قرآنک انسائیکلوپیڈیا

اُردو ترجمہ

جلد نہم

مؤلف

پروفیسر اشفاق احمد خان

(۱) مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ (سورۃُ الانعام : ۳۸)
''ہم نے (اپنی اِس) کتاب میں کوئی چیز چھوڑ نہیں رکھی ۔'' (۳۸ : ۶)

(۲) وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ O (سورۃُ الانعام : ۵۹)
''اور نہ کوئی تر اور خشک چیز مگر (یہ کہ یہ سب) روشن کتاب میں (موجود) ہیں ۔'' (۵۹ : ۶)

(۳) وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ (سورۃُ النَّحل : ۸۹)
''(اے محبوبِ محتشم!) ہم نے آپ پر ہر بات کو کھول دینے والی کتاب اُتاری ہے ۔'' (۸۹ : ۱۶)

(۴) وَكُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ O (سورہ یٰسٓ : ۱۲)
''اور ہر چیز کا ہم نے (اِس) روشن کتاب میں احاطہ کر رکھا ہے ۔'' (۱۲ : ۳۶)

(۵) وَكُلُّ صَغِیْرٍ وَّكَبِیْرٍ مُّسْتَطَرٌ O (سورۃُ القمر:۵۳)
''اور ہر چھوٹی اور بڑی بات (اِس کتاب میں) لکھی ہوئی ہے ۔'' (۵۳ : ۵۴)

قرآنک انسائیکلوپیڈیا (اُردو ترجمہ)

(جلد نہم)

مؤلف : پروفیسر اشفاق احمد خان
سابق صدر شعبہ عربی ۔ گورنمنٹ ایمرسن کالج ۔ ملتان

مترجم : پروفیسر اشفاق احمد خان (مؤلف انسائیکلوپیڈیا ہذا)

ثاقب پرنٹرز اینڈ پبلشرز

5 ۔ شالیمار کالونی' عقب ٹویوٹا موٹرز ۔ بوسن روڈ ملتان
موبائل : 0308-9217883
0301-7422684

طبع اوّل : فروری 2015ء

ملنے کے پتے:

اندرون ملک

(۱) پروفیسر اشفاق احمد خان ۔ ۵ شالیمار کالونی، عقب ٹویوٹا شوروم، بوسن روڈ ۔ ملتان
موبائل : 0308-9217883
0301-7422684 (محمد جمیل ۔ مارکیٹنگ منیجر)

(۲) ملتان کتاب گھر ۔ بالمقابل گورنمنٹ ایمرسن کالج ۔ ملتان
فون : 061-6750226

(۳) مکتبہ قاسمیہ ۔ کچہری روڈ، نزد چوک گھنٹہ گھر ۔ ملتان
موبائل : 0300-7300097
فون : 061-4542085

بیرون ملک : پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد سلیم
drhafizsaleem@yahoo.com.uk
Landline Tel : 0044-1628-823632

قیمت : ایک ہزار روپے (Rs.1000/-)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللھم صل علی سیدنا محمد عدد من یسبحک و یھللک و یکبرک و یعظمک من یوم خلقت الدنیا الی یوم القیامۃ فی کل یوم الف مرۃ اللھم صل علی سیدنا محمد عدد انفاسھم و الفاظھم

مرا پیمبر عظیم تر ہے

مرا پیمبر عظیم تر ہے	مرا پیمبر عظیم تر ہے
کمالِ خلّاق ذات اُس کی	جمالِ ہستی حیات اُس کی
بشر نہیں عظمتِ بشر ہے	مرا پیمبر عظیم تر ہے
وہ شرحِ احکامِ حق تعالیٰ	وہ خود ہی قانون خود حوالہ
وہ خود ہی قرآں وہ خود ہی قاری	وہ آپ مہتاب آپ ہالہ
وہ عکس بھی اور آئینہ بھی	وہ نقطہ بھی، خط بھی، دائرہ بھی
وہ خود نظارہ ہے خود نظر ہے	مرا پیمبر عظیم تر ہے
شعور لایا کتاب لایا	وہ حشر تک کا نصاب لایا
دیا بھی کامل نظام اُس نے	وہ آپ ہی انقلاب لایا
وہ علم کی اور عمل کی حد بھی	ازل بھی اُس کا ہے اور ابد بھی
وہ ہر زمانے کا راہبر ہے	مرا پیمبر عظیم تر ہے
وہ آدم و نوح سے زیادہ	بلند ہمت بلند ارادہ
وہ زہدِ عیسیٰ سے کوسوں آگے	جو سب کی منزل وہ اُس کا جادہ
ہر اک پیمبر نہاں ہے اُس میں	ہجومِ پیغمبراں ہے اُس میں

وہ جس طرف ہے خدا اُدھر ہے مرا پیمبر عظیم تر ہے

بس ایک مشکیزہ اک چٹائی ذرا سے جَو ایک چار پائی

بدن پہ کپڑے واجبی سے نہ خوش لباسی نہ خوش قبائی

یہی ہے کل کائنات جس کی گنی نہ جائیں صفات جس کی

وہی تو سلطانِ بحر و بر ہے مرا پیمبر عظیم تر ہے

جو اپنا دامن لہو سے بھر لے مصیبتیں اپنی جان پہ لے

جو تیغ زن سے لڑے نہتا جو غالب آ کر بھی صلح کر لے

اسیر دشمن کی چاہ میں بھی مخالفوں کی نگاہ میں بھی

امیں ہے صادق ہے معتبر بھی مرا پیمبر عظیم تر ہے

جسے شہِ شش جہات دیکھوں اُسے غریبوں کے ساتھ دیکھوں

عنانِ کون و مکاں جو تھامے کدال پر بھی وہ ہاتھ دیکھوں

لگے جو مزدور شاہ ایسا نہ زر نہ دَھن سر براہ ایسا

فلک نشیں کا زمیں پہ گھر ہے مرا پیمبر عظیم تر ہے

وہ خلوتوں میں بھی صف بہ صف بھی وہ اِس طرف بھی وہ اُس طرف بھی

محاذ و منبر ٹھکانے اُس کے وہ سر بہ سجدہ بھی سر بکف بھی

کہیں وہ موتی کہیں ستارہ وہ جامعیت کا استعارہ

وہ صبحِ تہذیب کا گجر ہے مرا پیمبر عظیم تر ہے

کلام: مظفر وارثی پیش کردہ: (ثنا خوان مصطفیٰ ﷺ) نواں شہر ملتان - موبائل: 0301-7438219

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

(۱۶۴) اُولُوالالباب (Men of Wisdom) --- --- --- --- --- --- ۴۰۷۳

عقل وفہم کا درست اور غلط استعمال۔ عقل وفہم کی راہ میں رکاوٹیں۔ عقل ودانش کی مختلف سطحیں۔ عقل ودانش سے محروم لوگ قرآن کی نظر میں۔

(۱۷۵) علم فلزّات ومعدنیات (Metallurgy and Mineralogy) --- ۴۰۷۶

علم فلزات ومعدنیات اور قرآنِ حکیم۔ (الف) دھاتیں: موتی، مرجان، یاقوت، سونا اور چاندی، تانبا۔لوہا۔ سونا، چاندی بطور دُنیاوی حسن دولت، غیرا ہم اور اللہ کی نظر میں قابلِ نفرت۔ سونا بطور تجارت کی ترقی۔ ڈالر کی بجائے سونا بطور شرح مبادلہ۔ سونے کی تاریخی حیثیت۔ (ب) معدنیات: پتھر۔گیلی چکنی مٹی (طین)۔ معدنیات اور نجی ملکیت۔

(۱۷۶) علم مابعدالطبعیات رعلم ماورائے مادّہ (Metaphysics) --- ۴۰۸۳

مادّی تجربہ، حواسِ خمسہ اور مابعدالطبعیات۔ مابعدالطبعیات کی مثالیں: (۱) روح۔روح کی دائمیت۔روحِ سلطانی، روحِ حیوانی۔ (۲) النفس اور القلب۔ (۳) موت اور اُس کی تخلیقی کیفیت۔ (۴) روزِ محشر۔وقوعِ قیامت پر عقلی وشرعی دلائل۔روزِ قیامت پر واقع ہونے والے واقعات۔نفخہ اُولیٰ۔عالمِ برزخ۔نفخہ ثانیہ۔الحساب۔ میزان کو مجازی معنیٰ میں لینے کی تردید۔آخرت میں میرٹ کی بنیاد پر درجہ بندی۔اعمال اور اُن کی کیفیات کے وزن پر اِشکال کا جواب۔مقامِ اعراف۔پُل صراط۔ ناگہانی آفت کے واقعات اور اخلاقی بے راہروی کے مابین تعلق۔ سورۃالانعام کی آیات ۴۵، ۴۶ سے ماخوذ نِکات۔ (۵) نارِ جہنم: جہنم کے مختلف نام۔جہنم کی ہولنا کیاں۔جہنم کی گہرائی اور اُس کی حدّت۔دوزخ میں جلنے والے پتھر۔سورہ مریم کی آیت ۷۱ وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کی تفسیر احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں۔دوزخ کے قول هَلْ مِنْ مَّزِيْد(سورہ ق:۳۰) کی تاویلات۔ دوزخ میں اللہ تعالیٰ کے قدم رکھنے کی توجیہ۔ دوزخیوں کا لباس وطعام۔ دوزخیوں اور جنتیوں کا ہمیشہ ہمیشہ دوزخ اور جنت میں رہنا۔ (۶) جنت: دنیا میں اہلِ جنت کی صفات۔جنت کے درجات۔چاروں جنتوں میں فرق۔ ایک اِشکال اور اُس کا جواب۔جنت کے ایک درجہ کی وسعت۔ جنت کے دروازے۔ جنت کے دروازوں کی وسعت۔جنت کے درخت۔جنت کی بیری کا درخت۔جنت کا درخت طُوبیٰ۔کدّو اور تربوز جنتی پیداوار ہیں۔جنت کے درختوں کی نوعیت۔جنتیوں کے لباس۔ سبز رنگ کو مخصوص کرنے کی وجہ۔جنت کا موسم اور درجہ حرارت۔جنتیوں کی خوشیوں کے مناظر کا نقشہ از روئے قرآن مجید۔اہلِ جنّت اور مواصلت۔جنتی عورتوں اور حوروں کی پاک دامنی

اور اُن کے حُسن و جمال کی کیفیت۔ جس عورت نے دنیا میں متعدد نکاح کئے ہوں وہ آخرت میں کس خاوند کے نکاح میں ہوگی؟ جنت کے پرندوں کی کیفیت۔ اہلِ جنت کا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا درجہ۔ ایک الجھاؤ اور اُس کا سلجھاؤ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنتیوں کو سلام کا تحفہ۔ قولِ باری تعالیٰ وَلَدَیْنَا مَزِیْد (قٓ:۳۵) اور لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَۃ'' (یونس:۲۶) کی تفسیر۔ بروزِ قیامت دیدارِ الٰہی۔ دیدارِ الٰہی کی بابت سیّدہ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا کا موقف۔ دیدارِ الٰہی کا احادیثِ مبارکہ سے ثبوت۔ آیا جنت اور جہنم پہلے ہی سے موجود ہیں؟ جنت میں سماع کی تحقیق۔ جنت الفردوس۔ جنتِ عدن۔ جنت کے دروازے کھلے رکھنے کے اَسرار و نکات۔ (۷) ملائکہ (فرشتے): فرشتوں کی قسمیں۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں نہیں ہیں۔ فرشتوں کے فرائضِ منصبی۔ اَلْمَلَاءُ الْاَعْلٰی سے مراد؟ شبِ قدر میں فرشتوں کا سلام۔ بشر اور فرشتوں میں باہمی فضیلت کی تحقیق۔ (۸) جنّات: جنات کی حقیقت۔ جنات ایک علیحدہ جداگانہ مخلوق ہیں۔ جنات کا قرآن سن کر رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا۔ جنّات کا نمازِ فجر میں رسول اللہ ﷺ سے قرآن سننا۔ حرفِ آخر (نتیجہ)۔

(۱۶۷) موسمیات (Meteorology) --- --- --- --- --- --- ۴۱۵۰

موسمیات بطور مشاہداتی طریق۔ کرّہ فضائی (Atmosphere) کے فوائد۔ درجہ حرارت (ٹمپریچر)۔ کرّہ فضائی کا دباؤ۔ خشکی اور بحری ہوائیں۔ پہاڑوں اور وادیوں کی ہوائیں۔ طوفانی آندھی (Typhoon) اور قرآن مجید۔ برف باری اور اولے (Precipitation)۔ بادلوں کی اقسام۔ بارش کے قطروں کا حجم۔ آسمانی بجلی کا کوندنا اور اُس کے اثرات۔ کرّۂ فضائی کی ساخت۔ کرّۂ متغیرہ (Troposhere)۔ کرّہ قائمہ (ہوائی Stratosphere) درمیانہ کرّہ ہوائی (Mesosphere)۔ کرّہ حارّہ (Thermosphere)۔ کرّہ بالا (Exosphere)۔ موسمیات اور بیرومیٹر۔ سورج اور چاند کی روشنی میں فرق۔

(۱۶۸) معجزات (Miracles) --- --- --- --- --- --- --- ۴۱۶۳

معجزہ کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ۔ معجزہ کی اقسام۔ معجزہ شق القمر۔ شق القمر کی بابت ایک سوال اور اُس کا جواب۔ معجزہ ردّ الشّمس۔ ردّ الشّمس کی بابت ایک اعتراض اور اُس کا جواب۔ معجزہ حبس الشّمس۔ معجزہ حنین الجذع۔ سفینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جنگل کا شیر۔ اخبار بالمغیبات۔ نبی اکرم ﷺ کا روحانی معجزہ۔ اعجازِ قرآن پر غیر مسلموں کے اعترافات۔ معجزہ اور جادو۔ معجزات کے تسلیم کرنے میں سنگِ گراں۔ ڈیوڈ ہیوم اور معجزات۔ سر سیّد احمد خاں اور معجزات۔ معجزات کے متعلق عام مغربی رجحان۔ معجزات کی بابت نصاریٰ کا اعتراض۔

(۱۶۹) میزان (Mizaan) --- --- --- --- --- --- --- --- ۴۱۸۲

میزان کا لغوی وشرعی معنیٰ۔ اعمال اور اُن کی کیفیات کے وزن پر ایک اِشکال کا جواب۔ میزان میں وزن کرنے کی حکمتیں۔ وزن کئے جانے والوں کی قسمیں۔ میزان کے خطرہ سے بچنے کے لئے حقوق العباد کی ادائیگی ضروری ہے۔ آیا صرف مسلمانوں کے اعمال کا وزن ہوگا یا کافروں کے اعمال کا بھی؟

(۱۷۰) مباہلہ (Mobahilah) --- --- --- --- --- --- --- ۴۱۸۷

مباہلہ کا لغوی واصطلاحی معنیٰ۔ عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کے ردّ میں مباہلہ کے انعقاد کا فیصلہ۔ واقعہ مباہلہ کے سبق آموز نِکات۔ قرآنی لفظ أَنْفُسَنَا کی صحیح تعبیر۔

(۱۷۱) مُحمّد ﷺ (Mohammad) --- --- --- --- ۴۱۸۹

لفظ ''محمّد'' کا تعارف۔ لفظ ''محمّد'' کا ہر حرف بامعنیٰ ہے۔ محمّد اور احمد۔ نبی اکرم ﷺ کے بہت سے نام لفظ ''حمد'' سے ماخوذ نہیں۔ لفظ ''حمد'' سے ماخوذ اسماء: محمّدؐ احمدؐ حامد اور محمود۔ نبی اکرم ﷺ پر مسلمانوں اور فرشتوں کی صلوٰۃ۔ درود کے ساتھ سلام کیوں؟ درود وسلام کا حکم صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے خاص کیوں؟ نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجنا سنتِ الٰہیہ ہے۔ صلوٰۃ اور سلام میں فرق۔ درود وسلام معرفتِ مصطفیٰ ﷺ کا باعث نبی اکرم ﷺ پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے کی اہمیت پر چند احادیثِ مبارکہ۔ اُن لوگوں کی مذمّت میں احادیثِ نبوی جو نبی علیہ السلام پر درود وسلام نہیں بھیجتے۔ فرشتوں کا درود وسلام۔ صلوٰۃ و سلام کا قبول ہونا۔ سلام اور دوسری عبادتوں کی قبولیت۔ صلوٰۃ وسلام کو نبی علیہ السلام کا قبول فرمانا۔ نبی ﷺ کو نام ''محمّد'' دے کر اُنہیں معصوم اور ہر خطا سے مبرّا ثابت کرنا ہے۔

<u>مدح النبی فی القرآن الکریم</u>: (1) پورے قرآن مجید میں نبی علیہ الصلوٰۃ و السلام کو آپ کے نام ''محمّد'' کی بجائے مختلف القاب سے خطاب کیا گیا۔

(2) قصہ آدم علیہ السلام و ابلیس میں عظمت ورفعتِ مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ثبوت۔

(3) روزِ ازل میں میثاقِ انبیاء علیہم السلام میں عظمت وتوقیرِ مصطفیٰ کا ثبوت۔

(4) وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (البقرة: ۴) ۴۲۹۲

(5) يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا (البقرة: ۱۰۴) ۴۲۱۵

(6) وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ (البقرة: ۲ : ۱۴۳) ۴۲۰۴

(7) تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ (البقرة: ۲۵۳) ۴۲۱۸

(8-12) (۱) ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهِ اِلَيۡكَ (آلِ عمران: ۴۴) ۴۳۹۶

(۲) تِلۡكَ مِنۡ اَنۡبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهَا اِلَيۡكَ (هود: ۱۱: ۴۹) ۴۳۹۷

(۳) ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهِ اِلَيۡكَ (يوسف: ۱۰۲) ۴۳۹۷

(۴) وَمَا كُنۡتَ بِجَانِبِ الۡغَرۡبِىِّ اِذۡ قَضَيۡنَا (اَلقصص: ۴۴) ۴۳۹۷

(۵) وَمَا كُنۡتَ بِجَانِبِ الطُّوۡرِ اِذۡ نَادَيۡنَا (اَلقصص: ۴۶) ۴۳۹۸

(13)(i) يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ (آلِ عمران: ۱۶۴؛ الجُمُعة: ۲) ۴۲۲۳

(ii) تِلۡكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتۡلُوۡهَا عَلَيۡكَ بِالۡحَقِّ (البقرة: ۲۵۲؛ آلِ عمران: ۱۰۸) ۴۲۲۳

(14) فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا (آلِ عمران: ۳: ۱۵۹) ۴۲۰۶

(15) مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ عَلٰى مَا اَنۡتُمۡ عَلَيۡهِ حَتّٰى (آلِ عمران: ۱۷۹) ۴۳۱۱

(16) (i) وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰى مَا اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوۡلِ (اَلنِّساء: ۶۱) ۴۲۱۸

(ii) وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا يَسۡتَغۡفِرۡ لَكُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ (المنافقون: ۵) ۴۲۱۸

(17) وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ جَآءُوۡكَ فَاسۡتَغۡفَرُوا (النسآء: ۶۴) ۴۲۰۷

(18) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوۡكَ فِيۡمَا شَجَرَ (النسآء: ۶۵) ۴۲۱۰

(19) مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء: ۸۰) ۴۲۴۶

(20) وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكَ وَرَحۡمَتُهٗ لَهَمَّتۡ طَّآئِفَةٌ (اَلنِّساء: ۱۱۳) ۴۲۱۹

(21) وَكَانَ فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكَ عَظِيۡمًا (اَلنِّساء: ۱۱۳) ۴۲۱۷

(22) يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَكُمُ الرَّسُوۡلُ بِالۡحَقِّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ (النسآء: ۱۷۰) ۴۲۹۳

(23) يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَكُمۡ بُرۡهَانٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَاَنۡزَلۡنَا (النساء: ۱۷۴) ۴۲۹۴

(24) يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمۡ كَثِيۡرًا (المائدة: ۱۵، ۱۶) ۴۳۰۰

(25) يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمۡ (المائدة: ۱۹) ۴۳۰۱

(26) يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوۡلُ لَا يَحۡزُنۡكَ الَّذِيۡنَ يُسَارِعُوۡنَ فِى الۡكُفۡرِ (المائدة: ۴۱) ۴۲۵۷

(27) يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ وَاِنۡ لَّمۡ (اَلمائدة: ۶۷) ۴۲۳۸

(28) قرآن پاک کے 209 مقامات پر رب تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کو اپنے محبوب ﷺ کی طرف نسبت دی ہے۔ ۴۲۲۳ تا ۴۲۲۹

(29) قَدۡ نَعۡلَمُ اِنَّهٗ لَيَحۡزُنُكَ الَّذِىۡ يَقُوۡلُوۡنَ فَاِنَّهُمۡ لَا (الانعام: ۳۳) ۴۲۳۰

(30) اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقۡتَدِهۡ قُلۡ لَّآ (الانعام: ۹۰) ۴۳۵۷

(116) وَلَسَوۡفَ يُعۡطِيۡكَ رَبُّكَ فَتَرۡضٰىؕ O (اَلضُّحٰی : ۵) ۴۳۲۶
(117) اَلَمۡ يَجِدۡكَ يَتِيۡمًا فَاٰوٰى O وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى O (اَلضُّحٰی : ۶ تا ۸) ۴۴۰۹
(118) اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ O (الانشراح : ۱) ۴۳۸۶
(119) وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ O (الانشراح : ۴) ۴۳۸۸
(120) اِنَّاۤ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ O (الکوثر : ۱) ۴۲۷۶
(121) اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ O (الکوثر : ۳) ۴۲۷۸
(122) تَبَّتۡ يَدَاۤ اَبِىۡ لَهَبٍ وَّتَبَّ O مَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُ مَالُهٗ وَمَا (اَللَّهَب : ۱۔۵) ۴۳۵۴

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اعضائے پاک کا ذکر کلامِ حکیم میں
آپ کا قلبِ مبارک۔ زبانِ مبارک۔ آنکھیں۔ چہرہ انور۔ دستِ مبارک۔ گردن مبارک۔
سینہ مبارک۔ کمر مبارک۔ آپ کی ذاتِ پاک۔ ۴۴۲۸
آپ کے بازو مبارک۔ ۴۴۲۹

(الف) تمام انبیاء علیہم السلام پر کفار کی طرف سے لگائے گئے الزامات کا جواب اُن انبیائے کرام نے خود دیا۔ ۴۴۲۹ تا ۳۲

(ب) جبکہ امام الانبیاء ﷺ پر لگائے گئے تمام الزامات کا جواب رب تعالیٰ نے خود دے کر اُنہیں قرآن کا حصہ بنا دیا۔ ۴۴۳۲۔۳۶

(ج) تمام انبیاء علیہم السلام کو اُن کے مانگنے پر رب نے عطا فرمایا جبکہ نبی علیہ السلام کو بن مانگے عطا فرمایا گیا۔ ۴۴۳۷۔۳۹

(د) رب تعالیٰ نے قرآن مجید میں ہر مقام پر آپ کو آپ کے مختلف القاب سے خطاب فرمایا جبکہ سابقہ تمام انبیاء علیہم السلام کو اُن کے اسمائے مبارک سے خطاب کیا۔ ۴۴۳۹۔۴۱

اسی طرح مسلمانوں کو بھی آپ کے نام سے خطاب کرنے سے منع کر دیا گیا جبکہ گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی امتیں بھی اپنے نبیوں کو اُن کے نام سے پکارتی تھیں۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات پر نصاریٰ کا اعتراض۔ نبی علیہ السلام کے اپنی امت پر حقوق۔ احادیثِ نبویہ کی حد درجہ تعظیم و توقیر۔ آپ ﷺ کے آثارِ شریفہ کی تعظیم۔

مراجع ومصادر (BIBLIOGRAPHY)

تعارف (انسائیکلو پیڈیا جلد نہم)

امام الانبیاء ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: اَلْعِلْمُ عِلْمَان: عِلْمُ الْاَدْیَانِ وَ عِلْمُ الْاَبْدَانِ یعنی علم تو دو ہی ہیں: ایک دین کا علم اور دوسرا طب کا علم (Medical Science)۔

میں سمجھتا ہوں کہ علمِ دین کا ذکر علم الابدان کے ذکر سے پہلے اس لئے کیا گیا کہ (۱) علمِ دین کا تعلق دنیا اور آخرت دونوں سے ہے جبکہ علم الابدان کا تعلق صرف اِس دنیا اور اِس میں رہنے والے فانی جسم سے ہے اور اس لحاظ سے علمِ دین کو علم الابدان پر فوقیت حاصل ہے۔ (۲) علم الابدان کی بنیاد اگر علم دین پر نہ ہو تو معالجین اور ڈاکٹر حضرات خدا فراموش ہی پیدا ہوں گے اور اُن کا ''خدمتِ خلق'' کا ڈھنڈورا غیر مخلصانہ اور (Lip-service) کی حد تک ہوگا۔

سچ پوچھئے تو سورۃ الاعراف کی آیت ۳۱ میں آدھا علمِ طب شامل ہے جس میں فرمایا: کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا یعنی کھاؤ، پیو لیکن حد سے آگے نہ بڑھو۔'' حد سے آگے بڑھنے سے مراد شکم پُری ہے جس کی مذمّت میں زبانِ رسالت نے فرمایا:

اَلْکَافِرُ یَاْکُلُ فِیْ سَبْعَۃِ اَمْعَاءٍ وَالْمُؤْمِنُ یَاْکُلُ فِیْ مِعًی وَّاحِدٍ (صحیح بخاری ۲: ۸۱۲)
''کافر سات انتڑیوں میں کھاتا ہے اور مؤمن ایک انتڑی میں کھاتا ہے۔''

ایک اور موقع پر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:
''اللہ حد سے زیادہ کھانے والوں سے نفرت کرتا ہے۔'' (مسند الفردس للدیلمی)

اصحابِ کہف کا واقعہ مشہور سائنسدان آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت (انجمادِ وقت Freezing of Time) کو شامل ہے جسے قرآن مجید نے آئن سٹائن سے صدیوں پہلے پیش کر دیا تھا۔

قرآن کی نظر میں اہلِ عقل و دانش دُنیوی دھن دولت رکھنے والے جاگیردار اور سرمایہ دار نہیں بلکہ وہ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت کی راہ سجھا دی ہے (بحوالہ سورۃ الزُّمر: آیت ۱۸) اور وہ حقوق اللہ کی ادائی کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کی ادائی میں بھی کوتاہی نہیں برتتے۔

انگریز نے برِّصغیر میں اپنے راج کے دوران مسلمانوں کی متاعِ بے بہا کے چھیننے کی جو سازش کی تھی اور آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس کو مباحث کا موضوع بنا کر عشقِ مصطفی ﷺ کی لَو کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کرنے کا جو فتنہ برپا کیا تھا، وہ آج امربیل کی طرح ایمان کی شاخوں پر براجمان ہے۔ نت نئے فتنوں کے ساتھ کبھی فخرِ کائنات ﷺ کے اختیارات و تصرّفات کو موضوعِ مناظرہ بنایا جاتا ہے تو

کبھی آپ کی شخصیتِ مبارکہ کا علم، کبھی آپ کی روحانیت اور اُس کے فیض کا کائنات میں ہمہ وقت جاری و ساری ہونا موضوعِ بحث بنتا ہے تو کبھی بشریت اور نورانیت کے چکر میں ناواقف مسلمان کو الجھا دیا جاتا ہے۔

قارئینِ کرام! اربابِ عشق و محبت نے فرقانِ حمید کو جو صحیفہِ انقلاب ہے، گلدستہِ نعتِ رسول ﷺ سے تعبیر کیا ہے اس لئے کہ قرآنِ حکیم کے لفظ لفظ اور ورق ورق پر محامدِ سرکار ﷺ کی دُھنک بکھری ہوئی ہے، اور ہر حاشیہ خوشبوئے اسمِ محمد ﷺ سے مہک رہا ہے۔ جنابِ آدم علیہ السلام سے لے کر جنابِ عیسیٰ علیہ السلام تک نازل ہونے والے تمام صحیفے بھی ذکرِ خیرالانام ﷺ کے انوارِ سرمدی سے تابندہ و روشن ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ قُدسی صفات ہستیاں نبی آخرالزماں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کا اہتمام فرما رہی ہیں جیسے کائنات کا ذرّہ ذرّہ تاجدارِ کائنات ﷺ کی قدم بوسی کے لئے بیتاب و مضطرب ہے، اور ایسا کیوں نہ ہو کیونکہ اِسی چشمہِ شعور سے ایمان و ایقان کے سُوتے پھوٹتے ہیں، صراطِ مستقیم پر گامزن مسافرانِ حق قربِ الٰہی کی منزل سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

قرآنِ حکیم ذکرِ مصطفیٰ ﷺ سے خالی نہیں اور زبانِ مصطفیٰ ﷺ ذکرِ قرآن سے پُر ہے۔ قرآن کا اسلوبِ عشق عجب پُر بہار اور روح پرور ہے۔

کبھی تو اللہ کا یہ آخری کلام تاجدارِ کائنات ﷺ کی نبوت و رسالت کا اعلان جاءَ، اَرْسَلَ اور بَعَثَ کے الفاظ میں فرماتا ہے اور کبھی کفار و مشرکین کو آپ ﷺ کے پرچمِ توحید کے نیچے آنے کی دعوت دیتا ہے۔

کبھی وہ سیّدہ آمنہ کے لعل کو والضُّحیٰ کے پیار بھرے لقب سے یاد فرماتا ہے تو کبھی آپ کی زلفِ عنبریں کے حوالے سے وَالّیل کے محبت آمیز لہجے سے پذیرائی بخشتا ہے۔ ربِّ محمد اپنی شاہکار تخلیق کو علمِ جمل کی رُو سے کبھی طٰہٰ (۹ + ۵ = ۱۴) کے لقب سے ملقب کرتا ہے تو کبھی وہ یٰسٓ یعنی قرآنِ پاک کے دل کے ذکر کا آغاز کائنات کے دل کے ذکر سے کرتا ہے۔

قرآن کبھی آپ کی اطاعت پر زور دیتا ہے (آلِ عمران: ۳۱) تو کہیں آپ کی عظمتوں کا بیان کرتا ہے (النساء: ۱۱۳)۔ کہیں آپ کی جود و سخا کی بات کرتا ہے (الضّحیٰ: ۱۰) تو کہیں آپ کے دستِ عطا کا ذکر کرتا ہے (الحشر: ۷)۔ کبھی آپ ﷺ کی رضا کی باتیں کرتا ہے (البقرۃ: ۱۴۴؛ (الضّحیٰ: ۵) تو کہیں آپ کے وطنِ مالوف شہرِ مکہ کی (البلد: ۱، ۲) اور اپنے حبیبِ محتشم کی عمر مبارک کی قسم کھاتا ہے (الحجر: ۷۲)۔ قرآن کبھی محبتِ الٰہی کے لئے اطاعتِ مصطفیٰ کو شرط قرار دیتا ہے (آلِ عمران: ۳۱) اور کہیں اطاعتِ مصطفیٰ ہی کو اطاعتِ الٰہی ٹھہراتا ہے (النساء: ۸۰)۔ کبھی قرآن اللہ اور اس کے محبوب علیہ السلام کے کلام کے درمیان

وحدت قائم کرتا ہے(النّجم :۴،۳) تو یہی قرآن کہیں مؤمنین کو ختم المرسلین ﷺ کی عزت و احترام کی بجا آوری کا سبق دیتا ہے (الفتح :۹؛ الحُجرات :۱تا۵)۔کبھی وہ آپ کی بعثت سے قبل آپ کی بے خطا عمرِ مبارک کو دلیلِ توحید بناتا ہے(یونس : ۱۶) تو کبھی اپنے رسول کے درِ عطا پر جھکنے ہی کو ایمان قرار دیتا ہے(النساء:۶۵؛ التوبة : ۵۹)۔کبھی وہ زبانِ رسالت سے نکلے ہوئے ہر ہر لفظ کو وحیِ الٰہی قرار دیتا ہے(النّجم :۴،۳) تو کہیں رسول کی اطاعت اور بات ماننے کو عبادت قرار دیتا ہے(الانفال :۲۴)۔

غرضیکہ کہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی فضیلت بیان ہو رہی ہے (البقرة : ۲۵۳) تو کہیں آپ کے اُسوہ حسنہ کو رُشد و ہدایت کا دائمی سرچشمہ قرار دیا جا رہا ہے(الاحزاب : ۲۱)۔کہیں آپ کی ذاتِ مطہرہ کو مؤمنوں کے حق میں جان سے بھی بڑھ کر عزیز بتایا جا رہا ہے(سورة التوبة : ۲۴) تو کہیں قرآن اللہ اور اُس کے رسول کی محبت کو تمام محبتوں پر مقدم سمجھنے کی نصیحت کرتا ہے (المجادلة :۲۲)۔کہیں وہ محفلِ رسول میں بات کرنے کا سلیقہ سکھاتا ہے (المجادلة :۱۲) تو کہیں اپنے محبوب کے دربار کے آداب وضوابط کو خود وضع کر کے اُنہیں قرآن کا حصہ بنا دیتا ہے (الحُجرات :۱تا۵)۔قرآن کہیں آپ کے لائے ہوئے دین کے غلبے کا ذکر کرتا ہے(سورة التوبة :۳۳؛ الصّفّ :۹)تو کہیں آپ پر ایمان لانے اور آپ کی اطاعت میں ہدایت ونجات کی ضمانت دیتا ہے (الصّفّ :۱۰،۱۱)

ربّ ذوالجلال والاکرام نے کہیں اپنے شاہکار و یکتائے کائنات ﷺ کو رحمة للعالمین کا لقب عطا کیا (الانبیاء : ۱۰۷) تو کہیں وہ اُس شاہکار ہستی پر نہ صرف خود بھی فرشتوں سمیت درود بھیج رہا ہے بلکہ اُس کی غلامی کا طوق اپنے زیبِ گلو کرنے والوں کو بھی درود وسلام بھیجنے کا حکم فرما رہا ہے (الاحزاب : ۵۶)۔کہیں آپ کی رسالت کو تمام عالمِ انسانیت کے لئے بیان کیا گیا (الاعراف :۱۵۸؛ الفرقان :۱) تو کہیں آپ کو یہ مژدۂ جانفزا سنایا جا رہا ہے کہ آپ کی ہر آنے والی گھڑی پہلی سے بہتر ہوگی (الضحیٰ: ۴)۔کہیں قرآن آپ ﷺ کے علم کو عطائے ربّانی قرار دیتا ہے(النساء: ۱۱۳) تو کہیں گنہگاروں کے لئے آپ کے درِاقدس کو گوشۂ پناہ قرار دیتا ہے(التوبة :۶)۔قرآن کہیں زبانِ رسالت کی سفارش کو اللہ کی بخشش کا سبب گردانتا ہے(النساء:۶۴)تو کہیں خطا کاروں کے صدقات کے قبول کرنے کو ان خطا کاروں کی طمانیتِ قلبی اور اُن کا سکون قرار دیتا ہے (التوبة :۱۰۳)۔کہیں آپ کی ذاتِ ستودہ صفات کو چمکتے ہوئے ستارے کے دلرُبا لقب سے پکارا ہے(النّجم :۱) تو کہیں وہ آپ کے حُسنِ خُلق کے ڈنکے بجاتا ہے(آلِ عمران : ۱۵۹ ؛ القلم:۴)۔کہیں وہ ساری اُمتوں پر تاجدارِ کائنات ﷺ کو گواہ اور نگہبان بنانے کی بات کرتا ہے(النساء: ۴۱) تو کہیں عالمِ ارواح میں ارواحِ انبیاء علیہم السلام کو جمع کر کے ربّ کائنات اُن سے اپنے محبوب علیہ السلام پر ایمان لانے اور آپ کی مدد ونصرت کا عہد و پیمان لیتا ہے(آلِ عمران :۸۱) کہیں وہ مقامِ محمود کے منصبِ جلیلہ پر آپ کے فائز کئے جانے کا اعلان کرتا ہے(سورہ بنی اسرائیل :۷۹) تو کہیں وہ آپ کی

دل آزاری کرنے والوں کو دردناک عذاب کی تہدید سناتا ہے (التوبہ:۶۱)۔ کہیں وہ آپ کو غیب کے خزانوں کی کنجیاں عطا کرتا ہے (التکویر:۲۴) تو کہیں آپ کو اپنی نگاہِ کرم کا مرکز ہونے کا شرف عطا فرماتا ہے (الطور:۴۸)۔

قرآن نے کہیں آپ کو اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ کا مژدۂ دلبہار سنایا تو کہیں گزشتہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر کی گئی ستم رانیوں اور اعصاب شکن مظالم کا ذکر کر کے آپ کی تسلی اور سہارے کا سامان کیا گیا۔

قارئینِ کرام! کتنا بڑا ظلم ہے کہ خالقِ کون و مکاں جس نسبت پر پورا زور دے' ہمارے مناظرے اور مجادلے اُسی ذات پر ہیں۔ جب ہم کشتگانِ عشقِ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے محامد و فضائل کی بات کرتے ہیں تو یار لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں کہ کہیں رسول کو خدا سے تو نہیں ملا رہے حالانکہ پنجگانہ نماز میں کئی بار ہر مسلمان اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ آپ اپنے معبودِ برحق کے بندے اور رسول ہیں۔ جب آقا علیہ السلام کے ادب و احترام کی بات آتی ہے تو گھبرانے لگتے ہیں کہ کہیں حد سے تو نہیں بڑھ رہے۔ آقا کے کمالات و فضائل اور مناقب و محامد کی بات آتی ہے تو ہم پر شخصیت پرستی کا فتویٰ لگایا جاتا ہے۔ میں عقل کے ان یتیموں سے پوچھتا ہوں کہ جس ذاتِ اقدس کے دستِ پاک کو اللہ ربّ العزت اپنا ہاتھ قرار دے' جس کے کنکریاں پھینکنے کو وہ اپنی طرف سے پھینکنا قرار دے' جس کی اتباع کو وہ اپنی اتباع کہے' اور جس کے کلام پاک کی سطر سطر میں محاسنِ مصطفیٰ کی قندیلیں روشن ہیں اُس کے ذکرِ پاک کو شخصیت پرستی قرار دینا کتنا بڑا ظلم اور سراپا حمد و ستائش (محمد علیہ السلام) کے رب کے غضب کو للکارنا ہے!

تیرے ضمیر میں جب تک نہ ہو نزولِ کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

قارئینِ کرام! علم و آگہی کے بحرِ مواج کی کم مایہ اشیاء جنہیں اِس سراپا خطا نے خالقِ لم یزل کی توفیق سے سترہ سالہ عرق ریزی کے ساتھ اکٹھا کیا ہے' آپ کے سامنے ہے۔ ع گر قبول اُفتد زہے عز و شرف

اگر ان کم مایہ چیزوں کے ساتھ کوئی موتی بھی چمکتا ہوا نظر آ جائے تو اُسے میرے خالق و مالک کی فیضانِ نظر سمجھئے جس کے لئے میرا سراپا اُس کے حضور سربسجود ہے۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہ

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ وَالْعَمَلَ الَّذِیْ یُبَلِّغُنِیْ حُبَّکَ
اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَّفْسِیْ وَاَھْلِیْ وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ

۷ ربیع الاوّل ۱۴۳۶ھ
30 دسمبر 2014ء

خاکپائے صالحین
آئی۔ اے۔ خان

بسم اللہ الرحمن الرحیم ٥

(۱۶۰) میڈیکل سائنس (گزشتہ سے پیوستہ)

علاج کا ثبوت احادیث نبویہ سے : نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے آپ کو اور اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو لاحق ہونے والی امراض کے علاج کے نسخے تجویز فرمائے۔ ماہرینِ طب نے ''طبِ نبوی'' کا ایک مفصل اور مستقل باب باندھا ہے۔ اس ضمن میں کچھ احادیثِ نبویہ حسب ذیل ہیں :۔

(۱) جنگِ اُحد (۳ ہجری) میں جب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا چہرۂ انور زخمی ہوگیا تو آپ کی نورِ نظر سیّدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ کے زخم دھوئے اور جب خون کو نہ رکتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے چٹائی کا ایک ٹکڑا جلا کر زخم کو اُس چٹائی کی راکھ سے بھر دیا۔'' (صحیح بخاری)

(۲) سیّدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مرتبہ اپنی ناک میں دوا ڈالی ۔ (ابوداؤد)

(۳) حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے امراض اور اُن کے علاج دونوں کو پیدا فرمایا ہے۔ لہٰذا اے بندگانِ خدا! اپنی بیماریوں کے لئے دوا استعمال کیا کرو لیکن حرام ادویہ سے بچتے رہو۔ (ابوداؤد)

(۴) سیّدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم نبی اکرم ﷺ کو اُن کی بیماریوں میں اکثر ادویات کا اہتمام کیا کرتی تھیں ۔ (ابونعیم)

(۵) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سعد بن زُرارہ کا علاج Cauterization☆ کے ذریعے کیا۔ (ترمذی)

(٦) نبی اکرم ﷺ نے اپنے ایک صحابی اُبی ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف ایک معالج بھیجا جس نے Cauterization کے ذریعے اُن کا علاج کیا۔ (صحیح مسلم)

☆ نسیجوں کو کسی گرم آلے یا جلانے والے مادّے سے داغنا جھلسانا یا جلانا' خصوصاً خون روکنے کے لئے۔

لہٰذا اس حقیقت کا واضح ثبوت موجود ہے کہ طبّی علاج معالجہ اور بیماری کا کنٹرول کرنا توکل علی اللہ کے ہرگز خلاف نہیں ہے۔ جس طرح بھوک کے مٹانے اور پیاس کے بجھانے میں کھانا' پینا اور مصیبت میں اللہ کی رحمت کو پکارنا توکل علی اللہ کے خلاف نہیں ہیں' اسی طرح طبّی علاج معالجہ بھی توکل علی اللہ کے خلاف نہیں ہے جیسا کہ محولہ بالا آیتِ قرآنی اور احادیثِ نبویہ سے ثابت ہے۔

عملِ تنفّس (سانس لینے کا عمل Respiration) : ''حکیم مطلق اللہ تعالیٰ نے منہ اور نتھنوں کو سانس لینے کے لئے بنایا ہے۔ منہ کے اندر دو راستے ہیں جن میں سے ایک راہ پھیپھڑوں تک ہوا پہنچانے کے لئے ہے۔ دوسری راہ معدے اور معدے کی نالی (Oesophagus) تک ماکولات و مشروبات پہنچنے کے لئے ہے۔ رب تعالیٰ نے پھیپھڑے دل کو ہوا دینے اور ہوا گزاری کے لئے بنائے ہیں تاکہ دل کی طاقت و توانائی رک نہ جائے۔''

''منہ کے دو حصّے ہیں : اس کا ایک حصہ سونگھنے کی حِس کے لئے مخصوص ہے۔ دوسرا حصّہ اس طرح بنایا گیا ہے کہ اس کے ذریعے ہوا دل تک پہنچ جاتی ہے اگرچہ منہ نیند اور کھانے پینے کی حالت میں پوری طرح سے بند ہو۔ اگر منہ کی تشکیل اس طرح سے نہ کی گئی ہوتی تو سونے کے دوران زبان اختناق یعنی دَم گھٹنے کا باعث بنتی اور اس لئے منہ کو کھانے' پینے کے دوران بھی ہر وقت کھلا رکھنا پڑتا۔ اس طرح ہوا کی راہ رک جاتی جس کا مطلب یہ ہوتا کہ اگر غذا کا لقمہ یا مشروب کا کوئی قطرہ ہوا کی راہ میں داخل ہوتا تو دم گھٹنے کا سبب بن جاتا۔'' ("The Prophetic Way of Treatment"... Badr Azimabadi, p. 250)

ترکی کے عظیم اور شہرہ آفاق دانشور ہارون یحییٰ عملِ تنفّس کی بابت یوں رقمطراز ہیں :

نان سٹاپ ایئر کنڈیشنر جو ہمارے جسم میں مائل بہ عمل ہے : سانس لینا ایسا عمل ہے جسے ہم دن بھر لاشعوری طور پر کرتے رہتے ہیں۔ اس عمل کے دوران کئی کیفیات واقع ہوتی ہیں جن میں ناک' سانس کی نالی اور پھیپھڑے شریک ہیں۔ سانس لینے کا مطلب دراصل ہمارے جسم کے خلیوں کو آکسیجن پہنچانا ہے۔ اسی لئے ہم اپنی سانس کو مختصر سے وقت کے لئے روک سکتے ہیں۔ اگر سانس روکنے کا یہ دَورانیہ لمبا ہو جائے تو ہمارے خلیے مرجائیں جس کا نتیجہ جسم کی موت ہوگا۔''

''وہ ہوا جسے ہم بطورِ سانس لیتے ہیں' پہلے پہل ہمارے ناک میں صاف ہوتی ہے۔ سانس لینے کے حوالے سے ناک میں ایئر کنڈیشنر چل رہا ہوتا ہے۔ ناک میں چھوٹے چھوٹے بال ہوتے ہیں جو چھاننی کا کام کرتے ہیں۔ یہ بال گندی یا ٹھنڈی ہوا کو پھیپھڑوں کی ضرورت کے مطابق بناتے ہیں۔ انہی بالوں کی رہینِ منت یہ بات ہے کہ جو ہوا ہم بطورِ سانس لیتے ہیں' وہ چھن کر' صاف ہو کر' مرطوب ہو کر' گرم ہو کر اور بیکٹیریا سے پاک و صاف ہو کر اندر جاتی ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے بال دراصل روزانہ تقریباً بیس ارب خارجی مواد سے ہمارے جسموں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرتِ تخلیق کی گواہی دیتی ہے۔ ارتقاء پسندوں کا یہ دعویٰ

کس قدر پوچ اور غیر معقول ہے کہ کائنات میں تمام کچھ اٹکل پچو وقوعات کا نتیجہ ہے۔ ایسا دعویٰ کرنے میں وہ دراصل اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔'' ("Miracles in Our Bodies", pp. 92, 93)

سانس لینے کا نظام ہمارے شعوری اختیار میں نہیں: اگر سانس لینا ہمارے شعوری اختیار میں ہوتا تو کیا ہوتا؟ ہم اس عمل کو بے خطا بروئے کار لانے کے قابل نہ ہوتے۔ ہم تھک جاتے اور بالآخر کچھ دیر بعد سانس لینا چھوڑ دیتے۔ ہمارا رب اس بات کو جانتا ہے کہ ہم اس کام کو اپنی مرضی سے نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اُس نے نظامِ تنفس کی تخلیق کی جو دوسرے نظاموں کی طرح کامیابی سے مائل بہ عمل ہے۔ یہ حقیقت اُس کے تحفوں اور عطیات میں سے ایک ہے جس کا ذکر اس آیت میں آیا ہے:

وَآتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَاسَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللهِ لَاتُحْصُوْهَا (ابراھیم: ۳۴)

''اور اُس نے تمہیں ہر وہ چیز عطا فرمادی جو تم نے اُس سے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو (تو پورا) شمار نہ کر پاؤ گے۔'' (۱۴: ۳۴)

انتقالِ خونِ انسانی: اس ضمن میں کچھ متجسسانہ سوالات پوچھے جاتے ہیں کہ آیا ایک جسمِ انسانی سے دوسرے جسمِ انسانی تک خون کا منتقل کرنا جائز اور حلال ہے۔ اس بحث کو سوال و جواب کی شکل میں ذیل میں ترتیب دیا گیا ہے:

سوالات: (1) کیا ایک جسمِ انسانی سے دوسرے جسمِ انسانی تک خون کا منتقل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(2) اگر وہ جائز ہے تو کیا کسی آدمی کا خون بطور عطیہ بلا قیمت لیا جا سکتا ہے یا بصورتِ دیگر اس خون کی خرید و فروخت قانوناً جائز اور حلال ہوگی؟

(3) کیا کسی غیر مسلم کا خون کسی مسلمان کے جسم میں منتقل کیا جا سکتا ہے؟

(4) کیا انتقالِ خون کی مذکورہ صورت کسی شادی شدہ جوڑے کی ازدواجی حیثیت پر اثر انداز ہوگی؟

جوابات: (1) خون جسمِ انسانی کا جزوِ ترکیبی (Component part) ہے اور جب اُسے جسم سے باہر نکالا جائے تو وہ پلید ہو جاتا ہے۔ بالعموم اس کا مطلب یہ ہے کہ عام حالات میں ایک آدمی کے خون کو دوسرے آدمی کے جسم میں منتقل کرنا ناجائز ہے۔ اعضائے انسانی کا تقدس اور حرمت بھی اسی بات کی متقاضی ہے۔

لیکن اضطراری حالات میں اور مختلف امراض کے علاج میں اسلام کی طرف سے دی گئی سہولیات اور مراعات کے مدِ نظر خون کے استعمال کی ممانعت کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں: اوّل تو یہ کہ خون جسمِ انسانی کا جزوِ ترکیبی ہے اور کسی انسانی جزء کے استعمال کی اجازت نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ خون ایک پلید چیز ہے اس لئے اس کی ممانعت ہے۔

جہاں تک پہلی وجہ کا تعلق ہے تو یہ بات تو معلوم ہے کہ اگر چہ خون جسمِ انسانی کا جزوِ ترکیبی ہے' تاہم اس کے منتقل کرنے میں کسی عملِ جراحی کا عمل دخل نہیں ہے بلکہ اسے ایک جسم سے کھینچ کر دوسرے جسم میں انجیکشن کے ذریعے منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح اس کی حیثیت انسانی دودھ کے قریب قریب ہو جاتی ہے جو کسی جراحی کے بغیر نکالا جاتا ہے اور دوسرے انسان کے جسم کا جزوِ ترکیبی ہو جاتا ہے۔ بچے کی ضرورت کے مدِّ نظر اسلام نے اس دودھ کو اس کی غذا تصور کیا ہے اور والداؤں کو اپنے بچوں کو چھاتی سے دودھ پلانے کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ عام حالات میں اسے فرض قرار دیا ہے۔ بالغوں کے لئے بھی انسانی دودھ کو بطورِ دوا اور امراض میں بطور علاج استعمال کرنا جائز قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں فتاویٰ عالمگیری (طبع مصر) کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

وَلَا بَأْسَ بِاَنْ يَسْعَطَ الرَّجُلُ بِلَبَنِ الْمَرْأَةِ وَيَشْرِبَه' لِلدَّوَاءِ (جلد ۴' ص ۱۱۲)

''عورت کے دودھ کا اگر کسی مرد کو انجکشن لگا دیا جائے یا یہ کہ کوئی مرد اُسے بطورِ دوا استعمال کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' (فتاویٰ عالمگیری' جلد ۴' ص ۱۱۲)

لہٰذا جسمِ انسانی کا جزوِ ترکیبی ہونے کی حیثیت سے اگر خون کی حیثیت کو دودھ کے مساوی قرار دیا جائے تو یہ کوئی غیر تصوّراتی بات نہیں ہے۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ضرورت کے تحت خون کی منتقلی اس وجہ سے کی جاسکتی ہے کہ شریعتِ اسلامی نے عورت کے دودھ کو شیر خوار بچوں کے لئے ضرورت کے تحت جائز قرار دیا ہے اگرچہ دودھ انسان کا جزوِ ترکیبی ہے۔

''اگر بیماری کے طول پکڑنے سے زندگی کو کوئی خطرہ یا اندیشہ نہ ہو بلکہ خون کی منتقلی حسن و جمال یا گرم خیزی اور تواں داری (Vitality) کی خاطر ہو تو یہ قطعاً جائز نہیں ہے۔''

(2) انسانی خون کی تجارت جائز نہیں ہے لیکن اگر ایسے حالات موجود ہوں جن کے تحت انتقالِ خون جائز ہو جاتا ہے اور خون قیمت ادا کئے بغیر نہیں ملتا تو اُس کی خرید جائز ہے۔ لیکن خون کا عطیہ دینے والے کے لئے اُس کی اجرت قبول کرنا جائز نہیں ہے۔ اس معاملہ میں ماہرینِ شریعتِ اسلامی کے نظریات حسبِ ذیل ہیں:۔

فَاَمَّا بَيْعُ لَبَنِ الْاٰدَمِيَّاتِ فَقَالَ اَحْمَدُ: اَكْرَهُه' وَاخْتَلَفَ اَصْحَابُنَا فِيْ جَوَازِهٖ فَظَاهِرُ كَلَامِ الْخَرَقِيِّ جَوَازُهٖ لِقَوْلِهٖ وَكُلُّ مَافِيْهِ النَّفْعَةُ وَهٰذَا قَوْلُ ابْنِ حَامِدٍ وَمَذْهَبُ الشَّافِعِيِّ وَذَهَبَ جَمَاعَةٌ مِّنْ اَصْحَابِنَا اِلَى تَحْرِيْمِ بَيْعِهٖ وَهُوَمَذْهَبُ اَبِيْ حَنِيْفَةَ لِاَنَّه' مَائِعٌ خَارِجٌ مِنْ آدَمِيَّةٍ فَلَمْ يَجُزْ بَيْعُه' كَالْعَرَقِ وَلِاَنَّه' مِنْ آدَمِيٍّ فَاَشْبَهَ سَائِرَاَجْزَاءِهٖ وَالْاَوَّلُ اَصَحُّ لِاَنَّه' لَبَنٌ "طَاهِرٌ "مُنْتَفِعٌ" بِهٖ فَجَازَ بَيْعُه' كَلَبَنِ الشَّاةِ وَلِاَنَّه' يَجُوْزُ اَخْذُالْعِوَضِ مِنْهُ۔۔۔۔ الخ (الهداية: ج ۳' ص ۵۵)

''امام احمد کے نزدیک انسانی دودھ کی تجارت ناپسندیدہ بات ہے۔ ہمارے اصحاب اس معاملہ

میں مختلف الرائے ہیں۔ امام احمد کے نظریہ کو امام خرقی کے قول ''ہر ایسی نفع بخش چیز'' کی تائید حاصل ہے۔ یہی نظریہ ابن حامد اور امام شافعی کا ہے۔ لیکن ہمارے اصحاب کا ایک طبقہ اسے ممنوع قرار دیتا ہے۔ امام ابوحنیفہ کا بھی یہی نظریہ ہے کیونکہ دودھ جیسی مائع چیز عورت کے جسم سے باہر نکلتی ہے لہٰذا پسینے کی طرح اس کی تجارت کی اجازت نہیں ہے جو انسانی جسم سے باہر نکلتا ہے۔ لہٰذا دودھ بھی دوسرے اجزاء کی طرح ہے۔ لیکن پہلا نظریہ زیادہ موزوں ہے کیونکہ دودھ نفع بخش خالص چیز ہے اس لئے بکری کے دودھ کی طرح اس کی تجارت کی اجازت ہے اور اس وجہ سے بھی کہ دودھ پلانے والی دایہ کے لئے بچے کو دودھ پلانے کی اجرت لینا جائز ہے۔ اس صورت میں یہ بات نفع بخشی کے قریب قریب ہے۔ پسینے کی تجارت سے یہ بات مختلف ہے کہ پسینے میں فائدے اور نفع بخشی کی کوئی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بکری کا پسینہ فروخت نہیں ہوتا جبکہ اس کا دودھ فروخت ہوتا ہے۔'' (الھدایة)

(3) ''درحقیقت دودھ کی گرم خیزی اور توانائی داری (Vitality) میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ تاہم یہ بات ظاہر ہے کہ غیر مسلم اور معصیت پیشہ آدمی کے خون میں موجود بد اثرات کا اثر تو اُس آدمی کی اخلاقیات پر لازماً ہوگا جس میں اُس غیر مسلم وغیرہ کا خون منتقل کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے فقہائے اسلام نے حدود سے نکل جانے والی یا معصیت پیشہ عورت سے بچے کو دودھ پلانا پسند نہیں کیا۔ بہ ایں وجہ غیر مسلم اور معصیت پیشہ افراد کے خون سے ممکنہ حد تک اجتناب کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔''

(4) ''شوہر کے خون کی منتقلی اُس کی بیوی میں اور بیوی کے خون کی منتقلی اُس کے شوہر میں اُن کی ازدواجی حیثیت پر اثر انداز نہیں ہوتی اور اُن کے ازدواجی تعلقات برقرار رہتے ہیں کیونکہ اسلام نے ازدواج کو حسب ونسب اور رضاعت کے ساتھ مختص کیا ہے اور ان حدود سے تجاوز کرنا درست نہیں ہے۔ رضاعت میں اجازت شدہ مدت تیس ماہ (= اڑھائی برس) ہے (بحوالہ سورۃ الأحقاف: آیت ۴۶) اور اس مدت کے بعد دودھ چوسنے میں رضاعت کا اطلاق نہیں ہوتا۔''
("Islam on Grafting & Transplanting of Human Organs"... Maulana Mufti Muhammad Shafi (Eng. Trans.) pp. 36-44)

<u>اعضائے انسانی کی منتقلی (Transplantation of Human Organs)</u>: علم طب میں جدید ایجادات اور ترقیاں فی الحقیقت بہترین تکنیکی مہارت کی مظہر ہیں اور ایک آدمی کے جسم کے کسی حصّہ کو کسی دوسرے آدمی کے درد والم کو دور کرنے کے استعمال کرنے میں امراض کے علاج میں بظاہر ایک مفید باب کھولا گیا ہے۔ لیکن ہر مفید چیز کو مفید اُس وقت کہا جا سکتا ہے جب اُس کے نقصانات فائدے سے زیادہ نہ ہوں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اعضائے انسانی کی منتقلی میں اس کے مفید پہلوؤں کو مدِّ نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ اُس کے ضرر رساں پہلو بھی پیشِ نظر رہنے چاہئیں۔

۲۰۲۴ (میڈیکل سائنس)

اعضائے انسانی کی منتقلی کی تین صورتیں ہیں :

(الف) اس کی ایک صورت جو زمانہِ قدیم سے اب تک رائج ہے' یہ ہے کہ عضوِ انسانی کا بدل نباتات یا معدنیات سے لیا جائے اور انہیں تکنیکی مہارت کے ساتھ کارآمد کیا جائے۔ مثال کے طور پر مصنوعی دانت' مصنوعی سمعی معاونات زمانہِ قدیم سے اب تک رائج الوقت ہیں اور سائنسی ترقی نے اسے خوب ہوا دی ہے اور چمکایا ہے اور ابھی اس کی ترقی کا وسیع میدان ہمارے سامنے ہے۔ ایسے مصنوعی اجزاء کا استعمال نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی رسالتمآب ﷺ کی اجازت سے کیا ہے۔

(ب) ''اعضائے انسانی کی منتقلی کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس مقصد کو جانوروں کے اعضاء سے حاصل کیا جائے۔ یہ طریقہ بھی زمانہِ قدیم سے رائج الوقت رہا ہے اور تازہ ترین طبی تحقیقات اور ترقیِ جراحت نے اس میں نئی دریافتیں کی ہیں۔ اگر اس میدان میں ماہرین پوری توجہ دیں تو مزید دریافتیں اور زیادہ سے زیادہ مفید اور کامیاب علاج متوقع ہیں۔''

''اعضائے انسانی کی منتقلی کے درجِ بالا دونوں طریقے مادی' مذہبی' ذاتی یا قومی اور دوسرے تمام پہلوؤں سے بے ضرر اور خطرات سے آزاد ہیں۔''

(ج) منتقلی کا تیسرا طریقہ ایک آدمی کا علاج دوسرے آدمی کے جسم کے اعضاء سے کرنا ہے اور یہی ہماری اس موجودہ بحث کا موضوع اور عنوان ہے۔ منتقلی کے اس طریقہ میں بلا شک و شبہ کئی قابلِ مشاہدہ فوائد ہیں۔ مثال کے طور پر ایک نابینا آدمی کسی مردہ کی آنکھ اپنے میں منتقل کر کے بینا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے پہلو بہ پہلو اس کے کئی ضرر رساں پہلو بھی ہیں جو تمام انسانیت کی بربادی کا سبب ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اس طریقہ کو اپنانے سے پہلے تحقیق اور تجربہ کے ذریعے ضرر رساں پہلوؤں کو پیشِ نظر رہنا چاہئے۔ ضرر رساں پہلو یہ ہیں :

(i) انسان تمام موجودات' نباتات اور جانوروں کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتا ہے اور اس مقصد کے لئے وہ کیمیائی تغیرات اور دوسرے میکانی ذرائع سے انہیں کاٹتا اور نئی شکل دیتا ہے۔ اگر یہی طریقہ انسان پر اختیار کیا جائے کہ اُس کی جلد' بال اور اعضاء کو کاٹ کر دوسروں کے استعمال میں لایا جائے تو یہ آدمیت کے احترام اور اُس کے تقدس اور رب تعالیٰ کی اپنی مخلوقات کے بارے میں مرضی کے خلاف ہے۔ اسی لئے انسانی اعضاء کی تجارت یا اعضاء کی قطع و برید کے ذریعے اُن کے استعمال کو گناہ کبیرہ ہونے کی وجہ سے قطعاً ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ وقت کے ہر دور میں دنیا کے پڑھے لکھے اہلِ دانش نے اس نظریہ کو قبول کیا ہے اور ہر نبی اور رسول کا مذہبی نظریہ یہی رہا ہے۔

(ii) ''فقہائے اسلام نے قرآن و حدیث کے واضح احکامات سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ بھوک و پیاس سے

مرنے والے کے لئے مردہ جانور اور دوسری حرام چیزوں کے کسی حصّے کا کھانا پینا جائز ہو جاتا ہے (بحوالہ سورۃ البقرۃ: ۱۷۳، سورۃ المائدۃ: ۳) لیکن اس صورت میں بھی اُسے اپنا جسم یا جسم کا کوئی حصّہ کسی دوسرے کو بطور عطیہ دینے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ خرید و فروخت یا تحفہ اور خیرات اپنی مملوکہ چیزوں سے ہو سکتی ہے۔ انسانی روح اور انسانی اعضاء انسان کی مِلک نہیں ہیں (بلکہ رب تعالیٰ اُن کا مالک ہے)، اس لئے اُنہیں کسی کو نہیں دیا جا سکتا۔''

(iii) آنکھوں اور گردوں جیسے اعضاء اُس شخص سے بطور رضا کارانہ عطیات لئے جاتے ہیں جس کی موت بیماری یا کسی اور وجہ سے یقینی ہو۔ اگر علاج کا یہ نظام آزادانہ طور پر عام ہو جائے تو اس کا فوری نتیجہ یہ ہوگا کہ غریب و مفلس لوگوں کی آنکھیں، گردے اور جسم کے دوسرے اعضاء کھلے بازار میں تجارتی اشیاء کی طرح فروخت ہونے لگیں گے اور اپنے بچوں کے لئے وہ اپنی رضا مندی سے ایسی قربانی دیں گے۔ ہر دانا و بینا آدمی اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ ایسی بدنظمی اعضائے انسانی کی رضا کارانہ عطیات کی بندش پر رُک نہیں جائے گی بلکہ کئی مُردے بالخصوص لاوارث مُردے اپنے کئی اعضاء سے محروم ہوتے ہوئے اس دنیا کو خیر باد کہیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مستقبل میں آنے والے طبّی معالجین اعضائے انسانی کو طویل عرصے تک محفوظ کرنے کا طریقہ معلوم کر لیں جیسا کہ وہ خون کو طویل عرصے تک محفوظ رکھتے ہیں۔ اس صورت میں وہ اعضائے انسانی کے بنک ہوں گے جو اس مقصد کے لئے مُردوں کو خرید لیا کریں گے اور کوئی بھی مُردہ اُن سے محفوظ نہیں ہوگا۔ جنازہ اور تدفین کی رسومات کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ اور اگر (خدانخواستہ) یہ صورت جاری رہی تو یہ طبعی موت مرنے والوں تک محدود نہیں رہے گی بلکہ قتل و غارت روز مرّہ کا معمول (Routine) بن جائیں گے جس کا نتیجہ تمام انسانی سماج کی تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔''

''اگر اخلاقی اور مذہبی فرائض اور احکامات کو نظر انداز کرتے ہوئے عملِ جراحی (سرجری) کے جدید طریقوں کی مکمل طور پر حوصلہ افزائی کی جائے اور اس نظام کی تشہیر کے لئے سب کی اجتماعی کوششیں کی جائیں تو کیا یہ بات یقینی ہے کہ دنیا میں نہ تو کوئی شخص بینائی سے محروم رہے گا اور نہ ہی کوئی مریض اچھی صحت سے محروم ہوگا؟''

''لہٰذا انسانی فلاح و بہبود کا بے ضرر راستہ یہی ہے کہ جراحت اور طب کے ماہرین اپنی توانائی کو پہلی دو صورتوں کی تحقیق و اصلاح پر صَرف کریں۔ امید ہے کہ وہ امراض اور نقائص جن کی خاطر اعضائے انسانی کو کاٹا جاتا ہے اور اُن کی قطع و برید کی ضرورت سمجھی جاتی ہے صرف انہی دو طریقوں ہی سے علاج و اصلاح کے ذریعے اثر پذیر ثابت ہوں اور وہ بیماریاں دُور ہو جائیں۔''

اس ضمن میں علمائے اسلام کی فقہی توضیح حسب ذیل ہے :

مُضطَرٌ" لَمْ یَجِدْ مَیْتَةً فَخَافَ الْھَلاَكَ فَقَالَ لَه' رَجُل" اِقْطَعْ یَدِیْ وَ کُلْھَا اَوْ قَالَ اِقْطَعْ مِنِّیْ قِطْعَةً وَ کُلْھَا لاَ یَسَعُه' اَنْ یَّفْعَلَ ذٰلِكَ وَلاَ یَسَعُ اَمْرُه' بِه کَمَا مَالاَ یَسَعُ لِلْمُضْطَرِّ اَنْ یَّقْطَعَ قِطْعَةً مِّنْ نَّفْسِه فَیَاْکُلَ کَذَا فِی فَتَاوٰی قَاضِیخَان (فتاوٰی عالمگیریه باب الحظر والاباحة ج ۵' ص ۳۱۰)

"ایک مجبور اور اضطراری کیفیت کا آدمی اپنی زندگی بچانے کے لئے کسی مردار کو بھی نہیں پاتا اور اس کی زندگی خطرہ میں ہے اور اگر کوئی اُسے یہ کہے کہ میرا ہاتھ کاٹ کر اسے کھا لو یا وہ مجبور آدمی خود کسی سے کہے کہ میرے جسم کا کوئی حصّہ کاٹ کر کھا لو تو نہ تو مجبور آدمی کو اور نہ ہی کسی دوسرے کو اس کی اجازت ہے جس طرح کہ مجبور آدمی کو اپنے جسم کا کوئی حصّہ کاٹ کر کھانے کی اجازت نہیں ہے۔ ایسی ہی بات قاضی خان کے فتاوٰی میں تحریر ہے۔" (فتاوٰی عالمگیریہ' باب الحظر والاباحۃ' جلد پنجم' صفحہ ۳۱۰)

لہٰذا اس معاملہ میں چاروں اماموں اور تمام اقوام کے فقہاء کا اجماع ہے۔" ("Islam on Grafting & Transplanting of Human Organs"... Maulana Mufti Muhammad Shafi (Eng. Trans.) pp. 45-56)

(دستخط مولانا محمد شفیع بشمول دستخط چھ دیگر علمائے دین)

حیاتین (Vitamins): حیاتین مخلوط نامیاتی مرکبات ہوتے ہیں جن کی جانداروں کو بہت کم مقدار میں ضرورت ہوتی ہے۔ بطور ذریعہِ توانائی اُن کی کوئی قدر نہیں لیکن ہمارے جسموں کے لئے وہ بہت اہم ہیں۔ ہماری غذا میں اُن کی عدم موجودگی کا نتیجہ سنگین طبی بگاڑ ہوتا ہے۔ بہت سے حیاتین کا نام حروفِ تہجی کے استعمال سے رکھا گیا ہے کیونکہ اُن کی اوّل دریافت پر اُن کی کیمیائی فطرت معلوم نہ تھی۔ اب ہم اُن کی کیمیائی خوبیوں کو بخوبی جانتے ہیں۔ چند منتخب حیاتین کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:

گروہ بندی: حیاتین "اے": قدرتی طور پر یہ حیاتین دودھ' مچھلی کے جگر کے تیل' گاجروں' میٹھے آلوؤں' کدّو' ساگ' ٹماٹروں' کیلوں' آڑوؤں' آلوچہ اور کچھ سبز نباتاتی پیداوار میں پایا جاتا ہے۔ ہمارے جسموں میں اس حیاتین کی خاصی مقدار میں عدم موجودگی کا نتیجہ جِلد کے خشک ہونے اور شب کوری (Night Blindness) میں نکلتا ہے۔

حیاتین "ب": یہ کئی مختلف وٹامنز کا مجموعہ ہے جیسے B_1; B_2, B_3, B_6, B_{12} وغیرہ۔ ہماری بڑی آنت میں موجود کچھ بیکٹیریا بھی B-Vitamins کی ایک قسم بناتے ہیں۔ جب ہم کوئی جراثیم کش دوا (Antibiotic) لیتے ہیں تو ہمیں وٹامن بی' مخلوط گولیوں یا سیرپ لینے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ اس کی

وجہ یہ ہے کہ جراثیم کش ادویات نہ صرف ضرر رساں بیکٹیریا کی نشوونما کو روک دیتے ہیں بلکہ اُن کی نشوونما کو بھی روکتے ہیں جو وٹامن بناتے ہیں۔

وٹامن B1 (Thiamine): اس وٹامن کی کمی سے اعصاب کا ورم (Beriberi) پیدا ہوتا ہے جس سے اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں۔ (i) گوشت، مچھلی، انڈوں اور دودھ کے استعمال سے اس وٹامن کی کمی کو دُور کیا جا سکتا ہے۔ (ii) خوردنی اناج، غلّہ، دالوں، تیل کے بیجوں اور گری دار میوے سے کمی دُور کی جا سکتی ہے۔

نوٹ: (۱) تازہ مچھلی کے خواص: اس کا گوشت ٹھوس، بندھا تھما ہوا اور چھونے سے لچکدار ہوتا ہے۔ (۲) اگر نشیب و فراز کے بغیر (چپٹا) اُسے ہاتھوں پر لیا جائے تو اُس کی دُم جھکتی نہیں ہے۔ (۳) گوشت نرم اور پھپھسا نہیں ہوتا۔ (۴) اس کی آنکھیں صاف اور روشن ہوتی ہیں اور مدّھم، غبار آلود، زرد اور بدرنگ یا بدنما نہیں ہوتیں۔ (۵) اُس کی جلد ٹھوس، بندھی تھمی ہوئی ہوتی ہے اور جلد کا چھلکا بہ آسانی اس سے علیحدہ نہیں ہوتا۔ (۶) مچھلی کے پکڑے جانے کے فوراً بعد اس کے پیشاب کی راہ (Urea) سمیت اُسے کاٹ دینا چاہیے۔ (۷) اگر مچھلی گل جائے تو اُس کا جسم ڈھیلا اور جھریاں دار ہو جاتا ہے اور اس کا خون نہایت دل آزار بدبو کے ساتھ سست رو سرخ سیال کی طرح باہر نکل جاتا ہے۔

وٹامن B2 (Riboflavin): اگر ہمارے جسموں میں اس وٹامن کی مناسب مقدار موجود نہ ہو تو اس سے شکستہ ہونٹوں، زبان کے پھٹنے کی شکایت ہو جاتی ہے۔ قدرتی نشوونما پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے۔ اس وٹامن کی کمی کو دودھ، انڈوں، جگر، گردوں اور سبزیات سے دُور کیا جا سکتا ہے۔

وٹامن B3 (Niacin): جگر، گردوں، گوشت، گھریلو پَر دار جانوروں (Poultry)، مچھلی، پھل دار پودوں کی پھلی (Legumes) اور گری دار میووں سے اس کی کمی کو دُور کیا جا سکتا ہے۔

وٹامن B6 (Pyridoxine): اعصابی نظام کے خلل پذیر ہونے میں یہ وٹامن اہم ہے، اور دودھ، جگر، گوشت، انڈے کی زردی، مچھلی، خوردنی اناج، پھل دار پودوں کی پھلی (Legumes) اور سبزیات سے اس کی کمی کو دُور کیا جا سکتا ہے۔

وٹامن B12 (Cyanocobalmin): اس وٹامن کی کمی سے سرخ خون کے خلیوں میں خِلقی بگاڑ (Malformation) پیدا ہوتا ہے۔ جسے دُور کرنے میں یہ حیاتین اہم ہے۔

وٹامن C (Ascorbic Acid): لیموں اور سنگترہ جیسے ترش پھلوں میں یہ حیاتین موجود ہوتا ہے۔ اس کا کیمیاوی نام (Ascorbic Acid) ہے۔ وٹامن C ہماری جلد کو صحتمند رکھتا ہے اور زخموں کو جلد مندمل کرتا ہے۔ وٹامن C کی انتہائی کمی مسوڑھوں سے خون نکلنے (Scurvy) کا باعث بنتی ہے۔

تازہ پھلوں' اُن پتے دار سبزیوں سے اس وٹامن کی کمی دور ہوسکتی ہے جن کے متعلق قرآن فرماتا ہے:

(۱) وَهُوَالَّذِیْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَ مِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْا اِلٰی ثَمَرِهٖ اِذَا اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ (الانعام: ۹۹)

''اور وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا' پھر ہم نے اُس کے ذریعہ سے ہر قسم کی روئیدگی نکالی' پھر ہم نے اُس سے سبز شاخ نکالی کہ ہم اُس سے تہہ بہ تہہ دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے درختوں سے یعنی اُن کے گچھوں سے نیچے کو لٹکے ہوئے خوشے (نکلتے ہیں) اور ہم نے انگور' زیتون اور انار کے باغ پیدا کئے باہم مشابہ اور غیر مشابہ۔ اُس کے پھل کو دیکھو جب وہ پھلتا ہے اور اُس کے پکنے کو (دیکھو)۔''

(۲) فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ یَّعْدِلُوْنَ O (اَلنَّمل: ۶۰)

''پھر ہم نے اُس (پانی) سے بارونق اور خوشنما باغات اُگائے' تمہارے لئے ممکن نہ تھا کہ تم اُن (باغات) کے درخت اُگا سکتے۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی (اور بھی) معبود ہے؟ بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو (راہِ حق سے) پرے ہٹ رہے ہیں۔'' (۲۷ : ۶۰)

وٹامن D: مضبوط ہڈیوں کی نشوونما کے لئے اِس وٹامن کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ وٹامن کیلشیم کو جذب کرنے میں معاون ہے جو ہڈیوں کو سخت کرتا ہے۔ بچوں میں اس وٹامن کی کمی سے اُن کی ٹانگیں ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔ کنوں اور سنگترہ کے استعمال اور سورج کی روشنی (ورائے بنفشی Ultraviolet Rays) کے ذریعے اس کی کمی دُور ہوسکتی ہے۔ انہی Ultraviolet Rays کا ذکر سورہ یونس کی آیت پنجم کی ابتداء میں آیا ہے۔

نیز اس وٹامن کی کمی کو دُور کرنے میں جگر' انڈے کی زردی' مکھن' پنیر' مچھلی کے جگر کا تیل' دودھ اور شیر خوار بچوں کی غذائیں بھی مفید ہیں۔

وٹامن E : اس وٹامن کی کمی کچھ جانوروں میں بانجھ پن (Sterility) کا سبب بنتی ہے۔

انڈے کی زردی، مکھن، ویجیٹیبل آئل، کاٹن سیڈ، سورج مکھی کے بیجوں، دالوں، خوردنی اناج اور پتے دار سبزیوں کے استعمال سے اس وٹامن کی کمی دُور ہو سکتی ہے۔

وٹامن K_1 اور K_2 : خون کو گاڑھا کرنے میں یہ وٹامنز مفید اور معاون ہیں۔

تازہ سبزیوں، پھلوں اور جگر کے استعمال کے ذریعے یہ وٹامن حاصل ہو سکتے ہیں۔

معدنی نمکیات (Minerals) : جانوروں کو بھی اپنی خوراک میں کچھ غیر نامیاتی مرکبات کی ضرورت ہوتی ہے جنہیں ہم ''معدنی نمکیات'' کہتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن اور سلفر ہیں۔

''معدنی نمکیات کے فوائد: (۱) جسم کے افعال کو باقاعدگی سے چلانے میں مدد دیتے ہیں اور جسم میں تعمیری کام بھی انجام دیتے ہیں۔ (۲) کیلشیم اور فاسفورس خاص طور سے ہڈیوں اور دانتوں کی نشوونما اور بناوٹ کرتے ہیں۔ (۳) آئرن بالخصوص خون بننے کے لئے ضروری ہے۔ (۴) خون کو معمول کے مطابق منجمد ہونے میں مدد دیتے ہیں۔''

کیلشیم (Calcium) : ہڈیوں اور دانتوں کو کیلشیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ نشوونما پانے والے بچوں کے لئے کیلشیم بہت اہم ہے۔ کیلشیم کے بڑے ذرائع دودھ، دودھ سے بنی ہوئی اشیاء، پنیر، انڈے، پھل، سبز پتوں والی سبزیاں اور بادام ہیں۔

''کیلشیم کے فوائد : (۱) ہڈیوں اور دانتوں کی نشوونما اور اُنہیں درست حالت میں رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ (۲) خون کو منجمد کرنے کے کام آتا ہے اور جسم کے بعض اعمال کو درست رکھتا ہے۔''

''کیلشیم کی کمی کے اثرات : مناسب طور پر وٹامن ڈی کے ہضم اور جذب نہ ہونے سے کیلشیم کی کمی کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور اس سے رکٹس (Rickets) کی بیماری ہو جاتی ہے۔

''فاسفورس (Phosphorus): یہ جسم کی مناسب نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ اس کے مرکبات

انسانی جسم میں ہڈیوں' دماغ اور اعصاب میں پائے جاتے ہیں۔ یہ دودھ' انڈے کی زردی' مچھلی' مٹر' پھلیوں' سویابین' گوشت اور میٹھی چیزوں میں پایا جاتا ہے۔''

''فاسفورس کے فوائد : (۱) غذائی اجزاء کے انجذاب (Absorption) میں مدد دیتا ہے۔ (۲) پٹھوں اور جوڑوں کی مناسب حرکت کے لئے ضروری ہے۔ (۳) ہڈیوں اور دانتوں کی مناسب نشوونما کرتا ہے۔''

''فاسفورس کی کمی کے اثرات : فاسفورس کی کمی سے کوئی بیماری لاحق نہیں ہوتی کیونکہ یہ عموماً غذاؤں میں کیلشیم یا پروٹین کے ساتھ موجود ہوتا ہے اور جسم کے اندر بھی کیلشیم کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے' لہٰذا اس کی کمی کے اثرات بھی کیلشیم کی کمی کے اثرات سے ملتے جلتے ہیں۔''

آئرن (Iron): یہ گوشت' سبزیوں' پھلوں' انڈوں' خشک پھلوں' کلیجی اور اناج سے بنی ہوئی چیزوں میں پایا جاتا ہے۔''

''آئرن کے فوائد: (۱) جسم میں آکسیجن پہنچانے کا کام کرتا ہے۔ (۲) ہیموگلوبن (Haemoglobin) (حُمرۃ الدّم) ☆ کا جزو بن کر خون بناتا ہے۔''

''آئرن کی کمی کے اثرات: خوراک میں اس کی کمی سے خون کی پیداوار کم ہو جاتی ہے اور انسان قلتِ خون (Anaemia) کا شکار ہو جاتا ہے جس سے انسان کمزور ہو جاتا ہے' سر چکرانے لگتا ہے اور وزن کم ہو جاتا ہے۔''

دانتوں کے گلنے اور خراب ہونے سے بچانے میں Flouride نبرد آزما ہوتا ہے۔ آیوڈین غدّہ درقیہ (Thyroid Hormone) کا جزء ہے اور ہماری غذا میں اس کی عدم موجودگی ہارمون ☆☆ کی کمی کا باعث بنتی ہے۔ سمندری غذائیں آیوڈین سے مالا مال ہوتی ہیں۔

روزمرّہ غذا میں معدنی نمکیات کے استعمال کی تجویز

قوّت بخش غذا	روزانہ کی مقدار
کیلشیم	0.8-1.2 g
فلورائیڈ	0.0015-0.004 g
آیوڈین	150 g

☆ یہ فقاری یا ظہری حیوانات کے خون کے سرخ ذرّات میں پایا جانے والا آکسیجن کا حامل مادہ ہے جس میں آئرن شامل ہوتا ہے۔

☆☆ اعتدال پیدا کرنے والا مادّہ جو کسی عضو میں پیدا ہوتا اور خون یا رطوبت کے ذریعے سرایت کر کے خلیوں کو فعّال بناتا ہے۔

۴۰۳۱ (میڈیکل سائنس)

قوّت بخش غذا	روزانہ کی مقدار
فاسفورس	0.8-12 g
پوٹاشیم	1.9-5.6 g
سوڈیم	1.1-3.3 g
آئرن (فولاد)	0.0100-0.0155 g

پانی (WATER): پانی مادّۂ حیات (Cytoplasm) کا جزوِ لاینفک ہے یعنی یہ غذا کا ایسا جزو ہے جس کی ہمارے جسم کو زیادہ مقدار میں ضرورت ہوتی ہے۔ ایک بالغ آدمی کو روزانہ تقریباً آٹھ سے دس گلاس پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کھانے کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ پانی پینا ہاضمہ کے لئے مضر ہوتا ہے البتہ کھانا کھانے کے کچھ دیر بعد پانی پینے میں کوئی حرج نہیں۔ چونکہ پسینے' پیشاب اور سانس کے ذریعے پانی خاصی مقدار میں ضائع ہو جاتا ہے' اس لئے خوراک (غذا) کے ساتھ پانی کا پینا ضروری ہوتا ہے۔ جانداروں اور نباتات کے لئے پانی قدرت کا ایک انمول عطیہ ہے جس کی اہمیت کے متعلق قرآنِ حکیم فرماتا ہے:

وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ كُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ (الانبیاء : ۳۰)

''اور ہم نے ہر زندہ چیز پانی سے پیدا فرمائی۔'' (۳۰ : ۲۱)

نوٹ: اس کی تفصیل وتوضیح انسائیکلوپیڈیا ہٰذا کی جلد دوم کے صفحات ۵۵۶' ۸۲۵ پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

''**پانی کے فوائد**: (۱) جسم کے درجہ حرارت کو برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ (۲) ہاضمہ میں اور ہضم شدہ غذا کو تحلیل کرنے اور جزوِ بدن بننے میں مدد دیتا ہے۔ (۳) جسم کے فاضل مادّوں کو خارج کرنے میں مدد دیتا ہے۔ (۴) جوڑوں اور پٹھوں کو نرم رکھتا ہے۔''

''**پانی کی کمی کے اثرات** : (۱) جسم میں پانی کی کمی سے غذا تحلیل نہیں ہوتی اور فاضل مادّوں کا اخراج صحیح طور پر نہیں ہوتا جس کی وجہ سے بے چینی اور الجھن پیدا ہو سکتی ہے۔ (۲) پانی کی کمی سے خلیات میں تراوٹ کم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے پٹھوں میں کھچاؤ محسوس ہوتا ہے۔'' (''مبادیاتِ ہوم اکنامکس'' برائے جماعت نہم' دہم -- پنجاب ٹیکسٹ بورڈ لاہور' صفحات ۱۱۶ تا ۱۲۸)

''**طعام اور مشروبات کا ماہرانہ ذوق یا فن** (Gastronomy): اشرف المخلوقات ہونے کے حوالے سے اکثر انسانوں نے ہر شعبۂ حیات میں اعلیٰ درجے کی نفاست ولطافت' عمدگی اور ذوقِ جمالیات کو ملحوظ رکھا ہے۔ زندگی کی مقدم ترین ضرورت اور حیات آفریں ہونے کے لحاظ سے غذا نے انسان کی خصوصی توجہ کو صفاتی لذت اور

حظ اندوزی (Qualitative Sumptuousness) کی طرف مبذول کیا ہے۔اور رزّاقِ عالم نے بڑی فیاضی سے انسان کے اس حسنِ ذوق کی تسکین کی ہے تاکہ وہ اپنے خالق و رازق کا شکر گزار بندہ بن کر رہے جس کا مطالبہ قرآن مجید نے کئی مقامات پر کیا ہے مثلاً فرمایا:

(۱) وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ O (الاعراف:۱۰)

''اور بالیقین ہم نے تمہیں زمین پر رہنے کو جگہ دی اور ہم نے تمہارے لئے اس میں سامانِ زندگی پیدا کیا، تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔'' (۷ : ۱۰)

(۲) اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ O (یٰس:۳۵)

''تو کیا یہ لوگ شکر گزار نہیں ہوتے؟'' (۳۶ : ۳۵)

اور ادائے شکر کا پہلا زینہ توحید ہے۔ادائے شکر کے معنیٰ ادائے حقوق کے ہیں یعنی جس نعمت کے برتنے کے جو حقوق شریعتِ الٰہی نے بتائے ہیں، اُنہیں برتنا ادائے شکر ہے۔زمین پر سکھ چین کے ساتھ رہنے سہنے کی جگہ ملنا، سامانِ معیشت بہ افراط ملنا بالخصوص شکر کے محرکات ہیں۔

''اطمینان بخش غذا اور اس کے عناصر : جذباتی اور جسمانی بہتری کے لئے اطمینان بخش غذا کا ہونا لازمی امر ہے۔جسم کے ریشہ جات لحمی (Tissues) کی تعمیر و مرمت میں جسم کو مطلوبہ مواد مہیا ہوتا رہے تو جسم توانا اور صحتمند رہتا ہے۔غذا سے مکمل طور پر مستفید ہونے کے لئے متوازن غذا کا ہونا ضروری ہے۔''

''متوازن غذا کی اصطلاح سے مراد وہ غذا ہے جس میں وہ تمام غذائی اجزاء پائے جاتے ہوں جن سے انسان کی صحت برقرار رہے، جسم میں بیماریوں کے خلاف قوّتِ مدافعت پیدا ہو اور انسان صحتمندی اور تندرستی سے اپنے روزمرّہ کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکے۔اگر غذا میں ان اجزاء کا تناسب صحیح نہ ہو تو ایسی غذا کو ہم غیر متوازن غذا کہیں گے۔غیر متوازن غذا سے جسم کی تمام ضروریات پوری نہ ہونے کی وجہ سے انسان کمزور ہو کر بہ آسانی مختلف اَمراض کا شکار ہو جاتا ہے۔غذا کے غیر متوازن ہونے سے وزن کی کمی، بھوک نہ لگنا، خراب دانت، بینائی میں کمزوری جیسے امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔اس لئے صحت کو برقرار رکھنے کے لئے متوازن غذا نہایت ضروری ہے۔''

متوازن غذا کے عناصر کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) کاربوہائیڈریٹس، پروٹین اور چکنائیاں جو جسم کو قوّت و توانائی مہیا کرتے ہیں۔

(۲) وٹامن جو جسم کے ضابط (ریگولیٹر) کا کام کرتے ہیں، جسم کی نشوونما کو ترقی دیتے ہیں اور بیماریوں کے خلاف تحفظ فراہم کرتے ہیں۔اسی حصّے میں وہ معدنیات بھی شامل ہیں جو سخت اور نرم ریشہ جاتِ لحمی اور جسم کے مائعات کی تشکیل کے لئے لازمی ہیں اور جسمانی عوامل کو باقاعدہ رکھنے میں مددگار ہیں۔جسمانی عوامل

کو قاعدے کے تحت چلانے میں پانی بھی بہت اہم ہے۔

انسانی غذا اور قدرت وحکمتِ الٰہی: سورہ عَبَس کی آیت ۲۴ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا :

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ (عبس : ۲۴)

یعنی ''انسان اپنے طعام وغذا کی طرف ذرا غور تو کرے۔'' (۲۴ : ۸۰)

اس مختصر سے جملے میں جہاں ایک طرف نباتات' حیاتیات اور ان سے متعلق کل علوم کی حقیقتوں کو سمو دیا گیا ہے کہ حضرتِ انسان کی غذا کی تیاری کے لئے ہم نے کیسے کیسے انتظامات کیے ہیں اور اپنی قدرت کی بڑی بڑی قوّتوں کو کس طرح کام میں لگا رکھا ہے' تو دوسری طرف حضرتِ انسان کے جذبہ تحقیق وتجسّس کو بھی مہمیز لگائی گئی ہے کہ انسانی غذا میں وہ کون سے رازہائے سربستہ ہیں جن کی طرف رُشد وہدایت کی یہ آخری کتاب ہماری توجہ کو مبذول کرا رہی ہے۔ آیئے دیکھیں اور اس سے حاصل ہونے والی تحقیق کو اپنے ایمان وایقان کی تازگی اور تابندگی کا سامان بنائیں :

''(A) **قوّت وتوانائی اور حرارت بخشنے والی غذائیں** : غذا کا سب سے پہلا اور اہم کام جسم کو قوّت وتوانائی اور حرارت مہیا کرنا ہے۔ انسان جو بھی کام کرتا ہے اُس کی ہر حرکت سے اُس کے جسم کی توانائی صَرف ہوتی ہے جسے متوازن غذا کھا کر پورا کیا جاتا ہے۔ جسم کو اگر مناسب مقدار میں توانائی مہیا نہ ہو تو وہ کمزور ہونے لگتا ہے اور کام پوری سرگرمی یا قوّت سے نہیں ہو پاتا۔ اس توانائی کو ماپنے کی بنیادی اکائی کو ''حرارہ'' کہتے ہیں۔ حرارہ توانائی کی وہ مقدار ہے جو ایک گرام پانی کا درجہ حرارت ایک سنٹی گریڈ تک بڑھا دے۔''

''ہر انسان کو حراروں کی الگ الگ مقدار میں ضرورت ہوتی ہے۔ مزدوروں' کسانوں' جسمانی محنت و مشقت یا ورزش کرنے والوں کو زیادہ حراروں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جو لوگ دفتروں میں یا گھروں میں بیٹھ کر کام کرتے ہیں اور زیادہ جسمانی مشقت یا چلنے پھرنے کا کام نہیں کرتے' اُنہیں اتنے حراروں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بچے جو ہر وقت بھاگتے' دوڑتے اور اُچھلتے کودتے رہتے ہیں' اُنہیں زیادہ غذائی حراروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جسم کو قوّت وتوانائی اور حرارت بخشنے والی غذائیں مندرجہ ذیل ہیں:۔

''(1) **کاربوہائیڈریٹس (Carbohydrates)** : یہ غذا کا سب سے اہم جزو ہیں اور جسم کو توانائی فراہم کرنے کا سب سے سستا ذریعہ ہیں۔ ایک گرام کاربوہائیڈریٹ غذا سے چار حرارے حاصل ہوتے ہیں۔ انسانی جسم کو اگر بقدرِ ضرورت کاربوہائیڈریٹ والی غذاؤں کی مقدار نہ ملے تو جسم اپنے اندر موجود پروٹین سے توانائی حاصل کرنا شروع کر دیتا ہے۔''

''**کاربوہائیڈریٹس کے ذرائع**: گیہوں' چاول' مکئی' باجرہ' جوار وغیرہ کاربوہائیڈریٹ کے اہم

ذرائع ہیں۔ آلو، شکر قندی، شکر، چینی، گڑ، مٹھائی، کھجور، خشک میوہ جات میں اس کی کافی مقدار ہوتی ہے۔ دودھ، دہی اور پھل بھی اس کے اچھے ذرائع ہیں۔"

"کاربوہائیڈریٹس کے فوائد: (۱) یہ جسم کو حرارت اور توانائی مہیا کرتے ہیں۔ (۲) غذا میں شیرینی پیدا کر کے اُسے لذیذ اور خوش ذائقہ بناتے ہیں۔ (۳) کاربوہائیڈریٹس سے کچھ پروٹین بھی حاصل ہوتے ہیں۔"

"چکنائیاں (Fats): یہ ہماری غذا میں کافی اہمیت کی حامل ہیں۔ بعض ایسے وٹامن جو چکنائی میں حل ہو جاتے ہیں، چکنائیاں اُنہیں جسم کے مختلف حصّوں تک پہنچانے میں مدد دیتی ہیں۔ غذا میں موجود تمام چکنائی یا تو ہضم ہو کر جسم کا حصّہ بن جاتی ہے یا جسم سے خارج ہو جاتی ہے۔ چکنائی والے کھانے اُبلے ہوئے کھانوں کے مقابلے میں دیر سے ہضم ہوتے ہیں اور انسان کو بھوک دیر سے لگتی ہے۔ چکنائی میں کاربن، ہائیڈروجن اور آکسیجن موجود ہوتے ہیں۔"

"چکنائی حاصل کرنے کے ذرائع: چکنائی حیواناتی اور نباتاتی ذرائع سے حاصل ہوتی ہے: (۱) حیواناتی ذرائع میں دودھ، مکھن، انڈے کی زردی، مچھلی کا تیل، جانوروں کی چربی وغیرہ شامل ہیں۔ (۲) نباتاتی ذرائع میں مونگ پھلی، سورج مکھی، زیتون، سرسوں، تل، بنولے وغیرہ کا تیل، بادام، پستہ، اخروٹ، ناریل اور مکئی وغیرہ شامل ہیں۔

"چکنائی کی روزمرہ ضرورت: سرد علاقوں کے رہنے والوں کو زیادہ چکنائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ زیادہ محنت و مشقت کرنے والوں کو روزانہ پچاس سے ساٹھ گرام چکنائی استعمال کرنی چاہئے۔ چونکہ چکنائی کی تھوڑی مقدار سے زیادہ حرارے ملتے ہیں اس لئے موٹے آدمیوں کو اس کا استعمال کم کرنا چاہئے۔"

"چکنائی کے فوائد: (۱) یہ جسم کے لئے ایندھن مہیا کرتی ہے۔ (۲) جلد اور بالوں کے لئے ضروری اجزاء مہیا کرتی ہے۔ (۳) اس سے عملِ انہضام میں مدد ملتی ہے اور جسم کے اہم اجزاء بھی محفوظ رہتے ہیں۔ (۴) یہ پروٹین کے غیر ضروری استعمال کو روکتی ہے۔ (۵) اس سے کچھ وٹامن بھی حاصل ہوتے ہیں۔"

"(B) جسم کی نشوونما اور مرمت کرنے والی غذائیں: حسبِ ذیل ہیں:

"(1) پروٹین (Protein): ہمارے جسم کا سب سے زیادہ حصّہ پروٹین پر مشتمل ہے۔ گوشت پوست، رگ ریشے اور خون میں ہر جگہ پروٹین موجود ہوتی ہے۔ ہمارے جسم کی مشین لگاتار حرکت اور کام کرتی رہتی ہے جس سے خلیوں کی ٹوٹ پھوٹ ہوتی رہتی ہے مثلاً دل کی حرکت، سانس لینا، گردشِ خون، اعصابی نظام اور خوراک کا ہضم ہونا وغیرہ جس کے لئے معدہ، انتڑیاں، جگر، گردے اور دیگر اعضاء ہر لمحہ کام کرتے رہتے ہیں۔ ان حرکات سے خلیوں کی

جوٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے' اُس کی مرمت کے لئے پروٹین کی ضرورت ہوتی ہے۔ پروٹین کاربن' ہائیڈروجن' آکسیجن اور نائٹروجن پر مشتمل ایک لیس دار مادے میں موجود ہوتی ہے اور ہم جو پروٹین خوراک سے حاصل کرتے ہیں' وہ ہضم ہونے کے دوران امینوترشوں میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ ہماری خوراک میں آٹھ امینوترشوں کا ہونا ضروری ہے کیونکہ یہ ترشے ہمارا جسم پیدا نہیں کرسکتا۔ جن غذاؤں میں یہ آٹھ ترشے پائے جاتے ہیں' اُنہیں مکمل پروٹین کہا جاتا ہے۔''

''پروٹین کے ذرائع : یہ حیواناتی اور نباتاتی ذرائع سے حاصل ہوتی ہے :۔ (۱) حیواناتی ذرائع میں گوشت' انڈے' دودھ' مرغی' مچھلی' دہی' پنیر وغیرہ ہیں۔ (۲) نباتاتی ذرائع میں اناج اور بیج ہیں مثلاً گیہوں' مٹر' دالیں' چاول' پھلیاں وغیرہ۔ مونگ پھلی میں بھی کچھ پروٹین ہوتی ہے۔

''پروٹین کی روزمرّہ ضرورت : ہماری روزمرہ خوراک میں پروٹین کی مطلوبہ مقدار کا انحصار انسان کے قدو قامت' عمر' وزن' جنس' مشاغل اور پروٹین کی قسم پر ہوتا ہے۔ ہماری غذا کا تقریباً ۲۰ فیصد حصّہ پروٹین پر مشتمل ہونا چاہئے۔''

''پروٹین کے فوائد : (۱) ان کا بنیادی مقصد جسم کی نشوونما اور تعمیر کرنا ہے۔ (۲) انسانی جسم کے خلیے' بافتیں' شریانیں اور عضلات جو مسلسل عمل کے نتیجے میں ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں' اُن کی مرمت کے لئے پروٹین نہایت اہم ہیں۔ (۳) پروٹین حرارت اور توانائی بھی مہیا کرتے ہیں۔ (۴) خون میں پروٹین کی مناسب مقدار موجود ہونے سے جسم کے بہت سے اعمال درست رہتے ہیں۔ (۵) بچوں کی دماغی اور جسمانی نشوونما کے لئے پروٹین بے حد ضروری ہے۔ بیماری سے بچاؤ اور جلد صحت یابی کے لئے بھی اہم ہے۔''

''پروٹین کی کمی کے اثرات : (۱) غذا میں پروٹین کی کمی سے بڑھتے ہوئے بچے خصوصاً پیدائش سے پانچ سال تک کی عمر کے بچے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے بچوں کا قدوقامت مناسب طور پر نہیں بڑھتا اور دماغی صلاحیتیں بھی پوری طرح اجاگر نہیں ہو پاتیں۔ (۲) اگر غذا میں پروٹین کی کمی کو بروقت پورا نہ کیا جائے تو یہ کمی بیماری کی شکل اختیار کرلیتی ہے جسے ''کواشیرکور'' کہتے ہیں۔ اس بیماری میں قد پست رہ جاتا ہے اور بچہ ذہنی صلاحیتوں میں اپنے ہم عمر بچوں سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ اس بیماری میں بال خشک اور کمزور رہ جاتے ہیں۔ (۳) پروٹین کی کمی سے ایک صحتمند انسان بھی متاثر ہوسکتا ہے کیونکہ اس کی کمی سے قوّتِ مدافعت (Resistance Power) کم ہوجاتی ہے۔''

(C) ''قوّتِ مدافعت (Resistance Power) پیدا کرنے والی غذائیں:

وٹامنز (Vitamins)' معدنی نمکیات' کیلشیم' فاسفورس وغیرہ۔ ان کی تفصیل گزشتہ صفحات میں دی جاچکی ہے۔

"**مطعومات اور مفکوہات**: فقہائے کرام کے نزدیک ماکولات اشیاء کی دو قسمیں ہیں: (۱) مطعومات اور (۲) مفکوہات۔ یعنی غذا اور میوہ جات۔ البتہ اس بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ کون سی چیزیں طعام و خوراک ہیں اور کون کون سی فواکہ (فروٹ) ہیں۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو چیزیں غذائیت حاصل کرنے کے لئے کھائی جائیں اور پیٹ بھر جائے لیکن دل نہ بھرے، وہ طعام ہے۔ اور ہر وہ چیز جو فقط لذّت و قوت حاصل کرنے کے لئے کھائی جائے اور دل تو بھر جائے لیکن پیٹ نہ بھرے، وہ فواکہ ہے۔ اس کلیہ سے سیب، تربوز، خربوزہ، ناشپاتی، کیلا، سنگترہ، مالٹا اور آم وغیرہ فواکہ ہیں اور کھجور، چھوہارہ، منقہ، کشمش اور تمام خشک میوے و مغزیات مثلاً پستہ، بادام، ناریل، اخروٹ، چلغوزہ وغیرہ سب مطعومات ہیں۔" (تفسیر نعیمی، ج ۱۸، ص ۱۰۴)

زیتون اور احادیثِ نبویہ: احادیثِ مقدسہ میں زیتون کا بہت ذکر آیا ہے مثلاً یہ احادیث ملاحظہ ہوں:

(۱) عَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَ قَالَ: اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ نَّتَدَاوٰى مِنْ ذَاتِ الْجَنْبِ بِالْقِسْطِ الْبَحْرِيِّ. وَالزَّيْتِ (ترمذی: باب الطّب)

"زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم فرمایا کہ نمونیے یا تپ دق میں قسطِ بحری اور زیتون سے علاج کیا کرو۔"

(۲) قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: كُلُوا الزَّيْتَ وَادَّهِنُوْا بِهٖ فَاِنَّ فِيْهِ شِفَاءٌ "مِّنْ سَبْعِيْنَ دَاءٍ مِّنْهَا الْجُذَامُ"

"نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: زیتون کھاؤ بھی اور لگاؤ بھی کیونکہ اس میں ستر بیماریوں کی شفا ہے، اُن میں سے ایک بیماری جذام (کوڑھ Leprosy) ہے۔" (مسند ابو نعیم)

(۳) عَنْ عُمَرَ ابْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: كُلُوا الزَّيْتَ وَادَّهِنُوْا بِهٖ فَاِنَّهٗ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ (سنن ابن ماجہ: رقم الحدیث: ۳۳۲۰؛ سنن ترمذی: ۱۸۵۱)

"فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زیتون کا پھل کھاؤ اور اُس کا تیل لگایا کرو کیونکہ وہ شجرہ مبارکہ ہے۔"

نوٹ: تفسیر نعیمی (طبع لاہور ۲۰۰۳ء) کی جلد ۱۸ کے صفحات ۹۹ اور ۱۰۰ پر زیتون کے چالیس اثرات اور زیتون سے علاج کے تیس فوائد کو بیان کیا گیا ہے جنہیں بہ خوفِ طوالت یہاں نہیں دیا جا رہا۔

طبّی تغافل : ''اگرچہ طبّی پیشے میں مریضوں کی اعلیٰ درجے کی نگہداشت کی توقع کی جاتی ہے تاہم کچھ عوامل ایسے ہیں جن میں عدالت کی جانب سے طبّی تغافل (Medical Negligence) کا شدید نظریہ لینا ناپسندیدہ ہے۔''

''عام اصول یہ ہے کہ ایک ڈاکٹر یا ایک طبّی پیشہ ور کو اپنے ہم عصر' اہل اور معقول معالجین کے معیارِ نگہداشت کے مطابق دیکھ بھال کرنی چاہئے لیکن کسی بھی اتفاقی یا حادثاتی پھسلن کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ کے مطابق چونکہ طبّی مشورہ اور طبّی علاج ناگزیر ہیں' اس لئے یہ بات عوام کے مفاد میں نہیں کہ وہ طبّی معالجین کے خلاف نالش کریں کیونکہ یہ بات طبّی پیشہ وروں کی اخلاقی اقدار کی تذلیل کا سبب بنے گی۔ طبّی پیشہ وران کو اپنے کام کی تحریک دلانا اخلاقی فرض کے ساتھ ساتھ سماجی تقاضا بھی ہے تاکہ وہ آزادانہ رضامندی سے اور پہل کرنے کی صلاحیت سے کام کریں۔ مقدمہ بازی کی کثرت اُنہیں ہراساں اور پریشان کردے گی جو عوام کی مشکلات کا باعث بنے گی۔''

امام شافعی کے نزدیک طبّی لوگوں کی عدمِ جوابدہی کی وجوہ دو طرح کی ہیں : (۱) کہ معالج مریض کی مرضی کے مطابق کام کرے (۲) معالج کا کام مریض کو آرام پہنچانا ہوتا ہے نہ کہ اُسے ضرر پہنچانا۔

''اس لئے نظریاتی لحاظ سے معالجین کے خلاف طبّی تغافل کے باعث نالش نہیں ہوسکتی بشرطیکہ وہ طبّی پیشہ کے مروّجہ اور متعارف معیار کے مطابق کام کریں۔ یہی نظریہ امام احمد بن حنبل کا ہے۔ امام مالک کے نزدیک ڈاکٹر اس لئے جوابدہ نہیں ہوسکتا کہ اُسے حکومت کی طرف سے ڈاکٹری کی پریکٹس کرنے کا لائسنس ملا ہوا ہے بشرطیکہ وہ ماہرینِ طب کی طرح کام کرے۔ ڈاکٹر کے لئے یہ بات بھی ضروری ہے کہ وہ کوئی طبّی علاج تجویز کرنے سے پہلے مریض کی اجازت اور اس کی رضامندی حاصل کرے۔ اگر تو مریض اُس ڈاکٹر سے علاج کرانا چاہتا ہے تو اس کا بظاہر مطلب یہی ہے کہ اُسے اپنے منتخب شدہ ڈاکٹر پر مکمل اعتماد اور یقین ہے لیکن ڈاکٹر کو کسی بھی صورت میں غفلت سے کام نہیں لینا چاہئے ورنہ وہ جوابدہ ہوگا۔''

''الھدایۃ کا بیان ملاحظہ ہو :۔

''اگر کوئی ڈاکٹر جسم کے کسی روایتی حصّے کا بطورِ علاج ورید پر نشتر لگانے کا عمل (Phlebotomy) یعنی آپریشن کرتا (فصد کھولتا) ہے تو اس آپریشن کے نتیجہ میں مریض کی موت کا وہ ذمّہ دار نہ ہوگا۔ یہی نظریہ ''المبسوط'' میں بیان ہوا ہے۔ جس وجہ پر اس تخصیصی قانون کی بنیاد ہے' وہ یہ ہے کہ آپریٹر کے لئے نتائج کا خیال رکھنا ممکن نہیں ہے کیونکہ اُن کا انحصار مریض کی جسمانی قوّت یا اُس کی کمزوری پر ہے کہ آیا

وہ کسی بدنظمی یا درد کو برداشت کرسکتا ہے اور چونکہ یہ بات غیر معلوم ہوتی ہے' اس لئے کام کو تحفظ کی شرط کے ساتھ مشروط کرنا ممکن نہیں ہے۔'' (''الھدایۃ'' تالیف از : ہیملٹن' صفحات ۵۰۴' ۵۰۵)

اس سلسلہ میں امام نووی فرماتے ہیں :

''جو سرجن مریض کا خون نکالتا ہے یا اُسے جونک لگاتا ہے' اُس پر کوئی ذمہّ داری عائد نہیں ہوتی اگرچہ مریض فوت ہوجائے بشرطیکہ آپریٹر طبّی سائنس کی طرف سے اُس قسم کے آپریشن میں عائد کردہ حدود سے تجاوز نہ کرے۔'' (''منہاج الطالبین'' صفحات ۴۵۴' ۴۵۵)

ابنِ قدامہ نے طبّی تغافل میں قانونِ قصاص (Lex Talions) پر اس طرح بحث کی ہے :

''ایک مستند سرجن جو مریض کا خون نکالتا ہے یا اُسے جونک لگاتا ہے' نتائج کا کسی بھی طرح ذمہّ دار نہیں۔ اور وہ جلاّد جو الٰہی اختیار پر موت یا سنگساری کا پروانہ لئے آتا ہے' محض مؤخرالذکر کا آلۂ کار ہے' جب تک اُسے یہ معلوم نہ ہو کہ حکمنامہ جابر شخص کی طرف سے ہے یا یہ کہ حکمنامہ غلطی سے جاری ہوا ہے۔ اِن دوصورتوں میں قانونِ قصاص کے تحت جلاّد خود ذمہّ دار ہوگا' یہ اور بات ہے کہ وہ کسی جبر وتشدد کے تحت کام کر رہا ہو۔'' ("Islamic Law of Tort".. Dr. Liaquat Ali Khan Niazi, pp. 179, 180)

''زخمی مریض کو علاج کی خاطر سرجن کے پاس لایا گیا لیکن وہ علاج بذریعہ زہر کے نتیجہ میں فوت ہوگیا تو اس میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ اگر تو وہ زہر جس سے مریض کا علاج کیا گیا' ایسی حیثیت کا ہے کہ اس سے موت واقع ہوتی ہو تو مریض اپنی بے نصیبی کا خود ذمہّ دار ہے کیونکہ اُسے اُس کے خطرناک ہونے کا علم ہے۔ اُس کی مثال اُس شخص کی سی ہے جو پہلے ہی زخمی تھا لیکن اُس نے اپنے آپ کو قتل کردیا۔ علاوہ ازیں اُس کے زخموں کا معائنہ کیا جائے گا اور اگر یہ معلوم ہوجائے کہ مریض عام حالات میں اُن زخموں کی وجہ سے نہیں مرسکتا تھا' تو سرجن کو ذمہّ دار ٹھہرایا جائے گا جو متوفّی کے سرپرست یا اُس کے قریبی رشتہ دار کو خوں بہا (دیت) ادا کرے گا۔ اگر مذکورہ زہر عام حالات میں موت کا سبب نہیں بنتا لیکن کچھ صورتوں میں اس سے موت واقع ہوجاتی ہو جسے سرجن نے طبّی علاج کے لئے استعمال کیا ہو تو یہ چیز بھی سرجن کو مریض کے ارادتاً مارنے کے جرم سے عہدہ برآ نہیں کرے گی کیونکہ اُسے قبل از وقت دیکھ لینا چاہئے تھا کہ اس سے موت واقع ہوجاتی ہے۔ اگر یہ قصاص کی صورت نہیں ہے تو اس کے بدلے میں سرجن کو خوں بہا (دیت) دینا ہوگا۔ قصاص درج ذیل صورتوں میں واقع ہوتا ہے :۔

۴۰۳۹ (میڈیکل سائنس)

''(۱) اگر سرجن نے مریض کا آپریشن کرنے کے بعد اپنے ماتحت عملے یا جونیئر رُفقائے کار کو زخموں پر پٹی باندھنے کا فرض سونپ دیا اور مریض اُن کی غفلت کی وجہ سے مرگیا تو قانونی حیثیت اُس سرجن کے مشابہ ہے جو طبّی مقصد کی خاطر مریض کو فوری علاج کے لئے زہر کھانے کو کہتا ہے۔

''(۲) اگر تو زخموں پر کسی اور سرجن نے پہلے سرجن کی اجازت کے بغیر پٹی باندھی تو یہاں ذمّہ داری دوسرے سرجن پر عائد ہوتی ہے۔ اگر مریض کے زخموں کی سچنگ مریض کے سرپرست یا کسی قرابتدار کی رضامندی سے ہنگامی صورت میں کسی اور نے یا کسی سرکاری عملے نے فرسٹ ایڈ کے طور پر کی اور اُس سرکاری عملے کا اُس زخمی کے ساتھ کوئی رشتہ بھی نہیں ہے (اور مریض اس دوران مرجاتا ہے) تو اُن پر نہ ہی قصاص اور نہ ہی دیت واجب ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے ہنگامی صورت میں سچنگ کی ہے۔ اُن کی حیثیت اُس جان بچانے والے کی سی ہے جو حسنِ نیت سے کسی کی جان بچاتا ہے۔'' (ایضاً' صفحات ۱۷۹۔۱۸۱)

''<u>حسنِ نیت کا قرینہ</u>: حسنِ نیت کا قرینہ اور بنیاد یہ ہے کہ طب سے منسلک لوگ اپنے مریضوں کے تحفظ اور اُن کی فلاح و بہبود کی خاطر اپنے فرائض کو بہ احسن طریق اور بہ حسنِ نیت ادا کریں۔''

''درج بالا اصول کی بنیاد اخلاقی ہے۔ قرینہ یہ ہے کہ ہر میڈیکل پیشہ ور اپنے فرض کو مریض کے مفاد اور تمامی فلاح و بہبود میں ادا کرے کیونکہ انسانی زندگی بڑی ہی محترم ہے اور کوئی بھی ڈاکٹر ارادی طور پر اپنے کسی ابنِ جنس کی زندگی ضائع نہیں کرتا۔ لیکن اصول کی یہ بنیاد الٹ اور باطل بھی ہوسکتی ہے اگر ڈاکٹر کی طرف سے غفلت ثابت ہوجائے۔ اگر تو ڈاکٹر کی نیت مریض کا علاج کرنے کی بجائے اُسے نقصان پہنچانا ہو تو وہ اپنے جرم میں برابر کا ذمّہ دار ہے چاہے مریض فوت ہو یا نہ ہو۔'' (ایضاً' صفحات ۱۸۱' ۱۸۲)

''<u>سخت لاپروائی پر ذمّہ داری</u>: میڈیکل پیشہ سے منسلک افراد کو مریضوں کی دیکھ بھال میں ایسی نگہداشت کا مظاہرہ کرنا چاہئے جو معقول قسم کے اور اہل ڈاکٹروں کا معیار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر لوگ اپنے اعمال اور بھول چوک (فروگزاشتوں) کے باعث انتہائی لاپروائی کے ذمّہ دار ہوتے ہیں۔''

''ذمّہ داری ڈاکٹروں کی انتہائی لاپروائی سے پیدا ہوتی ہے۔ انتہائی لاپروائی (Gross Negligence) سے مراد ایسی لاپروائی ہے جو رائج الوقت طبّی پیشہ کی تسلیم شدہ پریکٹس کے مطابق نہ ہو۔ اُس لڑکی کے معاملہ میں ایک قیاسی صورتِ حال پیدا ہوسکتی ہے جو چھت پر سے گرنے کی وجہ سے زخمی ہوگئی ہو۔ اگر تمام سرجنوں کی رائے یہ ہو کہ اگر اُس کا آپریشن کیا جائے تو وہ سر پر چوٹ لگنے کی وجہ سے مرجائے گی لیکن ایک سرجن اُس کے سر کے کامیاب آپریشن کی ضمانت دیتا ہے۔ اس کے بعد اگر لڑکی مرجائے تو مؤخرالذکر سرجن پر غفلت کی وجہ سے نالش کی جاسکتی ہے کیونکہ اس قیاسی صورت میں لڑکی نے اپنی رضامندی ظاہر کی' سرجن نے ضمانت دی لیکن آپریشن معقول قسم کے مستند ڈاکٹروں کے معیار پر پورا نہیں اترا تھا۔'' (ایضاً' صفحہ ۱۸۲)

(۱۶۱) تفکر (MEDITATION)

''ربِّ ذوالجلال والاکرام نے قرآن مجید میں جا بجا حکم دیا ہے کہ میری آیات پر غور وفکر اور تدبّر وتفکّر کرو۔ آیات سے مراد کہیں تو قرآن مجید کی آیات وعبارات ہیں لیکن آیات سے زیادہ تر مقصود زمین وآسمان میں قدرت کی حیرت انگیز نشانیاں ہیں۔ تدبّر وتفکّر کے اس حکم پر اتنا زور دیا گیا ہے جتنا عبادات کے احکام پر بھی نہیں دیا گیا۔ عبادت کے متعلق تقریباً ایک سو پچاس آیات ہیں لیکن مطالعۂ کائنات کے متعلق چھ سو سے زائد آیات ہیں۔ اس مطالعہ اور تدبّر وتفکّر کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بس بیٹھے ہوئے آنکھ بند کر کے سوچتے رہو اور جب تھک جاؤ تو سوچنا چھوڑ دو۔ نہیں' بلکہ مقصد یہ ہے کہ اشیائے کائنات کی ہیئتِ ترکیبی اور خواص کا علم حاصل کرو اور اُن قوانینِ فطرت کا مطالعہ کرو جن کی بدولت کائنات کا یہ نظام قائم ہے اور اس طرح جو علم حاصل ہو' اُس سے خود بھی فائدہ اٹھاؤ اور اپنے ابنائے جنس یعنی نوعِ انسان کو بھی فائدہ پہنچاؤ۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۶۴ اور سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۹۰ میں ارشاد ہوا ہے کہ اختلافِ لیل و نہار پر غور کرو جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ دن رات کیوں ہوتے ہیں اور چھوٹے بڑے کیوں ہو جاتے ہیں؟ اگر ہمارے علمائے دین اس حکمِ خداوندی کی تعمیل کرتے تو وہ یہ معلوم کر لیتے کہ زمین گول ہے اور اپنے محور اور مدار پر گھومتی ہے لیکن اس حکم پر انہوں نے نہیں بلکہ اغیار نے عمل کیا اور اُنہوں نے وہ باتیں معلوم کیں جن سے جغرافیہ اور علمِ ہیئت میں ایک بڑے مفید باب کا اضافہ ہوا۔ ان احکام میں ''حکمت'' یہ ہے کہ ایک تو تم تا قیامت عمل میں مصروف رہو گے جو قوموں کی زندگی کے لئے پہلی شرط ہے۔ دوم یہ کہ تمہاری قوم برابر ترقی کرتی رہے گی اور دوسری قوموں پر غالب رہے گی۔''

''ان احکام میں سے یہاں حسبِ ذیل صرف دو آیات بیان کی جاتی ہیں :

(۱) اَوَلَمۡ یَنۡظُرُوۡا فِیۡ مَلَکُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ وَّاَنۡ عَسٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنَ قَدِ اقۡتَرَبَ اَجَلُہُمۡ فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ O (الاعراف : ۱۸۵)

''کیا اُنہوں نے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت میں اور (علاوہ ان کے) جو کوئی چیز بھی اللہ نے پیدا فرمائی ہے' (اس میں) نگاہ نہیں ڈالی اور اس میں کیا عجب ہے اُن کی مدت (موت) قریب آ چکی ہو' پھر اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے!'' (۷ : ۱۸۵)

(۲) قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ بَدَاَ الۡخَلۡقَ ثُمَّ اللّٰہُ یُنۡشِیءُ النَّشۡاَۃَ الۡاٰخِرَۃَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ O (العنکبوت : ۲۰)

''(اے حبیبِ لبیب!) فرما دیجئے تم زمین میں (کائناتی زندگی کے مطالعہ کے لئے) چلو پھرو' پھر دیکھو

(یعنی غور و تحقیق کرو) کہ اُس نے مخلوق کی (زندگی کی) ابتداء کیسے فرمائی' پھر دوسری زندگی کو کس طرح اُٹھا کر (ارتقاء کے مراحل سے گزارتا ہوا) نشوونما دیتا ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر بڑی قدرت رکھنے والا ہے۔'' (۲۰ : ۲۹)

''ملاحظہ فرمایا آپ نے' یہ آیتیں کس قدر واضح ہیں۔ پہلی آیت میں صاف صاف تنبیہہ ہے کہ جو قوم کائنات کی تحقیق پر غور یعنی قوانینِ فطرت کو معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرے گی' وہ فنا ہو جائے گی اور مٹ جائے گی۔ دوسری آیت (۲۰:۲۹) میں تخلیقِ کائنات کا علم حاصل کرنے کے لئے کرۂ زمین پر تحقیق کی غرض سے سفر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ الغرض کائنات کی چیزوں میں غور و فکر اور اُن کی حقیقت و ماہیت معلوم کرنے کی کوشش کرنا مسلمانوں کے لئے اس قدر ضروری ہے کہ خود حضور سرورِ کائنات ﷺ بھی اکثر یہ دعا فرمایا کرتے تھے :

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا حَقِیْقَۃَ الْاَشْیَاءِ

''اے اللہ! ہمیں تمام اشیاء کی اصلی حقیقت سے آگاہ فرما۔''

اِس حدیثِ مبارکہ کا ایک ایک لفظ جواہرات سے زیادہ قیمتی ہے۔ بالخصوص ''ہمیں'' ''تمام'' اور ''اصلی'' کے الفاظ خاص توجہ کے طالب ہیں۔ یعنی رسول اللہ ﷺ حقائقِ اشیاء کا علم خود اپنے لئے ہی نہیں بلکہ اُمّت کے ہر فرد کے لئے چاہ رہے ہیں۔ ''تمام'' سے مقصود یہ ہے کہ کائنات میں کوئی بھی ایسی چیز باقی نہ رہ جائے جس کا علم کسی مسلمان کو نہ ہو۔ سبحان اللہ! کیا کرم و عنایت ہے! ''اصلی'' سے مقصد یہ ہے کہ حقیقت معلوم ہونے میں بال برابر بھی شبہ یا کسر نہ رہے۔ علاوہ ازیں آپ ﷺ کا یہ بھی ارشادِ گرامی ہے :

''ایک گھڑی کا تفکر ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔''

ایک اور مقام پر ارشادِ ربانی ہے :

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ O وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ O وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ O وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ O (الغاشیۃ : ۱۷ تا ۲۰)

''یہ لوگ کیا اونٹ پر نظر نہیں کرتے کہ وہ (کیسی) عجیب طرح پیدا کیا گیا ہے' اور آسمان پر کہ (کیسی) عجیب طرح بلند کیا گیا ہے' اور پہاڑوں پر کہ (کیسی) عجیب طرح گاڑ دیئے گئے ہیں اور زمین پر کہ وہ کس طرح (گولائی کے باوجود) بچھائی گئی ہے!'' (۱۷ تا ۱۹ : ۸۸)

اِن آیات و احادیث کو پڑھنے کے بعد یقیناً ہر وہ مسلمان جس کے دل میں اللہ اور رسول ﷺ کی ذرا سی بھی محبت و عظمت ہے' شرم سے اپنا سر جھکا لے گا اور یہ سوال کرنے کی جرأت ہرگز نہیں کرے گا کہ ہمارے قومی زوال اور تباہی کی وجوہات کیا ہیں؟

۴۰۴۲ (تفکّر Meditation)

حقیقتِ کائنات کی تحقیق کا نتیجہ کون کون سے علوم ہیں؟ کیا آپ انکار کر سکتے ہیں کہ وہ علوم طبعیات، علم الکیمیا، علم طبقات الارض، علم الحیٰوۃ، علمِ نباتات، علمِ معدنیات، علم الحیوانات، علمِ فلکیات، علمِ ریاضی اور بے شمار دوسرے علوم ہیں جو آج کل یورپین اور امریکن اقوام کی واحد اجارہ داری میں پھل پھول رہے ہیں اور انہی علوم کی برکت سے وہ قومیں متمدّن، مہذّب، خوشحال اور صاحبِ اقتدار ہیں۔ اور۔۔۔۔۔۔۔ ہم۔۔۔۔۔؟

کچھ نہ پوچھ اے ہم نشیں! تو مری بابت کچھ نہ پوچھ

ہمارے ہاں تو ان علوم کا نام لینا بھی گناہ ہے۔ کون سے علوم کا۔۔۔۔۔؟ اُنہی علوم کا جنہیں حاصل کرنے کا حکم رب تعالیٰ نے دیا ہے اور جن کے حصول کے لئے رسول اللہ ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے۔ یہ ہے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے احکام پر ہمارا عمل! کیا اس معاملہ میں قرآن کی یہ آیت ہم پر صادق نہیں آتی؟

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ (البقرۃ : ۸۵)

''کیا تم کتاب کے بعض حصّوں پر ایمان رکھتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو؟ پس تم میں سے جو شخص ایسا کرے، اُس کی سزا سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلت و رسوائی ہو اور قیامت کے دن (بھی ایسے لوگ) سخت ترین عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔'' ☆ (۲ : ۸۵)

کیا اب بھی آپ کو شک ہے کہ آپ کی تباہی اور دنیا میں رسوائی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ ماڈرن علوم حاصل نہ کر کے رب تعالیٰ کی نافرمانی کر رہے ہیں جس کی سزا میں یہ رسوائی ہو رہی ہے؟

اتنا بیان کر دینے کے بعد اب بتایا جاتا ہے کہ ''حکمت'' میں ''تفکر'' صرف یہی نہیں کہ چادر سے منہ ڈھانپ کر کشف القبور یا مکاشفہ لطائفِ غیبی کا مراقبہ کر لیا اور بس۔ بلکہ تفکر (Meditation) کی دو قسمیں ہیں: ایک تفکر بالمشاہدہ اور دوسری تفکر بالمراقبہ۔

تفکر بالمشاہدہ: اس کے حسبِ ذیل کئی طریقے ہیں:۔

پہلا طریقہ: کائنات میں جتنی بھی خوبصورت اور حسین چیزیں ہیں مثلاً آسمان میں سورج، چاند، ستارے، سیارے، شفق، بادل، بارش، قوس وقزح اور زمین پر سمندر، دریا، چشمے، آبشار، سبزہ، پھول، میوے، رنگ

☆ یہ آیت اگرچہ یہود کے بارے میں نازل ہوئی۔ لیکن کیا عجب کہ مسلمان بھی اُن کی راہ پر چل کر اس سزا کے مستحق ہو جائیں۔ رب تعالیٰ اپنے حفظ و امان میں رکھے!

برنگے جانور، چرند، پرند، طرح طرح کے خوبصورت پتھر، جواہرات اور دھاتیں وغیرہ ان سب کو بغور اور دلچسپی سے دیکھنے کی ایسی عادت ڈالئے کہ اُن میں جو حسن، نزاکت اور دلکشی ہے، اُس کا احساس پیدا ہو جائے۔ جب یہ بات حاصل ہو جائے تو اُن کے بنانے والے کا خیال کیجئے اور سوچئے کہ وہ خود کتنا حسین اور صناع ہوگا! اس مشق کا حاصل یہ ہونا چاہئے کہ قدرت کی ہر مخلوق میں ہمیں حسنِ مطلق کی جھلک نظر آنے لگے اور ساتھ ہی اللہ کی موجودگی کا احساس ذہن نشین ہوتا چلا جائے۔ یہ انہماک رفتہ رفتہ اس قدر بڑھ جائے کہ جس چیز کا نظارہ کیا جا رہا ہو، خود اس کی موجودگی کا احساس فنا ہو جائے اور ایک ایسی ہستی کی موجودگی کا احساس پیدا ہو جو موجود تو ہے مگر دکھائی نہیں دیتی۔ یہی حضوری کی ابتدا ہے۔

سورۃُ الحدید (۵۷) کی آیت ۳ ھُوَالْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ کی تشریح میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ اس کائنات کے ذرّے ذرّے میں موجود ہے تو اکثر لوگوں کو جو صرف پڑھتے اور سنتے ہیں، عملی طور پر کچھ نہیں کر پاتے، وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ گندی چیزوں میں بھی ہے تو وہ ناپاک کیوں نہیں ہو جاتا؟ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ اُن کے اردگرد جو فضا اور خلا ہے اور جس میں بظاہر کچھ بھی نظر نہیں آتا، اُس میں ان گنت چیزیں موجود ہیں۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ سب چیزیں جو اس فضا اور خلا میں موجود ہیں، اُن میں سے ہر ایک اپنا کام کرتی ہے اور کوئی چیز کسی دوسری چیز سے نہ تو متاثر ہوتی ہے اور نہ اُس کے کام میں رکاوٹ ڈالتی ہے حتیٰ کہ ریڈیو کی لہریں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتی ہیں اور کوئی بھی مادّی شے اُن کے لئے رکاوٹ کا سبب نہیں ہو سکتی۔ جب مخلوقات کا یہ حال ہے تو خود خالق کا تو ذکر ہی کیا! وہ بذاتہٖ سب پاکوں کا پاک ہے۔ اُس پر کوئی شے اثر نہیں کر سکتی۔ ہر شے میں ہوتے ہوئے بھی وہ ہر شے سے الگ ہے۔ یہاں ایک اور مثال پر غور کیجئے:

زمین پر گوبر اور گندگی کا ڈھیر پڑا ہوا ہے اور آفتابِ عالمتاب کی دھوپ اُس پر پڑ رہی ہے اور دھوپ کی حرارت گندگی کے اندر کئی گز نیچے تک پہنچ رہی ہے۔ اب بتائیے کہ یہ دھوپ اور حرارت اس گندگی سے ناپاک ہو جائے گی یا خود اُسے پاک کر دے گی؟

بہر حال اس طریقۂ تفکر سے جو مشاہدہ ہوتا ہے، اُسے سیر ہی سمجھنا چاہئے کیونکہ جو کچھ دکھائی دیتا ہے، اُس کی معرفت حاصل نہیں ہوتی۔

<u>دوسرا طریقہ</u> : جب پہلے طریقہ پر عمل کرنے سے تجلیات وغیرہ کا مشاہدہ ہونے لگے تو اب پوری کائنات کا تصوّر دماغ میں قائم کیجئے۔ یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ پہلے فلکیات پر چند ایسی کتابیں پڑھئے جو موجودہ تحقیقات کے مطابق لکھی گئی ہوں۔ اس طرح معلوم ہوگا کہ یہ سورج، چاند، ستارے اور سیارے سب بڑے بڑے کرے ہیں جو اس فضا میں تیر رہے ہیں۔ اُن کی تعداد، جسامتیں اور درمیانی فاصلے اتنے زیادہ ہیں کہ انسانی شمار و حساب میں آ ہی نہیں سکتے۔ اس طرح جب اس فضا کی وسعت و پہنائی کا تصوّر دماغ میں قائم ہو جائے تو رات کو

۴۰۴۴ (تفکّر Meditation)

جب ستارے جگمگا رہے ہوں' کھلے آسمان کے نیچے لیٹ کر غور کیا کیجئے کہ یہ زمین جو ایک کرہ ہے' اس کے چاروں طرف ایسا ہی آسمان جیسا کہ اوپر نظر آتا ہے' لا انتہا فاصلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ سوچئے کہ آخر یہ سلسلہ ستاروں اور سیاروں یعنی آفرینش کا کہاں تک چلا گیا ہے۔ اگر تفکر بالمشاہدہ کے پہلے طریقے سے آپ کی حسِ فکر یہ تربیت یافتہ ہو چکی ہو تو آپ کائنات کا زیادہ صحیح تصوّر قائم کر سکیں گے اور دیکھیں گے کہ پہلے آسمان سے آخری آسمان تک کس طرح آفرینش کا سلسلہ قائم ہے۔ اس کے بعد یہ سوچنا شروع کیجئے کہ جہاں آفرینش ختم ہوتی ہے' اُس سے آگے کیا ہے۔ آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ آگے محض خلا ہے۔ اب سوچئے کہ یہ خلاء کہاں تک چلا گیا ہے اور اس کی انتہا کے بعد کیا ہے؟ یہاں عقل عاجز اور دماغ بیکار نظر آئے گا اور کچھ بھی سمجھ میں نہ آئے گا۔ اس ناقص تصور یا تفہم کو خوب پختہ کر کے یہیں چھوڑ دیجئے۔''

''اب ایک ایٹم کی جسامت کا تصوّر دماغ میں بٹھایئے۔ ایٹم اس قدر چھوٹا ہے کہ ایک سوئی کی نوک پر لاتعداد ایٹم اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ جب یہ تصوّر قائم ہو جائے تو آگے چل کر اُقلیدس کے نقطے کا تصوّر کیجئے جس میں نہ لمبائی ہے' نہ چوڑائی' نہ گہرائی ہے اور نہ وہ سمتوں اور امتداد میں مقیّد ہے اور نہ اُس کے ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ جب یہ تصوّر بھی قائم ہو جائے تو آیتِ قرآنی :

سُبۡحٰنَ رَبِّکَ رَبِّ الۡعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ O (الصّافّات : ۱۸۰)

''آپ کا رب جو عزت کا مالک ہے اُن (باتوں) سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیں۔'' (۳۷:۱۸۰)

کا مفہوم ذہن نشین کرتے ہوئے یہ فکر کیجئے کہ ایک طرف تو اللہ اتنا بڑا ہے کہ تمام کائنات پر محیط ہے اور اُس کے ذرّے ذرّے میں موجود ہے تو دوسری طرف وہ اقلیدسی نقطے سے بھی زیادہ چھوٹا ہے۔ جب یہ تصوّرات پختہ ہو جائیں تو سخت مشقت اور مدتِ دراز کی کوشش کے بعد عجیب وغریب راز آپ پر کھلیں گے اور آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ تمام کائنات باجود اس بے انتہا وسعت و پنہائی کے اس ذاتِ پاک میں اس طرح سمائی ہوئی ہے کہ معدومِ محض کی سی حیثیت رکھتی ہے اور وہ ذات بہ یک وقت اس کائنات سے بھی بے اندازہ بڑی اور اقلیدسی نکتہ سے بھی کہیں چھوٹی ہے۔ اس نکتہ پر اس سے زیادہ صاف لکھنے کے لئے نہ ہماری زبان میں الفاظ ہیں اور نہ قلم میں طاقت' نہ رخصت۔

اسی تفکر کا ایک ضمنی پہلو یہ بھی ہے کہ جب آپ کائنات کی وسعت و پنہائی کا ایک تصوّر قائم کر لیں تو اُس کے مقابلہ میں اپنی زمین کی جسامت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کائنات کے مقابلہ میں ہماری یہ زمین اتنی بڑی بھی نہیں جتنا اس کرۂ زمین کے مقابلہ میں ایک رائی کا دانہ۔ پھر غور کیجئے کہ اس کرۂ ارض کے مقابلہ میں خود ہمارا جسم کتنا بڑا ہے تو معلوم ہوگا کہ ہماری جسامت اس نسبت سے اتنی بھی تو نہیں جتنی گندے پانی کی ایک بوند میں خوردبین سے نظر آنے والے لاکھوں جراثیم میں ایک جرثومہ کی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ تمام کائنات ایک کتاب مرقوم ہے اور ہم اس میں ایک نہایت باریک موہوم سی تحریر یا نقش۔ جیسا کہ غالب نے کہا ہے :

ع کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

صوفی شعراء اور بعض فلسفیوں نے غالب کے درج بالا شعر کا مضمون طرح طرح سے بیان کیا ہے۔ خصوصاً برکلے کے فلسفہ کا تو ماحصل ہی یہ ہے کہ ع
عالم تمام حلقہ دامِ خیال ہے

یعنی حقیقتاً صرف ایک ذہنِ کل موجود ہے اور باقی سب کچھ اُسی ذہن کے تصوّرات ہیں۔ قرآن مجید کی بعض آیات سے بھی ذہن اسی طرف منتقل ہوتا ہے کیونکہ جب اللہ ہی سب سے اوّل و آخر اور ہر چیز کے اندر و باہر اور ہر شے پر محیط ہے تو کائنات کی حیثیت اُس کی ذات میں یقیناً ایسی ہی ہو سکتی ہے جیسی ذہن میں تصوّرات کی۔ یا یوں سمجھئے کہ جب نقاش صفحۂ قرطاس پر ایک تصویر کھینچتا ہے تو جس طرح وہ تصویر کاغذ پر آنے سے پہلے نقاش کے ذہن میں موجود ہوتی ہے' اُسی طرح یہ کائنات مصوّرِ حقیقی کے ذہن میں موجود ہے۔ اس مثال کو وحدت الوجود ماننے والے بہت زور شور سے اپنے عقیدے کے ثبوت میں پیش کیا کرتے ہیں۔ ہم اس بارے میں اُن سے صرف یہ پوچھتے ہیں کہ کیا وہ تصویر جو مصور کے ذہن میں موجود ہے' اُس کے دماغ کا کوئی حصّہ یا اُس کے جسم کا کوئی عضو ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً ایسا نہیں ہے تو پھر اس تصوّر کی کیا حیثیت اور حقیقت ہے؟ کیا وہ اس ذہن اور دماغ کی مخلوق نہیں؟''

''یہ سب کچھ تو ہم ایک رَو اور جذبہ میں بیان کر گئے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حقیقت کا ایک شمّہ بھی نہ کسی سے بیان ہوا ہے اور نہ ہو سکے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے کوئی بھی لفظ صحیح طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً بڑا' چھوٹا' وغیرہ وغیرہ اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُس کے ہاتھ' آنکھیں' چہرہ اور زبان یا روح اور نفس ہے۔ لیکن سمجھنے سمجھانے کے لئے کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا ہے اور ہم کیا کہتے ہیں۔ وہ تو خود اپنے لئے فرماتا ہے کہ میں سَمِیْع ہوں' بَصِیر ہوں یعنی سنتا اور دیکھتا ہوں۔ سورۃ الفتح (۴۸) کی آیت ۱۰ میں وہ اپنے ہاتھ بھی بیان کرتا ہے: یَدُاللہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ (اللہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں پر ہے)۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۱۵ میں وہ اپنے چہرے کا بھی ذکر کرتا ہے: فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللہِ [تم جدھر بھی رخ کرو' اُدھر ہی اللہ کا چہرہ (اُس کی توجہ) ہے]۔ سورۃ الانعام (۶) کی آیت ۵۴ میں وہ اپنے لئے نفس کا ہونا بھی فرماتا ہے: کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ [تمہارے رب نے اپنی ذات (کے ذمّہ کرم) پر رحمت لازم کر لی ہے]۔ وہ کہتا ہے کہ میری روح بھی ہے: نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ سورۃ القلم (۶۸) کی آیت ۴۲ میں اپنی پنڈلی بیان فرمائی۔ اس لئے اس کا بیان کرتے ہوئے یہ سب الفاظ استعمال کرنے پر ہم بھی مجبور ہیں ورنہ اُس کی ذات تمام الفاظ اور الفاظ و تفہیم سے کہیں ارفع و اعلیٰ اور ماوراء ہے۔

''پھر لطف یہ ہے کہ جہاں انسان اس قدر ضعیف و حقیر ہے' وہاں دوسری طرف اس قدر قوی اور عظیم ہے کہ سمندروں میں طوفان لا سکتا ہے' اُٹھتے ہوئے طوفانوں کو روک سکتا ہے' پہاڑوں کو اُن کی بنیادوں سے ہلا سکتا ہے اور ہمت و ارادہ سے وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ جب انسان ایسا ہے تو اُس کا پیدا کرنے والا کیا کچھ نہ ہوگا!''

۴.۴.۶ (تفکّر Meditation)

تفکر بالمراقبہ: اس طریقہ میں چیزوں کی شکل وصورت اور حسن ولطافت پر غور کرنے کی بجائے اُن کی ساخت اور ماہیت پر غور کیا جاتا ہے اور تجزیہ کر کے دیکھا جاتا ہے کہ وہ کن عناصر یا اجزاء کو کس نسبت سے ملا کر بنائی گئی ہیں اور ہم انہی عناصر یا اجزاء کو اسی یا دیگر نسبتوں سے ملا کر کیا چیزیں بنا سکتے ہیں اور وہ انسان کے فائدے کے لئے کس طرح استعمال کی جاسکتی ہیں۔ اس طریقہِ تفکر میں روشنی، حرارت، برق، ایتھر، قدرتی شعاعوں کے خواص اور ان قوانین کے اکتشافات بھی شامل ہیں جن کے مطابق یہ چیزیں کام کرتی ہیں۔ اِسی کا نام سائنس ہے اور اسی سے وہ علوم وجود میں آتے ہیں جو آج کل یورپ وامریکہ کا طرہِ امتیاز بنے ہوئے ہیں۔ یہی وہ علوم ہیں جنہیں حاصل کرنے کے لئے آیات اللہ پر غور کرنے کا حکم قرآن مجید میں دیا گیا ہے جبکہ ہم نے آج تک اُن پر عمل نہیں کیا۔ اگر ہم موجودہ ذلت ورسوائی سے چھٹکارا اور عاقبت کے عذاب سے نجات پانا چاہتے ہیں تو ان علوم کے حاصل کئے بغیر چارہ نہیں۔ اس عملی طریقہِ تفکر سے یقیناً اللہ کا دیدار تو نہیں ہوگا لیکن اُس کی موجودگی پر محکم یقین ضرور پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ جب سے یہ اکتشاف ہوا ہے کہ ایٹم کے پھٹنے سے انرجی (توانائی) پیدا ہوتی ہے تو سائنس کے اس مسلمہ اصول کا خاتمہ ہو گیا ہے کہ مادّہ فنا نہیں ہوتا۔ اب تمام سائنسدان اس بات کے قائل ہیں کہ اس مادّی دنیا سے آگے ایک اور دنیا ہے جسے Metaphysical World (عالم ماورائے مادّہ) کہتے ہیں۔ یہ تو ابتدائے عشق ہے آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟ ہمارا تو ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ سائنس کے ذریعہ سے بھی اپنی ہستی کو منوا کر رہے گا۔ اُس نے مخلوق خصوصاً انسان کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ پہچانا جائے اور سب اُس کی پرستش کریں۔ یقین ہے کہ ایک دن یورپ کا بچہ بچہ حتّٰی کہ ملحد اور منکرِ خدا کمیونسٹ بھی ایمان لے آئیں گے۔ وہی دن ہوگا جب قرآن اور اسلام کی صداقت نصف النہار کی طرح روشن ہو جائے گی۔ یہ صرف گمان اور قیاس ہی نہیں بلکہ ایسا ہو کر رہے گا کیونکہ یہ بات بھی رب تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمائی ہے اور ارشاد ہوا ہے:

سَنُرِيْهِمْ آيٰتِنَا فِي الْأٰفَاقِ وَفِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (حٰمۤ السجدۃ: ۵۳)

"ہم اُنہیں عنقریب اطرافِ عالم میں اور خود اُن کی ذوات میں اپنی نشانیاں دکھا دیں گے یہاں تک کہ اُن پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن حق ہے۔" (۴۱ : ۵۳)

"اس آیت میں جو فرمایا کہ ہم تمام اطرافِ عالم میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے، وہ تو نظر آ ہی رہی ہیں کہ قدرت کے سینکڑوں راز معلوم ہو چکے ہیں جس کے نتیجہ میں اب چاند اور ستاروں کا سفر درپیش ہے اور ایک عالم ماورائے مادّہ (Metaphysics) کا عقیدہ قائم ہو چکا ہے۔ لیکن یہ جو فرمایا کہ ہم اُن کے نفوس میں بھی اپنی نشانیاں دکھائیں گے تو یہ بہت قابلِ غور بات ہے۔ ایکس رے کے ذریعہ بدن کے اندر اعضائے رئیسہ کے حالات تو بہت کچھ اب دکھائی دینے لگے ہیں، کہیں یہ تو مراد نہیں کہ آئندہ آلات کے ذریعے انسانی عقل، نفس اور روح وغیرہ کی طاقت اور لطافت وکثافت بھی معلوم ہو جایا کرے گی۔ دل کے خیالات بھی ریکارڈ ہونے لگیں گے وغیرہ وغیرہ۔ اگر ایسا ہو تو تعجب تو کچھ نہیں اور اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ آئندہ کچھ ایسے آلات نکل آئیں گے جن سے خدا کی موجودگی اس قدر ثابت ہو جائے جیسی آنکھوں سے دیکھ کر ہوتی ہے۔" (ماہنامہ "مومن" لاہور، جون ۲۰۰۳ء)

(۱۶۲) قوّتِ حافظہ (MEMORY)

سیکھے گئے اور تجربہ شدہ حقائق کو بیان کرنے کے عمل کی قوّتِ عاملہ کا نام یادداشت یا قوّتِ حافظہ (Memory) ہے۔اسے ''یادرکھنے'' کی قوت بھی کہا جاسکتا ہے۔(انسائیکلوپیڈیا آف دی قرآن' ج ۳' ص ۳۷۲)۔اس طرح یادداشت زمانہ ماضی کے متعلق سوچنے کی قوت کا نام ہے۔یادداشت کو حسبِ ذیل تین قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

(1) حافظے سے برآمد کرنا (Recall): قرآن مجید میں اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں :

(ا) وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ (آلِ عمران : ۱۲۱)

''اور (اے حبیبِ مکرّم! وہ وقت یاد کیجئے) جب آپ صبح سویرے اپنے درِ دولت سے روانہ ہوکر مسلمانوں کو (غزوہ اُحد کے موقع پر) جنگ کے لئے مورچوں پر ٹھہرارہے تھے۔'' (۳:۱۲۱)

(۲) اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ (المائدۃ: ۱۱۰)

''جب اللہ فرمائے گا: اے عیسٰی ابنِ مریم! تم اپنے اوپر اور اپنی والدہ پر میرا احسان یاد کرو۔'' (۵ : ۱۱۰)

(2) حافظے میں محفوظ کرنا (Memorizing): نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام قرآنی آیات کو حافظے میں محفوظ کرنے کے لئے جبریلِ امین علیہ السلام کے ساتھ ساتھ جلدی جلدی تلاوت کرتے جاتے تھے جس سے آپ ﷺ کو قدرے کلفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔رب تعالیٰ کو اپنے محبوبِ لبیب ﷺ کی یہ تکلیف گوارا نہ ہوئی اور آپ کو اُس میں عجلت کرنے سے منع فرمادیا گیا چنانچہ ارشاد ہوا :

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖO اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗO (القیمۃ : ۱۶'۱۷)

''(اے حبیب!) آپ (قرآن کو یاد کرنے کی) جلدی میں (نزولِ وحی کے ساتھ) اپنی زبان کو حرکت نہ دیا کریں۔بے شک اُسے (آپ کے سینہ میں) جمع کرنا اور اُسے (آپ کی زبان سے) پڑھانا ہمارا ذمہ ہے۔'' (۱۶'۱۷ : ۷۵) ☆

(3) حافظہ کو روکے رکھنے کا عمل (Retention): قرآن مجید میں اس کی مثالیں حسبِ ذیل ہیں :۔

☆ انتہائی خوش آئند بات یہ ہے کہ اس سے اگلی آیت ۱۸ میں فرمایا کہ جب ہم اُسے پڑھ چکیں تو آپ اُس پڑھے ہوئے کی پیروی کیا کریں۔حالانکہ رب تعالیٰ نے محبوب علیہ السلام کو قرآن پڑھ کر نہیں سنایا تھا بلکہ جبریل امین نے سنایا تھا۔معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ اپنے پیاروں کے عمل کو اپنا عمل فرماتا ہے۔جیسا کہ جنگِ بدر کے موقع پر حضور علیہ السلام کا کفار کی طرف کنکریاں پھینکنے کے عمل کو رب تعالیٰ نے اپنا عمل قرار دیا (سورۃ الانفال :۱۷)۔

۴۸۔۴ (قوّتِ حافظہ Memory)

(۱) إِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِO لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَا أُذُنٌ" وَّاعِيَةٌO (الحآقۃ : ۱۱، ۱۲)

''جب (طوفانِ نوح کا) پانی حد سے گزر گیا تو ہم نے تمہیں رواں کشتی میں سوار کرلیا۔ تاکہ ہم اس (واقعہ) کو تمہارے لئے (یادگار) نصیحت بنادیں اور محفوظ رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں۔'' (۱۱، ۱۲ : ۶۹)

(۲) سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰىO (الاعلیٰ : ۶)

''(اے حبیبِ مکرم!) ہم آپ کو خود (ایسا) پڑھائیں گے کہ آپ (کبھی) نہ بھولیں گے۔'' (۶ : ۸۷)

قرآن مجید حافظہ کو فطری صلاحیت (Faculty) یا مال خانہ (سٹور ہاؤس) کے طور پر پیش نہیں کرتا بلکہ وہ بندے اور خدا کے درمیان باہمی تعامل کے صفِ اوّل طریق کے طور پر اُسے پیش کرتا ہے۔ حافظہ اور یادداشت سے متعلق قرآن کے ابتدائی الفاظ کی بنیاد اساسی لفظ ''ذ۔ک۔ر (یعنی ذکر'' پر ہے جو اپنے مشتقات کے ساتھ اِن سورتوں میں آیا ہے :

ذِکر (سورۃ المائدۃ : ۹۱) ؛ تَذَکَّرَ (فاطر : ۳۷) ؛ تَذْکِرۃ (المُدثّر: ۴۹)؛ یَتَذَکَّرُ (النازعات: ۳۵) اَلذِّکْرٰی (عبس: ۴) ؛ ذَکَرَ (عبس : ۱۲) ان کے معانی کا انحصار اُن کے سیاق وسباق پر ہے اور اُن کا بنیادی مفہوم یادداشت، یاددہانی کرانے والی شے (ریمائنڈر)، غور وخوض، توجہ دینا یا تلاوت کا ہے۔

مسلمان کو یادرکھنے کا حکم ملا ہے اور حافظے میں محفوظ رکھنے کا مقصد مختلف اور بہت وسیع ہے اور کئی چیزوں کو شامل ہے۔ مثلاً اللہ ربّ العالمین، اُس کے اسمائے حسنیٰ، روزِ قیامت، قصص الانبیاء، اللہ تعالیٰ کے عطیات اور نوازشات، قربانی اور آیاتِ الٰہی وغیرہ کا ذکر اور اُنہیں یاد رکھنا۔ قرآنی آیات میں ان کا استعمال ملاحظہ ہو :۔

(۱) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا (الاحزاب : ۴۱)

''مومنو! اللہ کا کثرت سے ذکر کیا کرو۔'' (۴۱ : ۳۳)

(۲) قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (بنی اسرائیل:۱۱۰)

''فرما دیجئے کہ اللہ کو پکارو یا رحمان کو پکارو، جس نام سے بھی پکارو (سب) اچھے نام اُسی کے ہیں۔'' (۱۷:۱۱۰)

تسبیح کے مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ یہ اسمائے حسنیٰ (خوبصورت نام) کئی ہیں۔ جیسا کہ جامع ترمذی میں وارد ہوا کہ حدیث لٹریچر میں ان اسمائے حسنیٰ کی فہرست 99 بیان ہوئی ہے۔

(۳) وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (الزُّمَر : ۴۵)

''اور جب تنہا اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُن لوگوں کے دل گھٹن اور کراہت کا شکار ہو جاتے ہیں جو

آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔'' (۴۵ : ۳۹)

(۴) كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ وَقَدْ آتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًاO (طٰہٰ : ۹۹)

''(اے حبیبِ معظم !) اس طرح ہم آپ کو ان قوموں کی خبریں سناتے ہیں جو گزر چکی ہیں اور بے شک ہم نے آپ کو اپنی خاص جناب سے ذکر (یعنی نصیحت نامہ) عطا فرما دیا ہے۔'' (۹۹:۲۰)

(۵) وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا

''اور اپنے اوپر اللہ کی اُس نعمت کو یاد کرو جب تم (ایک دوسرے کے) دشمن تھے تو اُس نے تمہارے درمیان الفت پیدا کردی اور تم اُس کی نعمت کے باعث آپس میں بھائی بھائی ہوگئے۔'' (۱۰۳:۳)

(۶) وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ (الحج : ۳۶)

''اور قربانی کے جانوروں کو ہم نے تمہارے لئے اللہ (کے دین) کی یادگاریں بنا دیا ہے، تمہارے حق میں انہی کے اندر بھلائی رکھ دی گئی ہے، پس تم (اُنہیں) قطار میں کھڑا کر کے (نیزہ مار کر نحر کے وقت) اُن پر اللہ کا نام لو''۔ (۳۶ : ۲۲)

(۷) وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ذٰلِكَ مِنْ آيٰتِ اللّٰهِ (الکھف : ۱۷)

''اور جب دھوپ نکلتی ہے تو (اے مخاطب !) تو اُسے دیکھتا ہے کہ وہ اُن کے غار سے دائیں جانب کو بچی رہتی ہے اور جب وہ چھپتی ہے تو وہ اُن سے بائیں جانب کو کترا جاتی ہے جبکہ وہ اس (غار) کے ایک کشادہ میدان میں (لیٹے) ہیں۔ یہ (سورج کا اپنی راہ کو بدلنا) اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔'' (۱۷:۱۸)

''کسی چیز کو یاد کرنے کے قرآنی احکام کو نماز قائم کرنے (سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۴، سورۃ الجمعۃ کی آیت ۹)، زکوٰۃ (سورۃ الروم کی آیت ۳۹) اور حج کو (سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۹۸) کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے قصّے، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، خوفِ خدا، اللہ کا شکر گزار ہونا، مصائب میں صبر کرنا، تنبیہاتِ الٰہی کا خیال رکھنا، اللہ کے وعدوں پر پختہ یقین ہونا، دل کا خوفِ خداوندی سے تھرتھرانا اور کانپ جانا اور دینِ اسلام پر کامل ایمان ہونا۔ قرآن مجید سامع کو بالعموم انبیاء علیہم السلام کی حکایات کے ساتھ ساتھ اِن سب کو خود یاد رکھنے اور دوسروں کو بھی یاد رکھنے کا حکم دیتا ہے۔''

''ذکر قرآن کے دوسرے مرکزی نظریات کو بڑی مضبوطی سے پوری طرح ڈھانپ لیتا ہے۔ سورہ صٓ کی آیت ۱۷ کے حکم کو جس میں صبر کرنے اور ذکر کو اکٹھا بیان کیا گیا ہے، صبر اور ذکر کو اس انداز سے جوڑا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں سے ایک پر عمل کرنا دوسرے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے کہ وہ یا تو ایک ہی عمل کے پہلو ہیں یا دو علیحدہ علیحدہ ممتاز پہلو ہیں۔''

۴۰۵۰ (قوّتِ حافظہ Memory)

درجِ ذیل آیت میں ذکر کو نماز کی ادائیگی کے ساتھ مربوط کر دیا گیا ہے کہ نماز میں خشوع وخضوع اور ذکر میں تفکر وتدبر ہوتا ہے اور خشوع وخضوع اور تفکر وتدبّر دونوں ہی رب تعالٰی کو بہت ہی محبوب ہیں :

فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِکُمْ (النّسآء : ۱۰۳)

''جب تم نماز ادا کر چکو تو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹے ہر حال میں) یاد کرتے رہو۔'' (۴ : ۱۰۳)

''آیت نمازِ خوف سے متعلق ہے۔ اس نماز کے لئے لفظ قَضَیْتُمْ ارشاد فرمانا اس کی دلیل ہے کہ یہ بظاہر نامکمل' ناتمام نماز بھی عنداللہ ہو جاتی ہے۔'' (تفسیر ماجدی اردو' ص ۲۱۳' نوٹ : ۷۰۸)

ذکر کا تعلق محض جسم کی کھڑے' بیٹھے یا لیٹے ہونے کی کیفیت ہی سے نہیں بلکہ اُس کا تعلق غیر مبہم اور بالکل واضح اور نمایاں الفاظ میں رب تعالٰی کی حمد وثنا (تسبیح) سے بھی ہے جس کے متعلق ارشادِ باری تعالٰی ہوا :۔

(۱) وَاذْکُرْ رَّبَّکَ کَثِیْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْکَارِO (آلِ عمران : ۴۱)

''اور اپنے رب کو کثرت سے یاد کرتے رہو اور شام اور صبح اُس کی تسبیح کرتے رہو۔'' (۴۱ : ۳)

(۲) وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًاO وَمِنَ الَّیْلِ فَاسْجُدْ لَہٗ وَسَبِّحْہُ لَیْلًا طَوِیْلًاO (الدّھر)

''اور صبح وشام اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور رات کی کچھ گھڑیاں اُس کے حضور سجدہ ریزی کیا کرو اور رات کے (بقیہ) طویل حصّہ میں اُس کی تسبیح کیا کرو۔'' (۲۵'۲۶ : ۷۶)

قرآن مجید کا عمومی بیان یہ ہے کہ روحانی دولت سے مالا مال دل ودماغ والے لوگ (اولوا الالباب) ہی آیاتِ الٰہی میں تفکر وتدبّر کرتے ہیں یعنی آیاتِ الٰہی تفکر وتدبّر کا محرک ہوتی ہیں۔ یہ آیاتِ الٰہی آسمانوں اور زمین کی پیدائش' دن اور رات کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا جانا' جفت وطاق کی دو متضاد قوّتیں اور مرد وزن (دو متضاد مزاجوں کے حامل) وغیرہ ہیں۔ لیکن نہ تو وہ آیات بذاتِ خود اور نہ ہی اُن کی طرف توجہ کرنے کی اہلیت ذکر کے کامیاب عمل کی ضمانت ہیں جب تک خود رب تعالٰی کی مشیّت اور ارادہ اس میں شامل نہ ہو۔ جیسا کہ فرمایا:

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَO (التکویر : ۲۹)

''اور تم وہی کچھ چاہ سکتے ہو جو تمام جہانوں کا رب اللہ چاہے گا۔'' (۲۹ : ۸۱)

''ذکر مغفرت وبخشش کا کلیدی عامل ہے جس کا وعدہ حسبِ ذیل آیت میں کیا گیا ہے :

وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ (آلِ عمران:۱۳۵)

''اور وہ جب کوئی بُرائی کر چکتے ہیں یا اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کا ذکر کرتے ہیں' پھر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا گناہوں کی بخشش کرنے والا ہے ہی کون؟'' (۱۳۵ : ۳)

(۱۶۳) اصحاب الکھف والرقیم (Men of the Cave)

ابن اسحاق بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ قریشِ مکہ میں ایک مرتبہ یہ مشورہ ہوا کہ محمد (ﷺ) کا معاملہ بہت سنگین ہوتا جا رہا ہے' اس لئے ایسا کوئی یقینی فیصلہ ہونا چاہیے کہ یہ صادق ہیں یا کاذب؟ تا کہ ہم اُن کے متعلق اپنی آخری رائے پر عمل کر سکیں۔ بہتر یہ ہے کہ اس مسئلہ کو یہودِ مدینہ سے حل کرایا جائے کیونکہ وہ خود کو اہلِ کتاب کہتے ہیں اور اس قسم کے معاملات میں وہ صاحبِ بصیرت ہیں۔ قریش نے اس غرض سے نضر بن حارث اور عقبہ بن معیط پر مشتمل ایک وفد علمائے یہود کے پاس بھیجا۔ علمائے یہود نے اُن سے کہا کہ تم ان سے تین باتیں دریافت کرو۔ اگر وہ صحیح صحیح جواب دیں تو بلا شبہ وہ اللہ کے سچے رسول ہیں اور تمہیں اُن کی مخالفت ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ اور اگر وہ صحیح جواب نہ بتا سکیں تو تمہیں اختیار ہے جو چاہو اُن کے ساتھ کرو۔ وہ تین سوال یہ ہیں: ذوالقرنین کا واقعہ کیا ہے؟ اصحابِ کہف کون تھے اور اُن پر کیا گزری؟ روح کی حقیقت بیان کیجئے۔ آپ نے اس اعتماد پر کہ کل وحی آ جائے گی' فرمایا: میں تمہیں کل ان کے متعلق بتاؤں گا لیکن آپ انشاء اللہ کہنا بھول گئے تھے (اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی) پھر پندرہ دن تک وحی نہیں آئی تو کفارِ مکہ چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ محمد (ﷺ) نے ہم سے کل کا وعدہ کیا تھا اور اب پندرہ دن ہو گئے اور اُنہوں نے ہمارے سوالوں کے جواب نہیں دئے۔ اس سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بہت رنج ہوا' تب جبریل امین اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۃ الــــــکھف کی ابتدائی آیات کو لے کر نازل ہوئے۔ اس سورۃ میں اصحابِ کہف کی بھی اور ذوالقرنین کی بھی خبر ہے جس نے مشرق سے لے کر مغرب تک کا سفر کیا تھا اور روح کے متعلق سوال کا جواب اس سے پہلی سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔ معلوم یوں ہوتا ہے کہ سورہ بنی اسرائیل اور سورۃ الکھف ایک ساتھ نازل ہوئی ہیں اور ان تینوں سوالات کے جوابات بھی ایک ساتھ نازل ہوئے۔ روح کے متعلق جو اُن کے سوال کا جواب تھا' اس کے مناسب آیت سورہ بنی اسرائیل میں تھی۔ اس لئے آپ نے ان آیتوں کو بنی اسرائیل میں رکھوا دیا اور اصحاب الکھف اور ذوالقرنین کے متعلق آیات کو' اُن کے مناسب آیات سورۃ الکھف میں تھیں' اس لئے آپ نے اُنہیں سورۃ الکھف میں رکھوا دیا۔'' (تبیان القرآن۔۔علامہ غلام رسول' ج ۷' ص ۴۹)

''اصحابِ کہف کے اسماء عجمی زبان میں ہیں۔ ان کو شکل اور نقطوں میں منضبط کرنا مشکل ہے۔'' (ایضاً)

حافظ ابنِ حجر العسقلانی فرماتے ہیں کہ اصحاب الکھف اور الرقیم دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ ''فتح الباری'' میں اُن کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

وَقَالَ قَوْم'' أَخْبَرَاللّٰهُ عَنْ قِصَّةِ أَصْحٰبِ الْكَهْفِ وَلَمْ يُخْبِرْ عَنْ قِصَّةِ أَصْحٰبِ الرَّقِيْمِ (قُلْتُ) وَ لَيْسَ كَذٰلِكَ بَلِ السِّيَاقُ يَقْتَضِي أَنَّ أَصْحٰبَ الْكَهْفِ هُمْ أَصْحٰبُ الرَّقِيْمِ (ج ۶' ص ۲۹۳)

۴۰۵۲ (اصحاب الکھف والرقیم Men of the Cave and Ar-Raqeem)

''کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کے بارے میں بتایا ہے لیکن اصحاب الرقیم کے بارے میں نہیں بتایا (میں کہتا ہوں) ایسا نہیں ہے بلکہ کلام کا سیاق چاہتا ہے کہ اصحابِ کہف اصحاب الرقیم ہی ہیں۔'' (فتح الباری' جلد ششم' صفحہ ۲۹۳)

''قرآن کریم نے اصحابِ کہف کے واقعہ کا وہ پہلو ذکر کیا جو ہمارے لئے ہدایت کا درس رکھتا ہے۔ باقی اس کے زمان ومکان وغیرہ تفصیلات کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا۔ ہر واقعہ کے بیان میں قرآن کریم کا اسلوب یہی ہے اور یہی ایک ایسی خصوصیت ہے جو قرآن کریم کو تاریخ کی کتب سے ممتاز کرتی ہے۔ قرآن میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں' اُن سے مقصود داستان سرائی نہیں بلکہ عبرت آموزی اور بصیرت افروزی ہے۔ صحیح احادیث میں بھی اس واقعہ کی تفصیلات مذکور نہیں۔''

''یہاں ایک چیز ضرور قابلِ غور ہے۔ وہ یہ کہ ایڈورڈ گبن نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب (The Decline and Fall of the Roman Empire) میں بڑی دیدہ دلیری سے کام لیتے ہوئے لکھا ہے کہ (العیاذ باللہ) حضور کریم (ﷺ) نے یہ واقعہ اپنے شام کے تجارتی سفروں کے اثناء میں علمائے اہلِ کتاب سے سنا اور اُسے وحیِ الٰہی کہہ کر قرآن میں درج کر دیا۔ اس گستاخ اور منہ پھٹ مؤرخ نے سپہرِ علم وحکمت کے نیّرِ اعظم پر بے علمی اور جہالت کا الزام لگایا۔ اس طرح اُس نے نہ صرف حقیقت کا منہ چڑایا ہے بلکہ مؤرّخ کے بلند مقام کو بھی تعصّب کی غلاظت سے آلودہ کر دیا ہے۔'' (''ضیاء القرآن''۔ جسٹس کرم شاہ الازہری' جلد سوم' صفحہ ۱۵)

''مؤرّخ مذکور نے اپنی کتاب مذکورہ کے حاشیہ میں اس واقعہ کا ماخذ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں نے یہ واقعہ شام کے مشہور بشپ جیمز سروج (James of Saruj) کے مجموعہِ مواعظ جو 230 مواعظ پر مشتمل ہے' کے ایک وعظ سے لیا ہے۔ یہ بشپ 452ء میں پیدا ہوا اور 474ء میں اُس نے یہ مواعظ لکھے۔ چھٹی صدی کے اختتام سے پہلے شامی زبان سے اس کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہو گیا تھا۔ تاریخی لحاظ سے یہ کتاب اس واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کے اقرب ترین زمانہ کی تحریر ہے۔ یہ مواعظ کیونکہ تقریباً پچاس برس بعد لکھے گئے' اس لئے ان کی ساری تفصیلات کو جوں کا توں تسلیم کر لینا قطعاً قرینِ دانش نہیں۔ جب وہ خود مانتا ہے کہ یہ مجموعہ 474ء میں لکھا گیا اور اُسی کے قول کے مطابق اصحابِ کہف کا واقعہ 437ء میں پیش آیا۔ ذرا انصاف فرمایئے' ان پچاس سالوں میں اس میں کیا کچھ ردّ و بدل نہ ہو گیا ہو گا۔ کتنی ایسی چیزیں نظرانداز کر دی گئی ہوں گی جو انسان کے جذبہِ عجوبہ پرستی کی تسکین کا باعث نہیں بنتیں اور کئی باتیں بڑھا دی گئی ہوں گی تا کہ اس واقعہ کو نمک مرچ لگا کر پیش کیا جا سکے۔ اس لئے جیمز کی تفصیلات کا سو فیصد صحیح ہونا قطعاً یقینی نہیں۔ جب اس کی صحت یقینی نہیں تو قرآن کی صداقت کا انحصار ان مواعظ سے مطابقت پر نہیں ہو سکتا اور نہ ہی قرآن کو کسی گبن کے قول کی سند کی ضرورت ہے۔'' (ایضاً)

اصحاب الکھف کے واقعہ کی ابتدا کرتے ہوئے سورۃ الکھف (۱۸) میں فرمایا گیا:

۴۰۵۳ (اصحاب الکھف والرقیم Men of the Cave and Ar-Raqeem)

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ آيٰتِنَا عَجَبًاO اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَا آتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا O فَضَرَبْنَا عَلٰى آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًاO ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْا اَمَدًا O (الکھف:۹-۱۲)

"کیا آپ نے یہ خیال کیا ہے کہ کہف ورقیم (یعنی غار یا وادیِ رقیم) والے ہماری (قدرت کی) نشانیوں میں سے (کتنی) عجیب نشانی تھے؟ (وہ وقت یاد کیجئے) جب چند نوجوان غار میں پناہ گزیں ہوئے تو انہوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بارگاہ سے رحمت عطا فرما اور ہمارے کام میں راہ یابی (کے اسباب) مہیا فرما۔ پس ہم نے اُس غار میں گنتی کے چند سال اُن کے کانوں کو بند کر کے اُنہیں سُلا دیا۔ پھر ہم نے اُنہیں اٹھا دیا کہ یہ ظاہر کریں کہ دونوں گروہوں میں سے کون اس (مدت) کو صحیح شمار کرنے والا ہے جو وہ (غار میں) ٹھہرے رہے۔" (۹-۱۲ : ۱۸)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ فَضَرَبْنَا عَلٰى آذَانِهِمْ قرآن کے اُن فصیح جملوں میں سے ہے جن کی نظیر لانے سے فصحائے عرب بھی قاصر رہے یعنی ہم نے اُن کے کانوں کو بند کر دیا تا کہ کوئی آواز اُن کی نیند میں خلل نہ پیدا کرے۔

<u>لِنَعْلَمَ کے چند تراجم اور اُن پر اشکال</u> :سورۃ الکھف کی آیت ۱۲ کے الفاظ یہ ہیں :
ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْا اَمَدًا اس آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے:
"پھر ہم نے اُنہیں اٹھا دیا تا کہ ہم یہ جان لیں کہ اُن کے غار میں ٹھہرنے کی مدت کو دو جماعتوں میں سے کس نے زیادہ رکھا ہے۔"

اس ترجمہ پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اُنہیں اٹھانے سے پہلے کیا اللہ کو علم نہیں تھا کہ دو جماعتوں میں سے کس کو اُن کے ٹھہرنے کی مدت زیادہ یاد تھی اور یہ علام الغیوب ہونے کے خلاف ہے۔ اس لئے یہاں علم بمعنیٰ علمِ ظہور ہے یعنی اللہ تو ازل سے اس چیز کا عالم تھا لیکن وہ اپنے اس علم کو لوگوں پر ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ دو جماعتوں میں سے کون سی جماعت کو اُن کے ٹھہرنے کی مدت کا زیادہ علم ہے۔

"<u>اللہ کے علم کے حادث ہونے کا اِشکال اور اس کے جوابات</u> :ہماری تحقیق یہ ہے کہ علم بہ معنیٰ انکشاف بھی ہے اور علم بمعنیٰ اظہار بھی۔ یہاں پر علم بمعنیٰ اظہار ہے۔ اللہ تعالیٰ کو خود تو علم تھا ہی لیکن وہ دوسروں پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اُن میں سے کس کو اُن کے غار میں ٹھہرنے کی مدت زیادہ یاد تھی' اس لئے اوپر ترجمہ اس کے مطابق کیا گیا ہے۔" (تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی' جلد ہفتم' ص ۶۰).

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی (م ۶۰۶ ھ) لکھتے ہیں :

''بہ ظاہر لِنَعْلَمَ کے لفظ کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کو اس لئے اٹھایا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ علم حاصل ہو جائے اور اس وقت یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہو گا کہ آیا حوادث کے وقوع سے پہلے اللہ تعالیٰ کو اُن کا علم ہوتا ہے یا نہیں؟ ہشام نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کو حوادث کا اس وقت علم ہوتا ہے جب وہ حادث ہوتے ہیں اور اس نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔ قرآن مجید میں اس کے نظائر بہت ہیں۔''

(۱) اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ (البقرۃ: ۱۴۳)

''تا کہ ہم ظاہر کر دیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور اُس کو اُس سے ممتاز کر دیں جو اپنی ایڑیوں پر پلٹ جاتا ہے۔'' (۲ : ۱۴۳)

(۲) وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَیَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ ○ (آلِ عمران : ۱۴۲)

''حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے مجاہدوں اور صبر کرنے والوں کو (دوسروں سے) ممتاز نہیں کیا۔'' (۳ : ۱۴۲)

(۳) اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی الْاَرْضِ زِیْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَیُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ○ (الکھف : ۷)

''روئے زمین پر جو کچھ ہے، ہم نے اُسے اس زمین کی زینت بنا دیا ہے تا کہ ہم یہ ظاہر کریں کہ اُن میں سے کون سب سے اچھے کام کرنے والا ہے۔'' (۱۸ : ۷)

(تفسیر کبیر، ج ۷، ص ۴۳۰ مطبوعہ بیروت ۱۴۱۵ھ)

امام ابوعبداللہ قرطبی مالکی (م ۶۶۸ھ) اس اشکال کو دُور کرنے کے لئے لکھتے ہیں:

''لِنَعْلَمَ کا معنی یہ ہے کہ وہ چیز وجود اور مشاہدہ میں آجائے یعنی ہم اس چیز کو بحیثیت موجود بالفعل جان لیں ورنہ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے یہ علم تھا کہ دو جماعتوں میں سے کون سی جماعت کو اُن کے غار میں ٹھہرنے کی مدّت زیادہ یاد ہے۔'' (الجامع لاحکام القرآن، جز ۱۰، ص ۳۲۶ مطبوعہ بیروت ۱۴۱۵ھ)

قاضی عبداللہ بن عمر بیضاوی (م ۶۸۵ھ) لکھتے ہیں:

''تا کہ ہمارے علم کا تعلق اس کے حال کے مطابق ہو جائے جیسا کہ پہلے ہمارے علم کا تعلق اس کے استقبال کے مطابق تھا۔'' (تفسیر بیضاوی علی حاشی الخفاجی، ج ۶، ص ۱۳۸ مطبوعہ بیروت ۱۴۱۷ھ)

دو جماعتوں کا مصداق: اس میں بھی اختلاف ہے کہ یہ دو جماعتیں کون سی تھیں۔ علماء نے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ایک جماعت وہ بادشاہ ہیں جو یکے بعد دیگرے مسندِ اقتدار پر آتے رہے اور دوسری جماعت سے مراد اصحابِ کہف ہیں اور مجاہد نے یہ کہا ہے کہ جب اصحابِ کہف بیدار ہوئے تو غار کی مدّتِ قیام کے متعلق اُن میں اختلاف ہو گیا اور اس سے مراد اُن کی دو جماعتیں ہیں۔ فرّاء نے کہا ہے کہ

۴۔۵۵ (اصحاب الکھف والرقیم Men of the Cave and Ar-Raqeem)

مسلمانوں کی دو جماعتوں میں اُن کی مدتِ قیام کے متعلق اختلاف ہو گیا۔ مجاہد کا دوسرا قول یہ ہے کہ دو جماعتوں سے مراد ایک مسلمانوں کی جماعت ہے اور دوسری کافروں کی۔'' (''جامع البیان'' جز ۱۵، ص ۲۵۸۔۲۵۷)

''248 عیسوی کے اواخر میں دقیانوس (Decius) روما کے تخت پر متمکن ہوا تو اُس نے ایک قانون کے ذریعے مسیحی دین پر پابندی لگا دی۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا کے مقالہ نگار کے خیال کے مطابق یہ پہلا رومی فرمانروا تھا جس نے مسیحیت کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کا جامع منصوبہ بنایا اور اپنی ساری قلمرو میں عیسائیوں کے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ (Encyclopaedia Britannica, Vol. 7, p 120) عیسائی آبادیوں کو واضح طور پر بتا دیا گیا کہ اگر زندگی کی ضرورت ہے تو عیسائیت چھوڑ دو اور جن بتوں اور دیوی دیوتاؤں کی ہم پوجا کرتے ہیں، صرف اُنہی کی پوجا کرو۔ جب دقیانوس نے عیسائیوں کی پکڑ دھکڑ شروع کی تو چند نوجوان اپنی دولتِ ایمان بچانے کے لئے وہاں سے چل نکلے۔ قریب ہی ایک پہاڑ تھا جس میں ایک وسیع غار تھا جس میں وہ جا چھپے۔ بارگاہِ الٰہی میں گڑگڑا کر التجائیں کرنے لگے کہ وہ اُنہیں اس سنگدل بادشاہ کے شر سے بچائے اور اُنہیں نعمتِ ایمان سے محروم نہ کرے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی آزمائش میں اُن کا قدم لڑکھڑا جائے اور دامنِ حق اُن کے ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ رب تعالیٰ نے اُن کی فریاد سنی اور اُن پر نیند مسلط کر دی۔ اس غار کا منہ شمال کی جانب تھا۔ اس لئے اس میں دھوپ تو داخل نہ ہوتی لیکن ہوا اور روشنی کا گزر اچھی طرح سے تھا۔ اس لئے یہاں اُن کے جسم اس طویل نیند کے باوجود محفوظ تھے۔ قدرت مناسب وقفہ کے بعد اُن کے پہلو بھی بدل دیتی۔ دُور سے دیکھنے والے اُنہیں بیدار خیال کرتے حالانکہ وہ محوِ خواب تھے۔ اُن کے ساتھ ایک کُتا بھی ہو لیا تھا جسے اُنہوں نے بھگانے کے لئے بڑے جتن کئے لیکن اُس نے ساتھ نہ چھوڑا۔ جب وہ غار میں جا کر آسودۂ خواب ہو گئے تو وہ بھی پاسبانی کی خاطر غار کے دہانے پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ رہا۔''

''اس طرح ایک سو ستاسی (187) برس کا عرصہ گزر گیا۔ دقیانوس کیفرِ کردار کو پہنچا۔ مختلف بادشاہ آئے اور اپنی چند روزہ شاہی کا ڈنکا بجا کر چل دئے۔ پرانے شہر اُجڑے، نئی بستیاں آباد ہوئیں۔ افیسس کے شہر میں بھی اس دو سو سال کے زمانہ میں کیا کچھ شکست و ریخت نہ ہوئی ہو گی۔ جب حکمتِ الٰہی نے چاہا تو اِن سونے والوں کو بیدار کر دیا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔ خیال اُنہیں یہ گزرا کہ وہ آج معمول سے کچھ زیادہ ہی سوئے ہیں لیکن یہ بات اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ اُنہیں یہاں بے سُدھ پڑے دو صدیاں بیت چکی ہیں۔ اس لئے وہ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ وہ کتنی دیر سوئے ہیں۔''

''اُن کی آنکھیں کیا کھلیں کہ بشری تقاضے بھی بیدار ہو گئے۔ اُنہیں بھوک نے ستانا شروع کیا۔ اُنہوں نے اپنے ایک ساتھی کو جس کا نام یملیخا بتایا جاتا ہے، بستی کی طرف بھیجا کہ اُن کے لئے کھانا خرید لائے۔ جب وہ غار سے نکل کر شہر کی طرف روانہ ہوا تو وادی و کوہسار وہی تھے لیکن ماحول میں اجنبیت کے آثار قدم قدم پر حیران

کر رہے تھے۔ شہر میں گئے تو در و دیوار، گلی کوچے زبانِ حال سے کچھ اور ہی داستان سنا رہے تھے۔ یملیخا یہ سوچ رہے تھے کہ بارِ خدا! ایک آٹھ پہر میں یہ کیا انقلاب آ گیا! کل جب چھوڑ کر گئے تو اس شہر کا کیا حال تھا اور آج کیا ہے۔ ایک نانبائی کی دکان پر گئے اور اُسے کھانا دینے کے لئے کہا۔ اُس نے کھانا دیا۔ اُنہوں نے وہی پرانا سکّہ جو یہاں سے جاتے ہوئے وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے، اُس کی طرف بڑھا دیا۔ دکاندار اُس سکّہ کو دیکھ کر ہکا بکا ہو گیا۔ معاملہ نے طول پکڑا تو اِردگرد کے دکاندار بھی اکٹھے ہو گئے۔ یملیخا پر یہ الزام لگایا گیا کہ اُسے کوئی پرانا شاہی خزانہ ہاتھ آیا ہے۔ معاملہ حاکمِ شہر تک پہنچا۔ یہاں آ کر حقیقتِ حال سے پردہ اُٹھا۔ اُنہیں پتہ چلا کہ یہ ان نوجوانوں میں سے ایک ہے جو دقیانوس کے مظالم سے بھاگ کر ایک غار میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ لوگوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ سب اُن کی جھلک دیکھنے کے لئے غار تک گئے۔ وہاں دوسرے ساتھی یملیخا کا انتظار کرتے کرتے اُکتا گئے اور اُن کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے۔ جب اُنہوں نے غار کی طرف ایک جمِ غفیر آتے دیکھا تو اُنہیں یقین ہو گیا کہ اُن کا ساتھی پکڑا گیا ہے اور اُس کے بتلانے پر یہ ہجوم اُنہیں گرفتار کرنے کے لئے دوڑا چلا آ رہا ہے۔ جب لوگ حاکمِ شہر کی قیادت میں وہاں پہنچے، تب اصحابِ کہف کو معلوم ہوا کہ اُنہیں یہاں ٹھہرے صدیاں گزر چکی ہیں اور اب حالات کا رُخ بدل گیا ہے اور عیسائیت کا ہر طرف چرچا ہے۔ صرف رعایا ہی نہیں بلکہ حکومت بھی اس دین کو قبول کر چکی ہے۔ مؤرّخین کے بیان کے مطابق یہ واقعہ 437 عیسوی میں پیش آیا جبکہ روما کے تخت پر تھیوڈوسیس (Dheosis) متمکن تھا۔'' (ضیاء القرآن، ج ۳، ص ۱۴)

اصحابِ کہف کے قصّہ کے معجزاتی پہلو: چونکہ اصحابِ کہف نے اپنے خالق اللہ پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے اپنے آپ کو صرف اور صرف اُسی کے لئے وقف کر دیا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن پر اپنی رحمت کی برکھا کی بوچھاڑ کر دی اور اُن کی حالت کو آرام و آسائش میں بدل دیا (سورۃ الکھف: آیت ۱۶)۔ قادرِ مطلق ہونے کے حوالہ سے اُس نے اپنا قانونِ فطرت بھی بدل دیا۔ قرآن مجید اس قصّہ کے معجزاتی پہلو کو اس طرح بیان کرتا ہے:

وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَإِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًاO وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ وَّ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًاO (الکھف: ۱۷، ۱۸)

''اور جب دھوپ نکلتی رہے تو (اے مخاطب!) تو اُسے دیکھتا ہے کہ وہ اُن کے غار سے دائیں جانب کو بچی رہتی ہے اور جب وہ چھپتی ہے تو وہ اُن سے بائیں جانب کو کترا جاتی ہے جبکہ وہ اس (غار) کے ایک کشادہ موقع میں تھے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے، جسے اللہ ہدایت دیتا ہے وہی ہدایت پاتا ہے اور جسے وہ بے راہ کر دیتا ہے تو آپ اُس کے لئے کوئی مددگار، راہ بتانے والا نہ پائیں گے۔ اور (اے سننے والے!) تو اُنہیں بیدار خیال کرے گا حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں اور ہم (وقفوں کے ساتھ) اُنہیں

دائیں جانب اور بائیں جانب کروٹیں بدلاتے رہتے ہیں اور اُن کا کتا (اُن کی) چوکھٹ پر اپنے دونوں بازو پھیلائے (بیٹھا) ہے۔ اگر تو اُنہیں جھانک کر دیکھے تو اُن سے پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتا اور تیرے دل میں اُن کی دہشت بھر جاتی۔'' (۱۷، ۱۸ : ۱۸)

رب تعالیٰ نے اُنہیں برسوں تک بحالتِ خواب زندہ رکھا جبکہ وہ زندگی کی بقاء کے وسائل سے یکسر محروم تھے۔ یہ اس لئے کیا کہ لوگوں کو یقین ہو جائے کہ بلا شبہ اسی طرح وہ مخلوق کو مرنے کے بعد بھی زندہ کرے گا اور بعث بعد الموت کا مسئلہ حق ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے اُنہیں بیدار کیا اور اُن میں سے ایک نوجوان شہر میں کھانا خرید کرنے گیا تو اُس زمانہ میں بستی والوں کے درمیان ''بعث بعد الموت'' پر جھگڑا اور مناقشہ جاری تھا۔ ایک جماعت کہتی تھی کہ فقط روح کا بعث ہوگا اور دوسری جماعت روح اور جسم دونوں کے زندہ ہونے کی قائل تھی۔ یہ تو نصاریٰ کی جماعتیں تھیں اور جو نبطی مشرک تھے وہ سرے سے بعث بعد الموت ہی کے منکر تھے۔ ایسے نازک وقت میں رب تعالیٰ نے اُس شخص کو غار سے بیدار کر کے بھیجا اور اس طرح جب اصحابِ کہف کا واقعہ سب پر ظاہر ہو گیا تو اُس نے علی رؤوس الاشہاد یہ نظیر قائم کر دی کہ جس طرح برسوں تک اسبابِ حیات سے محروم رہنے کے باوجود روح کے ساتھ جسم بھی صحیح و سالم رہا' اُسی طرح بعث بعد الموت' روح اور جسم دونوں سے تعلق رکھتا ہے اور جس طرح سوئے رہنے کے بعد اصحابِ کہف بیدار کر دیئے گئے' اسی طرح قبر (عالمِ برزخ) میں ہزاروں برس مردہ رہنے کے بعد قیامت میں زندہ کر دیئے جائیں گے۔ اسی لئے قرآن مجید نے اعلان کیا :

وَ كَذٰلِكَ اَعۡثَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ لِيَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيۡبَ فِيۡهَا اِذۡ يَتَنَازَعُوۡنَ بَيۡنَهُمۡ اَمۡرَهُمۡ فَقَالُوا ابۡنُوۡا عَلَيۡهِمۡ بُنۡيَانًا رَبُّهُمۡ اَعۡلَمُ بِهِمۡ قَالَ الَّذِيۡنَ غَلَبُوۡا عَلٰٓى اَمۡرِهِمۡ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيۡهِمۡ مَّسۡجِدًا ۝ (الکھف : ۲۱)

''اور اس طرح ہم نے اُن (کے حال پر) اُن لوگوں کو مطلع کر دیا تا کہ وہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ (بھی) کہ قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ جب وہ (بستی والے) آپس میں اُن کے معاملہ میں جھگڑا کرنے لگے (جب اصحابِ کہف وفات پا گئے) تو اُنہوں نے کہا کہ اُن (کے غار) پر ایک عمارت (بطور یادگار) بنا دو' اُن کا رب اُن (کے حال) سے خوب واقف ہے' اُن (ایمان والوں) نے کہا جنہیں اُن کے معاملہ پر غلبہ حاصل تھا کہ ہم اُن (کے دروازہ) پر ضرور ایک مسجد بنائیں گے۔'' (۲۱ : ۱۸)

سَيَقُوۡلُوۡنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمۡ كَلۡبُهُمۡ وَيَقُوۡلُوۡنَ خَمۡسَةٌ سَادِسُهُمۡ كَلۡبُهُمۡ رَجۡمًا بِالۡغَيۡبِ وَيَقُوۡلُوۡنَ سَبۡعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمۡ كَلۡبُهُمۡ قُلۡ رَّبِّىۡۤ اَعۡلَمُ بِعِدَّتِهِمۡ مَّا يَعۡلَمُهُمۡ اِلَّا قَلِيۡلٌ فَلَا تُمَارِ فِيۡهِمۡ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا وَّلَا تَسۡتَفۡتِ فِيۡهِمۡ مِّنۡهُمۡ اَحَدًا ۝ (الکھف : ۲۲)

''عنقریب بعض لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا اُن کا کتا تھا اور بعض کہیں گے کہ وہ پانچ تھے' چھٹا اُن کا کتا تھا' یہ اُن کی اٹکل کے تکّے ہیں اور بعض کہیں گے کہ وہ سات تھے اور آٹھواں اُن کا کتا

تھا۔ فرما دیجئے: میرا رب ہی اُن کی تعداد کو خوب جانتا ہے اور سوائے چند لوگوں کے اُن (کی صحیح تعداد) کا علم کسی کو نہیں، سو آپ کسی سے اُن کے بارے میں بحث نہ کیا کریں سوائے اس قدر وضاحت کے جو ظاہر ہو چکی ہے اور نہ اُن میں سے کسی سے اُن (اصحابِ کہف) کے بارے میں کچھ دریافت کریں۔'' (۱۸:۲۲)

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ فرماتے ہوئے کہ ''اُن قلیل میں سے جنہیں اُن کی تعداد کا علم ہے، ایک میں بھی ہوں'' ارشاد فرمایا کہ وہ سات تھے اور آٹھواں اُن کا کتا تھا اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تعداد کے متعلق پہلے دو مقولوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ ''یہ باتیں اٹکل کے تیر ہیں''۔ مگر تیسرا قول ذکر کرنے کے بعد ایسی کوئی بات نہیں کی یعنی پہلے دو قول کہنے والوں کے ظن اور گمان پر مبنی تھے اور تیسرا قول ظنی نہیں ہے بلکہ یقینی اور حتمی ہے۔ اس لئے یہ سات (۷) صحیح تعداد ہے۔'' (تفسیر ابنِ کثیر، جلد سوم)

صالحین کی قبروں کے پاس مسجد بنانے پر معترضین کے اعتراضات اور اُن کے جوابات: صالحین کی قبور کے قرب وجوار میں مسجد بنانے کے عدمِ جواز کو ثابت کرنے کے لئے سیّد ابوالاعلیٰ مودودی (م ۱۳۹۹ھ) لکھتے ہیں:

''مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے قرآن مجید کی اس آیت کا بالکل الٹ مفہوم لیا ہے۔ وہ اسے دلیل ٹھہرا کر مقابرِ صلحاء پر عمارتیں اور مسجدیں بنانے کو جائز قرار دیتے ہیں حالانکہ یہاں قرآن اُن کی اس گمراہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو نشانی ان ظالموں کو بعث بعد الموت اور امکانِ آخرت کا یقین دلانے کے لئے دکھائی گئی تھی، اسے اُنہوں نے ارتکابِ شرک کے لئے ایک خداداد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ چلو، کچھ اور ولی پوجا پاٹ کے لئے ہاتھ آ گئے۔ پھر آخر اس آیت سے قبورِ صالحین پر مسجدیں بنانے کے لئے کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے جبکہ نبی ﷺ کے یہ ارشادات اس کی نہی میں موجود ہیں:۔

(۱) لَعَنَ اللّٰهُ تَعَالٰى زَائِرَاتِ الْقُبُوْرِ وَالْمُتَّخِذِيْنَ عَلَيْهَا الْمَسْجِدَ وَالسُّرُجَ

''اللہ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر، اور قبروں پر مساجد بنانے اور چراغ روشن کرنے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔'' (احمد، ترمذی، نسائی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

(۲) اَلَا وَاِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوْا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِيَاءِ هِمْ مَسٰجِدَ فَاِنِّيْ اَنْهٰكُمْ عَنْ ذٰلِكَ

''خبردار رہو، تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے۔ میں تمہیں ایسا کرنے سے روکتا ہوں۔'' (صحیح مسلم)

(۳) لَعَنَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَلْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَاءِ هِمْ مَسٰجِدَ (بخاری، مسلم، احمد، نسائی)

''اللہ نے یہود اور نصاریٰ پر لعنت فرمائی، اُنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔''

(۴) اِنَّ اُولٰٓئِكَ اِذَا كَانَ فِيْهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ مَاتَ بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهٖ مَسْجِدًا وَ صَوَّرُوْا فِيْهِ تِلْكَ الصُّوَرَ اُولٰٓئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (بخاری، مسلم، احمد، نسائی)

''اُن لوگوں کا حال یہ تھا کہ اگر اُن میں کوئی مردِ صالح ہوتا تو اُس کے مرنے کے بعد اُس کی قبر پر مسجدیں بناتے اور اُس کی تصویریں تیار کرتے تھے۔ یہ قیامت کے دن بدترین مخلوقات ہوں گے۔''
(''تفہیم القرآن'، جلد سوم، ص ۱۸، ۱۹، مطبوعہ لاہور، ۱۹۸۲ء)

''سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا ہے کہ عیسائی پادری اور رومی حکمرانوں نے مسجد بنائی تھی اور یہ اُن کا گمراہانہ فعل تھا۔ مودودی صاحب کا یہ خیال غلط ہے۔ عیسائی پادری تو غار کے اوپر اصحابِ کہف کی یادگار قائم کرنے کے لئے ایک عمارت بنانا چاہتے تھے جبکہ مسلمان وہاں مسجد بنانا چاہتے تھے اور بالآخر اُنہی کی رائے غالب رہی۔

صالحین کی قبور کے پاس مسجد بنانے کی ممانعت کے محامل : (۱) محولہ بالا احادیث (۳و۴) کی بابت قاضی عیاض بن موسیٰ اندلسی (م ۵۴۴ھ) لکھتے ہیں :

''ائمہ مسلمین نے نبی ﷺ کی قبر کی جگہ کو قبلہ بنانے سے منع کیا ہے کیونکہ جب نماز میں نمازیوں کا منہ آپ ﷺ کی طرف ہوگا تو وہ نماز صورۃً آپ ﷺ کی عبادت ہو جائے گی۔ اس وجہ سے صحابہ نے قبرِ مبارک کی بائیں جانب ایک دیوار بنادی حتیٰ کہ اب جو شخص وہاں نماز پڑھے گا، اُس کے لئے نماز میں آپ کی طرف منہ کرنا ممکن نہیں ہوگا۔'' (''اِکمال العلم بفوائد مسلم'، جلد دوم، ص ۴۵۱، مطبوعہ بیروت، ۱۴۱۹ھ)

''اس حدیث سے یہ واضح ہو گیا کہ صالحین کی قبر کے پاس نماز پڑھنا اُس وقت منع ہے جب نمازی اور قبر کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو اور جب نمازی اور قبر کے درمیان دیوار ہو یا اور کوئی حائل ہو تو پھر قبر کے پاس نماز پڑھنا ممنوع نہیں ہے۔ لہٰذا صالحین کی قبروں کے جوار میں مساجد کا بنانا بھی جائز ہے کیونکہ جب قبر کے پاس مسجد بنائی جائے گی تو مسجد کی دیوار قبر اور نمازی کے درمیان حائل ہو جائے گی۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی قبرِ مبارک کے ساتھ مسجدِ نبوی بنی ہوئی ہے اور اُس کی دیواریں قبلہ اور نمازی کے درمیان حائل ہیں۔'' (تبیان القرآن، ج ۷)

(۲) علامہ شرف الدین حسین بن محمد الطیبی (م ۷۴۳ھ) لکھتے ہیں :

''نبی ﷺ کو یہ خطرہ تھا کہ مسلمان آپ کی قبر کی اس طرح تعظیم کریں گے جس طرح یہود و نصاریٰ نے اپنے نبیوں کی قبروں کی تعظیم کی تھی۔ اس لئے آپ نے یہود و نصاریٰ اور اُن کے کاموں پر لعنت فرمائی تاکہ مسلمان آپ کی قبرِ انور کے ساتھ اُن کی طرح معاملہ نہ کریں کیونکہ یہود و نصاریٰ اپنے نبیوں کی تعظیم کے لئے اُن کی قبروں کو سجدہ کرتے تھے اور اُنہیں قبلہ بناتے تھے۔ وہ نماز میں ان قبروں کی طرف منہ کرتے تھے اس طرح اُنہوں نے اُن کی قبور کو بُت بنا لیا تھا۔ اس لئے آپ نے اُن پر لعنت کی اور مسلمانوں کو اس کام سے منع فرمادیا۔''

لیکن جس شخص نے کسی مردِ صالح کے قرب وجوار میں مسجد بنائی یا اُس کے مقبرہ میں نماز پڑھی اور اُس کی روح سے فیض کرنے کا قصد کیا کہ اس مردِ صالح کی عبادات کا اثر اُس تک پہنچے اور نماز میں اُس مردِ صالح کی تعظیم اور اُس کی طرف توجہ کرنے کا ارادہ نہیں کیا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قبر مسجدِ حرام میں حطیم کے پاس ہے' اس کے باوجود یہ مسجد روئے زمین پر نماز پڑھنے کی افضل ترین جگہ ہے۔''

''نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے زیادہ تاکید کے لئے مکرر فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو مساجد نہ بناؤ' میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں (صحیح مسلم) مقبرہ میں نماز پڑھنے کے متعلق اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے اسے مکروہ کہا ہے خواہ وہاں کی مٹی بھی پاک ہو اور جگہ بھی پاک ہو۔ اُن کا استدلال اس حدیث سے ہے اور بعض علماء نے کہا کہ مقبرہ میں نماز پڑھنا جائز ہے اور اس حدیث کی یہ تاویل کی ہے کہ غالب حال یہ ہے کہ قبرستان کی زمین مُردوں کے جسموں اور اُن کی آلائش اور پیپ وغیرہ سے مخلوط اور ملوث ہوتی ہے اور یہ ممانعت اُس جگہ کی نجاست کی وجہ سے ہے۔ اگر جگہ پاک ہو تو پھر وہاں نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' [''الکاشف عن حقائق السنن'' (شرح الطیبی) جلد دوم' صفحہ ۲۳۵' مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی)

(۳) مُلّا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ) نے علامہ طیبی کی عبارت نقل کی ہے اور مزید لکھا ہے:
''حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قبر کی صورت حطیم میں میزابِ رحمت کے نیچے ہے اور حطیم میں اور حجرِ اسود اور میزاب کے درمیان ستّر (۷۰) نبیوں کی قبریں ہیں۔'' (مرقات' ج ۲' ص ۲۰۲' مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان' ۱۳۹۲ بحوالہ تبیان القرآن' جلد ۷' صفحہ ۸۲)

(۴) ''شیخ انور شاہ کشمیری (م ۱۳۵۲ھ) نے اس حدیث کی شرح میں علامہ الطیبیؒ کی عبارت نقل کی ہے۔'' (فیض الباری' جلد دوم' صفحہ ۴۳' مطبوعہ مطبع حجازی قاہرہ' ۱۳۵۷ھ)

(۵) ''حافظ شہاب الدین ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) اور علامہ احمد قسطلانیؒ (م ۹۱۱ھ) نے لکھا ہے:
''جو شخص کسی مردِ صالح کے جوار میں مسجد بنائے اور اُس کے قرب سے برکت حاصل کرنے کا ارادہ کرے نہ کہ اُس کی تعظیم یا نماز میں اُس کی طرف توجہ کا تو وہ اس وعید میں داخل نہیں ہے۔'' (فتح الباری' ج ۱' ص ۵۲۵' مطبوعہ لاہور' ۱۴۰۱ھ)

(۶) علامہ وشتانی ابی مالکی (م ۸۲۸ھ) لکھتے ہیں:
''یہود و نصاریٰ انبیاء کی قبروں کو سجدہ کرتے تھے اور اُن قبروں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ اُنہوں نے اِن قبروں کو بُت بنا لیا تھا اس لئے مسلمانوں کو قبروں کے پاس اس طرح کے کاموں سے منع فرمایا لیکن جس نے کسی مردِ صالح کے قریب مسجد بنائی یا کسی مقبرہ میں نماز پڑھی تا کہ اُس مردِ صالح کے آثار سے تبرک حاصل کرے اور اُس جگہ اُس کی دعا قبول ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس پر دلیل یہ ہے

کہ مسجد حرام میں حطیم کے پاس حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قبر ہے۔ اس کے باوجود نماز پڑھنے کے لئے وہ جگہ روئے زمین میں سب سے افضل ہے۔" (اکمال اکمال المعلم' ج ۲' ص ۴۲۷' مطبوعہ بیروت ۱۴۱۵)

صالحین کے جوار میں مسجد بنانے پر مفسرین کی تصریحات :(۱) علامہ محمود بن عمر زمخشری خوارزمی (م ۵۳۸ھ) سورۃ الکہف کی آیت ۲۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"مسلمانوں میں سے جو اصحاب کہف کے معاملات میں غالب دخل رکھتے تھے' اُنہوں نے کہا کہ ہم غار کے دروازہ پر مسجد بنائیں گے تاکہ مسلمان اس مسجد میں نماز پڑھیں اور اُس جگہ سے برکت حاصل کریں۔"
(الکشّاف' جلد ۲' ص ۶۳۵' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت ۱۴۱۸ھ)

(۲) قاضی احمد بن محمد خفاجی حنفی (م ۱۰۶۹ھ) لکھتے ہیں:

"غار کے دروازہ پر مسلمانوں کا مسجد بنانا اس پر دلالت کرتا ہے کہ صالحین کی قبروں کے پاس مسجد بنانا جائز ہے جیسا کہ الکشّاف میں اس طرف اشارہ ہے۔" (عنایۃ القاضی' ج ۶' ص ۱۵۲' بیروت ۱۴۱۷ھ)

(۳) علامہ ابوالبرکات عبداللہ بن محمود النسفی الحنفی (م ۷۱۰ھ) لکھتے ہیں:

"مسلمان اور اُن کا بادشاہ جو اصحابِ کہف کے معاملہ پر غالب تھے' اُنہوں نے کہا کہ ہم غار کے منہ پر مسجد بنائیں گے اور اس جگہ سے برکت حاصل کریں گے۔" (مدارک التنزیل علی ہامش الخازن' ج ۳' ص ۲۰۶)

(۴) قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی نقشبندی (م ۱۲۲۵ھ) لکھتے ہیں:

"یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اولیاء اللہ کے مقابر کے پاس مسجد بنانا جائز ہے تاکہ اُن سے برکت حاصل کی جائے (الی قولہ) جن احادیث میں قبروں کے پاس نماز پڑھنے کی ممانعت آئی ہے' اُن کا محمل یہ ہے کہ قبروں کی طرف منہ کر کے نماز نہ پڑھو جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔" (تفسیر مظہری' ج ۶' ص ۲۳' ۲۴)

(۵) صدرالافاضل سیّد محمد نعیم الدین مرادآبادی (م ۱۳۶۷ھ) لکھتے ہیں:

"اس آیت سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کے مزارات کے قریب مسجدیں بنانا اہلِ ایمان کا قدیم طریقہ ہے اور قرآن کریم میں اس کا ذکر فرمانا اور اُس سے منع نہ کرنا' اس فعل کے درست ہونے کی قوی ترین دلیل ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بزرگوں کے جوار سے برکت حاصل ہوتی ہے۔ اسی لئے اہل اللہ کے مزارات پر لوگ حصولِ برکت کے لئے جایا کرتے ہیں اور اسی لئے قبروں کی زیارت سنت اور موجبِ ثواب ہے۔" ("خزائن العرفان" برحاشیہ کنزالایمان ص ص ۳۰۴ مطبوعہ تاج کمپنی کراچی' لاہور)

(۶) امام ابن جریر (م ۳۱۰ھ) لکھتے ہیں :۔
''عبداللہ بن عبید بن عمیر نے بیان کیا کہ جو لوگ اصحاب کہف کے غار پر مطلع ہوئے تھے' اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اندرونِ غار کی جگہ سے اندھا کر دیا تھا۔ مشرکین نے کہا: ہم اس جگہ ایک عمارت بنائیں گے۔ وہ ہمارے آباء واجداد کے بیٹے ہیں' ہم اس عمارت میں اللہ کی عبادت کریں گے۔ مسلمانوں نے کہا: بلکہ ہم اس کے زیادہ حقدار ہیں' وہ ہم میں سے ہیں' ہم اس جگہ پر ایک مسجد بنائیں گے' اس میں نماز پڑھیں گے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے۔'' (''جامع البیان'' رقم الحدیث: ۱۷۳۱۷' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵)

(۷) علامہ ابن جوزی (م ۵۹۷ھ) لکھتے ہیں :
''ابن قتیبہ نے کہا: مفسرین نے کہا ہے کہ جن لوگوں نے مسجد بنائی تھی' وہ بادشاہ اور اُس کے مؤمن اصحاب تھے۔'' (''زاد المسیر'' جلد پنجم' صفحہ ۱۲۴' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

(۸) علامہ ابن الحیان اندلسی (م ۷۵۴ھ) رقمطراز ہیں :
''جس نے اُس غار پر عمارت بنانے کی دعوت دی تھی' وہ ایک کافر عورت تھی۔ اُس کا ارادہ تھا کہ وہاں ایک گرجا گھر بنائے یا کفریہ کاموں کے لئے عمارت بنائے لیکن مسلمانوں نے اُسے منع کیا اور وہاں ایک مسجد بنا دی۔'' (''البحر المحیط'' جلد ہفتم' ص ۱۵۸' ۱۵۹' مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۲ھ)

(۹) اولیاء وصلحاء کے مقبروں میں نماز پڑھنے کے جواز میں شیخ محمد ذکی نے مشہور مسلمانوں کی مثالیں دی ہیں۔
''ایک روایت کے مطابق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ امام ابوحنیفہ (م ۱۵۰ھ) رحمۃ اللہ علیہ کے مقبرے پر باقاعدگی سے نماز پڑھتے تھے اور آپ کی دعائیں قبول ہوتی تھیں۔'' (''قضایائے وسیلہ''۔ ذکی ابراہیم' صفحہ ۴۷)

(۱۰) مفتی محمد شفیع دیوبندی (م ۱۳۹۶ھ) اس آیت ۲۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں :
''اس واقعہ سے اِتنا معلوم ہوا کہ اولیاء' صلحاء کی قبور کے پاس نماز کے لئے مسجد بنا دینا کوئی گناہ نہیں اور جس حدیث میں قبورِ انبیاء کو مسجد بنا دینے والوں پر لعنت کے الفاظ آئے ہیں' اس سے مراد خود قبور کو سجدہ گاہ بنا دینا ہے جو بالاتفاق شرک وحرام ہے۔'' (معارف القرآن' ج ۵' ص ۵۷۷' مطبوعہ کراچی ۱۴۱۲ھ)

اس لئے سیّد مودودی کا یہ لکھنا صحیح نہیں ہے کہ مسجد عیسائی پادریوں نے بنائی تھی اور یہ ایک گمراہانہ فعل تھا۔

<u>ممانعت کی احادیث کا منسوخ ہونا</u>: حافظ یوسف بن عبداللہ القرطبی (م ۴۶۳ھ) لکھتے ہیں :

''ان احادیث کی بناء پر بعض علماء' صالحین کے قرب میں مساجد بنانے کو ناجائز کہتے ہیں لیکن ان کے

معارض یہ حدیث ہے:

''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھے پانچ ایسی چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں: ایک ماہ کی مسافت سے میرا رعب طاری کر دیا گیا ہے، تمام روئے زمین کو میرے لئے مسجد اور آلۂ طہارت بنا دیا گیا ہے۔ میری اُمّت میں سے جس شخص نے جہاں بھی نماز کا وقت پایا وہ نماز پڑھ لے اور میرے لئے مالِ غنیمت حلال کر دیا گیا ہے جبکہ مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہیں کیا گیا تھا اور مجھے شفاعت کا منصب عطا کیا گیا ہے اور پہلے انبیاء کو ایک خاص مقام کی طرف بھیجا جاتا تھا اور مجھے تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔'' (صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۳۳۵، سنن نسائی)

''یہ رسول اللہ ﷺ کی فضیلت ہے کہ تمام روئے زمین کو آپ کے لئے مسجد بنا دیا گیا ہے اور تمام روئے زمین میں وہ جگہ بھی داخل ہے جو صالحین کے قرب و جوار میں ہو۔ لہٰذا اُس جگہ مسجد بنانا بھی جائز ہے اور وہاں نماز پڑھنا بھی جائز ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جن احادیث میں صالحین کے قرب میں مسجد بنانے کی ممانعت ہے، اُن سے یہ زیرِ نظر حدیث منسوخ ہو جائے گی تو یہ کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ حدیث نبی اکرم ﷺ کے فضائل میں ہے اور فضائل منسوخ نہیں ہوتے، نہ فضائل میں تخصیص ہوتی ہے اور نہ فضائل میں استثناء ہوتا ہے۔ نسخ صرف امر اور نہی میں جاری ہوتا ہے۔ اور جب ان احادیث میں تعارض ہے تو واضح ہو گیا کہ جس حدیث میں آپ نے فرمایا: تمام روئے زمین کو میرے لئے مسجد بنا دیا گیا ہے، وہ حدیث ان احادیث کے لئے ناسخ ہے جن میں صالحین کے پاس مسجد بنانے کی ممانعت ہے۔'' (صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۳۳۶۶ ؛ صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۵۲۰ ؛ سنن نسائی، رقم الحدیث: ۶۹۰۶ ؛ سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۷۵۳، بحوالہ تبیان القرآن، ج ۷، ص ص ۸۱۔۸۴)

سورۃ الکھف کی آیت ۲۵ میں شمسی اور قمری حساب کی طرف بھی اشارہ ہے جس میں فرمایا گیا:

وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا ○ (الکھف: ۲۵)

''اور وہ اپنی غار میں تین سو برس ٹھہرے رہے اور انہوں نے (اس پر) نو (سال) اور بڑھا دیئے۔''

''ابنِ کثیر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اوّل تین سو سال فرمایا اور یہ شمسی حساب کے مطابق ہے اور پھر وَازْدَادُوا تِسْعًا ○ کہہ کر نو سال کا اضافہ اس لئے کیا تاکہ شمسی حساب قمری حساب کے ساتھ مطابق ہو جائے مگر اوّل نظر میں بہ آسانی کہا جا سکتا ہے کہ آیت کی یہ تفسیر نہیں بلکہ تاویل ہے اس لئے کہ ایک طرف تو قرآن تذکیر و موعظت کے مقصد سے زائد تفصیلات کو دُور از کار کہتا ہے اور دوسری جانب خود ہی ایسی باتوں کے درپے ہوتا ہے جن کا موعظت و بصیرت سے کوئی خاص تعلق نہیں بلکہ یہ خالص علمِ ہیئت کا مسئلہ ہے۔'' (قصص القرآن، ص ۲۷۷)

توسّل کا فائدہ اٹھانے کا کون زیادہ مستحق ہے؟ قرآن مجید کی مدد سے ہم یہ ثابت کریں گے کہ

توسل (Mediation) کے عمل سے فائدہ اٹھانے کا کون زیادہ مستحق ہے؟ اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ مسلمان اور کافر دونوں ہی اپنے درجات کے تناسب سے توسّل سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ نہ صرف انسان بلکہ جانور بھی اولیاء اللہ سے فیض پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اصحابِ کہف کے کتے نے بھی اُن صلحاء کی صحبت پائی تو قرآن مجید نے بھی اس کا ذکرِ خیر کر کے اُسے وہ عزت بخشی کہ انسانوں کے لئے قابلِ رشک بنایا۔ رب تعالیٰ نے بظاہر اس معمولی حقیقت کو بھی بیان کر دیا ہے اور فرمایا ہے:

وَ کَلْبُھُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَیْهِ بِالْوَصِیْدِ (الکھف : ۱۸)

''اور اُن کا کتا (اُن کی) چوکھٹ پر اپنے دونوں بازو پھیلائے (بیٹھا) ہے۔'' (۱۸ : ۱۸)

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب کہا ہے:

سگِ اصحابِ کہف روزے چند   پئے نیکاں گرفت مردم شد
پسرِ نوح با بداں بہ نشست   خاندانِ نبوتش گم شد

اصحابِ کہف کو صدیوں زندہ رکھنے میں خدائی حکمت یہی تھی کہ اُنہیں آنے والی نسلوں کے لئے اللہ کی قدرتِ تامّہ کا نشان بنا دیا جائے۔ لیکن اس سے زیادہ حیران کن حقیقت یہ ہے کہ اُسی عرصہ کے دوران اُن کے دروازے پر اُنہی کی برکت سے بغیر کھائے پئے وہ زندہ بیٹھا رہا۔ اُن کا کتا ہونے کے ناطے سے وہ 309 برس زندہ رہا۔ اگر وہ کتا کسی اور کا ہوتا تو وہ مختصر سی مدّت تک بھی زندہ نہ رہتا اور کھانا پینا نہ ملنے کے باعث مر گیا ہوتا۔ اس میں ایک اور نکتہ یہ ہے کہ کتا اصحابِ کہف کا بھی نہیں تھا بلکہ وہ اُن کے نانبائی کا تھا۔ جب اصحابِ کہف سفر پر روانہ ہوئے تو وہ کتا بھی اُن کے ساتھ ہو لیا تھا اور قرآن مجید نے اصحابِ کہف کے ساتھ اُس کی بالعزم و بالجزم مصاحبت پر بالخصوص زور دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کتوں کا یہ انداز اور وضع تو قدرتی ہوتا ہے تو پھر اس میں ایسی کون سی خصوصی بات ہے جس کے باعث قرآن نے اس پر غیر معمولی زور دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتے نے صالحین اور اولیاء اللہ کی سنگت نہیں چھوڑی اور اُن کی دہلیز پر بیٹھے رہنے میں اپنی وفاداری ثابت کر دی۔ ان بزرگوں اور صالحین کی سنگت نے اُسے نہ صرف تین سو نو برس تک زندہ رکھا بلکہ اُسے دوسرے کتوں سے بھی ممتاز کر دیا۔ اِنہی صالح مردانِ خدا کے ساتھ کتے کے وفادارانہ رویّہ کی وجہ سے رب تعالیٰ نے اُن صالحین کے ذکر کے ساتھ ساتھ کتے (جس کا نام قطمیر بتایا جاتا ہے) کا بھی ذکر کر دیا۔''

کیا اصحابِ کہف اب تک حیات ہیں؟ عام طور پر مشہور ہے کہ اصحابِ کہف ابھی تک غار میں سو رہے ہیں اور زندہ ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بہ صراحت یہ فرمایا ہے کہ اصحابِ کہف کا انتقال ہو چکا:

قَالَ قَتَادَةُ غَزَا ابْنُ عَبَّاسٍ مَعَ حَبِیْبِ بْنِ مَسْلَمَةَ فَمَرُّوْا بِکَھْفٍ فِیْ بِلَادِ الرُّوْمِ فَرَأَوْا فِیْهِ عِظَامًا

فَقَالَ قَائِلٌ": هٰذِهٖ عِظَامُ اَهْلِ الْكَهْفِ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: لَقَدْ بُلِيَتْ عِظَامُهُمْ مِنْ اَكْثَرَ مِنْ ثَلَاثِ مِائَةِ سَنَةٍ (تفسیر ابن جریر)

"قتادہ کہتے ہیں: ابن عباس رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ حبیب بن مَسلمہ کے ساتھ ایک جنگ میں تشریف لے گئے۔ بلادِ روم میں اُن کا گزر اُس جگہ سے ہوا جہاں پہاڑی غاروں کا سلسلہ ہے۔ وہاں اُنہوں نے کسی غار کے اندر انسانوں کی ہڈیاں یا ڈھانچے دیکھے تو کسی کہنے والے نے کہا: یہ اہلِ کہف کی ہڈیاں ہیں۔ اس پر عبداللہ ابن عباس نے فرمایا: اُن کی ہڈیاں تو تین سو سال سے بھی زیادہ عرصہ ہوا' بوسیدہ ہو چکیں۔"

<u>نتائج و عِبر</u>: (۱) اگر ہمیں کوئی بات اپنی عقل کے مطابق عجیب و غریب معلوم ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے بھی واقعی کوئی عجیب بات ہے۔ اور اگر وہ عجیب ہے بھی تو ہمارے لئے ہے نہ کہ خالقِ کائنات کے لئے جس نے کائناتِ ہست و بود کو پیدا کیا اور پھر ایسے محکم نظام پر اُسے قائم کیا کہ عقل حیران ہے مگر آنکھ روزانہ اس کا مشاہدہ کرتی ہے اور قلب ہر لحہ اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ (اللہ تعالیٰ پر یہ بات کوئی بھاری نہیں ہے)۔"

(۲) "جب شر و فساد اور ظلم و سرکشی اس درجہ بڑھ جائے کہ اللہ کے نیک بندوں کے لئے کہیں پناہ نہ رہے تو اگرچہ عزیمت کا مرتبہ یہی ہے کہ کائنات کی رشد و ہدایت کی خاطر ہمہ قسم کی تکالیف برداشت کرنے اور کلمہِ حق پر کوہِ استقامت بنا رہے اور مخلوقِ خدا سے کٹ کر عزلت و کنارہ کشی اختیار نہ کرے لیکن اگر حالات اس درجہ نزاکت اختیار کرلیں کہ مخلوق کے ساتھ تعلق رکھنے کی شکل میں یا جان دینی پڑے اور یا دینِ باطل قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑے اور حالت یہ ہو جائے: اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ○ (الکھف: ۲۰) "بے شک اگر اُنہوں نے تم پر دسترس پالی تو تمہیں سنگسار کرڈالیں گے یا تمہیں (جبراً) اپنے مذہب میں پلٹا لیں گے اور (اگر ایسا ہو گیا تو) تم کبھی بھی فلاح نہیں پاؤ گے۔" (۱۸:۲۰) تو اُس وقت رخصت ہے کہ جان کی حفاظت اور دین کی صیانت کے لئے دنیا کے علائق سے کٹ کر عزلت نشینی اختیار کرے۔"

(۳) حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آیت وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ" ذٰلِكَ غَدًا ○ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ" (الکھف: ۲۳' ۲۴) "اور کسی بھی چیز کی نسبت یہ ہرگز نہ کہا کریں کہ میں اس کام کو کل کرنے والا ہوں مگر یہ کہ اللہ چاہے (یعنی انشاءاللہ کہہ کر) (۲۳' ۲۴: ۱۸) کے شانِ نزول کے متعلق یہ روایت کی جاتی ہے کہ جب مشرکینِ مکہ نے نبی اکرم ﷺ سے اصحابِ کہف کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں وحی سے معلوم کر کے کل اس کا جواب دوں گا مگر آپ کو "انشاءاللہ" کہنا یاد نہ رہا۔ اس وجہ سے تقریباً پندرہ روز وحی کا نزول نہیں ہوا۔ تب مشرکین نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں اور آپ اس وجہ سے دل فگار ہونے لگے۔ پندرہ روز کے بعد وحی کا نزول ہوا اور اس نے واقعہ کی ضروری تفصیلات کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ انسان جبکہ کل سے

ناواقف ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ جب کل کے لئے کسی بات کا وعدہ کرے تو خدا کی مشیّت کا ضرور حوالہ دے دیا کرے تاکہ یہ بات کبھی فراموش نہ ہونے پائے کہ بندہ نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا۔ میں زندہ بھی رہوں گا یا نہیں۔اور اگر زندہ بھی رہا تو وعدہ کے ایفاء پر قادر ہو سکوں گا کہ نہیں۔''

(۴) ''دین اور ملت خدا تعالیٰ کی صاف اور سیدھی راہ کا نام ہے۔اس لئے وہ جبر و اِکراہ سے قلب میں نہیں اترتی بلکہ اپنی صادق روشنی سے اندھے دل کو روشن اور منوّر کرتی ہے۔قرآن نے فرمایا کہ دین کے بارہ میں کوئی زبردستی نہیں ہے مگر اس کے برعکس باطل کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ خدا کی مخلوق پر زبردستی ظلم اور جبر سے اپنا اثر جمائے اور دلیل کی جگہ جبر سے کام لے لیکن خدا کی مشیّت انجام کار صداقت (یعنی دینِ حق) کو غالب اور باطل کو مغلوب کر دیتی ہے اور انجام و نتیجہ حق ہی کے ہاتھ رہتا ہے۔مگر چونکہ خدا کی گرفت کا قانون اوّل کافی مہلت دیتا ہے۔اس لئے ظالم اقوام جہالت سے اُسے اپنی کامیابی سمجھ کر خدا کی بطشِ شدید سے غافل ہو جاتی ہیں اور اس لئے تاریخ بار بار اپنے سبق کو دہراتی رہتی ہے۔''

(۵) ''تجربہ اس کا شاہد ہے کہ حق و صداقت کی تحریک اور نہ صرف یہ بلکہ ہر انقلابی تحریک جس درجہ قوم کے نوجوانوں پر اثر انداز ہوتی ہے' عمر رسیدہ افرادِ قوم پر اس سرعت کے ساتھ اثر انداز نہیں ہوتی۔نفسیات کے ماہرین اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ معمر افراد کا دل و دماغ چونکہ عمر کے بڑے حصّہ میں پرانی ریئت و رسم کا عادی ہو جاتا اور گزشتہ نظامِ سوسائٹی سے عرصہ تک مانوس رہ چکا ہوتا ہے اور اس کے رگ و ریشہ میں قدیم اثرات راسخ ہو چکے ہوتے ہیں' اس لئے ہر وہ تحریک جو قدیم نظام یا فرسودہ رسوم کے خلاف ظاہر ہوتی ہے' اُن کا دل و دماغ اس کے جدید اثرات سے اذیّت و تکلیف محسوس کرتا ہے اور جدید و قدیم محرکات کا تصادم اُن کے لئے بار بن جاتا ہے۔اس لئے وہ جدید انقلاب سے مانوس ہونے کی بجائے اور زیادہ متوحش ہو جاتے ہیں۔البتہ اُن میں سے جو دل و دماغ جذبات کے مقابلہ میں عقل کو اور تاثرات کے مقابلہ میں دلائل کو راہ نما بنا لیتے ہیں اور ہر معاملہ میں جدّت و قدامت سے قطع نظر متانت و سنجیدگی کے ساتھ اُس کی افادیت و مضرت پر غور کرنے کے عادی ہوتے ہیں' وہ اس عام اصول سے مستثنٰی ہیں اور جب وہ انقلابی تحریک کے فوائد کو دلائل کی قوّت سے محسوس کر لیتے ہیں' تو اس تحریک کے لئے زبردست پشت پناہ ثابت ہوتے ہیں مگر جماعتوں اور قوموں میں عموماً اُن کی تعداد کم ہوتی ہے۔''

''لیکن عمر رسیدہ افراد کے برعکس چونکہ نوجوانوں کے دل و دماغ بڑی حد تک غیر جانبدار ہوتے اور پرانے رسم و رواج کے لئے ابھی تک راسخ نہیں ہوتے' اس لئے اُن پر جدید نقوش بہت جلد منقش ہو جاتے ہیں اور وہ کسی تبدیلی اور کسی انقلاب کو محض اس لئے کہ وہ جدید محرکات کے داعی ہیں' توحش کی نظروں سے نہیں دیکھتے بلکہ دلچسپی کے ساتھ اس کی طرف بڑھتے اور صاف دل و دماغ سے اس پر غور کرتے ہیں۔''

''اب یہ انقلابی تحریک کی ذمہ داری ہے کہ اگر اُس میں صداقت اور حقانیت کارفرما ہے اور جماعتوں اور قوموں کو غلط روی سے نکال کر صراطِ مستقیم کی جانب داعی ہے تو اس کی جانب سرعت کے ساتھ جوق جوق بڑھنے والوں اور پیروی کرنے والوں کی زندگی میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور اُن کا وجود کائناتِ ہست و بود کے لئے رحمت ثابت ہوتا ہے اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو وہ تروتازہ اور صاف دل و دماغ رکھنے والے نوجوانوں کو تباہی اور بربادی کی راہ پر لگا دیتی ہے اور اس کا وجود دُنیائے انسانی کے لئے مصیبت اور عذاب بن جاتا ہے۔''

''پس قرآن عزیز نے اس واقعہ کے اظہار میں عبرت و موعظت کے جو پہلو نمایاں کئے ہیں' اُن میں سے ایک اہم پہلو اس نفسیاتی مسئلہ کی جانب توجہ دلاتا ہے۔ وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ قریشِ مکّہ میں سے بوڑھوں اور سن رسیدہ لوگوں کی اکثریت کا اسلام کی مقدس تعلیم سے گریز اور انفرادی و اجتماعی حیاتِ انسانی کے اس جدید انقلابِ (اسلام) سے توحش اور ان کے نوجوانوں کی اکثریت کا اس کی جانب تیزی کے ساتھ متوجہ ہونا اور اس کی دعوتِ انقلاب کی کشش سے فوج درفوج اس کے حلقہ بگوش ہو جانا دنیا کا انوکھا مظاہرہ نہیں ہے بلکہ جب کبھی بھی فرسودہ نظام اور باطل رسم ورواج کے خلاف خدا کے پیغمبروں نے حق وصداقت کا انقلاب برپا کیا ہے تو قبولِ حق کے لئے عمر رسیدہ انسانوں سے زیادہ نوجوانوں کے دل و دماغ پر ہی اس کا گہرا اثر پڑا ہے۔'' (قصص القرآن۔۔ محمد حفظ الرحمٰن سہواروی' جلد سوم' صفحات ۲۸۱۔۲۸۵ ملخصًا)

(۶) ''جیسا کہ اصحابِ کہف کے واقعہ سے معلوم ہوا کہ وقت کی بابت ہمارے خیالات اور اندازے ناقص ہیں۔ اصحابِ کہف کے نزدیک اُن کا غار میں قیام دن یا دن کا کچھ حصّہ تھا اگرچہ وہ وہاں صدیوں سے رہ رہے تھے۔ اس لئے وقت کا تعلق ہمارے اپنے داخلی تجربات سے ہے۔ وقت کا یہ مغالطہ آمیز تاثر ہمیں اُس حالت کا خفیف سا اشارہ دیتا ہے جب (روزِ قیامت) مُردوں کے اٹھائے جانے کا کوئی وقت نہ ہوگا' جب ہماری اس زندگی کے چھوٹے چھوٹے تاثرات کی درستی اخروی حقیقت سے کی جائے گی۔ وقت کے اس مخفی راز نے بہت سے غور وفکر کرنے والوں کو پریشان کر دیا ہے۔'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ : ۲۳۶۲)

(۷) ''اصحابِ کہف کی حکایت ''اضافیتِ وقت'' کی ایک حسین جھلک ہے جسے مشہور سائنسدان آئن سٹائن نے نزولِ قرآن سے صدیوں بعد 1905ء اور 1908ء میں پیش کیا تھا۔ اس طرح اصحابِ کہف کے لئے وقت کو منجمد کر دیا گیا (جس کی وضاحت آئندہ کے صفحات میں ''فزکس'' کے عنوان کے تحت ہوگی)۔ وقت نے اُن کے جسموں پر کوئی اثر نہیں کیا جو 309 برس کی طویل مدّت کے بعد نہ تو بوسیدہ ہوئے اور نہ ہی گلے سڑے اور یہ اس واقعہ کی معجزاتی جھلک ہے۔''

(۸) ''ان سونے والوں کی گرافائی تصویر انسانی میکانزم کو واضح کرتی ہے جس سے رب تعالیٰ نے اُن کے مشرک دشمنوں سے اُن کے تحفظ کو یقینی بنا دیا۔''

۴۰۶۸ (اصحاب الکھف والرقیم Men of the Cave and Ar-Raqeem)

(۹) ''مشرکینِ قریش نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایسے پریشان کن سوالات کرنے کے عادی تھے جو وہ عیسائیوں اور یہودیوں سے سنتے تھے اور ایسے سوالات کرنے میں اُن کا خیال یہ تھا کہ پیغمبر علیہ السلام اُن کا جواب نہ دے سکیں گے۔ اس طریق سے اُنہیں امید تھی کہ وہ نبی علیہ السلام کی تذلیل کریں گے۔ اُن میں سے ایک سوال افیسس (Ephesus) کے مقام پر اِن سات سونے والوں سے متعلق تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے نہ صرف اُنہیں اصل قصہ بتا دیا بلکہ اُن اختلافات کی بھی نقاب کشائی کی جو عیسائیت کی دنیا میں مشہور ہو چکے تھے۔ آپ نے لوگوں کو ایسی تفصیلات میں جھگڑنے پر سرزنش کی (سورۃ الکھف: ۲۲)۔ سب سے اہم بات یہ کہ آپ نے وحیِ الٰہی کے تحت قصّے کو اس طرح بیان کیا جس سے اعلیٰ اقدار کے روحانی اسباق آشکار ہو گئے۔'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ: ۲۳۳۵)

(۱۰) ''بلا شرکتِ غیرے صرف اللہ کی طرف لَو لگانے والوں کے لئے رب تعالیٰ اپنی قدرت کے متداول قانون کو بدل دیا کرتا ہے جیسا کہ سورۃ الکھف کی آیت ۱۸ میں سورج کے طلوع ہونے اور مائل بہ غروب ہونے میں بتایا گیا ہے۔ اسی قسم کی جھلک ہم عُزیر علیہ السلام کے قصہ میں پاتے ہیں جس کا ذکر سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵۹ میں ہوا ہے۔''

(۱۱) ''سورۃُ الکھف کی آیت ۱۷ کا لفظ تَـزَاوَرُ (ہٹ کر گزرنا) واضح طور پر اس بات کے ثبوت میں ہے کہ سورج ہمیشہ گردش میں رہتا ہے اور ساکن نہیں ہے۔'' ☆

(۱۲) ''یہ قصہ ظالم اور مظلوم کی غیر حقیقی حیثیت کو ظاہر کرتا ہے۔''

(۱۳) ''یہ قصہ مُردوں کے جی اٹھنے کی حقیقت پر بھی روشنی ڈالتا ہے جب حق کی اقدار بحال ہو جائیں گی۔''

(۱۴) ''یہ قصہ آنے والی نسلوں کے لئے رب تعالیٰ کی لامتناہی قوت کی علامت ہے۔''

(۱۵) ''ایمان' عقیدے اور نماز کی قوّت صراطِ مستقیم کی طرف راہ نمائی کرتے ہیں جس سے مثالی جرأت اور حوصلہ پیدا ہوتے ہیں کہ اللہ کے سوا کسی کا خوف دل میں نہیں رہتا۔ اللہ کی رحمتیں اور اُس کی برکات کے حصول کے لئے بھی وہ کافی ہیں۔ اس حتمی حقیقت کی سو فیصد صداقت ہمیں اصحابِ کہف اور موسیٰ علیہ السلام کے ہم عصر جادوگروں کے اسلام لانے میں ملتی ہے جن پر فرعون کی طرف سے ہیبت ناک انجام کی دھمکیاں بھی کچھ اثر نہ کر سکیں:

(i) اِنَّھُمْ فِتْیَۃٌ '' اٰمَنُوْا بِرَبِّھِمْ وَزِدْنٰھُمْ ھُدًی O وَرَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِھِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاْ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِلٰھًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا O (الکھف: ۱۳'۱۴)

☆ اس حقیقت کا ثبوت سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۳ اور سورہ یٰسٓ کی آیت ۴۰ میں بھی ہے۔

''یہ لوگ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے اُنہیں ہدایت میں ترقی دی تھی اور ہم نے اُن کے دل مضبوط کر دئے تھے۔ جب وہ لوگ (پختہ اور) مستعد ہو گئے تو بولے کہ ہمارا پروردگار تو وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے' ہم تو اُس کے علاوہ کسی معبود کو نہ پکاریں گے ورنہ پھر تو ہم بڑی ہی بے جا باتوں کے مرتکب ہوں گے۔'' (۱۳' ۱۴ : ۱۸)

(ii) قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَا اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَاO اِنَّا اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَ مَا اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰىO (طٰهٰ : ۷۲'۷۳)

''(جادوگر) بولے: ہم تمہیں ہرگز اُن واضح دلائل پر ترجیح نہیں دیں گے جو ہمارے پاس آچکے ہیں' اُس (رب) کی قسم! جس نے ہمیں پیدا فرمایا' تو جو حکم کرنے والا ہے کر لے' تو فقط (اس چند روزہ) دنیوی زندگی ہی سے متعلق فیصلہ کر سکتا ہے۔ بے شک ہم اپنے رب پر ایمان لائے ہیں تا کہ وہ ہماری خطائیں بخش دے اور اُسے بھی (معاف فرمادے) جس جادوگری پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا' اور اللہ ہی بہتر ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔'' (۷۲'۷۳ : ۲۰)

(۱۶) کتے نے جس کا نام ''قطمیر'' بتایا جاتا ہے' اُن صالح بندوں کی سنگت نہیں چھوڑی بلکہ اُن کے دروازے پر برابر بیٹھے رہنے سے اُس نے اپنی وفاداری ثابت کر دی۔ کتے کا یہ وفادارانہ رویہ رب تعالیٰ کو ایسا بھایا کہ (i) جہاں کہیں بھی اُس نے اصحاب کہف کا ذکر کیا ہے' کتے کا ذکر بھی ساتھ ہی کر دیا ہے۔ (ii) صرف یہی نہیں بلکہ رب تعالیٰ نے کتے کے بیٹھنے کے انداز (Posture) کو بھی اِن الفاظ میں بیان کر دیا ہے:

وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ (الکھف : ۱۸)

''اور اُن کا کتا (اُن کی) چوکھٹ پر اپنے دونوں بازو پھیلائے (بیٹھا) ہے۔'' (۱۸ : ۱۸)

اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اگر صالحین کی سنگت اختیار کرنے کے باعث ایک کتا خاص وقت میں نہیں مر سکتا تو ایک صحیح العقیدہ مسلمان رب کی رحمت سے کیسے محروم ہو سکتا ہے کیونکہ اُس کے پیارے بندے لوگوں کو اُس کی رضا کی راہ دکھانے اور اُن میں الٰہی شعور پھونکنے میں اللہ تعالیٰ کی پکی سند ہیں۔ اس سلسلہ میں شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب کہا ہے:

سگِ اصحابِ کہف روزے چند — پئے نیکاں گرفت مردم شد
پسرِ نوح با بداں بہ نشست — خاندانِ نبوتش گم شد

(۱۷) اس اثر پذیر واقعہ سے معلوم ہوا' اللہ تعالیٰ کا اپنے وفادار بندوں سے حسنِ سلوک کا وعدہ سچا ہے۔

(۱۸) انسانی کج روی ایسی ہے کہ جونہی حق وصداقت کی کوئی کرن جھلکتی ہے تو لوگ اس کی بابت طویل مباحثہ میں پڑ جاتے ہیں۔ بعد کے زمانوں میں تنازعہ اُن سونے والوں کی تعداد کے بارے میں ہوا کہ آیا وہ تین تھے یا پانچ تھے یا سات تھے؟ لوگوں نے حتمی علم کی بناء پر نہیں بلکہ اُن کی تعداد کا اندازہ ظن وتخمین اور قیاس کی بنیاد پر لگالیا۔

(۱۹) اللہ کے صالح بندے صرف حلال مال پر جیتے ہیں نہ کہ حرام پر جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے:

فَابْعَثُوْا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَاۤ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ (الکھف: ۱۹)

''تم اپنے میں سے کسی کو اپنا یہ سکہ دے کر شہر کی طرف بھیجو، پھر وہ دیکھے کہ کون سا کھانا زیادہ حلال اور پاکیزہ ہے تو اس میں سے کچھ کھانا تمہارے پاس لے آئے۔'' (۱۹ : ۱۸)

(۲۰) کراماتِ اولیاء نہ صرف ہمارے سیارۂ زمین پر وقوع پذیر ہوتے ہیں بلکہ آسمان پر بھی جیسا کہ سورۃ الکھف کی آیت ۱۷ میں سورج کے ذکر سے ظاہر ہے۔ اس کے برعکس جادو کی عملداری صرف زمین پر ہوتی ہے۔

(۲۱) اپنے ایمان کی حفاظت میں جبر وظلم اور بدی کی طاقتوں سے نبرد آزما ہونے میں رب کی رحمتوں کا کمانا اور ہر کام میں سہولت کا ہونا ہے۔ اس کا ثبوت قرآن کے ان الفاظ میں موجود ہے:

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا○ (الکھف: ۱۶)

''اور (اُن نوجوانوں نے آپس میں کہا:) جب تم اُن سے اور اُن (جھوٹے معبودوں) سے جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں' کنارہ کش ہو گئے تو تم (اِس) غار میں پناہ لے لو' تمہارا رب تمہارے لئے اپنی رحمت کشادہ فرما دے گا اور تمہارے لئے تمہارے کام میں سہولت مہیا فرما دے گا۔'' (۱۶ : ۱۸)

(۲۲) اللہ کے مخلص' وفادار بندے اور اُس کا خوف رکھنے والے ایسی رعب دار اور پُر جلال شخصیت ہوتے ہیں کہ کوئی اُن کا مقابلہ یا سامنا نہیں کر سکتا جیسا کہ اس آیت سے ثابت ہے:

لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا○ (الکھف: ۱۸)

''(اے مخاطب!) اگر تو اُنہیں جھانک کر دیکھ لے تو اُن سے پیٹھ پھیر کر بھاگ جائے اور تیرے دل میں اُن کی دہشت بھر جائے۔'' (۱۸ : ۱۸)

(۲۳) مندرجہ بالا آیت ۱۸ دراصل اُن سونے والوں کے غار کی زیارت کرنے کی ممانعت میں ہے۔ روایت ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روم فتح کیا تو آپ نے اِن سونے والوں کی طرف اپنے پانچ آدمی بھیجے جبکہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس آیت ۱۸ کا حوالہ دیتے ہوئے اُنہیں وہاں جانے سے روکا۔ بہر حال جب وہ لوگ غار کے دہانے پر پہنچے اور اُس کے اوپر سے غار میں نیچے اترنے کو تھے تو ایک انتہائی تند و تیز آتشیں بگولہ سے وہ خاکستر ہو گئے۔ (تفسیر نعیمی ۔۔۔ صاحبزادہ مفتی اقتدار احمد خان' جزء ۱۵' صفحہ ۵۲۵)

(۲۴) حفاظت یا شکار کے مقصد سے شکاری کتوں کا پالنا جائز اور درست ہے بشرطیکہ کتے کا مالک جانور کی گندگی اور پلیدی سے اپنے جسم' لباس' برتنوں' بستر اور گھر کو محفوظ رکھنے میں بہت زیادہ محتاط ہو لیکن ازراہِ شوق کتوں کا غیر ضروری طور پر پالنا گناہ ہے۔ یہ بات اس حقیقت سے ثابت ہے کہ اصحابِ کہف نے وہ شکاری کتا اپنے دشمن کے خلاف اپنی حفاظت اور اُس کے شکار کے لئے پالا تھا۔ یا ایک دوسری روایت کے مطابق اُن کے نانبائی نے وہ کتا تحفظ کے مقصد کے لئے پالا تھا۔'' (ایضاً' صفحہ ۵۲۴)

(۲۵) بَعَثْنَاهُمْ (ہم نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے اُنہیں تیار کر کے بھیجا) کا لفظ سورۃ الکھف کی آیات ۱۲ اور ۱۹ میں دو مرتبہ آیا ہے۔ پیغمبروں کا بعث بھی اسی مفہوم میں ہوتا ہے کیونکہ اُنہیں تیار کر کے لوگوں کی طرف پیغامِ الٰہی پہنچانے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ اسی طرح اصحابِ کہف کو بھی نیند سے اٹھا کر تیار کیا گیا تا کہ وہ روزِ محشر کا انکار کرنے والوں کے لئے ہمیشہ کی علامت بن جائیں۔ یہ بات یاد رہے کہ اُنہوں نے اپنے ایک آدمی کو بازار سے کھانا خرید کرنے کے لئے بھیجا لیکن ایسا نہ ہو سکا اور سب بے ثمر رہا۔ لیکن بہر حال الٰہی مقصد اور غرض و غایت کی تکمیل ہو گئی۔ لہٰذا لفظ بَعَثْنَاهُمْ کا استعمال اس مصلحت کو ظاہر کرنے کے لئے کیا گیا ہے کہ نیند سے بیدار ہونا تو معلوم ہو چکا لیکن بیدار ہونے کا مقصد بھی معلوم ہونا چاہئے۔

(۲۶) صراطِ مستقیم اور صحیح راہ نمائی پر وہ شخص ہے جو خالق و مالک اللہ کی نظر میں صالح اور نیک ہے۔ شہید وہ ہے جو اللہ کی نظر میں شہید ہے۔ لوگوں کی زبانوں اور اُن کی غوغا آرائیوں کا یہاں کچھ بھی گزر نہیں۔ یہ بات درج ذیل آیات سے ثابت ہے جو عزت و شہرت اور خود ستائشی کی غیر صحتمند' مریضانہ بھوک کو جڑ سے اکھیڑ دیتی ہیں :

(i) مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ (بنی اسراء یل: ۹۷ : الکھف : ۱۷)

''اور جسے اللہ ہدایت فرما دے تو وہی ہدایت یافتہ ہے۔'' (۹۷ : ۱۷ ؛ ۱۷ : ۱۸)

(ii) فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ○ (النّجم : ۳۲)

''پس تم اپنے آپ کو بڑا پاک وصاف مت جتایا کرو' وہ خوب جانتا ہے کہ (اصل) پرہیزگار کون ہے۔'' (۳۲ : ۵۳)

(۲۷) ہر مجتہد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اجتہاد اور قیاس کو آخری اور حتمی فیصلہ قرار نہ دے بلکہ

اُسے ہر حقیقت کو اللہ کی طرف منسوب کرنا چاہئے جیسا کہ ذیل کی آیت سے ثابت ہے:

قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ (الکھف : ۱۹)
''اُن (غار والوں نے) کہا: ہم (یہاں) ایک دن یا اُس کا (بھی) کچھ حصّہ ٹھہرے ہیں۔ (بالآخر) وہ کہنے لگے: تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ تم (یہاں) کتنا عرصہ ٹھہرے ہو۔'' (۱۹ : ۱۸)

(۲۸) دنیاوی اور مذہبی ہر معاملہ میں نرمی اور بُرد باری کا رویہ رب تعالیٰ کا بہت بڑا عطیہ ہے جیسا کہ سورۃ الکھف کی آیت ۱۹ کے لفظ وَلْيَتَلَطَّفْ (اور چاہئے کہ نرمی اور آہستگی سے کام لے) سے ثابت ہے۔

بعض بزرگوں کا کہنا ہے کہ قرآن مجید صرف دو باتوں پر مشتمل ہے: شریعت اور طریقت۔ لفظ مذکور وَلْيَتَلَطَّفْ پورے قرآن مجید کے کل الفاظ کے عین وسط میں واقع ہو رہا ہے جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ایمان کی عمدگی اور نفاست اور شیریں مقالی دونوں شریعت اور طریقت' انبیاء و رسولوں' علمائے دین' صوفیوں' شرفاء اور عوام الناس سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہر مسلمان کے لئے اپنے ابنائے جنس سے نرمی اور خوش اخلاقی سے پیش آنا لازم ہے۔

(۲۹) دنیاوی دولت جائز ضرورت کے تحت رکھنا جائز ہے اور توکل علی اللہ کے خلاف نہیں جیسا کہ سورۃ الکھف کی آیت ۱۹ کے الفاظ فَابْعَثُوْا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖ (تم اپنوں میں سے کسی کو یہ سکّہ دے کر بھیجو) سے ثابت ہے۔

(۳۰) نمود و نمائش' اتراہٹ اور خود نمائی بری عادتیں اور ممنوع ہیں جیسا کہ سورۃ الکھف کی آیت ۱۹ کے الفاظ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ۝ (اور کسی ایک شخص کو بھی تمہاری خبر نہ ہونے پائے) سے ثابت ہے۔

(۳۱) سورۃ الکھف کی آیت ۲۵ نے شمسی سال اور قمری سال کا تصوّر دیا ہے:
وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۝ (الکھف : ۲۵)
''اور وہ اپنی غار میں تین سو برس ٹھہرے رہے اور اُنہوں نے (اس پر) نو (سال) اور بڑھا دئے۔''

''ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اوّل تین سو سال فرمایا اور یہ شمسی حساب کے مطابق ہے اور پھر وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۝ کہہ کر نو سال کا اضافہ اس لئے کیا تا کہ شمسی حساب قمری حساب کے ساتھ مطابق ہو جائے۔

(۱۶۴) اولوالالباب (Men of Wisdom)

اشرف المخلوقات ہونے کے حوالے سے حضرتِ انسان کو سمجھ بوجھ اور فہم عطا کئے گئے ہیں۔ کچھ لوگ تو فہم کی اس صلاحیت کو درست طور پر استعمال کرتے ہیں جبکہ کچھ دوسرے لوگ اس کا غلط استعمال کرتے ہیں یا یوں کہنا چاہئے کہ وہ چیزوں کو اُن کے صحیح تناظر میں نہیں دیکھتے۔ صحیح سوچ اور درست فہم میں رکاوٹ اُن کی فضول خواہشات اور احمقانہ جذبات ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک حاسد آدمی سے عقل و فہم کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ حسد کے جذبہ کے تحت وہ اپنے آپ کو کج روی کے جال میں پھنسا لیتا ہے۔ کینہ، بغض، عداوت اور نفرت ہمیشہ اُس میں پروان چڑھتے رہتے ہیں اور وہ صحیح اور واضح سوچ اور مستحکم قیاس آرائی سے محروم رہتا ہے۔ اُس کی نظر خواہشات اور دنیاوی حظ اندوزیوں میں دھندلا جاتی ہے۔ سفلی خواہشات اور خود غرضانہ لالچ سے پاک و صاف لوگ اللہ تعالیٰ کا گہرا فہم رکھ سکتے ہیں اور اس طرح اُس کی تابعداری کر سکتے ہیں۔

تمام فضول خواہشات اور بے مہار جذبات بھی عقل و فہم کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ مال و اسباب اور دھن دولت کی لالچ آدمی پر بہت بری طرح اثر انداز ہوتے ہیں اور وہ اُن کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ اُن خواہشات کا غلام ہوتے ہوئے وہ کبھی بھی زندگی کے اصل حقائق و مسائل کی طرف توجہ نہیں دے سکتا۔ ایک وفادار مخلوق ہونے کے لئے اُسے اپنی تمام صلاحیتیں اپنے خالق کی طرف مرکوز کر دینی چاہئیں جس نے اُسے نیست سے ہست کیا اور اشرف المخلوقات ہونے کا اعلیٰ اعزاز بخشا۔''

اصحابِ دانش و عقل وہ لوگ ہیں جو اللہ کی تنبیہات اور وعیدوں کا مثبت اثر لیتے ہیں اور جو فی الفور اُس صداقت کو قبول کر لیتے ہیں جو اُن تک پہنچائی گئی ہے۔ وہ کبھی بھی مغرور اور متکبر نہیں ہوتے۔ وہ اپنی بدعملیوں پر قائم نہیں رہتے اور جونہی اُنہیں اپنی کوئی غلطی اور خطا معلوم ہوتی ہے تو اپنی اصلاح کر لیتے ہیں۔ کوئی بھی دلیل دیتے وقت اُن کا مقصد حق کی تلاش ہوتا ہے نہ کہ اپنی رائے دوسروں پر ٹھونسنا۔ رب تعالیٰ نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ فرمایا ہے:

فَبَشِّرْ عِبَادِO الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ أَحْسَنَه‘ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰهُمُ اللّٰهُ وَ أُولٰٓئِكَ هُمْ أُولُوا الْأَلْبَابِO (أَلزُّمَر: ۱۸،۱۷)

"سو آپ میرے ان بندوں کو بشارت دے دیجئے جو (اس) کلام کو کان لگا کر سنتے ہیں، پھر اس کی اچھی باتوں کی اتباع کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت بخشی ہے اور یہی لوگ عقلمند ہیں۔'' (۳۹ : ۱۸،۱۷)

''احکامِ شرعیہ میں بعض اعمال صحیح اور حسن ہوتے ہیں اور بعض اصح اور احسن ہوتے ہیں۔ تو جو شخص عقل اور نظرِ صحیح سے کام لے گا وہ صحیح اور حسن کے مقابلہ میں اصح اور احسن پر عمل کرے گا اور اس آیت میں احسن افعال کی اتباع کی تحسین کی گئی ہے مثلاً اگر کسی شخص نے اپنے مقتول کا قصاص قاتل کو قتل کرنے کی صورت میں لے لیا تو یہ صحیح ہے اور احسن یہ ہے کہ وہ اپنے قاتل کو معاف کر دے۔ اسی طرح برائی کے بدلہ میں اتنی ہی برائی کرنا صحیح ہے اور برا سلوک کرنے والے کو معاف کر دینا اور اس سے جواب میں نیک سلوک کرنا احسن ہے۔'' (تبیان القرآن، ج ۱۰، ص ۲۱۰)

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے وجود کا صحیح فہم رکھتے ہیں، کائنات میں بکھری ہوئی اُس کی لاتعداد نشانیوں میں غور و فکر کرتے ہیں اور مقصدِ تخلیق کو سمجھ لیتے ہیں تو قرآن کی نظر میں یہی لوگ اصحابِ عقل و دانش ہیں، جیسا کہ فرمایا:

(i) وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ O (الرَّعد : ۴)

''اور زمین میں (مختلف قسم کے) قطعات ہیں جو ایک دوسرے کے قریب ہیں اور انگوروں کے باغات ہیں اور کھیتیاں ہیں اور کھجور کے درخت ہیں جھنڈ دار اور بغیر جھنڈ دار، (اِن سب کو) ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے، (اس کے باوجود) ہم ذائقہ میں بعض کو بعض پر فضیلت بخشتے ہیں، بیشک اس میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔'' (۱۳ : ۴)

(ii) وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ O (الرّوم : ۲۴)

''اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ (بھی) ہے کہ وہ تمہیں ڈرانے اور امید دلانے کے لئے بجلی دکھاتا ہے اور آسمان سے پانی اتارتا ہے، پھر اُس سے زمین کو اُس کی مُردنی کے بعد زندہ و شاداب کرتا ہے، بے شک اس میں اُن لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔'' (۳۰ : ۲۴)

''عقل و دانش کی بھی مختلف سطحیں ہوتی ہیں۔ ایک مقام پر آدمی اپنے دل کو دنیاوی خواہشات اور خودغرضی سے پاک کر کے عقل و دانش کی سطح کو دریافت کر لیتا ہے۔ اس دنیاوی زندگی کے ساتھ لگاؤ اور فضول خواہشات کا تعاقب بھی عقل و دانش کی سطح کو متعین نہ کر سکنے کے عوامل ہیں۔''

''انسان یا تو اللہ کا تابعدار بندہ بن کر رہے گا یا اپنی سفلی خواہشات کا غلام ہو کر زندگی گزارے گا۔ جب وہ اللہ کا (وفادار) بندہ بن جاتا ہے تو اُسے اُس کی سفلی خواہشات سے بچا لیا جاتا ہے اور وہ عقل و دانش کو پا لیتا

ہے۔ اس کے الٹ بات بھی صحیح ہے یعنی خواہشات کی پرستش کا مطلب اپنے تمام تر خیالات اور رویّہ کو جسم و جان کی لامحدود خواہشات کا غلام بنا دینا ہے۔''

''جب خواہشات روح پر غلبہ اور کنٹرول حاصل کر لیتی ہیں تو وہ شخص کبھی بھی یہ نہیں جان پاتا کہ وہ اپنے فہم سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے کیونکہ اُس نے اُس معیار کو ہی ضائع کر دیا ہے جس سے حق و باطل اور صحیح و غلط کے درمیان تمیز کی جاتی ہے۔ اگرچہ عقل و دانش حاصل کرنے والا شخص اپنی ذات میں مثبت تغیرات اور تبدیلیوں سے ہمیشہ آگاہ ہوتا ہے لیکن اس بات کا اطلاق اس کے الٹ شخص پر نہیں ہوتا۔ یہ بات اُس شخص کی سی ہے جو بیہوش ہو جاتا ہے یا Coma کی حالت کا شکار ہو جاتا ہے، دونوں میں سے کسی بھی صورت میں اُسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ صحت یاب ہونے کے وقت تک کس حال میں رہا ہے۔'' ("The Basic Concepts in the Qur'an"... Harun Yahya, pp. 70, 71)

عقل و دانش سے محروم لوگوں کی حالت کو قرآن مجید میں یوں واضح کیا گیا ہے :۔

(i) وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ O (البقرۃ : ۱۷۱)

''اور ان کافروں (کو ہدایت کی طرف بلانے) کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو کسی ایسے (جانور) کے پیچھے چلا رہا ہے جو سوائے پکار اور آواز کے کچھ سنتا ہی نہیں۔ یہ لوگ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، سو انہیں کچھ بھی سمجھ نہیں۔'' (۲ : ۱۷۱)

یعنی اُس جانور کی طرح جس کے کان میں پکارنے والے کی آواز اور الفاظ تو آ رہے ہیں، باقی وہ معنیٰ و مفہوم کو کچھ نہیں سمجھتا۔ یہی معاملہ یہ منکرین، دعوتِ حق کے داعی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ داعی کے الفاظ تو سن لیتے ہیں لیکن اُس کے معنیٰ و مفہوم پر غور نہیں کرتے۔ صُمٌّ ''وہ بہرے ہیں آوازِ حق کی طرف سے، بُکْمٌ ''اقرارِ حق کے لئے اُن کی زبان گونگی ہے اور عُمْیٌ ''خود اپنے نفع و نقصان کے باب میں وہ اندھے ہیں۔

(ii) اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ O (الانفال : ۲۲)

''بے شک اللہ کے نزدیک جانداروں میں سب سے بدتر وہی بہرے، گونگے ہیں جو عقل سے (ذرا) کام نہیں لیتے۔'' (۸ : ۲۲)

''یعنی سن کر عمل نہ کرنا بھی اُن لوگوں کے عمل کے مشابہ ہے جو بہرے اور گونگے ہیں۔ شَرَّ الدَّوَآبِّ کفار و منافقین کے ذکر کے بعد اُن کی تحقیر و اہانت کے لئے ہے۔'' (تفسیر ماجدی اردو، صفحہ ۳۷۸، نوٹ : ۳۴)

(۱۶۵) علمِ فلزات و معدنیات (Metallurgy & Mineralogy)

دھاتوں اور معدنیات کے علم کو قرآن مجید نے خاصی ہوا دی اور چمکایا۔ قرآنی مطالعہ نے مسلمان ماہرینِ فلزات و معدنیات کی حوصلہ افزائی کی اور ان کے میدانوں میں اُنہوں نے اپنی تحقیقات کو خوب آگے بڑھایا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انہی مطالعوں اور تحقیقات کے باعث علمِ فلزات اور معدنیات اپنی جاندار شکل میں معرضِ وجود میں آئے۔

دھاتوں اور معدنیات دونوں کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور ان دونوں کو ذیل میں علیحدہ علیحدہ بیان کیا جاتا ہے۔ دیگر عطیات کے ساتھ ساتھ فلزات اور معدنیات بھی رب تعالیٰ کی قابلِ قدر عنایات و برکات میں سے ہیں۔

(الف) دھاتیں: قیمتی دھاتوں میں سے قرآن مجید صرف چار دھاتوں کا ذکر کرتا ہے:

(1) موتی (لُؤلُؤ) جس سے جنت میں نیکوکاروں کو زینت بخشی جائے گی (بحوالہ سورۃ الحج: آیت: ۲۳؛ سورہ فاطر: آیت: ۳۳)۔ سورۃ الواقعہ کی آیت ۲۳ میں حورانِ جنت کو (اَللُّؤلُؤ الْمَکْنُوْن) یعنی محفوظ چھپائے ہوئے موتیوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

(2) مَرجان (Coral) اور موتی: قرآن مجید نے بتایا کہ یہ دونوں دھاتیں سمندر سے حاصل ہوتی ہیں (سورہ یٰسٓ: ۲۲)۔

(3) یاقوت (Ruby): اِس کا ذکر سورہ یٰسٓ کی آیت ۵۸ میں ہوا ہے۔

(4) اِن قیمتی دھاتوں میں سے ایک سونا (ذَھَب) بھی ہے جس کا ذکر قرآن مجید کے اِن آٹھ مقامات پر ہوا ہے:

(۱'۲) سورہ آلِ عمران: آیات ۱۴' ۹۱ — (۳) سورۃ التوبۃ: آیت ۳۴
(۴) سورۃ الکہف: آیت ۳۱ — (۵) سورۃ الحج: آیت ۲۳
(۶) سورہ فاطِر: آیت ۳۳ — (۷'۸) سورۃ الزخرف: آیات ۵۳' ۷۱

چاندی (فِضّہ) کا ذکر قرآن مجید کے اِن چھ مقامات پر ہوا ہے:

(۱) سورہ آلِ عمران: آیت ۱۴ — (۲) سورۃ التوبۃ: آیت ۳۴

(۳) سورۃ الزخرف : آیت ۳۳ (۴،۵،۶) سورۃ الدھر : آیات ۱۵،۱۶،۲۱

سونے اور چاندی دونوں کا اکٹھا ذکر سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۴ اور سورۃ التوبۃ کی آیت ۳۴ میں ہوا۔ سونا بطور ذخیرہ کیا جانے والے مال کا ذکر سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۴ اور سورۃ التوبۃ کی آیت ۳۴ میں ہوا۔ اور بطور ایسی دھات کے جس سے کنگن ردست بند (Bracelets) بنائے جاتے ہیں کا ذکر سورۃ الکھف کی آیت ۳۱ میں، سورۃ الحج کی آیت ۲۳ میں، سورہ فاطر کی آیت ۳۳ میں اور سورۃ الزُّخرُف کی آیت ۵۳ میں ہوا اور جس سے طشتریاں اور پلیٹیں بنائی جاتی ہیں (بحوالہ سورۃ الزُّخرُف: آیت ۷۱)۔ قرآن یہ بھی بیان کرتا ہے کہ چاندی بھی سونے کے ساتھ اکٹھی کی جاتی ہے اور یہ کہ برتن، مینائیں اور دست بند رکنگن اس سے بنائے جاتے ہیں (بحوالہ سورۃ الدھر: آیات ۱۵،۱۶،۲۱) (Encyclopaedia of the Quran, Vol. III, p. 383)

درج بالا آیات اور سورہ آلِ عمران کی ذیل کی آیت اسلام کی دائمی قدر کی پیائش کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ نیز آیت میں ذَھَبٌ (سونا) سے سونے کی مخصوص و متعین دھات ہی مراد نہیں بلکہ مراد کسی عزیز سے عزیز اور زیادہ سے زیادہ قیمتی شے کے فدیہ سے ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِھِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَھَبًا وَّلَوِافْتَدٰی بِہٖ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ وَّمَالَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ O (آل عمران : ۹۱)

"بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور وہ کفر کی حالت میں مر گئے تو اُن میں سے کسی سے زمین بھر (بھی) سونا ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اگرچہ وہ اُسے معاوضہ میں دینا چاہے، یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے دردناک عذاب ہے اور جن کے کوئی بھی مددگار نہ ہوں گے۔" (۳ : ۹۱)

سورۃ الزُّخرُف کی مندرجہ ذیل آیات اس بات کی مظہر ہیں کہ سونا اور چاندی بہر صورت دنیاوی دھن دولت ہیں، غیر مستقل، انتہائی غیر اہم اور اللہ کی نظر میں قابلِ نفرت ہیں۔ حیاتِ اخروی ہی واحد حقیقی مقصد ہے جس کی خاطر دوڑ دھوپ کی جانی چاہئے:۔

وَلَوْلَآ اَنْ یَّکُوْنَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ یَّکْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُیُوْتِھِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّۃٍ وَّمَعَارِجَ عَلَیْھَا یَظْھَرُوْنَ O وَلِبُیُوْتِھِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَیْھَا یَتَّکِئُوْنَ O وَ زُخْرُفًا وَ اِنْ کُلُّ ذٰلِکَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃُ عِنْدَ رَبِّکَ لِلْمُتَّقِیْنَ O (الزُّخرُف: ۳۳-۳۵)

"اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ سب لوگ ایک ہی طریقہ کے ہو جائیں گے تو جو لوگ (خدائے) رحمٰن سے کفر کرتے ہیں، اُن کے گھروں کی چھتیں اور زینے ہم چاندی کے کر دیتے جن پر وہ چڑھا کرتے، اور اُن کے مکانوں کے دروازے (تک بھی) اور وہ تخت بھی جس پر وہ تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں اور سونے کی بھی (یہ چیزیں)

کر دیتے' لیکن یہ سب سامان صرف دنیاوی زندگی کی چند روزہ کامرانی ہے اور آخرت تو آپ کے پالنہار کے ہاں خدا ترسوں ہی کے لئے ہے۔'' (۳۳۔۳۵ : ۴۳)

یعنی دنیا اور اُس کا سارا ساز و سامان اللہ تعالیٰ کے ہاں اِس قدر حقیر اور بے وقعت ہے کہ اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ سارے لوگ گمراہ ہو جائیں گے تو ہم کفار کو اِتنی دولت دیتے' اُن کے ہاں سونے چاندی کی اِتنی بہتات ہوتی کہ اُن کے بنگلوں کی چھتیں چاندی کی بنی ہوتیں' اُن کے زینے' اُن کے مکانوں کے دروازے اور پلنگ بھی چاندی کے بنے ہوتے اور زیب و آرائش کا یہ عالم ہوتا کہ اُن کی چمک دمک اور حُسن و جمال کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ یہ ناپسندیدہ چیز ہم صرف ناپسندیدہ لوگوں کو ہی دیتے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا کہ کفار کی سج دھج دیکھ کر کم فہم لوگ کہیں یہ نہ سمجھنے لگیں کہ مقبولیت کفر کو حاصل ہے اور سب کفر کی راہ پر گامزن نہ ہو جائیں۔ تو آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ (۱) مال و جاہ کی بہتات دین و دنیا میں نقصان و حرمان ہی کا باعث ہوتی ہے (تفسیر کبیر)۔ (۲) اُن ''ریفارمرز'' کی روِش پر بھی روشنی پڑتی ہے جو اپنی تحریروں اور تقریروں میں یورپ اور امریکہ کے مال و زر کا ذکر للچائے ہوئے انداز میں کرتے رہتے ہیں اور مسلمانوں کو اس طرح ترغیب دیتے رہتے ہیں کہ جیسے یہ زرداری ہی ترقی کی معراج ہے۔

آخر میں فرمایا کہ دنیا پوری کی پوری ہاتھ آ جانے کے بعد بھی بہر حال فانی ہی فانی ہے اور سرتا سر نا قابلِ قدر و نا قابلِ طلب۔ قابلِ قدر اور قابلِ طلب تو صرف آخرت ہے اور وہ تقویٰ یعنی ایمان و طاعت ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ علمائے حق نے کہا کہ آیت سے چار مضمون پیدا ہوتے ہیں: (۱) مؤمنین کے حق میں رعایت کہ کہیں یہ پھسل نہ جائیں اور دولت کو رضائے الٰہی سمجھنے لگیں۔ (۲) آخرت کی تخصیص مؤمنین متقین کے ساتھ۔ (۳) دنیا کی تحقیر اور اُس کی اصلاً تخصیص کافروں کے ساتھ۔ (۴) چاندی اور سونے کی ناپسندیدگی کی طرف اشارہ کہ جو چیز کافروں کے لائق ہے' مؤمن کے پسند کی نہ ہونی چاہیے۔

''زمانۂ قدیم سے سونا تجارت کی ترقی میں اہم عنصر رہا ہے نیز آرائش و تزئین میں بھی سونا ہی نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ انسانی تہذیب کی ابتداء ہی سے یہ دنیا کی دھاتوں میں انتہائی قیمتی دھات شمار ہوتا ہے۔ اسی لئے سونے سے متعلق کچھ کہاوتیں اور ضرب الامثال اب تک زبان زدِ عام و خاص ہیں جیسے: ''سونے کی طرح چمکیلا'' اور ''ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی''۔ اب سے چھ سال پہلے اُس وقت کے ملائیشیا کے صدر اور او آئی سی (OIC) کے چیئرمین مہاتیر محمد نے OIC کی سمٹ کانفرنس منعقدہ (ملائیشیا کے دار الخلافہ) کوالالمپور میں اپنے صدارتی خطاب میں زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر عالمِ اسلام عالمی منڈی میں امریکہ کی بالادستی کو کچلنا اور اپنی برتری اور اقتدار کا تحفظ چاہتا ہے' تو تمام مسلمان ممالک کو ڈالر کی بجائے سونے کو ''شرحِ مبادلہ'' بنانا ہوگا۔''

''جب سے سونا دریافت ہوا ہے' اُس وقت سے لے کر اب تک سونے کی متبادل دھات تلاش کرنے

اوراس کے انتہائی اونچے نرخوں کو کم کرنے کی کوششیں کبھی باثمر نہیں ہوئیں۔مختلف زمانوں میں کچھ دھاتوں کا تعارف کرایا گیا لیکن سونے کی جاذبیت' اس کی اہمیت اورافادیت کبھی بھی کم نہ کی جاسکی۔اِسی لئے دنیا کے تمام ممالک افراطِ زر کے رُجحانات اور کرنسی کے نرخوں کے نشیب وفراز کا مقابلہ کرنے کے لئے سونے کی خرید کو ترجیح دیتے ہیں۔''

''اس زرد دھات یعنی سونے کی تاریخی حیثیت بہت دلچسپ ہے۔اس دھات کی کب دریافت ہوئی اور انسان نے کب اسے استعمال کرنا شروع کیا' تاریخ اس بارے میں بالکل خاموش ہے۔لیکن ہمارے سامنے آنے والے حقائق ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ سونے کی دریافت سب سے پہلے سپین کے پہاڑی علاقوں میں کھدائی کے دوران 4000 قبل مسیح میں ہوئی۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر زمانہ میں اس دھات کی اہمیت غیر معمولی طور پر ناقابلِ انکار رہی ہے۔عیسیٰ علیہ السلام سے ہزاروں سال پہلے ایران وعراق کے موجودہ علاقہ میسوپوٹامیا کے لوگ سونے کے زیورات استعمال کرتے تھے اور ایک تحقیق کے مطابق مصر کے فراعنہ (فرعون کی جمع) بھی سونا بطور آرائش وزینت استعمال کرتے تھے۔''☆ (روزنامہ ''نوائے وقت'' ملتان 27 نومبر 2005)

''حالیہ جائزہ سے معلوم ہوا ہے کہ پاکستان میں سونے کا یومیہ استعمال تیس ہزار (30,000) تولہ ہے جبکہ عالمی منڈی میں اس کا یومیہ استعمال ساڑھے پانچ ٹن ہے۔طبی تحقیق کی رُو سے سونا جوڑوں کے درد اور دوسری لاعلاج بیماریوں کے لئے مفید ہے۔اس کا استعمال نہ صرف حکیم کرتے ہیں بلکہ میڈیکل ڈاکٹر بھی استعمال کرتے ہیں اور وہ دیگر ادویات میں بھی استعمال ہوتا ہے۔اعصابی بیماریوں میں بھی سونے کا استعمال مفید ہے۔معالجین کا کہنا ہے کہ اگر سونے کی ایک ڈلی کو پانی بھرے گلاس میں رات بھر رکھا جائے اور اگلی صبح کو وہ پانی پیا جائے تو اعصابی تناؤ کم ہو جاتا ہے۔ایسا پانی انسانی چہرے کو خوبصورت اور جاذبِ نظر بناتا ہے۔سونے کی پیمائش کا پیمانہ ''قیراط'' کہلاتا ہے۔چوبیس (24) قیراط کا سونا اصلی اور خالص سونا ہوتا ہے۔22 قیراط کا سونا 91.67 فیصد اور 18 قیراط کا سونا 75 فیصد خالص ہوتا ہے۔16 قیراط کے سونے میں 58.3 فیصد سونا ہوتا ہے۔'' (ایضاً: مضمون نگار: سرور منیر رانا)

تانبے (نُحاس Copper) کا ذکر صرف ایک بار سورۃ الرحمٰن کی آیت ۳۵ میں ہوا جبکہ پگھلے ہوئے تانبے (قِطرَان' قِطر) کا ذکر دوبار یعنی سورہ ابراھیم کی آیت ۵۰ میں اور سورۃُ الکہف کی آیت ۹۶ میں ہوا کہ روزِ قیامت اللہ کے نافرمان بندوں اور جنوں کے لباس ایسے روغن کے ہوں گے جو آگ کو خوب بھڑکاتا ہے اور اُن کے چہروں کو آگ ڈھانپ رہی ہوگی (ابراھیم: ۵۰) اور ذوالقرنین نے پہاڑ کی اطراف کو پگھلے ہوئے تانبے سے بھر دیا (الکہف: ۹۶)۔اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ بہادیا (سورہ سبا: ۱۲)۔

☆ مصری نظامِ حکومت میں جب بادشاہ کی خاص نظرِ عنایت کسی پر ہوتی تھی' کسی معمولی انسان کو نواب یا رئیسِ بااختیار بنایا جاتا ہوتا تھا تو بطورِ اعزاز اُسے سونے کے زیور پہنائے جاتے تھے اور سورہ الزخرف (۴۳) کی آیت ۵۳ میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں طنزاً کہا تھا: فَلَوْلَآ أُلْقِيَ عَلَيْهِ أَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ (سو اُس کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن کیوں نہیں پڑے ہوئے؟)

پگھلے ہوئے تانبے کی اصل ماہیت کا نام مُہل ہے جو قرآن مجید میں تین بار استعمال ہوا ہے: (۱) سورۃ الکہف کی آیت ۲۹ میں ''جہنمیوں کی پیاس کی فریاد رسی ایسے پانی سے کی جائے گی جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگا'' (۲) زقُّوم کا درخت ''جو جہنمیوں کے پیٹوں میں پگھلے ہوئے تانبے کی طرح کھولے گا''۔ (۳) روزِ قیامت آسمان کی کیفیت ''وہ پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا'' (سورۃ الدخان: ۸)۔ مُہل کی اصل حقیقت رب تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ وہ کیسی ہے۔

لوہے میں بڑی طاقت اور حضرتِ انسان کے لئے اس میں بڑے فوائد ہیں (سورۃ الحدید: ۲۵)۔ وہ بے ہنگم ٹکڑوں کی شکل میں ہوتا ہے (سورۃ الکہف: ۹۶)۔ اس سے ہتھوڑے بنتے ہیں (سورۃ الحج: ۲۱)۔ رب تعالیٰ نے لوہے کو داؤد علیہ السلام کے لئے نرم بنا دیا (سورہ سبا: ۱۰)۔ سورۃ الحدید میں اس دھات کا اس طرح ذکر ہے:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (اَلْحَدِید: ۲۵)

''ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ہم نے اُن کے ساتھ کتاب کو اور انصاف کرنے کو نازل کیا تاکہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں اور ہم نے لوہے کو (بھی) نازل کیا کہ اُس کے اندر شدید ہیبت ہے اور لوگوں کے لئے (اور بھی) فائدے ہیں۔'' (۲۵ : ۵۷)

یہ آیت نیکی کے باقاعدہ استحکام، عمدگی اور اچھائی اور اللہ کی زمین پر عدل وانصاف کے استحکام کو محیط ہے جس سے حیاتِ انسانی کو خوشی ومسرت اور امن وآشتی کی راہ ملتی ہے۔

(ب) معدنیات: قرآن مجید میں اکثر ذکر پتھر (حَجَر) کا آیا ہے جس کی جمع حِجارہ ہے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر واحد اور جمع دونوں صورتوں میں گیارہ مرتبہ ہوا ہے:

(۱) سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۴ میں ایک مرتبہ، ۶۰ میں ایک مرتبہ اور ۷۴ میں دو مرتبہ = ۰۴
(۲) سورۃ الاعراف: ۱۶۰ (۳) سورۃ الانفال: ۳۲ = ۰۲
(۴) سورہ ھُود: ۸۲ (۵) سورۃ الحِجْر: ۷۴ = ۰۲
(۶) سورہ بنی اسرائیل: ۵۰ (۷) سورۃ الذّاریٰت: ۳۳ = ۰۲
(۸) سورۃ التحریم: ۶ = ۰۱

کل: ۱۱ مرتبہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پتھر پر سمندر میں مارا تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے (بحوالہ سورۃ البقرۃ: ۶۰، سورۃ الاعراف: ۱۶۰، سورۃ الشعراء: ۶۳)۔ پتھر نارِ جہنم کو غذا پہنچائیں گے (سورۃ البقرۃ: ۲۴، سورۃ

التّحریم : ۶)۔اگرچہ پتھر سخت ہوتے ہیں لیکن اُن میں سے کچھ دولخت ہوجاتے ہیں اور کچھ ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں (سورۃ البقرۃ: ۷۴)۔کچھ پتھر ایسے بھی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ آسمان سے نازل کرتا ہے (سورۃ الانفال: ۳۲، سورہ ھود: ۸۲، سورۃ الحِجر: ۷۴، بنی اسراء یل: ۵۰)۔وہ پتھر ان کے علاوہ ہیں جو فرشتوں نے قومِ لوط پر برسائے تھے (سورہ ھود: ۸۲، سورۃ الذاریٰت: ۳۳) اور وہ پتھر بھی جنہیں ابابیلوں نے دشمنِ اسلام ابرہہ اشرم اور اُس کے لشکر پر برسائے تھے یوں کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح پامال کردیا (سورۃ الفِیل: ۴)۔

قرآن مجید میں مذکور دوسری معدنیات گیلی چکنی مٹی یعنی طِین (Clay) ہے جس کا ذکر قرآن میں انسان کی تخلیق کے سلسلہ میں ذیل کے دس مقامات پر ہوا ہے:

(۱) سورہ آلِ عمران : آیت ۴۹ — (۲) سورۃ المائدۃ : آیت ۱۱۰
(۳) سورۃ الانعام : آیت ۲ — (۴) سورۃ الاعراف : آیت ۱۲
(۵) سورہ بنی اسرائیل: آیت ۶۱ — (۶) سورۃ المؤمنون : آیت ۱۲
(۷) سورہ الٓمّ السَّجدَۃ : آیت ۷ — (۸) سورہ الصّافّات : آیت ۱۱
(۹) سورہ صٓ : آیت ۷۱۔ — (۱۰) سورہ صٓ : آیت ۷۶۔

مصر کے فرعون کی طِین سے بنائی گئی مخیلہ عمارت کا ذکر سورۃ القَصَص کی آیت ۳۸ میں ہوا۔طِین کی دو قسمیں ہیں: (۱) کھنکھناتی ہوئی چکنی مٹی (صَلْصَال جیسے کوزہ گری) جس کا ذکر سورہ الرّحمٰن کی آیت ۱۴ میں ہوا اور جو ملائم، لوچدار مٹی (حَمَاٍ مَّسْنُوْن) سے بنتی ہے۔(۲) سخت مٹی (سِجّیل) جس سے آسمان سے پھینکے گئے کچھ پتھر بنائے گئے (سورہ ھُود: ۸۲، سورۃ الحِجر: ۷۴ اور سورۃ الفیل: ۴)۔

قرآن مجید حیران کن رنگ آمیزیوں اور پرچھایوں (Shades) کا حوالہ دیتا ہے جو نہ صرف نباتات میں بلکہ چٹانوں اور معدنیات میں بھی پائے جاتے ہیں۔سورہ فاطِر کی ذیل کی آیت میں معدنیات کے میدان میں بلند و بالا پہاڑوں کی کھدائی کرنے کے ذریعے تحقیق کرنے کا کھلا اشارہ موجود ہے:

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ O (فاطِر : ۲۷)

''اور پہاڑوں میں بھی رنگ برنگے ٹکڑے ہیں، کوئی سفید، کوئی سرخ، اُن کے رنگ مختلف ہیں اور کوئی بہت گہرے سیاہ۔'' (۳۵ : ۲۷)

''پہاڑوں کے مختلف رنگوں کی طرف خصوصی طور پر متوجہ کرکے اُن معدنیات کا کھوج لگانے کی ترغیب دی گئی ہے جو اُن کے شکموں میں موجود ہیں اور مدّت سے کسی جوانمرد اور باہمت انسان کی ضربِ خاراشگاف کے لئے چشم براہ ہیں اور پہاڑوں کی یہ مختلف رنگتیں اُن مدفون خزانوں کا پتہ دے رہی ہیں۔افسوس وہ قوم جسے قرآن کریم

جیسی کتابِ منیر عطا کی گئی، وہ اُسے ریشمی غلافوں میں لپیٹ کر سوگئی اور یورپ کی وحشی قومیں اس چشمہِ صافی سے اپنی کشتِ حیات کو سیراب کرنے میں سبقت لے گئیں۔'' (ضیاء القرآن ۔۔ کرم شاہ الازہری، ج ۴، ص ۱۵۴)

<u>کیا معدنیات کسی کی نجی ملکیت ہوسکتی ہیں یا نہیں ؟</u> کچھ صورتوں میں ملکیت اور قبضہ صحیح نہیں ہوتا جیسے (۱) مقاماتِ عبادت، عوامی سڑکیں اور شاہراہیں، باغات، چراگاہیں وغیرہ (۲) معدنیات لیکن اس سلسلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ کچھ کی رائے یہ ہے کہ معدنیات کسی کی نجی ملکیت نہیں ہوسکتیں اور اس بات کا کوئی اعتبار نہیں کہ آیا اُن کی کان کنی کی گئی ہے اور کسی شخص نے حکومت کی اجازت یا اجازت کے بغیر اُسے کھود کر باہر نکالا ہے کیونکہ کسی بھی صورت میں کسی شخص کو اپنی مزدوری سے زائد لینے کا استحقاق حاصل نہیں اور اس کی ملکیت حکومت ہی کی رہے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اِس رائے کی بنیاد جو زیادہ تر مالکی مکتبِ فکر کی ہے، اس نظریہ پر ہے کہ جائداد اپنی فطرت کے لحاظ سے ایسی ہوتی ہے کہ عوامی مفاد کے لئے حکومت کے علاوہ اس کا کوئی مالک نہیں ہوتا۔ کچھ دیگر علماء بالخصوص احناف یہ کہتے ہیں کہ زمین میں مخفی معدنیات زمین کے مالک کی ملکیت ہوتی ہیں۔ اور اس لئے زمین کے مالک کو اُن معدنیات سے فائدہ اٹھانے کا استحقاق حاصل ہوتا ہے لیکن وہ حکومتِ وقت کو کل مملوکہ معدنیات کا پانچواں حصّہ (خُمس) ادا کرے۔ ایک روایت کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے حضرت بلال بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک کان عطا فرمائی تھی جو کچھ فقہاء کے نزدیک صرف استعمال کے لئے تھی نہ کہ ملکیت کے لئے۔''

''لیکن معدنیات کی مفادِ عامّہ کی اہمیت کے مدِّ نظر ابنِ عابدین اور دیگر فقہاء کے نزدیک معدنیات بالخصوص تیل اور نمک چونکہ عام استعمال کی چیزیں ہیں، اس لئے اگر وہ حکومت کی جانب سے کسی خاص آدمی کو عطا کردی جائیں تو یہ بات مفادِ عامّہ کے خلاف ہوگی۔'' [ردّ المحتار (کتاب الاحیاء) ۔۔ ابن عابدین ؛ درّ المختار]

''ہم یہاں نمک کی ایک کان کی ملکیت اور اس کے قبضے کا حوالہ دیتے ہیں جسے خود نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ریاست کے لئے رکھ لیا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ابیض بن حمال نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے درخواست کی کہ اُسے مآرب کے علاقے میں نمک کی کان الاٹ کردی جائے جسے آپ ﷺ نے الاٹ کر بھی دیا۔ لیکن جونہی ابیض واپس پلٹے تو الاٹمنٹ منسوخ ہوگئی کیونکہ یہ بات نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علم میں لائی گئی کہ ابیض کو الاٹ کی جانے والی کان معاشرے کے لئے نمک کے حصول کا مستقل ذریعہ ہے ('' کتاب الاموال '' ۔۔ ابو عُبید، صفحہ ۳۹۰)۔ اس لئے کان کی ملکیت اور اُس کا قبضہ حکومت ہی کا رہنے دیا گیا۔ عوام کے عام استعمال نمک کو نجی جائداد میں تبدیل کرنے کی اجازت نہ دی گئی۔'' ("Economics & Islam"... Dr. Muhammad Musleh-ud-Din, pp. 100, 101)

(۱۶۶) علم ماورائے مادّہ / مابعد الطبعیات (Metaphysics)

کسی بھی انسان کے لئے اپنے حواس کے ذریعے تمام موجودات کا ادراک اور مشاہدہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ سننے، دیکھنے، چھونے، سونگھنے اور چکھنے کے دائرہ سے باہر کائنات میں کئی ایسی چیزیں موجود ہیں جن کی حقیقت ثابت ہوچکی ہے اور ہر زمانہ میں اُنہیں تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔

ہمارا مادّی تجربہ اور ہمارے حواسِ خمسہ ہمیں علم ماورائے مادّہ یعنی مابعد الطبعیات کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے بالکل قابل نہیں ہیں۔ انبیاء ورُسُل علیہم السلام کے ذریعے صرف وحیِ الٰہی ہی اس کا سچا اور یقینی ذریعہ معلومات ہے۔ اولیاء اللہ اور صوفیائے کرام کے لئے الہامِ الٰہی بھی ذریعہِ معلومات ہوسکتا ہے۔

مابعد الطبعیات (یا مافوق الفطرت) کی دنیا ہماری اس مادّی دنیا سے کہیں زیادہ وسیع اور فراخ ہے۔ مثلاً مادّی اصطلاح میں ہمارا دل ایک ایسا عضو ہے جو پھیپھڑوں اور جسم کے باقی حصّوں کے ذریعے خون کو پمپ کرتا ہے لیکن مابعد الطبعیاتی زبان میں اس کا مطلب محبت، نفرت، غصّہ، آرزو، مجموعہ جذبات، شدید خواہش، فکرمندی، غم، اداسی، رجائیت (پُر امیدی) اور قنوطیت کے جذبات میں لیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی روشنی میں ہم دنیائے مابعد الطبعیات کی مثالوں کو ایک ایک کرکے ذیل میں زیرِ بحث لاتے ہیں :-

(1) رُوح : ''الروح'' سے مراد یہ ہے کہ جب وہ جسم سے ملتی ہے تو زندگی کا معنیٰ دیتی ہے اور جب وہ جسم سے جدا ہوتی ہے تو جسم بے جان اور مردہ ہوجاتا ہے۔ روح کے جسم سے نکل جانے کے بعد کس چیز نے ہر جسمانی عمل کی جانداری (عملداری) روک دی اور کس چیز نے اُس مرنے والے شخص کا تعلق اپنے ماحول اور باقی دنیا سے توڑ دیا؟ اگرچہ اُس کے ریشہ کے قوائے احساس اب تک تقریباً سالم اور بے خلل ہیں لیکن نہ تو وہ دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی وہ سن سکتا ہے یا چھو سکتا ہے یا سونگھ سکتا ہے یا کسی چیز کو چکھ سکتا ہے۔

آخر یہ روح ہے کیا چیز جو جانداری کا ایسا منبع اور سرچشمہ ہے؟ تمام لوگ اس کے وجود کو مانتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھی اس کی حقیقت اور اصلیت کو نہیں جانتا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوا :

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًاO (بنی اسرائیل)

"اور (کفار) آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں، فرما دیجئے: روح میرے رب کے امر سے ہے اور تمہیں بہت ہی تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔'' (۸۵ : ۱۷)

آیتِ بالا سے دو اہم باتیں معلوم ہوئیں : (۱) قرآنی لفظ اُوْتِيْتُمْ (تمہیں دیا گیا) فعل مجہول ہے اور

صاف ظاہر کرتا ہے کہ علم، تجربہ یا مشاہدہ اُس قادرِ مطلق کے عطیات اور بخششیں ہیں نہ کہ کسی کی ذاتی ملک۔ (۲) یہ عطا شدہ علم، علمِ الٰہی کے مقابلے میں انتہائی کم اور تھوڑا ہے۔ انسان کو اُس کی فہم اور استفادہ کرنے کی اہلیت کے مطابق علم دیا گیا ہے۔ زندگی کی ماڈی فطرت کو واضح کرنا جدید سائنس کے بھی بس کا روگ نہیں اور اس حقیقت کو علم حیاتیات کے ماہر قائدین نے بھی تسلیم کیا ہے۔("Science of Life"... J. A. Thomson, p. 83)

ماڈی دنیا سے تعلق رکھنے والے ایک سائنسدان کو بھی اس بات کا اعتراف کرنا پڑا:

"فطرت کے متعلق ہمیں جتنی بھی زیادہ معلومات ملتی ہیں، اُتنی ہی زیادہ ہمیں اپنی لاعلمی سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ ہر حل شدہ مسئلہ مسائل کے ایک ایسے تازہ سلسلے کا دروازہ کھولتا ہے جس کا اب تک تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ غیب اور نا معلوم کا شعبہ لامتناہی ہے۔ معلوم شدہ کا شعبہ وسیع ہے لیکن متناہی ہے۔ ہم فیثا غورث کی نسبت حتمی حل کے زیادہ قریب نہیں ہیں۔ حتمی حل کا تجسّس محض منتشر اور پراگندہ ذہن کی علامت ہے۔" ("Universal History of the World".. Hammerton, Vol. VIII, p. 5012) New York.

قرآنی بیان اَلرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی (روح میرے پروردگار کے حکم ہی سے ہے) کی توضیح میں مصر کے نامور عالم جوہری طنطاوی اپنی تفسیر "الجواہر" میں لکھتے ہیں:

(قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی) مِمَّا اَبْدَعَهُ اللّٰهُ مِنْ غَیْرِ مَادَّةٍ وَقَدِاسْتَاثَرَ بِعِلْمِهٖ لَایَعْلَمُهٗ سِوَاهُ لِاَنَّکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اِلَّا مَا تَرَاهُ حَوَاسُکُمْ وَتَتَصَرَّفُ فِیْهِ عُقُوْلُکُمْ وحَوَاسُکُمْ لَاتَرٰی مِنَ الْمَادَّةِ اِلَّا بَعْضَ اَوْصَافِهَا کَالْاَلْوَانِ وَالْحَرَکَاتِ لِلْبَصَرِ وَالْاَصْوَاتِ لِلسَّمْعِ وَالطُّعُوْمِ لِلذَّوْقِ وَالْمَشْمُوْمَاتِ لِلشَّمِّ وَالْحَرَارَةِ وَالْبُرُوْدَةِ لِلَّمْسِ وقَدْ وَصَلَتْ اِلٰی سِتٍّ وَّثَلَاثِیْنَ نَوْعًا مِّنْ اَحْوَالِ الْمَادَّةِ مَا عَدَاهَا فَکَیْفَ تُدْرِکُوْنَ مَاهُوَ غَیْرُ مَادَّةٍ وهُوَ الرُّوْحُ ("الجواهر" للشیخ طنطاوی جوهری، جزء نہم، ص ۷۹، مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ بمصر، شوّال ۱۳۵۰ھ)

"کیونکہ اللہ تعالیٰ نے روح کو غیر ماڈی طور پر پیدا کیا، اس لئے اُس کا علم اللہ کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں۔ اُس کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا کیونکہ آپ کی آنکھ ظاہر کو دیکھتی ہے یا اُس چیز کو دیکھتی ہے جس کی طرف آپ کی جودت و ذکاوت (تیز فہمی) اور حس آپ کی راہ نمائی کرتی ہیں۔ ماڈی چیز میں بھی آپ کو اس کی کچھ خصوصیات معلوم ہوتی ہیں، مثلاً آپ چیزوں کے رنگوں اور اُن کی حرکات کو دیکھ سکتے ہیں، آوازوں کو سن سکتے ہیں، کھانے پینے کی چیزوں کو چکھ سکتے ہیں، خوشبو اور بدبو کو سونگھ سکتے ہیں اور گرم یا سرد کو چھو سکتے ہیں۔ ماڈی چیزوں کی خصوصیات 36 کی تعداد تک چلی گئی ہیں جن میں سے اکثر کا ہمیں علم ہی نہیں تو پھر ایک غیر ماڈی چیز یعنی روح کی حقیقت کا آپ کو کیسے علم ہو سکتا ہے!"

علامہ طنطاوی یہ بھی کہتے ہیں کہ ابن مسکویہ نے اپنی کتاب ''تہذیب الاخلاق'' میں' ابن سینا نے اپنی کتاب ''کتاب الاشارات'' میں اور ابن طفیل نے اپنے کتابچہ بہ عنوان ''حی ابن یقظان'' میں منطقی طور پر اور دیگر ذرائع سے روح کی دائمیت (ہمیشگی) کو ثابت کیا ہے۔'' (''الجواھر' جلد اوّل' صفحہ ۲۵۴)

<u>روح کی دائمیت (Eternity) اور اُس کا لافانی ہونا</u> : رب تعالیٰ خود لافانی ہستی ہے اور اُس نے انسان میں اپنی روح پھونکی (بحوالہ سورۃ الحجر: آیت ۲۹' سورہ صٓ: آیت ۷۲)۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لافانی ذات کی طرف سے آئی ہوئی روح بھی لافانی ہے اگرچہ جسم نے فنا ہو جانا ہے اور ہست سے نیست (عدم) میں چلے جانا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''الغزالی'' میں محسوس کیا ہے کہ اوّل اور انتہائی مشکل رکاوٹ جس پر قابو نہیں پایا جاسکتا' اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہے کہ روح جسم کے بغیر ایک ہستی کے طور پر زندہ رہتی ہے۔ روح کا کوئی جسم نہیں ہوتا۔ خالصتاً ایک جوہر اور غیر مادّی ہونے کے لحاظ سے اپنے وجود کو ثابت کرنے کے لئے وہ اپنی اوّلیں اہمیت کو برقرار رکھتی ہے جیسا کہ علامہ شبلی نے اپنی کتاب مذکور کے صفحات ۱۷۱' ۱۷۲ میں اسے بیان کیا ہے :

''روح کا وجود وجدانی معاملہ ہے۔۔۔۔ روح کے وجود کو ایک جداگانہ چیز کے طور پر ثابت کرنے کے بعد دوسرا مرحلہ جسم کے مردہ ہو جانے کے بعد روح کے باقی رہنے کی صلاحیت کا ثابت کرنا ہے۔''

''تاہم جدید تحقیق نے حقائق کے نئے دراز منظر وا کر دیئے ہیں' یہاں تک کہ اب ہم جسم کے بغیر روح کے مستقل وجود پر اِصرار کر سکتے ہیں یا یہ کہ جسم کے مردہ ہو جانے کے بعد روح کا باقی رہنا ایسی حقیقت نہیں جس میں اندھا عقیدہ شامل ہو بلکہ وہ ایک ایسی صداقت بن گئی ہے جسے مشاہدے اور اختیاری طور پر ثابت کیا جاسکتا ہے۔''

''سائنس کی یہ دریافت ہے کہ جسم لاتعداد چھوٹے چھوٹے خلیوں سے ترکیب پایا ہوا ہے جن کی تعداد ایک اوسط جسم میں ایک ہزار ایک سو ملین ہے۔ یہ خلیے ہر لحہ اپنی سالمیت کھوتے رہتے ہیں لیکن ہماری غذا اُن ضائع شدہ خلیوں کی تلافی کرتی رہتی ہے اور اُن کی جگہ نئے خلیے بنتے رہتے ہیں۔ اس طرح جسم اُس عمارت کی طرح ہے جس کی تشکیل کروڑوں اینٹوں سے ہوئی ہو لیکن جو ہر لحہ اپنی پہلی اینٹوں کی جگہ دوسری نئی اینٹوں کو لانے کے عمل میں ہو۔ اب اگر روح جسم کا مظہر ہو تو جسم کے خلیوں کا اپنی سالمیت کھو دینے یا اُن کے تغیر پذیر ہونے کے ساتھ روح کو بھی اُسی وقت اُسی تبدیلی میں سے گزرنا چاہئے بالکل اُسی طرح جس طرح کسی مشین کا پرزہ ٹوٹ جانے سے پوری مشین متاثر ہوتی ہے لیکن روح کا ایسا معاملہ نہیں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روح کا جسم کے بغیر اپنا ایک مستقل وجود ہے۔ اسی لئے ایک سائنسدان نے کہا ہے کہ ''شخصیت تغیر میں غیر مبدّل ہے'' یعنی انسانی شخصیت کا جسم کے مقابل اپنا ایک مستقل وجود ہے اور وہ مسلسل تغیرات کے درمیان بھی اپنا غیر مبدّل وجود رکھتی ہے۔''

اس نظریہ کی صدا قت کا ایک اور ثبوت علمِ نفسیات کے میدان میں لاشعور یا تحت الشعور کی دریافت نے دیا ہے جو ذہن کا بڑا حصّہ ہے۔ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ تحت الشعور میں ذخیرہ شدہ خیالات زندگی کے آخری لمحات تک اُسی حالت میں رہتے ہیں۔

''سادہ سی بات ہے کہ اگر روح جسم کی توسیع کا نام ہے تو پھر جسم کی طرح روح کو بھی زمان و مکان کے قوانین کا پابند ہونا چاہیے۔ مشاہدے سے ثابت ہوا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے اور ناگزیر نتیجہ یہی ہے کہ روح اپنی فطرت میں جسم سے علیحدہ چیز ہے اگرچہ اس کی اصل و ابتداء بیرونی ہے اور یہ کہ اس کا مستقل' خود مختارانہ وجود ہے۔ روح کا جسم کے ساتھ تعلق کا مقابلہ مشین اور اس کے چلنے کے ساتھ نہیں اور نہ ہی کسی موسیقی کے آلے کے ساتھ یا خود موسیقی کے ساتھ ہے۔ اگر اس موازنے کی کوئی بھی بنیاد ہوتی تو وہ قوانین جن کا اطلاق جسم پر ہوتا ہے' روح پر اثر انداز ہوتے۔''

''جدید نفسیات کی شاخ یعنی نفسیاتی تحقیق (Psychical Research) نے خالصتاً مشاہداتی سطح پر موت کے بعد کی زندگی کو ثابت کر دیا ہے۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس تحقیق نے نہ صرف زندگی اور بقا کو ثابت کیا ہے بلکہ بالفعل اُسی شخصیت کی بقا کو ثابت کیا ہے جس سے اُس کی موت سے پہلے ہم متعارف تھے۔''

''انسان میں ابتدا ہی سے کئی دوسری قابلِ تجزیہ خصوصیات بھی ہیں۔ اُن کا تجزیہ حال ہی میں سائنسی طور پر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر خواب دیکھنا انسان کا قدیم ترین معلوم شدہ عمل ہے لیکن زمانہ قدیم کا انسان خوابوں کی نفسیاتی تعلق داری سے آگاہ نہیں تھا جس کے حقائق پر جدید سائنسی تحقیق کے بعد روشنی پڑی ہے۔ اس سے بھی زیادہ روحِ انسانی کے کئی دیگر پہلو بھی دلچسپ ہیں جس کے جدید تحقیقات کی رُو سے غیر معمولی حسی قوّت ادراک (Extra sensory-perception) کے وجود کے ٹھوس ثبوت موجود ہیں۔''

براؤن یونیورسٹی کے فلسفہ کے پروفیسر سی۔ جے۔ ڈوکاس (C.J. Ducasse) نے بعد از موت زندگی کے نظریہ پر فلسفیانہ اور نفسیاتی لحاظ سے تنقیدی نظر کی۔ تنقید کے میدان میں مختلف تحقیقات میں عمومی تجزیہ کرنے کے بعد اس کا مشاہدہ یہ ہے:

''کچھ سرگرم' جوشیلے ذہن کے لوگ اور بہترین معلومات رکھنے والے لوگ جنہوں نے کئی سالوں تک انتہائی گہری نظر سے حیات بعد الموت کے ثبوت کا مطالعہ کیا' بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ کچھ صورتوں میں حیات و بقا کا مفروضہ معقول نظر آتا ہے۔'' ("Religion and Science".. Wahidud Din, pp. 39-44)

(2) <u>النفس اور القلب</u>: فہم اور تدبر کی صلاحیت عطا ہونے کے ساتھ انسان وہ واحد ہستی ہے جسے

احساسِ ذمہ داری ودیعت کیا گیا ہے (سورۃ الاحزاب:۷۲)۔وہ کھانے' پینے' سونے' جنفتی کرنے اور بچے پیدا کرنے میں دوسرے جانوروں اور درندوں کے ساتھ شریک ہے لیکن عقل و تدبر کی خصوصیت اُسے دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے اور اسی وجہ سے وہ ''اشرف المخلوقات'' ہے۔معرفتِ الٰہی کے تجسس اور تلاش میں اور اُس کی ذات اور اس کے اوصاف میں غور وفکر اور معقولیت بڑا قدم ہیں۔قرآن مجید اپنے ماننے والوں کو اس کی ترغیب وتحریص یوں دیتا ہے :

وَالَّذِیْنَ اِذَاذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْھَا صُمًّا وَّعُمْیَانًاO (الفرقان : ۷۳)

''اور (یہ) وہ لوگ ہیں کہ جب اُنہیں اُن کے رب کی آیتوں کے ذریعے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اُن پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے (بلکہ غور وفکر بھی کرتے ہیں)۔'' (۷۳ : ۲۵)

خالق کی رضا حاصل کرنے کے لئے (جو دونوں جہانوں میں دائمی خوشی اور ناقابلِ تصوّر آسائش وآرام کا ذریعہ ہے) غور وفکر کا آلہ (یعنی ذہن)' حواس اور انسان کی تمام مادّی صلاحیتیں اس مقصد کا ذریعہ ہیں جن کے استعمال کو آزادانہ طور پر انسان پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ہماری پانچوں حِسوں میں سے ہر حس کی اپنی حظ اندوزیاں ہیں۔آنکھوں کی طراوت قدرت کے حسن و جمال اور اُن چہروں کا مشاہدہ کرنے میں ہے جو انسانی ہمدردی رکھتے ہیں' کانوں کی مسرت مترنم آوازوں کے سننے میں ہے اور روح کی بشاشت اور تازگی حق و صداقت کا مشاہدہ کرنے میں ہے جس کی انتہائی شکل خالق کے فکر و تدبر کی ہے۔تو وہ شخص جو اپنی روح کو خوشیاں مہیا کرنے میں سست ہے' دراصل اپنے آپ کو دائمی خوشی و مسرت سے محروم کر رہا ہے۔اس صورتِ حال کے متعلق قرآن مجید یوں کہتا ہے :

(۱) وَمَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ سَبِیْلًاO (بنی اسرائیل: ۷۲)

''اور جو شخص اِس (دنیا) میں (حق سے) اندھا رہا سو وہ آخرت میں بھی اندھا اور راہِ (نجات) سے بھٹکا رہے گا۔'' (۷۲ : ۱۷)

(۲) فَاَمَّا مَنْ طَغٰیO وَاٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَاO فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰیO وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰیO فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰیO (آیات ۳۷-۴۱)

''تو جس کسی نے سرکشی کی ہوگی اور دُنیوی زندگی کو ترجیح دی ہوگی تو ایسے کا ٹھکانہ بس دوزخ ہی ہوگا۔اور جو کوئی اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو خواہش سے روکا ہوگا تو ایسے کا ٹھکانہ جنت ہی ہے۔(۳۷-۴۱ : ۷۹)

اور اِسی جہاد بالنفس کے ضمن میں ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ گرامی ہے:

لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرْعَۃِ اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِكُ نَفْسَہٗ' عِنْدَ الْغَضَبِ (اربعین نووی)

''طاقتور وہ نہیں جو (اپنے) مدّ مقابل کو پچھاڑ دے' دراصل طاقتور تو وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔'' (اربعین امام نووی)

احساسات وجذبات کے مرکز'' قلب (دل)'' کی امام غزالی نے خوب توضیح کی ہے جو غیر مرئی (غائب) دنیا کو دیکھنے کی کھڑکی ہے ("The Religion of Islam"... A.Galwash, Vol. 2, p. 211, NY1941) ۔

انسان جتنا زیادہ اپنے آپ کو دنیاوی خواہشات سے پاک وصاف کرتا ہے اور اپنی روح کو اپنے خالق کے احکامات و پیغامات کا پابند کرتا ہے' وہ اتنی ہی خوش کن اور ہم آہنگ روحانی دنیا پائے گا۔ اُس کا دل پاک وصاف ہوجائے گا اور وہ زیادہ سے زیادہ عنایاتِ الٰہی کا حاصل کرنے والا اُس پالش شدہ آئینے کی طرح ہوجائے گا جس میں الٰہی نور اور درخشانی بڑی تابانی کے ساتھ منعکس ہوگی۔ بدی اور شر دل کو دُھندلا دیتے ہیں اور آئینہِ دل کو غبار آلود کردیتے ہیں۔ بدآدمی کا دل' نہ کہ اُس کی آنکھیں' اندھا ہوجاتا ہے جیسا کہ سورۃ الحج میں ہے:

لَا تَعۡمَی الۡاَبۡصَارُ وَلٰکِنۡ تَعۡمَی الۡقُلُوۡبُ الَّتِیۡ فِی الصُّدُوۡرِO (الحج : ۴۶)

''(ایسوں کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔'' (۲۲:۴۶)

قرآن مجید نے ایک مقام پر ظلمتِ قلب کی اسی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے:

کَلَّا بَلۡ رَانَ عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ مَّا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ o کَلَّاۤ اِنَّهُمۡ عَنۡ رَّبِّهِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَO (اَلۡمُطَفِّفِیۡن : ۱۴'۱۵)

''ہرگز (ایسا نہیں کہ جزا وسزا نہ ہو) اصل یہ ہے کہ اُن کے دلوں پر اُن کے کرتوتوں کا زنگ لگ گیا ہے۔ حق یہ ہے کہ بے شک اُس دن اُنہیں اپنے رب کے دیدار سے (محروم کرنے کے لئے) پس پردہ کردیا جائے گا۔'' (۸۳ : ۱۴'۱۵)

یعنی'' اُن کی بدعملیوں کے دھبے اُن کے آئینہِ دل کو داغ دار کردیتے ہیں' لہٰذا وہ نورِ ہدایت کو حاصل نہیں کر سکتے۔ بروزِ قیامت ان معصیت پیشہ لوگوں کی آنکھوں سے سچی روشنی' رب تعالیٰ کی شان وشوکت' نیکوکاروں کی خوشی کو پسِ پردہ کردیا جائے گا۔ اُن کی سزا وہ حقیقتِ محض ہوگی جس کا وہ مشاہدہ کرلیں گے۔'' (یوسف علی' نوٹ: ۶۰۱۸)

اس ضمن میں نبی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا:

''جب انسان کوئی برا کام کرتا ہے تو اُس کے دل پر ایک سیاہ دھبہ آجاتا ہے۔ پھر اگر وہ اُس گناہ سے باز رہتے ہوئے نادم وپشیمان ہوتا ہے اور اللہ سے مغفرت طلب کرتا ہے تو اُس کے دل سے وہ دھبہ دھو دیا جاتا ہے اور اگر وہ گناہ دوبارہ کرتا ہے تو وہ سیاہ دھبہ اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ وہ دل کا پورا احاطہ کرلیتا ہے۔'' (ترمذی)

دل کا سکون وقرار اور آرام وآسائش ذکرِ الٰہی اور اُس سے فریاد والتجا کرنے میں ہے۔ جیسا کہ سورۃ الرّعد میں ارشادِ پاک ہوا:

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ O (الرَّعد:۲۸)
''جان لو کہ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔'' (۲۸ : ۱۳)

ذکرِ الٰہی میں خاصیت ہی یہ ہے کہ یہ انسان کے دل کو غیر اللہ کی طرف متوجہ ہونے کے اُلجھاؤ سے بچاتا ہے اور شرک سے جو انتشارِ ذہنی پیدا ہوتا ہے' توحید کا یقین اس کے لئے سپر ہو جاتا ہے۔ البتہ اس اطمینان کے بھی مختلف درجے ہوتے ہیں۔ جس درجہ کا ذکرِ الٰہی ہوتا ہے' اُسی نسبت سے اطمینانِ قلب بھی حاصل ہوتا ہے۔ ذکرِ الٰہی کے آثار میں سے ایک اثر خوف و خشیت کا ہے جیسا کہ سورۃ الانفال کی آیت دوم میں فرمایا: اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ کہ ''جب مؤمنوں کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُن کے دل سہم جاتے ہیں۔''

''آج انسان ملحدانہ اور مادیت گزیدہ فلسفوں کے اثر کے تحت مشینی زندگی کے پہیے کی زد میں آ گیا ہے اور بہت سے لوگ اپنا ذہنی سکون کھو بیٹھے ہیں جس کے نتیجہ میں ذہنی انتشار و اضطراب اور بے سکونی معاشرے میں عام ہے۔ معدے کے ناسور(Ulcer)' دل اور شریانوں کے اَمراض اور نظامِ انہضام (ہاضمہ) کی مختلف پراگندگیاں اور بے نظمیاں اُس نقصان کا تحفہ ہیں جو تفکرات اور پریشانیاں ہمارے دراِفرازی نظام(Endocrine System) پر مسلّط کرتی ہیں۔ اس لئے ہم میں سے اکثر لوگ ذہنی تناؤ کے باعث ایسی بیماریوں کے شکار ہیں جن کا پہلے کبھی نام بھی نہیں سُنا گیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ انسان کے حیات آفریں نظام اُلٹی سمت (Reverse gear) میں چلنا شروع ہو گئے ہیں۔ اُس رحیم و کریم خالق نے ہمارے درافرازی نظام کو اِس طریق سے منظّم کیا ہے کہ اگر ہم اطاعت و فرمانبرداری اور اُس سے محبت کے ساتھ زندگی گزاریں تو وہ نظام یقیناً صحتمندانہ طور پر کام کرے گا' خون کی نالیاں پھیلی رہیں گی' جسمانی اعضاء اور اعصاب کے ریشوں(Tissues) کو خون کی مناسب اور مطلوبہ فراہمی ہوتی رہے گی' مامونیت کا نظام(Immune System) زیادہ سے زیادہ حُسنِ کارکردگی سے کام کرے گا اور اعصابی نظام پُرسکون اور خوش کُن جمالیاتی نظم و تناسب کے ساتھ مائل بہ عمل رہے گا۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ اس چند روزہ زندگی کی عارضی خوشیوں کا پیچھا انسان قنوطیت کے ردِّعمل کے طور پر کرتا ہو۔ اگر ایسا ہے تو یقیناً یہ صراطِ مستقیم سے انحراف ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کا رابطہ اور تعلق اپنے خالق کے ساتھ جتنا زیادہ ہوگا' زندگی کے نظریہ کے بارے میں اُس کا نظریہ اُتنا ہی رجائیت پسندانہ ہوگا۔'' (ماجدی انگریزی' صفحہ 234-A نوٹ : 300)

(3) موت: ''اَلْمُنجد'' میں موت کی تعریف یہ کی گئی ہے:
زَوَالُ الْحَیَاۃِ عَمَّنْ کَانَتْ فِیْہِ یعنی زندگی والی شے سے زندگی کا زائل ہو جانا موت کہلاتا ہے۔

اس دنیا میں جو بھی جی آیا ہے' یہاں سے جانے کے لئے آیا ہے اور بہر صورت موت اُس کا مقدر ہے۔ اس دنیائے ہست و بود میں ہر جان کو ایک وقتِ معیّن دیا گیا ہے جس کا اختتام ہست سے نیست اور وجود سے عدم پر ہوتا ہے (سورۃ الاعراف:۳۴؛ یونس:۴۹؛ المنافقون:۱۱)۔

موت ایک ایسا مسئلہ ہے جسے کافر' مسلم اور ملحد سبھی مانتے ہیں لیکن ہر ایک کے ماننے کی نوعیت الگ الگ ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ زمانے کا ہیر پھیر ہے کوئی کچھ کہتا ہے' کوئی کچھ۔ الغرض موت اور فنا کے بارے میں توہماتی' تخیلاتی اور نفسیاتی لٹریچر کی بھرمار ہے۔ لیکن موت کے بارے میں سادہ ترین اور صحیح ترین مذہبی نظریہ سورۃ الزُّمَر کی مندرجہ ذیل آیت کے چند الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ موت میں ہم اپنی جان (ملک الموت کے) حوالے کر دیتے ہیں لیکن ہماری روح فنا نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک ایسے وجودی جہان میں واپس چلی جاتی ہے جہاں وہ روحانی دنیا کی حقیقتوں کے متعلق زیادہ باشعور ہو جاتی ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے:۔

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِہَا فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْہَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰی اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ○ (اَلزُّمَر:۴۲)

''اللہ جانوں کو اُن کی موت کے وقت قبض کرتا ہے اور اُن (جانوں) کو بھی اُن کے سونے کے وقت جن کو موت نہیں آئی ہے' پھر وہ اُن جانوں کو تو روک لیتا ہے جن پر موت کا حکم کر چکا ہے اور باقی (جانوں) کو ایک مقررہ میعاد کے لئے رہا کر دیتا ہے' بے شک اس (سارے تصرف) میں اُن لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو سوچتے رہتے ہیں۔'' (۳۹ : ۴۲)

سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۵۴ کی تشریح میں مفتی احمد یار خان گجراتی تفسیر ''روح البیان'' کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انسان میں دو رُوحیں ہیں: ایک روحِ سلطانی جس کا مقام دل ہے اور اسی سے زندگی قائم ہے۔ دوسرے روحِ حیوانی جس کا مقام دماغ ہے جس سے ہوش و حواس برقرار رہتے ہیں۔ روحِ حیوانی سونے کی حالت میں نکل جاتی ہے اور روحِ سلطانی موت کے وقت خارج ہوتی ہے یعنی روحِ حیوانی کے نکلنے کا نام ''نیند'' ہے اور روحِ سلطانی کے نکلنے کا نام ''موت'' ہے۔ پھر جس طرح نیند کی حالت میں روحِ حیوانی جسم سے نکل کر عالم کی سیر کرتی ہے' اسی سیر کا نام خواب ہے مگر جسم سے اُس کا تعلق پھر بھی ایسا ہی رہتا ہے جیسے بجلی کے بٹن کا پاور ہاؤس سے کہ جونہی کسی نے جسم کو ہاتھ لگایا یا پکارا' فوراً ہی روح کو خبر ہوئی اور آناً فاناً آ کر جسم میں داخل ہو گئی اور سونے والا جاگ گیا۔ ایسے ہی بعد موت روحِ سلطانی کا کچھ تعلق جسم سے باقی رہتا ہے۔ اسی لئے مسلمان جب قبرستان میں جاتا ہے تو سنتِ رسول ﷺ کی پیروی میں اصحابِ قبور کو اَلسَّلَامُ عَلَیْكُمْ یَا اَھْلَ الْقُبُوْر کے الفاظ میں ہدیہ سلام پیش کرتا ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ مُردے تمہاری اُس بات کو سنتے ہیں جو تم اُنہیں کہتے ہو۔ یہ حقیقت سورۃ الاعراف کی

آیات ۷۹، ۹۳ سے بھی ثابت ہے جب صالح علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کے اُن بے جان لاشوں کو خطاب فرمایا تھا جو عذاب الٰہی کی لپیٹ میں آ گئے تھے اور نبی علیہ السلام کے خطاب سے بھی جو اُنہوں نے جنگِ بدر کے کافر مقتولین کے مُردہ جسموں سے فرمایا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ موت نہ تو روح کی فنا کا نام ہے اور نہ جسم کی فنا کا۔ صرف روح کا تعلق ضعیف ہو جانے کا نام ہے۔ اب یہ روح چونکہ اس جسم کی پرورش نہیں کرتی اس لئے بعد از موت جسم گل سڑ جاتا ہے مگر چونکہ کچھ تعلق باقی رہتا ہے، اس لئے قبر میں نیکوکاروں کے جسم کو راحت اور بدکاروں کے جسم کو عذاب دیا جاتا ہے اور روح اس کا احساس کرتی ہے۔'' (تفسیر نعیمی، پارہ دوم، آیت ۱۵۴، صفحات ۴۴، ۴۵)

<u>موت بطور تخلیقی کیفیت</u>: ''اس روئے زمین پر آزمائشی زندگی اور آخرت کی مستقل روحانی دنیا کے درمیان موت ایک دروازے کی طرح ہے۔ قرآن مجید زندگی کی طرح موت کو بھی تخلیقی عمل کا نام دیتا ہے۔ لہٰذا موت عدم کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک تخلیقی کیفیت ہے جیسا کہ ذیل کی آیات سے ظاہر ہے:۔

(۱) كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○
''تم اللہ کا انکار کیسے کر سکتے ہو جبکہ تم بے جان تھے، پھر اُس نے تمہیں جان بخشی، پھر وہ تمہیں مارے گا پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا پھر تم اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔'' (البقرۃ: ۲۸)

كُنْتُمْ اَمْوَاتًا سے مراد قبل از ولادت کی بے جان یا جمادیت کی حالت ہے۔ لہٰذا انسان اُس حالت میں بے جان تھا۔ فَاَحْيَاكُمْ سے مراد وہ زندگی ہے جو ماں کے پیٹ میں بچے کو ملتی ہے۔ چونکہ یہ زندگی پہلی موت سے ملی ہوئی ہے، اس لئے یہاں ''ف'' ارشاد ہوا۔ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ اس موت سے مراد وہ موت ہے جو عمر ختم ہونے پر ہر شخص کو آتی ہے۔ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ یہ اُس دوسری زندگی کا ذکر ہے جو موت کے بعد ملنے والی ہے، جس کے کفار منکر تھے۔

(۲) قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ○
''کافر کہیں گے اے ہمارے پروردگار! تو نے ہمیں دو بار مُردہ رکھا اور دو بار زندگی دی، سو ہم اپنی خطاؤں کا اقرار کرتے ہیں تو کیا کوئی صورت نکلنے کی ہے؟'' (المؤمن: ۱۱)

دو موتیں (یعنی قبل از ولادت کی بے جان حالت + عمر ختم ہونے پر آنے والی موت)
دو زندگیاں (شکمِ مادر میں بچے کو ملنے والی زندگی + موت کے بعد ملنے والی آخرت کی زندگی)۔ اِن دونوں موتوں اور دونوں زندگیوں کی وضاحت اوپر سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۸ میں آ گئی ہے۔

''اس طرح موت ہمارے اس دنیا میں آنے سے پیشتر کے وجود کی حالت ہے جس طرح کہ وہ ہمارے

اس دنیا سے اُس دنیا کو جانے کے بعد کے وجود کی حالت ہے۔" ("Doomsday & Life after Death" ... Sultan Bashir Mahmood, pp. 191-192)

مرنے کے بعد روحیں اپنے آسمانی ٹھکانے کی طرف واپس چلی جاتی ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اللہ ہی کی جانب سے آئے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جا رہے ہیں یعنی یہ الفاظ قرآن اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اسی حقیقت کو قرآن مجید نے کئی مقامات پر اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ اور اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

حیاتِ دنیوی کی بساط لپٹنے کے بعد اگلی دنیا کو جانے پر رُوح کو مافوق الفطرت حقائق (فرشتوں جنت اور جہنم کی جھلکیاں) معلوم ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ سورہ قٓ کی مندرجہ ذیل آیت (۲۲) سے ظاہر ہے:

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ" ٥

"تو اس دن سے بے خبر تھا' سو ہم نے تجھ پر سے تیرا پردہ ہٹا دیا سو آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے۔" (۵۰:۲۲)

اِس سوال کے جواب میں کہ آیا مُردے میں کچھ ہوشیاری کی حالت بھی ہوتی ہے' سورہ فاطر کی آیت ۱۲۲ شارتاً بتاتی ہے کہ زندہ اور مُردہ برابر نہیں ہو سکتے اور یہ کہ جب اللہ تعالیٰ جسے چاہے' اپنی قدرتِ کاملہ سے سُنوا سکتا ہے' تو زندہ لوگ قبروں میں مدفون مُردوں کو الٰہی طاقت کے بغیر نہیں سنوا سکتے۔ (مثلاً سورۃ الاعراف کی آیت ۷۹ اور ۹۳ جب حضرت صالح اور حضرت شعیب علیہما السلام نے اپنے دشمن مُردوں کو با مقصد طور پر باذنِ الٰہی خطاب کیا تھا)۔

انگریزی کا مشہور شاعر Shelley کہتا ہے:

"کیا نیند اور نیند سے بیدار ہونا ہمیں متواتر اس بات کی یقین دہانی نہیں کراتے کہ ہم نے بہر حال مرنا ہے اور مرنے کے بعد ہمیں دوبارہ زندگی ملے گی؟ موت اور اُس کی بہن نیند دونوں کتنے ہی عجیب ہیں!"

(4) روزِ محشر (بعث الاجساد): یوم آخرت پر ایمان لانا اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے جب تمام مُردوں کو رب تعالیٰ کے حضور اپنے اعمال کی جوابدہی کے لئے دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اُس دن کے واقع ہونے کا قرآن مجید بار بار ذکر کرتا ہے۔ کافروں اور ملحدوں کے نزدیک یوم آخرت کا وقوع محال بالذات ہے کیونکہ اُن کے نزدیک مُردہ جسموں کو دوبارہ زندگی ملنا بعید از عقل ہے جبکہ وہ گل سڑ کر اور ریزہ ریزہ ہو کر دُور دراز جگہوں پر منتشر ہو چکے ہوں گے اور مٹی سے مل کر مٹی ہو چکے ہوں گے۔ قرآن مجید نے ایسے مزعومات کی کئی منطقی طریقوں سے تردید کی ہے۔ مثلاً درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

(ا) اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ (یونس: ۴)

"تم سب کو اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (یہ) اللہ کا سچا وعدہ ہے۔ بے شک وہی پیدائش کی ابتداء کرتا ہے، پھر وہی اُسے دُہرائے گا تا کہ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے، انصاف کے ساتھ جزا دے۔" (۱۰ : ۴)

(۲) وَقَالُوْا أَءِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا أَءِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًاO قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًاO أَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ قُلْ عَسٰى أَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًاO
(الاسراء : ۴۹ تا ۵۱)

"وہ (کفار) کہتے ہیں کہ جب ہم ہڈیاں اور چورا چورا ہو جائیں گے تو کیا ہم ازسرِنو پیدا اور جمع کئے جائیں گے۔ آپ کہہ دیجئے کہ تم پتھر یا لوہا ہو جاؤ یا کوئی اور چیز جو تمہارے خیال میں بہت ہی بعید ہو، پھر وہ کہیں گے کہ کون ہمیں دوبارہ چلائے گا؟ آپ کہہ دیجئے کہ وہ وہی ہے جس نے تمہیں اول بار پیدا کیا تھا۔ پھر وہ آپ کے آگے سر ہلائیں گے اور کہیں گے کہ یہ (زندہ ہونا) ہوگا کب؟ آپ کہہ دیجئے کہ عجب نہیں کہ یہ وقت قریب ہی آ پہنچا ہو۔" #(۴۹ تا ۵۱ : ۱۷)

سر کی یہ حرکت بطور انکار و اعراض ہوگی جس کا مطلب یہ ہوا کہ منکر جب دلائل میں لاجواب ہو جاتا ہے تو وہ بات کا رخ ہی بدل دیتا ہے۔ نغض کے لفظی معنی اوپر نیچے یا نیچے اوپر حرکت دینے کے ہیں۔

(۳) اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًاO (سریم : ۶۷)
"کیا انسان یہ بات یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس سے پہلے (بھی) اُسے پیدا کیا تھا جبکہ وہ کوئی چیز ہی نہ تھا۔" (۶۷ : ۱۹)

(۴) وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ O قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْ اَنْشَاَهَا اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌO یٰسٓ : ۷۸، ۷۹ : ۳۶)

نوٹ: "یہاں فرمایا گیا اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا (قیامت قریب ہی ہے)۔ اِس فرمان کو چودہ صدیاں تو گزر چکیں، ابھی تک تو آثار بھی نہیں آئے تو قیامت قریب کیسے ہوئی؟ یہ اعتراض امام فخر الدین رازی کے زمانے میں کیا گیا جبکہ اُس وقت چھ سو سال گزرے تھے۔ اس کا جواب امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیا کہ قریب ہونا دنیا کی پوری مدت کے لحاظ سے ہے۔ نبی کریم ﷺ کے زمانے تک دنیا کی زیادہ مدت جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوئی، ہزاروں سال گزر چکی، اب تھوڑی باقی ہے اس لئے قریبًا کہنا بالکل درست ہے۔ دوسرا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ قیامِ دنیا کا مقصد پورا ہو چکا ہے یعنی نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اب تو صرف قیامت کا ہی انتظار ہے جس میں اس سلسلے کا نتیجہ ظاہر ہونا ہے یعنی قریبًا ہے انتظار میں۔ اس کے سوا اب کسی اور کا انتظار نہیں رہا۔" (تفسیر نعیمی، ج ۱۵، ص ۲۳۲)

''اور (خود) ہمارے لئے مثالیں بیان کرنے لگا اور اپنی پیدائش (کی حقیقت) کو بھول گیا، کہنے لگا: ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا جبکہ وہ بوسیدہ ہو چکی ہوں گی۔ فرما دیجئے: اُنہیں وہی زندہ فرمائے گا جس نے اُنہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور وہ ہر مخلوق کو جاننے والا ہے۔'' (۷۸، ۷۹ : ۳۶)

(۵) اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِ ۦَ الْمَوْتٰى بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (الاحقاف : ۳۳)

''کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور وہ اُن کے پیدا کرنے سے تھکا نہیں، اس بات پر (بھی) قادر ہے کہ وہ مُردوں کو (دوبارہ) زندہ فرما دے، کیوں نہیں، بے شک وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔'' (۳۳ : ۴۶)

قرآن مجید میں یہ کہیں نہیں ہے کہ قیامت کب آئے گی کیونکہ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے (سورۃ الاعراف، آیت ۱۸۷) اگرچہ اس کی اَشراط اور علامات کتبِ حدیث میں موجود ہیں اور اُن میں سے تقریباً تمام علامات پوری ہو چکی ہیں۔ وقتِ قیامت زندگی کی تمام سرگرمیاں رک جائیں گی۔ قیامت کی ہولناکیوں کو بیان کرنے میں قرآن مجید کا بیان واضح ہے۔ وہ ہولناکیاں دنیا کی خوش آہنگی کو دگرگوں کر دیں گی جیسا کہ اِن آیات سے ظاہر ہے:

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ○ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ○ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ○ وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ○ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ○ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ○ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ○ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ○ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ○ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ○ وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ○ وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ○ وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ○ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ○ (التکویر : ۱ تا ۱۴)

''جب آفتاب لپیٹ لیا جائے گا۔ جب ستارے بے نور ہو جائیں گے۔ جب پہاڑ اُکھیڑ دئے جائیں گے۔ جب اونٹنیاں چھٹی پھرنے لگیں گی۔ جب وحشی جانور یکجا کر دئے جائیں گے۔ جب سمندر بھڑکا دئے جائیں گے۔ جب جانیں (جسموں) سے جوڑی جائیں گی۔ جب زندہ درگور کی ہوئی بچی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کے باعث ماری گئی۔ جب اعمال نامے کھول دئے جائیں گے۔ جب آسمان کی کھال اُدھیڑ دی جائے گی۔ جب دوزخ خوب دہکائی جائے گی اور جب جنت قریب کر دی جائے گی (تو اُس دن) ہر شخص جان لے گا کہ وہ کیا (اعمال) لے کر آیا ہے۔'' (۱ تا ۱۴ : ۸۱)

''جب آفتاب لپیٹ لیا جائے گا''۔ آفتاب کے طلوع ہونے پر اُس کی کرنیں اندھیروں میں ڈوبی ہوئی دنیا کو آناً فاناً منور کر دیتی ہیں لیکن اُس روز اُس کی نور افشانی کرنے والی کرنیں اُس کے گرد لپیٹ دی جائیں گی اور جب یہ منبع نور بے نور ہو جائے گا تو اُس وقت جو اندھیرا پھیلے گا وہ کس قدر گہرا اور کتنا بھیانک ہوگا! اس کا تصور ہی ہوش رُبا ہے۔

۴۰۹۵ (علم مابعد الطبعیات ۔۔Metaphysics)

''جب ستارے بے نور ہو جائیں گے۔'' وہ قانونِ کشش جو ہر ستارے کو اپنے مقام پر اور ہر سیارہ کو اپنے مدار میں روکے ہوئے ہے' وہ قانون منسوخ کر دیا جائے گا۔ ستارے اپنی اپنی جگہ سے ٹوٹ کر بکھر جائیں گے۔ بعض نے اِنْکَدَرَتْ کا معنی بے نور ہونا کیا ہے یعنی ستاروں کی چمک ختم ہو جائے گی۔

''جب پہاڑ اُکھیڑ دیئے جائیں گے۔'' کششِ ثقل کے فنا ہونے سے پہاڑوں کا وزن باقی نہیں رہے گا۔ ہوا کے جھونکے روئی کے گالوں کی طرح اُنہیں فضا میں اُڑانے لگیں گے۔ انجام کار اُن کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا جیسا کہ سورۃ القارِعۃ کی آیت پنجم میں بیان ہوا۔

''جب اونٹنیاں چُھٹی پھریں گی۔'' عِشَار اُس گابھن اونٹنی کو بھی کہتے ہیں جسے دسواں مہینہ ہوا اور وہ جلد ہی ایک بچے کو جنم دینے کے ساتھ شیر دار ہونے والی ہو۔ اہلِ عرب کو ویسے ہی اونٹ بڑے عزیز ہوتے ہیں' خصوصاً وہ اونٹنی جس کے حمل کو دس ماہ گزر چکے ہوں' اُن کے نزدیک وہ متاعِ گراں بہا شمار ہوتی ہے۔ وہ اُس کی حفاظت اور رکھوالی پوری توجہ سے کرتے ہیں لیکن قیامت کے روز لوگوں کی بدحواسی کا یہ حال ہوگا کہ ایسی قیمتی چیز کا بھی کوئی پُرسانِ حال نہ ہوگا اور ہر ایک کو اپنی جان کی پڑی ہوگی۔

''جب وحشی جانور یکجا کر دیئے جائیں گے۔'' صرف انسان ہی بدحواس نہ ہوں گے بلکہ جنگلی جانور جو انسان کی آواز سے بدکتے اور اُس کے سائے سے دُور بھاگتے ہیں' وہ بھی جنگل بیابان چھوڑ کر شہروں میں آگھسیں گے۔ نہ کوئی گدھا کسی کو دولتیاں مارے گا' نہ کوئی سانپ کسی کو ڈسے گا اور نہ کسی شیر کو کسی شکار پھاڑنے کی ہوش ہوگی۔ سب دُم دبائے اوپر تلے ایک جگہ جمع ہوں گے۔''

''جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے۔'' سمندروں میں اُس دن پانی کی لہریں نہیں' آگ کے شعلے اُٹھ رہے ہوں گے۔ پانی سے شعلوں کا اُٹھنا تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے لیکن اگر پانی کے اجزائے ترکیبی پر نظر ڈالی جائے تو تعجب اس پر نہیں ہونا چاہئے کہ اس سے آگ بھڑکے گی بلکہ حیرت اس پر ہوگی کہ پانی ڈالنے سے آگ بجھ کیوں جاتی ہے۔ پانی دو گیسوں یعنی آکسیجن اور ہائیڈروجن کا مرکب ہے۔ ان میں سے ایک گیس بھڑکانے والی ہے اور دوسری بھڑک اٹھنے والی ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ جب اُنہیں اکٹھا کیا جائے تو یہ آگ کی صورت اختیار کر لیں لیکن قادرِ مُطلق نے اُن کے مرکب کو پانی کی شکل دے دی اور اُس میں آگ بجھانے کی تاثیر رکھ دی۔ قیامت کے دن جب دوسرے تکوینی ضابطے بالائے طاق رکھ دیئے جائیں گے' سورج' ستارے اور پہاڑ کیا سے کیا بن جائیں گے' پانی کے اس ضابطے پر بھی قلمِ تنسیخ کھینچ دیا جائے گا۔ آکسیجن اور ہائیڈروجن اپنی اصلی حالت پر لوٹ آئیں گی اور اُن کے بے پایاں ذخائر جو سمندروں میں پانی کی صورت میں آج ٹھاٹھیں مار رہے ہیں' وہ بھڑکتے شعلے بن جائیں گے۔

''جب جانیں (جسموں) سے جوڑی جائیں گی۔'' یعنی اعمال و اخلاق کے مطابق انسانوں کی گروہ بندی کی جائے گی۔ مقربین کا ایک گروہ ہوگا' اصحابِ یمین ایک پرچم تلے اکٹھے ہوں گے اور اصحابِ شمال کو ایک جگہ جمع کیا جائے گا۔

''جب زندہ درگور کی ہوئی بچی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کے باعث ماری گئی۔'' یہ نہیں فرمایا گیا کہ اُس کے سنگ دل باپ سے پوچھا جائے گا کہ تو نے اپنی بچی کو کیوں زندہ درگور کیا بلکہ فرمایا کہ اُس بچی سے پوچھا جائے گا کیونکہ یہ باپ جس نے اپنی بے گناہ بچی پر ایسا ظلم کیا ہے' نگاہِ خداوندی میں اِس قابل ہی نہیں کہ اُسے خطاب کیا جائے (روح المعانی) یعنی اس انداز سے اپنے غصّے اور ناراضگی کی انتہا کا اظہار کیا گیا' اُسے مخاطب بنانے کے درجے سے ہی گرا دیا گیا اور اُسے رسوا کرنے میں مبالغہ سے کام لیا گیا۔ نیز ظالم سے اگر اُس کے ظلم کے بارے میں پوچھا جائے تو وہ اس کے لئے کئی حیلے بہانے تراشنے لگتا ہے۔ اس لئے مناسب یہی تھا کہ مظلوم سے پوچھا جائے تا کہ وہ اپنے غم والم کی داستان بیان کرے۔

اِس میں ایک اور حکمت بھی ہے۔ وہ یہ کہ دنیا میں کئی مظلوم ہوتے ہیں جنہیں ظلماً قتل کیا جاتا ہے لیکن اُن کا انتقام لینے کے لئے کئی تلواریں بے نیام ہو جاتی ہیں یا کم از کم اُن کی مظلومیت پر رنج وغم کے آنسو تو بہائے جاتے ہیں اور یہ ایسی مظلومہ تھی جس پر ظلم اُس کے ماں باپ نے کیا۔ اُس کی مظلومیت پر کسی نے صدائے احتجاج بھی بلند نہ کی' اُس کی جواں مرگی پر کوئی آنکھ نمناک تک نہ ہوئی بلکہ الٹا اطمینان کا سانس لیا گیا' اُس کے قاتل پر تحسین وآفرین کے پھول نچھاور کیے گئے' اُسے ''غیرتمند'' اور اپنے ''خاندان کی ناموس کے پاسبان'' کا خطاب دیا گیا۔ کیا مظلومیت میں اس کا کوئی ہمسر ہے؟ اگر ایسی معصوم' ستم رسیدہ بچی کی دلجوئی اُس کا پروردگار بھی نہ کرے تو اور کون کرے گا؟

اِس سوال میں قیامت کے برپا کرنے کی حکمت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ تم خود سوچو کہ اگر قیامت برپا نہ ہو تو کیا اس مظلومہ کی دادرسی کی کوئی اور صورت ہو سکتی ہے۔ اگر اتنا بڑا دلوں کو لرزا دینے والا ظالم محاسبہ سے بچ جائے تو اس سے بُری اندھیر گردی اور کیا ہو سکتی ہے! وہاں اندھیر گردی اور جور وستم نہیں بلکہ عدل وانصاف ہے۔

''جب آسمان کی کھال اُدھیڑ دی جائے گی۔'' آج انسان چرخِ نیلوفری کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے تو اُس کے جلال و جمال کو دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے لیکن اُس دن جب آسمان کی کھال اُدھیڑ دی جائے گی یعنی جب آسمان کے اوپر کی چیزیں بھی بے پردہ نظر آنے لگیں تو جلال و جمال سب فنا ہو جائے گا اور اُس کے چپے چپے سے وحشت برسنے لگے گی۔

اُس دن غفلت کے سارے پردے اُٹھ جائیں گے اور ہر قسم کا خمار اتر جائے گا اور ہر شخص کو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ اُس نے اپنی زندگی میں کیا کھویا' کیا پایا؟ اُس کے نیک وبد سب اعمال اُسے اپنے سامنے نظر آنے لگیں گے۔ یہ

علم ایسا یقینی اور قطعی ہوگا کہ اس کے بعد کسی مزید قیل وقال اور چون وچرا کی گنجائش ہی نہیں رہے گی اور ہر شخص کو اپنا انجام سامنے نظر آنے لگے گا۔

<u>وقوعِ قیامت پر عقلی دلائل</u> : صاحبِ تبیان القرآن' علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں :

''ہم اس دنیا میں دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ ظلم کرتے کرتے مرجاتے ہیں اور اُنہیں اُن کے ظلم پر کوئی سزا نہیں ملتی اور بعض لوگ ظلم سہتے سہتے مرجاتے ہیں اور اُنہیں اُن کی مظلومیت پر کوئی جزاء نہیں ملتی۔ اگر اس جہان کے بعد کوئی اور جہان نہ ہو تو ظالم سزا کے بغیر اور مظلوم جزاء کے بغیر رہ جائے گا اور یہ چیز اللہ کی حکمت کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہوا کہ اس عالم کے بعد کوئی اور عالم ہو جس میں ظالم کو سزا اور مظلوم کو جزاء دی جائے۔ اور سزا و جزاء کے برپا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس عالم کو بالکل ختم کر دیا جائے کیونکہ جزاء اور سزا اُس وقت جاری ہو سکتے ہیں جب بندوں کے اعمال ختم ہو جائیں اور جب تک تمام انسان اور یہ کائنات ختم نہیں ہو جاتی لوگوں کے اعمال کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ ایک شخص مسجد میں کنواں بنا کر مرجاتا ہے تو جب تک اس مسجد میں نماز پڑھی جاتی رہے گی اور جب تک اُس کنویں سے پانی پیا جاتا رہے گا' اُس شخص کے نامہ اعمال میں نیکیاں لکھی جاتی رہیں گی۔ اسی طرح کوئی شخص بت خانہ یا شراب خانہ بنا کر مرگیا تو جب تک وہاں بت پرستی یا شراب نوشی ہوتی رہے گی' اُس کے نامہ اعمال میں برائیاں لکھی جاتی رہیں گی۔ اس لئے جب تک یہ دنیا اور اس دنیا میں انسان موجود ہیں' اُس وقت تک لوگوں کا نامہ اعمال مکمل نہیں ہو سکتا اور لوگوں کے نامہ اعمال کو مکمل کرنے کے لئے دنیا اور دنیا والوں کو مکمل طور پر ختم کرنا ضروری ہے اور اِسی کا نام قیامت ہے۔''

''خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ جزاء اور سزا کا نظام قائم کیا جائے اور جزاء وسزا کو نافذ کرنے سے پہلے قیامت کا قائم کرنا ضروری ہے۔'' [اَلتَّذکِرۃ فی اَحوالِ المَوتٰی واُمور الآخِرۃ (اردو ترجمہ) جلد اوّل' صفحات ۳۶' ۳۷]

''<u>وقوعِ قیامت پر شرعی دلائل</u> : یہ دنیا دارالامتحان ہے جس میں انسان امتحان دینے والا اور اللہ تعالیٰ ممتحن ہے۔ اس امتحان کا نتیجہ اس دنیا میں ظاہر نہیں ہوتا لیکن نیک اور بد' اطاعت گزار اور نافرمان' موافق اور مخالف' مؤمن اور کافر میں فرق کرنا ضروری ہے اور یہ فرق صرف قیامت کے دن ظاہر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

(۱) اَمۡ نَجۡعَلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالۡمُفۡسِدِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ اَمۡ نَجۡعَلُ الۡمُتَّقِیۡنَ کَالۡفُجَّارِ ٥ (صٓ : ۲۸)

''کیا ہم ایمان والوں اور نیکوکاروں کو فسادیوں کی طرح کر دیں گے؟ یا ہم پرہیزگاروں کو بدکاروں جیسا کر دیں گے؟'' (۳۸ : ۲۸)

(۲) اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ نَّجۡعَلَھُمۡ كَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحۡیَاھُمۡ وَمَمَاتُھُمۡ سَآءَ مَا یَحۡكُمُوۡنَ O (الجاثیۃ : ۲۱)

''کیا بُرے کام کرنے والوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ ہم اُنہیں ایمان والوں اور نیکوکاروں کی طرح کر دیں گے کہ (ان سب کی) زندگی اور موت برابر ہو جائے؟ وہ کیسا ہی بُرا فیصلہ کرتے ہیں!''

(۳) لِیَجۡزِیَ الَّذِیۡنَ اَسَآءُوۡا بِمَا عَمِلُوۡا وَیَجۡزِیَ الَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا بِالۡحُسۡنٰی O (النّجم : ۳۱)

''تاکہ اللہ بُرے کام والوں کو اُن کی سزا دے اور نیکی کرنے والوں کو اچھی جزا دے۔''

(۴) اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ كَالۡمُجۡرِمِیۡنَ O مَا لَكُمۡ كَیۡفَ تَحۡكُمُوۡنَ O (القلم : ۳۵، ۳۶)

''کیا ہم اطاعت گزاروں کو مجرموں جیسا بنا دیں گے، تمہیں کیا ہوا تم کیسا فیصلہ کرتے ہو!''

انسان بذاتِ خود نیست سے ہست میں لائی ہوئی ایسی ننھی سی مخلوق ہے جو موجودات کے وسیع سمندر میں ایک قطرے سے بھی چھوٹا ہے، اس کے باوجود وہ اپنے خالق کے بارے میں جھگڑا کرنے اور فضول موازنہ کرنے میں سخت دل ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ رب تعالیٰ اپنی مخلوقات کی طرح ہے جن کی قوّتیں اور توانائیاں محدود ہیں یا وہ فضول متوازیات (Parallels) پیش کرتا ہے جن کا ذکر اوپر سورہ یٰسٓ کی آیت ۷۸ میں ہوا ہے کہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا جبکہ وہ بوسیدہ ہو چکی ہوں گی۔ اُن کے اس باطل نظریہ کو بیان کرنے کے بعد اُس پر ضربِ کاری لگاتے ہوئے قرآن نے فرمایا:

ءَ اِذَا مِتۡنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ O اَوَ اٰبَآؤُنَا الۡاَوَّلُوۡنَ O قُلۡ نَعَمۡ وَاَنۡتُمۡ دَاخِرُوۡنَ O فَاِنَّمَا ھِیَ زَجۡرَۃٌ وَّاحِدَۃٌ فَاِذَا ھُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ O وَقَالُوۡا یٰوَیۡلَنَا ھٰذَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ O ھٰذَا یَوۡمُ الۡفَصۡلِ الَّذِیۡ كُنۡتُمۡ بِهٖ تُكَذِّبُوۡنَ O (الصّٰفّٰت : ۱۶۔۲۱)

''کیا جب ہم مر جائیں گے اور ہم مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو ہم یقینی طور (دوبارہ زندہ کر کے) اٹھائے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی (اٹھائے جائیں گے)؟ فرما دیجئے: ہاں اور تم ذلیل وخوار بھی ہو گے۔ پس وہ تو محض ایک (زوردار آواز کی) سخت جھڑک ہوگی، تو سب اچانک (اٹھ کر) دیکھنے لگ جائیں گے اور کہیں گے: ہائے ہماری شامت، یہ تو جزا کا دن ہے۔ (کہا جائے گا: ہاں!) یہ وہی فیصلے کا دن ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔'' (۱۶۔۲۱ : ۳۷)

کفار کو یقین دلایا جا رہا ہے کہ اخروی زندگی ایک ٹھوس حقیقت ہے لیکن وہ موجودہ معلوم حالات سے بہت مختلف ہوگی۔ وہ جہان اور ہوگا جس میں روحوں کے تجربات اس عارضی زندگی کے تجربات سے مختلف ہوں گے۔ اُس زندگی میں نیکیوں کا شمار ہوگا جن سے وہ غافل رہے اور غرور اور تکبر کا وہ سر جس نے اُنہیں اپنی ذات میں مگن کر رکھا تھا، نیچا اور رسوا کر دیا جائے گا۔

۴۰۹۹ (علم ما بعد الطبعیات ۔۔Metaphysics)

جدید سائنسی تحقیق نے کافروں کے ان مزعومات کو مسترد کر دیا ہے کہ ایک شکستہ اور زوال پذیر جسم کیسے دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں محمد خلیفہ لکھتے ہیں :

''یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ زندہ ہوتے ہوئے انسان کی کچھ خلیے مرجاتے ہیں اور اُن کی جگہ متواتر نئے خلیے پیدا ہو جاتے ہیں ۔ ہر چھ سال میں بال ایک مرتبہ گر کر اُن کی جگہ نئے بال اُگ آتے ہیں ۔ اگر چہ مُردہ جسم کو آگ میں پھونک دیا جائے تو جلنے کے کیمیائی عمل سے اُس کی موت کے ساتھ ایک ایٹم بھی ضائع نہیں ہوتا ۔ وہ صرف فضائی آکسیجن جیسے ذرّات کے ساتھ مل جاتا ہے ۔ فضا' زمین' پودوں' جانوروں وغیرہ میں بعد کے ردِّ عمل میں ایٹم ایک دوسرے کے ساتھ الحاق کو بدلتے رہتے ہیں لیکن ہر انفرادی ایٹم اپنے ہمیشہ گھومنے والے الیکٹران کے ساتھ موجود رہتا ہے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی عملداری میں اُس کے حکم کے تحت ہوتا ہے (سورہ قٓ : ۴) ۔ اُسے بخوبی معلوم ہے کہ کون سا ذرّہ (ایٹم) کہاں کہاں ہے اور کس مقام پر ہے ۔''

(i) وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ٥ (یونس : ٦١)

''اور آپ کے پروردگار سے نہ زمین میں اور نہ آسمان میں ذرّہ برابر کوئی چیز بھی غائب نہیں اور نہ اس سے بڑی اور نہ اس سے چھوٹی مگر یہ کہ سب کتابِ مبین میں ہیں ۔'' (٦١ : ١٠)

(ii) لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ٥ (سبا : ٣)

''آسمانوں اور زمینوں میں اُس سے کوئی ذرّہ برابر بھی غائب نہیں اور نہ کوئی چیز اس سے چھوٹی اور نہ کوئی بڑی مگر یہ کہ (یہ سب) کتابِ مبین میں درج ہے ۔'' (٣ : ٣٤)

''یہ دونوں آیات جہانِ کوچک (عالمِ اصغر Microcosmos) کے ایک نمایاں پیغام کا پتہ دیتی ہیں' وہ عالمِ اصغر جو علم طبیعیات کی انتہائی ہیجان خیز اور ولولہ انگیز سرحد ہے ۔''

موت اور مُردوں کے دوبارہ جی اٹھنے سے متعلق قرآنی تعلیمات پر جو کچھ ریورینڈ منزیز (Rev. Menezes) نے اپنی تحریر میں مذاق اڑایا ہے' اُس پر یقین نہیں کیا جا سکتا ۔ اُس نے اِن حقائق کو انتہائی فضولیات کا نام دیا ہے بالخصوص اُن لوگوں کے جی اٹھنے کو جو جل کر مر جاتے ہیں یا جنہیں جنگلی درندے چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں ("The Life and Religion of Mohammad--- the Prophet of Arabia Sands"... F. J. L. Menezes, p. 114, London, 1911) ۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ریورینڈ منزیز نے واضح طور پر بائبل کے اُن دو بیانات کو نظر انداز کر دیا ہے جن میں بڑے زوردار' پُر اثر انداز میں حیات بعد الموت سے متعلق بات کی گئی ہے ۔ (Isa. 26:19, Dan. 12:2)

''اور اُن میں سے کئی جو خاک میں سوئے ہوئے ہیں' بیدار ہوں گے۔ اُن میں کچھ کو دائمی زندگی ملے گی اور کچھ کو دائمی شرمندگی اور نفرت کا سامنا ہوگا۔'' (Dan 12 : 2)

''ہمیں ڈاکٹر موڈی (Moody) کی کتاب ("Life after Life") میں بھی حیات بعد الموت سے متعلق جدید مغربی تصدیق ملی ہے جو اُن لوگوں کی شہادت سے اکٹھی کی گئی ہے جنہیں طبی لحاظ سے مُردہ قرار دیا گیا تھا لیکن حیات بعد الموت کی توثیق کے لئے اُنہیں دوبارہ زندہ کیا گیا۔'' ("The Sublime Qur'an and Orientalism" ... Mohammad Khalifa, p. 210)

<u>روزِ قیامت کو واقع ہونے والے واقعات</u>: قرآن مجید کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کل کائنات پر محیط روزِ قیامت انتہائی افراتفری اور آفتِ ناگہانی کا واقعہ ہوگا' جب تمام مخلوقات ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اپنی سالمیت کھو بیٹھیں گی اور نیست ہو کے رہ جائیں گی۔ وہ اپنی ہیئت میں پھلنے پھولنے سے سکڑنے میں تبدیل ہو جائیں گی۔ یہ عبوری دور اس قدر طاقتور ہوگا کہ اُسے کائنات میں ہر جگہ محسوس کیا جائے گا اور جسے قرآنِ حکیم میں ''صُور'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ خوفناک و مہیب دھما کا پوری کائنات میں خوف و اضطراب کی لہر دوڑا دے گا۔ اس انتہائی ناخوشگوار صداقت کو سورۃ النّمل کی آیت ۸۷ میں یوں بیان کیا گیا ہے:

(۱) وَيَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دَاخِرِيْنَ ○ (النَّمل: ۸۷)

''اور جس دن صُور پھونکا جائے گا تو وہ (سب لوگ) گھبرا جائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں مگر جنہیں اللہ چاہے گا (نہیں گھبرائیں گے) اور سب اُس کی بارگاہ میں عاجزی کرتے ہوئے حاضر ہوں گے۔'' (۲۷ : ۸۷)

(۲) وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ○ (الزُّمَر: ۶۸)

''اور صُور پھونکا جائے گا تو اُن سب کے ہوش اُڑ جائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سوائے اُس کے جسے اللہ چاہے۔ پھر وہ دوبارہ پھونکا جائے گا جبھی وہ دیکھتے ہوئے کھڑے رہ جائیں گے۔'' (۳۹:۶۸)

نوٹ : (۱) اس آیت ۶۸ میں دونوں نفخوں (نفخہ اُولٰی و نفخہ ثانیہ) کا بیان ہے۔ (۲) درج بالا دونوں آیتوں میں جملہ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ (سوائے اُس کے جسے اللہ چاہے) سے مراد اہلِ ایمان اور صالحین ہیں۔ اُنہیں دہشت کیوں ہونے لگی! اُنہیں تو خوابِ موت سے جاگتے ہی تسکین' تشفی اور دلدہی کے لئے فرشتے مل جائیں جو اعزاز و اکرام سے اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے جیسا کہ سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۰۳ میں فرمایا:

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○

''اُنہیں بڑی گھبراہٹ ذرا بھی غم میں نہ ڈالے گی اور اُن کا استقبال تو فرشتے (یہ کہتے ہوئے) کریں گے کہ یہ ہے آپ کا وہ دن جس کا آپ سے وعدہ کیا گیا تھا۔'' (۱۰۳ : ۲۱)

بہر حال ''صُور'' پھونکنے سے ہی روزِ قیامت کا آغاز ہو جائے گا۔ بڑا ہی خوفناک اور مہیب دن ہونے کے لحاظ سے قرآن مجید نے اسے آسمانوں اور زمین کے رہنے والوں پر ''بوجھل'' کہا ہے اور فرمایا ہے :

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّىْ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَا اِلَّا هُوَ ثَقُلَتْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً (الاعراف : ۱۸۷)

''(کفار) آپ سے قیامت کی بابت دریافت کرتے ہیں کہ وہ کب قائم ہوگی؟ فرما دیں کہ اس کا علم تو صرف میرے رب کے پاس ہے اُسے اپنے (مقررہ) وقت پر اس (اللہ) کے سوا کوئی ظاہر نہیں کرے گا۔ وہ آسمانوں اور زمین (کے رہنے والوں) پر شدائد و مصائب کے خوف کے باعث) بوجھل ہے۔ وہ تم پر اچانک (حادثاتی طور پر) آجائے گی۔'' (۱۸۷ : ۷)

مفسرین فرماتے ہیں کہ پہلی بار صور مخلوق کی موت کے لئے پھونکا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی حالت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا فَاِذَا هُمْ قِيَام '' يَنْظُرُوْن یعنی ابو جہل اور اُس کے ساتھی صرف ایک چیخ اور زور دار دھما کے کے منتظر ہیں۔ اس سے مراد نفخہ اُولیٰ ہے جس سے سارے کفار ہلاک ہو جائیں گے۔

حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ روزِ قیامت سے قبل کافروں پر اونگھ طاری ہوگی جس میں وہ نیند کا مزہ پائیں گے۔ پھر جب اہلِ قبور کو اٹھانے کے لئے چیخ دار آواز پڑے گی تو سب گھبرائے ہوئے جلدی اُٹھ کھڑے ہوں گے اور سر اٹھا کر دیکھ رہے ہوں گے کہ اُن کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ یہ کہتے ہوئے بول پڑیں گے:

يٰوَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (یٰسٓ : ۵۲)

''ہائے ہماری خرابی! کس نے ہمیں نیند سے جگا دیا۔'' (۵۲ : ۳۶)

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ کفار یہ بات اس لئے کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ دونوں نفخوں کے درمیان اُن سے عذاب اُٹھا دے گا اور اتنا زمانہ وہ سوتے رہیں گے اور نفخہ ثانیہ کے بعد جب اٹھائے جائیں گے اور قیامت کی ہولناکیاں دیکھیں گے تو اس طرح چیخ اُٹھیں گے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب کفار جہنم اور اس کے عذاب کو دیکھیں گے تو اُس کے مقابلہ میں عذابِ قبر اُنہیں ہلکا اور سہل معلوم ہوگا۔ اور اُس وقت فرشتے یا مؤمنین اُن کفار سے کہیں گے: هٰـذَا مَـا وَعَدَالـرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ (یہ ہے وہ جس کا رحمان نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں نے سچ فرمایا تھا) اور ایک قول کے مطابق اس مقولہ کے قائل خود کافر ہوں گے کہ وہ اُٹھنے کے بعد باہم ایک دوسرے سے یہ کہیں گے لیکن ہم نے

اُنہیں جھٹلایا تھا لیکن اُس وقت کا اقرار اُنہیں کچھ فائدہ نہ دے گا۔ پھر سب کو حکم ہوگا کہ حساب کے لئے موقف کی طرف چل دو اور وہاں جمع ہو جاؤ۔

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَۃٌ وَّاحِدَۃٌ ۝ وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُکَّتَا دَکَّۃً وَّاحِدَۃً ۝ فَیَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَۃُ ۝ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَھِیَ یَوْمَئِذٍ وَّاھِیَۃٌ ۝ (اَلْحَآقَّۃ: ۱۳ تا ۱۶)

''جب صُور یکبارگی پھونک دیا جائے گا اور زمین اور پہاڑ اٹھا لئے جائیں گے' یہ دونوں ایک دفعہ میں ریزہ ریزہ کردئے جائیں گے تو اُس دن وہ ہونے والی چیز ہو کے رہے گی اور آسمان پھٹ جائے گا اور وہ اُس دن بالکل بودا ہوگا۔'' (۱۳ تا ۱۶ : ۶۹)

نفخہ اُولیٰ کی دہشتناک آواز سے تمام دنیاوی کاروبار معطّل ہو کے رہ جائیں گے اور رب تعالیٰ کی ذات کے سوا تمام جاندار اور بے جان چیزیں فنا ہو جائیں گی جیسا کہ سورۃ القصص کی (آخری) آیت ۸۸ اور سورہ الرّحمٰن کی آیات ۲۶' ۲۷ میں ارشاد ہوا۔ توحید الٰہی کو بہ تاکید منوانے اور جتانے کے لئے موت کا ہونا ضروری تھا اور دوبارہ زندگی کا ملنا اس لئے ضروری ہوا تاکہ الٰہی انصاف ظالم کی گردن تک پہنچ سکے اور مظلوم کی دادرسی کر سکے۔ دہشت اور ہول کا وہ انتہائی وقت یقیناً ہوگا لیکن اہلِ ایمان کو دہشت کیوں ہونے لگی۔ اُنہیں تو خوابِ موت سے جاگتے ہی تسکین' تشفی اور دلدہی کے لئے فرشتے مل جائیں گے جو اعزاز و اکرام سے اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

عالمِ برزخ : ''بَــــرزخ'' کا لفظی معنیٰ دو چیزوں کے درمیان پردہ اور آڑ کا ہے اور یہ لفظ سورۃ المؤمنون کی آیت ۱۰۰ اور سورۃ الفُرقان کی آیت ۵۳ میں استعمال ہوا ہے۔ تابعی مجاہد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''برزخ'' وقتِ موت سے وقتِ حشرِ اجساد (دوبارہ زندہ کیا جانا) تک کی مدت کو کہتے ہیں۔

نفخہ ثانیہ : جیسا کہ بیان ہوا کہ نفخہ اوّل پر تو تمام مخلوقات فنا کی نذر ہو جائے گی۔ لیکن دوسرے نفخہ پر وہ اپنی قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے اور اپنے اعمال کے میزان اور جوابدہی کے لئے ربِّ ذوالجلال کے حضور حاضری کے لئے چل دیں گے جس کا ذکر قرآن مجید کی کئی آیات میں ہوا۔ مثلاً:

(۱) یَوْمَ یَدْعُوْکُمْ فَتَسْتَجِیْبُوْنَ بِحَمْدِہٖ (الاسراء : ۵۲)

''جس دن وہ تمہیں بلائے گا تو تم اُس کی حمد کرتے چلے آؤ گے۔'' (۵۲ : ۱۷)

(۲) فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَھُمْ یَوْمَئِذٍ وَّ لَا یَتَسَآءَلُوْنَ ۝ (المؤمنون : ۱۰۱)

''جب صور پھونکا جائے گا تو نہ اُن میں رشتے رہیں گے اور نہ اُس دن (کوئی) ایک دوسرے کی بات پوچھے گا۔''

(۳) وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَاِذَا ھُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی رَبِّھِمْ یَنْسِلُوْنَ ۝ (یٰسٓ : ۵۱)

''اور صور پھونکا جائے گا جبھی وہ قبروں سے اپنے رب کی طرف دوڑتے چلیں گے۔'' (۵۱ : ۳۶)

(۴) اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ٥ (يٰسٓ : ۵۳)
''وہ تو ایک ہولناک آواز ہی ہوگی اور سب کے سب فوراً ہمارے رُوبرو حاضر ہو جائیں گے۔''

(۵) يَوْمَ يُنْفَخُ فِى الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا٥ (اَلنَّبا : ۱۸)
''جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم چلے آؤ گے فوجوں کی فوجیں۔'' (۱۸ : ۷۸)

سورۃ القلم کی آیت ۴۲ الٰہی اظہار کی عجیب کیفیت کو آشکار کرتی ہے:
يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ٥ (القلم : ۴۲)
''جس دن پنڈلی کی تجلّی فرمائی جائے گی اور سجدہ کی طرف بلایا جائے گا تو وہ سجدہ نہ کرسکیں گے۔''

ٹخنے اور گھٹنے کی درمیانی جگہ کو عربی میں سَاق کہتے ہیں اور کشف ساق شدت اور سختی سے کنایہ ہے۔ جب کسی معاملہ کی شدت اور ہولناکی کی خبر دینا ہو تو ''ساق'' کا ذکر کرتے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں ہے:
وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ٥ (سورۃ القیامۃ : ۲۹)
''یعنی دنیا کی آخری شدت، روزِ قیامت کی پہلی شدت سے لپٹ جائے گی۔'' (۲۹ : ۷۵)

اس محاورہ کے مطابق آیت کا معنی یہ ہوگا کہ روزِ قیامت جب حالات بڑے تکلیف دِہ اور ہولناک ہو جائیں گے اور ہر شخص جلالِ خداوندی سے لرزہ براندام ہوگا اور دل خوف سے دھڑک رہے ہوں گے، اُس وقت لوگوں کے ایمان یا کفر، خلوص یا نفاق کو ظاہر کرنے کے لئے اُنہیں حکم دیا جائے گا کہ آؤ سب اپنے رب کو سجدہ کرو۔ جن کے دلوں میں ایمان اور اخلاص ہوگا، وہ فوراً سربسجود ہو جائیں گے لیکن کافر اور منافق سجدہ کرنے کے لئے بہت زور لگائیں گے کہ خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہو جائیں لیکن اُن کی کمر اکڑ جائے گی اور بڑی کوشش کے باوجود بھی سجدہ نہ کرسکیں گے۔ اس رسوائی پر اُن کی آنکھیں جھک جائیں گی اور اُن کے کھوکھلے دعووں کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ جائے گا۔

''سَاق'' کسی چیز کی اصل کو بھی کہتے ہیں جس پر وہ قائم ہو جیسے درخت کے تنے اور انسان کی ٹانگ کو سَاق کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے معنیٰ یہ ہوگا کہ جب تمام لوگوں کے اعمال کی اصل کو کھولا جائے گا اور تمام حقائق منکشف ہو جائیں گے۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ساق سے مراد نورِ عظیم ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر بیان کی ہے (مسند ابویعلی رقم الحدیث: ۷۲۸۳)۔

اِس سجدہ پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ قیامت تو دار الجزاء ہے، دار العمل نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مکلف ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ حصولِ لذّت اور حصولِ تقرب کے لئے سجدہ کریں گے۔

اَلْحِسَاب (جوابدہی کا وقت): وقتِ حساب کی آمد قرآن مجید کا مستقل موضوع ہے جس کے مطابق ہر ہر فرد کو اپنے اعمال و افعال کا ضرور بالضرور جواب دینا ہوگا۔ نامہ ہائے اعمال جو اُس وقت تک عالم غیب میں فرشتوں کے ہاتھوں میں محفوظ ہوگا، حشر میں کھول کر ہر بندہ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، کیونکہ:

وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَهُ فِيْ إِمَامٍ مُّبِيْنٍ o (یٰسٓ : ۱۲)

''اور ہم نے ہر چیز کو ایک واضح کتاب میں درج کر رکھا ہے۔'' (۱۲ : ۳۶)

اور اِقْرَاْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا o (الاسراء : ۱۴)

''لے اپنا نامہ اعمال خود پڑھ لے، تو خود ہی اپنے حق میں حساب کرنے کے لئے کافی ہے۔'' (۱۷:۱۴)

اور جیسا کہ اس سے قبل کی آیت (۱۳) میں کہا گیا کہ ہر انسان کا عمل ہم نے اُس کے گلے کا ہار کر رکھا ہے یعنی ہر حال میں ہم نے اُس کے عمل کو اس کے ساتھ غیر منفک جزء کے طور پر لازم کر دیا ہے کہ محاورہ عرب میں اَلْزَمْنٰهُ طٰائِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ شدتِ لزوم اور کمال ربط کے اظہار کے لئے آتا ہے۔ آیت میں یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ ہر آدمی اپنے اچھے بُرے اعمال کے واسطہ سے اپنے مقدر کا خود معمار ہے۔ سورۃ الحاقّۃ (۶۹) کی اِن آیات نے معاملہ کی حقیقت کو مزید طشت از بام کر دیا ہے:

فَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتٰابَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ o إِنِّيْ ظَنَنْتُ أَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ o فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ o فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ o قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ o كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا هَنِيْئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ o وَ أَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتٰابَهٗ بِشِمَالِهٖ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ أُوْتَ كِتٰبِيَهْ o وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ o يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ o مَا أَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ o هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ o خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ o ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ o إِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ o وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ o (اَلْحَاقَّة : ۱۹ تا ۳۴)

''تو جس شخص کا نامہ اعمال اُس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا لو! میرا نامہ اعمال پڑھ لو۔ میں تو جانے ہوئے تھا کہ مجھے میرا حساب ضرور پیش آنے والا ہے تو وہ شخص خوب مزے کی زندگی میں ہوگا، بہشتِ بریں میں ہوگا جس کے میوے جھکے ہوئے ہوں گے، کھاؤ اور پیو مزے کے ساتھ اُن اعمال کے بدلہ میں جو تم گزشتہ ایام میں کر چکے ہو۔ اور رہا وہ جس کا نامہ اعمال اُس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا: کیا ہی اچھا ہوتا کہ مجھے میرا نامہ اعمال ہی نہ ملتا اور مجھے خبر ہی نہ ہوتی کہ میرا حساب کیا ہے، کاش موت ہی خاتمہ کر چکی ہوتی۔ میرا مال میرے کچھ بھی کام نہ آیا۔ میرا جاہ (بھی) مجھ سے گیا گزرا ہوا۔ اُسے پکڑو اور اُسے طوق پہناؤ، پھر اُسے دوزخ میں داخل کر دو، پھر اُسے ایسی زنجیر میں جکڑ دو جس کی پیمائش ستر گز ہے۔ اُس کا ایمان ہی خدائے بزرگ پر نہ تھا اور نہ وہ غریب آدمی کے کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔''

(۶۹ : ۱۹تا۳۴)

قرآن مجید میں ''میزان'' جمع کے لفظ ''موازین'' کے لفظ کے ساتھ ذکر ہوا ہے (سورۃ الانبیاء: ۴۷)، جبکہ

حدیثِ پاک میں مفرد اور جمع دونوں طرح آیا ہے اس لئے اختلاف ہے کہ ہوسکتا ہے کہ کئی میزان ہوں۔ بہر حال ''میزان'' روزِ حشر کی نہایت اہم صداقتوں میں سے ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میزان ایک ہو لیکن اُسے تعبیر جمع کے صیغہ سے کیا گیا ہو۔ جیسا کہ سورۂ الشّعراء میں ہے: كَذَّبَتْ عَادُ ن الْمُرْسَلِيْنَ o كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ o حالانکہ رسول ایک ہی ہیں جنہیں قومِ عاد نے جھٹلایا تھا اور اسی طرح قومِ ثمود نے ایک رسول کو جھٹلایا مگر ایک رسول کو جمع کے لفظ سے تعبیر کرتے ہوئے ''مُرسَلین'' فرمایا گیا ہے۔ یہی حال میزان اور موازین کا ہے۔

<u>میزان کو مجازی معنی میں لینے کی تردید</u>: علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء نے فرمایا ہے کہ اگر میزان کو مجازی معنی میں لیا جائے جیسا کہ بعض علماء سے منقول ہے تو پھر کوئی شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ''پُل صراط'' سے مراد ''دینِ حق'' ہے اور جنت اور دوزخ سے مراد کہ' تکلیف اور خوشی اور فرحت ہے جو روح پر وارد ہوتی ہیں اور شیاطین اور جنّوں سے مراد اخلاقِ مذمومہ ہیں اور ملائکہ نام ہے قوائے محمود کا یعنی شر کی قوّت کا نام جن رکھ دیا گیا ہے اور قوّتِ خیر کو ملائکہ کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے حالانکہ یہ سب باطل اور فاسد ہے کیونکہ یہ صادق و مصدوق نبی ﷺ کی حدیثِ مبارکہ سے مردود ہے اور صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے: فَيُعْطٰى صَحِيْفَةُ حَسَنَاتِهٖ (اُسے اُس کی نیکیوں کا صحیفہ دیا جائے گا) اور فَيُخْرَجُ لَہٗ بِطَاقَةٌ'' (اُس کا نامۂ عمل نکالا جائے گا) اور یہ میزانِ حقیقی پر دلیل ہے اور موزون یعنی جس چیز کا وزن کیا جائے گا وہ صحیفہ ہائے اعمال ہوں گے۔ (''اَلتَّذْكِرَةُ فِي احوال الموتٰی و أمور الآخرة'' لشمس الدین قرطبی ترجمہ: غلام نصیر الدین گولڑوی' ج ۲' ص ۴۲)

''<u>آخرت میں میرٹ کی بنیاد پر درجہ بندی</u>: ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ آخرت میں لوگوں کے تین طبقات ہوں گے: (۱) پہلا طبقہ ایسے متقی اور پرہیزگاروں کا ہوگا جو کبیرہ گناہوں سے بچتے ہیں۔ (۲) دوسرا طبقہ اُن لوگوں کا ہوگا جن کے اعمال ملے جلے ہوں گے۔ اُنہوں نے نیک کام بھی کئے ہوں گے اور ساتھ ہی ساتھ فواحش اور کبیرہ گناہوں کا ارتکاب بھی کیا ہوگا۔ (۳) تیسرا طبقہ کفار کا ہوگا۔''

''نیک لوگوں کے نیک کاموں کو روشن اور جگمگاتے ہوئے پلڑائے میزان میں رکھا جائے گا اور اگر اُن کے صغیرہ گناہ بھی ہوئے تو اُنہیں دوسرے پلڑے میں ڈال دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُن صغائر کا وزن نہیں ہوگا اور نیکیوں والا پلڑا مسلسل بھاری رہے گا یہاں تک کہ صغائر کی ظلمت کافور ہو جائے گی اور صغائر کی اس کالک اور سیاہی کے اُڑ جانے سے گناہوں والا پلڑا خالی رہ جائے گا۔''

''جن لوگوں کے اعمال ملے جلے اور مخلوط ہوں گے' اُن کی نیکیوں کو روشن پلڑے میں اور اُن کے گناہوں کو تاریک پلڑے میں رکھا جائے گا تو اُن کے کبائر کا بوجھ ہوگا۔ اگر تو اُن کی نیکیوں کا وزن برائیوں سے بڑھ گیا' چاہے ایک کھجور برابر ہی ہو تو وہ جنتی ہوگا اور اگر گناہوں کا پلڑا بھاری ہوا اگرچہ ذرّہ برابر ہی ہو تو وہ دوزخ میں جائے گا اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضلِ خاص سے اُسے معاف فرما دے اور اگر اُس کے گناہ اور نیکیاں دونوں برابر اور مساوی

ہوئے تو وہ جنت اور جہنم کے درمیان مقامِ اعراف میں ٹھہرے گا۔'' (ایضاً ص ۴۳) جس کا ذکر سورۃ الاعراف کی آیات ۴۶، ۴۷، ۴۸ میں ہوا۔

اس طرح ''میزان'' اس دنیاوی زندگی میں احساسِ ذمہ داری اور حق و انصاف کے مابین تطبیق اور ہم آہنگی کا نام ہے۔ الٰہی فیصلہ میں نرمی اور رعایت کرنے یا اُس کے نفاذ میں التواء سے متعلق کسی قسم کے احتجاج یا عذر خواہی کی گنجائش نہیں ہوگی۔ فیصلہ اپنی قطعیت میں حتمی اور حرفِ آخر ہوگا اور بندے کے اعمال کا براہِ راست نتیجہ ہوگا۔ صادر شدہ فیصلہ کی حقانیت اور صداقت کے حق میں بندے کے اپنے اعضاء و جوارح گواہی دیں گے اور اُن کی کل روئیدادِ زندگی رتی رتی حق تعالیٰ کے سامنے اُنہی کے ہاتھوں پیروں کی زبانی پیش ہوگی:۔

(۱) يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ٥ (النور : ۲۴)
''اُس دن اُن کے خلاف اُن کی زبانیں، اُن کے ہاتھ اور اُن کے پاؤں گواہی دیں گے اُن کاموں کی جو وہ کیا کرتے تھے۔'' (۲۴ : ۲۴)

(۲) اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ٥ (یٰسٓ)
''آج ہم اُن کے منہ پر مُہر لگا دیں گے اور ہم سے اُن کے ہاتھ کلام کریں گے اور اُن کے پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ لوگ کیا کیا کرتے رہتے تھے۔'' (۶۵ : ۳۶)

(۳) حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ٥
''یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچ جائیں گے تو اُن کے کان، اُن کی آنکھیں اور اُن کی جلدیں اُن کے خلاف اُن کے اعمال کی گواہی دیں گے۔'' (سورہ فُصِّلَت ۲۰ : ۴۱)

<u>اعمال اور اُن کی کیفیات کے وزن پر ایک اشکال کا جواب</u>: قیامت کے دن میزان میں نیکیوں اور بدیوں کے وزن کئے جانے پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ نیک اور بد اعمال ٹھوس چیز تو ہیں نہیں کہ ایک پلڑے میں نیک اعمال رکھ دئے جائیں اور دوسرے پلڑے میں بد اعمال رکھ دئے جائیں اور اُن کا وزن کر کے یہ معلوم کیا جائے کہ اس انسان کی نیکیاں زیادہ ہیں یا گناہ زیادہ ہیں۔ وزن تو اُس چیز کا کیا جاتا ہے جو کوئی مقدار والی چیز ہو جبکہ نیکی اور بدی کی کیفیات مقدار والی چیزیں نہیں ہیں۔ مفسرین کرام نے اس کے کئی جواب دئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

(۱) بندوں کے اعمال نامے ایک قسم کے رجسٹر ہیں اور اُن میں ان سب چیزوں کا اُن کی پوری کیفیات سے اندراج ہوگا اور دراصل وزن ان رجسٹروں کا ہوگا اور وہ رجسٹر مقدار والی چیزیں ہیں۔

(۲) نیک اعمال کے مقابلہ میں حسین صورت والے اجسام بنا دئے جائیں گے اور برے اعمال کے مقابلہ میں بدصورت اجسام بنا دئے جائیں گے اور جیسے جیسے نیکی اور بدی میں اضافہ ہوگا، اُسی طرح اُن کی خوبصورتی اور بدصورتی میں بھی اضافہ ہوگا۔

(۳) سائنس کی تیز رفتار ترقی کی وجہ سے اب ایسے آلات ایجاد ہو چکے ہیں کہ جن چیزوں کے وزن اور اُن کی پیائش کا پہلے کوئی تصور نہ تھا' اب اُن کی پیائش کا معلوم ہونا روزمرہ ہو گیا ہے۔ مثلاً کمرے میں کتنے درجہ مثبت یا منفی درجہ حرارت ہے' اب یہ آلات کے ذریعے معلوم ہو جاتا ہے۔ ہوا کا وزن جاننے کا پہلے کوئی ذریعہ نہ تھا' اب ہوا کا دباؤ بیرومیٹر کے ذریعے معلوم ہو جاتا ہے۔ آواز کی پیائش کے بارے میں پہلے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا' اب سونومیٹر کے ذریعے آواز کی پیائش معلوم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جسم میں کتنا درجہ حرارت ہے' پہلے اُس کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہ تھا لیکن اب تھرمامیٹر کے ذریعے معلوم ہو جاتا ہے۔ انسان کے خون کے ایک قطرہ میں کتنے ملی گرام گلوکوز ہے' کتنا کولیسٹرول ہے' یہ گلوکومیٹر کے ذریعے معلوم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح لیبارٹری ٹیسٹ کے ذریعے معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان کے خون میں کتنا یورک ایسڈ ہے' کتنا یوریا ہے' کتنا کیلشیم ہے' کتنا ہیموگلوبن ہے' اُس کے خون میں سرخ ذرّات کتنے ہیں' سفید ذرّات کتنے ہیں۔ اُس کے خون میں کیا کیا بیماریاں ہیں' اُسے ایڈز ہے یا نہیں؟ ہیپاٹائٹس ہے یا نہیں؟ ہیپاٹائٹس اے' بی' سی یا اور کوئی مہلک بیماری ہے یا نہیں؟ ملیریا' ٹائیفائڈ ایسی تمام بیماریاں خون میں ہوتی ہیں اور اب سے سو سال پہلے اُن کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا لیکن اب میڈیکل سائنس کی روزافزوں ترقی کے باعث یہ چیزیں لیبارٹری ٹیسٹ سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ تو جس طرح اب خون کے ٹیسٹ کے ذریعے انسان کی صحت اور بیماری کا علم ہو جاتا ہے' اُسی طرح کوئی تعجب اور حیرت کی بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے میزان میں ایسی صفت پیدا کر دی ہو جس سے معلوم ہو جائے کہ انسان کے اعمال میں نیکیوں کی کتنی مقدار ہے اور برائیوں کی کتنی مقدار ہے۔ انسان نے جس عقل اور سائنس سے وزن اور پیائش کے یہ آلات ایجاد کئے' وہ عقل اور سائنس اللہ ہی کی دی ہوئی ہے۔ جب وزن اور پیائش میں مخلوق کی تجزیہ کاری کا یہ عالم ہے تو خالق کی تجزیہ کاری کا کیا عالم ہوگا!!

مقامِ اعراف : اَعْـراف کے لفظی معنی بلند چیز کے ہیں۔ اصطلاح میں یہ اُن لوگوں کا مقام ہوگا جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی اور وہ (Waiting List) میں ہوں گے۔ جنت میں جانے کی اُن کی آرزو پوری کر دی جائے گی اور وہ مولائے کریم کے فضل وکرم سے بالآخر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اُن کی بابت قرآن مجید فرماتا ہے:

وَ بَيْنَهُمَا حِجَاب" وَ عَلَى الْاَعْرَافِ رِجَال" يَّعْرِفُوْنَ كُلاًّ بِسِيْمٰهُمْ وَ نَادَوْا اَصْحَابَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلاَم" عَلَيْكُمْ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَ هُمْ يَطْمَعُوْنَo وَ اِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحَابِ النَّار قَالُوْا رَبَّنَا لاَ تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَo وَنَادٰى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالاً يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ قَالُوْا مَا اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَo (الاعراف : ۴۶ تا ۴۸)

"اور اُن دونوں کے درمیان ایک آڑ ہوگی اور اعراف کے اوپر (بہت سے) لوگ ہوں گے' وہ سب کو اُن کے قیافہ سے پہچانیں گے اور اہلِ جنت کو پکار کر کہیں گے کہ تم پر اللہ کی رحمت ہو اور (ابھی) یہ لوگ اس میں داخل نہ ہوئے ہوں گے اگرچہ وہ اس کے آرزومند ہوں گے۔ اور جب اُن کی نگاہیں اہلِ دوزخ کی طرف جا پھریں گی تو بول اُٹھیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں (ان) ظالم لوگوں کے ساتھ شامل نہ کرنا۔ اور اعراف والے (بہت سے) اشخاص کو پکاریں گے جنہیں وہ اُن کے قیافہ سے

پہچانیں گے اور کہیں گے تمہارا جتھا اور تمہارا اپنے آپ کو بڑا سمجھنا کچھ کام نہ آیا۔'' (۴۶ تا ۴۸ : ۷)

پُل ''صراط'' : قرآن مجید میں کہیں اِس پُل کا ذکر نہیں ہے۔ تاہم اُس میں لفظ ''صراط'' (بمعنی راہ اور راستہ) بالخصوص ''صراطِ مُستقیم'' کے ذکر میں بکثرت آیا ہے (بحوالہ سورۃ الفاتحہ کی آیت ۶ ؛ سورۃ الانعام کی آیت ۱۶۱ ؛ سورہ ھُود کی آیت ۵۶ ؛ سورہ یٰس کی آیت ۴)۔ اِن تذکروں میں صرف دو آیات (سورہ یٰس :۶۶ ؛ سورۃ الصّافات :۲۳) کا حوالہ جہنم پر کے پُل کے تصوّر کے طور پر آیا ہے' اوّل الذکر (۳۶:۶۶) غیر معیّن ہے۔ مؤخر الذکر (۳۷:۲۳) یعنی صراط الجحِیم میں پُل کا حوالہ ہے اور اسے اسلامی روایت میں جہنم کی بالائی تہہ کی علامت کے طور پر اختیار کیا گیا ہے۔ معادیات (حشر ونشر) کا لٹریچر اکثر اس بات کی توثیق میں ہے کہ جن لوگوں کا نہ تو ایمان ہے اور نہ ہی اُن کے اچھے عمل ہیں' وہ اس پُل کو تلوار کی دھار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک پائیں گے اور یہ کہ اُن کا اس سے نیچے گرنا جہنم سے نا قابلِ فرار ہوگا۔ تاہم مخلصین ومؤمنین اُس وسیع پُل سے بہ آسانی اور بہ سرعت گزر جائیں گے جسے سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ اور پھر اُن کی اُمت عبور کرے گی۔''
(انسائیکلوپیڈیا آف دی قرآن' جلد دوئم' صفحہ ۴۹)

روایات میں آیا کہ قیامت کے دن لوگوں کا پُل صراط پر سے گزر اُن کے ایمان اور اعمال کے مطابق ہوگا۔ کوئی پلک جھپکنے کی مقدار میں' کوئی تیر کی طرح' کوئی تیز اُڑان والے پرندے کی طرح' کوئی عمدہ نسل کے گھوڑے کی رفتار سے' کوئی آدمی کے دوڑنے کی رفتار سے اور کوئی آہستہ چلنے کی رفتار سے گزر جائے گا یہاں تک کہ آخری نجات یافتہ شخص سُرین کے بل گھسٹتا ہوا گزرے گا۔ یہ شخص اللہ تبارک وتعالیٰ سے عرض کرے گا: اے پالنہار! میری رفتار اتنی سست اور کم کیوں ہے؟ جواب ملے گا کیونکہ تیرے عمل کمزور ہیں (اور رفتار میں تیزی اعمال کی قوّت سے پیدا ہوتی ہے)۔'' (اردو ترجمہ ''سفرِ آخرت کی منازل'' از مولانا غلام نصیر الدین گولڑوی' جلد دوم' صفحہ ۱۷)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا : قیامت کے دن جب لوگ پُل صراط کے کنارے پر ہوں گے تو اُس وقت عرش کے نیچے سے ایک فرشتہ آواز دے گا: اے شہنشاہِ جبّار عزّ وجلّ کی مخلوق! تم پُل پر سے گزر جاؤ۔ تم میں سے جو ظالم اور نافرمان ہے' وہ رُک جائے۔ ہائے اُس گھڑی سے خدا کی پناہ! وہ کتنی خوفناک گھڑی ہوگی اور اُس وقت گرمی کس قدر سخت ہوگی! جو لوگ دنیا میں کمزور اور ذلیل تھے وہ آگے ہوں گے اور جو دنیا میں طاقتور اور مرتبہ ومنصب والے تھے' پیچھے ہوں گے۔ پھر اس ترتیب کے بعد تمام لوگوں کو پُل صراط سے گزرنے کی اجازت دے دی جائے گی (اور چلنے کا سگنل ہو جائے گا) اور لوگ اپنے اعمال کے مطابق گزریں گے۔ کوئی روشنی میں چلے گا اور کوئی تاریکی میں ہوگا۔ پُل صراط پر میری اُمّت جب آندھی جیسی تیزی کے ساتھ گزر رہی ہوگی تو وہ مجھے پکاریں گے اور میں اپنی اُمّت کی ہلاکت اور نقصان کے ڈر اور اندیشہ کی وجہ سے فوراً اُس طرف دوڑوں گا اور جبریل علیہ السلام مجھے میری کمر سے

پکڑے ہوئے ہوں گے اور میں بلند آواز سے پکاروں گا: ''رَبِّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ'' (اے پروردگار! میری اُمّت' میری اُمّت) آج میں تجھ سے اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں مانگتا' بس میری اُمّت کو بچا لے اور فرشتے پُل صراط کے دائیں بائیں کنارے کھڑے پکاریں گے: ''رَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ'' (اے پروردگار! سلامتی' سلامتی) بڑا خوفناک منظر ہوگا۔

نافرمان لوگ دائیں بائیں گر رہے ہوں گے' سیاہ ملائکہ اُنہیں پکڑ کر زنجیروں اور طوقوں میں جکڑ دیں گے اور سخت لہجے سے کہہ رہے ہوں گے: کیا تمہیں بُرے کام کرنے سے روکا نہیں گیا تھا؟ کیا تمہیں دوزخ کا خوف نہیں دلایا گیا تھا؟ کیا تمہیں ہر طرح سے ڈرایا نہیں گیا تھا؟ کیا تمہارے پاس نبی مختار تشریف نہ لائے تھے؟ ابوالفرج ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو اپنی کتاب ''رَوْضَةُ الْمُشْتَاقِ وَالطَّرِيْقُ اِلَى الْمَلِكِ الْخَلَّاقِ'' میں نقل کیا ہے۔''
(بحوالہ ''سفرِ آخرت کی منازل'' از مولانا غلام نصیر الدین گولڑوی' ج ۲' ص ۲۷)

''پُل صراط کا تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہونے کا مفہوم: بعض علماء نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن جب لوگ پُل صراط پر سے گزریں گے تو اُنہیں اپنے اپنے گناہوں اور نیکیوں کے مطابق آسانی وسہولت اور تنگی ومشقت کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ ایک قاعدہ اور رسم جاری ہے کہ اگر کسی گہری اور پوشیدہ بات کو بیان کرنا ہو تو اُسے اس طرح تعبیر کرتے ہیں اور اُس کی مثال بیان کرتے ہوئے کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو بال سے زیادہ باریک بات ہے۔ باقی حقیقتِ حال کو اللہ تعالیٰ بخوبی جاننے والا ہے۔''

''اَحَدُّ مِنَ السَّيْفِ'' (تلوار سے زیادہ تیز ہونے) کا معنی: پُل صراط کا تلوار سے زیادہ تیز ہونا اور بال سے زیادہ باریک ہونا اس لئے درست نہیں ہوسکتا کہ حدیث پاک میں پُل صراط کا یہ وصف بیان کیا گیا ہے کہ اس کے دونوں کناروں پر ملائکہ کھڑے ہوں گے اور اُس کے دونوں کناروں پر خاردار جھاڑی کی طرح لوہے کی کانٹے دار سلاخیں لگائی گئی ہوں گی جن کے سرے مُڑے ہوئے ہوں گے۔ بعض لوگ اُن میں الجھ کر نیچے گر جائیں گے اور بعض زخمی ہو جائیں گے۔ بعض لوگ اُس پر پیٹ کے بل چلیں گے اور بعض پھسل کر گر جائیں گے پھر اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس پُل پر سے گزرنے والوں میں سے بعض کے لئے اتنی روشنی ہوگی جتنی جگہ اُن کے دو پیر گھیر لیتے ہیں۔ لہٰذا اس بات میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ پُل صراط کے اوپر سے گزرنے والوں کے لئے پُل پر پاؤں دھرنے کی جگہ ہوگی اور ظاہر ہے کہ پُل صراط کے بال جیسا باریک ہونے کی حالت میں اِن تمام امور کا ہونا ممکن نہیں ہوگا اور بعض حُفّاظِ حدیث سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ لفظ ثابت نہیں ہے۔''

علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ قائل کا یہ قول مردود ہے اور اس باب کی احادیث اس قول کی تردید کرتی ہیں۔ احادیثِ مبارکہ میں جو بیان ہوا ہے کہ پُل صراط تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے' اس پر ایمان لانا

واجب ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ جو ذاتِ پاک ہوا میں پرندے کو روک لینے پر قدرت رکھتی ہے' وہ اس پر بھی قادر ہے کہ بال سے باریک پُل صراط پر مخلوق کو ٹھہرائے اور اس کو چلنے اور دوڑنے کی طاقت عطا فرمائے۔لہٰذا جب لفظ کے حقیقی معنی کے مراد لینے میں کوئی مشکل امر نہیں ہے تو حقیقت ہی مراد ہوگی اور خواہ مخواہ حقیقت کو چھوڑ کر لفظ کو اُس کے مجازی معنی پر محمول کرنا کسی طور جائز نہیں ہے۔اور پھر یہ کہ اس سلسلہ میں بہ کثرت احادیث اور عادل اور ثقہ ائمہ کے آثار وارد ہو چکے ہیں۔'' (ایضاً' جلد دوئم' صفحہ ۷۳' ۷۴)

<u>ناگہانی آفت کے واقعات اور اخلاقی بے راہ روی کے مابین تعلق</u>: قرآن مجید میں ہے :

(۱) اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ (النسآء : ۴۰)

''بے شک اللہ ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔'' (۴ : ۴۰)

(۲) وَاَنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِO (الحج : ۱۰)

''اور یہ کہ اللہ اپنے بندوں پر بالکل ظلم کرنے والا نہیں ہے۔'' (۲۲ : ۱۰)

تو اللہ تعالیٰ کی اس صفت رحمانیت کے پیشِ نظر یہ المیے اور ناخوشگوار واقعات انسانی زندگی میں کیوں پیش آتے ہیں؟ اگر یہ ناگہانی آفتیں لامحالہ انسان کا مقدر بن چکی ہیں تو پھر انسان اپنی بدنصیبیوں کے لئے کام کیوں کرتا ہے بالخصوص جبکہ وہ ہمیشہ اپنی فلاح و بہبود کے لئے ہی کوشش کرتا ہے؟

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ایٹمی سائنسدان سلطان بشیر محمود لکھتے ہیں :۔

''قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انسان اس بات کو نہیں جانتا کہ اُس کے لئے اچھی اور بُری چیز کیا ہے۔آدمی اپنی خواہشات کی اندھا دُھند تقلید کرتا ہے اور اکثر وہ چور گڑھے (Pitfall) میں گر جاتا ہے۔بہت مرتبہ وہ ایسی چیز سے گریز کرتا ہے جو اُس کے مستقبل کے لئے اچھی ہوتی ہے۔۔۔۔۔اُس کا صرف خالق ہی جانتا ہے کہ اس کے لئے اِس دنیا اور اخروی دنیا کے لئے کون سی چیز بہتر ہے۔اُسی انسان کی راہ نمائی کے لئے اُس نے ہر زمانے میں انبیاء اور رسولوں کے بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا۔انبیاء علیہم السلام کے اس طویل سلسلے کی آخری کڑی محمد ﷺ ہیں اور قرآن مجید الٰہی رشد و ہدایت کی آخری اور حتمی کتاب ہے۔اگر انسان اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو تو وہ ہمیشہ محفوظ راہ پر ہوگا۔''

''اصول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قوانین فطرت سے بغاوت کرے تو وہ اس زندگی میں تو سزا سے بچ سکتا ہے لیکن اگر معاشرے یا قوم کی اکثریت وحیِ الٰہی کی تعلیمات کے ساتھ سنگ دلانہ رویّہ اختیار کرے تو اُنہیں اجتماعی طور پر اپنے گناہوں کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ گرامی ہے :

''جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب بھیجتا ہے تو وہ عذاب بلا امتیاز پوری قوم پر آتا ہے۔تاہم مرنے کے

بعد اُنہیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور اُن کے اعمال کے مطابق اُن کا فیصلہ کیا جائے گا۔''

''قرآن مجید قومی ناگہانی آفتوں کا تعلق اُس قوم کے اکثریتی افراد کی اخلاقی بے راہروی کے ساتھ جوڑتا ہے۔ وہ بار بار ایسی قوم کے نتیجہ خیز واقعات کو بیان کرتا ہے جنھوں نے اخلاقیات سے متعلق الٰہی قوانین کی مخالفت کی تو وہ بالآخر صفحۂ ہستی سے نابود کر دیے گئے۔ پھر اُن کے بعد دوسری نسلیں آئیں جنھوں نے کچھ وقت تک الٰہی قوانین کا خیال رکھا۔ لیکن جونہی وہ اخلاقی لحاظ سے زوال پذیر ہوئیں تو اُنہیں بھی اپنے سے بہتر لوگوں کو جگہ دینے کے لئے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا۔''

''تاہم یہ مفروضہ کہ انسانی مصائب کا سبب اخلاقی بے راہروی ہوتی ہے' اساسی (بنیادی) نظریہ ہے جو اُس شخص کی سمجھ سے باہر ہے جس کا زندگی کے بارے میں مادّی نظریہ ہے۔ تاہم قرآن مجید ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ قومی ناگہانی آفتوں کا سبب بالعموم قوموں کا اخلاقی تنزل ہوتا ہے۔''

''آفتوں کے آنے کا یہ عمل مرحلہ وار ہوتا ہے۔ اخلاقی لحاظ سے جب بھی کوئی قوم زوال پذیر ہوتی ہے تو سب سے پہلے اُنہیں ہلکی سی تنبیہات کی جاتی ہیں تا کہ وہ سمجھ جائیں اور اپنی اصلاح کر لیں۔ بالآخر جب وہ اُس نقطے پر پہنچ جاتی ہیں جہاں سے واپسی کی کوئی امید نہیں ہوتی تو جوابدہی کا عمل تیز ہو جاتا ہے اور وہ قومی ناگہانی آفتوں کے ذریعے تباہ و برباد کر دی جاتی ہیں۔ ایسی ناگہانی آفتوں کی مثالیں یہ ہیں: وسیع پیمانے پر وبائی امراض' قومی تنازعات' سماجی بدنظمی' جنگیں' زلزلے' آتش فشاں پہاڑوں کا پھٹنا اور لاوا اگلنا' طوفانی جھکڑ' سیلاب' شہابیوں (Meteors) کا گرنا اور تباہی و بربادی کے قدرتی کارندے۔ وہ آفتیں بگڑی ہوئی' بدکار قوم پر قیامتِ صغریٰ بن کر گرتی ہیں۔ ایسے واقعات کی تاریخ عالم گواہ ہے لیکن مؤرخین اُن کا تجزیہ مختلف طور پر کرتے ہیں۔''

''اِن ناگہانی آفتوں کی اصل وجوہات کی طرف ہماری توجہ مبذول کرنے کے لئے قرآن مجید چند طرح کی سزاؤں اور عذابوں کو بیان کرتا ہے جو زمانہ ماضی میں بد اقوام پر اُن کے الٰہی قوانین کو مسلسل پامال کرنے کی پاداش میں نازل ہوئیں:

(۱) نوح علیہ السلام کی قوم کو وسیع پیمانے پر کے سیلاب میں غرق کر دیا گیا (سورہ ھود: ۳۷۔۴۸ وغیرہ)
(۲) شعیب علیہ السلام کی قوم کو زلزلے کے ذریعے تباہ کر دیا گیا (سورۃ الاعراف: ۹۱ وغیرہ)
(۳) قومِ عاد اور ثمود کو جو اپنے وقت کی طاقتور ترین قومیں تھیں' اُن کی بدعملیوں کے سبب قدرتی آفتوں کے ذریعے صفحۂ ہستی سے نابود کر دیا گیا۔ (سورۃ القمر: ۱۹' ۲۰' ۳۱ وغیرہ)۔

(۴) لوط علیہ السلام کی قوم کو ہم جنس پرستی (Homosexuality) کے قبیح گناہ کی پاداش میں آسمانی پتھروں کے ذریعے صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا (سورہ ھود: ۸۲؛ سورۃ الشعراء: ۱۷۳ وغیرہ)
(۵) مصر کے فرعون اور اُس کے ہم نواؤں کو وقت کے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلانے کی وجہ سے دریائے نیل کے پانی نے نگل لیا (سورۃ القصص: ۴۰ وغیرہ)۔

درجِ بالا ناگہانی آفتوں کا نزول بعض اوقات اب بھی ہوتا ہے۔ اگر آج کوئی پیغمبر زندہ ہوتا تو وہ ہمیں صاف طور پر بتاتا کہ اُن آفتوں کی وجہ کیا ہے لیکن چونکہ خاتم النبیین حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی رسول یا نبی کا آنا ناممکن نہیں تو اب قرآن مجید کے حوالے سے ان آفتوں کا تجزیہ کرنا اور ان انسانی مصائب کے اصل اسباب کی تشخیص کرنا اور اُن کا علاج ڈھونڈنا ہر زمانے کے دانشوروں کا کام ہے۔ اس سلسلے میں سورۃ العنکبوت کی آیت ۴۰ کا آخری حصہ بھی مطالعہ فرماتے جائیے:

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوٓا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ O (العنکبوت: ۴۰)
''اور اللہ اُن پر ظلم کرنے والا نہ تھا البتہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔'' (۴۰ : ۲۹)

یہ آیت ایک بار پھر اس بات کو جتلا رہی ہے کہ معاشروں پر عذاب کا مسلّط کیا جانا اُن کے اپنے گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں ہوتا بلکہ وہ خود اپنا نقصان کر رہے ہوتے ہیں۔ کوئی قوم اُس وقت تک خوش کن زندگی بسر کر سکتی ہے جب تک وہ اللہ کے بنائے ہوئے معاشرتی اور اخلاقی قوانین کی پابند رہے جنہیں انبیاء علیہم السلام نے اپنی اپنی قوموں کے آگے بیان کیا اور جو اَب ہمارے زمانہ کے لئے تمام انسانوں کی آخری کتابِ مبین قرآن مجید میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔''

''یہ اصول کہ دنیا کی بدنصیبیاں انسان کی اپنی بدعملیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں، نہ صرف قوموں کے لئے صادق آتا ہے بلکہ اُن کا اطلاق افرادِ معاشرہ پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ النساء کی اس آیت سے ثابت ہے:

مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (النِّسآء: ۷۹)
''جب تجھے کوئی بھلائی پہنچے تو (سمجھ کہ) وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جب تجھے کوئی برائی پہنچے تو (سمجھ کہ وہ تیری اپنی طرف سے ہے۔'' (۴: ۷۹) (یعنی اُسے اپنی خرابیٔ نفس کی طرف منسوب کر)

مذکورہ بالا سورۃ العنکبوت کی آیت ۴۰ اور سورۃ النساء کی آیت ۷۹ کی رُو سے ہم بالیقین یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ تمام بدنصیبیوں کا ذمّہ دار حضرتِ انسان خود ہے۔

آفتوں اور مصیبتوں کو حسبِ ذیل تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۴۔۱۱۳ (علم ما بعد الطبعیات ۔۔Metaphysics)

''(i) وہ مصیبتیں اور آفتیں جو انسان کی اپنی بدعملیوں کی وجہ سے اُس پر پڑتی ہیں جن کے متعلق فرمایا:
وَمَا أَصَابَكُمْ مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ (اَلشُّورٰی : ۳۰)
''اور جو بھی مصیبت تمہیں پہنچتی ہے تو اُس (بدعملی) کے سبب سے ہی (پہنچتی ہے) جو تمہارے ہاتھوں نے کمائی ہوتی ہے۔'' (۳۰ : ۴۲)
(ii) وہ مصیبتیں جو ایک فرد کی جانب سے دوسرے فرد کو پہنچتی ہیں۔ اُن کی بڑی وجہ آدمی کی موروثی حرص و طمع، بغض اور دوسروں کو اپنے زیر اور تابع کرنے کی نفسانی خواہش ہوتی ہے۔ اس قسم کی مصیبتوں کے بالعموم والدین اور معاشرہ ذمہ دار ہوتے ہیں۔
(iii) مصیبتوں کی سب سے بڑی اور تیسری وجہ قوموں کی من حیث المجموع حماقتیں اور نادانیاں ہوتی ہیں۔ اس کی مثال ماحول کی پلیدی اور گندگی ہے جس کے بے گناہ اور خطا کار دونوں اکٹھے شکار ہوتے ہیں۔ بہت سی صورتوں میں آنے والی نسلیں گزری ہوئی نسلوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے تکلیف اٹھاتی ہیں۔''

''حالیہ سائنسی نظریہ کے مطابق ایسے واقعات و حادثات کے وقوع کے اسباب کو تمام تر مادّی اسباب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن آخری کتابِ الٰہی ۔۔ قرآنِ حکیم ۔۔ کے حوالے سے انسانی مصائب کے مطالعہ میں ہم ایک نئی وسعت پاتے ہیں۔'' ("Doomsday & Life after Death" ... Sultan Bashir Mahmood, pp. 41, 42)

قرآن مجید انتہائی واضح طور پر آفات و مصائب کے اسباب کو انسانوں کی بدعملیوں اور گناہوں کی طرف منسوب کرتا ہے اگرچہ کچھ کوتاہ نظر کے لوگ اس کی تاویل کسی اور طرح کریں۔ قرآن فرماتا ہے :
وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّبِيٍّ إِلَّا أَخَذْنَا أَهْلَهَا بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُونَ O ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتَّىٰ عَفَوا وَّقَالُوا قَدْ مَسَّ آبَاءَنَا الضَّرَّاءُ وَالسَّرَّاءُ فَأَخَذْنَاهُم بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ O وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ O (الاعراف : ۹۴ تا ۹۶)
''اور ہم نے جس کسی بستی میں بھی کوئی نبی بھیجا تو (جب نبی کو جھٹلایا گیا) ہم نے وہاں کے باشندوں کو سختی اور تکلیف میں مبتلا کر دیا تاکہ وہ لوگ ڈھیلے پڑ جائیں۔ پھر ہم نے بدحالی اور تکلیف کی جگہ راحت بدل دی حتیٰ کہ اُنہیں خوب ترقی ہوئی اور کہنے لگے کہ تنگی اور راحت تو ہمارے باپ داداؤں کو بھی (یونہی) پیش آتی رہی تھی، اس پر ہم نے اُنہیں یکایک پکڑ لیا (اور اس کا) اُنہیں خواب و خیال بھی نہیں تھا۔ اور اگر بستیوں والے ایمان لے آئے ہوتے اور پرہیزگاری اختیار کی ہوتی تو ہم اُن پر آسمان و زمین کی برکتیں کھول دیتے لیکن اُنہوں نے تو جھٹلایا، سو ہم نے اُن کے کرتوتوں کی پاداش میں اُن کو پکڑ لیا۔'' (۹۴ تا ۹۶ : ۷)

بلاؤں کا نزول اور قوموں کا تنزل اور اِدبار اصلاً اِسی لئے ہوا کرتا ہے کہ لوگ اپنی گمراہیوں پر متنبہ اور اُن سے تائب ہو کر خدا پرستی اور پاکبازی کی راہ اختیار کریں۔ لیکن کج فہم اور خود بین لوگ اِن مصائب سے عبرت حاصل کرنے اور اپنی اصلاح کرنے کی بجائے ''اِن مصائب و آلام کو اپنی اخلاقی کمزوری یا کاروباری بد دیانتی' غریبوں پر ظلم و تعدّی اور گناہوں کی سزا نہیں سمجھتے بلکہ اُسے آئے دن کا معمول (Routine Matter) قرار دے کر تلافیِ مافات سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ آج کی مادّہ پرستانہ ذہنیت جس نگاہ سے اِن حوادث و آلام کو دیکھتی ہے اور پھر اُس کے لئے جو علاج تجویز کرتی ہے' اُن تباہ شدہ قوموں کا بھی یہی حال تھا۔ اسی کو قرآن مجید نے اپنے معجزانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ قرآنی بیان کا یہ مقصد نہیں کہ ہم گزشتہ اقوام کی ناعاقبت اندیشیوں پر طنزیہ قہقہے لگائیں یا رسمی طور پر اظہارِ افسوس کر دیں۔ بلکہ اس کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ ہم اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں اور ان مہلت کی گھڑیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آپ کو اُس ہیبت ناک انجام سے بچائیں جس سے سابقہ قوموں کو اپنی سرکشیوں کے باعث دوچار ہونا پڑا تھا۔''

آیت ۹۶ میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ''ایمان اور تقویٰ کسی قوم کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے جیسے عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ اس کے باعث تو رحمتِ الٰہی کا دریا جوش میں آتا ہے اور ہر جانب سے خیر و برکت کی فراوانی ہو جاتی ہے۔ زمین اپنے شکم میں پوشیدہ خزانوں کو اُس کے قدموں میں ڈھیر کر دیتی ہے اور آسمان اپنی نعمتوں اور برکتوں کو بے دریغ نچھاور کر دیتا ہے۔ برکاتِ آسمان سے مراد بارش اور الٰہی برکات و نعم کا نزول ہے اور برکاتِ زمین سے مراد زراعت و نباتات کا پھلنا پھولنا ہے۔'' (''ضیاء القرآن''۔۔۔ جسٹس کرم شاہ الازہری' جلد دوم' صفحات ۶۱' ۶۲)

سورۂ النّحل میں حسب ذیل چند اور انداز ہائے عذاب کا ذکر ہوا ہے۔ ملاحظہ ہوں:

أَفَأَمِنَ الَّذِينَ مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْيَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ۝ أَوْيَأْخُذَهُمْ فِي تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ ۝ أَوْيَأْخُذَهُمْ عَلَىٰ تَخَوُّفٍ فَإِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ (النّحل: ۴۵ تا ۴۷)

''کیا وہ لوگ جو بڑے بڑے منصوبے باندھتے رہتے ہیں' اس امر سے بے فکر ہو گئے ہیں کہ اللہ اُنہیں زمین میں دھنسا دے' یا اُن پر عذاب ایسے موقع سے آ پڑے کہ اُنہیں گمان بھی نہ ہو' یا اُنہیں اُن کے چلتے پھرتے میں پکڑ لے' سو یہ لوگ اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے' یا اُنہیں گھٹاتے گھٹاتے پکڑ لے' بے شک تمہارا رب بہت مہربان' ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔'' (۴۵ تا ۴۷ : ۱۶)

إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ '' میں پھر وہی نکتہ سمجھایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ فوراً عذاب کی گرفت میں نہیں لیتا بلکہ رجوع و توبہ کے لئے بار بار موقع دیتا رہتا ہے۔

قرآن مجید اس نظریہ کا بھی حامی ہے کہ روحانی اسباب کو مادّی اسباب پر تقدم حاصل ہے یا دوسرے

۴۱۱۵ (علم مابعد الطبعیات ۔۔Metaphysics)

لفظوں میں یوں کہیے کہ علم طبعیات (فزکس) کو علم مابعد الطبعیات (میٹا فزکس) سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ قوموں کی معاشرتی زندگی کی عملداری میں مابعد الطبعیات، طبعیات (فزکس) پر حاوی ہوتا ہے۔ پس مادّی اور روحانی قوانین کے مابین پُر اسرار رشتہ ہے۔ ہمیں اس رشتہ سے متعلق نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جانب سے بھی ایک اشارہ ملتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ قربِ قیامت میں اخلاقی بے راہ روی اور آفات ومصائب دونوں اپنے عروج پر ہوں گے جس کا مطلب یہی ہے کہ آفات و مصائب اور اخلاقی پستی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

''قیامت کے وقوع سے قریب ایک وقت ایسا آئے گا جب مذہبی جہالت اور لاعلمی عام ہو جائے گی، علم کا نام ونشان نہیں رہے گا اور حرج بہت زیادہ ہوگا۔ (خرج کا معنی وسیع پیمانے پر قتل وغارت ہے)۔ یہ حرج سچے مذہب اسلام سے تغافل، غلط نظریات کے عام ہونے اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کی لاعلمی کی وجہ سے ہوگا۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیثِ مبارکہ میں آپ ﷺ نے فرمایا:

''قربِ قیامت میں دُنیوی حظ اندوزیوں اور مسرتوں میں مصروف ہونے اور حقوق اللہ کو بھول جانے کی وجہ سے وقت تیزی سے گزرے گا، اعمالِ صالحہ کم ہو جائیں گے۔ خود غرضی اور کنجوسی کا زمانے میں راج ہوگا، پھر آفات ومصائب کا نزول ہوگا اور بہت زیادہ ''الحرج'' ہوگا۔ صحابہ کرام نے پوچھا: ''الحرج'' سے کیا مراد ہے؟ آپ نے جواب دیا: ''قتل وغارت، قتل وغارت''۔ یہ وہ مصیبتیں ہیں جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے اُن کی بدعملیوں اور بدنیتی کی وجہ سے پہنچتی ہیں۔'' (صحیح بخاری)

قرآن مجید انسان کو انتہائی غیر مبہم اور واضح طور پر اُن کی بدعملیوں کے مہیب نتائج کی وعید سناتا ہے تاکہ وہ اپنے طریقِ حیات کی اصلاح کر کے اِس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی غضبِ الٰہی سے بچ جائیں۔ فرمایا:

(۱) فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰى اِذَا فَرِحُوْا بِمَا اُوْتُوْا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

''پھر جب وہ اُس چیز کو جس کی اُنہیں نصیحت کی جاتی تھی، بھول گئے، تو ہم نے اُن پر ہر چیز کے دروازے کھول دئے، یہاں تک کہ جب وہ اُس پر جو اُنہیں ملا تھا، اترانے لگے تو ہم نے اُنہیں یکایک پکڑ لیا اور وہ نا اُمید ہو کر رہ گئے۔ اس طرح اُن لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جو ظلم کرتے تھے اور تمام تر حمد وثنا سارے جہانوں کے پروردگار کے لئے ہے۔'' (۶ : ۴۵،۴۴)

لیعنی پہلے سختیوں میں اور پھر آسائیوں میں دونوں طرح ہم نے اُنہیں آزما دیکھا کہ اب بھی وہ فطرتِ سلیمہ

سے کام لے کر کسی طرح راہِ حق پر آجائیں۔ اگر اس طرح بھی وہ باز نہ آئیں تو اُن کے لئے رزق کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں' ہر چیز کی فراوانی ہو جاتی ہے اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہم اللہ کے پیارے ہیں اور عیش وعشرت کا یہ دَور کبھی ختم نہ ہوگا۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے خالق و مالکِ حقیقی کے شکر گزار اور فرمانبردار بندے بن جائیں' وہ الٹا اکڑنے لگتے ہیں اور اس ناپائیدار اور سرور ونشاط میں وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ڈوری یکا یک کھینچ لی جاتی ہے' غضبِ الٰہی کی بجلی گرتی ہے جو اُنہیں اور اُن کے سارے متاعِ غرور وحیات کو دَم بھر میں جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔

ظالم قومیں جن کی چیرہ دستیوں سے بندگانِ خدا تنگ آچکے ہوتے ہیں' جب تباہ و برباد کر دی جاتی ہیں تو ہر طرف اطمینان اور آرام کا سانس لیا جاتا ہے اور واقعی وہ لمحہ اس قابل ہوتا ہے کہ مظلوم اور ستم رسیدہ لوگ اپنے ربِّ کریم کی حمد وثنا کے گیت گائیں جس نے اُن کی بیکسی اور بے بسی پر ترس کھا کر اُن کو اُن جابر ظالموں کی قید می اور ظلم وجور سے نجات بخشی۔

آیت سے ماخوذ چند نکات: (1) جس قوم پر عذابِ الٰہی آتا ہے' اُس کی نسل نہیں چلتی کیونکہ بروئے آیت مذکورہ اُن کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے' لہٰذا موجودہ بندر' کتے وغیرہ اصلی مخلوق ہیں اور کسی مسخ شدہ قوم کی نسل سے نہیں جیسا کہ لوگوں میں مشہور ہے۔ (2) جس بستی پر ہلاکت والا عذابِ الٰہی آتا ہے وہ بستی پھر کبھی آباد نہیں ہوتی اور اس کے کھنڈرات لوگوں کے لئے باعثِ عبرت ہوتے ہیں۔ ہمارے وطنِ عزیز پاکستان میں موہنجوداڑو' ہڑپہ اور ٹیکسلا کے کھنڈرات اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ (3) کفار اور اللہ کے باغیوں کی ہلاکت اللہ کی نعمت اور اُس کا مؤمنوں پر احسان ہے۔ مسلمانوں کو اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ ابوجہل کے قتل پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ عاشورہ کے دن کے روزے کا حکم فرمایا کہ وہ فرعون اور اُس کے ہم نواؤں کے ڈوبنے کی تاریخ ہے۔ لہٰذا مؤمن کے مرنے پر اِنَّـا لِلّٰہِ وَاِنَّـا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ اور ظالم وجابر کے مرنے پر اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہ کہنا ہمارے قرآن کا سکھایا ہوا سبق ہے۔ (تفسیر نعیمی' ج ۷' ص ۳۴۴)

(۲) فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ مَکۡرِہِمۡ اَنَّا دَمَّرۡنٰہُمۡ وَقَوۡمَہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ O (اَلنَّمل : ۵۱)

''تو ذرا دیکھئے تو سہی کہ اُن کی (مکارانہ) سازش کا انجام کیسا ہوا (کہ) بے شک ہم نے اُن (سرداروں) کو اور اُن کی ساری قوم کو تباہ و برباد کر دیا۔'' (۲۷ : ۵۱)

(۳) فَاَصَابَہُمۡ سَیِّاٰتُ مَا کَسَبُوۡا وَالَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡ ہٰۤؤُلَآءِ سَیُصِیۡبُہُمۡ سَیِّاٰتُ مَا کَسَبُوۡا وَمَا ہُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ O (اَلزُّمَر : ۵۱)

''تو اُنہیں وہ برائیاں آ پہنچیں جو اُنہوں نے کما رکھی تھیں اور اُن لوگوں میں سے جو ظلم کر رہے ہیں' اُنہیں (بھی) عنقریب وہ برائیاں آ پہنچیں گی جو انہوں نے کما رکھی ہیں اور وہ (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتے۔'' (۳۹:۵۱)

(5) نارِ جہنم: کافروں اور نافرمانوں کے لئے جہنم کا وجود بالکل حقیقی ہے۔ قرآن مجید کی نقشہ کشی کے مطابق جہنم تصور سے ماوراء ایک انتہائی ہیبت ناک اور آلام و صدمات سے پُر جگہ ہے۔ احادیثِ مبارکہ کی رُو سے نارِ جہنم کی شدّت و تمازت اس دنیا کی آگ سے ستّر (۷۰) گنا زیادہ ہے (العیاذ باللہ)۔

جہنم کے مختلف نام: قرآن نے مختلف مقامات پر جہنم کے سات نام بیان کئے ہیں:۔

(۱) سَعِیْر (سورۃ النساء: ۱۰، ۵۵؛ سورۃ الفرقان: ۱۱؛ سورۃ الاسراء: ۹۷)
(۲) جهنّم (سورۃ البقرۃ: ۲۰۶؛ آلِ عمران: ۱۲، ۶۲، ۱۶۷؛ النِّساء: ۹۳، ۹۷، ۱۱۵)
(۳) جَحِیم (البقرۃ: ۱۱۹؛ المائدۃ: ۱۰، ۸۶؛ التوبۃ: ۱۱۳؛ الحج: ۵۱؛ الشعراء: ۹۱)
(۴) لَظٰی (المعارج: ۱۵)
(۵) سَقَر (القمر: ۴۸؛ المُدَّثِّر: ۲۶، ۲۷، ۴۲)
(۶) هَاوِيَة (القارعة: ۹)
(۷) حُطَمَة (الهُمَزَة: ۴، ۵)

کافروں کے ٹھکانے کے لئے قرآن نے بالعموم نَار (بمعنی آگ) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ قرآن مجید نارِ جہنم کے طبقات کی تفصیل کے بارے میں خاموش ہے۔ سورۃ الحِجر کی آیت ۴۴ صرف اتنا بتاتی ہے کہ جہنم کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازہ کے الگ الگ حصے ہیں۔ ممکن ہے کہ دروازوں کی یہ تعداد استحقاقِ عذاب کے لحاظ سے سات طبقوں کے اظہار کے لئے ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ محض خلود (ہمیشہ کے لئے رہنا) مراد ہو اور اس سے مقصود دوزخ میں داخل ہونے والوں کی کثرتِ تعداد کا اظہار ہو (تفسیر بیضاوی)۔ جہنم کے دروازوں پر اُنّیس انتہائی تندخُو، سخت مزاج فرشتے مقرر ہیں جو حکمِ الٰہی کی تعمیل سے ذرّہ بھر غفلت نہیں برتتے (بحوالہ سورۃ التّحریم' آیت ۶؛ سورۃ المُدّثّر' آیت ۳۰)۔ بعض اوقات جہنّم کا لفظ بہ حیثیت مجموعی آگ کے مفہوم میں اور بعض اوقات اُس کے بالائی طبقے کے معنٰی میں آتا ہے۔ جہنّم کی تہہ میں زَقُّوم نامی ایک ہیبت ناک درخت اُگتا ہے (بحوالہ سورۃ الصّافّات' آیت ۶۲؛ سورۃ الدُّخان' آیت ۴۳) جس کے پھول شیاطین کے سر ہیں اور جو اللہ کے باغیوں کا کھاج ہوں گے۔''

جہنم کی ہولناکیاں: جہنم کی اذیّتوں کی بابت قرآن مجید کچھ مخصوص اشارات دیتا ہے مثلاً:

(۱) اُس کے شعلے سخت غضبناک اور اس کا غیظ و غضب سسکیاں لینا اور دھاڑنا ہے (سورۃ الفُرقان: ۱۲)
(۲) اُس کا پانی سخت کھولتا ہوا ہے (سورۃ الرحمٰن: ۴۴؛ سورۃ الواقعۃ: ۵۴)۔
(۳) اُس میں لُو کی لپٹ اور سیاہ دھوئیں کے سائے ہیں (سورۃ الواقعۃ: ۴۲، ۴۳)۔

(۴) اُس کے دھاڑنے میں یوں لگتا ہے کہ غیظ و غضب میں وہ ابھی پھٹنے کو ہے (سورۃ المُلک: ۷، ۸)
(۵) مردودوں اور راندہ درگاہ لوگوں کے لئے اعلان ہوگا: خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ o ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ o (اُسے پکڑو اور اُسے طوق پہناؤ، پھر اُسے دوزخ میں داخل کردو، پھر اُسے ایسی زنجیر میں جکڑ دو جس کی پیمائش ستر گز ہے) (سورۃ الحاقّۃ: ۳۰ تا ۳۲)
(۶) اہلِ جہنم کا لباس تارکول کا ہوگا اور آگ اُن کے چہروں پر چھا رہی ہوگی (سورۃ الحجر: ۵۰)۔

(۷) آگ اُن کے چہروں کو جلا دے گی اور اس میں اُن کے دانت نکلے ہوئے، منہ بگڑے ہوں گے۔
(سورۃ المؤمنون: ۱۰۴)
(۸) وہ سسکیاں لے رہے ہوں گے، آہیں بھر رہے ہوں گے اور اپنی قسمت کو کوس رہے ہوں گے۔ (ھود: ۱۰۶)
(۹) آگ میں بھونی ہوئی اُن کی جلدوں کو بدل کر ہمیشہ دوسری نئی کر دیا جائے گا تاکہ وہ برابر عذاب کا مزہ چکھتے رہیں۔ (سورۃ النساء: ۵۶)
(۱۰) وہ پیپ اور لہو کا پانی پئیں گے جو اُن کے حلق سے نہ اترے گا اور اگرچہ اُن کے چاروں طرف موت ہی موت ہوگی لیکن موت اُنہیں آئے گی نہیں۔ (سورہ ابراھیم: ۱۶، ۱۷)
(۱۱) اُن کے لئے آگ کے کپڑے قطع کیے جائیں گے، اُن کے سروں کے اوپر سے گرم پانی چھوڑا جائے گا جس سے اُن کے پیٹ کی چیزیں اور کھالیں گل جائیں گی اور اُن کے مارنے کے لئے گرز ہوں گے۔ (الحج: ۱۹-۲۱)
(۱۲) جب بھی وہ اس سے باہر نکلنا چاہیں گے، اُسی میں دھکیل دیے جائیں گے۔ (سورۃ الحج: ۲۲)
(۱۳) ذیل کی چار آیات بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ جہنم کے پیٹ کو اُس کی گہرائی تک بھر دے گا:
سورۃ الاعراف: ۱۸؛ سورہ ھود: ۱۱۹؛ سورۃ الاسراء: ۶۳؛ سورہ صٓ: ۸۵)
(۱۴) جہنم کے انگارے اپنی بڑائی کے لحاظ سے بڑے بڑے محل جیسے ہوں گے۔ (سورۃ المُرسلات: ۳۲)
(۱۵) جہنم ایسی بھڑکتی ہوئی آگ ہے جو کھال اُدھیڑ دینے والی ہے۔ (سورۃ المَعارج: ۱۵، ۱۶)

"جہنم کی گہرائی اور اس کی حدت: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے کہ آپ نے ایک گڑگڑاہٹ کی آواز سنی۔ آپ نے پوچھا: تمہیں معلوم ہے یہ کیسی آواز تھی؟ ہم نے عرض کیا: اللہ تعالیٰ اور اُس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ ایک پتھر ہے جسے ستر سال پہلے جہنم میں پھینکا گیا تھا، وہ اب تک اُس میں گر رہا تھا اور اب اُس کی گہرائی میں پہنچا ہے۔" (صحیح مسلم: کتاب الجنۃ والنار؛ مسند احمد ج ۲، ص ۳۷۱؛ ابن حبان ج ۹، ص ۲۷۸؛ ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۱۵۹۹۵)

"حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اگر بیل کی ناک کے سوراخ جتنی جگہ جہنم کی آگ کے

لئے کھول دی جائے اور وہ سوراخ مشرق میں ہو اور ایک شخص مغرب میں ہو تو اتنی دُور سے بھی اُس کی گرمی کی وجہ سے آدمی کا دماغ کھولنے لگ جائے گا اور پگھل کر بہہ جائے گا۔ اور جہنم جب جوش مارے اور چنگھاڑے تو کوئی مقرب فرشتہ اور کوئی نبی مُرسَل نہیں ہو گا مگر اپنے گھٹنوں کے بل گر جائے گا اور نَفسِیُ نَفسِیُ پکارے گا۔'' (''سفرِ آخرت کی منازل'' (اردو ترجمہ) از مولانا غلام نصیر الدین گولڑوی' ج ۲' ص ص ۱۷۶'۱۷۷)

دوزخ میں جلنے والے پتھروں کا بیان: سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۴ میں ارشاد ہوا کہ اگر تم اِس قرآن کا مقابل نہ لا سکے اور تم ہرگز لا بھی نہ سکو گے تو اُس آگ سے بچو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ اِن پتھروں سے مراد بُت ہیں جنہیں بنا کر اُنہوں نے اُن کی پرستش کی تھی۔ قرآن مجید میں ہے :

اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (سورۃ الانبیاء : ۹۸)

''بے شک تم اور جن چیزوں کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو وہ سب جہنم کا ایندھن ہیں۔'' (۲۱:۹۸)

بتوں کو اس لئے آگ میں ڈالا جائے گا تاکہ مشرکین کی زیادہ ذلت اور رسوائی ہو اور یہ واضح ہو کہ جن بتوں کو وہ اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے' وہ خود اپنے آپ کو عذاب سے نہیں بچا سکتے یا اس لئے کہ اُن کے جرم اور شرک کا منشا یہ بت تھے' اس لئے ان بتوں کو عذاب دیا جائے گا۔ جس طرح جو شخص سونے چاندی کی محبت کی وجہ سے اُن کی زکوٰۃ نہ نکالے' سونا چاندی تپا کر اُن سے اُس کی پیشانی' پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا (بحوالہ سورۃ التوبۃ : ۳۵)

وَاِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (سورہ مریم : ۷۱) کی تفسیر احادیث مبارکہ کی روشنی میں :

''اور تم میں سے کوئی ایسا نہیں جس کا گزر دوزخ پر سے نہ ہو۔'' لفظ ''وارد'' کے معنی اور تفسیر میں علمائے مفسرین کے متعدد اقوال ہیں : گزرنا' داخل ہونا' بخار' دیکھنا' جھانکنا' قریب سے مطلع ہونا۔

(۱) ''حضرات ابنِ عباس' عبداللہ بن مسعود اور کعب الاحبار رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں کہ 'وُرود'' سے مراد پُل صراط کے اوپر سے گزرنا ہے۔ حضرت سدی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے نبی کریم ﷺ سے مرفوعاً یہی معنیٰ روایت کیا ہے۔

(۲) ''وُرود'' کا دوسرا معنیٰ داخل ہونے کا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ کوئی نیک اور بد باقی نہیں رہے گا مگر وہ جہنم میں داخل ہو گا نافرمان لوگ اپنے جرائم کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے جبکہ اولیاء اور نیکوکاروں کا جانا وہاں اپنوں کی شفاعت کے لئے ہو گا اور وہ اُن اولیاء اور مؤمنوں پر اس طرح ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جائے گی جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہوئی تھی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْهَا جِثِیًّا۝ (مریم : ۷۲)

یعنی "پھر ہم پرہیزگاروں کو نجات دیں گے اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔" (مسند احمد' ج ۳' ص ۳۲۹' مستدرک للحاکم' ج ۴' ص ۵۸۷)

"حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ نے آیت وَاِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا کی تفسیر میں فرمایا کہ جہنم میں وارد ہونے سے مراد ہے کہ جہنم کو لوگوں کے لئے بچھا دیا جائے گا گویا کہ وہ پگھلی ہوئی ہے۔ جب نیک اور برے تمام لوگ اس پر قدم جما کر ٹھہر جائیں گے تو ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا: اے جہنم! اُن لوگوں کو پکڑ لے جو تیرے لئے ہیں اور جو میرے ہیں اُنہیں چھوڑ دے۔ چنانچہ جتنے لوگ جہنم کے سزاوار ہوں گے وہ پُل صراط سے نیچے دھنس کر غرق ہو جائیں گے اور یقیناً جہنم اہلِ جہنم کو اس طرح پہچانے گی جس طرح کوئی باپ بھی اپنے بچوں کو کیا پہچانتا ہوگا؟"

(۳) حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کا جہنم میں وارد ہونا بس یہی ہے کہ دنیا میں اُنہیں جو بخار وغیرہ ہو' وہ جہنم سے اُن کا حصّہ ہے اور اب وہ جہنم میں داخل نہیں ہوں گے۔

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک بیمار کی عیادت کرنے تشریف لے گئے جسے بخار تھا۔ آپ نے اُسے فرمایا: تجھے خوشخبری ہو' بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بخار میری پیدا کردہ آگ ہے جسے میں اپنے مؤمن بندے پر دنیا میں اس لئے مسلّط کرتا ہوں کہ یہ بخار آتشِ جہنم میں اس کا حصّہ بن جائے۔"
(ترمذی: رقم الحدیث ۲۰۸۸ ؛ ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۴۷۰ ؛ مسند احمد ج ۲' ص ۴۴۰ ؛ مستدرک للحاکم ج ۱' ص ۳۴۵ ؛ حلیۃ الاولیاء ج ۶' ص ۸۵ بحوالہ اردو ترجمہ مولانا غلام نصیر الدین گولڑوی' ج ۲' ص ۷۶)

(۴) وَرود کا چوتھا معنیٰ مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ قبر میں بندے کا دوزخ کی طرف نظر کرنا اور دیکھنا مراد ہے اور فلاح پانے والا کامیاب شخص اس سے نجات پانے والا ہے اور اگر کسی شخص کا اُس میں داخل ہونا ہی مقدر ہو چکا ہے تو وہ اُس میں داخل تو ہوگا مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یا کسی کی شفاعت سے یا کسی اور سبب سے آخر کار آگ سے نکل کر جنت میں آ جائے گا۔ اس کی دلیل کہ قبر میں آدمی کو دوزخ کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے' حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے جس میں ہے کہ تم میں سے جو شخص فوت ہوتا ہے تو (قبر میں) صبح و شام اُس پر اُس کا ٹھکانہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۵) وَرود سے مراد جہنم پر جھانکنا' اُس پر مطلع ہونا اور اُس کے قریب ہونا ہے (اس کے اندر گھسنا نہیں ہے) اور وہ اس طرح ہوگا کہ لوگ جب حساب کی جگہ حاضر ہوں گے جو جہنم کے قریب ہوگی' احتساب کی حالت میں اُس مقام سے لوگ جہنم کو نزدیک سے دیکھیں گے' پھر پرہیزگاروں کو اللہ تعالیٰ اس جہنم سے جسے وہ دیکھ چکے ہوں گے' نجات دے گا اور اُنہیں جنت کی طرف بھیج دیا جائے گا جبکہ ظالموں کے متعلق اللہ تعالیٰ حکم کرے گا کہ اُنہیں آتشِ جہنم میں پھینک دو۔

لفظ وَرود کا معنی جھانکنا' قریب ہونا اور اندر داخل نہ ہونا قرآن مجید میں بھی استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہوا: وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ (یعنی جب موسیٰ علیہ السلام مدین کے چشمہ کے پاس آئے)۔

(۶) حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ عزّ وجلّ کے قول وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا میں ولید بن مغیرہ اور اُبیّ بن خلف وغیرہ جیسے کافروں کو خطاب ہے۔

دوزخ کے قول هَلْ مِنْ مَّزِيْد (سورہ قٓ: ۳۰) کی تاویلات : دوزخ کہے گی: هَلْ مِنْ مَّزِيْد (کیا کچھ اور بھی ہے؟)۔ اس کے مفہوم میں علماء کا اختلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہنم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اُسے بھر دے گا تو جب اس میں جنّ اور انسان ڈال دے گا تو وہ کہے گی کہ کیا کچھ اور مزید بھی میرے اندر ڈالا جائے گا یعنی اب تو میرا پیٹ بھر گیا' مزید گنجائش نہیں۔ حضرت مجاہد اور دوسرے محدّثین سے یہی تفسیر منقول ہے۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ جہنم کہے گی: میرے لئے زیادہ کرو یعنی جہنم اہلِ جہنم پر سخت غیظ وغضب اور جوش میں ہوگی اور غصہ میں ایسا کہے گی جیسا کہ سورۃ المُلک کی آیات ۷' ۸ میں آیا: وَهِيَ تَفُوْرُo تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ (اور وہ ایسا جوش مار رہی ہوگی کہ گویا ابھی شدتِ غضب سے پھٹ جائے گی۔)

دوزخ میں اللہ تعالیٰ کے قدم رکھنے کی توجیہ : جہنم کہے گی: کیا کچھ اور ہیں؟ حتّٰی کی رب العزت اُس میں اپنا قدم رکھیں گے (حَتّٰى يَضَعَ فِيْهَا قَدَمَه') جس سے دوزخ کا بعض حصہ بعض سے مل جائے گا اور وہ عرض کرے گی: ''بس بس! تیری عزت اور کرم کی قسم!'' قدم اور پیر اُن لوگوں سے استعارہ ہے جن کا دخول جہنم میں متاخر ہوگا' کیونکہ جہنمی فوج در فوج جہنم میں داخل ہوں گے اور اُن کی بہت سی جماعتیں ہوں گی اور جہنم کے پہرے دار اُن کا انتظار کر رہے ہوں گے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

> كُلَّمَا اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَا اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌo (اَلْمُلْك : ۸)
> ''جب کوئی گروہ اس میں ڈالا جائے گا تو اُس کے محافظ پوچھیں گے: کیا تمہارے پاس ڈرانے والا (یعنی نبی یا رسول) نہیں آیا تھا؟'' (۶۷ : ۸)

اور اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے کہ ''دوزخ میں لوگوں کو مسلسل ڈالا جائے گا اور پہرے دار سب سے متاخر لوگوں کا انتظار کر رہے ہوں گے کیونکہ اُنہیں جہنمیوں کے ناموں اور اُن کی صفات کا علم ہوگا اور ہر پہرے دار اپنے متعلقہ گروہ کا منتظر ہوگا۔ اور جب ہر پہرے دار کے پاس پہنچنے والے اُفراد پورے ہو جائیں گے اور ان میں سے کوئی باقی نہیں بچے گا تو وہ کہیں گے: بس بس! یعنی ہمارے اعداد وشمار پورے ہو چکے۔ پھر جہنم جہنمیوں پر

سمٹ کر تنگ ہو جائے گی۔ سو اس میں داخل ہونے والی جماعت کو قدم رکھنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔'' (ایضاً' ص ۲۲۹)

دوزخیوں کا لباس اور کھانا پینا: اُن کے لباس کے بارے میں قرآن نے فرمایا:

(۱) سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٍ (ابراھیم : ۵۰)

''اُن کے کُرتے (آگ بھڑکانے والے روغن) تارکول کے ہوں گے۔''

(۲) فَالَّذِينَ كَفَرُوا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّن نَّارٍ (الحج : ۱۹)

''کافروں کے لئے آگ کے لباس تیار کر دیئے گئے ہیں۔''

اُن کے ماکولات اور مشروبات کے بارے میں قرآن نے فرمایا:

(۱) إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ ٥ طَعَامُ الْأَثِيمِ ٥ كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ ٥ (الدخان: ۴۳ تا ۴۵)

''بے شک تھوہر کا درخت گنہگاروں کا کھانا ہوگا' پگھلے ہوئے تانبے کی طرح پیٹوں میں جوش مارے گا۔''

(۲) وَإِن يَسْتَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ بِئْسَ الشَّرَابُ (الکھف: ۲۹)

''اور اگر (شدتِ پیاس کی وجہ سے) وہ فریاد کریں تو اُن کی فریاد رسی (اُس) پانی سے ہوگی جو پگھلائے تانبے کی طرح ہوگا' (اُن کے) منہ بھون ڈے گا' کیا ہی بُرا پینا ہوگا۔'' (۱۸:۲۹)

(۳) فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هَاهُنَا حَمِيمٌ ٥ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ ٥ لَّا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ ٥

''تو آج یہاں اُس کا کوئی دوست نہیں (جو اُسے کوئی فائدہ دے یا شفاعت کرے) اور نہ کچھ کھانے کو مگر دوزخیوں کا پیپ' اُسے خطا کار ہی کھائیں گے۔'' (الحاقۃ: ۳۵' ۳۶)

(۴) لَّا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا ٥ إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا ٥ جَزَاءً وِفَاقًا ٥ (النبا: ۲۴ تا ۲۶)

''وہ اس میں نہ کسی قسم کی ٹھنڈک کا مزہ پائیں گے اور نہ کچھ پینے کو مگر کھولتا پانی اور دوزخیوں کا جلتا پیپ' جیسے کو تیسا بدلہ (یعنی جیسے کفر بدترین جرم ہے' ویسا ہی اُنہیں سخت ترین عذاب ہوگا)۔''

(۵) تُسْقَىٰ مِنْ عَيْنٍ آنِيَةٍ ٥ لَّيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِن ضَرِيعٍ ٥ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِن جُوعٍ ٥

''وہ کھولتے پانی کے چشمے سے پلائے جائیں گے۔ اُن کے لئے کوئی کھانا نہ ہوگا سوائے خاردار خشک زہریلے درخت کے جو نہ بدن کو موٹا کرے اور نہ بھوک مٹائے۔'' (الغاشیۃ: ۵ تا ۷)

دوزخیوں اور جنتیوں کا ہمیشہ ہمیشہ دوزخ اور جنت میں رہنا: قرآن مجید نے اِن ہر دو طبقات کے لئے جہنم اور جنت میں رہنے کے عرصہ کو خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا کے الفاظ سے معنون کیا ہے (دوزخیوں کے لئے سورۃ الاحزاب کی آیت ۶۵ اور جنتیوں کے لئے سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۱۹)۔ اس کے علاوہ کتب احادیث میں بھی یہ مضمون کافی دفعہ بیان ہوا ہے۔ مثلاً:

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن موت کو لا کر پل صراط پر کھڑا کیا جائے گا' پھر آواز دی جائے گی'' اے اہلِ جنت!'' تو وہ خوف سے گھبرائے اور سہمے ہوئے جھانکیں گے کہ اُن کے نکالے جانے کا حکم تو نہیں۔ اسی طرح اہلِ جہنم کو آواز دی جائے گی' وہ خوش ہو کر اُدھر متوجہ ہوں گے کہ شاید اُن کی نجات کا حکم ہے۔ اتنے میں حکم ہوگا کہ'' تم جانتے ہو یہ کیا چیز ہے؟'' لوگ کہیں گے:'' جی ہاں! یہ موت ہے''۔ تب اُسے ذبح کر کے کہا جائے گا: اب کوئی موت نہیں' ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔'' (مسند احمد' ج ۲' ص ۳۳۷ ؛ ابن ماجہ' رقم الحدیث: ۴۳۲۷ ؛ ترمذی' رقم الحدیث: ۲۵۵۷)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں کہ ائمہ اہلِ علم اور علمائے محدثین حضرت سفیان ثوری' مالک بن انس' ابنِ مبارک' ابن عُیینہ' وکیع اور دوسرے اہلِ علم ایسی احادیث میں تاویل کے قائل نہیں۔ ائمہ محدثین کا مختار مذہب بھی یہی ہے کہ ایسی احادیث کو روایت کیا جائے اور اُن پر ایمان لایا جائے لیکن اُن کی تاویل اور تفسیر نہیں کی جائے گی اور یہ نہیں کہا جائے گا کہ موت تو ایک عرض ہے' جسم نہیں ہے' اُسے ذبح کرنا کس طرح متصور ہوگا؟ اور اسی طرح یہ کہنا بھی درست نہ ہوگا کہ اعمال کو کس طرح تولا جائے؟ ائمہ حدیث کا مذہب مختار یہی ہے کہ اس طرح کے سوال کرنا جائز نہیں۔ ایسی احادیث کے ظاہر پر ایمان رکھنا چاہئے۔

(6) ''جنّت'': لفظ'' جنّت'' اسم جنس ہے جس کا اطلاق قلیل اور کثیر دونوں پر ہوتا ہے اس لئے کبھی جنت کہہ دیا جاتا ہے اور کبھی جنّات۔ اسی طرح جنتِ عدن اور جنّاتِ عدن کیونکہ ''عدن'' کا معنی ہے اقامت اور تمام جنتیں دارالاقامۃ ہیں جیسے تمام جنتیں مؤمنین کے لئے ماویٰ ہیں۔ اسی طرح دارالخلد اور دارالسلام کا معنی سمجھنا چاہئے کہ تمام جنتیں ہمیشہ رہنے کا گھر ہیں اور خوف وحُزن سے سلامتی کی جگہ ہیں اور یوں ہی جنت النعیم اور جنات النعیم کو سمجھ لیجئے کہ تمام جنتیں بھانت بھانت کی نعمتوں سے مالا مال ہیں۔

ربّ ذوالجلال والاکرام نے قرآن مجید کے مختلف مقامات پر جنّت اور اس کی نعمتوں کا ذکر اس انداز سے فرمایا ہے کہ جیسے آدمی اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا ہو۔ ویسے تو جنت اور اس کی نعمتوں کا ذکر کئی سورتوں میں آیا ہے لیکن ذیل کی سورتوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ اس کا بیان آیا ہے: سورۃ الرحمٰن' سورۃ الواقعۃ' سورۃ الدّھر' سورۃ الغاشیۃ۔ اسی طرح احادیثِ مبارکہ میں بھی تفصیل کے ساتھ جنت کی صفت اور اس کی نعمتوں کا بیان آیا ہے۔

دنیا میں اہلِ جنت کی صفات: ابنِ وہب بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابنِ زید رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کی صفت وحالت بیان کرتے ہوئے فرمایا: اہلِ جنت دنیا میں گریہ زاری کرنے' غم زدہ رہنے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہوتے ہیں جس کے بعد اللہ تعالیٰ اُنہیں آخرت میں خوشیاں اور نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ پھر اُنہوں نے اللہ عزّ وجلّ کا یہ ارشادِ مبارک پڑھا کہ اہلِ جنت کہیں گے:

إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْ أَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ٥ (الطُّور : ۲۶)
''بے شک ہم اس سے پہلے اپنے گھر والوں میں سہمے سہمے رہتے تھے۔''

اور اہلِ جہنم کی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ دنیا میں خوش تھے اور اپنی خوشحالی اور امیری کی ترنگ میں غریب مؤمنوں کا مذاق اُڑاتے اور اُن پر ہنستے تھے۔ اُن کی اس حالت کی بابت فرمایا:

إِنَّهٗ كَانَ فِيْ أَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ٥ إِنَّهٗ ظَنَّ أَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ٥ (الانشقاق : ۱۳، ۱۴)
''بے شک وہ اپنے گھر میں خوش تھا اور سمجھتا تھا کہ اُسے (اپنے رب کی طرف) لوٹنا نہیں۔''

<u>جنّت کے درجات</u>: کے بارے میں سورۃ الرَّحمٰن میں ارشاد ہوا :

(۱) وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ٥ (اَلرَّحمٰن : ۴۶)
''اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے' اُس کے لئے دو جنتیں ہیں۔''

(۲) وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ٥ (اَلرَّحمٰن : ۶۲)
''اور اُن کے سوا دو جنتیں ہیں۔''

''ابنِ جُریج کہتے ہیں کہ یہ چار جنتیں ہیں۔ آیت بالا ۶۲ کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جو شخص اپنے رب کے حضور حساب کے لئے کھڑا ہونے سے ڈرا' اُس کے لئے پہلی دو جنتوں کے علاوہ دو اور جنتیں ہیں جو مرتبہ میں پہلی دو جنتوں سے کم ہیں اور امام الماوردی فرماتے ہیں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ بالائی حصہ میں دو جنتیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے لئے مخصوص ہوں اور زیریں حصہ والی دو جنتیں ان اہلِ جنت کے خدمتگار غلاموں اور حوروں کے لئے ہوں اور وہ جنتیں اس لئے ہیں تاکہ حوریں اور خدمتگار رلڑ کے الگ الگ رہیں اور مرد و زَن کا اختلاط نہ ہو۔''

<u>چاروں جنتوں میں فرق</u> : یہ بھی سورۃ الرحمٰن ہی میں بیان ہوا :
<u>پہلا فرق</u> : پہلی دو جنتوں کی تعریف میں فرمایا :

فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ٥ (اَلرَّحمٰن : ۵۰)
''ان میں دو چشمے جاری ہیں: ایک میٹھے پانی کا' دوسرا شرابِ طہور کا یا یک تسنیم کا دوسرا سلسبیل کا)
اور دوسری دو جنتوں کی تعریف میں ارشاد فرمایا:

فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ٥ (اَلرَّحمٰن : ۶۶)
''ان میں دو چھلکتے ہوئے چشمے ہیں۔'' (یعنی پانی چھلکتا ہوگا' بہتا نہیں ہوگا)

دوسرا فرق : پہلی دو جنتوں کی تعریف میں فرمایا :
فِيهِمَا مِن كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجَانِ ٥ (اَلرَّحْمٰن : ۵۲)
''ان میں ہر میوہ دو قسم کا ہے۔'' (یعنی تازہ اور خشک)
اور دوسری دو جنتوں کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا :
فِيهِمَا فَاكِهَةٌ" وَّنَخْل" وَّرُمَّان" ٥ (اَلرَّحْمٰن : ۶۸)
''ان میں میوے' کھجوریں اور انار ہیں۔'' (یہاں یہ نہیں فرمایا کہ ہر قسم کے میوے)

تیسرا فرق : پہلی دو جنتوں کی تعریف میں ارشاد فرمایا :
مُتَّكِئِينَ عَلٰى فُرُشٍ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ (اَلرَّحْمٰن : ۵۴)
''ایسے بچھونوں پر تکیہ لگائے ہوں گے جن کا اُستر دبیز ریشم کا ہے۔''
اور دوسری دو جنتوں کے وصف میں فرمایا:
مُتَّكِئِينَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ (اَلرَّحْمٰن :۷۶)
''سبز بچھونوں اور منقش چاندنیوں پر تکیہ لگائے ہوں گے۔''

چوتھا فرق : پہلی دو جنتوں میں جو خوبصورت' موٹی موٹی آنکھوں والی گورے رنگ کی حوریں ہیں' اُن کی تعریف میں فرمایا:
كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ٥(اَلرَّحْمٰن : ۵۸)
''گویا وہ (صفائی اور خوش رنگی میں) لعل اور مونگا ہیں۔''
اور دوسری دو جنتوں کے وصف میں فرمایا:
فِيهِنَّ خَيْرَات" حِسَان" ٥(اَلرَّحْمٰن : ۷۰)
''ان میں عادت کی نیک' صورت کی اچھی عورتیں ہیں۔''
(اور ہر خوبصورت کا حُسن اور خوبصورتی یاقوت اور مرجان یعنی لعل اور مونگے کی خوبصورتی اور حسن جیسا تو نہیں ہوسکتا۔)

پانچواں فرق : پہلی دو جنتوں کی تعریف میں فرمایا :
ذَوَاتَا اَفْنَانٍ ٥(اَلرَّحْمٰن : ۴۸)
''بہت سی ڈالیوں والیاں۔'' (اور ہر شاخ پر قسم قسم کے میوے)
اور دوسری دو جنتوں کے وصف میں فرمایا:
مُدْهَآمَّتٰنِ٥ (اَلرَّحْمٰن : ۶۴)
''گہرے سبز رنگ سے سیاہی کی جھلک دے رہی ہیں۔''

''<u>ایک اشکال اور اس کا جواب</u>: کیا وجہ ہے کہ پہلی دو جنتوں کے مکینوں کا تو ذکر کیا گیا لیکن دوسری دو جنتوں میں کون لوگ داخل ہوں گے' اُن کا ذکر نہیں کیا؟ جواب یہ ہے کہ چاروں جنتیں اہلِ خوف ہی کے لئے ہیں مگر یہ کہ ان اہلِ خوف کے مختلف مراتب اور درجات ہوں گے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ پہلی دو جنتیں اُن کے لئے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور حساب کے لئے اُس کے حضور کھڑنے ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے ہیں اور دوسری دو جنتیں اُن بندوں کے لئے ہوں گی جو خوفِ خدا رکھنے والے تو ہیں مگر پہلوں کی نسبت اُن کا مرتبہ کم ہے۔''
(اردو ترجمہ ''سفرِ آخرت کی منازل'' از علامہ غلام نصیر الدین گولڑوی' ج ۲' ص ص ۲۵۲' ۲۵۴' ۲۵۵)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں سو درجے ہیں۔ ان میں سے ہر دو درجوں کے درمیان اِتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔ فردوس سب سے اوپر والا درجہ ہے۔ اس سے اوپر رحمان کا عرش ہے جس سے جنت کی نہریں نکلتی ہیں۔ جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو جنتِ فردوس کا سوال کرو۔ (ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۳۳۱؛ ترمذی رقم الحدیث ۲۵۲۹؛ مسند احمد ج ۵' ص ۳۱۶)

<u>جنت کے ایک درجہ کی وسعت</u>: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنت میں سو درجے ہیں اور ایک ایک درجہ اتنا وسیع ہے کہ اگر تمام جہان اُس کے کسی ایک درجہ میں جمع ہو جائیں تو سما سکتے ہیں کہ اس میں اتنی گنجائش ہے۔ (ترمذی رقم الحدیث: ۲۵۳۲)

<u>جنت کے دروازے</u>: اللہ بزرگ و برتر کا ارشادِ گرامی ہے:

حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (اَلزُّمَر: ۷۳)

''یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور اُس کے دروازے کھلے ہوں گے۔''

جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ گرامی ہے کہ جو شخص اچھی طرح وضو کرے' پھر یہ کلمہ پڑھے: اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ' تو اُس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دئے جاتے ہیں' جس دروازے سے چاہے' جنت میں داخل ہو جائے۔ (صحیح مسلم ج ۳' ص ۱۱۸؛ مسند احمد ج ۴' ص ص ۱۴۶ تا ۱۵۳؛ مستدرک للحاکم ج ۲' ص ۳۹۹؛ ابن حبان ج ۲' ص ۱۹۳)

بعض علماء سے اِن دروازوں کی تعیین کا قول بھی منقول ہے۔ اُنہوں نے اپنے موقف پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے امام مالک نے موطا میں اور امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے جس کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے اپنے مال میں سے ایک جوڑا اللہ کی راہ میں خرچ کیا تو جنت میں اس کے لئے ندا کی جائے گی: اے اللہ کے بندے! یہ نیکی ہے پس جو شخص نمازیوں

میں سے ہوگا اُسے ''باب الصلوۃ'' سے پکارا جائے گا' جو مجاہدوں میں سے ہوگا اُسے ''باب الجہاد'' سے پکارا جائیگا' جو صدقہ دینے والا ہوگا اُسے ''باب الصدقۃ'' سے پکارا جائے گا' جو روزہ داروں میں سے ہوگا' اُسے ''باب الریان'' سے پکارا جائے گا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! کسی شخص کو اِن تمام دروازوں سے پکارے جانے کی ضرورت تو نہیں ہے' پھر بھی کوئی ایسا شخص ہوگا جسے اِن تمام دروازوں سے بلایا جائے گا؟'' فرمایا: ہاں اور مجھے امید ہے کہ تم اُن میں سے ہوگے۔'' (صحیح بخاری ج ۴' ص ۱۱۱؛ صحیح مسلم: کتاب الزکوۃ؛ ترمذی رقم الحدیث ۳۶۷۴؛ مسند احمد ج ۴' ص ۳۸۶؛ مؤطا امام مالک ج ۲' ص ۳۶۹' ابن حبان ج ۱' ص ۲۶۳' البیہقی ج ۹' ص ۱۷۱)

جنت کے دروازوں کی وسعت: حضرت اَنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہِ قدرت میں مجھ محمد کی جان ہے' جنت کے دروازوں کے کواڑوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا فاصلہ مکہ اور مقامِ ہجر کے درمیان' یا مکہ اور مقامِ بصریٰ کے درمیان ہے۔ (صحیح مسلم: کتاب الایمان)

جنت کے درخت: سورۃ الواقعۃ کی آیت ۳۰ وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ (اور ہمیشہ کے سائے میں) کی تفسیر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی علیہ الصلوۃ والسلام کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جنت میں ایک ایسا درخت ہے جس کے سایہ میں ایک سوار ستر (۷۰) یا فرمایا کہ سو (۱۰۰) سال تک چلتا رہے تو وہ سایہ ختم نہ ہو۔ حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ کو جب یہ حدیث پہنچی تو اُنہوں نے فرمایا: یہ سچ ہے' قسم ہے اُس ذات کی جس نے موسیٰ بن عمران پر تورات اتاری اور حضرت محمد مصطفی علیہ التحیۃ والثناء پر قرآن پاک نازل فرمایا ہے' اگر کوئی شخص چار یا پانچ سال کی عمر کے اونٹ پر سوار ہو کر اُس درخت کی جڑ سے سفر کرنا شروع کرے تو اُس کی شاخوں اور اُس کے سایہ کے اختتام تک پہنچ نہیں پائے گا کہ اس کا اونٹ بوڑھا ہو کر گر جائے گا۔ یہ درخت اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ قدرت سے لگایا ہے اور اس میں اپنی طرف سے روح ڈالی ہے اور اس کا احاطہ اور صحن جنت کی چاردیواری سے بھی پرے تک پھیلا ہوا ہے اور جنت کی تمام نہروں کا اصل سرچشمہ یہی درخت ہے اور اسی درخت کے مُڈّ اور جڑ سے سب نہریں پھوٹتی ہیں۔ (صحیح بخاری ج ۶' ص ۳۱۹؛ صحیح مسلم ج ۱۷' ص ۱۶۸؛ ترمذی رقم الحدیث: ۲۵۲۳؛ ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۳۳۵؛ مسند احمد ج ۲' ص ۴۰۴؛ مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۲۰۸۷۶؛ ابن حبان ج ۹' ص ۲۵۰؛ الدارمی ج ۲' ص ۳۳۸؛ حلیۃ الاولیاء ج ۹' ص ۳۰؛ البغوی ج ۱۵' ص ۲۰۷)

جنت کی بیری کا درخت: حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو سدرۃ المنتہیٰ کے ذکر میں یہ فرماتے ہوئے سنا کہ سوار اُس کی شاخوں کے سائے میں سو سال چل

سکتا ہے یا فرمایا کہ اُس کے سائے میں سو (۱۰۰) سوار آرام کر سکتے ہیں۔ اس میں سونے کے (سنہرے) آشیانے ہیں اور اس کے پھل مٹکوں جتنے ہیں (صحیح بخاری ج ا' ص ۴۵۸ ؛ صحیح مسلم' ج ۱۳' ص ۲۱۴ ؛ ترمذی ج ۸' ص ۵۶۳ ؛ نسائی ج ا' ص ۲۱۷ : مسند احمد ج ۳' ص ۱۴۸ ؛ ابن حبان' ج ۹' ص ۲۵۱ ؛ ابن ابی شیبہ رقم الحدیث ۱۵۸۱۲ ؛ دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۲ ص ۳۷۶۔۳۸۲)

حضرت سلیم بن عامر بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ایک دیہاتی بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ایک اذیت دینے والے درخت کا ذکر فرمایا ہے اور میں تو یہ خیال کرتا تھا کہ جنت میں کوئی درخت ایسا نہیں جس سے کسی جنتی کو کوئی تکلیف پہنچے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ کون سا درخت ہے؟ اُس نے عرض کی: بیری کا درخت کہ اُس کے کانٹوں سے اذیت پہنچتی ہے۔ آپ نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: فِیۡ سِدۡرٍ مَّخۡضُوۡدٍ (سورۃ الواقعۃ: ۲۸) ''بغیر کانٹوں والی بیریوں میں''۔ جنت کی بیری کے کانٹے دُور کر کے ہر کانٹے کی جگہ پھل لگا دیا گیا ہے اور اس میں ہر کانٹے کی جگہ پھل ہی نکلتا ہے۔ جنت کی بیری پر مختلف ذائقوں والے بہتر (۷۲) قسم کے پھل پیدا ہوتے ہیں اور ہر قسم کا ذائقہ دوسرے سے الگ ہوگا۔ (مجمع الزوائد للبیہقی' ج ۱۰' ص ۴۱۴؛ حلیۃ الاولیاء ج ۶' ص ۱۰۳)

سورۃ الواقعۃ کی آیات ۳۲' ۳۳ وَفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ ۝ لَّا مَقْطُوعَةٍ وَّلَا مَمْنُوعَةٍ ۝ اور وہ بکثرت پھلوں اور میووں میں (لطف اندوز ہوں گے) جو نہ (کبھی) ختم ہوں گے اور نہ اُن (کے کھانے) کی ممانعت ہوگی'' کا مفہوم یہی ہے کہ وہ پھل اس طرح کم مقدار میں نہیں ہوں گے جس طرح دنیا میں ہوتے تھے اور کسی وقت میں بھی وہ پھل منقطع نہیں ہوں گے۔ جس طرح دنیا میں گرمیوں کے پھل سردیوں میں نہیں ہوتے اور سردیوں کے پھل گرمیوں میں نہیں ہوتے۔ دنیا میں بعض اوقات پھلوں کے حصول سے درختوں کے کانٹے رکاوٹ بنتے ہیں۔ بعض اوقات وہ پھل اس قدر مہنگے ہوتے ہیں کہ انسان کی قوّتِ خرید سے باہر ہوتے ہیں۔ بعض اوقات انسان کی بیماریاں بعض پھلوں کے کھانے سے مانع ہوتی ہیں' جنت میں کسی بھی وقت پھل کو کھانے سے کوئی چیز مانع نہیں ہوگی۔

''جنت کی کھجور جڑ سے شاخوں تک پھل سے لدی ہوئی ہے اور اس کے پھل مٹکوں جتنے ہیں۔ جب اس کا پھل توڑا جائے گا' اُسی وقت اُس کی جگہ دوبارہ پھل لگ جائے گا۔ جنت کا پانی بغیر کھالوں کے بہتا ہے۔ جنت کے پھلوں کے خوشے بارہ ہاتھ کی مقدار کے برابر ہوں گے۔''

''جنت کا درخت طُوبیٰ: حضرت امام باہلی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے۔ جنت کا کوئی گھر ایسا نہیں جس میں اس درخت کی شاخ نہ پہنچتی ہو اور کوئی خوبصورت پرندہ ایسا نہ ہوگا جس کا آشیانہ اس درخت کی شاخوں پر نہ ہو اور کوئی پھل ایسا نہ ہوگا جو طوبیٰ پر لگا ہوا نہ ہو۔'' (''سفرِ آخرت کی منازل''۔۔۔اردو ترجمہ از علامہ غلام نصیر الدین گولڑوی' ج ۲' ص ۲۷۰)

کدو اور تربوز جنتی پیداوار ہیں : ''حضرت علی کرّم اللہ وجہہ' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے علی! تربوز کھایا کرو اور اُسے ایک معمولی چیز نہ سمجھو۔ یہ بڑی عظیم نعمت ہے اور اس کا پانی اور مٹھاس دونوں جنت میں سے ہیں۔ جو شخص اسے ایک بار کھاتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کے پیٹ میں ستر دوائیں داخل فرماتا ہے اور ستر بیماریاں دُور فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر لقمہ کے بدلے اُس کے لئے دس نیکیاں لکھتا ہے' اُس کے دس گناہ مٹا دیتا ہے اور دس درجے بلند فرما دیتا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیتِ مبارکہ تلاوت فرمائی: وَأَنبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّن يَقْطِينٍ (سورہ الصافّات: ۱۴۶) ''اور ہم نے اُس (یونس علیہ السلام) پر کدو کا درخت اُگایا۔'' پھر آپ نے فرمایا: کدو اور تربوز جنت کی ترکاریوں اور پھلوں میں سے ہیں۔

نوٹ: کدو کی بیل ہوتی ہے جو زمین پر پھیلتی ہے مگر یہ یونس علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت تھی کہ اِس بیل کی قد والے درختوں کی طرح شاخ تھی اور اس کے بڑے بڑے پتوں کے سایہ میں آپ آرام فرماتے تھے۔ (''الموضوعات'' لابن الجوزی' ج ۲' ص ۲۸۶' بحوالہ غلام نصیر الدین' ج ۲' ص ص ۲۷۰' ۲۷۱)

جنت کے درختوں کی نوعیت : حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں ہر درخت کا تنا سونے کا ہے۔ (ترمذی رقم الحدیث: ۲۵۲۵ ؛ ابن حبان ج ۹' ص ۲۵۰)

جنتیوں کے لباس : ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱) وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ٥ (سورۃ الحج: ۲۳)
''اور جنت میں اُن کا لباس ریشم کا ہے۔''

(۲) يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّن سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ (الکہف: ۳۱)
''اُس میں اُنہیں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور وہ سبز رنگ کے باریک اور دبیز کپڑے پہنیں گے۔''

(۳) عَالِيَهُمْ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ (الدّھر: ۲۱)
''اُن (جنتیوں) پر باریک ریشم کے اور دبیز ریشم کے سبز کپڑے ہوں گے۔''

''سبز رنگ کو مخصوص کرنے کی وجہ : مفسرین فرماتے ہیں کہ سبز رنگ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ نظر کے لئے موزوں اور اس کے لئے موافق و سازگار رہے۔ سیاہ رنگ غصّہ پیدا کرتا ہے۔ سبز رنگ سیاہ اور سفید دونوں رنگوں کی درمیانی اور اعتدالی کیفیت کا حامل رنگ ہے جس پر نظر ٹھہرتی ہے اور انتشارِ نظر کا موجب نہیں بنتا۔ اس لئے اِس معتدل رنگ کو جنتیوں کے لباس کے لئے خاص کیا گیا ہے۔'' (ایضاً ص ۳۴۳)

جنت کا موسم اور درجہ حرارت : سورۃ الدھر میں ارشادِ پاک ہوا :

لَا یَرَوْنَ فِیْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِیْرًاo (الدھر: ۱۳)

''وہ جنت میں نہ تپش پائیں گے اور نہ سردی۔''

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہاں کا موسم نہ ہی گرم اور نہ ہی سرد ہوگا بلکہ انسان کی حس اور طبیعت کے مطابق و موافق انتہائی خوش کن اور من بھاتا ہوگا۔

جنتیوں کی خوشیوں اور مسرّتوں کے مناظر کا نقشہ قرآن مجید میں حیرت انگیز اور بے مثالی انداز میں کھینچا گیا ہے۔ انہیں وہاں انتہائی پُر اطمینان، پُر امن اور ہر خطرے سے محفوظ دکھایا گیا ہے جہاں وہ کوئی فضول اور تہذیب و اخلاق سے گری ہوئی بات نہیں سنیں گے اور امن کا ماحول پائیں گے۔ ارشادِ پاک ہوا :

(۱) اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍo اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَo وَنَزَعْنَا مَافِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَo لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وَّمَاهُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَo (الْحِجر : ۴۵ تا ۴۸)

''بے شک پرہیز گار باغوں اور چشموں میں (بستے) ہوں گے، (کہا جائے گا کہ) اُن میں سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہوا اور جو کچھ اُن کے دلوں میں کینہ ہوگا، اُسے ہم نکال باہر کریں گے۔ سب بھائی بھائی کی طرح آمنے سامنے تختوں پر براجمان ہوں گے۔ اُس میں نہ اُنہیں کوئی تکلیف چھوئے گی اور نہ وہ اس میں سے (کبھی) نکالے جائیں گے۔'' (۱۵ : ۴۵ تا ۴۸)

(۲) لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِیْهَا بُكْرَةً وَّعَشِیًّاo (مریم : ۶۲)

''اُس جنت میں وہ کوئی فضول بات نہ سنیں گے ہاں البتہ سلام کی آوازیں سنیں گے اور اُنہیں اس میں اُن کا کھانا صبح و شام ملتا رہے گا۔'' (۱۹ : ۶۲)

اردو محاورہ میں صبح و شام سے ایک مراد دوام (ہمیشگی) کی ہوتی ہے نہ کہ طلوع و غروب آفتاب کے دو متعین وقت۔ جنت میں ظلمت ہی سرے سے کہاں ہوگی جس سے یہ متعارف صبح و شام پیدا ہوتے ہیں ع

چسکا پڑا ہے جام کا، شغل ہے صبح و شام کا (ماجدی)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جنتی لوگ جنت میں کھائیں اور پئیں گے، وہ اس میں نہ تو تھوکیں گے اور نہ پیشاب کریں گے، نہ رفع حاجت کریں گے اور نہ ناک صاف کریں گے۔ صحابہ نے عرض کیا: پھر اُن کا کھانا کہاں جائے گا؟ فرمایا: کھانے پینے کے بعد اُن

کے جسم سے پسینہ بہے گا اور اس کے ساتھ ہی اُن کا پیٹ فارغ اور خالی ہو جائے گا۔ (مسند احمد ج ۴ ص ۳۷۱ : سنن دارمی ج ۲ ص ۳۳۴ : ابن ابی شیبہ ج ۱۳ ص ۱۰۸ : حلیۃ الاولیاء ج ۸ ص ۱۱۶)

اہلِ جنت کی خوش عیشی کی تکمیل کے لئے دوسری لذتوں کے ساتھ مواصلت کا ذکر بھی ضروری تھا۔ سورۃ الواقعۃ کی آیات ۳۵ تا ۳۸ میں بتایا کہ جنت کی عورتوں کی (بہ شمول حوراہلِ جنت اور اس دنیا کی جنتی بیویاں) بناوٹ حیرت انگیز ہوگی۔ اُن کا شباب' اُن کا حسن و جمال' دلکشی اور اہلِ جنت کے ساتھ اُن کی ہم عمری یہ سب چیزیں مستقل' پائدار اور دائمی ہوں گی اور اس دنیا کی نعمتوں کی طرح فنا پذیر نہ ہوں گی:۔

إِنَّا أَنشَأْنَاهُنَّ إِنشَاءً ٥ فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًا ٥ عُرُبًا أَتْرَابًا ٥ لِّأَصْحَابِ الْيَمِينِ ٥ (الواقعة:۳۵-۳۸)

''بے شک ہم نے اُن عورتوں کو خاص طور پر بنایا ہے یعنی ہم نے ایسا بنا دیا ہے کہ وہ کنواری رہیں گی اور دائیں والوں کے لئے محبوبہ اور ہم عمر رہیں گی۔'' (۳۵ تا ۳۸ : ۵۶)

اُن کے بارے میں حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے سوال کرنے پر ختمی مرتبت آقا ﷺ نے فرمایا: اے اُمّ سلمہ! ان سے مراد دُنیا ہی کی بیویاں ہیں۔ اگرچہ وفات کے وقت وہ بوڑھی تھیں' اُن کے بال سفید تھے' اُن کی بینائی کمزور تھی' آنکھیں میلی کچیلی رہتی تھیں لیکن جب وہ جنت میں داخل ہوں گی تو ساری ہم عمر ہوں گی۔ (ضیاء القرآن)

عُرُب'' کا واحد عَرُوب'' ہے۔ علامہ قرطبی کہتے ہیں کہ یہ وہ عورت ہے جو ناز و انداز اور خوش گفتاری سے اپنی محبت کا اظہار اپنے خاوند سے کرے۔ یہ عورت کی ایسی صفت ہے جس میں اس کی نسوانیت کی ساری خوبیاں سمٹ آتی ہیں۔ حسین و جمیل بھی ہو' ناز و ادا والی بھی ہو' خوش گفتار بھی ہو' ہنس مکھ بھی اور اپنے خاوند کو دل سے چاہنے والی بھی ہو اور اپنی چاہت کو چھپانے والی نہ ہو بلکہ اس کا اظہار کرنے والی ہو۔'' (ضیاء القرآن' ج ۵' ص ۹۲)

<u>جنتی عورتوں اور حوروں کی پاکیزگی اور اُن کے حسن و جمال کی کیفیت</u> :(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ وہ نجاست سے پاک ہوں گی اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حیض سے' بول و براز سے' ناک کی ریزش سے' منی سے اور بچہ جننے سے وہ پاک ہوں گی۔ (جامع البیان' ج ۱' ص ۱۳۷ مطبوعہ مصر)

(۲) ''امام ابن ابی شیبہ' امام احمد' امام نسائی' امام عبد بن حُمید' امام ابن المنذر اور امام ابن ابی حاتم اپنی اپنی اسانید سے روایت کرتے ہیں کہ اہلِ کتاب میں سے ایک شخص بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوا اور کہا: اے ابوالقاسم! آپ یہ گمان کرتے ہیں کہ اہلِ جنت کھائیں گے' پئیں گے۔ آپ نے فرمایا: اُس ذات کی قسم جس کے قبضہِ قدرت میں میری جان ہے! ایک جنتی کو کھانے' پینے' جماع اور شہوت سے سو دنیاوی آدمیوں کی قوت دی جائے گی۔ اُس نے کہا: جو شخص کھاتا پیتا ہے اُسے رفع حاجت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور جنت تو پاک جگہ ہے وہاں نجاست نہیں ہوتی۔

آپ نے فرمایا: اُن کی رفع حاجت ایک پسینہ نکلنے سے ہوگی جس کی خوشبو مشک کی سی ہوگی اور پسینہ آنے کے بعد اُن کا پیٹ خالی ہو جائے گا۔'' (دُرِّ منثور' ج ا' ص ۴۰ مطبوعہ ایران بحوالہ تبیان القرآن' جلد اوّل' صفحہ ۳۲۰)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جنت میں نور چمک رہا ہوگا۔ مسلمانوں نے پوچھا: یارسول اللہ! یہ کس چیز کا نور ہوگا؟ آپ نے فرمایا: حور اپنے شوہر کو دیکھ کر ہنسے گی تو اُس کے دانتوں سے روشنی پھوٹے گی۔ (تاریخ بغداد لخطیب بغدادی' ج ۱۱' ص ۱۶۳ بحوالہ تبیان القرآن' ج ۱۱' ص ۶۶۰)

حضرت اُنس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بڑی آنکھوں والی حوروں کو زعفران سے پیدا کیا گیا ہے۔ (المعجم الاوسط' ج ۳' ص ۴۷۸)

<u>جس عورت نے دنیا میں متعدد نکاح کئے ہوں وہ آخرت میں کس خاوند کے نکاح میں ہوگی؟</u> جس عورت نے متعدد نکاح کئے ہوں تو ایک صورت یہ ہے کہ ہر خاوند نے اُسے طلاق دے دی ہو اور جب وہ فوت ہو تو وہ کسی کے نکاح میں نہ ہو۔ اس صورت میں اُسے جنت میں اختیار دیا جائے گا کہ جس خاوند کے اخلاق سب سے اچھے ہوں وہ اس سے نکاح کرلے جیسا کہ امّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اُس نے متعدد نکاح کئے ہوں اور آخری خاوند نے اُسے طلاق نہ دی ہو اور وہ اُس کے نکاح میں فوت ہوئی ہو تو اس صورت میں وہ جنت میں آخری خاوند کے نکاح میں ہوگی جیسا کہ حضرت حذیفہ کی حدیث میں ہے۔'' (تبیان القرآن -- علامہ غلام رسول سعیدی' جلد اوّل' صفحہ ۳۲۱)

اِن انعامات کے علاوہ قرآن مجید نے اہلِ جنت کے لئے کچھ اور نوازشات کا بھی ذکر فرمایا مثلاً:
(۱) اُن کے لئے موت نہیں ہوگی اور وہ حیاتِ جاودانی سے حظ اندوز ہوتے رہیں گے۔ (الدُّخان: ۵۶)
(۲) وہ مہذّب گفتگو سے حظ اندوز ہوتے رہیں گے (الرَّعد: ۲۴)
(۳) پرندوں کے گوشت سے لطف اندوزی' لمبے لمبے سایوں' پانی کی آبشاروں' پھلوں کی بہتات میں وہ زندگی بسر کریں گے جو نہ ختم ہوں گے اور نہ اُن سے روکا جائے گا۔ اونچے اونچے پلنگوں پر بستر بچھے ہوں گے (سورۃ الواقعۃ: ۲۱' ۳۰ تا ۳۴)
(۴) بہتی ہوئی شراب سے لبریز' سفید' پینے والوں کے حق میں خوب لذیذ اُن پر جام دَور کرے گا جس سے نہ چکر آئے گا اور نہ اس سے وہ بہکی بہکی باتیں کریں گے۔ (سورۃ الصّافات: ۴۵ تا ۴۷)
(۵) بڑی سے بڑی انفرادی اور مادّی لذّتیں بھی اہلِ جنت کے لئے کافی نہ ہوں گی۔ ہم مشربوں' دوستوں اور عزیزوں کے اجتماع کا لطف ان لذّتوں کو دوبالا کردے گا۔ (سورۃ الصّافات: ۵۰)

(۶) اہلِ جنت سونے کے تاروں سے بنے ہوئے تختوں پر تکیہ لگائے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے' اُن کے پاس لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے' آب خورے' آفتابے اور بہتی ہوئی شراب سے لبریز جام لے کر آمد و رفت رکھیں گے۔ (سورۃ الواقعۃ: ۱۵تا۱۸)

(۷) جنت کے پھلوں کے گچھے جھکا کر نیچے کر دیے جائیں گے تا کہ وہ کھڑے' بیٹھے' لیٹے ہر حال میں بہ آسانی پھل لے سکیں۔ (سورۃ الدھر: ۱۴)

(۸) اہلِ جنت کو پانی کی ضرورت پڑنے پر ایسا نہ ہوگا کہ اپنے بالا خانوں سے نیچے اتر کر اُنہیں مشکیزہ یا گھڑا بھر کر لانا پڑے بلکہ جدھر اشارہ کریں گے' اُس چشمہ کا پانی وہاں بہتا چلا جائے گا۔ کوئی بلندی و پستی' کوئی گڑھا اور وادی اُس پانی کے رواں ہونے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گی۔ (سورۃ الدھر: ۶)

(۹) اہلِ جنت کو ایسی خالص شراب پلائی جائے گی جو سر بمہر کر کے رکھی ہوئی ہے۔ (المطفّفین: ۲۵'۲۶)

حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آیتِ کریمہ خِتَامُہٗ مِسْكٌ کی تفسیر میں فرمایا کہ اس کا مطلب ہے کہ وہ چاندی کی مثل سفید شراب ہے اور پینے والے اس خاص شراب کو سب سے آخر میں پئیں گے۔ اُس کی خوشبو کا یہ عالم ہے کہ اگر دنیا کا کوئی آدمی اس شراب کے مٹکے میں اپنا ہاتھ ڈال کر نکال لے تو دنیا بھر کے ذی روح اُس کی خوشبو محسوس کریں یعنی پوری دنیا' اُس کی خوشبو اپنی لپیٹ میں لے لے اور پورے عالم کی فضا معطر ہو کے رہ جائے۔ اس نتھری ہوئی اور خوشبودار شراب کا ذکر فرمانے کے بعد اُس کے حصول کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ○ (المطفّفین: ۲۶)

''اور للچانے والوں کو اسی پر للچانا چاہیے (دنیا میں نیک کاموں میں سبقت کر کے)

(۱۰) اہلِ جنت کے چہرے بارونق ہوں گے' عالیشان جنت میں وہ اپنی کاوشوں پر خوش ہوں گے۔ جنت میں اونچے اونچے تخت بچھے ہوں گے' ساغر قرینے سے رکھے ہوں گے' گاؤ تکیے قطار در قطار لگے ہوں گے اور قیمتی قالین بچھے ہوں گے۔ (سورۃ الغاشیۃ: ۸' ۹' ۱۰' ۱۳تا۱۶)

<u>جنت کے پرندوں کی کیفیت</u>: سورۃ الواقعۃ کی آیت ۲۱ میں فرمایا: وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ○ ''اور پرندوں کا گوشت بھی ہوگا جس کی اہلِ جنت خواہش کریں گے۔'' اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جنت میں ایک پرندہ ہے جس کے ستر ہزار پَر ہیں۔ وہ آ کر جنتی شخص کے پیالے پر بیٹھ جائے گا' پھر وہ اپنے پَر جھاڑے گا تو اُس کے ہر پَر سے سفید رنگ کے برف کے ذرّات اور اولے نکلیں گے جو مکھن سے زیادہ ملائم اور شہد سے زیادہ میٹھے ہوں گے اور اُس کا کوئی رنگ پرندے کے مشابہ نہیں ہوگا' پھر وہ پرندہ اُڑ کر چلا جائے گا۔'' (الجامع لاحکام القرآن' جز ۱۷' ص ص ۱۸۵' ۱۸۶ ؛ کنز العمال' ج ۱۴' ص ص ۴۶۲' ۴۶۳)

حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص جنت کے پرندوں میں سے کسی پرندے کو کھانے کی

خواہش کرے گا تو وہ پرندہ بھنا ہوا اُس کے ہاتھ میں آ جائے گا۔

حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کوثر کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ وہ دریا ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے (جنت میں) عطا فرمایا ہے۔ اُس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید ہے' شہد سے زیادہ میٹھا ہے' اُس میں ایسے پرندے ہیں جن کی گردنیں اونٹوں سے زیادہ لمبی ہیں۔ اُن کا کھانا بہت اچھا ہے (سنن الترمذی' رقم الحدیث: ۲۵۴۲)۔

یہ حظ اندوزیاں اور شادمانیاں انسانی سوچ اور تصوّر سے ماوراء ہیں خواہ وہ تصوّر کے کتنے ہی گھوڑے کیوں نہ دوڑائے' اُن لطف اندوزیوں تک پہنچ ہی نہیں سکتا جو اہلِ جنت کے لئے چھپا کے رکھی گئی ہیں:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ "مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ○ (السجدة: ۱۷)

''سو کسی کو علم نہیں جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا (سامان) اُن کے لئے خزانۂ غیب میں مخفی ہے' یہ صلہ ہے اُن کے (نیک) اعمال کا۔'' (۳۲ : ۱۷)

حقیقتاً جنت کی نعمتوں کا پورا اندازہ انسان کو اپنے ناسوتی حواس کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطہ سے یہ جو حدیثِ قدسی مختلف طریقوں سے مروی ہوئی ہے کہ قَالَ اللّٰهُ أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ" رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ" سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے صالح بندوں کے لئے وہ وہ نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے' نہ کسی کان نے سنا ہے اور جو نہ کسی انسان کے دل میں گزری ہیں) وہ گویا ٹھیک اِسی آیت کی تفسیر ہے۔

''اہلِ جنت کا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا درجہ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سب سے کم درجے کا جنتی وہ ہوگا جس کے اَسّی ہزار خادم اور بہتر (۷۲) بیویاں ہوں گی۔ (ترمذی رقم الحدیث: ۱۵۶۲؛ مسند احمد ج ۳' ص ۷۶؛ ابن حبان رقم الحدیث: ۲۶۳۸؛ درِّ منثور از جلال الدین السیوطی' ج ۱' ص ۳۹) ابنِ عساکر کا کہنا ہے کہ ان بہتّر میں سے دو بیویاں دنیا کی اور ستّر (۷۰) آخرت کی ہوں گی۔

جنابِ موسیٰ علیہ السلام کے سوال پر کہ جنت میں سب سے بلند درجہ کون سا ہے؟ رب تعالیٰ نے جواب دیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں میں نے پسند کر لیا ہے اور اُن کی عزت و کرامت میں نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہے اور میں نے اُن کی کرامت پر مُہر لگا دی ہے۔ اُن کی کرامت کو کسی آنکھ نے نہ دیکھا ہے' نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ کسی بشر کے دل میں ان کا خیال آیا ہے اور اس کا مصداق اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ہے: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ "مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ ''سو کسی کو علم نہیں جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا (سامان) اُن کے لئے خزانۂ غیب میں مخفی ہے''۔

ایک اُلجھاؤ اور اُس کا سُلجھاؤ : ''اِس باب کی ایک حدیث میں ہے کہ جنتیوں کی کنگھیاں سونے اور چاندی کی ہوں گی اور اُن کی اگربتیاں عُود کی ہوں گی ۔ اب اِشکال یہ ہے کہ جنتیوں کے نہ تو بال بکھریں' اُلجھیں گے' نہ میلے کچیلے ہوں گے کہ اُنہیں سنوارنے اور کنگھا کرنے کی ضرورت پڑے' اسی طرح اُن کا پسینہ خالص مشک ہوگا پھر اُنہیں اگربتیوں اور دھونیوں کی کیا حاجت ہوگی؟ جواب یہ ہے کہ جنت کی یہ ساری نعمتیں اور قسم قسم کے لباس اس لئے نہیں کہ کسی تکلیف اور الم کو دُور کرنے کے لئے ہوں گے بلکہ لذت کے لئے ہوں گے تاکہ وہ نئی نئی لذت اور مزے سے لطف اندوز ہوتے رہیں اور مسلسل اور پے در پے نعمتوں سے حظ اُٹھائیں ۔'' (اردو ترجمہ مولانا غلام نصیر الدین گولڑوی' ج ۲' ص ص ۳۰۲' ۳۰۳)

مذکورہ بالا مادّی حظ اندوزیوں اور مسرّتوں کے علاوہ ایک اور قسم کی مسرت کے حوالہ جات بھی قرآن مجید میں ہیں جو اُن مادّی مسرتوں سے کہیں بڑھ کر اور اعلیٰ و اَرفع ہیں ۔ جنات الفردوس اور جنات النعیم کی لطف اندوزیوں سے بڑھ کر رضا اور خوشنودِ الٰہی ہے جس کا ذکر سورۃ التوبۃ میں یوں ہوا :

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللهِ أَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَالْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ٥ (اَلتَّوبة : ٧٢)

''اور اللہ کی رضامندی سب (نعمتوں) سے بڑھ کر ہے' بڑی کامیابی یہی ہے۔'' (۹:۷۲)

''صوفیائے عارفین نے لکھا ہے کہ جنت میں دیدارِ الٰہی گو ایک عظیم الشان نعمت ہے لیکن یہ لذت تو صرف عاشقوں اور دیدار کرنے والوں کے نقطۂ خیال سے ہے ۔ عاشق کے لئے بے شک دیدارِ محبوب سے بڑھ کر لذیذ نعمت اور کیا ہوسکتی ہے لیکن محبوب کی رضا تو اس سے بھی بڑھ کر لطیف و لذیذ ہے اور محبوبِ حقیقی کی رضا صرف تعمیل احکام اور ادائے فرائض میں ہے ۔'' (ماجدی' حاشیہ صفحہ ۴۱۴ اُردو)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنتیوں کو سلام کا تحفہ : سورہ یٰسٓ میں ارشادِ خداوندی ہے :

سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ٥ (يٰسٓ : ۵۸)

''اُن پر رحمت والے رب کی طرف سے سلام ہوگا ۔''

اس آیت کی تفسیر زبانِ رسالت مآب ﷺ کی طرف سے ملاحظہ ہو: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس وقت اہلِ جنت اپنی نعمتوں کی لطف اندوزیوں میں مشغول ہوں گے کہ اچانک اوپر سے ایک نور چمکے گا ۔ جب وہ سر اٹھا کر دیکھیں گے تو اُنہیں معلوم ہوگا کہ اُن کا ربّ کریم اُن کی طرف نظرِ کرم فرما رہا ہے' ارشاد ہوگا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ اور سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ کا یہی مطلب ہے ۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اُن کی طرف دیکھے گا اور وہ اُس کی طرف دیکھتے رہیں گے ۔ محویت کا یہ عالم ہوگا کہ جب وہ جمالِ حقیقی کا دیدار کر رہے ہوں گے تو جنت کی کسی دوسری نعمت کا اُنہیں خیال تک نہیں

رہے گا یہاں تک کہ حُسنِ حقیقی پردہ فرمائے گا لیکن اس کا نور اور اس کی برکت اُن پر اور اُن کے مکانوں پر ضیاء بار رہے گی۔ (ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۸۴؛ موضوعات لابن جوزی ج ۳، ص ۲۶۱)

قولِ باری تعالیٰ وَلَدَیْنَا مَزِیْد" اور لِلَّذِیْنَ أَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَۃ" کی تفسیر: سورہ قٓ کی آیت ۳۵ اِس طرح ہے: لَهُم مَّا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ" (اہلِ جنت کو وہاں سب کچھ ملے گا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اور بھی بہت کچھ ہے) حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنتی ہر جمعہ کو اپنے رب کریم کا دیدار کریں گے اور وہ کافور کے ایسے ٹیلے پر بیٹھیں گے جس کے کنارے دکھائی نہیں دیں گے اور ان ٹیلوں کے درمیان ایک نہر چلتی ہے جس کے دونوں کنارے مُشک کے ہیں اور نہر کے کنارے بیٹھی اتنی خوبصورت آواز میں قرآن مجید کی تلاوت کرتی ہیں کہ ایسا حُسنِ قرأت کا مظاہرہ کبھی نہ اگلوں نے سنا ہے اور نہ پچھلوں نے۔ پھر جب جنتی اپنے گھر کی طرف چلیں گے تو ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے' موتیوں کے پلوں کو عبور کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوں گے۔''

قیامت کے دن دیدارِ الٰہی کے بارے میں معتزلہ کا موقف یہ ہے کہ چونکہ ذاتِ باری تعالیٰ ایک غیر مادّی ہستی ہے اِس لئے وہ نظر نہیں آ سکتا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کہنا کہ وہ نظر آ سکتا ہے' اُسے انسان کی طرح سمجھنے کے ہم معنیٰ ہوگا (اور نظریہ تجسیمیت Anthropomorphism اسی کا نام ہے)۔ وہ اپنے موقف کی تائید میں سورۃ الانعام کی یہ آیت بھی پیش کرتے ہیں: لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ جس کا معنیٰ وہ غلط طور پر یہ کرتے ہیں کہ آنکھیں اُسے نہیں دیکھ سکتیں جبکہ وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے۔ (اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے)

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ قولِ باری تعالیٰ لِلَّذِیْنَ أَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَۃ" کے بارے میں فرماتے ہیں: ''اس آیتِ کریمہ میں ''زِیَادَۃ'' سے مراد اللہ عزّ وجلّ کی ذات کا دیدار کرنا ہے اور اہلِ جنت کے نزدیک جمعہ کے دن دیدارِ الٰہی کے انعام سے زیادہ محبوب کوئی چیز نہ ہوگی اور اس کا نام ''یومُ المزید'' بھی ہے۔

دیدارِ الٰہی کے متعلق قرآنی آیات: حسب ذیل ہیں:

(۱) وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ (القیامۃ: ۲۲، ۲۳)
''اُس دن کتنے ہی چہرے تروتازہ ہوں گے' اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے۔'' (۲۲، ۲۳: ۷۵)

(۲) كَلَّا إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ ۝ (المطففین: ۱۵)
''بے شک کفار اُس دن اپنے رب کے دیدار سے ضرور محروم ہوں گے۔'' (۱۵: ۸۳)

اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ مسلمان رب کے دیدار سے محروم نہیں رہیں گے۔

(۳) اگر دیدارِ الٰہی ناممکن ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام اللہ سے اُس کے دیدار کا سوال نہ کرتے (بحوالہ سورۃ الاعراف:۱۴۳)
(۴) وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۝ (حٰم السجدة : ۳۱)
"اور تمہارے لئے جنت میں ہر وہ چیز ہے جس کو تمہارا دل چاہے اور اس میں تمہارے لئے ہر وہ چیز ہے جو تم طلب کرو گے۔"

نیک اور صاف دل لوگ جنت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار طلب کریں گے اور اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ جنت میں اُن کی ہر خواہش پوری فرمائے گا' سو یہ آیت جنت میں اللہ تعالیٰ کے دیدار ہونے کی دلیل ہے۔

(۵) لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ (الانعام : ۱۰۳)
"آنکھیں اُس کا اَحاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ آنکھوں کا احاطہ کرتا ہے۔" (۶ : ۱۰۳)

دیدارِ الٰہی کی بابت سیدہ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کا موقف : سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا آیتِ مذکورہ بالا سے استنباط کر کے دیدارِ الٰہی کی قائل نہیں تھیں لیکن ہمارا استدلال اُس قوی حدیث سے ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ کیا تم اس پر تعجب کرتے ہو کہ خُلّت حضرت ابراہیم کے لئے ہو' کلام حضرت موسیٰ کے لئے ہو اور دیدار سیدنا محمد ﷺ کے لئے ہو؟ عکرمہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ کیا سیدنا محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ تو اُنہوں نے کہا: ہاں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کو آقائے ہر جہاں ﷺ نے "حِبرُ الاُمّت" کا لقب عطا فرمایا اور اسی وجہ سے کبار صحابہ تک مشکل مسائل میں اُن کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ اس مسئلہ میں سیدہ عائشہ صدّیقہ کے اختلافِ رائے سے کوئی اثر نہیں پڑے گا کیونکہ سیدہ نے نبی ﷺ سے یہ روایت نہیں کیا کہ آپ نے فرمایا ہو کہ میں نے اپنے رب کو نہیں دیکھا بلکہ اُنہوں نے خود قرآن مجید سے اس مسئلہ کا استنباط کیا ہے اور جب صحابی کا قول کسی دوسرے صحابی کے قول کے خلاف ہو تو اُس کا قول حجت نہیں ہوتا اور جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح سند کے ساتھ رؤیت ثابت ہے تو اس روایت کو قبول کرنا واجب ہے۔
("تبیان القرآن"۔۔۔ علامہ غلام رسول سعیدی' جلد سوئم' ص ۶۲۱)

سورۃ الانعام کی محولہ بالا آیت ۱۰۳ کے جواب میں دیدارِ الٰہی کے ثبوت میں یہ بات بڑی اہم ہے کہ آیت مذکورہ میں لفظ لَا تُدْرِكُ آیا ہے جو 'اِدراک' (بمعنیٰ احاطہ کرنا) سے ہے' نہ کہ لَا تَنْظُرُ۔ اور اس لحاظ سے آیت کا معنیٰ یہ ہو گا کہ آنکھیں اُس کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ ظاہر ہے کہ رب کی ذات ایسی نہیں کہ کسی کے احاطہ میں آ جائے اور یہ معلوم کر لیا جائے کہ رب کا حجم' قد و قامت' ڈیل ڈول اور جسامت وغیرہ کیا ہے کہ یہ بات معبودیت کے خلاف ہے۔ احاطہ کرنے اور دیکھنے میں بڑا فرق ہے۔ لہٰذا "احاطہ کرنا" ہی صحیح ترجمہ ہے۔

احادیث مبارکہ سے ثبوت : حضرت جریر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک آپ نے چودھویں رات کے چاند کی طرف دیکھ کر فرمایا: تم عنقریب اپنے رب کو اس طرح

دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھ رہے ہو۔ تمہیں اس کو دیکھنے سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ (صحیح بخاری ج ۱، رقم الحدیث: ۵۵۴ ؛ صحیح مسلم ؛ سنن ابی داؤد ج ۴، رقم الحدیث: ۴۷۲۹ ؛ سنن ابن ماجہ ج ۱، رقم الحدیث: ۱۷۷)

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے جب اس کی بابت سوال کیا گیا تو اُنہوں نے حضرت ابن عباس کی حدیث کے مطابق بار بار یہی کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی آنکھوں سے اپنے رب کو دیکھا ہے یہاں تک کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی سانس منقطع ہوگئی۔

امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں دکھائی نہیں دیتا کیونکہ وہ باقی ہے اور فانی آنکھوں سے باقی کو نہیں دیکھا جا سکتا اور جب مسلمان آخرت میں پہنچیں گے تو اُنہیں باقی رہنے والی آنکھیں دی جائیں گے تو باقی آنکھوں سے باقی ذات کو دیکھ لیں گے۔

آیا جنت اور جہنم پہلے ہی سے موجود ہیں؟ آدم اور حوّا علیہا السلام چونکہ جنت میں رہتے رہے ہیں اس لئے جنت و جہنم کے وجود کا پہلے ہی سے ہونا ایک کھلی حقیقت اور اٹل صداقت ہے۔

جنت میں سماع کی تحقیق: سورۃ الزُّخرُف کی آیت ۷۰ میں فرمایا:

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ○ (الزُّخرُف: ۷۰)

’’تم اور تمہارے ساتھ جڑے رہنے والے ساتھی (سب) جنت میں داخل ہو جاؤ، تمہاری تکریم کی جائے گی۔‘‘ (۴۳ : ۷۰)

یحییٰ بن ابی کثیر نے کہا کہ وہ جنت میں سماع کریں گے یعنی اُنہیں جنت کے ہر درخت سے تسبیح اور تقدیس کے غنا کی آوازیں سنائی دیں گی۔ امام اوزاعی نے کہا: اللہ کی مخلوق میں حضرت اسرافیل علیہ السلام سے زیادہ کسی کی حسین آواز نہیں ہے اور جب وہ غنا شروع کرتے ہیں تو ساتوں آسمانوں اور زمینوں کی تسبیح اور نماز منقطع ہو جاتی ہے اور جنت کا ہر درخت اُن کے غنا کو دُہراتا ہے اور جنت کی حوریں بھی نغمہ سرا ہوتی ہیں اور پرندے بھی خوش اَلحانی سے گاتے ہیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ فرشتوں کی طرف وحی کرتا ہے کہ اس نغمہ کو دہراؤ اور میرے اُن بندوں کو سناؤ جنہوں نے دنیا میں اپنے کانوں کو مزامیرِ شیطان سے محفوظ رکھا تھا، تو وہ خوش الحانی اور روحانی آوازوں کے ساتھ نغمہ سرا ہوں گے اور حوروں اور فرشتوں کی آوازیں مل کر ایک ہو جائیں گی۔ پھر رب تعالیٰ داؤد علیہ السلام سے فرمائے گا کہ آپ عرش کے پائے کے پاس کھڑے ہو کر میری تمجید کریں اور وہ نہایت خوش گوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تمجید کریں گے جس سے سننے والوں کی لذت دوبالا ہو جائے گی۔ (الجامع لاحکام القرآن، جز ۱۴، ص ۱۳، التذکرۃ فی احوال الموتیٰ وامور الآخرۃ لامام قرطبی مالکی، ج ۲، ص ص ۳۱۵، ۳۱۶)

سلمان کہتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ آیا جنت میں سماع ہوگا ؟ اُنہوں نے کہا: ہاں' ایک درخت ہے جس کی جڑ سونے کی ہے' اُس کے پتے چاندی کے ہیں اور اُس کے پھل موتی' زمرد اور یاقوت ہیں ۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ایک ہوا بھیجے گا جس سے وہ ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے ۔ کسی شخص نے اس سے زیادہ حسین آواز کبھی نہیں سنی ہوگی ۔

جنت الفردوس: لفظ ''فردوس'' فارسی زبان سے لیا گیا ہے ۔ فارسی میں فردوس اُس باغ کو کہتے ہیں جس کے درخت پھیلتے جائیں اور قبطی زبان میں فردوس انگور کی بیلوں کو کہتے ہیں ۔ قاموس اور منتہی الارب میں مذکور ہے کہ فردوس پانی کی اُس چھوٹی سی نہر کو کہتے ہیں جس میں ہر طرف سبزہ اُگا ہو اور جس باغ کے اندر ہر طرح کے پھل اور پھول ہوں ۔ (تاج العروس' ج ۴' ص ۲۰۵ مطبوعہ بیروت)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں سو (۱۰۰) درجے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اُس کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لئے تیار کیا ہے ۔ ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان اور زمین کے درمیان فاصلہ ہے ۔ پس جب تم اللہ سے سوال کرو تو ''الفردوس'' کا سوال کرو کیونکہ وہ جنت کا اوسط ہونے کے لحاظ سے سب سے بلند درجہ ہے ۔ اس کے اوپر رحمٰن کا عرش ہے اور اُس سے جنت کے دریا نکلتے ہیں ۔ (صحیح بخاری' رقم الحدیث ۲۷۹۰ ؛ مسند احمد' رقم الحدیث: ۸۴۰۰)

جنت عدن: کا ذکر سورۃ الرّعد کی آیت ۲۳' سورۃ النّحل کی آیت ۳۱ اور سورہ صٓ کی آیت ۵۰ میں ہوا

جَنّٰتِ عَدۡنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الۡاَبۡوَابُ ○ (صٓ : ۵۰)

''وہ دائمی اقامت کے سدابہار باغات ہیں جن کے دروازے اُن کے لئے کھلے ہوں گے ۔'' (۵۰ : ۳۸)

جنت کے دروازے کھلے رکھنے کے اسرار و نکات: (۱) اہل جنت کو جنتوں کے دروازے کھلوانے کے لئے کسی مشقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور نہ فرشتوں سے اجازت لینے کا مرحلہ پیش آئے گا بلکہ فرشتے اُن کی پیشوائی کے لئے مرحبا اور خوش آمدید کہتے ہوئے اُن کا استقبال کریں گے ۔ (۲) یہ قول اُن کی تعظیم وتکریم کے اظہار کے لئے ہے جیسے کوئی کہے: میرے گھر کے دروازے تمہارے لئے کھلے ہیں ۔ (۳) اس میں متقین کی بلند حوصلہ کی طرف اور نفسانی خواہشوں اور لذتوں سے اُن کے دُور رہنے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جنت کو نفس کی ایسی ناپسندیدہ چیزوں نے گھیرا ہوا ہے کہ اُس میں کسی کے داخل ہونے کی توقع نہیں ہے تو اُن لوگوں کی سیرت کی عمدگی اور پاکبازی کا کیا عالم ہوگا جن کے لئے جنت کے دروازے کھلے ہوئے ہوں گے !

(7) ملائکہ (فرشتے ANGELS) : یہ غیر مادّی زندہ مخلوق ہیں۔ انہیں بولنے اور عقل کی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں۔ وہ نہ تو کھاتے پیتے ہیں، نہ ہی آرام کرتے ہیں اور نہ ہی اپنی نسل بڑھاتے ہیں۔ بعض علماء نے یہ تعریف کی ہے کہ وہ اجسامِ لطیفہ نوریہ ہیں اور مختلف شکلوں میں متشکل ہونے پر سخت اور مشکل کاموں کے کرنے پر اللہ تعالیٰ کے اِذن اور اُس کی اجازت سے قادر ہیں۔ اُن کے بارے میں قرآن فرماتا ہے :

لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ O (التّحریم : ۶)

"وہ کسی بھی امر میں جس کا اُنہیں اللہ حکم دیتا ہے، اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کام انجام دیتے ہیں جس کا اُنہیں حکم دیا جاتا ہے۔" (۶ : ۶۶)

اُن کی تعداد کا اللہ ہی کو علم ہے۔ ہر فرشتے کے ذمّے اللہ نے اپنی اپنی ڈیوٹی سپرد کر رکھی ہے اور اُن کے اختیار و اقتدار کا درجہ بدرجہ نظام وضع کر رکھا ہے۔

سورہ فاطر کی اوّل آیت کی رُو سے فرشتوں کے پَر ہوتے ہیں۔ اُن میں سے کچھ دو دو پروں والے، کچھ تین تین پروں والے اور کچھ چار چار پروں والے ہیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَۃٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ O (فاطر : ۱)

"تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام آسمانوں اور زمینوں کو ابتداءً پیدا کرنے والا (اور) فرشتوں کو رسول بنانے والا ہے جو دو دو، تین تین اور چار چار پروں والے ہیں، وہ اپنی تخلیق میں جو چاہتا ہے، اضافہ فرماتا ہے، بے شک ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔" (۱ : ۳۵)

آیت میں چار سے زائد پَر والے فرشتوں کی نفی نہیں ہے کیونکہ یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ اپنی تخلیق میں جو چاہتا ہے، اضافہ فرما دیتا ہے اور حدیث پاک میں ہے:

"حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا کہ اُن کے چھ سو پَر تھے"۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۴۸۵۶؛ صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۱۷۴؛ سنن الترمذی، رقم: ۳۲۷۷)

جو فرشتے رسول ہیں، اُن کی دو جہتیں ہوتی ہیں: ایک جہت سے وہ اللہ تعالیٰ سے نعمتیں وصول کرتے ہیں اور دوسری جہت سے وہ مخلوق تک اُن نعمتوں کو پہنچاتے ہیں۔

فرشتوں کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ ہیں جو ہر وقت اللہ تعالیٰ کی معرفت میں مستغرق رہتے ہیں جیسا کہ فرمایا:

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ O (الانبیاء : ۲۰)
''وہ رات اور دن اُس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور تھکتے نہیں ہیں۔'' (۲۰ : ۲۱)

اِن فرشتوں کو علّیّین اور ملائکہ مقربین کہا جاتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جو آسمانوں اور زمینوں میں اللہ تعالیٰ کے تکوینی نظام کی تدبیر کرتے ہیں اور اس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی سرِ مُو مخالفت یا نافرمانی نہیں کرتے جیسا کہ سورۃ التّحریم کی آیت ۶ اُوپر بیان ہوئی۔ اِن فرشتوں کو ''مُدَبِّراتُ الامر'' کہا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض فرشتے آسمانوں کے تکوینی نظام کی تدبیر کرتے ہیں اور بعض زمین کے تکوینی نظام کی تدبیر کرتے ہیں۔ (بیضاوی)

محمد رشید رضا اپنی تفسیر ''المنار'' میں لکھتے ہیں :
''سلف صالحین نے فرشتوں کے متعلق یہ کہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ رب تعالیٰ نے اُن کے وجود کی اور اُن کے بعض کاموں کی خبر دی ہے جس پر ہمیں ایمان لانا واجب ہے اور یہ ایمان لانا اُن کی حقیقت کے جاننے پر موقوف نہیں ہے' اس لئے ہم اُن کی حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتے ہیں۔ جب شریعت میں یہ وارد ہے کہ فرشتوں کے پَر ہیں تو ہم اس پر ایمان لاتے ہیں لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ان پروں کی کیفیت کا علم نہیں ہے اور جب شریعت میں یہ وارد ہے کہ فرشتے سمندروں اور سبزہ زاروں میں مقرر کئے گئے ہیں' تو ہم اس پر یہ استدلال کرتے ہیں کہ اس کائنات میں اِس عالمِ محسوس سے زیادہ لطیف ایک اور عالم ہے اور اُس عالم میں فرشتے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں اور عقل کے نزدیک یہ جائز ہے اور وحی اس کی تصدیق کرتی ہے۔'' (المنار' جلد ۱' ص ۲۵۴' مطبوعہ بیروت)

''جو محیر العقول کارنامے فرشتے انجام دیتے ہیں اور ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں آسمان سے زمین پر پہنچ جاتے ہیں اور آسمانوں کی خبریں زمین تک پہنچاتے ہیں' سائنس کی ترقی اور کمپیوٹر کے اِس دَور میں اس کا سمجھنا آسان ہو گیا ہے' جب خلائی سیاروں اور برقی لہروں کے ذریعے ایک برِّ اعظم سے دوسرے بعد برِّ اعظم تک ایک آن میں آواز اور تصویر پہنچ سکتی ہے اور چاند سے زمین پر ٹیلی فون سے گفتگو ہو سکتی ہے تو فرشتوں کے تصرّفات اور نظامِ عالم میں اُن کی تدبیروں کا واقع ہونا اب بعید از فہم نہیں رہا۔'' (تبیان القرآن' ج ۱' ص ۳۴۳)

علاّمہ آلوسی لکھتے ہیں :
''کبھی فرشتے اپنے بدنوں میں ظاہر ہوتے ہیں جنہیں ہر خاص و عام دیکھ لیتا ہے' درآں حالیکہ وہ اپنی صورت پر بھی قائم رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ کہا گیا ہے کہ جبریل علیہ السلام جنابِ دِحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں جب بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوتے تھے تو اُسی وقت سدرۃ المنتہیٰ میں بھی موجود ہوتے تھے اور کامل ولی اللہ بھی اسی طرح ایک وقت میں کئی جگہ موجود ہوتا ہے۔ ہر چند یہ چیز بہ ظاہر عقل سے بعید ہے لیکن میرا اس پر ایمان ہے۔'' (روح المعانی' ج ۱' ص ۲۱۹' بحوالہ ''تبیان القرآن'' ج ۱' ص ۳۴۴)

حسب ذیل آیات میں فرشتوں کی بعض خصوصیات اور افعال کو بیان کیا گیا ہے :

(۱) اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاس (الحج : ۷۵)

''اللہ ہی فرشتوں اور انسانوں میں سے رسولوں کو چن لیتا ہے۔'' (۷۵ : ۲۲)

(۲) اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ O (حٰم السجدة : ۳۰)

''بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پالنہار اللہ ہے' پھر وہ اُس پر مضبوطی سے قائم رہے' اُن پر فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ خوف اور غم نہ کرو اور اُس جنت کی خوشیاں مناؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔'' (۳۰ : ۴۱)

(۳) وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ O (اَلزُّخْرُف : ۸۰) -

''اور ہمارے فرشتے اُن کے پاس لکھ رہے ہیں۔'' (۸۰ : ۴۳)

(۴) فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا O (الذّٰرِيٰت : ۴)

''قسم ہے اُن فرشتوں کی جو کام تقسیم کرنے والے ہیں۔'' (۴ : ۵۱)

(۵) وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا O وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا O وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا O فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا O فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا O (النّٰزِعٰت : ۱ تا ۵)

''اُن فرشتوں کی قسم جو نہایت سختی سے (کافر کی جان) کھینچتے ہیں اور جو بہت نرمی سے (مؤمن کی جان کی گرہ) کھولتے ہیں اور جو (زمین و آسمان میں) سرعت سے تیرتے پھرتے ہیں' اور جو (احکامِ الٰہیہ کی اطاعت میں) پوری قوت سے آگے بڑھتے ہیں اور جو (امورِ تکوینیہ اور نظامِ عالم کی) تدبیر کرتے ہیں۔'' (۱ تا ۵ : ۷۹)

<u>فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں نہیں ہیں</u> : ''جہینہ' خزاعہ' بنو ملیح' بنو سلمہ' عبد الدار وغیرہا دیگر کفارِ مکہ کا یہ عقیدہ تھا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ رب تعالیٰ نے اُن کا ردّ کرتے ہوئے فرمایا کہ (اے محبوب لبیب!) آپ اُن سے پوچھئے کہ آپ کے رب کے لئے تو بیٹیاں ہوں اور اُن کے لئے بیٹے ہوں :

(۱) فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنٰتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ O (اَلصّٰفّٰت : ۱۴۹)

''پس آپ اُن سے پوچھئے کیا آپ کے رب کے لئے بیٹیاں ہیں اور اُن کے لئے بیٹے ہیں۔'' (۱۴۹ : ۳۷)

(۲) وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَ يُسْئَلُوْنَ O (الزُّخْرُف : ۱۹)

''فرشتے جو رحمٰن کی عبادت کرنے والے ہیں' اُن کو اُنہوں نے عورتیں قرار دے دیا۔ کیا اُنہوں نے اُن کے عملِ تخلیق کا مشاہدہ کیا تھا' عنقریب اُن کی یہ شہادت لکھ لی جائے گی اور اُن سے اس کی بازپرس کی جائے گی۔'' (۱۹ : ۴۳)

(۳) اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَلَهُ الاُنثٰی ۝ تِلْكَ اِذًا قِسمَةٌ ضِیزٰی ۝ (النّجم : ۲۱، ۲۲)
"کیا تمہارے لئے بیٹا ہونا چاہئے اور اللہ کے لئے بیٹی! پھر تو یہ بہت ظالمانہ تقسیم ہے۔" (۲۱، ۲۲:۵۳)

فرشتوں کے فرائضِ منصبی : حسبِ ذیل ہیں :

(۱) کچھ فرشتے ہر وقت رب تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس میں مصروف رہتے ہیں (سورۃ الاعراف:۲۰۶)۔
(۲) کچھ فرشتے مسلمانوں کی مغفرت کے لئے دعا گو رہتے ہیں (سورۃ المؤمن : ۷)۔
(۳) کچھ فرشتے روح قبض کرنے پر مقرر ہیں (سورۃ الانعام:۹۳؛ سورہ الم السجدۃ:۱۱)
(۴) کچھ فرشتے لوگوں کے اعمال لکھنے پر مقرر ہیں (سورہ قٓ : ۱۸ ؛ سورۃالانفطار:۱۰، ۱۱)
(۵) مؤمنین کے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت کچھ فرشتے اُنہیں وعدہ شدہ جنت کی خوشخبری سناتے ہیں (سورہ حٰمٓ السجدۃ : ۳۰، ۳۱)۔

افضل الملائکہ حضرت جبریل علیہ السلام کا فرضِ منصبی انبیاء و رُسُل علیہم السلام کے پاس وحیِ الٰہی کا پہنچانا رہا ہے اور وہ سلسلہ خاتم النّبیین ﷺ کے بعد منقطع ہوگیا۔ قرآن مجید میں جبریل علیہ السلام کے کئی نام آئے ہیں:

(۱) جبریل (سورۃالبقرۃ:۹۷، ۹۸) (۲) روح القُدُس (سورۃالبقرۃ:۸۷)
(۳) الرُّوح (النّبا:۳۸؛ القدر:۴) (۴) روح الامین (سورۃالشّعراء : ۱۹۳)

سیّدہ مریم سلام اللہ علیہا کے پاس عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی خوشخبری جبریل علیہ السلام لائے تھے جنہیں سورہ مریم کی آیت ۱۷ میں رُوْحَنَا کے لفظ سے معنون کیا گیا ہے۔

افضل الملائکہ حضرت جبریل علیہ السلام کے علاوہ کچھ اور اہم فرشتے میکائیل علیہ السلام، عزرائیل علیہ السلام اور اسرافیل علیہ السلام ہیں۔ میکائیل علیہ السلام کا نام سورۃالبقرۃ کی آیت ۹۸ میں آیا ہے۔

الملاء الاعلیٰ سے مراد کون سے فرشتے ہیں ؟ سورہ صٓ کی آیت ۶۹ میں فرمایا گیا :

مَا کَانَ لِیَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰی اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ ۝ (صٓ : ۶۹)
"مجھے تو (از خود) عالمِ بالا کی جماعت (ملائکہ) کی کوئی خبر نہ تھی جب وہ (تخلیقِ آدم کے بارے میں) بحث و تمحیص کر رہے تھے۔" (۶۹ : ۳۸)

اَلْمَلَاء کا معنیٰ وہ جماعت ہے جو کسی ایک نظریہ اور ایک رائے پر متفق ہو جائے اور وہ جماعت دیکھنے والوں کے نزدیک عظیم ہو، جب وہ اس جماعت کو دیکھیں تو سیر ہو کر اور نظر بھر کر دیکھیں (المفردات امام راغب)

اور الملاء الاعلیٰ کا معنیٰ ہے بہت بلند اور بہت عظیم جماعت اور اس کا مصداق فرشتوں کی عظیم جماعت ہے۔

یہ ملائکہ مقربین کس چیز میں اور کس سے بحث کر رہے تھے' اس کی دو تفسیریں ہیں:

(1) وہ اللہ تعالیٰ سے بحث کر رہے تھے کہ آدم کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے اور اُسے پیدا کرنے کا کیا فائدہ ہے۔ تیری تسبیح و تقدیس اور تحمید کرنے کے لئے ہم کافی ہیں ۔۔۔۔ الی آخرہٖ ۔(سورۃ البقرۃ:۳۰)

(2) اس کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو اس چیز میں بحث کر رہے تھے کہ وہ کون سے نیک کام ہیں جو گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آج رات میرے پاس خواب میں میرا رب تبارک و تعالیٰ بہت حسین صورت میں آیا اور فرمایا: اے محمد! کیا تمہیں معلوم ہے کہ ملائکہ مقرّبین (الملاء الاعلی) کس چیز میں بحث کر رہے ہیں؟ میں نے کہا: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر اللہ نے اپنا ہاتھ میرے دونوں کندھوں کے درمیان رکھا حتیٰ کہ میں نے اپنے سینے میں اُس کی ٹھنڈک محسوس کی' پھر مجھے اُن تمام چیزوں کا علم ہو گیا جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا: اے محمد! کیا آپ جانتے ہیں کہ الملاء الاعلی کس چیز میں بحث کر رہے ہیں؟ میں نے کہا: جی ہاں! کفارات میں اور نماز کے بعد مسجد میں ٹھہرنا کفارات ہیں' زیادہ قدم چل کر مسجد میں جانا اور تکلیف اور مشقت کے وقت کامل وضو کرنا کفارات ہیں اور جس نے یہ کام کئے' وہ خیریت سے زندہ رہے گا اور خیریت سے مرے گا اور وہ اپنے گناہوں سے اُس دن کی طرح پاک ہو جائے گا جس دن وہ اپنی ماں سے پیدا ہوا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یا محمد! جب تم نماز پڑھو تو یہ دعا کرو: اے اللہ! میں تجھ سے نیکیوں کے کرنے اور برائیوں سے ترک کرنے کا اور مساکین سے محبت کرنے کا سوال کرتا ہوں۔ اور جب تو اپنے بندوں کو آزمائش میں مبتلا کرنے کا ارادہ کرے تو میری روح کو اپنی طرف اُس حال میں قبض کرنا کہ وہ فتنہ میں مبتلا نہ ہو اور فرمایا کہ بلند درجات اِن کاموں سے حاصل ہوتے ہیں: سلام کو پھیلانا' کھانا کھلانا اور رات کو اٹھ کر اُس وقت نماز پڑھنا جب لوگ سوئے ہوئے ہوں۔'' (سنن الترمذی' رقم الحدیث: ۳۲۳۳؛ تفسیر عبدالرزاق' ج ۲' ص ۱۶۹؛ مسند احمد ج ۱' ص ۳۶۸؛ صحیح ابن خزیمہ' رقم الحدیث: ۳۲۰؛ مسند ابن عباس' رقم الحدیث: ۱۳۵۱؛ السنۃ لابن ابی عاصم' رقم الحدیث: ۴۶۹' بحوالہ تبیان القرآن' ج ۱۰' ص ۱۴۲)

شبِ قدر میں فرشتوں کا سلام: مفسرین لکھتے ہیں کہ شبِ قدر میں عبادت کرنے والے انسان کو جس وقت روح الامین آکر سلام کرتا ہے اور اس سے مصافحہ کرتا ہے تو اُس پر خوفِ خدا کی ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے' یادِ خدا سے آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور خشیتِ الٰہی سے بدن کا رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے۔ امام

رازی فرماتے ہیں کہ فرشتوں کا سلام کرنا سلامتی کا ضامن ہے۔ سات فرشتوں نے آکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کوسلام کیا تھا تو اُن پر نارِنمرود سلامتی کا باغ بن گئی تھی۔ شب قدر کے عابدوں پر جب اِس رات لاتعداد فرشتے سلام کرتے ہیں تو کیونکر یہ امید نہ کی جائے کہ نارِجہنم اُن پر سلامتی کا باغ بن جائے گی۔ (تبیان القرآن، ج ۱۲، ص ۸۹۹)

بشر اور فرشتوں میں باہمی افضلیت کی تحقیق : رُسل بشر کی رُسل ملائکہ سے افضلیت، اور عامۃ البشر (یعنی مؤمنین نہ کہ کفار) کی عامۃ الملائکہ سے افضلیت پر حسبِ ذیل دلائل ہیں :۔

(۱) رب تعالیٰ کے حکم کے تحت تمام فرشتوں نے آدم علیہ السلام کی تعظیم وتکریم کے لئے اُنہیں سجدہ کیا اور حکمت کا تقاضا ہے کہ ادنیٰ کو اعلیٰ کی تعظیم کا حکم دیا جاتا ہے۔

(۲) رب تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے اسماء کی تعلیم دی تو اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ آدم علیہ السلام کی تعظیم وتکریم کی وجہ استحقاق بیان کی جائے۔

(۳) سورہ آلِ عمران میں ارشادِ پاک ہوا :

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی آدَمَ وَنُوْحًا وَّآلَ اِبْرٰھِیْمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَی الْعَالَمِیْنَ ٥ (آلِ عمران:۳۳)

"بے شک اللہ نے آدم کو، نوح کو، آلِ ابراہیم کو اور آلِ عمران کو تمام جہان والوں پر فضیلت دی ہے۔"

اور تمام جہانوں میں فرشتے بھی شامل ہیں۔

(۴) انسان میں شہوت اور غضب ہے اور اُسے کھانے، پینے، رہنے اور لباس کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ چیزیں اُسے علمی اور عملی کمال کے حصول سے مانع ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان موانع کے باوجود عبادت کرنا اور علمی اور عملی کمال حاصل کرنا، فرشتوں کی عبادت سے بہت افضل ہے جنہیں عبادت کرنے سے کوئی مانع اور رکاوٹ نہیں ہے۔ اس لئے انسان کا عبادت کرنا فرشتوں کی عبادت کرنے سے بہت افضل ہے۔" (شرح عقائد نسفی ملخصاً، ص ۱۲۶، مطبوعہ کراچی بحوالہ تبیان القرآن، جلد دہم، صفحہ ۵۱۳)

(8) جنّات : علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی (م ۵۰۲ ھ) لکھتے ہیں :

"جن کا اصل معنیٰ ہے: کسی چیز کا حواس سے مخفی ہونا، قرآن مجید میں ہے:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ اللَّیْلُ رَاٰی کَوْکَبًا (الانعام : ۷۶)

"جب رات نے اُسے چھپالیا تو اُس (ابراہیم علیہ السلام نے) ستارہ دیکھا۔" (۶ : ۷۶)

اور حدیثِ مبارکہ ہے: اَلصَّوْمُ جُنَّۃ" (روزہ ڈھال ہے) (صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۷۴۹۲؛ صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۱۱۵۱) غرضیکہ جنات غیر مرئی (نظر نہ آنے والی) مخلوق ہیں۔

قرآن مجید میں جنات کا ثبوت ہے بلکہ پوری سورۃ الجنّ (۷۲) اِنہی کے بارے میں نازل ہوئی اور اس کا بھی ثبوت ہے کہ اُنہیں افعالِ شاقہ پر عظیم قوّت حاصل ہوتی ہے۔ اُن کی مذکر اور مؤنث دونوں جنسیں ہوتی ہیں۔ اُن کی دو اقسام ہوتی ہیں: مؤمن جن جو آسمانی کتابوں بالخصوص قرآن مجید پر ایمان رکھتے ہیں اور کافر جن میں شیطان اور اُس کے چیلے شامل ہیں۔ پہلی قسم کے جنات میں ایک عزازیل نامی جن تھا جسے آدم کو سجدہ نہ کرنے کی حکم عدولی کی پاداش میں "ابلیس" اور "شیطان" کے القاب دیئے گئے۔ بالآخر اُس نے آدم اور حوا علیہما السلام کو شجرِ ممنوعہ کے کھانے کی ترغیب دی۔

کئی مستشرقین کا یہ غلط نظریہ ہے کہ شیطان' آدم کی تعظیم و تکریم نہ کرنے کے باعث جنت سے نکالے جانے سے پہلے فرشتہ تھا ("Islam : Beliefs and Institutions" H. Lammens, p. 99 London, 1968 ; "The Life and Religion of Mohammad --- the Prophet of Arabian Sands"... F.J.L. Menezes, p. 111, London, 1911 ; "Al-Qur'an"-- G. Sale, p. 51, London, 1899)

لیکن قرآن مجید نے سورۃ الکہف کی آیت ۵۰ میں کَانَ مِنَ الْجِنِّ (وہ جنات میں سے تھا) کہہ کر مسئلہ کو حل کر دیا ہے کہ وہ فرشتہ نہیں بلکہ جن تھا۔

کچھ مستشرقین نے ایک دَم سے جنات کے متعلق پُرتخیل نظریہ کو مسترد کر دیا ہے' جس نظریہ کی لغویت "ذہین ذہنوں" میں سما گئی تھی ("Islam and Its Founder"... J. W. Stobart, p. 108)

<u>جنات کی حقیقت</u>: لفظ "جن" کی توضیح میں دو مستند شخصیات کا یہاں حوالہ دیا جاتا ہے:

(۱) اَصْلُ الْجِنِّ سَتْرُ الشَّیْءِ عَنِ الْحَاسَّۃِ اِنَّ الرُّوْحَانِیِّیْنَ ثَلَاثَۃ": اَخْیَار" وَھُمُ الْمَلَائِکَۃُ وَ اَشْرَارُھُمْ وَھُمُ الشَّیَاطِیْنُ وَاَوْسَاط" فِیْھِمْ اَخْیَار" وَ اَشْرَار" وَھُمُ الْجِنّ (مفردات امام راغب)

"جو چیز حواس سے مخفی ہو جن کہلاتی ہے۔ غیر مرئی (نظر نہ آنے والی) مخلوق تین قسم کی ہوتی ہے (۱) جن کی فطرت نیک ہو جیسا کہ فرشتے (۲) جو بدفطرت ہوں جیسے شیاطین اور (۳) اُن میں معتدل قسم کے نیک فطرت اور بدفطرت دونوں ہوتے ہیں اور اسی قسم کا نام جن ہے۔

(۲) اَلْجِنُّ اَجْسَام" ذَاتَ اَرْوَاحٍ كَالْحَيْوَانِ عَاقِلَة" كَالْاِنْسَانِ خُفْيَة" عَنْ اَعْيُنِ النَّاس وَلِذَا سُمِّيَتْ جِنًّا خُلِقَتْ مِنَ النَّارِ كَمَا خُلِقَ آدَمُ مِنْ طِيْنٍ ۔۔۔ تَتَّصِفُ بِالذُّكُوْرَةِ وَالْاُنُوْثَةِ وَ تَتَوَالِدُ وَ الظَّاهِرُ اَنَّ الشَّيْطٰنَ مِنْهُمْ بِخِلَافِ الْمَلَائِكَةِ فَاِنَّهُمْ لَا يُتَّصِفُوْنَ بِالذُّكُوْرَةِ وَلَا بِالْاُنُوْثَةِ وَوُجُوْدِ الْجِنِّ وَالشَّيٰطِيْنِ وَالْمَلَائِكَةِ ثَابِت" بِالشَّرْعِ وَاَنْكَرَهُ الْفَلَاسِفَةُ (تفسیر مظہری)
''جنات کا جسمانی وجود ہے' دوسرے حیوانات کی طرح وہ زندہ مخلوق ہیں' انسانوں کی طرح اُنہیں فہم وعقل حاصل ہے۔ چونکہ وہ انسان کی نظروں سے پوشیدہ ہیں' اس لئے اُنہیں ''جنات'' کہا جاتا ہے۔ آگ سے اُنہیں پیدا کیا گیا ہے جس طرح آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا۔۔ وہ مذکر ومؤنث دونوں طرح کے ہوتے ہیں' بچے پیدا کرنے کی اُن میں صلاحیت ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ شیاطین کا تعلق جنات کی قسم سے ہے۔ رشتے نہ تو مذکر اور نہ ہی مؤنث ہوتے ہیں۔ جنات' شیاطین اور فرشتوں کا وجود شریعت میں ثابت ہے اگر چہ فلاسفر اسے نہیں مانتے۔'' (تفسیر مظہری)

<u>جنات ایک علیحدہ' جداگانہ ہستی ہیں</u> : کچھ جدید قسم کے لوگ جنات کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک جنات ایک وہم اور شگون کے سوا کچھ نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کے لفظ ''جنات'' سے مراد جنگلوں' صحراؤں اور پہاڑوں پر رہنے والے انسانوں کے طبقہ کا نام ہے۔ اُن کی زندگی تنہائی کی ہوتی ہے اور چونکہ وہ عام انسانی آبادی میں نظر نہیں آتے' اسی لئے اُنہیں ''جن'' کہا جاتا ہے۔ کچھ فلسفیوں کے نزدیک جنات سے مراد آدمی میں چھپی ہوئی خصوصیات اور صلاحیتیں ہیں۔

کسی صحیح اور بے خطا نتیجے تک پہنچنے کے لئے ہمیں قرآن مجید کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور دیکھنا ہوگا کہ قرآن حکیم اُن کی حقیقت کی بابت کیا کہتا ہے:

(۱) سورۃ الرحمٰن کی آیات ۱۴' ۱۵ میں فرمایا گیا :

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ O وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ O (الرحمٰن)
''اُسی نے انسان کو ٹھیکری کی طرح بجتے ہوئے خشک گارے سے بنایا اور جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا۔'' (۱۴' ۱۵ : ۵۵)

یہ ظاہر ہے کہ آدم اور جنات کی تخلیق جس مادّے سے کی گئی یعنی خشک گارا اور آگ کا شعلہ' وہ ایک دوسرے سے مختلف ہے تو پھر جنات کو نوعِ انسان میں سے سمجھنا کیا درست ہوگا ؟

(۲) انسانوں اور جنات کے مقصدِ تخلیق کو بیان کرتے ہوئے قرآن نے فرمایا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِO

"اور میں نے تو جنات اور انسان کو پیدا ہی اسی غرض سے کیا ہے کہ وہ میری عبادت کیا کریں۔" (۵۱:۵۶)

اگر جنات انسان کی نوع میں سے ہوتے تو یہاں اُن کا ذکر جداگانہ اور علیحدہ نہ کیا جاتا۔

(۳) قرآنی تعلیمات کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق سے بہت پہلے جنات کی تخلیق ہو چکی تھی۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ شیطان جنات میں سے تھا (سورۃ الکہف: ۵۰) اور آدم کی تخلیق کے وقت اُس کا وجود ثابت ہے۔ رب تعالیٰ کی حکم عدولی کی وجہ سے اُسے راندۂ درگاہ کر دیا گیا۔ لہٰذا تخلیقِ انسان سے قبل اُن کے وجود کے پیشِ نظر اُنہیں نسلِ انسانی میں سے کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے؟

(۴) سورۃ الاعراف میں جنات کی ایک خصوصی کیفیت کی نقاب کشائی کی گئی جو انسانوں میں نہیں پائی جاتی۔ فرمایا:

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (الاعراف: ۲۷)

"بے شک وہ (خود) اور اُس کا قبیلہ تمہیں (ایسی ایسی جگہوں سے) دیکھتا (رہتا) ہے جہاں سے تم اُنہیں نہیں دیکھ سکتے۔" (۷ : ۲۷)

یہ تمام حقائق اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ جنات انسانی معاشرے کے ارکان نہیں بلکہ وہ ایک مختلف' جداگانہ مخلوق ہیں۔

<u>جنات کا قرآن سن کر رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا</u>: سورۃ الاحقاف میں ہے:

وَاِذْ صَرَفْنَا اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَO قَالُوْا يٰقَوْمَنَا اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍO يٰقَوْمَنَا اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍO (الاحقاف: ۲۹ تا ۳۱)

"(یاد کیجئے) جب ہم نے جنوں کی ایک جماعت کو آپ کی طرف متوجہ کیا جو آپ سے قرآن بغور سنتے تھے' پس جب وہ (نبی کے پاس) پہنچ گئے تو (ایک دوسرے سے) کہنے لگے: چپ ہو جاؤ' پھر جب قرآن پڑھا جا چکا تو وہ اپنی قوم کے طرف عذاب سے ڈراتے ہوئے واپس گئے۔ اُنہوں نے کہا: اے ہماری قوم! بے شک ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے' وہ پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی

ہے اور حق اور سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتی ہے ۔ اے ہماری قوم ! اللہ کی طرف دعوت دینے والے کا پیغام مان لو اور اُس پر ایمان لے آؤ' اللہ تمہارے بعض گناہ بخش دے گا اور تمہیں دردناک عذاب سے پناہ دے گا۔'' (۲۹ تا ۳۱ : ۴۶)

جنات کا نمازِ فجر میں رسول اللہ ﷺ سے قرآن سننا : حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ عکاظ کے بازار کا قصد کر کے گئے ۔ اِس اثناء میں شیاطین (جنات) اور آسمان کی خبروں کے درمیان کوئی چیز حائل ہو گئی تھی اور ان کے اوپر آگ کے گولے پھینکے جاتے تھے ۔ پھر شیاطین واپس آجاتے تھے ۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ اب کیا ہو گیا ہے؟ تو اُنہوں نے کہا: ہمارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان وہی چیز حائل ہوئی ہے جو تازہ ظہور میں آئی ہے ۔ تم زمین کے مشارق و مغارب میں سفر کرو اور دیکھو کہ کون سی نئی چیز ظہور میں آئی ہے ۔ وہ روانہ ہوئے اور اُنہوں نے زمین کے مشارق و مغارب میں سفر کیا اور وہ اس پر غور کرتے تھے کہ اُن کے اور آسمان کی خبروں کے درمیان کیا چیز حائل ہوئی ہے ۔ پھر وہ جنات تہامہ میں پہنچے جہاں رسول اللہ ﷺ ایک کھجور کے درخت کے پاس تھے ۔ اُس وقت آپ عکاظ کے بازار میں اپنے اصحاب کو صبح کی نماز پڑھا رہے تھے ۔ جب جنات نے قرآن مجید سنا تو اُنہوں نے کہا: غور سے سنو یہی وہ چیز ہے جو تمہارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان حائل ہوئی ہے ۔ پھر وہ وہیں سے اپنی قوم کی طرف لوٹ گئے اور اُنہوں نے کہا: اے ہماری قوم !

إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًاO يَهْدِىٓ إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًاO (الجن: ۱'۲)

''ہم نے عجیب قرآن سنا ہے جو راہِ ہدایت دکھاتا ہے' تو ہم اُس پر ایمان لے آئے اور ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو ہرگز شریک نہیں ٹھہرائیں گے ۔'' (۱'۲ : ۷۲)

اور رب تعالیٰ نے اپنے نبی مکرّم ﷺ پر یہ آیت نازل فرمائی :

قُلْ أُوْحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ (الجن : ۱)

''فرما دیجئے کہ میری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ جنات کی ایک جماعت نے قرآن نے سنا۔'' (۱:۷۲)

حرفِ آخر (نتیجہ) : غیب پر ایمان لانا آسمانی مذاہب کا بنیادی اصول ہے ۔ ایمان اور کفر کے درمیان یہی امتیازی نشان ہے ۔ یہ عقیدہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ کائنات بظاہر ذی حس انسان کو جس طرح نظر آتی ہے' وہ اس سے بھی کہیں زیادہ وسیع' متنوع اور رنگا رنگی ہے ۔ جو لوگ مافوق الفطرت کو حقیقت کے طور پر نہیں مانتے' وہ خود اللہ کی ذات کے منکر ہیں جس سے وہ اپنے آپ کو رحمت اور ہدایتِ الٰہی سے محروم کر رہے ہیں ۔ یہ راہ نمائی تو ہر وقت اُس کے وفادار بندوں کو ہی ملتی رہتی ہے ۔

(۱۶۷) موسمیات (Meteorology)

''موسمیات کا تعلق فضا اور اس کے مظاہر سے ہے۔ موسمیات بنیادی طور پر مشاہداتی ہے۔ اس کا معلومہ مواد بالعموم پہلے ہی بیان کیا گیا ہوتا ہے۔ ماہرِ موسمیات فضا' اُس کے درجہ حرارت' کثافت' ہواؤں' بادلوں' زمین پر گرتی ہوئی برف اور دیگر خصوصیات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اُس کا مقصد مشاہدہ کئے گئے مواد کی روشنی میں موسم کا پتہ لگانا ہوتا ہے۔ یہ سارا کام خارجی اثر اور طبعیات (فزکس) کے بنیادی اصولوں کے تحت ہوتا ہے۔''
(McGraw-Hill Encyclopedia of Science and Technology, Vol. 8, p. 380)

کرّہِ فضائی (Atmosphere) کے فوائد: کرہ فضائی کی عظیم قدر صرف اس بات میں ہی نہیں کہ زمین پر رہنے والے تمام جانداروں کو سانس لینے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ درجِ ذیل باتوں میں بھی ہے:

(۱) کرہ فضائی حرارت کو باقاعدہ رکھنے (Heat Regulator) کی خدمت انجام دیتا ہے۔ (۲) یہ چھتری کی طرح کام کرتا ہے جو ضرررساں بنفشی شعاعوں (Ultraviolet Rays)' ایکس ریز' سماوی (Cosmic) شعاعوں اور خلائی شہابِ ثاقب (Meteoroids) کے حملوں کے خلاف زمین کی حفاظت کرتا ہے۔ (۳) کرہ فضائی نقل و حمل کے جہاز کی طرح کام کرتا ہے جو اپنی حرکت اور سمندروں کے باہمی تعامل کے ذریعے حرارت' مقدارِ تحرک اور نمی کو اونچی سطحِ مرتفع کے علاقوں اور زمین کے داخلی علاقوں تک لے جاتا ہے تاکہ اُس مادّے کی گردش برقرار رہے جو زمین پر ماحولیاتی توازن (Ecological Balance) کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ (۴) کرہِ فضائی کی بدولت آوازیں سنی جاسکتی ہیں' سورج اور چاند اپنی اپنی روشنی ایک دوسرے سے بڑھ کر دیتے ہیں اور یہ کہ رات کے وقت ستارے آسمان پر چمکتے ہیں۔ (۵) کرہِ فضائی کی بدولت ہم نیلگوں آسمان کے حسن و جمال' شفق کی ملائمت اور آفتاب کے غروب ہونے کی شان و شوکت اور اس کی درخشانی سے حظ اندوز ہوتے ہیں اور الغرض یہ کہ کرہ فضائی کی بدولت زمین' زندگی اور کثیر التعداد پُرعظمت مظاہر کے ساتھ پُر ہے۔

درجہ حرارت (ٹمپریچر): حرارت کو اکثر ٹمپریچر کے ساتھ گڈمڈ کر دیا جاتا ہے جبکہ وہ دونوں بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ حرارت توانائی کی ایک قسم ہے جبکہ ٹمپریچر ایک قسم کی مقدار کا نام ہے۔ اگر ہم جلتی ہوئی دیا سلائی اپنے ہاتھ میں پکڑیں تو اُس کا شعلہ ہماری انگلیوں کو جلا ڈالے گا جس کا مطلب یہ ہے کہ دیا سلائی کا ٹمپریچر بہت بلند ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم اپنے ہاتھ سردیوں میں پانی گرم کرنے والے ریڈی ایٹر پر رکھیں تو انگلیوں کا جلنا محسوس نہ ہوگا۔ یعنی دیا سلائی کا ٹمپریچر ریڈی ایٹر کے ٹمپریچر سے کہیں زیادہ ہے جبکہ اُس کی حرارت ریڈی ایٹر کی حرارت سے خاصی کم ہے۔ حرارت اور ٹمپریچر کا فرق سمجھ لینے کے بعد یہ سمجھنا ضروری ہے کہ کرہِ فضائی کی حرارت کی توانائی انتہائی تیز رفتاری سے حرکت کرنے والے گیس کے ذرّات میں موجود ہوتی ہے۔ اِن

رفتاروں کو بالواسطہ طور پر تھرمامیٹر میں الکوحل اور پارے (مرکری) کے ذریعے معلوم کیا جاسکتا ہے۔
("Meteoroiogy".. Yuan Zhongjia, Trans Zeng Lingsen, pp. 26, 27)China,1985.

کرہ فضائی کا دباؤ: زمان و مکان کے ساتھ کرہ فضائی کے دباؤ کے اختلاف کی بنیاد پر موسمیاتی اسٹیشن روزانہ موسم کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ بالعموم یوں کہئے کہ اگر دباؤ گر جائے تو موسم ابر آلود اور برساتی ہوگا اور اگر دباؤ بڑھ جائے تو موسم صاف اور دھوپ دار ہوگا۔ ماہر موسمیات بیرومیٹر کی ریڈنگ کے ذریعے اور کچھ دیگر متعدد موسمیاتی عناصر کے اختلافات کے حوالے سے موسم کی پیش گوئی کر سکتا ہے۔'' (ایضاً ص ۳۰)

خشکی اور سمندری ہوائیں: ساحلی علاقوں یا بڑے جزیروں میں رہنے والے لوگ بخوبی اس بات کو جانتے ہیں کہ اصولی طور پر یہ ہوائیں سمندر سے خشکی کی طرف دن کے وقت اور خشکی سے سمندر کی طرف رات کے وقت چلتی ہیں۔ رات اور دن میں ہواؤں کی یہ گردش جو کلاک کی طرح باقاعدگی سے چلتی ہے' خشکی اور سمندر کے مابین تھرمل قوت کے اختلاف کے ساتھ مشروط ہے۔ خشکی پر چونکہ دباؤ کم ہوتا ہے' اس لئے دن کے وقت حرارت اور رات کے وقت ٹھنڈک تقریباً ایک ہی تناسب میں ہوتے ہیں جبکہ سمندر میں دباؤ اس قدر اونچا معلوم ہوتا ہے کہ سمندری پانی کا ٹمپریچر چوبیس گھنٹوں میں بہت سست روی سے بدلتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں دن کے دوران خشکی میں چلنے والی گرم تر اور ہلکی تر ہوا اٹھتی ہے جبکہ سمندر سے سرد تر اور کثیف تر ہوا اٹھتی ہے۔ اس طرح سمندری ہوائیں اٹھتی ہیں۔ رات کے وقت یہ عمل الٹ ہوتا ہے۔ (ایضاً' صفحات ۴۱' ۴۲)

پہاڑوں اور وادیوں کی ہوائیں: پہاڑوں اور وادیوں میں دن اور رات کے دوران بالعموم ہوائیں مخالف سمتوں کو چلتی ہیں۔ ان ہواؤں کی تشکیل خشکی اور سمندری ہواؤں کی طرح ہوتی ہے۔ دن کے وقت پہاڑی سطح کی ہوا اپنی آس پاس کی ہوا کی نسبت زیادہ گرم ہو جاتی ہے۔ گرم تر ہوا ہلکی تر ہو کر سطح زمین سے اوپر کو اٹھ جاتی ہے۔ اس دوران وادیوں کے درمیان کی ہوا سرد تر اور کثیف تر ہو کر نیچے بیٹھ جاتی ہے اور اس طرح وادیوں کی ہوائیں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ رات کے وقت پہاڑی سطح کی ہوا ٹھنڈی ہو کر کثیف تر ہو جاتی ہے۔ سرد تر اور کثیف تر ہوائیں وادیوں کی تہوں کی طرف نیچے کو چلتی ہیں اور وادی کی گرم تر اور ہلکی تر ہوائیں اوپر کو اٹھتی ہیں اور اس طرح پہاڑی ہوائیں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔'' (ایضاً' صفحہ ۴۳)

درج ذیل آیات میں قرآن مجید نے جو کچھ کہا ہے' وہ سب انتہائی فصاحت و بلاغت کے ساتھ قدرت کے بوالعجب مظاہر سے متعلق مذکورہ بالا باتوں کو شامل ہے:۔

(۱) ۔۔۔۔ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا وَبَثَّ فِیْھَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ O

"۔۔۔ اُس پانی میں جسے اللہ نے اتارا' پھر اُس سے زمین کو اُس کے مُردہ ہونے کے بعد جِلا اُٹھایا اور اس میں طرح طرح کے حیوانات پھیلا دیئے' اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان مقیّد ہے (ان سب میں) اہلِ عقل کے لئے یقیناً نشانیاں ہیں۔" (۲ : ۱۶۴)

آیت میں مصنوعات سے صانع پر استدلال ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ ان تمام مظاہرِ قدرت میں غور و فکر اور تدبّر کرے کہ یہ تمام چیزیں متغیّر اور حادث (After-created) ہیں اور اُن کا حدوث اس بات کا متقاضی ہے کہ اُن کا کوئی بنانے والا ہونا چاہئے اور چونکہ ان تمام چیزوں کے نظامِ عمل میں انتشار اور اختلاف نہیں ہے بلکہ ہم آہنگی اور وحدت ہے' اس لئے اُن کا بنانے والا بھی واحد ہی ہونا چاہئے۔ پھر ان تمام چیزوں میں جو بے شمار حکمتیں اور فوائد ہیں' اُن کا تقاضا ہے کہ وہ بنانے والا انتہائی علیم اور حکیم ہے اور یہ ساری کائنات کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے اور اس کا نظم اور ربط اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ بالکل صحیح منصوبہ بندی سے وجود میں آئی ہے جس کا کوئی پیدا کرنے والا ضرور ہے۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ ایک معترض نے سوال کیا کہ قرآن کی جامعیت کا دعویٰ ہے تو اُس میں نمک مرچ وغیرہ کھانے کے مسالوں کا ذکر کہاں ہے؟ جواب یہ ہے کہ مَا یَنفَعُ النَّاس کا عموم اِن سب کو شامل ہے۔ (ماجدی)

(۲) وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًاۢ بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ (الاعراف : ۵۷)

"اور وہ وہی تو ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت (بارش) سے قبل خوشخبری کے طور پر بھیجتا ہے۔ چنانچہ جب وہ بھاری بھرکم بادل کو اٹھا لیتی ہیں تو ہم اُسے کسی خشک بستی کی طرف ہانک لے جاتے ہیں' پھر ہم اُس کے ذریعہ سے پانی نازل کرتے ہیں' پھر ہم اُس کے ذریعہ سے ہر طرح کے پھل نکالتے ہیں۔" (۷ : ۵۷)

(۳) وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُ (اَلْحِجر : ۲۲)

"اور ہم ہی پانی سے لدی ہوئی ہواؤں کو بھیجتے ہیں پھر ہم ہی آسمان سے پانی برساتے ہیں پھر وہی پانی ہم تمہیں پلاتے ہیں۔" (۱۵ : ۲۲)

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ بارش بننے کا پہلا مرحلہ "ہوا" ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز تک بارش اور ہوا کے درمیان صرف یہ تعلق معلوم ہو سکا تھا کہ ہوا بادلوں کو دھکیلتی ہے تاہم ہوا کے "بار آوری کے کردار" کا جدید موسمیاتی تحقیق سے پتہ چلا ہے جو بارش برسانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ ("قرآن رہنمائے سائنس"۔ ہارون یحییٰ ص ۱۳۱)

اوپر کی آیت میں فَاَنْزَلْنَا اور فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُ میں حرفِ جارّہ "ف" کی موزونیت پر غور کرنے سے ہواؤں کا

بارش کے ساتھ تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ لَـوَاقِـح جو لَاقِـح کی جمع ہے' لَـقَـحَ سے ہے بمعنی بار آور کرنا جو نر درخت کے زرگل (Pollen) کو مادہ درخت کے نیچے کے خلا (Ovary) میں داخل کرنے سے ہوتا ہے۔ ہوا اس عمل کو کئی پھولوں کے لئے کرتی ہے۔ یہاں ایک نمایاں استعارہ کے ذریعے ہواؤں کی بار آور کرنے کی خصوصیت کو بادلوں کی طرف منتقل کیا گیا ہے جو بارش کے ذریعے ہر قسم کے پھل' غلّہ اور سبزیات کو اُگاتے ہیں۔ بہ حیثیت بخارات کے بادلوں کو ہواؤں کی کارستانی بتایا گیا ہے۔ جو فضائی روؤں کو قائم رکھتی ہیں جس کے نتیجے میں بارش کا نزول ہوتا ہے۔'' (یوسف علی' نوٹ : ۱۹۶۰)

(۴) وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَأَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ O
(المؤمنون : ۱۸)

''اور ہم نے اندازہ کے ساتھ آسمان سے پانی برسایا' پھر ہم نے اُسے زمین میں ٹھہرایا اور ہم اس کے معدوم کرنے پر بھی قادر ہیں۔'' (۱۸ : ۲۳)

''بارش بالعموم مقدارِ معیّن و مناسب میں اور وقتِ مناسب پر ہوتی ہے۔ وہ کچھ تو زمین کے بالائی پرت میں جذب ہو جاتی ہے اور بلندی پر واقع تمام مقامات میں کافی عرصے تک باقی رہتی ہے۔ وہ زمین کے بالائی پرت کی کئی تہوں میں جذب ہو کر داخل ہوتی ہے اور طبعی جغرافیہ کی تعمیر کی تشکیل کرتی ہے۔ زمین کے بالائی حصّوں کی قوتِ حفاظت ہندوستان جیسے اُن علاقوں میں بھی دریاؤں کی دائمی روانی کو قائم رکھتی ہے جہاں برسات موسمی اور سال کے کچھ مہینوں تک محدود ہوتی ہے۔ ایک اور صورت جس میں بارش مقدارِ معیّن کے مطابق نازل ہوتی ہے' برف اور اولوں کی ہے اور ان کا بھی ہوا اور زمین کے بالائی پرت کے بے جا صَرف سے گریز میں ایک مقام ہے۔ اگر بلند و بالا پہاڑی مقامات میں برف اور گلیشیئر نہ ہوتے تو کچھ دریا طغیانی کے ساتھ نہ بہہ سکتے۔ اگر نکاسیِ آب اور اس طرح آبیات کا صاف ہونا نہ ہوتا تو سیلابوں اور سیم زدہ زمینوں کا سامنا ہوتا جیسا کہ اُن مقامات پر ہوتا ہے جہاں فطرت کے عمومی عوامل میں عارضی طور پر رکاوٹ ہو جاتی ہے۔ یہ صورتِ حال بارش کے مقدارِ معیّن میں نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ اِن غیر عادی اور غیر طبعی حالات کا بھی ایک مقام ہے اور انسان کو اللہ تعالیٰ کے غیر مختتم اور عظیم پیمانے پر انعامات و نوازشات کا شکر گزار ہونا چاہیے۔'' (ایضاً' نوٹ: ۲۸۷۸)

مَـآءً بِـقَـدَرٍ یعنی اندازے کے مطابق بارش اتارنے کا مطلب یہ ہے کہ نہ اتنا زیادہ کہ تمام اہلِ زمین سیلاب اور طوفان کی زد میں آ جائیں اور نہ اتنا کم کہ وہ زمین کی پیداوار اور دیگر ضروریات کے لئے ناکافی ہو۔

''ہم تمہاری ضروریات کے مطابق بارش برساتے ہیں۔ اس سے تمہاری کھیتیاں سیراب ہوتی ہیں' تمہارے پینے کے لئے تالابوں میں پانی جمع ہو جاتا ہے لیکن جو تمہاری وقتی ضروریات سے بچ جاتا ہے وہ ضائع نہیں ہوتا بلکہ ہم اُسے اپنے مخفی ذخیروں میں جمع کر لیتے ہیں اور تم ہر وقت اُن سے مستفید ہوتے رہتے ہو۔ یہ کنویں' یہ

ٹیوب ویل' یہ دریا' یہ چشمے جن سے تم اپنی ضروریات پوری کرتے ہو' اُن میں ہمارے انہی مخفی آبی ذخیروں ہی سے تو پانی آ رہا ہے۔ میدانوں اور صحراؤں کو تو رہنے دو' ذرا پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر جا کر دیکھو' ہم نے کس طرح پانی کی بہم رسانی کا وہاں مکمل انتظام کر رکھا ہے۔ وہاں تم کنواں کھود کر یا ٹیوب ویل لگا کر زمین کے شکم سے پانی نہیں نکال سکتے اور کوئی نہر جاری نہیں کر سکتے۔ اگر خالقِ کائنات علیم و قدیر نہ ہوتا تو وہاں پانی مفقود ہوتا اور پانی کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہاں انسانی' حیوانی اور نباتاتی زندگی کا نام و نشان تک نہ ہوتا۔ یہ ہماری حکمت اور علم کا کتنا بڑا کرشمہ ہے کہ پانی جو ہمیشہ نشیب و پستی کی طرف بہتا ہے' ہزاروں فٹ کی بلندی پر ہماری واٹر سپلائی سکیم کے تحت نصب کئے ہوئے فواروں سے کس زور شور اور کثرت سے اُبل رہا ہے کہ وہاں کی ضروریات پوری ہونے کے بعد وہ دریاؤں کی شکل اختیار کر کے میدانی علاقوں میں بہتا ہوا آ نکلتا ہے اور جہاں جہاں سے دریا گزرتے ہیں' لاکھوں ایکڑ رقبہ سیراب ہوتا جاتا ہے۔'' (''ضیاء القرآن''۔ جسٹس کرم شاہ الازہری' جلد سوم' صفحہ ۲۴۹)

کچھ ہوائیں بارآوری کے قابل نہیں ہوتیں (Non-fertilizing) بلکہ وہ زمین کی پیداواری صلاحیت کے لئے مضر ہوتی ہیں۔ انہی ہواؤں کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہوا :۔

وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ O (اَلرُّوم : ۵۱)

''اور اگر ہم (خشک) ہوا بھیج دیں اور وہ (اپنی) کھیتی کو زرد ہوتا ہوا دیکھ لیں تو اُس کے بعد وہ (پہلی تمام نعمتوں سے) کفر کرنے لگیں گے۔'' (۵۱ : ۳۰)

طوفانی آندھی (Typhoon): یہ سخت قسم کی آندھیاں سمندر سے اٹھتی ہیں اور اکثر موسم گرما اور خزاں میں چلتی ہیں۔ سمندر پر ہیبت ناک لہریں اٹھتی ہیں جس سے زمین پر خوفناک ہوائیں اور موسلا دھار بارشیں برستی ہیں اور انسانی زندگی' اَملاک و جائداد اور لوگوں کی اقتصادی سرگرمی کو سخت نقصان پہنچاتی ہیں۔ زمین کی مزاحمت (رگڑ ائی) درمیان میں رکاوٹ بننے کے باعث خشکی پر ان طوفانی آندھیوں کی رفتار بالعموم ساٹھ میل فی سیکنڈ سے کم ہوتی ہے لیکن اُن سے علاقہ بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ طوفانی آندھیوں سے متاثرہ علاقوں میں ہوا کا دباؤ بہت کم ہوتا ہے۔ (ایضاً صفحات ۵۰' ۵۲' ۵۳)

قرآن مجید سرد ہواؤں (Bora)' بگولا نما آندھیوں (Tornadoes) اور طوفانی آندھیوں (Typhoons) کے متعلق درج ذیل آیات میں بتاتا ہے :

(۱) مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ (ابراهيم)

''جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا' اُن کی مثال یہ ہے کہ اُن کے اعمال (اُس) راکھ کی مانند ہیں جس پر تیز آندھی کے دن سخت ہوا کا جھونکا آ گیا۔'' (۱۸ : ۱۴)

(۲) اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا O

اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَکُمْ فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰی فَیُرْسِلَ عَلَیْکُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیْحِ فَیُغْرِقَکُمْ بِمَا کَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَکُمْ عَلَیْنَا بِهٖ تَبِیْعًاO (بنی اسرائیل : ۶۷، ۶۸)

"کیا تم اس بات سے بے خوف ہو گئے ہو کہ وہ تمہیں خشکی کے کنارے پر ہی (زمین میں) دھنسا دے یا تم پر پتھر برسانے والی آندھی بھیج دے، پھر تم اپنے لئے کوئی سازگار نہ پاؤ گے۔ یا تم اس بات سے بے خوف ہو گئے ہو کہ وہ تمہیں دوبارہ اس (سمندر) میں پلٹا کر لے جائے اور تم پر کشتیاں توڑ دینے والی آندھی بھیج دے، پھر تمہیں اُس کفر کے باعث جو تم کرتے تھے (سمندر میں) غرق کر دے، پھر تم اپنے لئے اس (ڈبونے) پر ہم سے مؤاخذہ کرنے والا کوئی نہیں پاؤ گے۔" (۱۷ : ۶۷، ۶۸)

(۳) فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْۤ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِیْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰی وَهُمْ لَا یُنْصَرُوْنَO (حٰمٓ السجده : ۱۶)

"سو ہم نے اُن (قومِ عاد و ثمود) پر منحوس دنوں میں خوفناک تیز و تند آندھی بھیجی تاکہ ہم اُنہیں دنیوی زندگی میں ذلت کے عذاب کا مزہ چکھائیں اور آخرت کا عذاب تو سب سے زیادہ ذلت انگیز ہوگا اور اُن کی کوئی مدد نہ کی جائے گی۔" (۴۱ : ۱۶)

(۴) فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِیَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ رِیْحٌ فِیْهَا عَذَابٌ اَلِیْمٌO تُدَمِّرُ کُلَّ شَیْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا یُرٰۤی اِلَّا مَسٰکِنُهُمْ کَذٰلِکَ نَجْزِی الْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَO (الاحقاف : ۲۴، ۲۵)

"پھر جب اُنہوں (قومِ عاد) نے اِس (عذاب) کو بادل کی طرح اپنی وادیوں کے سامنے آتا ہوا دیکھا تو کہنے لگے: یہ (تو) بادل ہے جو ہم پر برسنے والا ہے۔ (ایسا نہیں) وہ (بادل) تو وہ (عذاب) ہے جس کی تم نے جلدی مچا رکھی تھی۔ (یہ) آندھی ہے جس میں دردناک عذاب (آرہا) ہے۔ (جو) اپنے پروردگار کے حکم سے ہر شے کو تباہ و برباد کر دے گی، پس وہ یوں تباہ ہو گئے کہ اُن کے (مسمار) گھروں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ ہم مجرم لوگوں کو اِسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔" (۴۶ : ۲۴، ۲۵)

(۵) فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِکُوْا بِالطَّاغِیَةِO وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِکُوْا بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِیَةٍO سَخَّرَهَا عَلَیْهِمْ سَبْعَ لَیَالٍ وَّثَمٰنِیَةَ اَیَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَی الْقَوْمَ فِیْهَا صَرْعٰی کَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَةٍO فَهَلْ تَرٰی لَهُمْ مِّنْ بَاقِیَةٍO (اَلْحَآقّة : ۵ تا ۸)

"پس قومِ ثمود کے لوگ! تو وہ حد سے زیادہ کڑک دار چنگھاڑ والی آواز سے ہلاک کر دیئے گئے۔ اور رہے قومِ عاد کے لوگ تو وہ (بھی) ایسی تیز آندھی سے ہلاک کر دیئے گئے جو انتہائی سرد نہایت گرجدار

تھی۔ اللہ نے اُس (آندھی) کو اُن پر مسلسل سات راتیں اور آٹھ دن مسلط رکھا۔ سو (اے مخاطب!) تو اُن لوگوں کو اس (عرصہ) میں (اس طرح) مرے پڑے دیکھتا (تو یوں لگتا) گویا وہ کھجور کے گرے ہوئے درختوں کی کھوکھلی جڑیں ہیں، سو تو کیا اُن میں سے کسی کو باقی دیکھتا ہے۔'' (۶۹ : ۵ تا ۸)

برف باری اور اولے (Precipitation): درج ذیل آیت کا موضوع بارش، برفباری اور اولے (Precipitation) اور گلیشیروں یعنی برف زاروں کی اندرونی حرکیات و اثریات کا علم (Glaciology) ہیں جو علم الماء (ہائیڈرالوجی) کے نظام کا ایک اور لازمہ ہیں کیونکہ برف زار برف کو پگھلا کر بڑے بڑے دریاؤں کی طرف پانی کو بھیجنے کا کردار ادا کرتے ہیں۔''

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يُزْجِي سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهُ ثُمَّ يَجْعَلُهُ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَصْرِفُهُ عَنْ مَنْ يَشَاءُ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ يَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ (النور : ۴۳)

''(اے مخاطب!) کیا تجھے یہ علم نہیں کہ اللہ ایک اَیک بادل کو چلاتا رہتا ہے، پھر اُسے باہم ملا دیتا ہے پھر اُسے تہہ بہ تہہ کر دیتا ہے، پھر تو بارش کو دیکھتا ہے کہ وہ اس کے بیچ میں سے نکل کر آتی ہے۔ اور اسی بادل سے یعنی اس کے بڑے بڑے حصّوں میں سے وہ اولے برساتا ہے، پھر اُنہیں جس پر چاہتا ہے گراتا ہے اور جس سے وہ چاہتا ہے، ہٹا دیتا ہے۔ قریب ہے کہ اس کی بجلی کی چمک آنکھوں کی بینائی کو لے جائے۔'' (۲۴ : ۴۳)

''مشہور یہ ہے کہ جب بخارات اوپر چلے جاتے ہیں اور حرارت سے تحلیل نہیں ہوتے تو وہ سخت ٹھنڈک والی ہوا کے طبقہ میں پہنچ جاتے ہیں جہاں پر درجہ حرارت منفی 50 درجہ سینٹی گریڈ سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ وہاں پر وہ بخارات منجمد ہو کر بادل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ پھر اگر وہاں زیادہ ٹھنڈک نہ ہو تو وہ بادل قطرہ قطرہ ہو کر گرنے لگتے ہیں اور یوں بارش ہوتی ہے اور اگر ٹھنڈک اجزائے بخاریہ کے جمع ہونے سے پہلے پہنچ جائے تو پھر برفباری ہو جاتی ہے اور اگر اجزائے بخاریہ کے جمع ہونے کے بعد ٹھنڈک پہنچے تو پھر ژالہ باری ہوتی ہے۔'' (تبیان القرآن ---علامہ غلام رسول سعیدی، ج ہشتم، ص ۱۶۱)

ایک مناسب وقت پر مناسب موسم میں بادل کو پیدا کرنا، ایک مناسب بلندی پر لے جانا، ہوا میں مناسب حال تغیرات پیدا کرنا، بادل کے منتشر ٹکڑوں کو اوپر نیچے جمع کر کے اُنہیں گھنگھور گھٹا کی شکل میں تبدیل کر دینا، پھر ایک مناسب مقدار میں مناسب مدت تک بارش کرتے رہنا، یہ سب کام اُسی صانع مطلق و حکیم برحق کے ہیں۔

''محبینِ فطرت، فنکار یا بادلوں کا مشاہدہ کرنے والے بادلوں کے اس قرآنی بیان کو دادِ تحسین دیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔۔ پتلے پتلے بادل انوکھی وضع کی مختلف صورتوں میں تیرتے ہوئے، آپس میں جڑتے ہوئے، اپنے

مرکزی حصے اور جسمانی وجود کو ساتھ لئے ہوئے' اور پھر بھاری بھرکم بادلوں کی شکل اختیار کئے ہوئے' ایک دوسرے کے اوپر انبار اور ڈھیر لگے ہوئے جو گاڑھے اور ٹھوس ہو کر کس شان سے بارش برساتے ہیں۔ پھر بالائی مقامات پر بھاری' سیاہ بادل جن سے اولے برستے ہیں' کیسے نمایاں' ممتاز اور ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوتے ہیں! وہ حقیقت میں پہاڑوں کے تودے لگتے ہیں۔ اور جب اولے نیچے گرتے ہیں تو آس پاس کی جگہ کیسی ٹھنڈی پڑ جاتی ہے! کچھ مقامات پر تو وہ پڑتے ہیں اور کچھ مقامات پر باوجود اُن کے باہم جڑے ہوئے ہونے کے' نہیں پڑتے۔ اور گرجتے بادلوں سے برقِ آسمانی سے آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والی روشنی کیسی ہوتی ہے! اس کتابِ فطرت میں کیا ہم قوّت والے' مہربان و رحیم خدا کا (غیر مرئی) ہاتھ نہیں دیکھتے؟'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ :۳۰۱۹)

اولوں اور برفباری کی کئی شکلیں ہیں یعنی بارش' بوندا باندی' برفباری' برف کے گولے' برفانی دانے' ژالہ باری' کُہر (Rime) وغیرہ۔

بارش سے تو ہم کافی حد تک مانوس ہیں اور وہ ہماری جانی پہچانی ہے۔ وہ ان بادلوں سے اترتی ہے:
Cumulo-nimbus Clouds, Alto-stratus clouds, Strato-cumulus Clouds, Nimbo-stratus clouds.
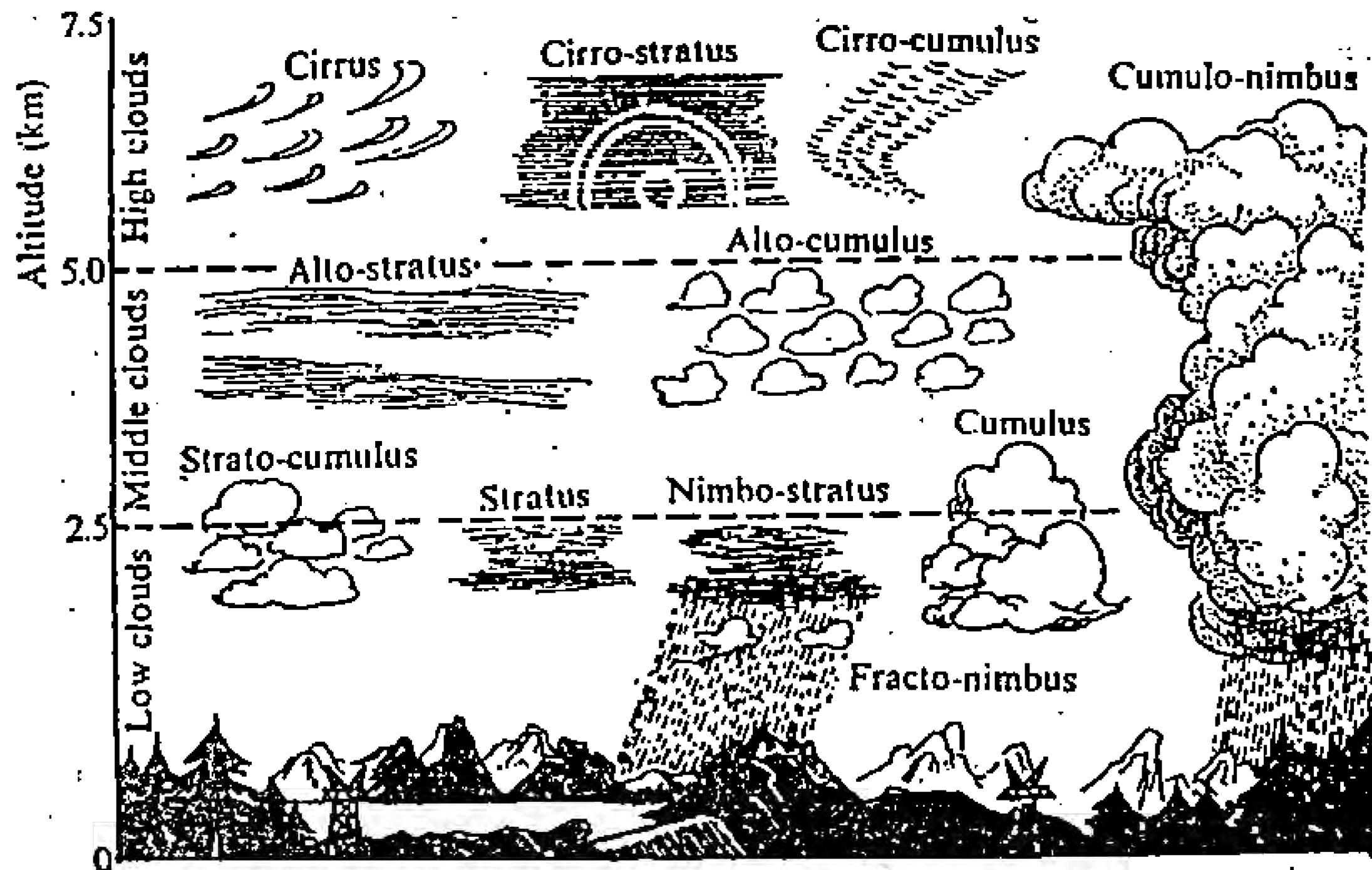
Fig Classification of clouds

''بارش کے قطروں کا حجم 0.5 سے 6.0 ملی میٹر کے درمیان ہوتا ہے۔ 6.0 ملی میٹر سے بڑے قطرے زمین پر شاذ و نادر ہی دیکھے جاتے ہیں کیونکہ زمین پر گرتے ہی وہ یا تو بہ آسانی ٹوٹ جاتے ہیں یا عملی طور پر وہ اتنے بڑے حجم میں بالکل ہوتے ہی نہیں۔''

''بونداباندی اپنے حجم میں 0.5 ملی میٹر سے کم چھوٹے چھوٹے قطروں کی ہوتی ہے۔اپنے حجم میں ایک جیسے اوراپنی مقدار میں چھوٹے ہوتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر ہوا اُنہیں اپنے ساتھ لے آتی ہے۔وہ بالعموم گھنے اورتہ کی صورت میں پھیلے ہوئے اُن بادلوں سے اترتی ہے جن کی نچلی سطحیں بعض اوقات اس قدر نیچی ہوتی ہیں کہ وہ زمین کو چھورہی ہوتی ہیں۔بونداباندی سے واقع ہونے والی ژالہ باری کے قطرے اگر مسلسل ایک گھنٹہ بھی نیچے گرتے رہیں تو وہ ایک ملی میٹر سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔''

''برف نیم شفاف' ٹھوس قسم کی' نہایت عمدہ اوردیکھنے میں حسین وجمیل ہوتی ہے۔'' (ایضاً' ص ۷۸۔۸۰)

''آسمانی بجلی کا کوندنا (Lightning): یہ انتہائی اونچے درجے کی وولٹیج کا برقیاتی شعلہ ہوتا ہے جو بالعموم چند میل لمبا زمین کے کرہ فضائی میں واقع ہوتا ہے۔یہ طوفانِ بادوباراں کے Cumulo-nimbus بادلوں میں الیکٹرک چارج کے ذریعے پیدا ہوتی ہے۔اس کی توانائی ایک ہزار ملین (=ایک ارب) جُول ہوتی ہے یا یوں سمجھئے کہ ایک عام قسم کے کمرے میں تقریباً دو ہفتے ایئر کنڈیشنر چلتے رہنے میں جتنی توانائی خرچ ہوتی ہے۔''

''آسمانی بجلی بارش برسنے' برف سازی' بگولا نما آندھی (عاصفہ) کو توانائی مہیا کرنے اور فضائی نائٹروجن کے تعیّن میں کرداراداکرتی ہے۔آسمانی بجلی سے لگنے والی آگ سے جنگل کے جنگل اجڑ جاتے ہیں جس سے چٹیل (بےآب وگیاہ) میدان رہ جاتے ہیں۔''(Encyclopedia Americana, Vol. 17, p. 472)

''آسمانی بجلی کے کوندنے کے اثرات: آسمانی بجلی کا کوندنا اکثر خطرناک ہوتا ہے تاہم ایک لحاظ سے انسان کے لئے اُس کا فائدہ بھی ہے۔وہ اُن اُگنے والوں پودوں کو خوراک مہیا کرتی ہے جنہیں نائٹروجن کی ضرورت ہوتی ہے۔آسمانی بجلی کا عنصر پودوں کی جڑوں میں جذب ہوجاتا ہے' خالص شکل میں نہیں بلکہ نائٹروجن میں شامل مرکبات کے ذریعے جنہیں ''نائٹریٹ'' کہا جاتا ہے۔فضا میں نائٹروجن بکثرت ہوتا ہے لیکن وہ پودوں کے لئے اس وقت تک بےکار ہے جب تک وہ نائٹریٹ پیدا کرنے کے لئے دوسرے عناصر سے مل جل نہ جائے جو ایک مشکل کام ہے۔آسمانی بجلی کا ہر دفعہ چمکنا فضا میں نائٹروجن کی ایک خاص مقدار کا آکسیجن سے ملنے کے لئے سبب بنتا ہے۔آسمانی بجلی کے کئی بار چمکنے سے نائٹریٹ کی شکل میں پودوں کو اُتنی نائٹروجن مہیا ہوجاتی ہے جسے وہ جذب کرسکتے ہیں۔''(The New Book of Popular Science, Vol 2, p. 143)

آسمانی بجلی نے جس کا ذکر سورۃُ البقرۃ کی آیات ۱۹' ۲۰ میں' سورۃ الرَّعد کی آیات ۱۲' ۱۳ میں اور سورۃ

النُور کی آیت ۴۳ میں ہے، مصنوعی بجلی (الیکٹریسٹی) بنانے کا تصوّر دیا جسے انسان کے بہترین مفاد میں لایا گیا اور جو تدریجاً ترقی کرتے کرتے الیکٹریکل انجینیرنگ کے مقام تک پہنچی جو انسان کی ناقابلِ تصوّر حد تک خدمت میں مصروف ہے۔

قرآن مجید کے مختلف مقامات پر آسمانی بجلی کے کوندنے کے حوالہ جات ملتے ہیں جیسے یہ آیات :

(۱) أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَٰتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَٰبِعَهُمْ فِىٓ ءَاذَانِهِم مِّنَ الصَّوَٰعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ مُحِيطٌۢ بِالْكَٰفِرِينَ ۞ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَٰرَهُمْ كُلَّمَآ أَضَآءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ وَإِذَآ أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَآءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَٰرِهِمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ۞ (البقرۃ:۱۹، ۲۰)

"یا اُن (منافقین) کی مثال ایسے ہے جیسے آسمان سے زور کا مینہ برس رہا ہو۔ اس میں اندھیرے، گرج اور بجلی ہے، وہ کڑک کے سبب موت کے اندیشہ سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے ہوئے ہیں حالانکہ اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔ قریب ہے کہ بجلی اُن کی بینائی ہی اُچک لے جائے، وہ جب اُن پر چمکتی ہے تو اُس کی روشنی میں چل لیتے ہیں اور جہاں اُن پر اندھیرا ہوا (تو بس) کھڑے رہ جاتے ہیں، اور اگر اللہ چاہتا تو اُن کے کان اور اُن کی بینائی سلب کر لیتا، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔" (۲:۱۹، ۲۰)

(۲) هُوَ الَّذِى يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ۞ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَٰٓئِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ وَيُرْسِلُ الصَّوَٰعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَن يَشَآءُ وَهُمْ يُجَٰدِلُونَ فِى اللَّهِ وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ ۞ (اَلرَّعد : ۱۲، ۱۳)

"وہی ہے جو تمہیں (کبھی) ڈرانے اور (کبھی) امید دلانے کے لئے بجلی دکھاتا ہے اور (کبھی) بھاری (گھنے) بادلوں کو اٹھاتا ہے۔ (بجلیوں اور بادلوں کی) گرج اور فرشتے اُس کے خوف سے اُس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور وہ کڑکتی بجلیاں بھیجتا ہے، پھر جس پر چاہتا ہے اُسے گرا دیتا ہے اور وہ (کفار قدرت کی اِن نشانیوں کے باوجود) اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں اور وہ سخت تدبیر و گرفت والا ہے۔" (۱۲، ۱۳ :۱۳)

(۳) يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ يَذْهَبُ بِالْأَبْصَٰرِ ۞ (النّور : ۴۳)
"یوں لگتا ہے کہ (بادل) کی بجلی کی چمک آنکھوں (کو خیرہ کر کے اُن) کی بینائی اچک لے جائے گی۔" (۴۳ : ۲۴)

<u>کرہ فضائی کی ساخت</u> : ماہرینِ موسمیات اور خلائی سائنسدانوں نے سطحِ زمین سے کئی سو کلو میٹر بلند

(Meteorology..موسمیات). ۱۶۰ء

تک زمین کے کرۂ فضائی کی خاصی تفصیلی شکل بنائی ہے۔ اُنہوں نے معلوم کیا ہے کہ یہ کرۂ فضائی کم وبیش پانچ نمایاں تہوں پر مشتمل ہے۔ اِن تہوں کے ارتفاع کی حدود ٹھیک ٹھیک تو نہیں بتائی جا سکتی کیونکہ کرۂ فضا میں حقیقی بلندیاں مختلف ہوتی ہیں جن کا انحصار جغرافیہ اور موسم پر ہوتا ہے۔ تاہم زمین کے اوپر اِن تہوں کے فاصلے حسب ذیل فاصلوں کے قریب قریب ہیں :۔

(۱) کرہ متغیرہ (Troposphere): (0 تا 10 کلومیٹر) : یہ تہہ سطحِ زمین سے قریب تر ہے اور اس طرح اس کا تعلق انسان سے بہت زیادہ ہے۔ بادل' برفباری اور مختلف قسم کی آندھیاں اس طبقہ میں واقع ہوتی ہیں۔''

(۲) کرۂ قائمہ (ہوائی) Stratosphere : (10 تا 40 کلومیٹر) : یہ کرہ' کرہ متغیرہ سے اوپر واقع ہے۔ اس کرہ کی تہہ میں کئی کلومیٹر دبیز علاقہ ہے جہاں درجہ حرارت بنیادی طور پر ایک جیسا معلوم ہوتا ہے۔ یہ طبقہ اکثر بادل نہ ہونے کی وجہ سے صاف وشفاف ہوتا ہے اور اس میں جیٹ طیارے ہچکولے کھائے بغیر پرواز کر سکتے ہیں۔''

(۳) درمیانہ کرہ ہوائی (Mesosphere): (40 تا 70 کلومیٹر) : اس طبقے کا یہ نام اس لئے ہے کیونکہ یہ پانچ طبقات کے درمیان واقع ہے۔ اس طبقہ کا بالائی حصہ سرد تر اور نچلا حصہ گرم ہوتا ہے۔''

(۴) کرہ حارّہ (Thermosphere): (70 تا 400 کلومیٹر) : اس طبقہ کے بالائی حصہ کا درجہ حرارت' حرارتِ آفتاب کے گھٹنے بڑھنے کے ساتھ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ اس طبقہ کا ٹمپریچر بلندی کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہتا ہے۔ اس طبقہ کی ہوا انتہائی رواں ساز (ionized) ہوتی ہے اور اسی لئے اس طبقے کو ionosphere بھی کہا جاتا ہے۔''

(۵) کرۂ بالا (Exosphere): (400 کلومیٹر سے بالا) : کرۂ حارّہ سے اوپر جاتے ہوئے یہ کرہ' فضائی کرہ کا آخری حصہ ہے۔ اس کرہ میں ہوا انتہائی ہلکی اور صرف ہیلیم اور ہائیڈروجن پر مشتمل ہوتی ہے جو فضا کے ہلکے ترین رکن ہیں۔ اونچے ٹمپریچر کی وجہ سے گیسی ذرّات بڑی تیزی سے حرکت کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر جواباً عمل کرتے ہیں۔ زمین سے دُوری کے باعث تیزی سے حرکت کرنے والے ذرّات زمین کی کششِ ثقل اور دوسرے گیسی ذرّات کی مدافعت سے آزاد ہو جاتے ہیں۔'' ("Meteorology".. Yuan Zhongjia, pp. 17-21)

اِن فضائی کرّات کی بابت قرآن مجید گمراہی کے حوالے سے بڑے ہی جامع اور فصیح انداز میں یوں کہتا ہے:

۴۱۶۱ (موسمیات..Meteorology)

وَ مَنْ یُّرِدْ أَنْ یُّضِلَّہٗ یَجْعَلْ صَدْرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا کَأَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ (۱۲۵ : ۶)

''اور جس کے لئے اللہ ارادہ کرلیتا ہے کہ اُسے گمراہ رکھے' اُس کے سینہ کو وہ تنگ اور بہت تنگ کردیتا ہے جیسے اُسے آسمان میں چڑھنا پڑرہا ہو۔'' (۱۲۵ : ۶) #

موسمیات(Climatology) اور بیرومیٹر : بیرومیٹر ہوا کے دباؤ کو ماپنے کا آلہ ہے۔اُسے بالخصوص موسم کی پیشگوئی کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔موسمیات یعنی آب وہوا(Climatology) قرآن مجید میں اس طرح اشارہ ملتا ہے :

هُوَالَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰی اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْکِ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْابِهَاجَآءَ تْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَ هُمُ الْمَوْجُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ لَئِنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ O (یونس:۲۲)

''وہ وہی (اللہ ہی) تو ہے جو تمہیں سمندر اور خشکی میں لئے پھرتا ہے چنانچہ جب تم کشتی میں سوار ہوتے ہو اور وہ (کشتیاں) لوگوں کو☆ ہوائے موافق کے ذریعہ سے لے کر چلتی ہیں اور وہ لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں کہ (ناگہاں) ہوا کا ایک تھپیڑا آتا ہے اور اُن کے اوپر ہر طرف سے موجیں اٹھتی چلی آتی ہیں اور وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ (بس اب) ہم گھر گئے' (تو اُس وقت) اللہ کو اس کے ساتھ اعتقاد کو (بالکل) خالص کرکے پکارتے ہیں (کہ) اگر تو نے ہمیں اس (مصیبت) سے نجات دے دی تو ہم یقیناً بڑے شکر گزاروں میں ہوں گے۔'' (۲۲ : ۱۰)

ایک وقت میں لوگوں کے خوش ہونے اور پھر ہواؤں کے تھپیڑوں کے باعث اُن کے لئے موت کے خطرے میں کسی حد تک بیرومیٹر کا تصوّر پایا جاتا ہے۔

ایسے نازک موقعوں پر اسباب سے قطع نظر کرکے ساری توجہ مسبب الاسباب کی طرف کردینا عین انسان کی فطرتِ سلیمہ کا تقاضا ہے اور جو بدنصیب ایسے وقت میں بھی رجوع الی اللہ کی توفیق نہیں پاتے' اُن کے دل نورِ انسانیت کی آخری شعاع سے بھی محروم ہوچکے ہیں۔(ماجدی' ص ۴۳۷' نوٹ :۳۹)

سورج کی روشنی کی بابت قرآن مجید اپنے عام معمول کے مطابق جامع انداز میں یوں کہتا ہے :

جاہلیت کے اُس دور میں کسی کو کیا معلوم تھا کہ آسمان کی مسافتیں طے کرنے کے ساتھ ساتھ ہوا کی کمی کی وجہ سے دَم گھٹتا جاتا ہے جبکہ ہوائی جہاز' ہیلی کاپٹر اور اس قسم کے دیگر ذرائع کی ابھی ایجاد بھی نہیں ہوئی تھی۔لہٰذا آیت میں جہاں آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائڈ کی طرف واضح اشارہ موجود ہے' وہاں اس بات کا بھی پختہ ثبوت موجود ہے کہ یہ کلام بلاشک وشبہ رب تعالیٰ کا کلام ہے۔

☆ غائب کے صیغے کو حاضر کے صیغے میں اور حاضر کے صیغے کو غائب کے صیغے میں اچانک بدلنا قرآن مجید کا خصوصی امتیاز ہے جس کی متعدد مثالیں قرآن مجید میں ملتی ہیں۔اس سے اندازِ بیان کے طرز وادا میں بلیغانہ حسن وجمال پیدا ہوجاتا ہے۔

هُوَالَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَہٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَالسِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ ذٰلِکَ اِلَّا بِالْحَقِّ (یونس : ۵)

''وہ (اللہ) وہی تو ہے جس نے آفتاب کو چمکتا ہوا بنایا اور چاند کو روشن کیا اور اُس کے لئے منزلیں مقرر کیں تاکہ تم برسوں کا شمار اور حساب جان لیا کرو۔ اللہ نے یہ نشانیاں بے مقصد پیدا نہیں کیں۔''

ضیاء اور نور دونوں کا معنی چمک اور روشنی کا ہے۔ مگر نور عام ہے اور ہر ہلکی و عارضی روشنی کو نور کہہ دیتے ہیں مگر ضیاء بالعموم تیز اور اصل روشنی کو کہتے ہیں۔ چونکہ سورج کی روشنی تمام چاند تاروں سے تیز بھی ہے اور اصل بھی کہ اس میں روشنی کسی دوسرے تارے سے نہیں آتی' اس لئے اسے ضیاء فرمایا گیا (تفسیر کبیر)۔ زمین و آسمان میں سورج کا فیض تمام تاروں سے زیادہ ہے کہ آسمان کے ہر تارے میں نور سورج کا ہے اور زمین میں تمام نباتات اور حیوانات کی زندگی کی بقا اسی سے ہے۔ جو دانہ یا پھل پیدا ہوتا ہے' وہ سورج کے فیض سے اور اُن میں جو لذّتیں ہیں' وہ سورج کے فیض ہی سے ہیں۔ البتہ اُن کے رنگ و بو چاند سے ہیں۔

سورج اور چاند دونوں ہی نور ہیں مگر اُن میں چند طرح کا فرق ہے: (۱) سورج کی روشنی خود اپنی ہے جبکہ چاند کی روشنی اپنی نہیں بلکہ سورج کے ذریعہ سے ہے۔ (۲) سورج کی روشنی میں گرمی اور جلال ہے جبکہ چاند کی روشنی میں ٹھنڈک اور جمال ہے۔ (۳) سورج رات کو دُور کرکے دن لے آتا ہے جبکہ چاند رات کو دُور نہیں کرتا بلکہ اُسے روشن کر دیتا ہے۔ (۴) سورج آسمان کے تاروں اور زمین کے چراغوں کو بجھا دیتا ہے جبکہ چاند میں یہ بات نہیں ہے۔ (۵) سورج سے شمسی مہینے اور سال' چاند سے قمری مہینے اور سال بنتے ہیں۔ (۶) سورج سے نمازوں کے اوقات' روزے کے سحر و افطار معلوم ہوتے ہیں جبکہ چاند سے روزے' زکوٰۃ اور حج وغیرہ کا اہتمام ہوتا ہے۔ (۷) سورج کی بارہ منزلیں ہیں جنہیں وہ ایک سال میں اپنی رفتار سے طے کرتا ہے' اس سے موسم وغیرہ بنتے ہیں۔ چاند کی اٹھائیس منزلیں ہیں جنہیں وہ قریبًا ایک ماہ میں طے کرتا ہے۔ (۸) چاند کا گھٹنا بڑھنا تاریخ کا پتہ دیتا ہے' شمسی مہینوں میں یہ بات نہیں ہے۔ (۹) دنیاوی کاموں کا حساب شمسی مہینوں سے لگانا بالکل جائز ہے۔

حضرتِ انسان پر اپنی شانِ کریمی کے اظہار میں ایک اور مقام پر فرمایا :

وَسَخَّرَ لَکُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ وَسَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَ النَّہَارَO وَآتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَاسَاَلْتُمُوْہُ (ابراھیم : ۳۲، ۳۳)

''اور اُس نے تمہارے فائدہ کے لئے سورج اور چاند کو (باقاعدہ ایک نظام کا) مطیع بنا دیا جو ہمیشہ (اپنے مدار میں) گردش کرتے رہتے ہیں اور تمہارے (نظامِ حیات کے) لئے رات اور دن کو بھی (ایک نظام کے) تابع کر دیا۔ اور اُس نے تمہیں ہر وہ چیز عطا فرما دی جو تم نے اُس سے مانگی۔''
(۱۴ : ۳۲، ۳۳)

(۱۶۸) معجزات (MIRACLES)

معجزہ کا مصدر ع۔ج۔ز (عجز) ہے بمعنیٰ ''عاجز ہو جانا'' اور کسی چیز کے ''نہ کر سکنے کے قابل'' ہونا ہے۔ اسی عجز کے مصدر سے لفظ مُعْجِز بطورِ اسمِ فاعل ہے بمعنیٰ ''عاجز کر دینے والا''۔ معجز کے آخر میں حرف (ہ) بطور لاحقہ لانے سے لفظ ''معجزہ'' بنا جس میں مبالغہ کی صفت پائی جاتی ہے۔ (''القاموس المحیط''۔ مجد الدین فیروز آبادی' جلد دوم' صفحہ ۱۸۱)

ماہرِ لسانیات امام جرجانی نے معجزہ کی یہ تعریف کی ہے :

هُوَخَارِقُ الْعَادَةِ دَاعِيَة" إِلَى الْخَيْرِ وَالسَّعَادَةِ مَقْرُوْنَة" بِدَعْوَى النُّبُوَّةِ يُقْصَدُ بِهِ إِظْهَارُ صِدْقِ مَنِ ادَّعٰى أَنَّهٗ' رَسُوْلُ' مِّنَ اللهِ تَعَالٰى (''التعریضات'' للجُرجانی' ص ۲۱)

''معجزہ حقائق کے عام مشاہدے کے خلاف ہونے کا نام ہے جس کا مقصد فلاح وخیر اور نیکی کی طرف دعوت دینا ہوتا ہے۔ اس کا اٹوٹ انگ تعلق رسالت ونبوّت سے ہوتا ہے اور مدّعی کی صداقت کے اس اظہار کے لئے ہوتا ہے کہ اُسے واقعی اللہ کی جانب سے بطور رسول رنبی بھیجا گیا ہے۔''

قرآن مجید نے کہیں بھی ''معجزہ'' کا لفظ کسی نبی یا رسول کی طرف نسبت کرنے کے حوالے سے استعمال نہیں کیا بلکہ معجزہ کے معنیٰ میں اُس نے یا تو ''آیت رآیات'' یا ''برھان'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں جیسے ذیل کی آیات میں :

سورۃ البقرۃ : آیت ۲۵۹ ؛ سورہ آلِ عمران : آیت ۴۹ ؛ سورۃ الانعام : آیت ۳۵ ؛ سورۃ الاعراف : آیات ۷۳' ۲۰۳ ؛ سورہ بنی اسرائیل : آیت ۱۰۱ ؛ سورۃ المؤمنون : آیت ۴۵)

سورۃ القَصَص کی آیت ۳۲ میں لفظ بُرھانٰن (دو بُرہان) معجزہ کے مفہوم میں لایا گیا ہے۔

<u>معجزہ کی اقسام</u> : قرآن مجید نے رسولوں اور نبیوں کے معجزات کا ذکر کیا ہے۔ معجزات کی دو قسمیں ہیں :

(۱) کونیہ یا حسیہ (ظاہر معجزات)

(۲) کلامیہ یا عقلیہ (روحانی معجزات)

تمام انبیاء علیہم السلام کو اوّل الذکر یعنی کونیہ (حسیہ) معجزات عطا کئے گئے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں :

(۱) دہکتی ہوئی شعلہ زن آگ کا ابراہیم علیہ السلام پر گل وگلزار ہو جانا (سورۃ الانبیاء : ۶۹)

(۲) صالح علیہ السلام کی قوم ثمود کے مطالبے پر پہاڑ سے اونٹنی کا برآمد ہونا (الاعراف: ۷۳)
(۳) داؤد علیہ السلام کے لئے پہاڑوں اور پرندوں کا مسخر ہونا (سورہ سبا : آیت ۱۰)
(۴) جناب عزیر علیہ السلام کو ایک صدی بے جان رکھنے کے بعد اُنہیں دوبارہ زندہ کرنا اور اُن کے گلے سڑے گدھے پر گوشت چڑھا کر اُسے دوبارہ زندہ کرنا۔ نیز گدھے اور عزیر علیہ السلام کے طعام دونوں پر برابر کی ایک صدی گزرنے کے باوجود گدھے کا گل سڑ جانا لیکن کھانے پر وقت کا بے اثر ہونا اور اُس کا اُسی طرح تروتازہ رہنا۔ یہ تینوں مثالیں معجزہ کی عمدہ مثالیں ہیں جس کے آگے کائنات کی تمام تر قوت عاجز و بے بس ہے۔
(بحوالہ سورۃ البقرۃ : آیت ۲۵۹)
(۵) جناب عیسیٰ علیہ السلام کا بِن باپ کے پیدا ہونا' پنگوڑے کی عمر میں آپ کا لوگوں سے باتیں کرنا' مادرزاد اندھوں کو بینا کر دینا' کوڑھیوں کو شفایاب کر دینا اور بہ حکمِ الٰہی مُردوں کو زندہ کر دینا (آلِ عمران: ۴۹)
(۶) جنابِ زکریا علیہ السلام کو اُن کی پیرانہ سالی میں فرزند (یحییٰ علیہ السلام) عطا کرنا اور اس سے زیادہ حیران کن بات یہ کہ جنابِ زکریا علیہ السلام کی زوجہ محترمہ بانجھ بھی تھیں (سورہ مریم: ۸) اور بچے جننے جنانے کی عمر سے نکل کر نوے سال کی ہو چکی تھیں۔
(۷) سیّدہ مریم سلام اللہ علیہا کو بے موسم پھل عطا کرنا اور وہ بھی بالکل بند کمرے میں جہاں کسی کا بھی گزر ممکن نہ تھا (آلِ عمران: ۳۷)
(۸) اصحابِ کہف کا غار میں بغیر کھائے پیے صدیوں تک' موسم کے شکست و ریخت کے اثرات سے آزاد ہو کر رہنا۔ (سورۃ الکہف: ۱۹' ۲۵)
(۹) جنابِ موسیٰ کے عصا کا اژدہے میں تبدیل ہونا' فرعونی جادوگروں کے اژدھوں کو نگل جانا اور آپ کے عصا کو دریا میں مار کر راہ بنا لینا (سورۃ الاعراف: ۱۰۷) وغیرہ وغیرہ۔

انبیاء علیہم السلام کے یہ تمام مذکورہ معجزات ''کونیہ'' (ظاہر) قسم کے تھے جو اُن مقدس ہستیوں کے اس دنیا کو خیرباد کہنے کے ساتھ ساتھ ختم ہو گئے۔ لیکن چونکہ ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام امام الانبیاء ہیں اور قیامت تک کے آنے والوں کے لئے رسول ہیں' اس لئے آپ کو کونیہ اور عقلیہ (روحانی) دونوں قسم کے معجزات سے نوازا گیا۔ آپ کو کونیہ/حسیہ قسم کے جو معجزات عطا کیے گئے' اُن کی مثالیں درجِ ذیل ہیں :

(I) معجزہ شق القمر : اس کے متعلق سورۃ القمر کی اوّلین آیات میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا :
اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ○ وَاِنْ يَّرَوْا آيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ○ وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ○ (القمر : ۱-۳)
''قیامت قریب آ گئی ہے اور چاند شق ہو گیا۔ اور اگر وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کہ وہ بڑا زبردست جادو ہے۔ اور اُنہوں نے (رسولِ خدا کو) جھٹلایا اور اپنی خواہشات کی پیروی کرتے رہے اور ہر کام کے لئے ایک انجام ہے۔'' (۵۴ : ۳-۱)

پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ قیامت قریب آ گئی کیونکہ جو وقت گزر چکا ہے' اُس کی نسبت سے قیامت کے آنے کا بقیہ وقت کم ہے۔ نیز ہر وہ چیز جس کا ہونا یقینی ہو' عقلمند اُسے نزدیک ہی سمجھتے ہیں۔ کیونکہ شق القمر جو منجملہ علاماتِ قیامت تھا' وقوع میں آ گیا۔ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ سے مراد یہ ہے کہ چاند کا شق ہونا بالفعل حضورِ اقدس ﷺ کے زمانہ میں ہو چکا۔ اس معنیٰ کی تائید حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی قراءت سے ہوتی ہے۔ اس معنیٰ کی تائید مابعد کی آیت دوم سے بھی ہوتی ہے کہ شق القمر کے معجزہ کو کفار نے دیکھا اور ٹال دیا۔ اس سے پہلے بھی وہ پے در پے معجزات دیکھ چکے تھے اور اُنہیں دیکھ کر سِحْرٌ ''مُّسْتَمِرٌّ'' بتانے لگے۔ اِسی معنیٰ پر مفسرین کا اجماع ہے۔ شق القمر سے متعلق حدیثِ مبارکہ ملاحظہ ہو :

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰي عَنْهُ اَنَّ اَهْلَ مَكَّةَ سَاَلُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَنْ يُّرِيَهُمْ اٰيَةً فَاَرَاهُمُ انْشِقَاقَ الْقَمَرِ مَرَّتَيْنِ (مُتَّفَق'' عَلَيْهِ وَهٰذَا لَفْظُ مُسْلِم)

''حضرت اَنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ مشرکین مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے مطالبہ کیا کہ وہ اُنہیں کوئی معجزہ دکھائیں تو آپ نے اُنہیں دو مرتبہ چاند کا دولخت ہونا دکھا دیا۔'' (بخاری' مسلم)

''کثیر التعداد صحیح احادیث کے باوجود بعض لوگ اس واقعہ کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ واقعہ قیامت کے وقت ظہور پذیر ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ اِنْشَقَّ اگرچہ ماضی کا صیغہ ہے لیکن یہاں مستقبل پر دلالت کرتا ہے اور لغتِ عرب میں اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ اُن کے انکار کی کئی وجوہات ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ایسا واقعہ پیش آیا ہوتا تو ساری دنیا میں اس کی دھوم مچی ہوتی۔ اُس زمانہ کے مؤرخ اپنی تاریخوں میں اِس کا ذکر کرتے' علمِ نجوم کے ماہرین اسے بطور یادگار واقعہ نقل کرتے۔''

''اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ یہ واقعہ سرِ شام ہوا تھا' اس لئے جزیرۂ عرب کے مغرب میں جو ممالک تھے' وہاں اُس وقت دن تھا۔ وہاں تو دیکھے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نیز یہ واقعہ رات کو پیش آیا اور اچانک پیش آیا۔ لوگوں کو کیا خبر تھی کہ ایسا واقعہ رُوپذیر ہونے والا ہے تاکہ وہ بے تابی سے اس کا انتظار کرتے۔ رات کو دنیا سو رہی ہوگی۔ کسی کو کیا خبر کہ آن کی آن میں کیا وقوع پذیر ہو گیا۔ اگر کوئی اُس وقت جاگ بھی رہا ہو تو ممکن ہے وہ کسی اور کام میں مشغول ہو اور اُس نے اس کی طرف توجہ ہی نہ کی ہو یا توجہ کی ہو اور اُس نے دیکھا بھی ہو لیکن اَن پڑھ ہو یا لکھا بھی ہو اور پھر تحریر ضائع ہو گئی۔ غرضیکہ بیسیوں احتمالات ہو سکتے ہیں۔ اتنے احتمالات کی موجودگی میں ہم صحیح روایات سے ثابت شدہ واقعہ کو کس طرح غلط کہہ سکتے ہیں!''

''علامہ سلیمان ندوی نے اپنی کتاب ''خطباتِ مدراس'' میں لکھا ہے کہ ابھی ابھی سنسکرت کی ایک پرانی کتاب ملی ہے جس میں لکھا ہے کہ مالابار کے راجہ نے اپنی آنکھوں سے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔''

''بعض لوگ اس وجہ سے اس واقعہ کا انکار کرتے ہیں کہ اتنا بڑا کرہ پھٹ کر دو ٹکڑے ہو جائے اور وہ

دونوں ٹکڑے آکر جڑ جائیں' یہ ناممکن ہے لیکن جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں اسے ناممکن کہنا مشکل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک کرہ کے اندر آتش فشاں مادّہ ہو اور وہ اس طرح سے پھٹے کہ اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں لیکن مرکز کی مقناطیسی قوت اتنی طاقت ور ہو کہ وہ ان دونوں ٹکڑوں کو پھر سے یکجا کر دے۔ ہمیں اِن تکلفات کی تب ضرورت پیش آتی جب خود بخود چاند کے پھٹنے کا واقعہ رونما ہوتا۔ جب ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب علیہ السلام کی رسالت کی تصدیق کے لئے چاند کو دو ٹکڑے کیا تو اب کسی کو شک کی مجال نہیں رہتی کیونکہ جس خالقِ حکیم نے اس چاند کو بنایا ہے' وہ اُسے توڑ بھی سکتا ہے اور توڑ کر جوڑ بھی سکتا ہے۔''

''جو لوگ کہتے ہیں کہ انشقاقِ قمر وقوعِ قیامت کے وقت ہوگا' قرآن کا سیاق وسباق اُن کی اس توجیہ کو قبول نہیں کرتا کیونکہ وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَۃً والا جملہ صاف بتا رہا ہے کہ اُنہوں نے انشقاقِ قمر دیکھا اور اتنے عظیم الشان اور محیر العقل معجزہ کا مشاہدہ کیا لیکن پھر بھی ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ یہ کلام اسی وقت درست ہوسکتا ہے جبکہ شقِ قمر ہو چکا ہو۔ نیز کفارِ مکّہ نے اس معجزہ کا خود مطالبہ کیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ یہ معجزہ اُنہیں دکھا دیا جائے تو وہ ضرور ایمان لائیں گے لیکن جب یہ معجزہ ظہور پذیر ہوا تو اُنہیں ایمان لانے کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ الٹا کہنے لگے کہ یہ ایک بڑا زبردست جادو ہے۔'' (''ضیاء القرآن''۔۔۔پیر کرم شاہ الازہری' جلد پنجم' صفحات ۵۲' ۵۳)

''سوال: شق القمر حضور اقدس کے زمانہ میں پیش آیا جسے اب چودہ سو برس سے زیادہ ہو چکے ہیں تو یہ کس طرح قربِ قیامت کا نشان ہوسکتا ہے جو اب تک نہیں آئی۔

جواب: حضورِ اقدس ﷺ کا وجودِ مبارک اور آپ کی نبوّت قربِ قیامت کی علامات میں سے ہے یعنی اس امر کا ایک نشان ہے کہ دنیا کی عمر کا اکثر حصّہ گزر چکا ہے اور بہت تھوڑا باقی رہ گیا ہے۔ چنانچہ صحیحین میں ہے کہ آپ نے اپنی انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''میری بعثت اور قیامت ان دو انگلیوں کی مانند ہیں کہ جس قدر وسطی (درمیانی انگلی) سبابہ (شہادت کی انگلی) سے آگے ہے' قیامت سے پہلے میرا مبعوث ہونا بھی اسی مانند ہے کہ میں پہلے آ گیا ہوں اور قیامت میرے پیچھے آ رہی ہے۔'' جب آپ کی نبوت قربِ قیامت کی علامت ہوئی تو شق القمر کا بالفعل وقوع بھی جو آپ کی نبوت کی دلیل ہے' قربِ قیامت کا نشان ٹھہرا۔'' (سیرتِ رسولِ عربی ﷺ۔۔۔علامہ نور بخش توکلی' صفحات ۳۶۵' ۳۶۶)

عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ: اُتِیَ النَّبِیُّ بِاِنَاءٍ وَھُوَ بِالزَّوْرَاءِ فَوَضَعَ یَدَہٗ فِی الْاِنَاءِ فَجَعَلَ الْمَاءُ یَنْبُعُ مِنْ بَیْنِ اَصَابِعِہٖ فَتَوَضَّاَ الْقَوْمُ قَالَ قَتَادَۃُ: قُلْتُ لِاَنَسٍ: کَمْ کُنْتُمْ؟ قَالَ: ثَلَاثَ مِائَۃٍ اَوْ زُھَاءَ ثَلَاثِ مِائَۃٍ وَ فِیْ رِوَایَۃٍ: لَوْ کُنَّا مِائَۃَ اَلْفٍ لَکَفَانَا کُنَّا خَمْسَ عَشَرَۃَ مِائَۃٍ (مُتَّفَق'' عَلَیْہِ)

''حضرت اَنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ زَوراء کے مقام پر پانی کا ایک برتن نبی علیہ الصلوٰۃ

والسلام کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے اُس برتن میں اپنا دستِ مبارک ڈالا تو پانی آپ کی انگلیوں کے درمیان سے اچھل اچھل کر باہر نکلنے لگا۔ لوگوں نے اُس پانی سے وضو کر لیا۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس سے پوچھا کہ آپ کتنے لوگ تھے؟ اُنہوں نے کہا: تین سو یا اس کے لگ بھگ ایک اور روایت میں ہے کہ اگر ہم ایک لاکھ بھی ہوتے تو پانی ہمیں کافی ہو جاتا لیکن ہماری تعداد پندرہ سو تھی۔'' (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

عَنِ الْبَرَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: کُنَّا یَوْمَ الْحُدَیْبِیَةِ اَرْبَعَ عَشْرَةَ مِائَةٍ وَالْحُدَیْبِیَةُ بِئْرٌ'' فَنَزَحْنَاهَا حَتّٰی لَمْ نَتْرُكْ فِیْهَا قَطْرَةً فَجَلَسَ النَّبِیُّ ﷺ عَلٰی شَفِیْرِ الْبِئْرِ فَدَعَا بِمَاءٍ فَمَضْمَضَ وَمَجَّ فِی الْبِئْرِ فَمَكَثْنَا غَیْرَ بَعِیْدٍ ثُمَّ اسْتَقَیْنَا حَتّٰی رَوِیْنَا وَرَوَتْ اَوْصَدَرَتْ رَكَائِبُنَا (صحیح بخاری)

''حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حدیبیہ کے دن ہم چودہ سو کی تعداد میں تھے۔ حدیبیہ میں ایک کنواں تھا جس کا پانی ہم اس قدر نکالتے رہے کہ اُس میں ہم نے (پانی کا) ایک قطرہ بھی باقی نہیں چھوڑا۔ (اس پریشانی کے عالم میں صحابہ کرام نبی علیہ السلام کے پاس پہنچے)۔ آپ تشریف لائے، کنویں کے دہانے پر بیٹھ گئے اور کچھ پانی منگوایا۔ آپ نے اُس پانی سے غرارہ کیا اور غرارہ شدہ پانی کنویں میں ڈالا۔ تھوڑی ہی دیر بعد پانی اوپر چڑھ آیا۔ یہاں تک کہ ہم نے اُسے پی کر نہ صرف اپنی پیاس بجھائی بلکہ ہمارے (سفری) جانوروں نے بھی خوب سیر ہو کر پانی پیا۔'' (بخاری، مسلم)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنِّیْ اَسْمَعُ مِنْكَ حَدِیْثًا كَثِیْرًا اَنْسَاهُ قَالَ: اُبْسُطْ رِدَاءَكَ فَبَسَطْتُهُ' قَالَ: فَغَرَفَ بِیَدَیْهِ ثُمَّ قَالَ: ضُمَّهُ' فَضَمَمْتُهُ' فَمَا نَسِیْتُ شَیْئًا بَعْدَهُ' (مُتَّفَق'' عَلَیْه)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں آپ سے بہت سی حدیثیں سنتا ہوں جنہیں بھول جاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اپنی چادر پھیلا دو۔ میں نے اُسے پھیلا دیا۔ ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ آپ نے اُس چادر کو اپنے ہاتھوں کی ہتھیلی سے فضائی ہوا سے بھر دیا۔ پھر فرمایا: اُسے (اپنے سینے سے لگا کر) بھینچو، پس نے اُسے بھینچا تو اُس کے بعد میں کچھ بھی نہیں بھولا۔'' (بخاری، مسلم)

(۱۱) معجزہ ردّ الشمس:

عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَیْسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یُوْحٰی اِلَیْهِ وَرَاْسُهٗ فِیْ حِجْرِ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ فَلَمْ یُصَلِّ الْعَصْرَ حَتّٰی غَرَبَتِ الشَّمْسُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

ﷺ: اَللّٰھُمَّ اِنَّ عَلِیًّا کَانَ فِیْ طَاعَتِكَ وَطَاعَةِ رَسُوْلِكَ فَارْدُدْ عَلَیْهِ الشَّمْسَ قَالَتْ اَسْمَاءُ، فَرَاَیْتُھَا غَرَبَتْ وَرَاَیْتُھَا طَلَعَتْ بَعْدَ مَا غَرَبَتْ (مشکل الآثار : الطحاوی؛ المعجم الکبیر: طبرانی ؛ مجمع الزوائد: ہیثمی ؛ میزان الاعتدال: الذھبی ؛ البدایہ والنھایۃ: ابن کثیر ؛ الشفاء ؛ قاضی عیاض؛ الخصائص الکبریٰ: جلال الدین السیوطی ؛ السیرۃ الحلبیہ: حلبی ؛ الجامع لاحکام القرآن : القرطبی ؛ کشف اللبس عن حدیث الشمس: جلال الدین السیوطی ؛ حدائق الانوار : الشیبانی)

''سیّدہ اسماء بنتِ عُمَیس رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی علیہ السلام پر وحی نازل ہو رہی تھی جبکہ آپ کا سرِ اقدس جنابِ علی کرّم اللہ وجہہ' کی گود میں تھا اور جنابِ علی نے اُس وقت تک نمازِ عصر ادا نہیں کی تھی' یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا۔ نبی علیہ السلام (اُٹھ بیٹھے) اور عرض کیا: اے اللہ! بے شک علی تیری اور تیرے رسول کی اطاعت میں تھا☆ پس علی (کی بروقت نماز کے لئے) سورج پلٹا دیجئے۔ سیّدہ فرماتی ہیں کہ میں نے سورج کو غروب ہوتے دیکھا' پھر اُسے غروب ہونے کے بعد طلوع ہوتے بھی دیکھا۔''☆☆

نوٹ: اس حدیث کے راوی جناب علی ابن ابی طالب' جناب ابو ہریرہ اور ابو سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی ہیں۔

(۱۱۱) **معجزہ حبس الشمس** : ردّ الشمس کی طرح حبس الشمس بھی آنحضرت ﷺ کے لئے وقوع میں آیا چنانچہ شبِ معراج کی صبح کو جب کفارِ قریش نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اپنے قافلوں کے حالات پوچھے تو آپ نے ایک قافلہ کی نسبت فرمایا کہ وہ چہارشنبہ کے دن آئے گا۔ قریش نے اُس دن کا انتظار کیا یہاں تک کہ سورج غروب ہونے لگا اور وہ قافلہ نہ آیا۔ اُس وقت آپ نے دعا فرمائی تو رب تعالیٰ نے سورج کو ٹھہرا رکھا اور دن میں اضافہ کر دیا یہاں تک کہ وہ قافلہ آ پہنچا۔'' (سیرت رسولِ عربی۔۔علامہ نور بخش توکلی' ص ۳۶۶)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ: جَاءَ اَعْرَابِیٌّ'' اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فَقَالَ: بِمَ اَعْرِفُ اَنَّكَ نَبِیٌّ''؟ قَالَ: اِنْ دَعَوْتُ ھٰذَا الْعِذْقَ مِنْ ھٰذِہِ النَّخْلَةِ اَتَشْھَدُ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ؟ فَدَعَاہُ

☆ معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو آرام پہنچانا بھی اطاعتِ الٰہی کے زمرہ میں آتا ہے۔

☆☆ بعض لوگ اِس حدیث کے منکر ہیں اور اس کے انکار کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ جنگِ احزاب (خندق) کے موقع پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نمازِ عصر قضا ہوگئی تھی' اُس کی بروقت ادائیگی کے لئے تو آپ نے سورج کو نہیں پلٹایا تو اپنے ایک امتی کے لئے سورج کا پلٹانا نا قابلِ قبول ہے۔ جواب اس کا ایک تو یہ ہے کہ درج بالا حوالہ جات کے مدِّ نظر متعدد مستند اور ثقہ علمائے حدیث نے اس حدیث کو بیان کیا ہے اور دوسرا جواب یہ کہ نبی علیہ السلام نے (بہ اذنِ الٰہی) سورج کو اپنے لئے اس لئے نہیں پلٹایا تاکہ میری یہ ادا میری اُمت کے لئے سنت بن جائے کہ اُمت کی بھی نمازیں قضا ہوں گی اور جب وہ میری سیرت میں اس واقعہ کو دیکھیں گے تو اُن کی ڈھارس بندھ جائے گی اور میری طرح وہ اپنی قضا نماز کو ادا کر لیا کریں گے۔

رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فَجَعَلَ يَنْزِلُ مِنَ النَّخْلَةِ حَتّٰى سَقَطَ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ ثُمَّ قَالَ: اِرْجِعْ فَعَادَ فَاَسْلَمَ الْاَعْرَابِيُّ (سنن الترمذی: کتاب المناقب؛ المستدرک للحاکم؛ المعجم للطبرانی)

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک بدّو بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوا اور کہا: مجھے کیسے معلوم ہو کہ آپ اللہ کے نبی ہیں؟ آپ نے فرمایا: اگر میں اس کھجور کے درخت کے گچھے کو اپنی طرف بلاؤں (اور وہ میری طرف چلا آئے) تو کیا تم مجھے اللہ کا رسول مان لو گے؟ بدّو نے ہاں میں جواب دیا۔ پھر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کھجور کے خوشے کو اپنی طرف بلایا تو وہ درخت سے نیچے اترنا شروع ہوا یہاں کہ وہ نبی علیہ السلام کے قدموں میں آ کر گر گیا۔ پھر آپ ﷺ نے (اُسے) فرمایا: (اب) واپس چلے جاؤ تو وہ خوشہ (اپنی جگہ پر) واپس چلا گیا اور بدّو نے اسلام قبول کر لیا۔"

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ اَهْلُ بَيْتٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ لَهُمْ جَمَلٌ يَسْنُوْنَ عَلَيْهِ وَاِنَّ الْجَمَلَ اسْتُصْعِبَ عَلَيْهِمْ فَمَنَعَهُمْ ظَهْرَهٗ وَاِنَّ الْاَنْصَارَ جَاءُوْا اِلٰى رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَقَالُوْا: اِنَّهٗ كَانَ لَنَا جَمَلٌ نُسْنِيْ عَلَيْهِ وَاِنَّهُ اسْتُصْعِبَ عَلَيْنَا وَمَنَعَنَا ظَهْرَهٗ وَقَدْ عَطِشَ الزَّرْعُ وَالنَّخْلُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لِاَصْحَابِهٖ: قُوْمُوْا فَقَامُوْا فَدَخَلَ الْحَائِطَ وَالْجَمَلُ فِيْ نَاحِيَةٍ فَمَشَى النَّبِيُّ نَحْوَهٗ فَقَالَتِ الْاَنْصَارُ: يَا نَبِيَّ اللهِ! اِنَّهٗ قَدْ صَارَ مِثْلَ الْكَلْبِ وَاِنَّا نَخَافُ صَوْلَتَهٗ فَقَالَ: لَيْسَ عَلَيَّ مِنْهُ بَاْسٌ فَلَمَّا نَظَرَ الْجَمَلُ اِلٰى رَسُوْلِ اللهِ ﷺ اَقْبَلَ نَحْوَهٗ حَتّٰى خَرَّ سَاجِدًا بَيْنَ يَدَيْهِ فَاَخَذَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بِنَاصِيَتِهٖ اَذَلَّ مَا كَانَتْ قَطُّ حَتّٰى اَدْخَلَهٗ فِي الْعَمَلِ فَقَالَ لَهٗ اَصْحَابُهٗ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! هٰذِهٖ بَهِيْمَةٌ لَا تَعْقِلُ تَسْجُدُ لَكَ وَنَحْنُ نَعْقِلُ فَنَحْنُ اَحَقُّ اَنْ نَسْجُدَ لَكَ فَقَالَ: لَا يَصْلُحُ لِبَشَرٍ اَنْ يَّسْجُدَ لِبَشَرٍ وَلَوْ صَلَحَ لِبَشَرٍ اَنْ يَّسْجُدَ لِبَشَرٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْاَةَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا مِنْ عِظَمِ حَقِّهٖ عَلَيْهَا (المسند لاحمد بن حنبل؛ السنن للدارمی؛ المعجم الاوسط للطبرانی؛ الاحادیث المختارۃ للمقدسی؛ الترغیب والترھیب للمنذری؛ البیان والتعریف للحسینی؛ مجمع الزوائد للھیثمی؛ فیض القدیر للمناوی)

"حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ انصار کے پاس ایک اونٹ تھا جسے وہ کھیتی باڑی کے لئے پانی کے لانے میں استعمال کرتے تھے۔ اونٹ اُن کے قابو سے باہر ہو گیا اور اپنی پیٹھ پر پانی لانے سے اُنہیں روک دیا۔ انصار نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس یہ شکایت لے کر پہنچے کہ ہمارے پاس کاشت کے لئے پانی لانے کے لئے ایک اونٹ ہے۔ اب وہ ہمارے قابو سے باہر ہو گیا ہے' اور ہمارے کسی فائدے کا نہیں' اس کے نتیجے میں ہمارے کھیت اور تمام زراعت سوکھ کر مرجھا گئے ہیں۔ نبی ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: میرے ساتھ آؤ۔ صحابہ کرام آپ کے ساتھ گئے۔ آپ (اونٹ کے) احاطہ میں داخل ہوئے جس کے ایک کونے میں اونٹ تھا۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اونٹ کے طرف بڑھے تو انصار نے کہا: اے اللہ کے رسول! اونٹ کاٹنے والے کتے کی طرح دیوانہ ہو گیا ہے اور ہمیں آپ کے

بارے میں اُس کے حملے کا خطرہ ہے۔آپ نے فرمایا: مجھے اُس سے کوئی خطرہ نہیں۔ جونہی اونٹ نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا تو وہ آپ کی طرف چلنا شروع ہوا یہاں تک کہ وہ آپ کے قدموں میں سجدہ ریز ہو کر گر پڑا۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُسے اُس کی پیشانی سے پکڑا اور اُسے کام پر لگا دیا۔ اس پر صحابہ نے آپ سے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ عقل سے عاری جانور آپ کے آگے سجدہ ریز ہے جبکہ ہم عقل و فہم رکھتے ہوئے آپ کو سجدہ کرنے کے زیادہ حقدار ہیں۔آپ نے فرمایا: کسی انسان کا کسی انسان کو سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر کسی کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں ہر بیوی کو اپنے خاوند کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا کہ اللہ تعالیٰ نے خاوند کو بیوی پر فوقیت بخشی ہے اور اُسے اُس پر قوام بنایا ہے۔''

'عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا اَنَّ یَھُوْدِیَّۃً مِنْ اَھْلِ خَیْبَرَ سَمَّتْ شَاۃً مَّصْلِیَّۃً ثُمَّ اَھْدَتْھَا لِرَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فَاَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ الذِّرَاعَ فَاَکَلَ مِنْھَا وَاَکَلَ رَھْطٌ مِّنْ اَصْحٰبِہٖ مَعَہٗ، ثُمَّ قَالَ لَھُمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِرْفَعُوْا اَیْدِیَکُمْ وَاَرْسَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِلَی الْیَھُوْدِیَّۃِ فَقَالَ لَھَا: اَسَمَمْتِ ھٰذِہِ الشَّاۃَ؟ قَالَتْ: مَنْ اَخْبَرَکَ؟ قَالَ: اَخْبَرَتْنِیْ ھٰذِہٖ فِیْ یَدِیْ لِلذِّرَاعِ قَالَتْ: نَعَمْ قَالَ: فَمَا اَرَدْتِّ اِلٰی ذٰلِکَ؟ قَالَتْ: اِنْ کَانَ نَبِیًّا فَلَنْ یَّضُرَّہٗ وَاِنْ لَّمْ یَکُنْ نَبِیًّا اِسْتَرَحْنَا مِنْہُ فَعَفَا عَنْھَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَلَمْ یُعَاقِبْھَا (السنن لابی داود: کتاب الدیات؛ السنن للدارمی؛ السنن الکبریٰ للبیہقی)

''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اہلِ خیبر کی ایک یہودیہ نے بھنے ہوئے گوشت میں زہر ملا کر اُسے نبی علیہ السلام کی خدمت میں تحفۃً بھیجا۔ نبی علیہ السلام نے اُس گوشت کی ران لے کر اُسے تناول فرمانا شروع کیا۔ آپ کے صحابہ بھی آپ کے ساتھ گوشت تناول کر رہے تھے' آپ نے اُنہیں کھانے سے روک دیا اور اُس یہودیہ کو بلا بھیجا اور اُس سے کہا: کیا اس گوشت میں تو نے زہر ملایا ہے؟ اُس نے کہا: آپ کو کس نے بتایا؟ آپ نے فرمایا: اِس ران نے مجھے بتایا ہے جو میرے ہاتھ میں ہے۔ یہودیہ نے اقرارِ جرم کرلیا۔ آپ نے اس سے پوچھا: اس کام کے کرنے میں تمہارا ارادہ کیا تھا؟ اُس نے کہا: میرا خیال تھا کہ اگر آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں تو زہر آپ کو کوئی نقصان نہ دے گا اور اگر آپ نبی کاذب ہیں تو ہم آپ سے چھٹکارا پالیں گے۔ نبی علیہ السلام نے اُسے معاف کردیا اور سزا نہیں دی۔''

(۱۷) معجزہ حنین الجذع: عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا اَنَّ امْرَاَۃً مِّنَ الْاَنْصَارِ قَالَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اَلَا اَجْعَلُ لَکَ شَیْئًا تَقْعُدُ عَلَیْہِ فَاِنَّ لِیْ غُلَامًا نَجَّارًا قَالَ: اِنْ شِئْتِ قَالَ: فَعَمِلَتْ لَہُ الْمِنْبَرَ فَلَمَّا کَانَ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ قَعَدَ النَّبِیُّ ﷺ عَلَی الْمِنْبَرِ الَّذِیْ صُنِعَ لَہٗ، فَصَاحَتِ النَّخْلَۃُ الَّتِیْ کَانَ یَخْطُبُ عِنْدَھَا حَتّٰی کَادَتْ اَنْ تَنْشَقَّ فَنَزَلَ النَّبِیُّ

ﷺ حَتّٰی اَخَذَهَا فَضَمَّهَا اِلَيْهِ فَجَعَلَتْ تَئِنُّ اَنِيْنَ الصَّبِيِّ الَّذِيْ يُسَكَّتُ حَتّٰی اسْتَقَرَّتْ
(البخاری: کتاب البیوع ؛ السنن للترمذی : کتاب المناقب عن رسول اللہ ﷺ ؛ السنن للنسائی : کتاب الجمعہ؛ السنن لابن ماجہ: کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا؛ المسند لاحمد بن حنبل ؛ صحیح لابن خزیمہ ؛ المصنف لعبد الرزاق ؛ الصحیح لابن حبان ؛ المسند لابی یعلی)

عَنْ اَبِيْ زَيْدٍ الْاَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اُدْنُ مِنِّيْ قَالَ: فَمَسَحَ بِيَدِهٖ عَلٰی رَاْسِهٖ وَلِحْيَتِهٖ ثُمَّ قَالَ : اَللّٰهُمَّ جَمِّلْهُ وَ اَدِمْ جَمَالَهٗ قَالَ : فَلَقَدْ بَلَغَ بِضْعًا وَّ مِئَةَ سَنَةٍ وَ مَا فِيْ رَاْسِهٖ وَلِحْيَتِهٖ بَيَاضٌ "اِلَّا نَبْذٌ" يَسِيْرٌ" وَلَقَدْ كَانَ مُنْبَسِطَ الْوَجْهِ وَلَمْ يَنْقَبِضْ وَجْهُهٗ حَتّٰی مَاتَ (رواہ احمد)

''ابوزید انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا: میرے قریب ہو جاؤ۔ (میں آپ کے قریب ہوا) تو آپ نے اپنے دستِ مبارک سے میرے سر اور ڈاڑھی کو تھپتھپانا شروع کیا اور دعا کی: اے اللہ! اُسے حسن و جمال عطا کر اور اُس کے حسن و جمال کو قائم و دائم رکھ۔ راوی کا کہنا ہے کہ ایک سو برس کی عمر سے زائد ہونے کے باوجود ابوزید کے سر اور ڈاڑھی کے چند بال سفید ہوئے تھے۔ اُن کا چہرہ ہمیشہ رخشندہ اور تابندہ رہتا تھا اور اُس میں تا دمِ آخر کوئی مرجھائی نہیں دیکھی گئی۔''

عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ رَجُلًا جَاءَ اِلَی النَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَ هُوَ يَخْطُبُ بِالْمَدِيْنَةِ فَقَالَ: قَحَطَ الْمَطَرُ فَاسْتَسْقِ رَبَّكَ فَنَظَرَ اِلَی السَّمَاءِ وَ مَا نَرٰی مِنْ سَحَابٍ فَاسْتَسْقٰی فَنَشَاَ السَّحَابُ بَعْضُهٗ اِلٰی بَعْضٍ ثُمَّ مُطِرُوْا حَتّٰی سَالَتْ مَثَاعِبُ الْمَدِيْنَةِ فَمَا زَالَتْ اِلَی الْجُمُعَةِ الْمُقْبِلَةِ مَا تُقْلِعُ ثُمَّ قَامَ ذٰلِكَ الرَّجُلُ اَوْ غَيْرُهٗ وَالنَّبِيُّ يَخْطُبُ فَقَالَ: غَرِقْنَا فَادْعُ رَبَّكَ يَحْبِسْهَا عَنَّا فَضَحِكَ ثُمَّ قَالَ : اَللّٰهُمَّ حَوَالَيْنَا وَلَا عَلَيْنَا مَرَّتَيْنِ اَوْ ثَلَاثًا فَجَعَلَ السَّحَابُ يَتَصَدَّعُ عَنِ الْمَدِيْنَةِ يَمِيْنًا وَّشِمَالًا يُمْطَرُ مَا حَوَالَيْنَا وَلَا يُمْطَرُ مِنْهَا شَيْءٌ" يُرِيْهِمُ اللّٰهُ كَرَامَةَ نَبِيِّهٖ ﷺ وَاِجَابَةَ دَعْوَتِهٖ (مُتَّفَقٌ" عَلَيْهِ)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جمعہ کے دن ایک بدو نبی علیہ السلام کے پاس آیا جبکہ آپ مدینہ میں (نمازِ جمعہ کا) خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ اُس بدو نے کہا: اے اللہ کے رسول! بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط سالی کا شکار ہو گئے ہیں، پس اپنے رب سے بارانِ رحمت کی دعا کیجئے۔ اس پر نبی علیہ السلام نے ایک نظر آسمان کی طرف کی جس میں ہمیں کوئی بادل نظر نہ آتا تھا۔ آپ نے جونہی بارش کے لئے دعا کی، تو بادلوں کے ٹکڑے آپس میں جڑنے شروع ہوئے اور اُس کے بعد اتنی بارش ہوئی کہ مدینہ کی گلیاں پانی سے چھلک پڑیں۔ بارش اُس سے اگلے جمعہ تک ہوتی رہی۔ وہی آدمی یا اُس کے علاوہ کوئی اور آدمی کھڑا ہوا جبکہ آپ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ اُس آدمی نے کہا: اے اللہ کے

رسول! ہم ڈوبنے کے قریب ہیں، اپنے اللہ سے دعا کیجئے کہ بارش کو ہم سے روک دے۔ آپ مسکرا دئے اور دو یا تین مرتبہ یہ الفاظ کہتے ہوئے اپنے ہاتھ بلند کئے: اے اللہ! بارش کو ہمارے مضافات کو لے جا اور ہم پر نہ برسا۔ اس پر بادل منتشر ہونا شروع ہوئے اور شہرِ مدینہ کے دائیں، بائیں کو منتقل ہو گئے۔ وہ ہماری بجائے ہماری کھیتیوں اور کھیتوں پر برسنا شروع ہوئی۔'' (بخاری: کتاب الادب ؛ صحیح مسلم: کتاب الاستقاء ؛ سنن ابی داؤد : کتاب صلاۃ الاستقاء ؛ سنن نسائی : کتاب الاستقاء ؛ سنن ابن ماجہ : کتاب اقامۃ الصلوٰۃ ؛ السنن الکبریٰ للبیہقی ؛ شرح معانی الآثار : الطحاوی ؛ المعجم الاوسط للطبرانی ؛ مسند ابی یعلیٰ ؛ صحیح ابن خزیمہ)

(7) ''امام بخاری اپنی تاریخ اور امام بیہقی اپنی سنن میں روایت کرتے ہیں کہ رحمتِ عالم ﷺ کا سفینہ نامی ایک غلام تھا۔ آقا علیہ السلام نے اُنہیں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی طرف بھیجا جو اُس وقت یمن کے امیر تھے۔ راستہ میں شیر سامنے آ گیا۔ اُس نے جب آپ پر حملہ کرنا چاہا تو آپ نے اُسے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا:

أَنَا سَفِينَةُ مَوْلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ وَمَعِيَ كِتَابُهُ' (حجة الله على العالمين' ج ۲' ص ۲۸'۲۰۹)

''اے شیر! خبردار میرا نام سفینہ ہے' میں حضور علیہ السلام کا غلام ہوں۔ میرے پاس حضور علیہ السلام کا گرامی نامہ بھی ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اُس شیر کو الہام کیا۔ وہ جنابِ سفینہ رضی اللہ عنہ کے کلام کو سمجھ گیا اور راہ سے ہٹ گیا۔''

امام بیہقی اور بزاز کی ایک روایت ہے جسے ان دونوں نے صحیح قرار دیا ہے اور امام سیوطی نے ان دونوں کی روایتوں کو صحیح کہا ہے کہ سفینہ رضی اللہ عنہ ایک کشتی میں سمندر کو عبور کر رہے تھے۔ آندھی کی وجہ سے کشتی ٹوٹ گئی۔ بڑی مشکل سے ایک نواحی جزیرہ میں پہنچے جہاں ایک شیر کھڑا تھا۔ حضرت سفینہ کہتے ہیں کہ میں نے اُسے کہا: أَنَا مَوْلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ (اے جنگل کے بادشاہ! میں رسولِ اکرم ﷺ کا غلام ہوں)۔ یہ سنتے ہی وہ میرے آگے آگے چل دیا اور اپنا کندھا ہلا ہلا کر اشارہ کرتا رہا اور مجھے اُس سڑک پر پہنچا دیا جو میری منزل کی طرف جاتی تھی۔ (ایضاً' صفحہ ۳۴ بحوالہ ''ضیاء النبی'' از کرم شاہ الازہری' جلد پنجم' صفحہ ۸۳۳)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حسی (کونیہ) معجزات کی طول طویل فہرست ہے جن میں سے چند ایک کے بیان پر اکتفا کیا گیا ہے۔

''اخبار بالمغیبات: نبی مکرم ﷺ کے جلیل القدر معجزات میں سے ایک رفیع الشان معجزہ یہ ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے صحابہ کو بالتفصیل آگاہ فرمایا۔ قاضی عیاض شفاء شریف میں لکھتے ہیں :

هٰذَا بَحْرٌ" لَا يُدْرَكُ قَعْرُهٗ وَلَا يُنْزَفُ غَمْرُهٗ

"(اس موضوع سے متعلق جو احادیث ہیں) وہ اپنی کثرت میں سمندر کی طرح ہیں جس کی تہ کو کوئی نہیں پہنچ سکتا، جس کے پانی کو کوئی نہیں نکال سکتا۔"

"ہم یہاں اُن بے شمار احادیث میں سے چند اہم احادیث قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تاکہ علوم غیبیہ کے بارے میں بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علم خداداد کی وسعتوں پر آپ کو آگاہی ہو اور محمد کریم ﷺ کے بے انتہا علوم و معارف پر کسی قسم کی انگشت نمائی سے باز رہیں۔"

(i) عَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ يَمَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَامَ فِيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَقَامًا اَيْ خَطَبَ وَمَا تَرَكَ شَيْئًا مِمَّا يَكُوْنُ فِيْ مَقَامِهٖ ذٰلِكَ اِلٰى قِيَامِ السَّاعَةِ اِلَّا حَدَّثَنَا بِهٖ حَفِظَهٗ مَنْ حَفِظَهٗ وَ نَسِيَهٗ مَنْ نَسِيَهٗ ــــ وَاللّٰهِ مَا تَرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِنْ قَائِدِ فِتْنَةٍ اِلٰى اَنْ تَنْقَضِيَ الدُّنْيَا يَبْلُغُ مَنْ مَعَهٗ ثَلَاثَ مِائَةٍ فَصَاعِدًا اِلَّا قَدْ سَمَّاهُ بِاسْمِهٖ وَ اِسْمِ اَبِيْهِ وَ قَبِيْلَتِهٖ بِحَيْثُ لَمْ يَبْقَ فِيْهِ شُبْهَةٌ" (السيرة النبوية ــ زيني دحلان، جلد ۳، صفحه ۱۷۳؛ الشفاء: صفحة ۱۷۳)

"حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ☆ فرماتے ہیں کہ ایک دن سرکارِ دو عالم ﷺ خطبہ ارشاد کرنے کے لئے ہمارے درمیان کھڑے ہوئے۔ آپ نے قیامت تک وقوع پذیر ہونے والے تمام واقعات ﷺ نے قیامت تک برپا ہونے والے تمام فتنوں کے قائدین جن کے پیروکاروں کی تعداد تین صد کا ذکر فرمایا۔ انہیں جس نے یاد رکھا، یاد رکھا اور جس نے انہیں بھلا دیا، سو بھلا دیا۔ بخدا! رسول اللہ یا اس سے زائد تک پہنچی ہو، اس کا نام بھی بتایا، اس کے باپ اور قبیلہ کا نام بھی بتا دیا اور اس کی ایسی شناخت کرائی تاکہ اس کے بارے میں کسی کو شبہ نہ رہے۔"

(ii) قَالَ اَبُوْ ذَرٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ لَقَدْ تَرَكَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَمَا يُحَرِّكُ طَائِرٌ" جَنَاحَيْهِ فِي السَّمَاءِ اِلَّا ذَكَرَ لَنَا مِنْهُ عِلْمًا

"حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس دنیا سے رحلت کرنے سے پہلے ہر اُس پرندے کے بارے میں ہمیں بتایا جو فضا میں اپنے پروں کو حرکت دیتا ہے۔"

(iii) عَنْ اَبِيْ عَبْدِاللّٰهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ: لَمَّا حَفَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْخَنْدَقَ مَرُّوْا بِكُدْيَةٍ فَتَنَاوَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْمِعْوَلَ مِنْ يَدِ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَوْ مِنْ يَدِ سَلْمَانَ فَضَرَبَ بِهَا ضَرْبَةً فَتَفَرَّقَتْ بِثَلَاثِ فِرَقٍ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَقَدْ فُتِحَتْ عَلَيَّ فِيْ ضَرْبَتِيْ هٰذِهٖ كُنُوْزُ

☆ یہ حذیفہ معمولی صحابی نہ تھے بلکہ صحابہ کرام کے درمیان صاحب سرِّ رسول اللہ ﷺ کے لقب جلیل سے مشہور تھے۔

کِسریٰ وَقَیصَرَ (فروع کافی: کتاب الروضۃ صفحہ ۲۰۱)

''حضرت امام جعفر علیہ السلام نے فرمایا کہ جب حضور علیہ السلام نے خندق کھودنے کا حکم دیا تو راستہ میں ایک چٹان حائل ہوگئی۔ حضور علیہ السلام نے حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کے دستِ مبارک سے یا حضرت سلمان فارسی سے لے لی اور اُس چٹان پر ایک ضرب لگائی اور اُس کے تین ٹکڑے ہوگئے۔ آپ نے فرمایا: میری اس ضرب سے میرے لئے کسریٰ اور قیصر کے خزانے فتح کر دئے گئے ہیں۔''

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ یہ خزانے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں فتح ہوئے۔ روایت میں فُتِحَتْ عَلَیَّ (مجھ پر فتح کئے گئے) کے الفاظ ایک حق بین کے لئے روشنی کا مینار ہیں جس سے شک وشبہ کا ادنیٰ احتمال بھی باقی نہیں رہتا۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا روحانی معجزہ : قرآن مجید ہے جس کی معجزاتی خصوصیت کے آگے بٹیلے' بدماغ (Stiff-necked) اور مغرور ومتکبر فصیح اللسان وبلیغ البیان عرب نہ ٹھہر سکے اور اس کے ناقابلِ تقلید چیلنج کو قبول نہ کرسکے۔ قرآن مجید کا حسن وجمال' حتمی حقائق کی قوّت' اس کی منطق اور طرزِ استدلال' اُس کی گہرائی اور عقل ودانش عربوں اور عجمیوں کے علم یا تصوّر سے کہیں بعید اور ماوراء ہے۔ جب قرآن مجید کی تلاوت ہوتی تھی تو مشرکین اپنے کانوں کو بند کرلیتے تھے (حٰمٓ السجدۃ: ۲۶) اور کچھ لوگ شور وغوغا کرتے اور سیٹیاں بجاتے تھے (سورۃ الانفال: ۳۵) کہ کہیں قرآن کی سحر البیانی اُن پر اثر نہ کرجائے۔ کفار قرآن مجید کے ناقابلِ گریز حسن وجمال اور اُس کی قوّت کی کوئی معقول توضیح پیش نہ کرسکے۔ تاہم اُنہیں لوگوں کو قرآن سے دُور رکھنے اور اپنی عداوت کے جواز کے لئے کوئی نہ کوئی عذر تراشنا پڑا۔ اُنہوں نے کذب بیانی کا اختراع کیا اور کہا: قرآن تو محض شاعری ہے (سورہ اَلطّور: ۳۰) یا جادو ہے (سورہ سبا: ۴۳)۔ اپنی تمام تر ناکامی اور بے بسی کے لئے اُنہیں صرف یہی بہانہ تراشنا پڑا تھا۔ سورہ اَلطّور کی آیت ۲۹ میں رب تعالیٰ نے اُن کے اس الزام کو مسترد کردیا:

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ۝ (اَلطّور: ۲۹)

''(اے حبیبِ مکرّم!) آپ نصیحت فرماتے رہیے۔ پس آپ اپنے رب کے فضل وکرم سے نہ تو کاہن (یعنی جنات کے ذریعے خبریں دینے والے) ہیں اور نہ دیوانے۔'' (۲۹ : ۵۲)

تاریخ شاہد ہے کہ مشرکینِ عرب نے رسول اللہ ﷺ کو خاموش کرنے کے لئے جنگوں پر جنگیں لڑیں۔ اُن کے لئے آسان ترین راہ تو یہی تھی کہ وہ سورہ کوثر جیسی مختصر سورت قرآن کے معیار کی لے آتے اور اس طرح قرآنی چیلنج کو قبول کرنے سے وہ میدان جیت جاتے۔ جب چند الفاظ زیادہ مؤثر طور پر مقصد کو حل کردیں تو کوئی معقول آدمی تلوار اٹھانا پسند نہیں کرتا۔ لیکن اُنہوں نے جنگ کو ترجیح دی اور ایسا کرنے میں اُنہوں نے عملاً اس بات کو تسلیم کرلیا کہ وہ قرآن کی نظیر پیش نہیں کرسکتے۔

قرآن مجید کا چیلنج اور یہ پیشگوئی کہ وہ کبھی بھی اس کی نظیر پیش نہیں کر سکیں گے (سورہ بنی اسرائیل: ۸۸؛ سورہ الطور: ۳۴) قرآن مجید کے اعجاز کا انتہائی نمایاں پہلو ہے جسے غیر مسلموں نے بھی تسلیم کیا ہے۔

اعجازِ قرآن پر غیر مسلموں کے اعترافات

(۱) ''ادبی نقطہ نگاہ سے قرآن کو خالص عربی زبان کا نمونہ سمجھا جاتا ہے جو آدھا نظم کی شکل میں اور آدھا نثر کی شکل میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ماہرینِ گرامر نے اپنے اصولوں کو قرآن میں استعمال شدہ محاورات اور جملوں سے منطبق کرنے کے لئے بعض صورتوں میں اپنے اصول وضع کئے ہیں اور یہ کہ اگرچہ باوقار، شائستہ اور لطیف ہونے کے حوالے سے قرآن کی نظیر لانے کی متعدد کوششیں کی گئی ہیں لیکن اب تک کوئی بھی اس کوشش میں کامیاب و کامران نہیں ہو سکا۔'' (F.F. Arbuthnot)

(۲) ''قرآن کا بیشتر حصہ قافیہ بندی کے لہجہ (Rhymed Cadence) میں ہے جو شعر و شاعری سے ملتا جلتا ہے لیکن اُسے نثری بھی کہا جا سکتا ہے۔ ادبی نقطہ نگاہ سے قرآن کو عربی زبان کا شاہکار سمجھا جاتا ہے اور کوئی شک نہیں کہ قرآن نے کسی اور کی نسبت سے زیادہ زبان کو متاثر کیا ہے۔ ادبی طرزِ بیان و انداز کا حتمی نمونہ اور اللہ تعالیٰ کا مستند پیغام ہوتے ہوئے قرآن، محمد (ﷺ) کا عظیم معجزہ ہے۔ آپ نے اپنے مخالفین کو اس جیسی چیز لانے کا بار بار چیلنج کیا۔'' (J. Christy Wilson)

(۳) ''اگر قرآن محمد (ﷺ) کی ذاتی کوشش کا نتیجہ ہوتا تو آپ کے مخالفین اس کے مقابلہ میں آتے۔ قرآن کا یہ چیلنج ہے کہ وہ اس جیسی دس سورتیں بنا کے لائیں۔ اور اگر وہ نہ لا سکیں (اور یقیناً وہ کبھی بھی نہ لا سکیں گے) تو اُنہیں قرآن کو امتیازی معجزہ کے طور پر تسلیم کر لینا چاہئے۔'' (G.A.R. Gibb)

(۴) ''قرآن لفظ بہ لفظ بلکہ حرف بہ حرف وحیِ الٰہی ہے جسے جبریل، محمد (ﷺ) کی طرف لائے جو ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ یہ اپنے آپ میں بھی ہمیشہ رہنے والا اور اللہ کے رسول محمد (ﷺ) کے لئے بھی دائمی معجزہ ہے۔ اس کی معجزانہ خصوصیت کچھ تو اس کے طرزِ بیان میں ہے جو ایسی مکمل اور بلند و بالا ہے کہ انسان اور جن دونوں مل کر بھی اس جیسی صرف ایک سورہ بھی نہیں لا سکتے اور اس کی معجزانہ خصوصیت اس کی تعلیمات میں، مستقبل کے متعلق پیش گوئیوں میں ہے اور حیران کن بات یہ کہ ایسی درست اور صحیح معلومات محمد (ﷺ) جیسا ناخواندہ اور اُمّی شخص اپنی طرف سے نہیں دے سکتا تھا۔'' (Hany Gaylord Dorman)

(۵) ''جب بھی محمد (ﷺ) سے اپنے مشن کی تصدیق کے لئے کسی معجزے کا مطالبہ کیا جاتا تو آپ قرآن

کے الٰہی کلام ہونے کے ثبوت میں قرآن کا متن اور اس کی نا قابلِ موازنہ عمدگی کو پیش کرتے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ غیر مسلموں کے لئے قرآن کی زبان کے انداز سے بڑھ کر اور کوئی معجزانہ بات نہیں جس میں قابلِ فہم کاملیت اور پُرکشش بلند آہنگی نے تعریف و ستائش کے ساتھ اُن قدیم لوگوں کو تاراج کر دیا جو فصاحت و بلاغت کے اس قدر دلدادہ تھے۔ قرآن کے وسیع ارکانِ کلمہ' بارُعب لہجہ اور امتیازی ترنم نے انتہائی دشمنوں اور انتہائی متشکک اور مذہب سے برگشتہ لوگوں کے اسلام قبول کرنے میں خاصا کردار ادا کیا ہے۔'' (Paul Casanova)

دیگر معجزات اور قرآن کے معجزہ میں فرق یہ ہے کہ انبیائے سابقہ اور ہمارے نبی ﷺ کے معجزات صرف اُن لوگوں کے لئے تھے جنہوں نے ان معجزات کا مشاہدہ کیا۔ اُن کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے وہ معجزات محض خبر کی حیثیت رکھتے ہیں جن پر ایمان لانا یا اُنہیں شک کی نگاہ سے دیکھنا سامعین کے ذہنی رجحان پر منحصر ہے۔ لیکن قرآن مجید جو ہر لحاظ سے مکمل اور اتم ہے' کا دعویٰ اور اُس کا ثبوت خود قرآن ہے اور اس کے معجزات دن بدن ظاہر ہو رہے ہیں۔

معجزہ اور جادو : معجزہ اور جادو کے درمیان کیسے تمیز کی جائے' ایک گرما گرم سوال رہا ہے۔ انتہائی آسان پیرائے میں اسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

(۱) اللہ کے پیغمبر کی بنیاد اُن تعلیمات پر ہوتی ہے جو وہ گم کردہ راہ لوگوں کو اُن کی دونوں دنیاؤں میں فلاح و بہبود کی خاطر دیتا ہے۔ پیغمبر کو عطا کردہ معجزہ بالعموم اُس کی پیغمبری کی تصدیق و توثیق کی علامت کے طور پر ہوتا ہے جس کے چیلنج کو قبول کرنے کی کسی میں جرأت نہیں ہوتی۔ اسی لئے اس چیلنج کو قبول نہ کر سکنے کی وجہ سے لوگوں کا عاجز ہونا ظاہر ہو جاتا ہے اور اسی لئے اس علامت کو ''معجزہ'' (جو ''عاجز'' سے ہے) کا نام دیا گیا۔ لوگوں کی اس عاجزی کو جادو کے کسی بھی زور سے اُن کی اہلیت اور اُس کام کرنے کی صلاحیت ہونے میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا چاہے جادوگر اپنے فن میں کتنے ہی ماہر اور مردِ میدان کیوں نہ ہوں۔ اس نا قابلِ انکار تاریخی حقیقت کی مثال موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے ہم عصر مصری جادوگروں کے مابین مقابلہ کی ہے۔

(۲) چونکہ معجزہ قادرِ مطلق اللہ کی ظاہر و باہر علامت ہوتا ہے' اس لئے اس کا انحصار علت و معلول کے قانون (Law of Causality) پر نہیں ہوتا' جبکہ جادو ایک تدوین شدہ فن ہوتا ہے اور اس کا انحصار کچھ مخصوص اصولوں پر ہوتا ہے اگرچہ اُن اصولوں کا علم عوام الناس کو نہ ہو۔

(۳) جادوگر اپنے جادو کی سحر انگیزیاں حالات کی مصلحت کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی بھی وقت دکھا سکتا ہے جبکہ اللہ کا پیغمبر معجزہ صرف اللہ کے حکم ہی سے دکھا سکتا ہے جو صرف حالات کی مصلحت کے تحت ہوتا ہے۔

(۴) جادوگر کی عام زندگی بدعملیوں اور لوگوں کو اذیّت پہنچانے سے عبارت ہوتی ہے۔ عوام الناس میں اُس کا تصوّر شیطان سے کم نہیں ہوتا جس کی جادوئی قوّتوں اور مہارتوں سے وہ خوف کھاتے ہیں۔ اس کے برعکس نبی اور رسول کی تمام زندگی حق وصداقت، خلوص، پاکیزگی، پارسائی اور تمام مخلوقاتِ خدا سے ہمدردی کا دوسرا نام ہوتی ہے۔ اُس کا کردار دامانِ سحر سے بڑھ کر روشن، پاکیزہ اور بے داغ ہوتا ہے اور بے داغ سپیدۂ سحر کی طرح جاذب اور درخشاں اور تابندہ ہوتا ہے۔ جادوگر ناپسندیدہ اور قابلِ نفرت ہوتا ہے جبکہ نبی اور رسول انسانیت دوستی کا صحیح نشان ہوتے ہوئے محبوب اور پسندیدہ ہستی ہوتا ہے۔

(۵) اللہ کا رسول اور نبی اللہ ہی کی اجازت سے معجزہ دکھاتا ہے اور جادوگر کی طرح یہ اُس کا پیشہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے مخصوص اوقات میں جبکہ ایک طرف اپنی نبوت ورسالت کی توثیق میں پیش کرتا ہے تو دوسری طرف پیغامِ الٰہی کو عام کرنے میں اُسے دکھاتا ہے۔ اُس کی زندگی کی عصمت اور پاکیزگیِ کردار کو سب لوگ تسلیم کرتے ہیں کیونکہ وہ شروع ہی سے اُنہی میں رہ رہا ہوتا ہے (سورہ یونس: ۱۶)، خواہ لوگ اُسے مشکوک نگاہ سے دیکھیں یا اُس کے پیغمبر من جانب اللہ ہونے کا انکار کردیں۔ اسی لئے وہ اُس سے اُس کے پیغمبر ہونے کی صداقت کا ثبوت مانگتے ہیں۔

اگر جادو اور معجزہ کسی بھی وقت ایک دوسرے کے مقابل آجائیں تو شکست، ذلت ورسوائی جادوگر کا مقدر بن جاتے ہیں چاہے جادوگر اپنے فن میں کتنے بڑے ماہر اور مردِ میدان کیوں نہ ہوں۔'' (قصص القرآن، جلد اوّل، صفحات ۴۲۷ تا ۴۲۹۔ مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی)

(۶) جادوگر کا بندھا ہوا طریقہ خالصتاً مصنوعی نیند طاری کرنے (Hypnosis) کا ہوتا ہے یا جسے ہم ہاتھ کی صفائی کہتے ہیں یعنی ایسی کیفیت طاری کرنا جس میں آدمی کامل شعور میں ہوتا دکھائی دیتا ہے لیکن وہ شعبدہ بازی سے اتنا متاثر ہوجاتا ہے کہ وہ کسی بھی چیز کے بارے میں سوچ تک نہیں سکتا۔ یہ حقیقت سورۃ الاعراف کی آیت ۱۱۶ کے الفاظ سَحَرُوْا اَعْیُنَ النَّاسِ (اُن جادوگروں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کردیا) سے ثابت ہے۔

اس مسئلہ کے متعلق ایک جدید مستند سکالر کا بیان ہے:

''فرعون کے جادوگروں کے سحرزدہ کرتبوں کو ہاتھ کی صفائی کے علاوہ کوئی اور نام دینا غلط ہے۔''
(Cheyne and Black's Encyclopaedia Biblica)

اسی قسم کے نظریہ کا اظہار Rawlinson نے کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

''وہ چالاک د ہوشیار شعبدہ باز تھے اور ہاتھ کی صفائی دکھانے میں ماہر تھے۔'' ("Moses : His Life and Times", p. 93)

اس کے برعکس معجزہ خالص صداقت پر مبنی ہوتا ہے اور اُس میں نیند کی کیفیت طاری کرنے (Hypnosis)

کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ مثلاً کفارِ مکّہ کے مطالبے پر جب پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُنہیں چاند کو دولخت کرنے کا معجزہ دکھادیا تو یہ معجزہ نہ صرف مکہ (عرب) کے کچھ لوگوں نے دیکھا بلکہ غیر ممالک میں بھی دیکھا گیا۔

معجزات کے تسلیم کرنے میں سنگِ گراں: ''سترھویں صدی عیسوی میں مغرب کے ایک فلسفی نے قانونِ انجذاب (Law of Absorption) پیش کیا جو ''زندگی کے میکانی نظریہ'' کے نام سے مشہور ہے' جس کے مطابق تمام کائنات "علت و معلول" (Cause and Effect) کے نظام میں اس قدر بندھی ہوئی ہے کہ وہ اس سے بال برابر بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوسکتی۔ مثال کے طور پر آگ کی فطرت جلا دینا ہے اور اُس کی اِس فطرت کو اُس سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا یہ کبھی نہیں ہوا کہ شعلہ زن آگ اُن چیزوں کو نہ جلائے جن کا جلانا اُس کی فطرت میں ہے۔''

''جب اِس نظریے کو دنیا بھر میں تسلیم کرلیا گیا تو مغربی مفکرین نے ہر اُس واقعہ کا مذاق اُڑانا شروع کیا جو اِس اصول پر پورا نہیں اترتا تھا اور اُسے ''مافوق الفطرت'' کا نام دیا گیا کیونکہ وہ اُن کے علّت و معلول کے نظریہ کے خلاف جاتا تھا۔ اُنہوں نے ہر اُس چیز کو ''وہم'' قرار دیا جو قدرتی عمل کے مطابق نہیں ہوتا تھا۔ اس نظریہ سے بڑھ کر اُس تمسخر نے جو اُنہوں نے مافوق الفطرت کے ساتھ کیا' اسلام کے احیائے نَو کرنے والوں کو مرعوب کردیا۔ جب انہوں نے معلوم کیا کہ قرآن میں مذکور پیغمبروں کے معجزات اِن نظریات کے موافق نہیں ہیں تو اُنہوں نے قرآن کے الفاظ کو اس انداز سے موڑنا شروع کیا کہ اِن معجزات کو قدرتی اصولوں کا مظہر ہونا چاہئے نہ یہ کہ وہ بے قاعدہ ہوکر مافوق الفطرت کہلائیں۔ مثلاً ''علت و معلول'' کے نظریہ کے مطابق کسی چیز کو جلانا آگ کا خاصہ ہے لیکن قرآن کا دعویٰ ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو نذرِ آتش کیا گیا تو وہ آپ پر سلامتی والی ہو گئی (بحوالہ سورۃ الانبیاء : ٦٩)۔ اس واضح قرآنی بیان سے نمٹنے کے لئے اسلام کے بعض تجدیدِ نَو کرنے والوں نے اس واقعہ کے وقوع ہی کا انکار کردیا۔ اُنہوں نے قرآنی الفاظ کو بازیچہ اطفال بنادیا کہ قرآن کے معانی کو ہی یوں بدل کر رکھ دیا کہ گزشتہ چودہ صدیوں کے کسی عالمِ قرآن وسنت نے اُس کا تصوّر تک نہیں کیا۔ اس طرح سرسیّد احمد خان نے اُمّتِ مسلمہ کے متفقہ اجماع کی خلاف ورزی کی اور اپنی تحریف کے عذر تلاش کرنے کی کوشش کی۔ سرسیّد احمد خان نے لکھا ہے :

> ''اسلام کے ابتدائی دَور کے علماء کے زمانہ میں طبعی علوم نے ترقی نہیں کی تھی۔ قانونِ فطرت کے بارے میں اُنہیں بتانے والا اور غلطی سے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ لہٰذا یہ اسباب اور اسی طرح کے دوسرے اسباب کچھ اس طرح کے تھے کہ اُس زمانہ کے علماء قرآن کے ان الفاظ کی طرف مناسب توجہ نہیں دے سکے۔ مثال کے طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ کی بابت کوئی حتمی شہادت موجود نہیں کہ اُنہیں فی الواقع آگ میں ڈالا گیا لیکن اُن علماء نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔'' (مقدمہ تفسیر قرآن)

حقیقت یہ ہے کہ احادیثِ مبارکہ اور روایات سے قطع نظر اس واقعے سے متعلق قرآن کے الفاظ ملاحظہ ہوں:
(۱) قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْا آلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ O قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ O وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ O (الانبیاء : ۶۸ تا ۷۰)

''وہ بولے: اس (ابراہیم) کو جلا دو اور اپنے (تباہ حال) معبودوں کی مدد کرو اگر تم (کچھ) کرنے والے ہو۔ ہم نے فرمایا: اے آگ! تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور سراپا سلامتی ہو جا۔ اور انہوں نے ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ بُری چال کا ارادہ کیا تھا مگر ہم نے اُنہیں بُری طرح نا کام بنا دیا۔''
(۲۱:۷۰-۶۸)

(۲) قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ O فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ O
(الصّٰفّٰت : ۹۷، ۹۸)

''وہ کہنے لگے: ان کے (جلانے کے) لئے ایک عمارت بناؤ، پھر اُنہیں (اُس کے اندر) سخت بھڑکتی آگ میں ڈال دو۔ غرض اُنہوں نے ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ ایک چال چلنا چاہی، سو ہم نے اُن ہی کو نیچا دکھا دیا۔'' (نتیجۃً آگ گلزار بن گئی)۔ (۳۷:۹۸، ۹۷)

ابراہیم علیہ السلام کا آگ سے صحیح و سالم نکل آنے کو مغرب کی موجود ''نیچرل فہم'' کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لئے قرآن کے انتہائی واضح اور غیر مبہم الفاظ میں تحریف کی گئی۔ لہٰذا اِس ''نیچرل فہم'' کے لئے سرسید احمد خان اور اُن کے ہمنواؤں نے نہ صرف تفسیرِ قرآن کے اصولوں کی بیخ کنی کی بلکہ الفاظ کو من گھڑت معانی پہنا کر انسان کے جسمانی طور پر دوبارہ جی اُٹھنے کے بنیادی عقیدے کو بھی نقصان پہنچایا۔ اُنہوں نے شیاطین، جنات اور فرشتوں کے وجود کو توہم قرار دیا اور انبیاء علیہم السلام کے تمام معجزات کا انکار کر دیا۔ اس مقصد کے لئے اُنہوں نے قرآن مجید کو شاعرانہ علامتی (مجازی) قصوں اور تمثیلی کہانیوں میں بدل دیا۔ اُن کی تاویلات کو پڑھتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی حیاتِ طیّبہ میں واقع ہونے والے کسی وقوعہ کو سادہ طور پر بیان کرنے کی بجائے قرآن نے اُنہیں علامتی معنوں میں تیرہ صدیوں کے بعد پہلی مرتبہ مغرب کے پُر جوش حامیوں کے لئے پیش کیا ہے۔ قرآن کے واضح الفاظ کو اپنی مرضی اور مفاد کے معانی پہنانا اُن کے نزدیک کھیل تماشہ ہے۔ اس کی لاتعداد مثالیں تفسیر میں ملتی ہیں اور اس سمت میں اُن کی جدّ وجُہد سرسید احمد خان کی زبانی ملاحظہ ہو:۔

''جب معجزات کو مافوق البشر یا مافوق الفطرت سمجھ لیا جائے تو ہمیں اُن کا انکار ہے اور ہم اُن کے واقع ہونے کو ناممکن سمجھتے ہیں۔ ہمارا یہ بانگ دہل یہ اعلان ہے کہ کسی مافوق الفطرت واقعہ کا جسے معجزہ کہتے ہیں، واقع ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ پھر اگر ہم اُسے الٰہی طاقت تسلیم کر بھی لیں تو یہ بے مقصد ہوگا۔''
(''تفسیر القرآن'' از سرسید احمد خان بحوالہ "An Approach to the Qur'anic Sciences"... Muhammad Taqi Usmani, pp. 391-394)

<u>ڈیوڈ ہیوم (David Hume) اور معجزات</u>: مغرب کا ممتاز فلسفی ڈیوڈ ہیوم، سرسید احمد خان کے زمرہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس نے بڑی شدّ ومد سے معجزات کے اِمکان کی تردید کی ہے۔ اپنے نقطۂ نظر کو تقویت دینے

اور اُسے ثابت کرنے کے لئے اُس نے منطق اور استدلال کا عجیب طریقہ اختیار کیا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ ہمارا تجربہ اور مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ کائنات کا نظام ایک خاص طرز اور غیر متبدّل معیّن سطور پر چل رہا ہے اور وہ نظام ''علت و معلول'' کے قانون سے ایک قدم بھی باہر نہیں جا سکتا جبکہ معجزات جو ''علّت و معلول'' کے قانون کے خلاف ہیں، ہمارے تجربے اور مشاہدے کے بھی خلاف ہیں۔ اس لئے ڈیوڈ ہیوم کے نزدیک معجزے کے جواز کو تسلیم کرنا ممکن نہیں ہے بالخصوص جبکہ ہمارے تجربے اور مشاہدے کے مقابل کوئی مدلّل اور ٹھوس دلائل موجود نہ ہوں۔ اُس کے نزدیک معجزے کے مستند ہونے کے لئے کوئی باوزن دلائل موجود نہیں۔ ☆

انسائیکلو پیڈیا بری ٹینیکا کا مضمون نگار ڈیوڈ ہیوم کے مفروضے پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اِس ''مفروضہ اصول'' کی کہ معجزات انسانی مشاہدات اور تجربات کے خلاف ہوتے ہیں' کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اور پھر ''تجربات'' کا مطلب کیا ہے؟ اس بیان کو بھی کسی ٹھوس ثبوت کی ضرورت ہے کہ معجزہ تمام تجربات کے خلاف ہوتا ہے۔ پہلے تو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ آیا معترض نے تمام تجربات کا احاطہ کرلیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ تجربات سے مراد عام تجربات ہیں اور معجزہ عام تجربات کے خلاف ہوتا ہے تو پھر اس سے صرف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ معجزات عام تجربات کے خلاف ہوتے ہیں' تمام تجربات و مشاہدات کے مخالف ہونا تو لازم نہ آیا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ معجزہ کسی تجربہ کے مطابق ہو اور وہ تجربہ آپ کے فہم کی رسائی سے بھی بلند و بالا ہو۔ (جلد ۱۵' صفحہ ۵۸۶)

معجزات کے متعلق عام مغربی رُجحان: سر جیمز جینز (Sir James Jeans) نے معجزات کو تسلیم نہیں کیا۔ معجزات کے انکار میں تمام علمائے سائنس و فلسفہ نے ڈیوڈ ہیوم اور ہکسلے (Huxley) کی ہم نوائی نہیں کی۔ مشہور و معروف سائنسدانوں کی اچھی خاصی تعداد معجزات پر یقین رکھتی تھی جن میں مشہور نیوٹن' فرائڈ' سمپسن' کیلن اور لسٹر ہیں۔ مشہور جرمن سائنسدان لوزی (Lotze) نے معجزات کی تائید میں متعدد مضامین لکھے اور یہ ثابت کیا کہ معجزات کسی بھی طرح سائنس یا عقلِ سلیم (Common Sense) کے خلاف نہیں ہیں۔ (Article on "Miracles" in the Encyc. Britannica, pp. 587, 588)

معجزات کی بابت نصاریٰ کا اعتراض: نصاریٰ کہتے ہیں کہ معجزات کا اکثر ذکر قرآن میں پایا جاتا ہے مگر کوئی آیت ایسی نظر نہیں آتی جس سے یہ ثابت ہو کہ حضرت محمد (ﷺ) نے معجزے دکھائے ہیں بلکہ بہت سی آیتیں ایسی ہیں جن میں معجزے نہ دکھانے کا سبب درج ہے اور بعض ایسی بھی ہیں جن میں وہ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ میں معجزے دکھانے کو نہیں بھیجا گیا۔ سورۃ العنکبوت کی آیت ۵۰ اور بنی اسرائیل کی آیت ۵۹ میں ہے:

(۱) وَقَالُوْا لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ آيٰت'' مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَاللّٰهِ وَاِنَّمَا اَنَا نَذِيْر'' مُّبِيْن'' O
''اور کفار کہتے ہیں کہ اُن پر (یعنی نبی اکرم ﷺ پر) اُن کے رب کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اتاری گئیں۔ فرما دیجئے کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں اور میں تو محض صریح ڈرانے والا ہوں۔'' (۲۹ : ۵۰)

☆ ''علمائے اسلام نے معجزہ کی یہ تعریف نہیں کی کہ وہ قوانینِ فطرت کے خلاف ہو بلکہ معجزہ وہ ہے جو خارقِ عادت ہو۔ نیز معجزات کو قوانینِ فطرت کے خلاف کہنے کا دعویٰ تو تب درست ہوسکتا ہے جب کہ پہلے تمام قوانینِ فطرت اور سننِ الٰہیہ کا احاطہ کرنے کے دعویٰ کو کوئی ثابت کرلے اور جب تک یہ ثابت نہ ہو اور جو یقیناً ثابت نہیں تو پھر معجزات کو سننِ الٰہیہ کے خلاف ٹھہرانا سراسر لغو ہے۔'' (ضیاء القرآن' جلد دوم' صفحہ ۶۳۲)

(۲) وَمَامَنَعَنَا اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰیٰتِ اِلَّاۤ اَنۡ كَذَّبَ بِهَا الۡاَوَّلُوۡنَ (بنی اسرائیل : ۵۹)
"اور ہمیں (اب بھی اُن کے مطالبہ پر) نشانیاں بھیجنے سے (کسی چیز نے) منع نہیں کیا سوائے اس کے کہ اِن ہی (نشانیوں) کو پہلے لوگوں نے جھٹلا دیا تھا۔" (۱۷ : ۵۹)

"اُن کے اِس اعتراض کا تحقیقی جواب یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس قدر معجزے دکھائے کہ کسی نبی نے اپنی اُمت کو نہیں دکھائے۔ جن دو آیتوں سے معترض نے استدلال کیا ہے' اُن میں ایسی نشانیوں کے نہ ملنے کی وجہ مذکور ہے کہ قریش جو باوجود معجزاتِ کثیرہ دیکھنے کے اور نشانیاں طلب کرتے ہیں (مثلاً کوہِ صفا کا سونا ہو جانا' مکہ کے پہاڑوں کا دُور کیا جانا تا کہ زمین قابلِ زراعت ہو جائے اور نہروں کا جاری ہونا تا کہ باغات لگ جائیں)۔ ان نشانیوں کے دینے سے ہمیں اس امر نے روکا ہے کہ اس قسم کی نشانیاں ہم نے پہلی امتوں کو طلب کرنے پر عطا کیں مگر وہ ایمان نہ لائے اور ہلاک ہوئے۔ ہماری عادت یوں ہی جاری ہے کہ ہم کسی قوم کے سوال پر ایسی آیات کو صرف عذاب سے ڈرانے کے لئے بطور پیش خیمہ بھیجا کرتے ہیں۔ اگر وہ قوم ان آیات پر ایمان نہ لائے تو پھر ہم ضرور اُن پر عذابِ استیصال نازل کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر کفار قریش کے سوال پر وہ نشانیاں ہمارے حبیب علیہ السلام کی دعا سے عطا کر دی جائیں تو یہ بھی اُنہی کی طرح جھٹلائیں گے اور عذابِ استیصال کے موجب ہوں گے۔ مگر ہم نے بہ مقتضائے حکمت اس اُمت کو عذابِ استیصال سے محفوظ رکھا ہے۔ لہٰذا ہم نے وہ نشانیاں اُنہیں عطا نہیں کیں۔ پھر فرمایا:

اَوَلَمۡ یَكۡفِهِمۡ اَنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡكَ الۡكِتٰبَ یُتۡلٰى عَلَیۡهِمۡ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَرَحۡمَةً وَّذِكۡرٰى لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ○ (العنکبوت : ۵۱)
"کیا اُن کے لئے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر (وہ) کتاب نازل فرمائی ہے جو اُن پر پڑھی جاتی ہے' بے شک اس (کتاب) میں اُن کے لئے رحمت اور نصیحت ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔" (۲۹ : ۵۱)

یعنی قرآنِ پاک ایسی نشانی ہے جو تمام نشانیوں سے بے نیاز کر دینے والی ہے۔ وہ زندہ و جاوید معجزہ ہے جو ہر مکان و زمان میں اُن پر پڑھا جاتا ہے اور پڑھا جاتا رہے گا۔ اس میں ایمان والوں کے لئے بڑی رحمت اور نصیحت ہے نہ کہ اُن کے لئے جو بغض و عناد رکھتے ہیں۔

اِس تقریر سے واضح ہو گیا کہ آیاتِ بالا سے معجزات کی نفی نہیں کی گئی بلکہ ان میں باوجود کثرتِ معجزات ان خاص نشانیوں کے نہ ملنے کی وجہ بیان ہوئی ہے جو کفار نے محض عناد سے طلب کیں۔ لہٰذا عیسائیوں کا یہ کہنا کہ قرآن میں کوئی ایسی آیت نظر نہیں آئی جس سے ثابت ہو کہ آنحضرت ﷺ نے معجزے دکھائے' صرف عناد پر مبنی ہے۔ بہ قولِ قرآن وہ اپنے منہ سے بڑا بول بولتے ہیں :

كَبُرَتۡ كَلِمَةً تَخۡرُجُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ اِنۡ یَّقُوۡلُوۡنَ اِلَّا كَذِبًا ○ (الکھف : ۵)
"یہ کتنا بڑا بول ہے جو اُن کے منہ سے نکل رہا ہے۔ وہ (سراسر) جھوٹ کے سوا کچھ کہتے ہی نہیں۔" (۱۸:۵)

(۱۶۹) میزان (Mizaan)

میزان کا لغوی و شرعی معنیٰ: علامہ محمد یعقوب فیروز آبادی (م ۸۱۷ھ) لکھتے ہیں: میزان کا معنی ہے: عدل اور مقدار (القاموس المحیط ص ۱۲۳۸، مطبوعہ بیروت ۱۴۲۴ھ)

علامہ محمد بن مکرم بن منظور افریقی (م ۷۱ھ) لکھتے ہیں: میزان اُس آلے کو کہتے ہیں جس سے چیزوں کا وزن کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

(۱) وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (الانبیاء: ۴۷)
''اور قیامت کے دن ہم انصاف کی میزانوں کو رکھیں گے۔'' (۴۷ : ۲۱)

(۲) لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید: ۲۵)
''بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ہم نے اُن کے ساتھ کتاب اور میزانِ عدل نازل فرمائی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوسکیں۔'' (۲۵ : ۵۷)

(۳) فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ○ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ○ (القارعۃ: ۶ تا ۹)
''پس رہا وہ جس (کی نیکیوں) کے پلڑے بھاری ہوں گے تو وہ خوشگوار عیش و مسرت میں ہوگا اور جس (کی نیکیوں) کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو اُس کا ٹھکانہ دوزخ (کی گہرائی) میں ہوگا۔'' (۶ تا ۹ : ۱۰۱)

زجاج نے کہا کہ میزان کی ایک تفسیر یہ ہے کہ میزان کے دو پلڑے ہیں اور دنیا میں میزان (ترازو) کو اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ لوگ اس کے ساتھ عدل کریں اور قیامت کے دن اُس میں لوگوں کے اعمال کا وزن کیا جائے گا۔ دوسری تفسیر کے مطابق میزان اُس کتاب کا نام ہے جس میں مخلوق کے اعمال لکھے جائیں گے۔ ابن سیدہ نے کہا: حدیث میں ہے کہ میزان کے دو پلڑے ہیں۔ (مسند احمد، ج ۲، ص ۱۷۰)

''میزان'' کا شرعی معنیٰ یہ ہے: وہ چیز جس میں حقوقِ واجبہ کا وزن کیا جائے خواہ وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر میزانِ عقل رکھ دی ہے جس سے خیر اور شر اور حُسن اور قبح کا ادراک کیا جاتا ہے۔ اِسی میزانِ عقل کو عرف میں ''ضمیر'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ہر مسلمان کے دل میں ایک میزانَ شرع ہوتی ہے جس سے وہ احکامِ شرعیہ کا وزن کرتا ہے اور کسی بھی کام کے ارادے کے وقت وہ میزان اُسے بتاتی ہے کہ وہ کام اُس کے لئے شرعاً جائز ہے یا ناجائز۔ قرآن مجید میں ہے:

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ○ وَلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ (القیامۃ: ۱۴، ۱۵)

''بلکہ انسان کو اپنے نفس پر بصیرت حاصل ہے خواہ وہ کتنی تاویلات کرے۔'' (۷۵ : ۱۵'۱۴)

''اعمال اور اُن کی کیفیات کے وزن پر ایک اشکال کا جواب: قیامت کے دن میزان میں نیکیوں کا جو وزن کیا جائے گا' اُس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ انسان کے نیک اور بُرے اعمال کوئی ٹھوس چیز تو نہیں کہ ایک پلڑے میں نیک اعمال اور دوسرے پلڑے میں بُرے اعمال رکھ دئے جائیں' پھر اُن کا وزن کر کے یہ معلوم کیا جائے کہ اس انسان کی نیکیاں زیادہ ہیں یا گناہ زیادہ ہیں۔ نیز بعض نیک اعمال اخلاص سے کئے جاتے ہیں اور بعض نیک اعمال ریا کاری سے کئے جاتے ہیں اور اخلاص اور ریا کاری کیفیات ہیں' ان کا وزن کیسے ممکن ہوگا؟ وزن تو اُس چیز کا کیا جاتا ہے جو کوئی مقدار والی چیز ہو اور کیفیات مقدار والی چیز نہیں ہوتیں۔ قدیم علماء نے اس کا جواب یہ دیا تھا کہ بندوں کے اعمال نامے ایک قسم کے رجسٹر ہیں اور اُن میں ان سب چیزوں کا ان کی پوری کیفیات سے اندراج ہوگا اور دراصل وزن ان رجسٹروں کا کیا جائے گا جو مقدار والی ٹھوس چیزیں ہیں۔''

''دوسرا جواب یہ ہے کہ نیک اعمال کے مقابلہ میں حسین صورت والے اجسام بنا دئے جائیں گے اور بُرے اعمال کے مقابلہ میں بدصورت اجسام بنا دئے جائیں گے اور جیسے جیسے نیکی اور بدی میں اضافہ ہوگا' اُسی طرح اُن کی خوبصورتی اور بدصورتی میں بھی اضافہ ہوگا۔''

''اس کا تیسرا جواب یہ ہے کہ سائنس کی تیز رفتار ترقی کی وجہ سے اب ایسے آلات ایجاد ہو چکے ہیں کہ جن چیزوں کے وزن اور اُن کی پیائش کا پہلے کوئی تصور نہیں تھا' اب اُن کی پیائش کا معلوم ہونا روزمرہ ہو گیا ہے۔ مثلاً کمرے میں کتنے درجہ مثبت یا منفی درجہ حرارت ہے' اب یہ آلات کے ذریعے معلوم ہو جاتا ہے۔ ہوا کا وزن جاننے کا پہلے کوئی ذریعہ نہ تھا' اب ہوا کا دباؤ بیرومیٹر کے ذریعے معلوم ہو جاتا ہے۔ آواز کی پیائش کے بارے میں پہلے کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا' اب سونومیٹر کے ذریعے آواز کی پیائش ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح جسم میں کتنا درجہ حرارت ہے' پہلے اس کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا لیکن اب تھرمامیٹر کے ذریعے معلوم ہو جاتا ہے۔ انسان کے خون کے ایک قطرہ میں کتنے ملی گرام گلوکوز ہے' کتنا کولیسٹرول ہے' یہ گلوکومیٹر کے ذریعے معلوم ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح لیبارٹری ٹیسٹ کے ذریعے معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان کے خون میں کتنا یورک ایسڈ ہے' کتنا یوریا ہے' کتنا کیلشیم ہے' کتنا ہیموگلوبین ہے' اُس کے خون میں کتنے سرخ ذرات ہیں' سفید ذرّات کتنے ہیں' اُس کے خون میں کیا کیا بیماریاں ہیں' اُسے ایڈز ہے یا نہیں؟ ہپاٹائٹس اے' بی' سی یا اور کوئی مہلک بیماری ہے یا نہیں؟ ملیریا' ٹائیفائڈ ایسی تمام بیماریاں خون میں ہوتی ہیں اور اب سے سو سال پہلے اُن کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا لیکن اب میڈیکل سائنس کی روزافزوں ترقی کے باعث یہ چیزیں لیبارٹری ٹیسٹ سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ سو جس طرح اب خون کے ٹیسٹ کے ذریعے انسان کی صحت اور بیماری کا علم ہو جاتا ہے' اسی طرح کوئی تعجب اور حیرت کی بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میزان میں ایسی صفت پیدا کر دی ہو جس سے معلوم ہو جائے کہ انسان کے اعمال میں

نیکیوں کی مقدار کتنی ہے اور برائیوں کی مقدار کتنی ہے۔ نیک اعمال میں اخلاص کی اور ریا کاری کی کتنی مقدار ہے۔ انسان نے جس عقل اور سائنس سے وزن اور پیمائش کے یہ آلات ایجاد کیے' وہ عقل اور سائنس اللہ ہی کی دی ہوئی ہے۔ جب وزن اور پیمائش میں مخلوق کی تجزیہ کاری کا یہ عالم ہے تو خالق کی تجزیہ کاری کا کیا عالم ہوگا!''
(''تبیان القرآن''۔ علامہ غلام رسول سعیدیؒ' جلد ۱۱' صفحہ ۶۰۸)

''میزان میں وزن کرنے کی حکمتیں: اللہ ربّ العزت کو ہر انسان کے نیک اور بد عمل کا علم ہے۔ وزن اس لئے کیا جائے گا کہ (۱) اُس شخص پر کوئی ظلم تو نہیں ہو رہا۔ اس کے اعمال کے مطابق اُسے جزا دی جا رہی ہے۔ (۲) جس شخص کو اللہ معاف کر دے' اُسے یہ معلوم ہو کہ اُس پر اللہ تعالیٰ کا کتنا کرم ہے۔ اُس کے گناہ کس قدر زیادہ اور نیکیاں کس قدر کم تھیں۔ پھر بھی اللہ نے اُسے معاف کر دیا۔ (۳) میزان سے نتیجہ معلوم ہونے کے بعد شفاعت کرنے والے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اُس کی شفاعت کریں اور جن مقرّبین کو اللہ تعالیٰ بلند درجات عطا فرمائے تو اہلِ محشر پر یہ ظاہر ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی عظیم عبادات کی وجہ سے اُنہیں نواز رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کے محبوبین کی شان اور اُن کی عبادات کا کمال ظاہر ہو۔ (۴) اسی طرح کوئی شخص لوگوں کے نزدیک بہت نیک اور بزرگ ہوتا ہے اور وہ اُسے اللہ تعالیٰ کا بہت مقرب ولی جانتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں وہ بہت بدکار اور مبغوض ہوتا ہے۔ اگر اعمال کا وزن کئے بغیر اُسے سزا دی جاتی تو لوگ سمجھتے کہ اُس پر (معاذ اللہ) ظلم ہو رہا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے عدل کو ظاہر کرنے کے لئے اُس کے اعمال کا وزن کرائے گا۔ (۵) نیک لوگوں کے اعمال کا وزن اُن کی فضیلت کے اظہار کے لئے کیا جائے گا اور لوگوں کے سامنے اُن کی شان بڑھانے اور اُن کی عزت افزائی کے لئے کیا جائے گا اور کفار کے اعمال کا وزن اُن کی ذلت و رسوائی کے اظہار کے لئے کیا جائے گا۔ حشر کے دن نیک لوگوں کی عزت افزائی کی مثال ان احادیث میں ہے:

(۱) ''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے: جو میری ذات سے محبت کرنے والے ہیں' اُن کے لئے نور کے منبر ہوں گے' اُن کی انبیاء اور اولیاء تحسین کریں گے۔'' (سنن الترمذی' رقم الحدیث: ۲۳۹۰؛ مسند احمد' ج ۵' ص ۲۳۶؛ صحیح ابن حبان' رقم الحدیث: ۵۷۷؛ المعجم الکبیر' ج ۲۰' ص ۱۶۷؛ حلیۃ الاولیاء' ج ۵' ص ۱۲۱)

(۲) حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ کے بعض بندے ایسے ہیں جو نہ نبی ہوں گے' نہ شہید لیکن قیامت کے دن اُن کا اللہ کے ساتھ قرب دیکھ کر انبیاء اور شہداء اُن کی تحسین کریں گے۔ صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہوں گے؟ فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی وجہ سے لوگوں سے محبت کریں گے۔ اُن کے درمیان نہ کوئی رشتہ داری ہوگی اور نہ اُنہوں نے اُن کو کوئی مال دیا ہوگا۔ اُن کے چہرے نورانی ہوں گے' وہ نور پر فائز ہوں گے اور جب (قیامت کے دن) لوگ خوفزدہ ہوں گے تو اُنہیں کوئی خوف نہ ہوگا اور جب لوگ غمگین ہوں گے تو اُنہیں کوئی غم نہ ہوگا۔'' (سنن ابی داؤد' رقم الحدیث: ۳۵۲۷؛ مشکوٰۃ' رقم الحدیث: ۵۰۱۲)

(ایضاً' جلد ۱۱' ص ۵۹۳)

''وزن کئے جانے والوں کی قسمیں: علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی (م ۶۶۸ ھ) لکھتے ہیں کہ آخرت میں لوگوں کے تین طبقات ہوں گے۔ بعض ایسے مسلمان ہوں گے جن کا کوئی کبیرہ گناہ نہیں ہوگا۔ یہ متقین ہیں اور بعض ایسے مسلمان ہوں گے جن کے فواحش اور کبیرہ گناہ بھی ہوں گے اور اُن کی نیکیاں بھی ہوں گی۔ یہ مخلطین ہیں اور تیسری قسم میں کفار اور مشرکین ہیں۔''

''رہے متقین تو اُن کی نیکیاں ایک روشن پلڑے میں رکھی جائیں گی اور اُن کے صغیرہ گناہ دوسرے پلڑے میں رکھے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے صغیرہ گناہوں کا کوئی وزن نہیں ہونے دے گا اور اُن کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوجائے گا اور دوسرا تاریک پلڑا وزن سے خالی رہے گا۔''

''رہے مخلطین تو اُن کی نیکیاں روشن پلڑے میں اور اُن کی برائیاں تاریک پلڑے میں رکھی جائیں گی۔ پھر اُن کی برائیوں کا وزن ہوگا تو اگر اُن کی نیکیاں زیادہ وزنی ہوں تو وہ جنت میں داخل ہوجائیں گے خواہ اُن کی نیکیوں کا وزن معمولی سا زیادہ ہو اور اگر اُن کی برائیاں زیادہ وزنی ہوں تو وہ دوزخ میں داخل ہوجائیں گے خواہ برائیاں معمولی سی زیادہ ہوں ماسوا اس کے کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں اپنے فضل و کرم سے معاف فرمادے۔ اور اگر اُن کی نیکیوں اور برائیوں کا وزن برابر ہو تو وہ اصحابِ اعراف میں سے ہوں گے۔ یہ اُس وقت ہے جب اُن کے گناہوں کا تعلق حقوق اللہ سے ہو اور اگر اُن کے گناہوں کا تعلق حقوق العباد سے ہو اور اُن کی نیکیاں زیادہ ہوں تو اُن کی نیکیوں کے ثواب کو بہ قدرِ حقوق کم کردیا جائے گا۔ اور اگر اُن کی نیکیاں دے کر بھی اُن کے حقوق پورے نہ ہوئے تو حق داروں کے گناہ اُن پر بہ قدرِ حقوق ڈال دیئے جائیں گے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے۔''

''رہا کافر تو اُس کے کفر کا تاریک پلڑا میں وزن کیا جائے گا۔ اُس کی کوئی نیکی نہیں ہوگی جسے روشن پلڑے میں رکھا جائے۔ اُس کا روشن پلڑا فارغ ہوگا اور نیکی اور خیر سے خالی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اُسے دوزخ میں جانے کا حکم دے گا اور ہر کافر کو اس کے باقی گناہوں کے اعتبار سے عذاب دیا جائے گا۔''

''میزان کے خطرہ سے بچنے کے لئے حقوق العباد کی ادائیگی ضروری ہے: امام محمد بن محمد غزالی (متوفی ۵۰۵ ھ) لکھتے ہیں:

''یاد رکھئے! میزان کے خطرہ سے بروزِ قیامت وہی شخص نجات پاسکتا ہے جو دنیا میں میزانِ شرع سے اپنے اعمال، اقوال اور خواہشات کا محاسبہ کرے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آخرت کے محاسبہ سے پہلے اپنا محاسبہ کرلو اور آخرت میں وزن سے پہلے اپنے اعمال کا وزن کرلو۔ انسان اپنا محاسبہ کرکے موت سے پہلے ہر گناہ سے پکی توبہ کرلے اور اللہ تعالیٰ کے فرائض کی ادائیگی میں جو تقصیر ہوگئی ہے، اُس کا تدارک کرے اور لوگوں کے جو حقوق اُس پر واجب ہیں، اُنہیں ادا کرے اور اُس نے لوگوں پر جو زیادتیاں کی ہیں، اُن کی تلافی کرے، اُس نے جسے

زبان سے جو تکلیف دی ہے یا جس کی غیبت کی ہے یا جس کے متعلق بدگمانی کی ہے، مرنے سے پہلے اُنہیں راضی کر لے تو وہ بغیر محاسبہ کے جنت میں جائے گا۔ اور جو لوگوں کے حقوق ادا کرنے اور زیادتیاں معاف کرانے سے پہلے مر گیا تو قیامت کے دن اُسے حق دار گھیر لیں گے۔ اِن حقوق کے بدلے میں اُس کی نیکیاں اُنہیں دی جائیں گی اور جب نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو اُن کے گناہ اُس کے اوپر ڈال دیئے جائیں گے۔'' (احیاء علوم الدین، جلد چہارم، صفحہ ۴۵۴)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن حقوق والوں کو اُن کے حقوق ادا کیے جائیں گے حتیٰ کہ سینگوں والی بکری سے بغیر سینگ والی بکری کا بدلہ لیا جائے گا۔ (صحیح مسلم: رقم الحدیث: ۲۵۸۲؛ مسند احمد ج ۲، ص ۳۶۳؛ مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ۶۹۴۴؛ المعجم الکبیر ج ۲۳، ص ۳۶۷)

آیا صرف مسلمانوں کے اعمال کا وزن ہوگا یا کافروں کے اعمال کا بھی؟ اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ آیا صرف مسلمانوں کے اعمال کا وزن کیا جائے گا یا کافروں کے اعمال کا بھی وزن ہوگا۔ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ صرف مسلمانوں کے اعمال کا وزن کیا جائے گا اور کافروں کے اعمال کا وزن نہیں کیا جائے گا کیونکہ سورۃ الکہف کی آیت ۱۰۵ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا۝

''یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیتوں اور اُس سے ملاقات کا انکار کیا، سو اُن کے سارے اعمال اکارت گئے تو ہم قیامت کے دن اُن کے لئے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے۔'' (۱۸: ۱۰۵)

''لیکن اس مسئلہ میں تحقیق یہ ہے کہ جن کافروں کو رب تعالیٰ دوزخ میں ڈالنا چاہے گا، اُنہیں بغیر وزنِ اعمال کے دوزخ میں ڈال دے گا اور بقیہ کافروں کے اعمال کا وزن کیا جائے گا جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے:

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ۝ (المؤمنون: ۱۰۳)

''اور جن کی میزان کے پلڑے ہلکے ہوئے تو یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو نقصان میں ڈالا وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔'' (۲۳: ۱۰۳)

امام ابو منصور محمد بن محمد ماتریدی سمرقندی حنفی (متوفی ۳۳۳ھ) وزنِ اعمال کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''کافر کو اُس کی نیکیوں پر کوئی اجر نہیں دیا جائے گا کیونکہ دنیا میں اُسے جو نعمتیں دی گئی تھیں وہی اُس کی نیکیوں کا اجر تھا۔ رہا مؤمن تو اُس کی برائیوں سے درگزر کر لیا جائے گا اور اُس کی نیکیوں پر اجر دیا جائے گا کیونکہ مؤمن کی تعظیم و تکریم میں رب تعالیٰ سورۃ الاحقاف کی آیت ۱۶ میں فرماتا ہے:

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ

''یہی وہ لوگ ہیں جن کے بہت نیک اعمال تو ہم قبول فرماتے ہیں اور اُن کے گناہوں سے ہم درگزر فرماتے ہیں، وہ جنتی لوگ ہیں۔'' (۴۶: ۱۶)

(۱۷۰) مباہلہ (Mobahilah)

لفظ ''مباہلہ'' کا مصدر ب۔ ہ۔ ل (بھل) ہے جس کا معنیٰ اونٹنی کے تھنوں کو اس طرح ڈھانپ لینا ہے کہ کوئی اُس کا دودھ چوس نہ سکے۔

''اصطلاح میں مباہلہ کا معنیٰ یہ ہے کہ فریقین میں سے ہر فریق نہایت عاجزی سے اللہ تعالیٰ کے حضور یہ دعا کرے کہ اُن میں سے جو جھوٹا ہو اُس پر اللہ کی لعنت ہو۔'' (E.W. Lane's Arbic-English Lexicon, Vol. 2, p. 267)

نجران مکہ مکرمہ سے جانب یمن سات منزل کے فاصلہ پر ایک بڑا شہر ہے۔ یہ شہر ملکِ عرب میں عیسائی مذہب کا مرکز تھا اور ۷۳ گاؤں اس سے متعلق تھے۔ جناب سرورِ ہر عالم ﷺ کے وصال سے ایک سال پیشتر ۱۰ ہجری میں یہاں کے عیسائیوں کا ایک وفد مدینہ منورہ میں آیا جس میں ساٹھ آدمی تھے جن میں چوبیس اُن کے اشراف میں سے تھے اور ان چوبیس میں سے تین مرجع کل تھے: عبدالمسیح جن کا لقب عاقب تھا اور سید جس کا نام ایہم اور بقولِ بعض شرجیل تھا اور ابو حارثہ بن علقمہ جو اُن کا اُسقف (بڑا پادری) تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُنہیں دعوتِ اسلام دی اور اُن کے تمام شکوک وشبہات کا قرآنِ حکیم نے تحقیقی جواب دے دیا کیونکہ عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ پیدائش کو اس بات کی دلیل بناتے تھے کہ آپ خدا یا خدا کے بیٹے ہیں۔ قرآنِ کریم ان کی واضح تردید فرماتا ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کے خدا ہونے کی یہی دلیل ہے تو پھر آدم علیہ السلام کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ اُن کا تو نہ کوئی باپ تھا اور نہ کوئی ماں۔ اگر تم اُنہیں انسان مانتے ہو تو عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا کیوں بنا رکھا ہے۔ رب تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے سامنے آدم اور عیسیٰ علیہما السلام کی پیدائش یکساں ہے۔ وہ بھی اُس کی قدرت کی جلوہ گری ہے اور یہ بھی۔ غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقت یہود کی افتراء پردازیوں، بہتان تراشیوں اور نصاریٰ کی مبالغہ آرائیوں میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ قرآن کریم کے نے یہ سارے پردے ہٹا دئے۔ لیکن اُنہوں نے پھر بھی دعوتِ توحید کو قبول نہ کیا اور اپنے عقیدۂ تثلیث پر اڑے رہے تو ان معاندین پر حجت قائم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولِ مکرّم ﷺ کو اُن سے مباہلہ کرنے کا حکم فرمایا۔ اور یہ آیت نازل ہوئی:

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَآءَنَا وَأَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝ (آلِ عمران:۶۱)

''پھر جو کوئی آپ سے اس (عقیدۂ مسیح کی اُلوہیت کے) بارے میں حجت کرے بعد اس کے کہ آپ کے پاس یقینی علم آ گیا تو فرما دیجئے کہ اچھا آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تمہارے بیٹوں کو بھی اور اپنی عورتوں کو بھی اور تمہاری عورتوں کو بھی اور اپنے آپ کو بھی اور تمہارے تئیں بھی، پھر ہم خشوع سے دعا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی رحمت سے دُوری کی بد دعا کریں۔'' (۳ : ۶۱)

چنانچہ آپ ﷺ حضرت امام حسین اُٹھائے، حضرت حسن کو انگلی سے پکڑے تشریف لائے اور حضور علیہ السلام

کے پیچھے پیچھے خاتونِ جنت اور اُن کے پیچھے علی حیدرِ کرّار کرّم اللہ وجھہ الکریم آ رہے تھے۔حضور علیہ السلام نے وفدِ نجران کو مباہلہ کی دعوت دی۔ جب اُنہوں نے یہ نورانی چہرے دیکھے تو اُن کے اُسقف نے کہا کہ اگر تم نے اُن سے مباہلہ کیا تو یاد رکھو کہ تمہارا نام ونشان تک مٹ جائے گا۔ چنانچہ اُنہوں نے صلاح مشورہ کے لئے مہلت طلب کی اور دوسرے روز مباہلہ کرنے سے انکار کر دیا اور جزیہ دینے کے لئے تیار ہو گئے اور صلح کر لی۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اگر وہ مباہلہ کر لیتے تو بندر اور سور بن جاتے اور یہ جنگل اُن پر آگ برساتا۔ اللہ تعالیٰ نجران اور اُس کے باشندوں کو تباہ کر دیتا یہاں تک کہ کوئی پرندہ بھی درخت پر باقی نہ رہتا۔

واقعہ مباہلہ کے سبق آموز نکات: نصاریٰ کا اس طرح مباہلہ سے گریز صاف بتا رہا ہے کہ اعدائے اسلام بھی حضورِ اقدس ﷺ کی دعا کی اجابت کے قائل تھے۔اس مباہلہ سے ایک اور بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر دینِ اسلام اللہ کی طرف سے نہ ہوتا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نبی برحق نہ ہوتے تو ہرگز اپنے دعویٰ پر اللہ کے حضور جھوٹے پر لعنت اور غضب الٰہی نازل ہونے کی بد دعا کرنے کا حوصلہ اور جرأت نہ کر سکتے۔کیا کوئی اپنی چالاکی سے اللہ کو بھی دھوکہ دے سکتا ہے؟ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو پھر عیسائی علماء کیوں دعا مانگنے کی جرأت نہ کر سکے۔ نیز یہ کہ اگر نصرانیوں کو اپنے عقیدہ کی سچائی کا یقین ہوتا تو وہ کبھی مباہلہ کرنے سے باز نہ آتے۔

"بعض لوگوں نے یہاں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی صرف ایک صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی تھیں۔ ورنہ دوسری صاحبزادیاں بھی اُس دن مباہلہ میں شرکت کرتیں۔تو اُن کی خدمت میں گزارش ہے کہ تاریخ کی تمام معتبر کتابوں (ناسخ التواریخ اور کافی وغیرہ) میں مرقوم ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی چار صاحبزادیاں تھیں اور اُس دن خاتونِ جنت سلام اللہ علیہا کا اکیلے تشریف لانا اس لئے تھا کہ باقی صاحبزادیاں انتقال فرما چکی تھیں۔حضرت رقیّہ نے ۲ ہجری میں' حضرت زینب نے ۸ ہجری میں اور حضرت اُمِّ کلثوم نے ۹ ہجری میں انتقال فرمایا اور یہ واقعہ مباہلہ ۱۰ ہجری کا ہے۔

أَنفُسَنَا کے لفظ سے بعض لوگوں نے حضرت علی کرّم اللہ وجھہ الکریم کی خلافتِ بلافصل پر استدلال کیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ أَنفُسَنَا سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں جس سے ثابت ہوا کہ آپ نفسِ رسول ہیں' گویا آپ رسول جیسے ہیں۔تو جب آپ حضور کریم کے مساوی ہو گئے تو آپ سے زیادہ خلافت کا حقدار اور کون ہو سکتا ہے؟ اس کے متعلق التماس ہے کہ حضرت علی کا شمار أَبْنَاءَ نَا میں ہے کیونکہ آپ نبی اکرم ﷺ کے داماد ہیں اور داماد کو بیٹا کہا جاتا ہے اور اگر أَنفُسَنَا ہی شمار کر لیں تو عینیت اور مساوات کہاں سے ثابت ہوئی کیونکہ یہ لفظ تو اُن لوگوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو قریبی رشتہ دار یا دینی اور قومی بھائی ہوں جیسے لَاتُخْرِجُوْنَ أَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ اور ثُمَّ أَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ تَقْتُلُوْنَ أَنْفُسَكُمْ ان سب آیات میں اور ان کے علاوہ دیگر آیات میں أَنْفُس کا لفظ دینی اور قومی بھائیوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔

(۱۷۱) محمد ﷺ (Mohammad

لفظ ''محمد'' کا مصدر ح۔م۔د ہے بمعنی تعریف وستائش کرنا خواہ وہ کسی ظاہر خصوصیت کے لئے ہو یا کسی مخفی وصف کے لئے ہو۔ لفظ ''مُحَمَّد'' اسم مفعول ہے جس کے معنی اہلِ لغت نے حسبِ ذیل کئے ہیں :

(۱) هُوَالَّذِیْ حُمِدَ مَرَّةً بَعْدَ مَرَّةٍ (الروض الانف سہیلی ۱:۲۸۱؛ لسان العرب لمنظور افریقی ۳:۱۵۶؛ القاموس المحیط لمجد الدین فیروز آبادی ۱ : ۱۸۹)

''محمد وہ ہے جس کی تعریف بار بار بہ کثرت کی جائے۔''

(۲) وَمُحَمَّد'' إِذَا كَثُرَتْ خِصَالُهُ الْمَحْمُوْدَةُ (مفردات القرآن لامام راغب اصفہانی ص ۱۳۱)

''محمد وہ ہے جس کی قابلِ تعریف وستائش خصلتیں بہ کثرت ہوں۔''

قرآن مجید میں لفظ ''مُحَمَّد'' حسبِ ذیل چار مقامات پر آیا ہے :

(۱) وَمَا مُحَمَّد'' إِلَّا رَسُوْل'' (آلِ عمران : ۱۴۴)

''اور محمد (ﷺ) رسول ہی تو ہیں۔'' (۱۴۴ : ۳)

(۲) مَا كَانَ مُحَمَّد'' اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (الاحزاب: ۴۰)

''محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور سب انبیاء کے آخر میں (سلسلہ نبوت ختم کرنے والے) ہیں۔'' (۴۰ : ۳۳)

(۳) وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَآمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ (محمد : ۲)

''اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور اُس (کتاب) پر ایمان لائے جو محمد (ﷺ) پر نازل کی گئی۔'' (۲ : ۴۷)

(۴) مُحَمَّد'' رَّسُوْلُ اللهِ (الفتح : ۲۹)

''محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔'' (۲۹ : ۴۸) ☆

کچھ محدثین کے نزدیک نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک ہزار اسمائے حُسنٰی ہیں اور اُن میں سے ہر نام آپ کے روشن ومعتبر کردار کے معجزانہ پہلو کا آئینہ دار اور عکاس ہے۔ جس طرح اللہ تبارک وتعالٰی کے ہزاروں اسمائے حسنٰی ہیں لیکن اُس کا ذاتی نام ''اللہ'' ہے اسی طرح نبیِ اکرم ﷺ کے سینکڑوں اسمائے حسنٰی میں آپ کا ذاتی نام ''محمد'' ہے ﷺ۔

☆ خیال رہے کہ محولہ بالا چاروں آیات میں لفظ ''محمد'' کا استعمال بیانیہ ہے نہ کہ ندائیہ۔ پورے قرآن مجید میں رب تعالٰی نے اپنے حبیب لبیب کو ''یا محمد'' کہیں نہیں کہا بلکہ کہیں یا اَيُّهَا الرَّسُوْلُ تو کہیں یا اَيُّهَا النَّبِيُّ کہیں یا اَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ اور کہیں یا اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ کہیں یٰسٓ اور کہیں طٰہٰ جیسے پیارے القاب سے خطاب کیا۔ نام سے خطاب نہ کرنے بلکہ لقب کے ساتھ خطاب کرنے میں اپنے محبوب علیہ السلام کی حد درجہ تعظیم ومحبت کا اظہار ہے جبکہ قرآن میں مذکور تمام انبیاء علیہم السلام کو اُن کے اسمائے گرامی کے ساتھ خطاب کیا گیا۔

لفظ ''مُحمّد'' کا ہر حرف با معنیٰ ہے: لفظ حروف کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اگر کسی لفظ کا کوئی ایک حرف ہٹا دیا جائے تو بقایا حروف کا معنیٰ فوت ہو جاتا ہے۔ مثلاً لفظ ''طاہر'' ایک با معنیٰ لفظ ہے اور ط۔ا۔ہ۔ر حروف کا مجموعہ ہے۔ اگر اس کا پہلا حرف ط ہٹا دیا جائے تو اہر بے معنیٰ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اور مثالیں ہیں۔ لیکن اللہ اور مُحمّد کے دونوں لفظ مذکورہ اصول سے مستثنیٰ ہیں۔ اگر لفظ اللہ سے پہلا حرف الف ہٹا دیا جائے تو باقی للہ بچتا ہے جس کا معنیٰ ''اللہ کے لئے'' ہے۔ اگر اس کا دوسرا حرف ل ہٹا دیا جائے اور پہلا حرف الف ساتھ ملا دیا جائے تو باقی اِلٰہ بچتا ہے بہ معنیٰ معبود۔ اگر اس کے دونوں حروف الف اور لام ہٹا دیے جائیں تو باقی لَہٗ بچتا ہے بہ معنیٰ ''اُس (اللہ) کے لئے''۔ اور بالآخر اگر لَہٗ کا ل ہٹا دیا جائے تو باقی ہٗ رہ جاتا ہے بہ معنیٰ ''وہ''۔

اسی طرح لفظ مُحمّد (جو ہمارے نبی کا ذاتی نام ہے) کا ہر حرف با معنیٰ ہے۔ اگر اس کا پہلا حرف م ہٹا دیا جائے تو باقی حَمّد رہ جاتا ہے بہ معنیٰ تعریف۔ اگر اس کا دوسرا حرف ح ہٹا دیا جائے اور پہلے حرف م کو ساتھ ملا دیا جائے تو باقی مُمِد رہ جاتا ہے بہ معنیٰ ''مددگار''۔ اگر شروع کے م اور ح دونوں کو الگ کر دیا جائے تو باقی مَد رہ جاتا ہے بہ معنیٰ بلند و بالا جو رسالت کے منصب رفیع و عظیم کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ بالآخر اگر دوسرا میم حذف کر دیا جائے تو دال باقی رہ جاتا ہے بہ معنیٰ راہ نما اور راہبر۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ لفظ مُحَمّد کا ہر حرف خدائے واحد کے وجود کا مسلمہ ثبوت ہے۔

مُحمّد اور احمد: نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسمائے حسنیٰ کے علاوہ یہ دونوں نام آپ کے ذاتی نام ہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ آپ کا زمینی نام ''مُحمّد'' اور آسمانی نام ''احمد'' ہے۔ مؤخر الذکر یعنی احمد سورۃ الصّف کی آیت ۶ میں ایک بار استعمال ہوا ہے جب عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بتایا تھا کہ میرے بعد احمد نامی ایک رسول تشریف لائیں گے۔

یہاں بجا طور پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ از روئے حدیث آپ کا زمینی نام محمد اور آسمانی نام احمد ہے تو عیسیٰ علیہ السلام نے یہ پیش گوئی زمینی لوگوں کو بتائی تو انہیں آپ احمد نام کی بجائے محمد نام سے متعارف کراتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زمین پر پیدا ہوئے اور زمینی لوگوں کے ساتھ گزر بسر کیا لیکن پیدائش سے لے کر آسمان کی طرف اٹھائے جانے تک حقیقتاً آپ کی اکثر عادتیں آسمانی مخلوق سے ملتی جلتی تھیں۔ آپ کی پیدائش معروف و معلوم قدرتی طریقے کے خلاف ہوئی تھی۔ زمین پر تھوڑا عرصہ رہنے کے بعد آپ کو آسمان کی طرف اٹھا لیا گیا۔ تو آپ کے آغاز و انتہا کے مدِّ نظر آپ کی آسمانی زندگی آسمانی مخلوقات کے مشابہ ہے۔ اسی وجہ سے آپ نے لفظ ''احمد'' کا استعمال کیا جو آسمانی مخلوق میں وسیع طور پر جانا پہچانا تھا۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بہت سے نام لفظ ''حمد'' سے ماخوذ ہیں: حمد کا لفظ نبی علیہ السلام کے

مختلف اسمائے گرامی میں نمایاں مقام کا حامل ہے۔ لفظ ''حمد'' سے کم از کم چار نام ماخوذ ہیں: محمد، احمد، حامد اور محمود۔ اِن میں سے پہلا اور آخری نام (یعنی محمد اور محمود) کا مفہوم ایک ہی ہے یعنی وہ شخص جس کی تعریف کی جائے، جبکہ احمد اور حامد کا معنیٰ وہ شخص ہے جو تعریف و ستائش کرے۔ آپ ﷺ کو ''احمد'' کا نام عطا فرما کر رب تعالیٰ نے آپ کو اپنی حمد و ثنا کرنے والا بنا دیا جس کے نتیجہ میں آپ اُس بلند و بالا مقام پر فائز ہو گئے جس کے اوپر کوئی اور مقام نہیں۔ اِسی طرح آپ کو لفظ ''محمّد'' عطا فرما کر ایسی ہستی بنا دیا جس کی بار بار تعریف کی جاتی ہے اور اس لحاظ سے بھی آپ کو مقامِ رفیع و عظیم عطا ہوا۔ لفظ ''محمد'' میں مبالغہ کی صفت ہے اور لفظ ''احمد'' اسم تفضیل ہے اور یہ دونوں لفظ آپ کی تعریف و ستائش کی کاملیت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ پوری کائنات میں کبھی کوئی ایسا شخص ایسا نہیں ہوا اور نہ ہو گا جس نے اپنے رب کی اس طرح تعریف کی ہو جس طرح امام الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کی حمد و ثنا کی ہے۔ اسی طرح اُس اکملیت اور کاملیت کا بھی تصور تک نہیں کیا جا سکتا جس کے ساتھ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعریف و ستائش کی جاتی رہی اور ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ نہ صرف انسان، جن اور فرشتے آپ کے مدّاح ہیں بلکہ آپ کا خالق و مالک رب تعالیٰ بھی آپ کا مدّاح ہے کیونکہ:

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (۳۳:۵۶)

''بے شک اللہ اور اُس کے فرشتے نبی علیہ السلام پر رحمت بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی آپ پر رحمت بھیجا کرو اور خوب خوب سلام بھیجا کرو۔'' (۳۳ : ۵۶)

اللہ کی رحمت بھیجنا تو ظاہر ہی ہے۔ مسلمانوں اور فرشتوں کی صلوٰۃ بھیجنے کے معنی یہ ہیں کہ اُنہیں حکم مل رہا ہے کہ رسول پر اُس رحمتِ خاص کی دعا کرتے رہیں اور اسے اُن کے حق میں طلب کرتے رہیں۔ اسی کو عرفِ عام میں درود بھیجنا کہتے ہیں۔ یہاں صلوٰۃ سے مراد رحمتِ عام نہیں بلکہ نبی کے شایانِ شان رحمتِ خاص مراد ہے۔

امام مرتضیٰ الزَّبِیدی ''تاج العروس'' میں صلوٰۃ کا معنیٰ لکھتے ہیں:

قَالَ ابْنُ الاعرابی اَلصَّلاۃُ مِنَ اللّٰہِ اَلرَّحْمَۃُ وَمِنْہُ ھُوَالَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ اَیْ یَرْحَمُ

''ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے صلوٰۃ کا معنیٰ ''رحمت'' ہے اور یہی اس آیت کا معنیٰ ہے ''وہ تم پر صلوٰۃ بھیجتا ہے'' یعنی ''وہ تم پر رحمت بھیجتا ہے۔''

علامہ راغب اصفہانی (م ۵۰۲ھ) لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کا محمد ﷺ پر صلوٰۃ پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُن کی حمد و ثنا فرماتا ہے اور اُن کا تزکیہ فرماتا ہے۔ فرشتوں کی صلوٰۃ پڑھنے کا مطلب ہے کہ وہ اللہ سے نبی علیہ السلام کے لئے رحمت طلب کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی صلوٰۃ پڑھنے کا مطلب ہے کہ وہ اپنے نبی علیہ السلام کے لئے اللہ کی برکت و رحمت کے نزول کی دعا کرتے ہیں۔'' (المفردات، ج ۲، ص ۳۷۴، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ ۱۴۱۸ھ)

قاضی عیاض نے فرمایا:

''سلام کا معنیٰ ہے تسلیم کرنا' مان لینا' اطاعت کرنا اور سرِ تسلیم خم کرنا۔ گویا مؤمنوں سے فرمایا ہے کہ تم لوگ آپ پر صلوٰۃ پڑھو اور اس حکم کو مان لو' تسلیم کرلو اور اس کی اطاعت کرو۔'' (الشفاء' ج ۲' ص ۵۱' ۵۰)

''ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ہمیں آپ پر صلوٰۃ پڑھنے کا حکم دیا اور ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آپ کا مرتبہ کیا ہے اور آپ پر کس طرح صلوٰۃ پڑھنی چاہئے تو ہم نے صلوٰۃ پڑھنے کو اللہ کے سپرد کر دیا اور ہم نے کہا: اے اللہ! اپنے رسولِ مکرّم کے مرتبہ کو تو ہی جاننے والا ہے' اُن کے مرتبہ کے موافق تو ہی اُن پر صلوٰۃ پڑھ سکتا ہے' سو تو ہی اُن پر صلوٰۃ پڑھ۔'' (مجمع بحار الانوار' ج ۳' ص ۳۴۷ بحوالہ تبیان القرآن' ج ۹' ص ۵۳۴)

صَلُّوْا امر کا صیغہ ہے جس کا معنیٰ ہے ''تم درود بھیجو'' اور سَلِّمُوْا بھی امر کا صیغہ ہے جس کا معنیٰ ہے ''تم سلام بھیجو''۔ دونوں صیغوں کی نوعیت یکساں ہے لیکن سَلِّمُوْا کے ساتھ تَسْلِيْمًا کا اضافہ ہونے سے وہ مفعولِ مطلق بن گیا اور سلام کی معنویت میں زور پیدا ہو گیا کیونکہ مفعولِ مطلق سے معنیٰ میں زور (Emphasis) پیدا ہو جاتا ہے۔

نبیِ مکرّم ﷺ نے سلام بھیجنے کا طریقہ یہ بتایا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ اور درود بھیجنے کا طریقہ یہ بتایا: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّد۔ صلوٰۃ وسلام کسی بھی انداز سے پڑھا جائے' جائز ہے۔ چاہے کوئی اَلصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللہ پڑھے یا اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰى مُحَمَّد پڑھے' ہر صورت میں اللہ کے حکم پر عمل ہو جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے اور بھی کئی درود مروی ہیں جن کے صیغے مختلف ہیں اور اپنی ضرورت وخواہش کے مطابق اُنہیں پڑھنا بھی جائز ہے۔

معلوم ہوا کہ درود بھیجنا ذکرِ الٰہی اور عبادت کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ تمام عبادات یعنی نماز' روزہ' حج' صدقات وخیرات وزکوٰۃ یہاں تک کہ اللہ کی راہ میں سر کٹانا وغیرہ کسی بھی کارِ خیر کی قبولیت کی ضمانت نہیں دی جا سکتی لیکن درود پاک بہر صورت رب کے ہاں منظور ومقبول ہے کیونکہ رب تعالیٰ خود اِس عمل میں شامل ہے۔ تفسیر روح البیان میں ہے کہ بجائے اسمِ ذات مُحَمَّد لانے کے جیسا کہ قرآن کا عام دستور حضرت انبیاء علیہم السلام کے معاملہ میں ہے' اسمِ صفت النَّبِي لانا حضور علیہ السلام کے مزید اعزاز واکرام کے لئے ہے اور اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو اپنے محبوبِ مکرّم ﷺ کی تعظیم وتوقیر کا بڑی سختی سے حکم فرمایا:

لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ (سورة الفتح : ۹)

''تاکہ (اے لوگو!) تم اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اُن (کے دین) کی مدد کرو اور اُن کی (بہ دل وجان) تعظیم وتوقیر کرو۔'' (۴۸ : ۹)

درود کے ساتھ سلام کا حکم کیوں؟ اس ضمن میں پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری لکھتے ہیں:

''نبی مکرم ﷺ کے اعلیٰ اور رفیع مرتبہ کے پیشِ نظر مؤمنوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے نبی پر نہ صرف صلوٰۃ یعنی درود بھیجیں بلکہ سلام بھی بھیجیں۔ سلام بالعموم کسی ممتاز شخصیت' قائد و پیشوا یا سیاست دان کو کیا جاتا ہے۔ لیکن نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مرتبہ و مقام رب تعالیٰ کے نزدیک اُن شخصیات سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہے جنہیں سلام کیا جانا چاہئے اور یہ چیز آپ ﷺ کے خصائل حمیدہ اور بے مثل طرزِ زندگی کی وجہ سے ہے۔''

درود و سلام کا حکم صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے خاص کیوں؟ اس کی اصل وجہ تو مالکِ کون و مکاں ہی بہتر جانتا ہے لیکن کچھ مفسرین کے نزدیک اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ دینِ حق کی تبلیغ اور جبینِ انسانیت کو ایک خدائے واحد کے حضور جھکانے میں جن تکالیف اور اعصاب شکن مصائب کو آپ نے جھیلا' کسی اور نبی یا رسول نے نہیں جھیلا اور اس ضمن آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی بھی ہے کہ مجھ سے پہلے اگر تمام انبیائے کرام کی جھیلی ہوئی تکالیف و مصائب کو ترازو کے ایک پلڑے میں اور مجھ اکیلے کی تکالیف کو ترازو کے دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے' تو میرا پلڑا اُن سب سے بھاری ہوگا۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود بھیجنا سنتِ الٰہیہ ہے: جیسا کہ سورۃ الاحزاب کی مندرجہ بالا آیت ۵۶ سے معلوم ہوا کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود بھیجنے کا نہ صرف حکم ہے بلکہ یہ سنتِ الٰہیہ بھی ہے۔ ماحول' ضرورت اور زمانے کے بدلنے سے احکام میں تبدیلی ہو جاتی ہے مگر سنتِ الٰہیہ میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ سنت کو ہمیشہ ابدی' دائمی اور آفاقی قانون کا درجہ حاصل رہتا ہے جو ہر دَور میں بحالہ ایک ہی شکل میں قائم و برقرار رہتا ہے (بحوالہ سورہ فاطر: ۴۳ و سورۃ الفتح: ۲۳)۔ لہٰذا مؤمنوں کے لئے فرض ہے کہ وہ سنتِ الٰہیہ میں شریک ہوتے ہوئے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بکثرت درود و سلام بھیجا کریں۔

یہاں پہنچ کر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اپنے رب کے ہاں رفعتِ مقام کا پتہ چلتا ہے۔ اسلام کی تمام اقسامِ عبادات (نماز' روزہ' حج وغیرہ) نبی علیہ السلام کی سنتِ مبارکہ ہیں نہ کہ اللہ کی کیونکہ اللہ نماز نہیں پڑھتا' نہ ہی وہ روزہ رکھتا ہے اور نہ ہی حج کرتا ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود بھیجنا اُس کی سنتِ مبارکہ ہے اور اسی لئے درودِ پاک کو سب عبادات سے زیادہ معزز' شاندار' ترجیحی اور ارفع عمل سمجھا گیا ہے۔

مختلف طریقہ ہائے عبادات سے متعلق احکاماتِ الٰہیہ کچھ اصول و ضوابط کے ماتحت ہیں مثلاً پنجگانہ نماز اپنے وقت پر ادا کی جاتی ہے اور اس کی قبولیت سنتِ رسول کے مطابق ادا ہونے کے ساتھ مشروط ہے۔ اسی طرح روزوں میں بھی کچھ اصولوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے یعنی سنتِ رسول کے تمام طریقہ ہائے عبادت کے اپنے اپنے تقاضے

ہیں۔لیکن چونکہ صلوٰۃ وسلام چونکہ خالق کائنات کا طریقہ ہے اس لئے وہ وقت اور دوسرے ذیلی واجبات کا پابند نہیں۔

''آیت مذکورہ کا سادہ سا گرائمری تجزیہ اس نکتے کو مزید واضح کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔عربی گرامر میں جملے کی دو قسمیں ہوتی ہیں: جملہ فعلیہ جس میں فعل ظاہر ہوتا ہے اور جملہ اسمیہ جو محض نام کا جملہ ہوتا ہے۔جملہ فعلیہ کسی خاص وقت (ماضی' حال یا مستقبل) سے متعلق ہوتا ہے اور وہ تینوں زمانوں میں سے کسی ایک میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔وقت بھی غیر مستقل اور عارضی چیز ہے۔اگر یہ زمانہ حال میں ہے تو اُسے بہر حال جانا ہے اور اگر زمانہ مستقبل سے متعلق ہے تو اُسے ابھی آنا ہے۔''

''تاہم جملہ اسمیہ تمام اوقات کو اپنے اندر لئے ہوتا ہے۔یہ دائمی اور مستقل ہوتا ہے۔ایک نام سے منسلک ہونے کے بعد اس کا تعلق تمام اوقات سے ہو جاتا ہے۔آیت مذکورہ ۵۶ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے جملہ اسمیہ سے بات شروع کی ہے۔زمانہ ماضی کا صیغہ کہ ''اللہ اور اس کے فرشتوں نے درود بھیجا'' کی بجائے یا زمانہ مستقبل کا صیغہ کہ ''اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجیں گے'' استعمال کرنے کی بجائے زمانہ حال میں بات کی ہے کہ ''اللہ اور اُس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں''۔یہ کوئی حکم یا ہدایت نہیں بلکہ ایک حقیقت کا اعلان ہے جو ہمیشہ جاری رہے گا۔اس طرح نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود وسلام کا عمل ایک غیر منقطع اور دائمی عمل ہے۔''

''صلوۃ'' اور ''سلام'' میں فرق: جیسا کہ آیت مذکورہ ۵۶ سے معلوم ہوا کہ زور سلام پر ہے' صلوٰۃ پر نہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ مانوسیت اور پہچان سلام سے ہوتی ہے اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام فوراً اپنے اُس اُمتی کو پہچان لیتے ہیں جو بڑے خلوص' محبت اور تعظیم کے ساتھ آپ پر بکثرت سلام بھیجتا ہے۔اس طرح حکمِ الٰہی نبوّت کی رفعت مقامی کا مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ مؤمنوں کے لئے اُس کی لامحدود رحمت کا مظہر بھی ہے۔

''مؤمنوں کو درود وسلام پڑھنے پر ثواب دیے جانے کی قسم میں بھی امتیاز روا رکھا گیا ہے اور وہ امتیاز درجے اور مرتبے میں ہے۔نبی علیہ السلام پر درود بھیجنے والوں کو اپنے اس عمل کی روحانی اجرت دی جاتی ہے۔جس طرح ایک مزدور کو اپنی محنت کی اجرت رقم کی شکل میں دی جاتی ہے' اسی طرح درود بھیجنے والے کو اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اُس کی طرف سے برکات کی شکل میں روحانی طور پر نوازا جاتا ہے۔پیغمبر کریم ﷺ نے اپنے اُن اُمتیوں کے لئے شفاعت کی ضمانت دی ہے جو آپ پر درود وسلام بھیجتے ہیں۔عبداللہ بن عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اُنہوں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے سنا:

إِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ فَقُولُوا مِثْلَ مَا يَقُولُ ثُمَّ صَلُّوا عَلَيَّ فَإِنَّهُ مَنْ صَلَّى عَلَيَّ صَلَاةً صَلَّى اللّٰهُ بِهَا عَشْرًا ثُمَّ سَلُوا اللّٰهَ لِيَ الْوَسِيلَةَ فَإِنَّهَا مَنْزِلَةٌ فِي الْجَنَّةِ لَا تَنْبَغِي إِلَّا لِعَبْدٍ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ وَأَرْجُوا أَنْ أَكُونَ أَنَا هُوَ فَمَنْ سَأَلَ لِيَ الْوَسِيلَةَ حَلَّتْ لَهُ الشَّفَاعَةُ (صحیح مسلم: کتاب الصلوٰۃ' سنن ابی

داؤد: کتاب الصلوٰۃ، جامع ترمذی: کتاب المناقب، سنن نسائی: کتاب الاذان، مسند احمد بن حنبل، صحیح ابن خزیمہ، مشکوٰۃ المصابیح لخطیب تبریزی: کتاب الصلوٰۃ، شرح السنۃ لحسین بن مسعود بغوی، کنز العمال لعلاء الدین علی ۷:۰۰۷، بحوالہ ڈاکٹر محمد طاہر القادری)

''جب تم مؤذن کو اذان کہتا سنو تو اُس کے کہے ہوئے الفاظ دُہرا دو، پھر مجھ پر درود بھیجو، اس لئے کہ جو کوئی مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے، اللہ تعالیٰ اُس پر اُس کی وجہ سے دس رحمتیں نازل فرماتا ہے۔ پھر تم اللہ سے میرے لئے مقامِ وسیلہ کی درخواست کرو جو جنت میں ایک مقام ہے جو اللہ کے ایک (خاص) بندے کو عطا کیا جائے گا اور مجھے اُمید ہے کہ وہ بندہ میں ہی ہوں۔ اور جو کوئی میرے لئے مقامِ وسیلہ مانگے گا، تو اس کے لئے میری شفاعت واجب ہو گئی۔''

درود و سلام معرفتِ مصطفیٰ ﷺ کا باعث: اعمالِ صالحہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقات و خیرات سے بھی بڑھ کر ایک اور عمل دوست کی حیثیت سے قبر میں ہمارا محافظ بنے گا اور وہ عمل حضور ﷺ پر کثرت سے درود و سلام بھیجنا ہے۔ بقیہ اعمال نے تو فرشتوں کو قریب آنے سے روکنا ہے اور اس عمل نے اس سوال مَا تَقُوْلُ فِیْ حَقِّ ھٰذَا الرَّجُل (اس شخصیت کے بارے میں تو کیا کہا کرتا تھا؟) کا جواب ہمیں عطا کرتا ہے یعنی معرفتِ مصطفیٰ ﷺ ہمیں عطا کرنی ہے کہ جب حضور ﷺ ہمارے سامنے ہوں گے تو یہ عمل ہمیں آپ علیہ السلام کو پہچاننے میں معاونت کرے گا۔ ذرا سوچئے! اُس شخص کا کیا حال ہوگا کہ جس کے پاس اس عملِ درود و سلام کی قلت ہو گی، عشق و محبتِ مصطفیٰ کی کمی ہو گی اور وہ قبر میں حضور ﷺ کی پہچان نہ کر سکے گا۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر صلوٰۃ و سلام بھیجنے کی اہمیت پر چند احادیث مبارکہ

(۱) عَنْ طَلْحَۃَ عَنْ أَبِیْهِ قَالَ: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ جَاءَ ذَاتَ یَوْمٍ وَالْبِشْرُ یُرٰی فِیْ وَجْهِهٖ فَقَالَ: اِنَّهٗ جَاءَ نِیْ جِبْرِیْلُ فَقَالَ: أَمَا یُرْضِیْكَ یَا مُحَمَّدُ! أَنْ لَا یُصَلِّیَ عَلَیْكَ أَحَدٌ'' مِّنْ أُمَّتِكَ اِلَّا صَلَّیْتُ عَلَیْهِ عَشْرًا وَلَا یُسَلِّمُ عَلَیْكَ أَحَدٌ'' مِّنْ أُمَّتِكَ اِلَّا سَلَّمْتُ عَلَیْهِ عَشْرًا (سنن نسائی: باب السھو)

''حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں اُنہوں نے کہا کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ چمکتے دمکتے اور ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ تشریف لائے اور فرمایا کہ میرے پاس جبریل یہ پیغام لے کر آئے کہ اے قابلِ صد ستائش! (آپ کا رب فرماتا ہے کہ) کیا آپ کو یہ بات پسند نہیں کہ جب آپ کا کوئی اُمتی آپ پر ایک مرتبہ درود بھیجے تو میں اُس پر دس مرتبہ رحمت بھیجوں اور آپ کا کوئی اُمتی آپ کو ایک مرتبہ سلام کہے تو میں اُس پر دس مرتبہ سلامتی بھیجوں!''

(۲) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: مَنْ ذُكِرْتُ عِنْدَهٗ فَلْیُصَلِّ عَلَیَّ

وَمَنْ صَلّٰی عَلَیَّ صَلَاۃً وَّاحِدَۃً صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ عَشْرَ صَلَوَاتٍ وَحَطَّ عَنْہُ عَشْرَ سَیِّاٰتٍ وَّ رَفَعَہٗ بِھَا عَشْرَ دَرَجٰتٍ (مسند احمد، متدرک للحاکم، سنن نسائی، صحیح ابن حبان)

''انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کسی کے پاس میرا ذکر کیا جائے، اُسے چاہئے کہ مجھ پر درود بھیجے اور جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا، اللہ تعالیٰ اس پر دس مرتبہ رحمت بھیجے گا اور اُس کے دس گناہ مٹادے گا اور اس کے دس درجے بلند فرمائے گا۔''

(۳) قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: مَنْ سَلَّمَ عَلَیَّ عَشْرًا فَکَأَنَّمَا أَعْتَقَ رَقَبَۃً (الشفا لقاضی عیاض)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے مجھ پر دس مرتبہ درود بھیجا تو گویا اُس نے ایک غلام آزاد کیا۔''

(۴) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِنَّ أَوْلَی النَّاسِ بِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ أَکْثَرُھُمْ عَلَیَّ صَلٰوۃً (ترمذی، ابن حبان، شرح السنۃ للبغوی، مشکوٰۃ المصابیح لخطیب تبریزی، میزان الاعتدال للذھبی)

''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میرے قریب ترین وہ شخص ہوگا جو مجھ پر بکثرت درود پڑھتا ہوگا۔''

(۵) عَنْ أَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ حِیْنَ یُصْبِحُ عَشْرًا وَّحِیْنَ یُمْسِیْ عَشْرًا أَدْرَکَتْہُ شَفَاعَتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ (طبرانی)

''حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص مجھ پر صبح دس مرتبہ اور شام دس مرتبہ درود بھیجے گا، اُس کے لئے میری شفاعت واجب ہو جائے گی۔''

(۶) عَنْ أَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: أَکْثِرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ عَلَیَّ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ فَاِنَّہٗ یَوْمٌ مَّشْھُوْدٌ تَشْھَدُہُ الْمَلَائِکَۃُ وَاِنَّ أَحَدًا لَنْ یُّصَلِّیَ عَلَیَّ اِلَّا عُرِضَتْ عَلَیَّ صَلٰوتُہٗ حَتّٰی یَفْرُغَ مِنْھَا قَالَ قُلْتُ: وَبَعْدَ الْمَوْتِ؟ قَالَ: اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَی الْاَرْضِ أَنْ تَأْکُلَ أَجْسَادَ الْاَنْبِیَاءِ عَلَیْھِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ (ابن ماجہ، السخاوی، مُلّا علی قاری)

''حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جمعہ کے دن مجھ پر بہ کثرت درود پڑھا کرو اس لئے کہ جمعہ کا دن برکت کا دن ہے جس میں فرشتے بہ کثرت حاضر ہوتے ہیں اور جو کوئی بھی مجھ پر درود بھیجتا ہے تو جب تک بھیجنے والا فارغ نہیں ہو جاتا، وہ درود مجھ پر برابر پیش کیا جاتا رہتا ہے۔ ابوالدرداء کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: کیا آپ کی وفات کے بعد بھی ایسا ہی ہوگا؟ اس پر آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء علیہم السلام کے جسموں کو کھانا حرام کر دیا ہے۔''

(۷) عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اَلصَّلٰوۃُ عَلَیَّ نُوْرٌ عَلَی الصِّرَاطِ وَمَنْ صَلّٰی عَلَیَّ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ ثَمَانِیْنَ مَرَّۃً غُفِرَتْ لَہٗ ذُنُوْبُ ثَمَانِیْنَ عَامًا (شرح شفا للملا علی قاری)
''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھ پر درود کا بھیجا جانا پل صراط پر نور ہوگا اور جو کوئی جمعہ کے دن مجھ پر اسّی مرتبہ درود بھیجے گا' اُس کے اسّی برس کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔''

(۸) عَنِ الْحَسَنِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: مَنْ ذُکِرْتُ عِنْدَہٗ فَخَطِیءَ الصَّلَاۃَ عَلَیَّ خَطِیءَ طَرِیْقَ الْجَنَّۃِ (منذری ۲ : ۲۳۱)
''امام حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کے پاس میرا ذکر ہوا اور وہ مجھ پر درود پڑھنا بھول گیا' وہ جنت کا راستہ بھول جائے گا۔''

شیخ ابن حجر مکی فرماتے ہیں کہ ایک شخص اپنی تحریروں میں صرف صَلَّی اللّٰہُ کے الفاظ لکھتا تھا اور وَ سَلَّم نہیں لکھتا تھا۔ اُس نے نبی علیہ السلام کو خواب میں یہ فرماتے سنا کہ تم وَ سَلَّم نہ لکھ کر چالیس ثواب کیوں ضائع کرتے ہو؟'' (''فضائل درود شریف''۔۔۔ مولانا محمد زکریا' صفحہ ۹۲) تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی۔

نوٹ: وَ سَلَّم میں چار حروف ہیں اور ہر حرف کے دس ثواب ہیں' اس طرح ۴x۱۰=۴۰ ثواب ہوئے۔

اُن لوگوں کی مذمّت میں احادیث جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود وسلام نہیں بھیجتے

(۱) إِنَّ أَبْخَلَ النَّاسِ مَنْ ذُکِرْتُ عِنْدَہٗ وَلَمْ یُصَلِّ عَلَیَّ (کنز العمال لعلاء الدین علی ۱: ۴۸۹)
''لوگوں میں بخیل ترین وہ ہے جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔''

(۲) رَغِمَ أَنْفُ رَجُلٍ ذُکِرْتُ عِنْدَہٗ فَلَمْ یُصَلِّ عَلَیَّ (الجامع الصحیح ترمذی' کتاب الدعوات)
''اُس شخص کی ناک خاک آلود ہو جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔''

(۳) عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: مَا جَلَسَ قَوْمٌ مَجْلِسًا لَمْ یَذْکُرُوا اللّٰہَ تَعَالٰی فِیْہِ وَلَمْ یُصَلُّوْا عَلٰی نَبِیِّهِمْ ﷺ إِلَّا کَانَ عَلَیْهِمْ تِرَۃً یَوْمَ الْقِیَامَۃِ فَإِنْ شَاءَ عَذَّبَهُمْ وَإِنْ شَاءَ غَفَرَ لَهُمْ (احمد وابوداؤد وغیرہما)
''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر لوگ ایسی مجلس میں بیٹھیں جس میں نہ تو وہ اللہ کا ذکر کریں اور نہ ہی اس کے رسول ﷺ پر درود بھیجیں تو وہ مجلس اُن

کے لئے قیامت کے دن حسرت وندامت کا باعث بن جائے گی۔ اللہ چاہے تو اُنہیں عذاب دے اور چاہے تو اُنہیں معاف کردے۔''

(۴) عَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: أُحْضُرُوا الْمِنْبَرَ فَحَضَرْنَا فَلَمَّا ارْتَقٰى دَرَجَةً قَالَ: آمِيْن ثُمَّ ارْتَقٰى الثَّانِيَةَ فَقَالَ: آمِيْن ثُمَّ ارْتَقٰى الثَّالِثَةَ فَقَالَ: آمِيْن فَلَمَّا نَزَلَ قُلْنَا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قَدْ سَمِعْنَا مِنْكَ الْيَوْمَ شَيْئًا مَا كُنَّا نَسْمَعُهُ، فَقَالَ: إِنَّ جِبْرِيْلَ عَرَضَ لِيْ فَقَالَ: بَعُدَ مَنْ أَدْرَكَ رَمَضَانَ فَلَمْ يُغْفَرْلَهُ، فَقُلْتُ: آمِيْن۔ فَلَمَّا رَقِيْتُ الثَّانِيَةَ قَالَ: بَعُدَ مَنْ ذُكِرْتَ عِنْدَهُ، فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْكَ فَقُلْتُ: آمِيْن فَلَمَّا رَقِيْتُ الثَّالِثَةَ قَالَ: بَعُدَ مَنْ أَدْرَكَ أَبَوَيْهِ الْكِبَرَ عِنْدَهُ، أَوْ أَحَدَهُمَا فَلَمْ يُدْخِلَاهُ الْجَنَّةَ قُلْتُ آمِين (صحیح بخاری فی برّ الوالدین، مستدرک لحاکم، صحیح ابن حبان، السخاوی)

''حضرت کعب بن عجرۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ منبر لاؤ۔ ہم نے منبر پیش کیا۔ جب آپ پہلی سیڑھی پر چڑھے تو آپ نے آمین فرمایا۔ جب آپ دوسری سیڑھی پر چڑھے تو آپ نے آمین فرمایا۔ پھر آپ تیسری سیڑھی پر چڑھے تو آپ نے آمین فرمایا۔ جب آپ نیچے اترے تو ہم نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! ہم نے آج آپ سے وہ چیز سنی ہے جو پہلے نہیں سنی تھی۔ آپ نے فرمایا: جبریل میرے پاس آئے اور کہا کہ وہ شخص اللہ کی رحمت سے دُور ہو جس نے ماہِ رمضان پایا لیکن (اُس کا احترام نہ کرنے کی وجہ سے) اُس کی بخشش نہ ہو سکی تو میں نے آمین کہا۔ جب میں دوسری سیڑھی پر چڑھا تو جبریل نے کہا: وہ شخص رحمتِ الٰہی سے دُور ہو جس کے سامنے آپ کا نام لیا گیا اور اُس نے آپ پر درود نہ پڑھا تو میں نے آمین کہا۔ جب میں تیسری سیڑھی پر چڑھا تو جبریل نے کہا: وہ شخص رحمتِ الٰہی سے دُور ہو جس نے اپنے بوڑھے والدین یا اُن میں سے ایک کو پایا اور وہ اُسے جنت میں لے جانے کا سبب نہ بن سکے۔ تو (اس پر) میں نے کہا آمین۔

فرشتوں کا درود وسلام: منصبِ نبوّت کی عظمت ورفعت کا یہ ایک اور بیّن اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ صرف مؤمنوں کو درود وسلام بھیجنے کا حکم دیتا ہے بلکہ وہ آسمانی مخلوق کو بھی جو کہ معصوم عن الخطا، نیک و پاک اور نوری ہیں، اسی قسم کا حکم دیتا ہے۔ فرشتے بھی صبح سے لے کر شام تک مؤمنوں کے پُرخلوص محبت بھرے درود وسلام پہنچاتے رہتے ہیں۔ حضور علیہ السلام اپنی اُمّت کے اِن تحائف کو پسند فرماتے ہیں اور ان بھیجنے والوں پر برکات ورحمتِ الٰہی کے نزول کی دعا کرتے ہیں جیسا کہ آپ نے فرمایا:

(۱) إِنَّ لِلّٰهِ مَلَائِكَةً سَيَّاحِيْنَ فِي الْأَرْضِ يُبَلِّغُوْنَنِيْ مِنْ أُمَّتِيَ السَّلَامَ (سنن نسائی، المعجم الکبیر لطبرانی، شعب الایمان لاحمد بن حسین البیہقی)

''روئے زمین پر اللہ کے چلنے پھرنے والے فرشتوں کے دستے مجھ تک میری اُمّت کے بھیجے گئے سلام پہنچا دیتے ہیں۔''

(۲) صَلُّوْا عَلَيَّ فَإِنَّ صَلَاتَكُمْ تَبْلُغُنِي حَيْثُ كُنْتُمْ (سنن ابی داؤد، مجمع الزوائد لہیثمی)
''مجھ پر درود بھیجا کرو اس لئے کہ تمہارا درود مجھ تک پہنچ جاتا ہے جہاں کہیں بھی تم ہو۔''
(۳) مَنْ صَلَّى عَلَيَّ عِنْدَ قَبْرِيْ سَمِعْتُه، وَمَنْ صَلَّى عَلَيَّ نَائِيًا أُبْلِغْتُه (شعب الایمان للبیہقی، کنز العمال لعلاء الدین علی)
''جو شخص میرے مزارِ مبارک کے قریب مجھ پر درود بھیجے، میں اُسے سنتا ہوں اور جو شخص مجھ پر دُور سے درود بھیجے، تو وہ مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔'' (پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری، صفحات ۴۱، ۴۲)

''صلوٰۃ وسلام کا قبول ہونا: صلوٰۃ وسلام کو اللہ تعالیٰ ہر وقت قبول فرماتا ہے اور ہمیشہ اس ہدیے کو تسلیم کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی معصیت پیشہ اور فاسق و فاجر شخص بھی صلوٰۃ وسلام کا تحفہ پیش کرے تو اُسے بھی بہر حال قبول کر لیا جاتا ہے۔''

''سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک معصیت پیشہ اور فاسق و فاجر کی طرف سے پیش کیا گیا درود وسلام آخر کیوں قبول کیا جاتا ہے اور اس کے پس پردہ حکمت کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ صلوٰۃ اور سلام کے معانی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی رحمت و برکات، قربِ الٰہی اور نبی علیہ السلام کے نامِ نامی کی بلندی اور رفعت کے لئے دعائیہ کلمات ہیں۔ نبی ﷺ پر نوازشات وعنایاتِ ربانی پہلے ہی سے ہیں (بحوالہ سورۃ النجم: آیات ۹،۸ اور سورۃ الانشراح: آیت چہارم)۔ جب بندہ اللہ سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر رحمتیں بھیجنے کی درخواست کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں تو پہلے ہی اپنے نبی پر رحمتیں اور عنایتوں کی برکھا کر رہا ہوں اور اُنہیں اپنا قرب عطا کر رہا ہوں۔ تاہم اے میرے پرستار بندے! چونکہ تو نے اپنی ذات کے لئے مجھ سے کچھ نہیں مانگا بلکہ بے غرضی اور کمال خلوص سے میرے نبی پر درود وسلام کا تحفہ بھیجا ہے، اس لئے تمہارے عریضے کو پذیرائی بخشتے ہوئے اُسے قبول کیا جاتا ہے، قطع نظر اس بات کے کہ تو گنہگار ہے یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صلوٰۃ وسلام کو بہر حال قبول کر لیا جاتا ہے۔''

سلام اور دوسری عبادتوں کی قبولیت: جیسا کہ پہلے بیان ہوا کسی بھی عبادت (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وخیرات وغیرہ یہاں تک کہ اللہ کی راہ میں گردن کٹوانے تک) کی عنداللہ قبولیت کی ضمانت کسی کے پاس نہیں کہ شاید اُن میں کسی قسم کا سقم یا خامی رہ گئے ہوں اور اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں قبول کرے یا نہ کرے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ تبارک وتعالیٰ کو اُس کی تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ پیارے اور محبوب ہیں اور جو شخص اللہ کے اس محبوبِ مکرّم پر درود وسلام کا تحفہ ارسال کرتا ہے، رب تعالیٰ اُس سے خوش ہو کر اُس کے اس عمل کو یقیناً شرفِ قبولیت عطا فرماتا ہے کیونکہ یہ عمل خود رب تعالیٰ کا اپنا عمل بھی تو ہے۔

''نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے صحابی اُبی ابن کعب رضی اللہ عنہ کو ہدایت کی کہ وہ اپنے نبی (یعنی مجھ)

پر بہ کثرت اور بالعموم درود وسلام بھیجا کریں۔ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں :

قُلْتُ : يَا رَسُوْلَ اللهِ ! اِنِّیْ اُكْثِرُ الصَّلٰوةَ عَلَيْكَ فَكَمْ أَجْعَلُ لَكَ مِنْ صَلٰوتِیْ ؟ فَقَالَ: مَاشِئْتَ قُلْتُ : اَلرُّبُعُ قَالَ: مَاشِئْتَ فَاِنْ زِدْتَّ فَهُوَخَيْرٌ لَّكَ ۔ قُلْتُ: اَلنِّصْفُ قَالَ: مَاشِئْتَ فَاِنْ زِدْتَّ فَهُوَخَيْرٌ لَّكَ ۔ قُلْتُ: فَالثُّلُثَيْنِ؟ قَالَ: مَاشِئْتَ فَاِنْ زِدْتَّ فَهُوَخَيْرٌ لَّكَ ۔ قُلْتُ: اَجْعَلُ لَكَ صَلَاتِیْ كُلَّهَا؟ قَالَ : اِذًا تُكْفٰى هَمُّكَ وَيُغْفَرُلَكَ ذَنْبُكَ (ترمذی ومستدرک للحاکم)

''میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں آپ پر بہ کثرت درود بھیجتا ہوں تو میں اس عمل پر اپنا کتنا وقت آپ کے لئے مخصوص کردوں؟ آپ نے فرمایا: اس قدر کہ جتنا تم چاہو۔ میں نے عرض کیا: کیا یہ چوتھائی وقت ہو جائے؟ آپ نے فرمایا: جیسے تمہاری مرضی' لیکن اگر تم اس میں کچھ اور اضافہ کردو تو وہ تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ میں نے عرض کیا: تو کیا یہ آدھا وقت ہو جائے؟ آپ نے فرمایا: جیسے تمہارے مرضی' لیکن اگر تم اس میں کچھ اور اضافہ کردو تو وہ تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ میں نے پھر عرض کیا: تو کیا وہ دو تہائی ہو جائے؟ آپ نے فرمایا: جیسے تمہاری مرضی' لیکن اگر تم اس میں کچھ اور اضافہ کردو تو وہ تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ میں نے عرض کیا: تو کیا میں اپنا سارا وقت آپ پر درود پڑھنے کے لئے وقف نہ کردوں؟ اس پر آپ نے فرمایا: تب تو یہ بات تمہیں فکر وغم سے محفوظ رکھے گی اور تمہارے گناہ معاف کردئے جائیں گے۔''

یہاں ایک حیات آفرین سوال پیدا ہوتا ہے کہ عبادت صرف اللہ ہی کی ہے لیکن اُس عبادت یعنی نماز میں مسلمانوں کو اپنے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود بھیجنے کا حکم دیا جارہا ہے اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ آپ پر درود بھیجے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی۔ عجیب بات ہے کہ عبادت صرف اللہ کی ہے جبکہ تعظیم محمد مصطفی ﷺ کی ہورہی ہے۔ کیوں؟ جواب اس کا ظاہر ہے کہ نماز کے دوران جو شیطانی خیالات اور وسوسے دل میں آتے ہیں' رب تعالیٰ درود پاک کی وجہ سے اُن وسوسوں کو نظرانداز کرتے ہوئے نماز اپنے فضل وکرم سے قبول فرمالیتا ہے۔

<u>صلوٰۃ وسلام کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قبول فرمانا</u>: اس سوال پر کہ آیا نبی علیہ السلام اپنی اُمت کی طرف سے بھیجے گئے درود وسلام کو قبول فرماتے ہیں کہ نہیں؟ عموماً بحث سننے میں آتی ہے۔ لیکن سچے اور مخلص مسلمان ایسی بحثوں میں نہیں پڑتے کیونکہ درود وسلام بھیجنے کے الٰہی حکم پر اُن کا غیر متزلزل اور پختہ ایمان ہوتا ہے۔ مسلمان اس بات پر مطمئن ہوتا ہے کہ اگر درود وسلام آپ تک فرشتوں کی وساطت سے پہنچایا جاتا ہے تو فرشتے بھی تو اسے حکمِ الٰہی کے تحت ہی پہنچاتے ہیں اور اگر درود وسلام آپ تک براہِ راست پہنچتا ہے تو یہ آپ پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا خاص انعام و احسان ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ہی سے وابستہ ایک معجزہ بھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر درود وسلام آپ تک بالواسطہ یا بلاواسطہ نہیں پہنچتا تو پھر اس حکمِ الٰہی میں کیا معنی باقی رہ جاتا ہے؟ کیا رسول اللہ ﷺ کا کوئی فرمان (معاذ اللہ) مبہم اور بے معنی ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ خود اپنے نبی کی زبان پر بولتا ہے (بحوالہ سورۃ النجم: آیات ۳'۴)

نبی ﷺ کو نام "محمّد" دے کر انہیں معصوم اور ہر خطا سے مبرّا ثابت کرنا ہے: یہ حقیقت ہے کہ کسی شخص کی تعریف و ستائش اُس کے حسنِ کردار، حسنِ اخلاق اور اُس کی لیاقت و مہارت کی بنیاد پر کی جاتی ہے نہ کہ اُس کے نقائص اور کوتاہیوں کی بناء پر۔ ممتاز و مشہور شاعرِ دربارِ رسول حضرت حسّان بن ثابت انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور یوں فرماتے ہیں:

وَاَحسَنُ مِنكَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَينٌ ۔۔۔ وَاَجمَلُ مِنكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ
خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِّنْ كُلِّ عَيبٍ ۔۔۔ كَاَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

"(یا رسول اللہ!) آپ سے زیادہ خوبصورت کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور آپ سے زیادہ حسین و جمیل کسی عورت نے جنا ہی نہیں۔ آپ ہر عیب و خطا سے مبرّا و منزّہ پیدا کیے گئے، یوں لگتا ہے آپ کی پیدائش آپ کی منشا کے مطابق ہوئی ہے۔"

جہاں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک طرف ظاہری حسن و جمال کا نمونہ تھے تو دوسری طرف آپ باطنی حسن و جمال کی معجزاتی علامت تھے۔ آپ اکثر اوقات یہ دعا کیا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اَحْسِنْ خُلُقِي كَمَا اَحْسَنْتَ خَلْقِي (مسند احمد بن حنبل ۶: ۶۸، ۱۵۵؛ مسند طیالسی ۱: ۴۹ رقم ۳۷۴؛ مسند ابی یعلی ۹: ۱۱۲؛ شعب الایمان للبیہقی ۶: ۳۶۴ رقم: ۸۵۴۳؛ مجمع الزوائد للہیثمی)

"اے اللہ! تو میرے کردار کو اسی طرح خوبصورت بنا دے جس طرح تو نے میری ظاہری شکل و صورت کو عمدہ اور خوبصورت بنایا ہے۔"

آپ ﷺ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد آپ کے خوش نصیب زائرین آپ کے بے مثال حسن و جمال کو یاد کر کے اکثر مضطرب اور پریشان ہو جاتے تھے۔ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کو گئے اور جس کیف و وجد کی کیفیت میں اُنہوں نے اپنے آپ کو پایا، وہ اُسے یوں بیان کرتے ہیں:

فَجَعَلْتُ اَنْظُرُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَاِلَى الْقَمَرِ وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ حَمْرَاءُ فَاِذَا هُوَ عِنْدِيْ اَحْسَنُ مِنَ الْقَمَرِ (الجامع الترمذی: کتاب الادب، باب فی رخصۃ فی لبس الحمرۃ للرجال، رقم: ۲۸۱۱؛ سنن دارمی ۱: ۴۴ رقم: ۵۷؛ المستدرک للحاکم ۴: ۲۰۷، رقم: ۷۳۸۳)

"میں کبھی تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چہرۂ انور کی طرف اور کبھی آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کی طرف دیکھتا تھا جبکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سرخ رنگ کے لباس میں ملبوس تھے تو نبی علیہ السلام مجھے چاند سے زیادہ حسین و جمیل معلوم ہوئے۔"

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نبی اکرم ﷺ کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں:

۴۲۰۲ (محمد ﷺ Mohammad)

مُنَزَّہٌ عَنْ شَرِیْکٍ فِیْ مَحَاسِنِہٖ ٭ فَجَوْھَرُ الْحُسْنِ فِیْہِ غَیْرُ مُنْقَسِمٖ

''عمدگی صفات میں آپ ﷺ کا کوئی ثانی نہیں' پس آپ میں حسن کا جوہر نا قابلِ تقسیم ہے۔''

فَاقَ النَّبِیّٖنَ فِیْ خَلْقٍ وَّفِیْ خُلُقٍ ٭ وَلَمْ یُدَانُوْہُ فِیْ عِلْمٍ وَّ لَا کَرَمٖ

''اپنی پیدائش اور کردار میں آپ تمام انبیاء علیہم السلام پر فائق ہیں اور وہ نہ تو آپ کے (خداداد) علم میں اور نہ ہی آپ کی فوقیت میں آپ کے برابر ہیں۔''

ایک اور فارسی شاعر نے انتہائی بلیغ اور جامع پیرایہ میں آپ ﷺ کی مدح اس طرح کی ہے :

حُسنِ یوسف' دَمِ عیسیٰ' یدِ بیضا داری ٭ آنچہ خوباں ہمہ دارند' تو تنہا داری

لمحہ فکریہ : جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ لفظ محمّد کا معنی وہ شخص ہے جس کی مبالغہ کی حد تک بے انتہا بار بار تعریف کی جائے۔ اس مفہوم میں خالقِ ارض وسماء اللہ تبارک وتعالیٰ ہی تمام تر حمد وثنا کا مستحق اور سزاوار ہے جیسا کہ سورۃ الفاتحہ کی اوّل آیت میں بیان ہوا۔ اس لحاظ سے تو رسول اللہ ﷺ کی بجائے اللہ تبارک وتعالیٰ کا نام محمّد ہونا چاہئے تھا۔ رسول اللہ ﷺ تو اپنے خالق ومالک کے ثنا خواں یعنی حامد ہیں۔ یہ لمحہ فکریہ ہے اور حل طلب معمہ ہے۔

اس کا جواب ظاہر ہے۔ کوئی شک نہیں کہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۴۴ کی رُو سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ اپنے خالق کی حمد وثنا کر رہا ہے۔ لیکن جب رب تعالیٰ خود اپنی مقرب مخلوق کے ہمراہ اپنے محبوب علیہ السلام کی تعریف و توصیف میں مصروف ہے (بحوالہ سورۃ الاحزاب: ۵۶) تو محمد نام کا آپ سے زیادہ اور کون مستحق ہوگا؟

''اگرچہ نبی اکرم ﷺ کے خاصی تعداد میں اسمائے حسنیٰ ہیں لیکن چونکہ محمّد کا نام آپ کے خالق کو بہت محبوب ہے اس لئے اس نام کا تعلق عقیدے اور ایمان کے ساتھ بہت مضبوط ہے۔ اس کی نمایاں اور ممتاز اہمیت اس حقیقت سے لگائی جا سکتی ہے کہ ایک غیر مسلم جب تک مُحمّد'' رسول اللہ کا جملہ کہہ نہیں دیتا' اُس وقت تک وہ سچا مسلمان ہو نہیں سکتا اور اُس کا ایمان ناقص رہتا ہے۔ مسلمان ہونے کے لئے اُس کا ''احمد رسول اللہ'' بھی کہنا کافی نہیں ہوگا۔ اس کے پسِ پردہ حکمت یہی ہے کہ اسلام قبول کرتے ہی آدمی کو یہ احساس ہو جانا چاہئے کہ اللہ کا رسول محمد ہی تعریف وستائش کا مستحق ہے۔'' (''میلاد النبی ﷺ'' ۔۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری' صفحات ۲۳۱ تا ۲۴۳) مطبوعہ لاہور' مارچ ۲۰۰۵ء)

یہاں ایک اور اہم قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ کسی لفظ میں تشدید (ّ) کا ہونا اُس لفظ میں دو حروف ہونے کا

ثبوت ہوتا ہے جیسا کہ لفظ ''جَنّت'' (دونونوں کے ساتھ) ہے جو اصل میں جَنْنَتْ ہے۔ دوسرا نون اپنے سابق نون کے ساتھ مل کر پھر اس سے اگلے حرف ''ت'' کے ساتھ اُسے ملا رہا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دوہرے حرف کا کام اپنے سابق حرف کو اپنے سے اگلے حرف کے ساتھ جوڑنا ہوتا ہے۔ اسی طرح لفظ مُحَمّد (= مُحَمْمَد) میں دوسرا ''م'' اپنے سے پہلے حرف ''ح'' کو اپنے مابعد کے حرف ''د'' سے جوڑ رہا ہے۔ جس طرح کلمہ طیبہ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ میں لفظ مُحَمَّد نے اللہ کو اس سے ماقبل کے لفظ رسول سے جوڑ دیا ہے اور جملہ بن گیا ہے: رَسُوْلُ اللّٰہ یعنی اللہ کا بھیجا ہوا۔ کس کی طرف؟ اُس کی مخلوقات کی طرف۔ یہ الفاظِ دیگر مُحَمّد نے لوگوں کو اللہ سے ملا دیا۔ جس طرح لفظ مُحَمّد میں پہلا حرف ''م'' اُس سے متصل حرف ''ح'' کو اپنے مابعد کے حرف ''د'' سے مشدّد (ڈبل) میم کے بغیر نہیں ملا سکتا' اسی طرح لوگ بھی محمد ﷺ کے وسیلہ کے بغیر اللہ سے نہیں مل سکتے۔ اِسی لئے آپ کا مقام حرفِ مشدّد کا سا ہے۔

اُدھر خالق سے واصل' اِدھر مخلوق میں شامل

مدح النبی فی القرآن الکریم: اس عنوان پر لاکھوں جلدیں تیار کی جاسکتی ہیں لیکن جگہ کی تنگی کے باعث یہ ناچیز قرآن مجید کی چند آیات کے حوالے دینے پر اکتفا کرے گا جس سے معلوم ہوگا کہ آپ کے خالق کی نظروں میں آپ کو کتنا عظیم مقام حاصل ہے۔

(1) جیسا کہ مضمون کے آغاز میں بیان ہوا کہ قرآن مجید میں کسی بھی جگہ اللہ رب العزت نے آپ ﷺ کو آپ کے نامِ نامی (مُـحَـمَّـد) سے خطاب نہیں فرمایا بلکہ ہر جگہ آپ کے اعزاز و اکرام کی خاطر آپ کو مختلف القاب سے خطاب فرمایا گیا۔ کہیں یَـا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ تو کہیں یَـا اَیُّهَا النَّبِیُّ' کہیں یَـا اَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ اور کہیں یَااَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ کہیں یٰسٓ اور کہیں طٰهٰ جیسے پیارے القاب سے خطاب کیا۔ جبکہ آپ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کو اُن کے اسمائے گرامی سے خطاب کیا گیا جیسے یَـا آدَمُ (۲:۳۵) 'یَـانُوْحُ (۱۱:۴۶)' یَا اِبْرٰهِیْمُ (۱۱:۷۶) ' یَا دَاوٗدُ (۳۸: ۲۶)' یَا زَکَرِیَّا (۱۹ :۷)' یَا یَحْییٰ (۱۹:۱۲)' یَامُوْسٰی (۱۷ '۱۹ :۲۰)' یَا عِیْسٰی (۵۵ : ۳)۔

(2) سورة البقرة کی آیت ۳۴ میں مذکور آدم علیہ السلام اور ابلیس کے قصہ میں یہودِ مدینہ کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ جس طرح شیطان آدم علیہ السلام کی خلافتِ ارضی کو قائم کرنے کی کوشش میں بری طرح ناکام ہوا' اُسی طرح تمہیں بھی اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے میں کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ نہیں ملے گا اور میرے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوّت بہر حال قائم ہو کر رہے گی۔ یہ اسلام کی بالآخر فتح کی پیش گوئی اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے راحت و مسرت کا پیغام تھی۔

(3) روزِ ازل میں اللہ رب العزت کی طرف سے تمام نیک اور بد' مطیع و نافرمان روحوں سے اپنی

ربوبیت کے بارے میں عہد (میثاق) صرف دو لفظوں اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ (سورۃ الاعراف: ۱۷۲) (کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟) میں لیا گیا۔ لیکن خاتم الانبیاء ﷺ کی رسالت کا اقرار کرانے کو خاصا دورانیہ دیا گیا۔ شہادتیں قائم کی گئیں اور اُن پر رب تعالیٰ کی توثیق مزید (Countersignature) کی گئی (سورہ آل عمران: ۸۱) تاکہ محبوب علیہ السلام کی عظمت و توقیر اور شانِ ارفع و بے مثال پوری طرح اجاگر ہو جائے۔ نیز اس میثاق میں صرف انبیاء و رُسُل علیہم السلام کی حاضری تھی۔ مقدس ہستیوں کا یہ اجتماع محبوبِ ربّ العالمین کے اعزاز و توقیر میں تھا۔ یہاں پلیدوں اور نافرمانوں کا کیا کام!

(4) وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ
''اور آپ پہلے جس قبلہ پر تھے ہم نے اُسے صرف اس لئے مقرر کیا تھا کہ ہم (پرکھ کر) ظاہر کر دیں کہ کون (ہمارے) رسول ﷺ کی پیروی کرتا ہے (اور) کون اپنے اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔'' (۲:۱۴۳)

مذکورہ بالا آیت میں رسالت کے منصبِ ارفع و اعلیٰ کو سمجھایا جا رہا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو یروشلم (بیت المقدس) کے قبلہ کو حبیب علیہ السلام کی مدینہ کو ہجرت کے ساڑھے سولہ مہینے بعد تک بھی قبلہ رکھتے لیکن ہم پرکھنا چاہتے تھے کہ کون کعبۃ اللہ کی طرف رُخ کرتا ہے اور کون رُخِ مصطفیٰ کی طرف پھرتا ہے۔ کون اپنی نسبتِ ایمان کو آپ ﷺ کی نسبت سے قائم رکھتا ہے اور کون پیچھے پھر کر اُدھر منہ کرتا ہے۔ دیکھنا یہ چاہتے تھے کہ لوگوں نے ایمان کا مرکز آیا فقط کعبے کو بنایا ہوا ہے یا آپ ﷺ کی ذاتِ مقدسہ کو بنایا ہوا ہے۔ اگر مرکز و محورِ ایمان ذاتِ مصطفیٰ ہو تو کعبہ بھی اس میں آ گیا اور ایمان بچ گیا لیکن اگر مرکز و محورِ ایمان ذاتِ مصطفیٰ کی بجائے کعبہ ہو تو کعبہ کی طرف رخ کرنے کے باوجود بھی ایمان گنوا دیا۔ اگر نسبتِ ایمان غلامیٔ مصطفیٰ ہو تو کعبہ سے منہ پھیر کر بھی ایمان باقی رہا اور اگر نسبت ایمان کی شناخت کعبۃ اللہ ہو' رسول نہ ہو تو کعبے کی طرف منہ کر کے بھی بے ایمان رہے۔ ایمان کی پہچان کرائی جا رہی ہے کہ بے شک کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں مگر کعبے کو اس لئے قبول کریں کہ رُخِ مصطفیٰ اُدھر ہے۔ ایک ہے رسول کو اس لئے قبول کرنا کہ وہ اس کعبے کا رسول ہے کہ اُس کا طواف کرتا ہے اور بوقتِ نماز اُدھر کو رُخ کرتا ہے۔ دوم یہ کہ کعبے کو اس لئے قبول کرنا کہ رسول اُس کا اشارہ کرتا ہے۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلی صورت میں کعبے کی وجہ سے رسول کو ماننے سے کوئی بھی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔ وہ کلمہ گو ہو کے بھی کافر ہی رہا اور جو یہ کہے کہ میں کعبہ کو اس لئے مانتا ہوں کہ مصطفیٰ نے یہ کعبہ دکھایا' وہ سچا' سُچا اور پکا مسلمان ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''مکتوبات'' میں ذکر فرمایا کہ میں رب کو ربِّ محمد کی وجہ سے مانتا ہوں اور اُسے اس لئے رب مانتا ہوں کہ رسول ﷺ نے اُس کی پہچان کرائی ہے۔ چنانچہ آیتِ مذکورہ میں بھی یہی نکتہ سمجھایا جا رہا ہے کہ حبیب! جس نے آپ کو کعبے کی وجہ سے مان رکھا ہے' اُس کی مسلمانی ہمیں منظور نہیں ہے۔ مسلمان وہ ہے جو کعبہ کو آپ کی وجہ سے مانتا ہے۔ چنانچہ کعبہ کی نسبت بھی نسبتِ مصطفیٰ کے بغیر قبول

نہ کی تو باقی نسبتیں کیا رہیں؟ کعبے کا تعین بھی رضائے رسول سے ہوا۔ تعینِ کعبہ سے بڑھ کر اسلام میں کوئی اور آزمائش کا رکن نہیں تو گویا سارا دین حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رضا پر استوار ہو گیا۔

رکوع کے آغاز میں فرمایا کہ بے وقوف وہ جو عملِ پیغمبر پر اعتراض کرے، خواہ وہ کتنا پڑھا لکھا اور دانشور کیوں نہ ہو اور عقلمند وہ جو درِ مصطفیٰ پر اپنی عقل کو جھکا دے!

اِس مقام کی خاص بات جو قرآنِ حکیم میں کسی اور جگہ نظر نہیں آتی، یہ ہے کہ اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اللہ کو کتنی محبت ہے اور اُس کا کتنا اِکرام ہے۔ تحویلِ قبلہ کی آرزو میں حضور علیہ السلام کے رُخِ انور کا بار بار آسمان کو پلٹنے کا ذکر فرمایا تو ایک دفعہ ہی اُس کا ذکر کرنا کافی ہو جاتا کہ محبوب! ہم نے قبلہ کو کعبہ سے بدل دیا مگر ایک نہیں، پورے آٹھ مرتبہ ایک ہی رکوع میں قبلہ بدلنے کا ذکر فرمایا کہ جتنی بار ذکر کروں، میرا حبیب خوش ہوگا اور اُس کے سینے میں ٹھنڈک محسوس ہوگی کہ میرا خالق و مالک میرا کتنا اِکرام فرما رہا ہے۔ اُدھر مسلمانوں سے فرمایا جا رہا ہے: وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (یعنی اے میرے حبیب کے غلامو! جہاں کہیں بھی تم ہو، میرے محبوب علیہ السلام کی رضا کی خاطر اپنی نمازوں میں رُخ اُدھر پھیر لیا کرو)۔

خدا کی رضا چاہتے ہیں دو عالم   خدا چاہتا ہے رضائے محمد

معلوم ہوا کہ سارا اسلام، سارا ایمان، مسلمانی کا کمال اور ساری عبادات کی قبولیت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رضا میں ہے۔ اور یہ نکتہ بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ کعبہ یا قبلہ سے حضور علیہ السلام کی عظمت نہیں بلکہ حضور علیہ السلام سے قبلہ و کعبہ کی عزت بنی۔ مرضیِ مولا یہی تھی کہ دونوں قبلوں کو اپنے حبیب کے سجدوں سے عزت دی جائے۔ یہ بھی نکتہ ہے کہ رضائے مصطفیٰ ﷺ نے کعبہ کو پورے عالم کا مسجود الیہ بنا دیا۔

صحیح بخاری شریف میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنجناب ﷺ کی آخری علالت کے ایام میں اِنَّ اَبَا بَکْرٍ کَانَ یُصَلِّیْ یعنی جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نماز کی امامت کراتے تھے۔ ایک دن آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے رب کے حضور غلاموں کا اجتماع دیکھنا چاہا۔ مشتاقانِ دید تین دن سے دیدارِ مصطفیٰ کو ترس گئے تھے۔ ختمی مرتبت آقا نے حجرۂ مبارکہ کا پردہ اٹھایا تو نگاہیں بہ حالتِ نماز بے ساختہ رُخِ انور کی طرف اٹھ گئیں۔ اس موقع پر عقل نے کہا ہوگا کہ نگاہیں اُدھر نہ کرنا۔ عشق نے کہا ہوگا اِدھر کعبہ ہے تو اُدھر کعبے کا بھی کعبہ ہے۔ عقل نے کہا ہوگا کہ اگر چہرے پھر گئے تو نمازیں قضا ہو جائیں گی۔ عشق نے کہا ہوگا۔

نمازیں جو قضا ہوں پھر ادا ہوں   نگاہوں کی قضائیں کب ادا ہوں

نمازیں بھول گئیں، کعبے کی سمتیں بھول گئیں۔ یہ وہی صحابہ تھے جن کے سامنے وحیِ الٰہی کا نزول ہوا تھا: قَدْ نَرٰی

تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ (ہم نے آپ کے رخِ انور کا آسمان کی طرف بار بار پلٹنا دیکھ لیا ہے) کعبے تو بنتے ہی مصطفیٰ کی ادا سے ہیں۔ اُن کی رضا مل گئی تو کعبہ بھی مل گیا اور کعبے والا بھی مل گیا اور اگر وہ رضا نہ ملی تو کچھ بھی نہ ملا' چاہے کعبہ کے غلاف کے نیچے اُس سے چمٹ کر اپنے رب کو کیوں نہ منا رہے ہوں۔ تو دیدارِ مصطفیٰ سے کئی صحابہ کرام وجد میں آ گئے۔ یہ تو مقتدیوں کا حال تھا۔ سیّدنا صدّیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مصلّے چھوڑ دیا اور پچھلی صف میں آنا چاہا۔ عبادت کبریاء کی ہو رہی ہے' ادب مصطفیٰ کا ہو رہا ہے۔ وہ مصطفیٰ جن پر عبادتِ الٰہی کے دوران سلام نہ بھیجیں تو نماز نہ ہو اور کئی عارفین آگے چلتے جب ہیں جب درِ مصطفیٰ سے سلام کا جواب پا لیتے ہیں۔

عظمتِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک اور ثبوت سنن ابن ماجہ کی بروایت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وہ حدیث ہے کہ آقا ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر کعبہ کا طواف کرنے کے دوران کعبہ کو مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا :

يَا بَيتَ اللّٰهِ! مَا اَطيَبَكَ وَ اَطيَبَ رِيحَكَ! مَا اَعظَمَكَ وَ اَعظَمَ حُرمَتَكَ! وَالَّذِي نَفسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَحُرمَةُ المُؤمِنِ اَعظَمُ عِندَاللّٰهِ حُرمَةً مِّنكَ مَالُهُ' وَ دَمُهُ' وَ اِن نَّظُنَّ بِهِ اِلَّا خَيرًا
(سنن ابن ماجۃ: ابواب الفتن' حدیث : ۳۹۳۲)

''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' اُنہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کعبہ کا طواف کرتے اور یہ فرماتے دیکھا: ''اے بیت اللہ! تم کس قدر خالص اور عمدہ ہو اور تمہاری بُو کس قدر خوش آئند اور فرحت بخش ہے! تمہاری عظمتوں اور تمہارے تقدّس کا کیا کہنا! لیکن میں اُس ذات کی قسم کھاتے ہوئے کہتا ہوں جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ اللہ کے نزدیک مؤمن کی حرمت' اُس کے مال واسباب کی حرمت اور اُس کے خون کی حرمت تیری حرمت سے کہیں زیادہ ہے۔''

ظاہر ہے کہ قلبِ عبدِ مؤمن اُس سراج منیر (سورۃ الاحزاب: آیت ۴۵) سے منوّر رہتا ہے جسے خاتم الانبیاء کہتے ہیں تو وہ قلبِ عبدِ مؤمن اللہ کے نزدیک کعبہ سے بھی زیادہ معزّز ہے تو اُس ہستی کا کیا کہنا جو اپنی ہمہ وقتی درخشانی و تابانی سے دلوں کو منوّر کر رہی ہے!!

(5) فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ
(آل عمران: ۱۵۹)

''(اے حبیبِ والا صفات!) اللہ کی کیسی رحمت ہے کہ آپ اُن کے لئے نرم طبع ہیں اور اگر آپ تند خو سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے گرد سے چھٹ کر بھاگ جاتے۔'' (۳ : ۱۵۹)

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں آپ علیہ السلام کے رحیمانہ کردار کا کیسا روح پرور تجزیہ کیا ہے!

فَالرُّسُلُ خُلِقُوْا لِلرَّحْمَةِ وَهُوَ خُلِقَ بِنَفْسِهِ رَحْمَةً فَلِذٰلِكَ صَارَ اَمَانًا لِلْخَلْقِ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ:

أَنَا رَحْمَةٌ مُهْدَاةٌ" (الجامع لاحکام القرآن المعروف بہ تفسیر قرطبی، ج ٦، ص ٣٥٠)
"تمام پیغمبروں کو رحمت کے لئے پیدا کیا گیا لیکن نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام بذاتِ خود رحمت ہیں، تو آپ مخلوقات کے لئے ملجا و ماویٰ بن گئے۔ اسی لئے نبی علیہ السلام نے فرمایا: میں اللہ رب العزت کی طرف سے تحفۂ رحمت ہوں۔"

اور اب کچھ اُن مستشرقین کے بیانات کا بھی مطالعہ کر لیجئے جنہوں نے آپ کی ذاتِ مقدس کو گلدستہ ہائے خراجِ تحسین پیش کئے ہیں:

(۱) "پیغمبر (علیہ السلام) ہمیشہ حلم اور نرم دلی کی طرف مائل تھے۔" (Historians' History of the World, Vol. VIII, p. 121, quoted in Tafsir Majidi, Note : 67-B/296)

(۲) "آپ نے زندگی بھر کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ آپ نے کبھی بھی اپنا ہاتھ دوسرے کی ہتھیلی سے کھینچنے میں پہل نہیں کی جب تک دوسرے نے اس بارے میں پہل نہ کی ہو۔ جن لوگوں کی آپ نے حفاظت کی، آپ اُن کے لئے انتہائی وفادار، معتمد علیہ محافظ تھے، شیریں مقال اور اپنی گفتگو میں انتہائی پسندیدہ تھے۔ جو بھی آپ کو دیکھتا، فی الفور عزت و تعظیم سے اُس کا دل بھر جاتا۔ جو لوگ آپ کے قریب ہوتے، آپ سے محبت کرنے لگتے۔" ("Muhammad and Muhammadanism".. Bosworth Smith, p.131)

(۳) "ظلم و تشدد محمد (ﷺ) کی فطرت کا حصہ نہیں تھا۔" (Lane and Lane-Poole's Selections from the Kuran).

(۴) "آپ اپنے رفقاء کے لئے رحم دل اور بُردبار تھے۔ وقت کی مصلحت کے تحت آپ بخوبی جانتے تھے کہ دشمن کا دل کیسے جیتا جاتا ہے اور اُسے اپنی خدمت پر کیسے مامور کیا جا سکتا ہے۔ اپنے دشمن کو وقتی پناہ دینے کے بعد آپ نے شاذ و نادر ہی اُس سے مؤاخذہ کیا ہو۔ آپ کی تحکمانہ وضع قطع ایک اجنبی میں ناقابلِ بیان رعب ڈال دیتی تھی لیکن قریبی یگانگت (Close Intimacy) پر خدشہ اور خوف کی جگہ اعتماد اور محبت اپنی جگہ بنا لیتے۔" ("The Life of Mahomet".. Sir William Muir, p. 27)

(6) وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَّلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًاO (النساء: ٦٤)

''اور اگر یہ لوگ جس وقت اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں' (اے حبیب!) آپ کے پاس آجائیں اور اللہ سے بخشش مانگیں اور پیغمبر اُن کے لئے بخشش مانگے تو وہ اللہ تعالیٰ کو یقیناً معاف کرنے والا مہربان پائیں گے۔''

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت کے حصول کے لئے توبہ کے مختلف طریقوں میں سب سے مؤثر طریقہ رسول اللہ ﷺ کو وسیلہ بنانا ہے۔ آپ ﷺ کا توسّل دعا کی فوری قبولیت کی ضمانت ہے۔

''یہ کہنا کہ اس آیت کا حکم آنحضرت ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ساتھ مختص ہے' غلط ہے۔ کیونکہ یہ اصولی قاعدہ ہے کہ عموم الفاظ کا اعتبار رہتا ہے نہ کہ موردِ خاص کا۔ صحابہ کرام اور تابعین عمومِ الفاظِ قرآنی سے حجت پکڑتے رہے باوجودیکہ وہ آیتیں خاص خاص موقعوں پر نازل ہوئیں (اِتقان: للسیوطی)۔ اسی طرح زیرِ نظر آیت اگرچہ ایک خاص قوم کے حق میں نازل ہوئی لیکن جہاں یہ وصف (عاصیانِ اُمّت کا حضور سید الابرار کی بارگاہ میں گناہوں کی معافی کے لئے حاضر ہونا) پایا جائے گا' عمومِ حالت کے موافق اس کا حکم بھی عام اور ہر دو حالتِ حیات و بعد الوفات کو شامل ہوگا۔ چنانچہ علمائے کرام نے عموم سے ہر دو حالتیں سمجھی ہیں اور جو شخص آپ کے مزارِ اقدس پر حاضر ہو' اُس کے لئے مستحب خیال کیا ہے کہ وہ اس آیت کو پڑھے اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگے۔ مذاہب اربعہ کے علماء نے اسے اپنے مناسک میں نقل کیا ہے اور اسے مستحسن سمجھ کر آدابِ زیارت میں شامل کیا ہے۔''

''صحابہ کرام کے زمانہ سے لے کر آج تک اہلِ اسلام حضورِ اقدس ﷺ کے روضہ شریف کی زیارت اور حضور علیہ السلام سے توسّل و استغفار کرتے رہے ہیں۔ حافظ ابوعبداللہ محمد بن موسیٰ بن نعمان اپنی کتاب ''مصباح الظلام'' میں لکھتے ہیں کہ حافظ ابوسعید سمعانی نے بروایت علی ابن طالب رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے:

قَدِمَ عَلَيْنَا أَعْرَابِيٌّ بَعْدَمَا دَفَنَّا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بِثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فَرَمٰى بِنَفْسِهٖ عَلٰى قَبْرِهٖ وَحَثَا عَلٰى رَأْسِهٖ مِنْ تُرَابِهٖ وَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَدْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَقَدْ جِئْتُكَ تَسْتَغْفِرُ لِيْ ذُنُوْبِيْ مِنَ الْقَبْرِ قَدْ غُفِرَ لَكَ (شواھد الحق' ص ۸۷)

''نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تدفین کے تین دن بعد ایک بدّو قبرِ مبارک پر حاضر ہوا' اُس نے اپنے آپ کو آپ کی قبرِ انور پر گرا دیا' قبر مبارک کی مٹی اپنے سر پر ڈالی اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے' اب آپ کے حضور حاضر ہوا ہوں کہ آپ میری بخشش کرا دیں۔ اس پر قبرِ انور سے آواز آئی: تجھے بخش دیا گیا۔'' (وفاء الوفاء للسمھودی: شفاء السقام للسبکی بحوالہ ''سیرتِ رسولِ عربی ﷺ'' - علامہ نور بخش توکلی' ص ص ۵۲۹' ۵۳۰)

''مسند امام ابی حنیفہ رضی اللہ عنہ میں بروایتِ امام منقول ہے کہ حضرت ایوب سختیانی تابعی آئے۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ کے مزارِ انور کے نزدیک پہنچے تو اپنی پیٹھ قبلہ کی طرف اور منہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چہرہ انور

کی طرف کرلیا اور آپ کی ذاتِ اقدس سے توسّل کیا۔'' (وفاء الوفاء ص ۱۴۱۲ بحوالہ ''سیرتِ رسولِ عربی ﷺ'')

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی عباسی خلیفہ منصور کو اسی بات کی ترغیب دی کہ روضہ رسول علیہ السلام پر درود وسلام پیش کرنے کے بعد کعبہ کی طرف پشت کرکے اور مواجہہ شریف کی طرف رخ کرکے رب تعالیٰ سے دعا کے لئے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا توسّل کرے۔

بعض صاحبان حصولِ دعا کے لئے اولیائے کرام کی خدمت میں حاضری کو بھی اسی ضمن میں شمار کرتے ہیں اور حاضر ہونے والوں پر بڑی بے رحمی سے شرک کا الزام لگاتے ہیں۔ وہ خود ہی انصاف فرمادیں کہ جب کوئی مسلمان کسی ولی یا بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور دعا کے لئے عرض کرتا ہے تو کیا (العیاذ باللہ) وہ اُن کی عبادت کر رہا ہوتا ہے؟ اگر صرف طلبِ دعا کے لئے بھی کسی کے پاس جانا عبادت اور شرک ہے تو اِن صاحبان کا صحابہ کرام کے متعلق کیا فتویٰ ہے جو حضور سرورِ عالم، رحمتِ مجسّم ﷺ کی خدمتِ اقدس واطہر میں کبھی بارش کے نزول کے لئے، کبھی بارش کے رکنے کے لئے، کبھی بیماری سے شِفا یاب ہونے کے لئے اور کبھی دیگر مقاصد کے لئے حاضر ہوتے اور دعا کے لئے عرض کرتے اور آپ ﷺ دعا کے لئے دستِ مبارک بارگاہِ الٰہی میں اٹھاتے تو مشکلیں آسان ہوجاتیں۔ لا علاج مریض شِفا یاب ہوجاتے، طویل خشک سالی کے بعد آنِ واحد میں گھنگھور گھٹائیں برسنے لگتیں اور برستی ہی چلی جاتیں۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اس بات پر محکم یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت کفر اور گمراہی ہے اور ابدی عذاب کا موجب ہے اور ان بے رحم مُفتیوں سے بھی مؤدّبانہ التماس ہے کہ وہ شمعِ توحید کے پروانوں پر شرک کی جھوٹی تہمت لگانے کا شغل ترک کردیں اور کوئی مفید مشغلہ اختیار فرمائیں جس سے انہیں بھی فائدہ ہو اور اُن کی قوم کا بھی بھلا ہو۔'' (ضیاء القرآن، جلد چہارم، ص ۲۵۹)

مولانا محمد قاسم نانوتوی رقمطراز ہیں:

''یہ قرآنی آیت کسی خاص زمانہ کے لئے مخصوص نہیں ہے خواہ لوگ نبی علیہ السلام کے ہم عصر ہوں یا آپ کے بعد آنے والے ہوں۔ اور پھر اس آیت کو کسی خاص وقت کے لئے محدود کرنا کیونکر ہو جبکہ نبی علیہ السلام اپنی تمام اُمّت کے لئے برابر طور پر رحمت ہیں اور آپ کی رحمت کو آپ کے پاس آنے والے لوگوں کے لئے کہ آپ اُن کے لئے اللہ سے بخشش کی دعا کریں، اسی صورت میں معقول اور جائز سمجھا جائے گا جب آپ کو اپنی قبر مبارک میں حیات سمجھا جائے۔'' (''حیات النبی ﷺ''۔ پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری، ص ۱۲۵)

ابنِ حجر مکّی شافعی لکھتے ہیں:

دَلَّتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ عَلٰى حَثِّ الْاُمَّةِ عَلَى الْمَجِيْءِ اِلَيْهِ ﷺ وَالْاِسْتِغْفَارُ عِنْدَهٗ، وَاِسْتِغْفَارِهٖ لَهُمْ وَهٰذَا لَا يَنْقَطِعُ بِمَوْتِهٖ وَ الْاٰيَةُ الْكَرِيْمَةُ وَاِنْ وَرَدَتْ فِيْ قَوْمٍ مُّعَيَّنٍ فِيْ حَالِ الْحَيٰوةِ نَعَمْ بِعُمُوْمِ الْعِلَّةِ كُلُّ مَنْ وُجِدَ فِيْهِ ذٰلِكَ الْوَصْفُ فِي الْحَيٰوةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ وَ لِذٰلِكَ فَهِمَ الْعُلَمَاءُ مِنْهَا الْعُمُوْمَ لِجَانِبَيْنِ (شِفاء السّقام، ص ص ۸۱، ۸۲؛ الجواهر المعظم، ص ۶؛ شواهد الحق، ص ۶۱)

’’قرآن کی یہ آیت اُمّتِ مسلمہ کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور حاضر ہونے کی تحریک دلاتی ہے کہ وہ آپ ﷺ کے سامنے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کریں اور حضور علیہ السلام بھی اُن کی بخشش کی دعا کریں اور یہ چیز آپ کی وفات سے منقطع نہیں ہوئی۔ اگرچہ آیت کچھ مخصوص لوگوں کے لئے نازل ہوئی لیکن عمومیت کے لحاظ سے اس کا اطلاق اُن تمام لوگوں پر ہوتا ہے جو آپ کے پاس (خواہ پیغمبر علیہ السلام کی حیات میں یا آپ کی وفات کے بعد) اپنے گناہوں کی بخشش کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اسلام نے اُن سب لوگوں کے لئے ایک عمومی نقطہ بنالیا ہے جو آپ کے پاس حاضر ہوتے ہیں تو آپ اللہ تعالیٰ کے حضور اُن کی بخشش کی ضرور سفارش فرمائیں گے۔‘‘

(7) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًاO (النساء : ۶۵)

’’پس (اے حبیب!) آپ کے رب کی قسم! یہ لوگ مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے درمیان ہونے والے ہر اختلاف میں آپ کو حکم نہ بنا لیں پھر اُس فیصلہ سے جو آپ صادر فرما دیں اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور (آپ کے حکم کو) بخوشی پوری فرمانبرداری کے ساتھ قبول کر لیں۔‘‘ (۶۵ : ۴)

بارگاہِ رسالت کی عدالت کی کوئی مثیل ونظیر نہیں ہے جن کے فیصلے کو رب تعالیٰ نے جزوِ ایمان قرار دیا اور اُس پر تنگی محسوس کرنے کو خارج از ایمان ہونے کا فیصلہ سنایا گیا۔ ذرا غور تو کیجئے کہ اس دنیا کی عدالت سے کسی مجرم کے خلاف صادر شدہ فیصلہ پر مجرم خوشی کا اظہار تو نہیں کرتا بلکہ فیصلہ کرنے والے کے خلاف وہ سراپا کینہ اور بغض ہوتا ہے۔ اس بغض رکھنے پر دنیا کا کوئی ضابطۂ اخلاق یا عدالت اُسے سزا دینے کے مجاز نہیں۔ لیکن سورۃ النّساء کی محولہ بالا آیت ۶۵ کے مدِّ نظر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اُس اعلیٰ وارفع مقام کا اندازہ لگائیے جو اُن کے خالق و مالک نے اُنہیں عطا فرمایا ہے۔ دربارِ نبوی سے صادر شدہ فیصلہ کو مجرم کا بہ صدقِ دل بخوشی تسلیم کر لینا ہی صحیح ایمان کا تقاضا ہے' کیونکہ قرآن مجید کی رُو سے دربارِ نبوی کے کسی فیصلے کو نارضامندی سے قبول کرنا کفر کی علامت ہے اور اس صورت میں وہ ’’توہینِ عدالت‘‘ کا مرتکب ہونے کے ساتھ ساتھ ایمان کی دولت سے بھی محروم رہے گا اور غضبِ الٰہی کا بھی مورد بنے گا۔

پیغمبر کے حکم کو نہ ماننے والوں اور صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر شیطانی اور اپنی نفسانی راہوں پر چلنے والوں کا انجام بالآخر نارِ جہنم ہے جیسا کہ سورۃ النساء کی اِس آیت میں تنبیہ کی گئی:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًاO (اَلنِّسَآء : ۱۱۵)

’’اور جو شخص رسول (ﷺ) کی مخالفت کرے اس کے بعد کہ اُس پر راہِ ہدایت واضح ہو چکی ہو اور مسلمانوں کی راہ سے جدا راہ کی پیروی کرے تو ہم اُسے اُسی (گمراہی) کی طرف پھیرے رکھیں گے جدھر وہ (خود) پھر گیا ہے اور (بالآخر) اُسے دوزخ میں ڈالیں گے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔‘‘ (۴:۱۱۵)

۴۲۱۱ (محمد ﷺ Mohammad)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اعلیٰ اور فائق قیادت کی وضاحت ابن العربی نے اس طرح کی ہے:
''محمد (ﷺ) کی ہستی دو مشمولات کو شامل ہے: ایک روحِ محمد (ﷺ) اور دوسری محمد (ﷺ) بطورِ انسان اور یہ دونوں مشمولات دنیاوی اور اخروی زندگی کے ساتھ مربوط ہیں۔ جب محمد (ﷺ) بطورِ انسان پیدا ہوئے تو اُسی وقت آپ (رشد و ہدایت کے لئے) مائل بہ عمل تھے اور تادمِ آخر اسی طرح رہے لیکن آپ کی روح دائمیت (ہمیشگی) کے ساتھ قائم و دائم ہے۔'' ("Revelation and Reason in Islam"... A. J. Arberry)

نبی اکرم ﷺ کے اختیارات بطور قانون ساز: اللہ قادرِ مطلق شہنشاہِ کل ہے اور مختار کاری کا مکمل مالک ہونے کے حوالہ سے وہ قانون کا واضع اور اُس کا عطا کرنے والا ہے۔ وہ اپنے احکامات بذریعہ وحی اپنے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچاتا ہے۔ یہ احکامات یا تو براہِ راست ہوتے ہیں جو اصل خدائی الفاظ میں ہوتے ہیں اور اگر وہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے الفاظ میں ہوں تو وہ بالواسطہ (پیغمبر) ہوتے ہیں۔ سورۃ التوبہ (۹) کی درج ذیل آیت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقام کو بطور قانون عطا کرنے والے کے اجاگر کرتی ہے:

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗٓ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْہُ اِنْ کَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ O (التوبۃ : ۶۲)
''اللہ اور اُس کا رسول زیادہ حقدار ہے کہ اُسے راضی کیا جائے اگر یہ لوگ ایمان والے ہوتے۔''

یعنی رسول اللہ ﷺ کے راضی ہونے سے ہی اللہ راضی ہو جاتا ہے کیونکہ دونوں کی رضا ایک ہی ہے۔ کاش کہ وہ اس روشن حقیقت کو جان لیتے!

یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کہ آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کے لئے تثنیہ کی ضمیر ھُمَا کی بجائے ہٗ کی واحد ضمیر لائی گئی ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ اگرچہ مختار کاری (Authority) صرف خدائے واحد کی ہے لیکن اس کا اظہار دُوہرا ہے اور یہ کہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے مابین قانون سازی کے اختیار میں بہ مشکل ہی کوئی فرق ہے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کے وضع کردہ قوانین وضوابط وحیِ الٰہی کا نتیجہ ہوتے ہیں' اس لئے اُنہیں بھی قانون دانی کی ویسی ہی قوت حاصل ہے جیسی قرآنی قانون دانی کو حاصل ہے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قانون سازی کی مختار کاری کو قرآنِ مجید کے کثیر التعداد مقامات پر اجاگر کیا گیا ہے جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

(۱) یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ (النساء : ۵۹)
''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔'' (۴: ۵۹)

(۲) مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (النساء : ۸۰)
''جس نے رسول ﷺ کا حکم مانا' بے شک اُس نے اللہ ہی کا حکم مانا۔'' (۴:۸۰)

(۳) یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ (الاعراف : ۱۵۷)

"(رسول) اُنہیں اچھی باتوں کا حکم دیتا ہے اور اُنہیں بُری باتوں سے روکتا ہے، اُن کے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال کرتا ہے اور اُن پر پلید چیزوں کو حرام کرتا ہے اور اُن سے اُن کے بارِ گراں اور طوقِ (قیود) جو اُن پر (نافرمانیوں کے باعث مسلّط) تھے، ساقط فرماتا ہے (اور اُنہیں نعمتِ آزادی سے بہرہ ور فرماتا ہے۔" (۷ : ۱۵۷)

(۴) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ (الانفال : ۲۴)

"مؤمنو! جب (بھی) رسول ﷺ تمہیں کسی کام کے لئے بلائیں جو تمہیں (جاودانی) زندگی عطا فرماتا ہے تو اللہ اور رسول ﷺ کو فرمانبرداری کے ساتھ جواب دیتے ہوئے (فوراً) حاضر ہو جایا کرو۔" (۸:۲۴)

آیت مذکورہ میں اللہ اور رسول ﷺ دو کا ذکر ہے تو اس لحاظ سے دَعَـا کا صیغہ واحد کی بجائے دَعَـوَا صیغہ تثنیہ کا ہونا چاہئے تھا جیسا کہ سورۃ التـوبۃ کی آیت ۶۲ میں ہے۔ تو یہاں بھی بتانا یہی مقصود ہے کہ اگرچہ اللہ رب العزت کی ذات حکم دینے میں مستقل بالذات ہے اور اس کے حکم کی تعمیل بہرحال مقدم ہے لیکن یاد رکھو کہ رسول کا بلانا بھی دراصل اللہ ہی کا بلانا ہے اور اُن کی پکار کا انکار دراصل اللہ کی پکار کا انکار ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح بخاری میں روایت کیا ہے کہ حضرت سعید بن المعلیٰ فرماتے ہیں کہ میں نماز پڑھ رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے یاد فرمایا۔ نماز ختم کرنے کے بعد میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ اے حبیب اللہ! جب آپ نے اِس غلام کو یاد فرمایا تو میں نماز پڑھ رہا تھا۔ اب فارغ ہو کر حاضرِ بارگاہ ہو گیا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اے ابا سعید! کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم نہیں پڑھا کہ جس وقت تمہیں اللہ اور اُس کا رسول بلائے تو فوراً حاضر ہو جایا کرو؟ فقہائے کرام نے اس سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ اگر کوئی نماز پڑھ رہا ہو اور حضور علیہ السلام اُسے بلائیں تو وہ حاضرِ خدمت ہو جائے، اُس کی نماز نہیں ٹوٹے گی۔ (تفسیر مظہری بحوالہ ضیاء القرآن، ج ۲، ص ۱۴۱)

آیت مذکورہ اس بات پر زور دے رہی ہے کہ سنتِ رسول ﷺ ہماری زندگی کا سرچشمہ ہے اور اس کی پیروی ہی میں ہماری بقا اور اقوامِ عالم پر ہمارے غلبہ کا راز پوشیدہ ہے۔ لیکن اُمّت کے اُن نام نہاد "خیرخواہوں" کا کیا کہیے جو اُمّت کو پٹڑی سے اتار کر اُنہیں جہالت کی دَلدل میں اس استدلال کے ساتھ گھسیٹ کے لئے جا رہے ہیں کہ (معاذ اللہ) رسول کی تابعداری ایسی زنجیر ہے جس نے اُمت کی آزادی کو پابہ جولاں کر دیا ہے اور یہ کہ یہ ایسی افیون ہے جس نے اُمّت کی تفکراتی قوّتوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اُن کے اس بے وزن پروپیگنڈے کو مسترد کرتے ہوئے اپنی تفسیر مظہری میں فرمایا ہے:

اِنَّ اِطَاعَةَ الرَّسُوْلِ فِیْ كُلِّ اَمْرٍ یُحْیِی الْقَلْبَ وَعِصْیَانُهٗ یُمِیْتُهٗ

"بے شک ہر معاملے میں رسول کی تابعداری دل کو زندہ رکھتی ہے اور اُن کی نافرمانی دل کو مردہ کر دیتی ہے۔"

(۵) وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا O (الاحزاب : ۳۶)

''نہ کسی مؤمن مرد کو (یہ) حق حاصل ہے اور نہ کسی مؤمن عورت کو کہ جب اللہ اور اُس کا رسول کسی کام کا فیصلہ (یا حکم) فرمادیں تو اُن کے لئے اپنے (اُس) کام میں (کرنے یا نہ کرنے کا) کوئی اختیار حاصل ہو اور جو شخص اور اُس کے رسول (ﷺ) کی نافرمانی کرے تو وہ یقیناً کھلی گمراہی میں بھٹک گیا۔ (۳۳:۳۶)

آیت کے شانِ نزول کے بارہ میں حضرات قتادہ، مجاہد، ابن عباس اور دیگر ائمہ تفسیر کا یہ قول ہے کہ یہ آیت اُس وقت نازل ہوئی جب رحمت عالم ﷺ نے اپنے جدِّ امجد حضرت عبدالمطلب کی نواسی، خاندانِ بنی ہاشم کی معزز خاتون حضرت زینب بنتِ جحش رضی اللہ عنہا کو اپنے آزاد کردہ غلام زید کے لئے شادی کا پیغام بھیجا تو اُنہوں نے اور اُن کے بھائی عبداللہ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جبریل یہ آیتِ طیّبہ لے کر حاضر ہوئے کہ کسی مؤمن مرد اور عورت کو اس بات کی اجازت نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا رسولِ مکرّم اُسے کوئی حکم دے تو وہ انکار کر دے۔ جب یہ ارشادِ خداوندی حضرت زینب اور اُن کے بھائی عبداللہ نے سنا تو فوراً زید سے نکاح کرنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود اُن کا نکاح حضرت زید سے پڑھا دیا۔

اگرچہ یہ آیت اُس خاص موقع پر نازل ہوئی لیکن اپنے الفاظ کے اعتبار سے یہ عام ہے اور حضور علیہ السلام کے قانون ساز ہونے اور مختار کاری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بالغ، ذی ہوش لڑکی کو اسلام نے نکاح کے معاملہ میں خیارِ بلوغ کا حق دیا ہے کہ وہ جس سے چاہے نکاح کے لئے رضامندی کا اظہار کر دے اور جس کو چاہے ناپسند کر دے اور اس میں اُس کے والد تک کو اُس پر جبر کرنے کا کوئی حق اسلام نہیں دیتا۔ لیکن پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قانون ساز ہونے کے حوالہ سے معاملہ کچھ اور ہے کہ ''خیارِ بلوغ'' کا حق ملنے کے باوجود اُسے آقا علیہ السلام کے فیصلہ پر سرِ تسلیم خم کرنا پڑے گا اور یہی سچے ایمان کا تقاضا ہے۔ ☆

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تشریعی اختیارات کا ایک اور مستحکم ثبوت یہ بھی ہے کہ پورے قرآن مجید میں 36 مقامات پر اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا ذکر اکٹھا آیا ہے اور 20 مقامات پر صرف رسول ﷺ کی اطاعت کا ذکر ہوا ہے جیسے:

(۱) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النسآء : ۸۰)

''جس نے رسول کا حکم مانا، اُس نے بالیقین اللہ کا حکم مانا۔'' (۴:۸۰)

(۲) وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ O (النور: ۵۶)

''نماز کو قائم رکھو، زکوٰۃ دیتے رہو، رسول کا حکم مانتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔'' (۲۴:۵۶)

(۳) وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا O (الفرقان : ۲۷)

''اور اُس دن ہر ظالم اپنے ہاتھوں کو کاٹ کاٹ کھائے گا اور کہے گا کاش میں نے رسول کی ہمراہی میں راستہ اختیار کر لیا ہوتا۔'' (۲۵:۲۷)

لیکن پورے قرآن پاک میں کہیں بھی صرف اطاعتِ الٰہی کا ذکر نہیں ہے۔ وجہ یہی ہے کہ کہیں لوگ یہ سمجھ نہ بیٹھیں کہ اعلیٰ و ارفع ذات یعنی اللہ کا دامن ہم نے تھام لیا ہے تو اب اُس سے کم تر ذات یعنی رسول کا دامن تھامنے کی کیا ضرورت ہے؟

(۶) مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (الحشر: ۷)
''رسول تمہیں جو کچھ دے دیں' لے لیا کرو اور جس سے روک دیں' رُک جایا کرو۔'' (۵۹ : ۷)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قانون ساز ہونے کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ آپ نے جناب علی کرم اللہ وجھہ' سے فرمایا کہ جب تک تمہاری بیوی فاطمہ حیات ہے تم دوسرا نکاح نہیں کر سکتے۔ حالانکہ اُنھیں از روئے قرآن چار بیویوں سے نکاح کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ جناب علی کرم اللہ وجہہ' نے حکم پیغمبر کے آگے سر جھکا دیا' سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حینِ حیات میں اُنہوں نے دوسرا نکاح نہیں کیا اور نہ نبی علیہ السلام کے سامنے قرآنی اجازت نامے کا حوالہ دیا۔

Wensinck نامی ایک مستشرق لکھتا ہے:
''سنتِ نبوی ایسا آئینہ ہے جس میں مسلم سماج کی امنگیں اور آرزوئیں منعکس ہوتی ہیں۔'' ("Muslim Creed"... Wensinck, p. 1)

الکاشانی کا بیان ہے کہ سنتِ نبوی کے بغیر نہ تو قرآن پر ایمان لانا ممکن ہے اور نہ ہی احکام اسلام پر عمل پیرا ہونا ممکن ہے۔ ("The Relationship between Qur'an and Sunnah" ... Tanzil-ur-Rahman, p. 136)

سنتِ نبوی کی اہمیت کو بڑی جامعیت کے ساتھ امام اوزاعی نے یوں بیان کر دیا ہے:
''قرآنِ حکیم کو سنت کی اس سے کہیں زیادہ ضرورت ہے کہ سنت کو قرآن کی ضرورت ہو۔'' (''جامع بیان العلم''۔۔۔ امام اوزاعی' جلد ۲' صفحہ ۱۹۱)

نبی اکرم ﷺ بطور قانون ساز مستشرقین کی نظر میں

(۱) ''آپ ﷺ نے حکومت کی' سزائیں دیں اور قانون سازی کی۔'' ("An Introduction to the Study of Anglo-Mohammadan Law"... R.K. Wensinck, p. 15)

(۲) ''خصوصی مسائل کے حل کے لئے جب بھی وہ پیدا ہوں' آپ ﷺ منصفِ اعلیٰ تھے اور وحیِ قرآن کی تفسیر و تاویل کرنے کے آپ ذمہ دار تھے۔'' ("A History of Islamic Law" ... N.J. Coulson, p. 3) Edinburgh Edition, 1964.

(۳) ''جب آپ دل میں انتہائی گڑ جانے والے احکام صادر فرماتے تو یوں لگتا تھا کہ آپ فی الواقع اللہ کی طرف سے بول رہے ہیں۔'' ("Muhammadanische Studien"...Goldziher) 1990

(۴) ''قانونِ اسلامی کو مغربی نظریات کی کسوٹی پر پرکھنے میں مستشرقین نے ٹھوکر کھائی ہے۔ مغرب میں قانون انسانی خواہشات کی پیداوار ہے جو اکثر اوقات اعلیٰ اخلاقی اقدار سے عاری ہوتا ہے اور جہاں قانون سازی کے اختیارات میں کوئی حد اور پابندی نہیں ہے جس سے انسان انسان کا غلام ہو کے رہ گیا ہے۔ وہ یہ بات بھول گئے ہیں کہ اسلام میں قانون سازی ہمیشہ رضائے الٰہی کی حدود میں رہتی ہے جس کے حکومت اور افراد پابند رہنے اور جوابدہ ہونے کے ذمہ دار ہیں۔'' ("Islamic Legal Theory and the Orientalists" ... Syed Abul Hasan Najmee, p. 41)Lahore, 1969.

(8) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ O

''مومنو! رَاعِنَا مت کہا کرو اور اُنْظُرْنَا کہا کرو اور توجہ سے سنا کرو اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔'' (۲ : ۱۰۴)

''رَاعِنَا ذومعنی لفظ ہے جس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ ہماری رعایت فرمایئے لیکن رَاعِنَا کے ''ع'' کو ذرا کھینچ کر پڑھنے سے اس کے معنی میں ایک گستاخانہ مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ مسلمان اس شرارت سے غافل، بے خبر، خالی الذہن خود بھی یہ الفاظ بولنے لگتے اور حضور کریم ﷺ کے کسی ارشادِ گرامی کو اچھی طرح سمجھ نہ پاتے تو عرض کرتے رَاعِنَا اے حبیب اللہ! ہم پوری طرح سمجھ نہیں سکے، ہماری رعایت فرماتے ہوئے دوبارہ سمجھا دیجئے۔ یہاں اُنہی کو یہ ممانعت ہو رہی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کو اپنے محبوب علیہ السلام کی عزت وتعظیم کا یہاں تک پاس ہے کہ ایسے لفظ کا استعمال بھی ممنوع فرما دیا جس میں گستاخی کا شائبہ تک بھی ہو۔ چنانچہ فرمایا کہ رَاعِنَا کی جگہ اُنْظُرْنَا کہا کرو (یعنی ہماری طرف نگاہِ لطف فرمایئے) کیونکہ یہ لفظ ہر طرح کے احتمالاتِ فاسدہ سے پاک ہے۔ وَاسْمَعُوْا کا حکم دے کر یہ تنبیہ فرما دی کہ جب میرا رسول تمہیں کچھ سنا رہا ہو تو ہمہ تن گوش ہو کر سنا کرو تا کہ اُنْظُرْنَا کہنے کی نوبت ہی نہ آئے کیونکہ یہ بھی تو شانِ نبوت کے مناسب نہیں کہ ایک ایک بات تم بار بار پوچھتے رہو۔ نبی مکرم ﷺ کا ادب واحترام اس بات میں ہے کہ آپ کے ارشاداتِ عالیہ کو ہمہ تن گوش ہو کر سنو، نہ کہ اس بات میں کہ آپ کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرتے رہو یا اُنْظُرْنَا کہتے رہو۔

حال کے بعض گمراہ فرقوں نے رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس سے بالکل قطع نظر کر کے ایمان واسلام کے لئے محض قرآن کی اتباع کو کافی سمجھ لیا ہے۔ اُن کی گمراہی آیت کے لفظ وَاسْمَعُوْا سے ظاہر ہے۔

آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مرتبہ رسالت کا ادب صرف معنوی حیثیت ہی سے نہیں، لفظی حیثیت سے بھی ضروری ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ جن الفاظ سے اہانت کا احتمال بھی نکلتا ہو، اُن سے احتیاط لازم ہے۔ بلکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں تو ایسے الفاظ پر حد واجب ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بے ادبی اور گستاخی کے ارادہ تک سے بالکل بَری تھے تو جو ممانعت کی گئی، وہ یہود کی نیت پر حکم کر کے کی گئی۔

علامہ شوکانی ''فتح القدیر'' کی جلد اوّل (ص ۱۲۴) میں رَاعِنَا کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''رَاعِنَا اور ایسے تمام الفاظ جن سے توہینِ رسالت کا احتمال ہو' اُن کا استعمال قطعی طور پر ممنوع قرار دیا گیا۔'' اس لئے اہلِ ایمان کو براہِ راست مخاطب کر کے یہ حکم دیا گیا کہ وہ ایسے ذومعنی الفاظ سے قطعاً پرہیز کریں تاکہ شانِ رسالتمآب ﷺ میں کسی قسم کی پنہاں اور پوشیدہ گستاخی کا احتمال بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔''

آیت کے آخری حصّہ سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حق میں ادنیٰ سی گستاخی بھی کفر ہے اور کفر کا مقدر دردناک عذاب ہے۔ بعض صاحبانِ نظر نے اِس آیت کے اسلوبِ بیان سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ حق تعالیٰ کو یہودیوں کے اس فتنہ پرور گروہ کا یہ گستاخانہ اندازِ تخاطب اتنا ناگوار گزرا کہ اُس نے ایسے بدطینت یہودیوں سے خطاب کرنا بھی پسند نہیں فرمایا حالانکہ قرآنِ حکیم میں یہود و نصاریٰ سے جابجا براہِ راست خطاب کیا گیا ہے۔

آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مرتبہ رسالت کا ادب صرف معنوی حیثیت ہی سے نہیں' لفظی حیثیت سے بھی ضروری ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ جن الفاظ سے اہانت کا احتمال بھی نکلتا ہو' اُن سے احتیاط لازم ہے۔ بلکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں تو ایسے الفاظ پر حد واجب ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بے ادبی اور گستاخی کے ارادہ تک سے بالکل بَری تھے تو جو ممانعت کی گئی' وہ یہود کی نیت پر حکم کر کے کی گئی۔

ہر نازک موقع پر منافقین مسلمانوں میں افتراق' ڈر اور خوف پیدا کر کے مسلمانوں کی اذیت کا سامان پیدا کرتے رہتے تھے۔ لہٰذا الٰہی حکمت اور مصلحت نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ مسلمانوں اور منافقوں کے دونوں گروہ بلا امتیاز آپس میں گڈمڈ رہیں اور اسی لئے اُن کو جدا جدا رکھنا ضروری تھا۔ ان گروہوں کی باہمی علیحدگی کا انتظام چند طرح سے کیا گیا: (۱) نیک اور صالح لوگوں کی آزمائش اُنہیں لگاتار مصائب میں مبتلا کرنے سے اور بدلوگوں کو دنیاوی لذات کی عیش کوشی میں کھلی چھٹی دینے سے (۲) اسلام کو فتح یاب کرنے اور کفر کو شکست دینے سے (۳) اپنے پیغمبر ﷺ کو اس بات کا علم دینے سے کہ کون سچا مسلمان ہے اور کون نہیں۔ منافقوں نے یہی کہا تھا کہ اگر محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں' تو اُنہیں ہمیں بتانا چاہئے کہ ہم میں سے کون ایمان والا ہے اور کون نہیں۔ اس سلسلہ میں امام بیضاوی علیہ الرحمۃ نے درج ذیل حدیث کا حوالہ دیا ہے:

إِنَّهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ: عُرِضَتْ عَلَيَّ أُمَّتِي وَأُعْلِمْتُ مَنْ يُّؤْمِنُ بِي وَمَنْ يَّكْفُرُ فَقَالَ الْمُنَافِقُوْنَ: إِنَّهُ يَزْعَمُ أَنَّهُ يَعْرِفُ مَنْ يُّؤْمِنُ وَمَنْ يَّكْفُرُ وَنَحْنُ مَعَهُ وَلَا يَعْرِفُنَا فَنَزَلَتْ (تفسیر بیضاوی)

''نبی علیہ السلام نے فرمایا: میری امت مجھ پر پیش کی گئی اور میں نے جان لیا کہ کون مجھ پر ایمان لایا ہے اور کون مجھ پر ایمان نہیں لایا۔ اِس پر منافقین کہنے لگے: آپ کا دعویٰ ہے کہ کون آپ پر ایمان لایا ہے اور کون آپ پر ایمان نہیں لایا۔ ہم تو آپ کے ہم نشیں ہیں اور آپ کو ہماری حقیقت کا پتہ تک نہیں۔ تو اس موقع پر سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۷۹ نازل ہوئی۔'' (جو حسبِ ذیل ہے):۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (آل عمران : ۱۷۹)

''جس حال پر ایمان والے ہیں' اللہ انہیں اُس حال پر چھوڑے رکھنے کا نہیں جب تک کہ وہ ناپاک کو پاک سے الگ نہ کر لے اور نہ اللہ تمہیں غیب پر مطلع کرنے والا ہے' البتہ اللہ جسے چاہتا ہے' اپنے رسولوں میں سے انتخاب کر لیتا ہے۔'' (۳ : ۱۷۹)

درج بالا آیت سے دو نکات حاصل ہوئے: اوّل تو یہ کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بخوبی علم تھا کہ منافق کون کون لوگ ہیں اور دوم یہ کہ کسی بات کا اظہار نہ کرنا اُس بات کی لاعلمی کو مستلزم نہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین محبوبِ کبریاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی لامحدود وسعتِ علمی پر ہمیشہ شاداں و فرحاں رہتے جبکہ یہ بات منافقوں کے لئے ناقابلِ تسلیم تھی اور آپ کی خداداد وسعتِ علمی سے چڑتے ہوئے اور خشک مزاج ہوتے ہوئے انہوں نے ہمیشہ اسے اپنے رسوا کن شر کا ہدف (نشانہ) بنایا۔

(9) وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا○ (النّساء : ۱۱۳)

''(اے نبی!) اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور آپ کو وہ سکھایا ہے جو آپ نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا بڑا ہی فضل و کرم ہے۔'' (۴ : ۱۱۳)

اللہ تبارک و تعالیٰ کے آخری رسول ﷺ پر اُس ذاتِ کردگار کی بے پناہ نوازشات و انعامات ہوتے ہوئے آپ میں کسی نقص یا غلطی کا پایا جانا محال بالذات ہے اور آپ پر اِن نوازشات و عطیات کے ہوتے ہوئے یہ ناممکن تھا کہ کوئی آپ کو (معاذ اللہ) صراطِ مستقیم کی پٹڑی سے اُتار دے۔ اس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کے دشمنوں کی بدخواہیوں کے باوجود اپنے رسول کی حفاظت فرمائی ہے تاکہ آپ کی ذاتِ مقدسہ تمام عالم کے تمام انسانوں کے لئے تاابد مشعلِ راہ بنی رہے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں درج بالا آیت کتنی ہی پیاری ہے! آیت میں لفظ ''فضل'' کو پڑھ کر ہم مسلمانوں کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ رحمتِ الٰہی کا بحرِ ذخّار اپنی پوری طغیانی کے ساتھ موجزن ہے۔ غرض کہ آپ ﷺ عطیات و نوازشاتِ الٰہی کا مرکز ہیں' وہ عطیات و نوازشات جو کسی طرح بھی کم اور محدود نہیں ہیں بلکہ ''عظیم'' ہیں اور ''عظیم'' بھی اللہ کی نظر میں جس کے نزدیک کُل متاعِ دنیا قلیل و حقیر ہے (بحوالہ سورۃ النساء : ۷۷)

لفظ ''فضل'' کا موازنہ ذیل کی آیات کے لفظ ''مَنّ'' سے کیجئے جو موسیٰ اور اُن کے بھائی ہارون علیہما السلام کے بارے میں آیا ہے:

(۱) وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرٰى○ (طٰهٰ : ۳۷)

''اور (اے موسٰی !) ہم نے تم پر ایک اور بار (اس سے پہلے بھی) احسان فرمایا تھا۔'' (۳۷:۲۰)

(۲) وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰی مُوسٰی وَهٰرُوْنَ O (اَلصّٰٓفّٰت : ۱۱۴)

''اور بے شک ہم نے موسٰی اور ہارون (علیہما السلام) پر بھی احسان کئے۔'' (۱۱۴ : ۳۷)

''فَـضـل'' کے مراتب بنانے میں کچھ اہلِ لغت کا کہنا ہے کہ درج بالا آیات میں لفظ مَـنّ (بمعنیٰ احسان) کی حیثیت فـضل سے کہیں کم ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں فـضل صرف ہمارے نبیِ اکرم ﷺ کے لئے خاص ہے اگرچہ سورۃ الانعام کی آیت ۸۶' سورہ سَبا کی آیت دہم اور سورۃ الجاثیۃ کی آیت میں ۱۶ میں یہ لفظ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔

(10) تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ (البقرۃ : ۲۵۳)

''یہ سب رسول (جو ہم نے مبعوث فرمائے) ہم نے اُن میں سے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے' اُن میں سے کسی سے اللہ نے (براہِ راست) کلام فرمایا اور کسی کو درجات میں (سب پر) فوقیت دی۔''

مفسرینِ قرآن نے وضاحت کی ہے کہ رب تعالٰی کے فرمان رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ (کسی کو درجات میں سب پر فوقیت دی) میں صاف اشارہ آخر الانبیاء حضرت محمد ﷺ کی طرف ہے لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ کسی نبی کو دوسرے نبی پر یوں فضیلت نہ دو کہ اس سے دوسرے نبی کی معاذ اللہ تحقیر ہو۔ (ضیاء القرآن' ج ۱' ص ۱۷۵)

قَالَ النُّحَاسُ بَعْضَهُمْ هُنَا عَلٰی قَوْلِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَالشَّعْبِيِّ وَمُجَاهِدٍ مُحَمَّدٌ ﷺ (قرطبی)

''النحاس کا کہنا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق یہاں بَعْضَهُمْ سے مراد نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس ہے۔''

(11) (i) وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلٰى مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُوْدًا O (اَلنِّسَاء : ۶۱)

''اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اُس حکم کی طرف آؤ جسے اللہ نے نازل کیا ہے اور رسول کی طرف آؤ تو (اے نبیِ مکرّم!) آپ دیکھیں گے کہ منافقین آپ کی طرف سے بڑی پہلوتہی کر رہے ہیں۔'' (۴:۶۱)

(ii) وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ O (المنافقون : ۵)

''اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ رسول اللہ تمہارے لئے استغفار کر دیں تو وہ اپنا سر پھیر لیتے ہیں اور

(اے نبی مکرّم!) آپ اُنہیں دیکھیں گے کہ تکبّر کرتے ہوئے بے رخی کر رہے ہیں۔" (۵ : ۶۳)

علامہ قرطبی علیہ الرحمۃ نے یہاں ایک بڑی بصیرت افروز بات لکھی ہے کہ جب رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کے قبیلہ والوں نے اُسے سمجھایا کہ اب بھی حاضرِ خدمت ہو کر معافی مانگ لو۔ نبی مکرّم ﷺ تیری بخشش کے لئے دعا فرمائیں گے تو تیری بدبختی، نیک بختی سے بدل جائے گی تو اُس نے ازراہِ نخوت وتکبّر نفی میں سر ہلایا اور کہنے لگا:

اَمَرْتُمُوْنِیْ اَنْ اُؤْمِنَ فَقَدْ آمَنْتُ وَاَنْ اُعْطِی زَکٰوۃَ مَالِیْ فَقَدْ اَعْطَیْتُ فَمَا بَقِیَ اِلَّا اَنْ اَسْجُدَ لِمُحَمَّدٍ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)

"تم نے مجھے ایمان لانے کا حکم دیا تو میں ایمان لے آیا، تم نے مجھے اپنے مال کی زکوٰۃ دینے کا کہا تو میں نے زکوٰۃ بھی ادا کر دی۔ اب ایک ہی بات باقی ہے کہ میں محمد (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو سجدہ کروں، یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔"

"اِس روایت میں غور کیجئے گا کہ منافق کا ذہن کس طرح غلط راہ پر چلتا ہے اور اُس کی سوچ میں کس قدر بگاڑ پیدا ہوتا ہے، بارگاہِ نبوّت میں حاضری اور محبوبِ کبریاء علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اپنی بخشش کی دعا کرانے میں اُسے صریح شرک نظر آتا ہے۔ وہ اپنے اعمال، نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ پر ہی نازاں رہتا ہے اور یہ ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ کے حبیب کے درِ کرم پر حاضر ہو کر اُس کی رحمتوں سے اپنے دامن کو لبریز کرے۔" (ضیاء القرآن، ج ۵، ص ۲۵۳)

دربارِ نبی سے روکنے والے آج کے اُن نام نہاد "مسلمانوں" کے لئے بھی اس میں لمحۂ فکریہ ہے کہ کیا اُن کا یہ عمل رسول اللہ ﷺ کے ہم عصر منافقین جیسا تو نہیں ہے جن کی بابت قرآن میں سخت وعید آئی ہے؟

(12) وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ وَرَحْمَتُہٗ لَھَمَّتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْھُمْ اَنْ یُّضِلُّوْکَ وَمَا یُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَضُرُّوْنَکَ مِنْ شَیْءٍ وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ (النسآء : ۱۱۳)

"اور (اے حبیب!) اگر آپ پر اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت نہ ہوتی تو اِن (دغابازوں) میں سے ایک گروہ ارادہ کر چکا تھا کہ آپ کو بہکا دیں جبکہ وہ محض اپنے آپ کو ہی گمراہ کر رہے ہیں اور آپ کا تو وہ کچھ بگاڑ ہی نہیں سکتے، اور اللہ نے آپ پر کتاب نازل فرمائی ہے اور اُس نے آپ کو وہ سب علم عطا کر دیا ہے جو آپ نہیں جانتے تھے۔" (۴ : ۱۱۳)

یہ رب تعالیٰ کی دائمی اور مستقل عنایت و نوازش ہی تھی جس نے رسول اللہ ﷺ کو اُن بدباطنوں کی راہ پر چلنے سے روک دیا جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل میں بیان ہوا:

وَلَوْ لَآ اَنْ ثَبَّتْنٰکَ لَقَدْ کِدْتَّ تَرْکَنُ اِلَیْھِمْ شَیْئًا قَلِیْلًاO اِذًا لَّاَذَقْنٰکَ ضِعْفَ الْحَیٰوۃِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ عَلَیْنَا نَصِیْرًاO (بنی اسرائیل : ۷۴، ۷۵)

''اور اگر ہم نے آپ کو (پہلے ہی سے عصمتِ نبوت کے ذریعہ) ثابت قدم نہ بنایا ہوتا تو تب بھی آپ اُن کی طرف بہت ہی معمولی سے جھکاؤ کے قریب جاتے۔ (اگر بالفرض آپ مائل ہو جاتے تو) اُس وقت ہم آپ کو دوگنا مزہ زندگی میں اور دوگنا مزہ موت میں چکھاتے' پھر آپ اپنے لئے (بھی) ہم پر کوئی مددگار نہ پاتے۔'' (۱۷ : ۷۴'۷۵)

لیکن نبی معصوم کو ثابت قدم کیسے نہ رکھا ہوتا۔ یہ ثابت قدمی تو فرع ہے معصومیت کی اور معصومیت لازمہ نبوت ہے۔ بعض نے لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ کو قادحِ عصمت سمجھا ہے حالانکہ آیت کے الفاظ اس کے الٹ پر دلالت کرر ہے ہیں۔ آپ کا جھکاؤ اوّل تو ہوا نہیں' صرف قربِ جھکاؤ ہوا ہے اور پھر وہ بھی ہونے کہاں پایا۔ لَوْ لَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ کی زنجیرِ عصمت نے اتنا بھی ہونے کا موقع کب دیا؟ غرض یہ کہ یہ ارشادِ الٰہی بطورِ الزام نہیں بلکہ یہ تو آپ کی صرف کمال حرص ایمانی کا مظہر ہے اور بہ قولِ مفسّر تھانوی ''یہ ارشاد عتاب نہیں بلکہ اظہارِ محبوبیت ہے کہ آپ ایسے محبوب ہیں کہ ہم نے قلیل جھکاؤ کے قرب سے بھی آپ کو بچا لیا۔'' (ماجدی اردو' صفحہ ۵۹۳' نوٹ: ۱۰۷)

لَوْ لَآ اِمتناعیہ ہے اور اپنے اندر اسی مفہوم کا حامل ہے۔ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ کی عبارت سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمتِ شان کا پتہ چلتا ہے کیونکہ جتنا کوئی زیادہ عزیز ہوتا ہے' اُتنا ہی اُس کی معمولی سے معمولی لغزش ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔

ع   موئے در دیدہ بود کوہِ عظیم

قائدِ مفسرینِ قرآن علامہ ابن جریر نے اس آیت کی وضاحت اپنی تفسیر میں اس طرح کی ہے :

وَمِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْكَ يَامُحَمَّدُ مَعَ سَائِرِمَاتَفَضَّلُ بِهٖ عَلَيْكَ مِنْ نِّعَمِهٖ اَنَّهٗ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَهُوَ الْقُرْاٰنُ الَّذِىْ فِيْهِ بَيَانُ كُلِّ شَىْءٍ وَّ هُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ وَّ الْحِكْمَةُ يَعْنِىْ وَ اَنْزَلَ عَلَيْكَ مَعَ الْكِتٰبِ الْحِكْمَةِ وَهِىَ مَاكَانَ فِى الْكِتٰبِ مُجْمَلًاذَكَرَهٗ مِنْ حَلَالِهٖ وَحَرَامِهٖ وَنَهْيِهٖ وَاَحْكَامِهٖ وَ وَعْدِهٖ وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ مِنْ خَبَرِالْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ وَمَاكَانَ وَمَاهُوَ كَائِنٌ''

''اے محمد ﷺ! آپ پر اللہ تعالیٰ کے لامحدود انعامات میں سے ایک خاص انعام یہ ہے کہ اُس نے آپ کو قرآن جیسی عظیم کتاب عطا فرمائی ہے جس میں ہر چیز کا بیان ہے۔ اس میں رشد و ہدایت کی روشنی بھی ہے اور تنبیہات بھی۔ اُس نے اس کتاب میں حکمت بھی نازل کی ہے یعنی کتاب میں مجملاً بیان شدہ حلال و حرام' منہیات و احکام کی تفصیل ہے۔ علاوہ ازیں اُس نے آپ کو وہ کچھ سکھا دیا جو آپ (اس سے پہلے) نہیں جانتے تھے یعنی گزشتہ اقوام اور جو کچھ ماضی میں وقوع پذیر ہوا اور جو کچھ مستقبل میں ہونے والا ہے۔'' (تفسیر ابن جریر)

علامہ ابن جریر کے الفاظ کہ رب تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو ماضی اور مستقبل کا علم (علم ما کان و ما یکون)

عطا کیا' کی تائید میں امام مسلم نے اپنی صحیح میں بہ سند حضرت ابو زید عمرو ابن الاخطب رضی اللہ عنہ اِسی مضمون کو یوں بیان کیا ہے:

حَدَّثَنِیْ اَبُوْ زَیْدٍ قَالَ: صَلّٰی بِنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ الْفَجْرَ وَصَعِدَ الْمِنْبَرَ فَخَطَبَنَا حَتّٰی حَضَرَتِ الظُّھْرُ فَنَزَلَ فَصَلّٰی ثُمَّ صَعِدَ الْمِنْبَرَ فَخَطَبَنَا حَتّٰی حَضَرَتِ الْعَصْرُ ثُمَّ نَزَلَ فَصَلّٰی ثُمَّ صَعِدَ الْمِنْبَرَ فَخَطَبَنَا حَتّٰی غَرَبَتِ الشَّمْسُ فَاَخْبَرَ بِنَا بِمَا کَانَ وَ بِمَا ھُوَ کَائِنٌ" فَاَعْلَمُنَا اَحْفَظُنَا (صحیح مسلم' جلد ۲)

"مجھے ابو زید نے بیان کیا اور کہا: ہمیں نبیِ اکرم ﷺ نے نمازِ فجر پڑھائی' پھر آپ نے منبر پر چڑھ کر ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا یہاں تک کہ نمازِ ظہر کا وقت آ گیا' آپ منبر سے اترے' نماز پڑھائی' پھر آپ منبر پر چڑھے' ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا یہاں تک کہ نمازِ عصر کا وقت آ گیا' آپ منبر سے اترے' نماز پڑھائی پھر آپ منبر پر چڑھے' ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ اپنے اس طول طویل خطبہ میں جو صبح سے شام تک جاری رہا' آپ ﷺ نے ہمیں زمانۂ ماضی میں واقع شدہ احوال اور مستقبل میں ہونے والے واقعات کے متعلق بتایا۔ ہم میں بڑا عالم وہ ہے جسے اس خطبہ کا زیادہ سے زیادہ حصّہ یاد ہے۔"

یوں سمجھیے کہ (۱) "امام الاوّلین والآخرین ﷺ کا علمِ مبارک ربِّ ذوالجلال والاکرام کے علم کی طرح قدیم نہیں بلکہ حادث ہے یعنی پہلے نہیں تھا بلکہ بعد میں اللہ تعالٰی کے تعلیم کرنے سے حاصل ہوا۔ (۲) رب تعالٰی کے علم کی طرح ذاتی نہیں بلکہ عطائی ہے یعنی اللہ تعالٰی کے بتلانے سے حاصل ہوا۔ (۳) نبی علیہ السلام کا علم اللہ کے علم کی طرح غیر متناہی اور غیر محدود نہیں بلکہ متناہی اور محدود ہے۔ اور اللہ تعالٰی کے علمِ محیط کے ساتھ فخرِ موجودات ﷺ کے علم کی نسبت اتنی بھی نہیں جتنی پانی کے ایک قطرے کو دنیا بھر کے سمندروں سے ہے۔"

"ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ حضور رحمتِ عالم ﷺ کا یہ حادث' عطائی اور محدود علم اتنا محدود نہیں جتنا بعض حضرات نے سمجھ رکھا ہے۔ اُس کی وسعتوں کو یا دینے والا جانتا ہے یا لینے والا۔ جبریلِ امین بھی وہاں دَم مارنے کی مجال نہیں رکھتا۔ فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی (اُس نے وحی فرمائی اپنے بندے کی طرف جو وحی فرمائی)۔ علم و معرفت کی وہ وسعتیں اور بے کرانیاں جن پر بیان کا ہر جامہ تنگ ہے' اُن کی حد برآری ہم کرنے لگیں گے تو ٹھوکریں نہیں کھائیں گے تو اور کیا ہو گا۔"

"اس تلمیذِ رحمٰن نے اپنی زبانِ حق ترجمان سے ہمیں خود جو کچھ بتایا ہے' ہم اُس کو تسلیم کرتے ہیں اور اسی پر ہمارا ایمان ہے۔ اُسی کی زبانِ پاک سے نکلا ہوا یہ قولِ طیب ہم نے سنا ہے کہ آپ فرماتے ہیں:

رَاَیْتُ رَبِّیْ عَزَّوَجَلَّ فِیْ اَحْسَنِ صُوْرَۃٍ قَالَ: فِیْمَ یَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْاَعْلٰی؟ قُلْتُ: اَنْتَ اَعْلَمُ قَالَ: فَوَضَعَ کَفَّہٗ بَیْنَ کَتِفَیَّ فَوَجَدْتُ بَرْدَہٗ بَیْنَ ثَدَیَّ فَعَلِمْتُ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

''آج میں نے اپنے بزرگ و برتر پروردگار کی بڑی حسین اور پیاری صورت میں زیارت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا: (اے حبیب!) جانتے ہو کہ ملاءِ اعلیٰ کس بات پر باہم جھگڑ رہے تھے۔ میں نے عرض کیا آپ ہی بہتر جانتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی ہتھیلی میرے دونوں کندھوں کے درمیان رکھی جس کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینے میں محسوس کی۔ پھر میں نے جان لیا جو کچھ آسمانوں اور زمین میں تھا۔''

شیخ عبدالحق محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مشکوٰۃ کی شرح ''اشعۃ اللمعات'' میں اس حدیثِ پاک کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

''اس ارشادِ نبوی کا مقصد یہ ہے کہ تمام علوم جزوی اور کلّی مجھے حاصل ہو گئے اور اُن کا میں نے احاطہ کر لیا۔''

شارحِ بخاری علاّمہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تمام کائنات جو آسمانوں میں تھی بلکہ اُن کے اوپر بھی جو کچھ تھا اور جو کائنات سات زمینوں میں تھی بلکہ اُن کے نیچے بھی جو کچھ تھا وہ میں نے جان لیا۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو تو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی دکھائی تھی اور اُسے آپ پر منکشف کیا تھا اور مجھ پر اللہ تعالیٰ نے غیب کے دروازے کھول دیئے ہیں۔'' (ضیاء القرآن' جلد ۳' صفحات ۴۵۸' ۴۵۹)

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شہرہ آفاق قصیدہ میں درجِ بالا حقیقت کی یوں نقاب کشائی کی ہے:

وَاِنَّ مِنْ جُوْدِكَ الدُّنْيَا وَضَرَّتَهَا وَمِنْ عُلُوْمِكَ عِلْمُ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

''(اے حبیبِ خدا!) دنیا اور آخرت کی تمام نوازشات وعنایات آپ کی (خداداد) سخاوت کی وجہ سے ہیں اور لوحِ محفوظ میں مرقوم علم آپ کے علم کا محض ایک جزء ہے۔''

امام موصوف کے جذبات واحساسات کسی دیوانے کی بڑ نہیں۔ جو کچھ اُنہوں نے کہا' وہ بنی اسرائیل کی ذیل کی آیت کا ترجمان ہے:

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا○ (بنی اسراء یل: ۲۰)

''ہم ہر ایک کی مدد کرتے ہیں اِن (طالبانِ دنیا) کی بھی اور اُن (طالبانِ آخرت) کی بھی' (اے حبیبِ مکرّم! یہ سب کچھ) آپ کے رب☆ کی عطا سے ہے اور آپ کے رب کی عطا (کسی کے لئے) بند نہیں ہے۔'' (۱۷:۲۰)

☆ رَبِّكَ (آپ کا رب) کے لفظ کو ذہن میں رکھتے ہوئے غور کیجئے کہ باری تعالیٰ نہ صرف اپنے محبوب کا رب ہے بلکہ تمام عالمین کا رب ہے۔ کوئی شک نہیں کہ جہاں میں صدّیق اکبر کا رب ہوں' وہاں ابوجہل کا بھی رب ہوں اور جہاں میں بلالِ حبشی کا رب ہوں وہاں امیہ بن خلف کا بھی رب ہوں۔ محبوب! تیرا بھی رب ہوں۔ لیکن پیارے! جو لطف و مزا مجھے تیرا رب ہونے میں ہے' کسی اور کے رب ہونے میں نہیں۔ یاد رہے کہ مؤلف کی تحقیق کے مطابق پورے قرآن پاک میں 209 مقامات پر رب تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کو رَبِّكَ فرما کر اپنے محبوب علیہ السلام کی طرف نسبت دی ہے۔ دیکھئے آئندہ صفحات ۲۲۳ تا ۲۲۹۔

(13)(i) يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيٰتِهٖ (آل عمران: ۱۶۴؛ الجُمُعة: ۲)
''وہ (یعنی میرا رسول) اُن پر اللہ کی آیتیں پڑھتا ہے۔'' (۱۶۴ :۳؛ ۲ : ۶۲)
(ii) تِلْكَ آيٰتُ اللهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ (البقرة: ۲۵۲؛ آل عمران: ۱۰۸)
''یہ اللہ کی آیتیں ہیں، ہم اُنہیں (اے حبیب!) آپ پر سچائی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔'' (۲:۲۵۲)

محولہ بالا دونوں آیتوں کو اکٹھا پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالنا کچھ مشکل نہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مقدسہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے بندوں کے درمیان ناقابلِ جدا وسیلہ ہے۔ یہ رابطہ کوئی معمولی رابطہ نہیں بلکہ ایسا مضبوط ہے کہ جب وہ کسی پر اپنی نوازشات کی برکھا کرنا چاہتا ہے تو اپنے محبوب علیہ السلام کو فرماتا ہے کہ ''ذرا اُن کے حق میں دعا تو کر لیجئے کہ آپ کی دعا اُن کے لئے باعث سکون و اطمینان ہے'' (بحوالہ سورۃ التوبۃ: آیت ۱۰۳) اور جب اُس کی رحمتِ بے پایاں کا بحرِ مواج اپنے پورے جوبن میں ہوتا ہے تو وہ اپنے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنے ساتھیوں کی کوتاہیوں کو نظرانداز کرنے کی ترغیب دیتا ہے (بحوالہ سورہ آلِ عمران: ۱۵۹) جبکہ وہ اپنی مخلوق کا مالک ہوتے ہوئے نبی علیہ السلام کے وسیلہ کے بغیر خود بھی اُنہیں معاف کر سکتا ہے۔ یہ سب کچھ محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اُس اعلیٰ و ارفع مقام کو اجاگر کرنے کے لئے کیا گیا جو اُنہیں اپنے خالق کی نظروں میں حاصل ہے۔

(14) قرآن پاک کے 209 مقامات پر رب تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کو اپنے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف نسبت دی ہے۔ ملاحظہ ہو:

(۱) وَاِذْقَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (البقرة: ۳۰)
(۲) اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَاتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ○ (البقرة: ۱۴۷)
(۳) وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَمَا اللهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ○ (البقرة: ۱۴۹)
(۴) اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَاتَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ○ (آل عمران: ۶۰)
(۵) فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ (النساء: ۶۵)
(۶) وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا (المائدة: ۶۴)
(۷) يٰٓاَيُّهَاالرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (المائدة: ۶۷)
(۸) وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا (المائدة: ۶۸)
(۹) نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ○ (الانعام: ۸۳)
(۱۰) اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِىَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (الانعام: ۱۰۶)
(۱۱) وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ○ (الانعام: ۱۱۲)
(۱۲) وَالَّذِيْنَ آتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (الانعام: ۱۱۴)
(۱۳) وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا (الانعام: ۱۱۵)

(۱۴) إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِه وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ٥ (الانعام: ۱۱۷)

(۱۵) إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ٥ (الانعام: ۱۱۹)

(۱۶) وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا قَدْفَصَّلْنَاالْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ٥ (الانعام: ۱۲۶)

(۱۷) أَلنَّارُ مَثْوٰكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاإِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ٥ (الانعام: ۱۲۸)

(۱۸) ذٰلِكَ أَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّأَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ٥ (الانعام: ۱۳۱)

(۱۹) وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا وَمَا رَبُّكَ بِغٰفِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ٥ (الانعام: ۱۳۲)

(۲۰) وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُوالرَّحْمَةِ (الانعام: ۱۳۳)

(۲۱) فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ٥ (الانعام: ۱۴۵)

(۲۲) هَلْ يَنْظُرُوْنَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ (الانعام: ۱۵۸)

(۲۳) أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ (الانعام: ۱۵۸)

(۲۴) يَوْمَ يَأْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا (الانعام: ۱۵۸)

(۲۵) إِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ٥ (الانعام: ۱۶۵)

(۲۶) وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا (الاعراف: ۱۳۷)

(۲۷) إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ٥ (الاعراف: ۱۵۳)

(۲۸) وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ (الاعراف: ۱۶۷)

(۲۹) إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ٥ (الاعراف: ۱۶۷)

(۳۰) وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى أَنْفُسِهِمْ (الاعراف: ۱۷۲)

(۳۱) وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ (الاعراف: ۲۰۵)

(۳۲) إِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِه وَيُسَبِّحُوْنَهٗ (الاعراف: ۲۰۶)

(۳۳) كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ٥ (الانفال: ۵)

(۳۴) إِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ إِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ أَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (الانفال: ۱۲)

(۳۵) وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ٥ (يونس: ۱۹)

(۳۶) كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْا أَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ٥ (يونس: ۳۳)

(۳۷) وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ٥ (يونس: ۴۰)

(۳۸) وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ (يونس: ۶۱)

(۳۹) إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ٥ (يونس: ۹۳)

(۴۰) لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ٥ (يونس: ۹۴)

(۴۱) إِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ٥ (يونس: ۹۶)

(۴۲) وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا (يونس: ۹۹)

(۴۳) إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ٥ (هود: ۱۷)

(۴۴) إِنَّ رَبَّكَ هُوَالْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ٥ (هود: ۶۶)

(۴۵) وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ (هود: ۸۳)

(۴۶) فَمَا أَغْنَتْ عَنْهُمْ آلِهَتُهُمُ الَّتِي يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَا جَآءَ أَمْرُ رَبِّكَ (هُود: ۱۰۱)

(۴۷) وَكَذٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ (هُود: ۱۰۲)

(۴۸) خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ (هُود: ۱۰۷)

(۴۹) إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ٥ (هُود: ۱۰۷)

(۵۰) خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ٥ (هُود: ۱۰۸)

(۵۱) وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَإِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ٥ (هُود: ۱۱۰)

(۵۲) وَإِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ أَعْمَالَهُمْ إِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ٥ (هُود: ۱۱۱)

(۵۳) وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ أَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ٥ (هُود: ۱۱۷)

(۵۴) وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ٥ (هُود: ۱۱۸)

(۵۵) إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ (هُود: ۱۱۹)

(۵۶) وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ ٥ (هُود: ۱۱۹)

(۵۷) فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ٥ (هُود: ۱۲۳)

(۵۸) وَالَّذِيْ أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ (الرَّعد: ۱)

(۵۹) وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ (الرّعد: ۶)

(۶۰) وَإِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ٥ (الرّعد: ۶)

(۶۱) أَفَمَنْ يَّعْلَمُ أَنَّمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمٰى (الرَّعد: ۱۹)

(۶۲) وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ إِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ٥ (الحِجر: ۲۵)

(۶۳) وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّيْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُوْنٍ ٥ (الْحِجر: ۲۸)

(۶۴) إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيْمُ ٥ (الحِجر: ۸۶)

(۶۵) فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَ ٥ (الحِجر: ۹۲)

(۶۶) فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ٥ (الحِجر: ۹۸)

(۶۷) وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ٥ (الحِجر: ۹۹)

(۶۸) هَلْ يَنْظُرُوْنَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَوْيَأْتِيَ أَمْرُ رَبِّكَ (النّحل: ۳۳)

(۶۹) وَأَوْحٰى رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا (النّحل: ۶۸)

(۷۰) قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (النَّحل: ۱۰۲)

(۷۱) ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا (النَّحل: ۱۱۰)

(۷۲) ثُمَّ جٰهَدُوْا وَ صَبَرُوْا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ٥ (النَّحل: ۱۱۰)

(۷۳) ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ (النَّحل: ۱۱۹)

(۷۴) وَأَصْلَحُوْا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ٥ (النَّحل: ۱۱۹)

(۷۵) وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ٥ (النَّحل: ۱۲۴)

(۷۶) أُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (النَّحل: ۱۲۵)

(۷۷) إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ٥ (النَّحل: ۱۲۵)

(۷۸) وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًاo (بنی اسراء یل : ۱۷)
(۷۹) كُلًّا نُمِدُّ هٰؤُلَاۤءِ وَهٰؤُلَاۤءِ مِنْ عَطَاۤءِ رَبِّكَ (بنی اسراء یل : ۲۰)
(۸۰) وَمَا كَانَ عَطَاۤءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًاo (بنی اسراء یل : ۲۰)
(۸۱) وَقَضٰى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوْا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (بنی اسراء یل : ۲۳)
(۸۲) وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاۤءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًاo (بنی اسراء یل : ۲۸)
(۸۳) إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۤءُ وَيَقْدِرُ (بنی اسراء یل : ۳۰)
(۸۴) كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًاo (بنی اسراء یل : ۳۸)
(۸۵) ذٰلِكَ مِمَّا أَوْحٰى إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ((بنی اسراء یل : ۳۹)
(۸۶) وَإِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰى أَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًاo (بنی اسراء یل : ۴۶)
(۸۷) وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ((بنی اسراء یل : ۵۵)
(۸۸) إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًاo (بنی اسراء یل : ۵۷)
(۸۹) وَإِذْ قُلْنَا لَكَ إِنَّ رَبَّكَ أَحَاطَ بِالنَّاسِ (بنی اسراء یل : ۶۰)
(۹۰) وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًاo (بنی اسراء یل : ۶۵)
(۹۱) عَسٰى أَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًاo (بنی اسراء یل : ۷۹)
(۹۲) إِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ إِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًاo (بنی اسراء یل : ۸۷)
(۹۳) وَاذْكُرْ رَّبَّكَ إِذَا نَسِيْتَ (الکهف : ۲۴)
(۹۴) وَاتْلُ مَاۤ أُوْحِيَ مِنْ كِتٰبِ رَبِّكَ (الکهف : ۲۷)
(۹۵) وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ أَمَلًاo (الکهف : ۴۶)
(۹۶) وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا (الکهف : ۴۸)
(۹۷) وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَ لَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًاo (الکهف : ۴۹)
(۹۸) وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ (الکهف : ۵۸)
(۹۹) ذِكْرُ رَحْمَةِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّاo (مریم : ۲)
(۱۰۰) وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ (مریم : ۶۴)
(۱۰۱) وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّاo (مریم : ۶۴)
(۱۰۲) فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ (مریم : ۶۸)
(۱۰۳) وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّاo (مریم : ۷۱)
(۱۰۴) وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّاo (مریم : ۷۶)
(۱۰۵) وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّأَجَلٌ مُّسَمًّىo (طٰهٰ : ۱۲۹)
(۱۰۶) وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا (طٰهٰ : ۱۳۰)
(۱۰۷) وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ أَبْقٰىo (طٰهٰ : ۱۳۱)
(۱۰۸) وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَo (الانبیاء : ۴۶)
(۱۰۹) وَ إِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَo (الحج : ۴۷)
(۱۱۰) وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ (الحج : ۵۴)

(۱۱۱) وَادْعُ إِلٰى رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍo (الحج : ۶۷)
(۱۱۲) أَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ" وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَo (المؤمنون : ۷۲)
(۱۱۳) لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلاًo (الفرقان : ۱۶)
(۱۱۴) وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً أَتَصْبِرُوْنَ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًاo (الفرقان : ۲۰)
(۱۱۵) وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّ نَصِيْرًاo (الفرقان : ۳۱)
(۱۱۶) أَلَمْ تَرَ إِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا (الفرقان : ۴۵)
(۱۱۷) فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًاo (الفرقان : ۵۴)
(۱۱۸) وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُo (الشعراء : ۹)
(۱۱۹) وَ إِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰى أَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَo (الشعراء : ۱۰)
(۱۲۰) وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُo وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرٰهِيْمَ o (الشعراء : ۶۹، ۷۰)
(۱۲۱) وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُo كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ۨالْمُرْسَلِيْنَo (الشعراء : ۱۰۴، ۱۰۵)
(۱۲۲) وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُo كَذَّبَتْ عَادُ ۨالْمُرْسَلِيْنَo (الشعراء : ۱۲۲، ۱۲۳)
(۱۲۳) وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُo كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَo (الشعراء : ۱۴۰، ۱۴۱)
(۱۲۴) وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُo كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ۨالْمُرْسَلِيْنَo (الشعراء : ۱۵۹، ۱۶۰)
(۱۲۵) وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُo كَذَّبَ أَصْحٰبُ الْأَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَo (الشعراء : ۱۷۵، ۱۷۶)
(۱۲۶) وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُo وَإِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَo (الشعراء : ۱۹۱، ۱۹۲)
(۱۲۷) وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَo (النمل : ۷۳)
(۱۲۸) وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَo (النمل : ۷۴)
(۱۲۹) إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ (النمل : ۷۸)
(۱۳۰) سَيُرِيْكُمْ آيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَo (النمل : ۹۳)
(۱۳۱) وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ إِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ (القصص : ۴۶)
(۱۳۲) وَ مَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْ أُمِّهَا رَسُوْلاً (القصص : ۵۹)
(۱۳۳) وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخْتَارُ (القصص : ۶۸)
(۱۳۴) وَ رَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَo (القصص : ۶۹)
(۱۳۵) وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْا أَنْ يُّلْقٰى إِلَيْكَ الْكِتٰبُ إِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ (القصص : ۸۶)
(۱۳۶) وَادْعُ إِلٰى رَبِّكَ وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَo (القصص : ۸۷)
(۱۳۷) وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ" مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ (العنكبوت : ۱۰)
(۱۳۸) بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا أَتٰهُمْ نَذِيْرٌ" مِّنْ قَبْلِكَ (الٓمّ السجدة : ۳)
(۱۳۹) إِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَo (الٓمّ السجدة : ۲۵)
(۱۴۰) وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰى إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (الاحزاب : ۲)
(۱۴۱) وَيَرَى الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْ أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ (سبا : ۶)
(۱۴۲) وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ"o (سبا : ۲۱)
(۱۴۳) فَاسْتَفْتِهِمْ أَلِرَبِّكَ الْبَنٰتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَo (الصّافّات : ۱۴۹)
(۱۴۴) سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَo (الصّافّات : ۱۸۰)
(۱۴۵) أَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِo (صٓ : ۹)
(۱۴۶) إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّيْ خَالِقٌ" بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍo (صٓ : ۷۱)

(۱۴۷) وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا أَنَّهُمْ أَصْحٰبُ النَّارِ ۝ (غافر : ۶)

(۱۴۸) وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ (غافر : ۵۵)

(۱۴۹) فَإِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ (فُصِّلَت : ۳۸)

(۱۵۰) إِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّ ذُوْ عِقَابٍ أَلِيْمٍ ۝ (فُصِّلَت : ۴۳)

(۱۵۱) وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ (فُصِّلَت : ۴۵)

(۱۵۲) وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝ (فُصِّلَت : ۴۶)

(۱۵۳) أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ (فُصِّلَت : ۵۳)

(۱۵۴) وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ إِلٰى أَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ (اَلشُّورٰى : ۱۴)

(۱۵۵) أَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَةَ رَبِّكَ (اَلزُّخْرُف : ۳۲)

(۱۵۶) وَرَحْمَةُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝ (اَلزُّخْرُف : ۳۲)

(۱۵۷) وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (اَلزُّخْرُف : ۳۵)

(۱۵۸) إِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ (اَلدُّخَان : ۵، ۶)

(۱۵۹) وَوَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ (اَلدُّخَان : ۵۷)

(۱۶۰) إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ (اَلجَاثِية : ۱۷)

(۱۶۱) وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۝ (ق : ۳۹)

(۱۶۲) مُسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ۝ (اَلذّٰرِيٰت : ۳۴)

(۱۶۳) إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ (اَلطُّور : ۷)

(۱۶۴) فَذَكِّرْ فَمَا أَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ۝ (اَلطُّور : ۲۹)

(۱۶۵) أَمْ عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَبِّكَ أَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ۝ (اَلطُّور : ۳۷)

(۱۶۶) وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (اَلطُّور : ۴۸)

(۱۶۷) وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝ (اَلطُّور : ۴۸)

(۱۶۸) إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ (اَلنَّجْم : ۳۰)

(۱۶۹) إِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ (اَلنَّجْم : ۳۲)

(۱۷۰) وَأَنَّ إِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ۝ (اَلنَّجْم : ۴۲)

(۱۷۱) فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ۝ (اَلنَّجْم : ۵۵)

(۱۷۲) وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝ (اَلرَّحْمٰن : ۲۷)

(۱۷۳) تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝ (اَلرَّحْمٰن : ۷۸)

(۱۷۴) نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ۝ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۝ (اَلواقعة : ۷۳، ۷۴)

(۱۷۵) إِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ۝ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۝ (اَلواقعة : ۹۵، ۹۶)

(۱۷۶) مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝ (اَلقلم : ۲)

(۱۷۷) إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ (اَلقلم : ۷)

(۱۷۸) فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَ هُمْ نَآئِمُوْنَo (اَلْقلم : ۱۹)

(۱۷۹) فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ (اَلْقلم : ۴۸)

(۱۸۰) وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌo (اَلْحَآقّة : ۱۷)

(۱۸۱) فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِo (اَلْحَآقّة : ۵۲)

(۱۸۲) وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًاo (اَلْمُزَّمِّل : ۸)

(۱۸۳) اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَ نِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ (اَلْمُزَّمِّل : ۲۰)

(۱۸۴) وَرَبَّكَ فَكَبِّرْo (اَلْمُدَّثِّر : ۳) (۱۸۵) وَ لِرَبِّكَ فَاصْبِرْo (اَلْمُدَّثِّر : ۷)

(۱۸۶) وَ مَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (اَلْمُدَّثِّر : ۳۱)

(۱۸۷) اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِالْمُسْتَقَرُّ o (اَلْقِيٰمة : ۱۲)

(۱۸۸) اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِالْمَسَاقُo (اَلْقِيٰمة : ۳۰)

(۱۸۹) فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَ لَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا اَوْ كَفُوْرًاo (اَلانسان : ۲۴)

(۱۹۰) وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًاo (اَلانسان : ۲۵)

(۱۹۱) جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًاo (اَلنَّبا : ۳۶)

(۱۹۲) اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَاo (اَلنّٰزعات : ۴۴) (۱۹۳) اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌo (اَلْبُرُوج : ۱۲)

(۱۹۴) سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰىo (اَلأعلٰى : ۱)

(۱۹۵) اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍo (اَلْفجر : ۶)

(۱۹۶) فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍo (اَلْفجر : ۱۳)

(۱۹۷) اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِo (اَلْفجر : ۱۴)

(۱۹۸) وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّاo (اَلْفجر : ۲۲)

(۱۹۹) مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰىo (اَلضُّحٰى : ۳)

(۲۰۰) وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى o (اَلضُّحٰى : ۵)

(۲۰۱) وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْo (اَلضُّحٰى : ۱۱)

(۲۰۲) وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْo (الانشراح : ۸)

(۲۰۳) اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَo (اَلْعَلَق : ۱)

(۲۰۴) اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُo (اَلْعَلَق : ۳)

(۲۰۵) اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى o (اَلْعَلَق : ۸)

(۲۰۶) يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَاo بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَاo (اَلزَّلْزَلة : ۴، ۵)

(۲۰۷) اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِo (اَلْفِيْل : ۱)

(۲۰۸) فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْo (اَلكوثر : ۲)

(۲۰۹) فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًاo (اَلنَّصر : ۳)

(15) لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ O (سورة التوبة : ۱۲۸)

"بے شک تمہارے پاس تم میں سے (ایک باعظمت) رسول (ﷺ) تشریف لائے' تمہارا تکلیف و مشقت میں پڑنا اُن پر سخت گراں (گزرتا) ہے۔ (اے لوگو!) وہ تمہارے لئے (بھلائی اور ہدایت کے) بڑے طالب و آرزومند رہتے ہیں (اور) مؤمنوں کے لئے نہایت ہی شفیق' بے حد رحم فرمانے والے ہیں۔" (۹ : ۱۲۸)

بالعموم انسانیت کی لگن اور دیکھ بھال اور بالخصوص مؤمنوں کے لئے محبت و شفقت' ملخصاً یہ تھا پیغمبر کا کردار! فرمایا جا رہا ہے کہ اے اولادِ آدم! ہر وہ چیز جس سے تمہیں تکلیف پہنچتی ہو وہ حضور علیہ السلام کے قلبِ رحیم پر بھی گراں گزرتی ہے اور ہر وہ چیز جس سے تمہارا بھلا ہو' اُس کے حضور بہت خواہشمند ہیں۔ امّت کے ساتھ اُس کے آقا کا جو رشتہ محبت و الفت ہے' اُس کا بیان ان پاکیزہ الفاظ سے زیادہ بلیغ پیرایہ میں ادا کرنا ممکن نہیں۔

عَزِيْزٌ عَلَيْهِ اَنْ تَدْخُلُوا النَّارَ وَحَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ

"تمہارا جہنمی ہونا اُن پر گراں گزرتا ہے اور تمہارے جنت میں جانے کے بہت آرزومند ہیں۔"

یہاں یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے دو صفاتی ناموں (رؤوف' رحیم) کو محمد ﷺ کے سوا کسی نبی میں جمع نہیں فرمایا۔ اس سے اگلی آیت ۱۲۹ میں فرمایا گیا کہ اے حبیب! جو لوگ آپ کو رؤوف اور رحیم تسلیم نہیں کرتے' اُنہیں فرما دیجئے کہ اللہ ہی مجھے کافی ہے۔

(16) قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ O (الانعام : ۳۳)

"(اے حبیب!) بے شک ہم جانتے ہیں کہ وہ (بات) یقیناً آپ کو رنجیدہ کر رہی ہے جو یہ لوگ کہتے ہیں' پس یہ آپ کو نہیں جھٹلا رہے لیکن (دراصل) ظالم لوگ اللہ کی آیتوں ہی سے انکار کر رہے ہیں۔"

یہاں ربِّ ذوالجلال والاکرام کفار کے مقابلہ میں کیسے اپنے آپ کو ڈھال بنا کر اپنے پیغمبر کی تسلی و تشفی کر رہا ہے۔ کفار کے قائد ابوجہل نے صاف طور پر پیغمبر علیہ السلام سے کہا تھا کہ ہم آپ کو جھوٹا نہیں کہتے بلکہ اُس پیغام کی تکذیب کرتے ہیں جس کے متعلق آپ کہتے ہیں کہ میں اُسے اللہ کی طرف سے لایا ہوں۔

(17) (i) قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف : ۱۵۸)

(ii) تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا O (الفرقان : ۱)

(iii) وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (سبا:۲۸)

(۱) ''اے حبیب! فرما دیجئے کہ اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا فرستادہ ہوں۔'' (۷:۱۵۸)
(۲) ''بڑی برکت والا ہے وہ اللہ جس نے (حق و باطل میں فرق اور) فیصلہ کرنے والا (قرآن) اپنے (محبوب و مقرب) بندے پر نازل فرمایا تاکہ وہ تمام جہانوں کے لئے ڈر سنانے والا ہو جائے۔'' (۲۵ : ۱)
(۳) ''اور (اے حبیبِ مکرّم!) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر اس طرح کہ (آپ) پوری انسانیت کے لئے خوشخبری سنانے والے اور ڈر سنانے والے ہیں لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔'' (۳۴:۲۸)

محولہ بالا تینوں آیتوں کے مدِّنظر نبی علیہ السلام کی رسالت کی ہمہ گیر آفاقیت ملاحظہ ہو۔ قرآن یہاں صرف اہلِ عرب سے مخاطب نہیں ہے بلکہ تمام دنیا کے لوگوں سے مخاطب ہے کیونکہ آپ کا پیغام تمام دنیا تک وسیع ہے اور کسی خاص نسل تک کے لئے محدود نہیں۔ اس بات کی توثیق غیر مسلمین نے بھی کی ہے مثلاً ڈریپر لکھتا ہے:

''قرآن نے لوگوں کی قسمتوں کو بہت کنٹرول کیا ہے اور اب تک ہماری نسل کا ایک خاصی تعداد کے لئے وہ اصولِ زندگی کا کام دے رہا ہے۔'' ("Intellectual Development of Europe", Vol. 1, p. 340)

بہت سے یہودی اور عیسائی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ کا رسول نہیں مانتے اور اگر وہ آپ کو پیغمبر مانتے بھی ہیں تو آپ کی رسالت کو صرف ملکِ عرب تک محدود مانتے ہیں نہ کہ تمام دنیا کے لئے۔ وہ اپنے مفروضے کی بنیاد قرآن کی اس آیت کو قرار دیتے ہیں:

وَلِتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (الانعام : ۹۲)
''تاکہ آپ مکہ کے لوگوں کو اور اُس کے گرد والوں کو ڈرائیں۔'' (۶ : ۹۲)

اُمّ الـقُـرٰی (جس کے لفظی معنی بستیوں کے مرکز کے ہیں) کا یہ نام کیوں پڑا؟ بعض نے کہا کہ قدیم جغرافیہ کے لحاظ سے یہ زمین کے عین وسط میں واقع تھا۔ کسی نے کہا کہ اُس وقت حجاز خصوصاً اُس کا یہ شہر دنیا کی تہذیبوں کا سنگم تھا یعنی اُس کے ایک بازو میں مصری، رومی، یونانی تہذیب تھی اور دوسرے بازو میں کلدانی، ایرانی اور ہندی تمدّن۔ کسی نے کہا اس لئے کہ آج بھی دنیا کے تین بڑے بڑے اعظموں ایشیا، افریقہ، یورپ کا سرِ راہ عین ساحلِ حجاز ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سب اسباب صحیح ہوں۔ وَمَنْ حَوْلَهَا جب مکہ معظمہ نافِ زمین یا مرکزِ بلاد قرار پایا تو اُس کے ہر طرف آبادی جہاں تک بھی پھیلی ہوگی، سب مَنْ حَوْلَهَا ہی کے تحت میں آئے گی یعنی جمیع الآفاق اس میں شامل ہیں (مدارک و بیضاوی)۔ اور نبی علیہ السلام کی رسالت کل کائنات و جمیع آفاق کے لئے ثابت ہوئی۔

اُن کا یہ اِصرار اس لحاظ سے بھی غیر معقول، بے وزن اور پُھس پُھسا (Untenable) ہے کہ جب یہ لوگ

آپ علیہ السلام کو پیغمبر مانتے ہیں خواہ اہل عرب کے لئے سہی' تو ظاہر ہے کہ یہ لوگ آپ کے آفاقی رسالت کے دعوئی کو بھی اور آپ کے آخری پیغمبر ہونے میں بھی اپنے آپ کی تردید کر رہے ہیں کیونکہ ایک سچا پیغمبر کسی چیز کے بارے میں اور بالخصوص اپنے الٰہی مشن کے بارے میں جھوٹ نہیں بول سکتا کہ جھوٹ بولنا پیغمبر کی شان اور منصب کے خلاف ہے۔ ان حقائق سے ثابت ہوا کہ آخرالانبیاء ﷺ کو تمام مخلوقات کے لئے بھیجا گیا۔''

تاریخ شاہد ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایوان ہائے خسرو' قیصر اور دیگر غیر عرب ممالک کے حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے اپنے قاصد مقرر کئے۔ اگر آپ کی رسالت کا مشن صرف ملکِ عرب تک محدود ہوتا تو آپ کبھی بھی اِن غیر ممالک کے سربراہوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے نامہ ہائے مبارک نہ بھیجتے۔ اُن کے انکار کا نتیجہ ''جنگِ مقدس'' یعنی اُن سے جہاد پر ہوا' آپ نے میدانِ کارزار میں اُن پر فتح پائی اور اُنہیں بطور غلام اپنا اسیر بنا لیا اور ماتحتی میں آجانے کے بعد اُن پر ''جزیہ'' نامی ٹیکس لگا دیا۔ کیا یہ بات عجیب نہیں کہ ایک آدمی آپ کو رسول بھی مانے اور پھر آپ کے دعوائے رسالتِ آفاقی کا انکار بھی کرے۔ تصدیق اور انکار کا یکجا کرنا گویا دو متضاد چیزوں کا اکٹھا کرنا ہوتا ہے۔''

''بہت سے عیسائی فرقے بھی محمد ﷺ کے دعوائے رسالت کو بالکل نہیں مانتے۔ مسلمانوں نے اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے یہ مناسب سوال کیا کہ تم لوگ ابراہیم' اسحاق' یعقوب' یوسف' داؤد' موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو اللہ کے رسول اور اُس کے معتبر پیغام مانتے ہو تو اُن کے رسول یا پیغمبر ہونے کی تائید میں تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟ کسی بھی پیغمبر کی رسالت کے لئے تم کوئی بھی معیار مقرر کرو تو اُسی معیار اور اصول کا اطلاق برابر طور پر محمد ﷺ کی رسالت پر بھی ہوگا۔ اگر وہ لوگ مذکورہ بالا کسی بھی پیغمبر کی نبوت کے لئے کوئی دلیل لائیں تو ہم اپنے پیغمبر علیہ السلام کی رسالت پر کم از کم دس ایسے دلائل لا سکتے ہیں۔ مثلاً :

(i) ''اگر تورات کے نزول کو موسیٰ علیہ السلام' زبور کو داؤد علیہ السلام اور انجیل کو عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کے ثبوت کے لئے بطور ثبوت پیش کیا جائے تو ہم یہ کہیں گے کہ قرآن کے نزول کو جو ہر لحاظ سے اپنی عمدگی میں تورات اور انجیل پر فائق ہے اور جو ہر طرح مکمل' فصیح اور ہر چیز کو محیط اپنی اصلی شکل میں موجود ہے اور جس میں کوئی بھی خارجی چیز شامل نہیں ہوئی' محمد ﷺ کی رسالت و نبوت کے ثبوت کے لئے ایک مُسکت دلیل کیوں نہ مانا جائے؟''

(ii) ''اگر انبیائے سابقہ کے معجزات اُن کے منصب نبوّت کا ثبوت تھے تو ہمارے نبیِ اکرم ﷺ کے معجزات بہ حیثیتِ مجموعی بہ لحاظ مقدار اور خصوصیت دیگر انبیاء علیہم السلام کے معجزات سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ یہود اور نصاریٰ کے پاس کسی بھی ایسے معجزے کا ثبوت نہیں جس کا وہ ذکر کرتے ہیں۔ اس کے برعکس کوئی بھی شخص ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرمودات کتبِ حدیث اور وقائع نگاروں کی روئدادوں میں مستند راویوں سے تصدیق شدہ حالت میں پاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہود و نصاریٰ کو اپنے متعلقہ رسول کا کوئی ایک ایسا فرمان مہیا کرنے کی دعوت دی جاتی ہے جسے مستند راویوں نے روایت کیا ہو۔''

(iii) ''کتبِ حدیث کی طرف ذرا دیکھئے' نبی علیہ السلام کی کتابِ زندگی کے ہر صفحے کا ہر لمحہ اور ثانیہ بڑے واضح اور نمایاں طور پر محفوظ کرلیا گیا ہے جسے سینکڑوں سلسلہ ہائے شہادت کی تائید حاصل ہے۔ احادیثِ نبویہ کے ایسے مستند ثبوت دوسرے مذاہب بہ شمول یہودیت اور عیسائیت میں نہیں پائے جاتے۔ یہ روایتی بیان اور استناد صرف قرآنِ حکیم' ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے پیروکاروں کے ساتھ خاص ہے۔''

(iv) ''اگر کوئی شخص موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے قانونِ شریعت کا مقابلہ وموازنہ ہمارے نبی علیہ السلام کی شریعت سے کرنا چاہے تو وہ مؤخر الذکر کو اول الذکر سے کہیں زیادہ جامع اور فائق تر پائے گا کیونکہ آپ کی شریعت انفرادی اخلاقیات' دعا و مناجات' حیات بعد الممات' سماجی اخلاقیات' سیاسیات' اقتصادیات' تہذیب وثقافت غرضیکہ ہر چیز کو شامل ہے۔''

(v) ''ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کسی استاد سے نہیں پڑھا یا سیکھا' نہ ہی کتب آپ کے زیرِ مطالعہ رہیں' نہ ہی آپ نے حصولِ علم کے لئے کسی غیر ملک کا سفر کیا' پھر بھی آپ نے دنیا کو جامع اور مکمل قانون عطا کیا جس کی باریکیوں کو سمجھنے کے لئے بڑے بڑے علماء وفضلاء نے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ اور یہ حقیقت اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ یہ معجزانہ علم سب من جانب اللہ تھا۔''

(vi) ''اور اگر کوئی شخص ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ کرام کا موازنہ دوسرے پیغمبروں کے اصحاب سے کرنا چاہے تو یہ کام بھی بڑی کامیابی کے ساتھ ہمارے نبی کے صحابہ کے حق میں ہوسکتا ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے جہاد کی تیاری کے لئے کہا تو انہوں نے بہ بانگ دہل اس کا انکار کرتے ہوئے کہا:

فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ O (المائدۃ : ۲۴)

''سو آپ خود اور آپ کا خداوند چلے جائیں اور آپ دونوں لڑ بھڑ لیں' ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔'' (۵ : ۲۴)

''اور عیسائی روایات کے مطابق یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کیا تو آپ کے تمام حواری بھاگ گئے اور کوئی بھی آپ کے ساتھ نہ رہا اور عیسائی عقیدے کے مطابق یہودا نے اپنے آقا سے تیس حقیر سکّوں کے عوض بے وفائی کی اور اپنے آقا کو گرفتار کرا لیا۔''

''اس کے برعکس ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ کرام کی غیر متزلزل وفاداری اور بہادری چار دانگ عالم میں مشہور ہے۔ اِن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے پیغمبر کی خاطر ایسی مالی اور جسمانی قربانیاں دیں جس کی مثال انبیائے سابقہ کی کسی بھی قوم میں نہیں ملتی۔ پھر آپ کے خلفائے راشدین کی طرف نظر پھیریئے جنہوں نے مختصر سے عرصہ میں دنیا میں اسلامی قانون کا نفاذ واستحکام کر دیا۔''

(18) ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت و رسالت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ تمام انبیائے سابقہ آپ ﷺ کی آمد کا مژدہ اپنی اپنی قوم کو سناتے آئے ہیں' ایسی اعلیٰ و ارفع عظمت و توقیر والا پیغمبر جو از روئے قرآن ذیل کی خوبیوں کا حامل ہوگا:

(i) اَلرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰۃِ وَالْاِنْجِیْلِ (الاعراف:۱۵۷)

''وہ نبی اُمی جسے وہ اپنے ہاں لکھا ہوا پاتے ہیں تورات اور انجیل میں۔'' (۷ : ۱۵۷)

(ii) اَوَلَمْ یَکُنْ لَّھُمْ اٰیَۃً اَنْ یَّعْلَمَہٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ O (الشُّعراء : ۱۹۷)

''کیا ان لوگوں کے لئے یہ (کافی) دلیل نہیں کہ اُسے علمائے بنی اسرائیل جانتے ہیں؟'' (۲۶:۱۹۷)

قرآن حکیم میں بہت سی آیات ایسی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ سابقہ انبیاء علیہم السلام نے نبی علیہ السلام کی آمد کی پیش گوئی کر دی تھی۔ اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ بھی اس بات کو جانتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ آپ کی حیات ہی میں آپ کے دشمن ہو گئے جبکہ آپ کی آمد سے پہلے وہ ایسی باتوں کا ذکر کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اہلِ مکہ میں سے آخر الانبیاء ﷺ کی آمد کا وقت آ پہنچا ہے۔''

''علمائے یہود و نصاریٰ نبی اکرم ﷺ کی آمد کے منتظر تھے۔ اُن میں پڑھے لکھے اور معقول لوگ جو مخلص سلیم الفطرت اور حسن نیت کے مالک تھے' فوراً آپ کی رسالت پر ایمان لے آئے جیسے یہود کے بہت بڑے عالم عبداللہ بن سلام اور ان جیسے دیگر لوگ۔ جبکہ دوسرے لوگوں نے یہ اچھی طرح جانتے ہوئے کہ آپ ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں' از راہِ حسد و عناد آپ کو جھٹلانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی آیات ۸۹' ۹۰' ۱۴۶ میں بیان ہوا۔

''تورات اور انجیل ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد سے متعلق واضح پیش گوئیوں سے پُر تھیں لیکن یہود و نصاریٰ نے تقریباً اُن سب میں تحریف کر کے اُن کی اصلیت کو مسخ کر دیا اور جن میں وہ تغیر و تبدل نہ کر سکے' اُس کی تعبیر و تاویل اُنہوں نے غلط رنگ میں کی۔ جس طرح بے قدرے یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق پیش گوئیوں کو بگاڑا اور اُن کی غلط تاویل کی' اسی طرح دنیائے عیسائیت نے ہمارے محمد ﷺ کی آمد سے متعلق پیش گوئیوں کے ساتھ کیا۔''

''اس طرح دنیائے عیسائیت کا یہ انکار کہ انجیل میں نبی آخر الزماں ﷺ کی آمد یا پیش گوئی کا کوئی ذکر نہیں' معقولیت اور اعتدال سے متجاوز اور اصل حقائق سے اُسی طرح بے جوڑ ہے جس طرح یہود کا رویّہ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہے۔ جہاں دنیائے عیسائیت کے علماء و فضلاء کی طرف سے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ انبیائے سابقہ نے عیسیٰ علیہ السلام کی آمد سے متعلق بہت سی پیش گوئیاں کی ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ تورات و انجیل (Gospel)☆ دونوں میں ہمارے

☆(Gospel) کا معنی خوشخبری کا ہے اور یہ نام اس لئے ہے کہ اس میں آخر الانبیاء ﷺ کی آمد کی خوشخبری ہے۔ ایسی خوشخبریاں عیسیٰ علیہ السلام کی تمثیلی زبان میں متعدد ہیں۔

محمد ﷺ کی آمد کی نہایت واضح الفاظ میں پیش گوئیاں ہیں۔'' (''بشائر النبیہ'' از مولانا محمد ادریس کاندھلوی انگریزی ترجمہ' صفحات iv تا ix)

سورۃ الصّف کی آیت ۵ میں بھی عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی آخرالانبیاء احمد ﷺ نامی رسول کی آمد کی پیش گوئی کی گئی ہے۔

ورقہ بن نوفل ☆ وہ شخص تھے جو قبل از اسلام کے عرب دور میں بت پرستی سے دستبردار ہو گئے تھے۔ وہ ابراہیم علیہ السلام کے دینِ حنیف کی تلاش میں تھے اور اُنہیں کتب وصحائفِ آسمانی کا مطالعہ حاصل تھا۔ بعد میں اُنہوں نے عیسائیت قبول کر لی اور اُنہوں نے اپنے ذاتی استعمال کے لئے بائبل کے کچھ اجزاء کو نقل کر کے اُن کا ترجمہ کیا۔ حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے آغاز میں ورقہ عمر رسیدہ اور نابینا ہو گئے تھے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر پہلی نزولِ وحی کے وقت سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل سے اس کا ذکر کیا جنہوں نے محمد ﷺ کی ذاتِ اقدس میں رسولِ موعود کو پہچان لیا۔'' (سیرت ابن ہشام طبع مصر ۱۳۵۵/۱۹۳۷؛ صحیح بخاری: باب التعبیر؛ الاصابہ لابن حجر عسقلانی' جلد ششم (طبع قاہرہ ۱۳۲۵)؛ طبقات ابن سعد' جلد اوّل (طبع لیڈن ۱۹۰۵)؛ کتاب الاغانی لابی الفرج اصفہانی' جلد سوم ؛ اسد الغابہ لابن الاثیر' جلد پنجم بحوالہ ''محمد دی اُمی نبی'' از ڈاکٹر یوسف عباس ہاشمی' صفحہ ۱۶۲)

''جب مغرب کے مسلمانوں نے احادیث اور سیرت لٹریچر میں ان حقائق کا مطالعہ کیا تو اُنہیں ایک انتہائی اُلجھے ہوئے مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر تو وہ احادیث اور سیرت کے بیانات کو خود اختراعی نہ سمجھتے تو یہ بات محمد ﷺ کے مشن کی صداقت کی دلیل تھی اور اگر وہ اُنہیں خود اختراعی سمجھتے تو یہ بات بیچارے ورقہ کو ''مذہبی مفکر''۔ ''حق کا متلاشی'' اور ''محمد ﷺ کا محسن'' ہونے کے کے اعزاز سے محروم کر دیتی اور وہ ایسے خطرے کو مول لینے کے لئے تیار نہ تھے۔''

''اُن کی پریشانی قابلِ فہم ہے۔ ورقہ جیسے حنیف اور حقیقت پسند شخص کی طرف سے محمد ﷺ کو رسول اللہ تسلیم کرنا اُن کے لئے موجبِ پریشانی تھا کیونکہ ایسی صورت میں ورقہ کی گواہی کی روشنی میں مسلمانوں کو رسالت کے ثبوت کی تائید حاصل ہو گئی۔ اس کے برعکس اگر انہوں نے ورقہ کے واقعہ کو خالصتاً افسانہ اور من گھڑت قصہ قرار دیا (جیسا کہ سپرینگر نے اپنی کتاب کی پہلی جلد میں ۱۸ صفحات پر مشتمل بیان میں کیا ہے) تو یہ اُن کی طرف سے اپنے ہم مذہب بھائی کو رسوا کرنا تھا۔ ورقہ بن نوفل کی وفات اسلام پر ہوئی۔'' ("Muhammad the Ummi Nabi" ... Prof. Dr. Yusuf Abbas Hashmi, pp. 155-156)

☆ سر ولیم میور ورقہ بن نوفل کے بارے میں رقمطراز ہے: ''معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کا محمد (ﷺ) کی ذہنی تسلی وتشفی کرانے میں بڑا حصہ تھا کہ اُن کا مشن منجانب اللہ ہے۔'' (لائف آف محمد' صفحہ ۳۶) اور ''جس نے (یعنی ورقہ بن نوفل نے) اُن کی تعلیمات کو اپنے خیالات کے مثیل اور جزولازم (Counterpart) پایا۔''

''ہمارے نبی ﷺ کی پیش گوئی کئی طریق سے کی گئی۔ اپنی آمد پر آپ نے اپنی رسالت کے متعدد واضح نشانات دکھائے کیونکہ آپ کی حیاتِ طیبہ اوّل سے آخر تک تمام کی تمام ایک کھلا معجزہ ہے۔ آپ باطل کے خلاف برسرِ پیکار ہوئے اور مشکلات پر فتح پائی۔ باوجود اس کے کہ آپ اُمّی تھے اور کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا' آپ نے انتہائی اعلیٰ وارفع حکمت کی تعلیم دی۔ آپ نے پتھر دلوں کو موم کر دیا اور نرم دلوں کو جنہیں نصرت وامداد کی ضرورت تھی' قوّت بخشی۔ آپ کے تمام اقوال وافعال میں اصحابِ بصیرت دستِ الٰہی کی کارفرمائی کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے باوجود جاہل ونادان کافروں نے اسے جادوگری کہا اور اُس حقیقت کو غیر حقیقت کا نام دیا جو تاریخِ انسانی کا ایک ٹھوس حقیقت بن گئی۔'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ: ۳۷۳۹)

(19) يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا۝ وَ دَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا۝ (الاحزاب: ۴۵، ۴۶)

''اے نبیِ مکرّم! بے شک ہم نے آپ کو (حق اور خَلق کا) مشاہدہ کرنے والا اور (حُسنِ آخرت کی) خوشخبری دینے والا اور (عذابِ آخرت کا) ڈر سنانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اور اُس کے اِذن سے اللہ کی طرف دعوت دینے والا اور روشن کر دینے والا آفتاب (بنا کر) بھیجا ہے۔'' (۳۳ : ۴۵، ۴۶)

<u>شاھد</u> کا معنٰی گواہ ہے اور گواہ کے لئے ضروری ہے کہ جس واقعہ کی وہ گواہی دے رہا ہے' وہ وہاں موجود بھی ہو اور اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ چنانچہ علاّمہ راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں لکھا ہے:

''شہادت وہ ہوتی ہے کہ انسان وہاں موجود بھی ہو اور وہ اُسے دیکھے بھی خواہ آنکھوں کی بینائی سے یا بصیرت کے نور سے۔''

علاّمہ ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: شَاهِدًا عَلٰى أُمَّتِكَ یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی اُمت پر گواہی دیں گے۔ اپنی اس تفسیر کی تائید میں انہوں نے یہ حدیث پیش کی ہے:

أَخْرَجَ ابْنُ الْمُبَارَكِ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ قَالَ: لَيْسَ مِنْ يَوْمٍ إِلَّا وَيُعْرَضُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ أُمَّتُهٗ غُدْوَةً وَّعَشِيَّةً فَيَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ وَلِذٰلِكَ يَشْهَدُ عَلَيْهِمْ (تفسیر مظہری)

''حضرت عبداللہ بن مبارک نے حضرت سعید بن مسیّب سے روایت کی ہے کہ ہر روز صبح وشام حضور کی اُمّت حضور علیہ السلام پر پیش کی جاتی ہے اور حضور ﷺ ہر فرد کو اُس کے چہرے سے پہچانتے ہیں' اسی لئے حضور علیہ السلام (بروزِ قیامت) اُن پر گواہی دیں گے۔''

علاّمہ ابن کثیر اسی آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

''حضور علیہ السلام اللہ کی توحید کے گواہ ہیں کہ اُس کے بغیر کوئی معبود نہیں اور قیامت کے دن لوگوں کے اعمال پر آپ گواہی دیں گے۔''

علامہ آلوسی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :
''حضور علیہ السلام اپنی اُمّت پر گواہی دیں گے کیونکہ آپ اُن کے احوال و اعمال کا مشاہدہ فرما رہے ہیں اور روزِ قیامت اُن کے حق میں یا اُن کے خلاف آپ گواہی دیں گے۔''

آگے چل کر علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ صوفیائے کرام نے اس اُمر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بندوں کے اعمال پر آگاہ فرمادیا ہے اور حضور نے اُنہیں دیکھا ہے' اس لئے آپ ﷺ کو شاہد کہا گیا۔

اس قول کی تائید میں علامہ آلوسی نے مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر نقل کیا ہے :

در نظر بودش مقامات العباد　　　زاں سبب نامش خدا شاہد نہاد

یعنی بندوں کے مقامات حضور علیہ السلام کی نگاہ میں تھے' اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کا اسمِ پاک شاہد رکھا۔

مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس مقام پر جو حاشیہ لکھا ہے' اُس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں :

''آپ محشر میں بھی اُمّت کی نسبت گواہی دیں گے کہ اللہ کے پیغام کو کس نے کس قدر قبول کیا۔''

مُبشّر (خوشخبری دینے والا) : یہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دوسرا لقب ہے۔ جو اس دین پر ایمان لائے گا' اس کے ارشادات پر عمل کرے گا وہ دونوں جہانوں میں کامیاب و کامران ہوگا۔

علامہ اسماعیل حقّی فرماتے ہیں : ''اہلِ ایمان اور اہلِ طاعت کو جنّت کی خوشخبری دیتے ہیں اور اہلِ محبت کو دیدارِ محبوب کی۔''

آپ کا تیسرا لقب نذیر ہے۔ اس کا معنیٰ ہے کسی شخص کو نافرمانی کے نتائج سے بروقت آگاہ کر دینا۔ یہ بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شانِ اقدس ہے۔

آپ کا چوتھا لقب دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ کہ آپ اللہ پاک کی مخلوق کو اللہ کی طرف دعوت دینے والے ہیں اور یہ کام چونکہ بہت ہی کٹھن اور دشوار ہے' کوئی آدمی اپنے عقیدہ کو چھوڑنے کے لئے بہ آسانی تیار نہیں ہوتا'

اس لئے ساتھ ہی بِاِذْنِہٖ کا کلمہ بڑھا دیا۔ یعنی اے محبوب! ہم نے اس دشوار کام کو آپ کے لئے آسان بنا دیا ہے۔ اس کی ایک صورت یہی تھی کہ رب تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم ﷺ کو اُن گونا گوں خوبیوں اور دلفریبیوں سے ممتاز فرمایا تھا کہ دل خود بخود اُس طلعتِ زیبا کی طرف کھنچے چلے جاتے تھے۔ وہ لوگ جن میں حق پذیری کا ادنیٰ سا بھی ملکہ موجود تھا' وہ اس شمعِ جمال پر پروانہ وار نثار ہوتے تھے اور دنیا نے دیکھا کہ عرب کے اُجڈ اور سخت مزاج لوگ کس طرح اپنے بچوں' اپنے آباد گھروں' قیمتی مال و متاع اور وطنِ عزیز کو چھوڑ کر درِ مصطفیٰ علیہ اطیب التحیۃ والثناء کی طرف کشاں کشاں جا رہے ہیں۔ ابھی چند دن پہلے خالد بن ولید نے میدانِ اُحد میں مسلمانوں کی فتح کو شکست میں تبدیل کر دیا لیکن وہی فاتح' خالد مکّہ کو الوداع کہہ رہا ہے اور اپنے گلے میں غلامی کا قلادہ ڈال کر سرکارِ مدینہ کی حاضری کے لئے کوہ و دمن' دشت و صحرا کو عبور کرتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ یہی دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ کی شان کا ایک ظہور ہے۔'' (ضیاء القرآن' جلد چہارم' صفحات ۸۱' ۸۲)

سراج منیر (منور کر دینے والا آفتاب) : یہ آپ کا پانچواں لقب ہے یعنی آفتاب بھی اور آفتاب عالمتاب بھی۔ روشن اور اتنا روشن کہ دوسروں کو بھی نور و ضیاء کا منبع و مصدر بنا دینے والا۔ حضرت عارف باللہ مولانا ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں: حضور علیہ السلام زبانِ فیض ترجمان سے تو داعی تھے اور اپنے قلب مبارک اور قالب منور کی وجہ سے سراج منیر تھے۔ اہلِ ایمان اس آفتاب کے رنگوں میں رنگے جاتے ہیں اور اس کے انوار سے درخشاں و تاباں ہوتے ہیں۔

عظمتِ رسول کی دل پذیر اور ایمان افروز لڑی میں سنن ابن ماجہ کی اُس حدیثِ مبارکہ کو بھی شامل کر لیجئے جس کا حوالہ گزشتہ صفحہ ۴۲۰۶ میں دیا گیا ہے۔

(20) یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (المائدۃ: ۶۷)

''اے رسول! جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ پر اتارا گیا اُس کی تبلیغ کرتے رہئے' اور اگر آپ نے یہ نہ کیا تو آپ نے اللہ کا پیغام پہنچایا ہی نہیں اور اللہ تعالیٰ تمام لوگوں (کے شر) سے آپ کو محفوظ رکھے گا۔'' (۵ : ۶۷)

ایسے مفروضات' محالاتِ عادی ہی نہیں' محالاتِ عقلی بھی ہیں۔ پیغمبر کی شانِ ارفع سے یہ بات بہت ہی بعید اور محال بالذات ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے میں ذرّہ بھر بھی کوتاہی کرے۔

اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ کیا حضور ﷺ تبلیغ میں کوتاہی کرتے تھے کہ بَلِّغْ کے لفظ میں اُنہیں تبلیغ کا حکم دیا

گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس قسم کے خطاب حضور علیہ السلام کی تائید کے لئے ہوتے ہیں یعنی معنی یہ ہوگا کہ ''یوں ہی تبلیغ جاری رکھئے۔'' جیسا کہ سورۃ التحریم کی اوّل آیت (۶۶:۱) میں فرمایا: یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰہَ یعنی ''اللہ سے اسی طرح ڈرتے رہئے''۔ (اور یہ ترجمہ صحیح نہیں ہوگا کہ اے نبی! اللہ سے ڈریئے۔ حالانکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا نہ کوئی ہوا اور نہ ہوگا)۔ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ (اگر آپ نے یہ نہ کیا) کے الفاظ میں بھی حضور والا کی شانِ ارفع کو اجاگر کرنا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضور اکرم ﷺ اپنی بعثت اور نزولِ قرآن سے پہلے بھی عملی مبلّغ تھے اگرچہ قولی تبلیغ اعلانِ نبوّت کے بعد شروع کی لیکن آپ کی عملی تبلیغ ولادت ہوتے ہی شروع ہوگئی تھی: وہ اس طرح کہ (۱) کیا بی بی حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کا بایاں پستان نہ چوسنے اور اُسے اپنے رضاعی بھائی کے لئے چھوڑ دینے میں آپ کی طرف سے عدل کی تبلیغ نہ تھی؟ (۲) نماز کا حکم ملنے سے پہلے آپ نے جو نمازیں خود پڑھیں' کیا یہ تبلیغ نہیں تھی؟ اور کیا (۳) حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ سے زائد صحابہ کے مجمع سے کیا آپ نے اپنی تبلیغ کی بابت گواہی نہیں لی اور سب کے گواہی دینے پر آپ نے تین بار آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر اُن کی گواہی پر کیا اللہ کو گواہ نہیں بنایا؟

اصل میں بات یہ ہے کہ زیرِ نظر آیت میں ناممکن کو ناممکن پر معلق کیا ہے۔ جس طرح سورۃ الحآقّۃ کی آیات ۴۴ تا ۴۷ میں فرمایا کہ ''اگر یہ رسول بعض باتیں خود گھڑ کر ہماری طرف منسوب کر دیتا تو ہم اُس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے' پھر ہم اُس کی رگِ دل کاٹ ڈالتے' پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔'' یہاں مقامِ نبوّت کی نازک اور گراں ذمہ داریوں کو اُجاگر کیا جا رہا ہے اور سوال کیا جا رہا ہے کہ اے میرے رسول کے دشمنو! ذرا یہ تو بتاؤ کہ اگر میرے اس رسولِ مکرّم نے اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ کر میری طرف منسوب کی ہوتی تو کیا میرا جوشِ غضب اُسے معاف کرتا؟ ہرگز نہیں' میں تو اُس کی رگِ جاں کاٹ کر اُسے ہلاک کر کے رکھ دیتا۔ جب میں نے رگِ جاں کاٹی نہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ کر وحی میں نہیں ملاتا' پس سمجھ لو کہ وہ میرا سچا رسول ہے اور میری جو وحی اُس پر نازل ہوتی ہے' اُسے من وعن بلا کسی کمی بیشی کے تم تک پہنچا دیتا ہے۔ چنانچہ یہ بظاہر سخت بیان دراصل شانِ نبوّت کی رفعت اور عظمتِ مصطفی ﷺ کی عطر بیز خوشبو میں رسا بسا ہوا ہے۔

اِسی آیت کی روشنی میں سورۃ المآئدۃ کی مذکورہ آیت ۶۷ کو سمجھا جا سکتا ہے کہ چونکہ آپ نے احکامِ الٰہی میں سے کوئی بات نہ چھپا کر تبلیغ کا فریضہ نبوّت ادا کر دیا ہے اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں کہ آپ نے اللہ کا پیغام اُس کے بندوں تک نہیں پہنچایا۔ یہ کہنا تو تب صحیح ہوتا جب آپ سے فریضہ نبوّت کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوتاہی ہوئی ہوتی۔

''اعلانِ نبوّت سے پہلے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی قوم کی آنکھوں کا تارا تھے۔ اُن کی زبانیں حضور ﷺ کو ''الصادق'' اور ''الامین'' کہنے سے نہیں تھکتی تھیں۔ لیکن جس روز نبی رؤف ورحیم نے دینِ توحید کی تبلیغ کا آغاز کیا تو حالات یکسر بدل گئے۔ جو لوگ آپ ﷺ کے قدموں میں آنکھیں بچھانا اپنی سعادت سمجھتے تھے' وہ اب خون کے

پیاسے ہو گئے۔ مکی زندگی میں بھی آپ علیہ السلام ایسے عیار دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے جو آپ کے خون کے پیاسے تھے اور ہجرت کے بعد جب آپ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف فرما ہوئے تو وہاں بھی دشمنانِ اسلام جن میں منافقین اور یہودی پیش پیش تھے' اُن کی سازشیں اور منصوبہ بندیاں صرف اِس نقطہ پر مرکوز تھیں کہ جس طرح ہو سکے' اِس آواز کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا جائے جو اُنہیں ہر لحظہ اللہ وحدہٗ لاشریک پر ایمان لانے کی دعوت دیتی رہتی ہے۔"

"جنگوں کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ سرکارِ دو عالم ﷺ جب استراحت فرما ہوتے تو جاں نثار اور وفادار غلاموں کا ایک دستہ رات بھر حضور علیہ السلام کا پہرہ دیا کرتا لیکن جب سورۂ المائدۃ کی آیتِ مذکورہ نازل ہوئی تو اُس دن سے آپ ﷺ نے پہرہ داروں کو اپنے گھر بھیج دیا اور فرمایا کہ اللہ نے میری حفاظت کی ذمہ داری اُٹھالی ہے اور اب مجھے کسی بداندیش سے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ چشمِ فلک نے دیکھا کہ آپ کی حیاتِ طیبہ میں بڑے بڑے خطرناک لمحات بھی آئے لیکن محبوبِ رب العالمین ﷺ نے ذرّہ بھر پروانہ کی۔ اللہ تعالیٰ کی حفاظت پر کامل اعتماد کرتے ہوئے کبھی حفاظتی تدابیر کی طرف توجہ نہ دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس وعدہ کو پورا فرمایا اور بعد میں کوئی دشمن محبوبِ رب العالمین کو کوئی گزند نہ پہنچا سکا۔"

اس سلسلہ میں اُن بعض مستشرقین کا حوالہ دینا بے جا نہ ہوگا جنہوں نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پُرعزم اور غیر مذبذب خلوص اور الٰہی مشن کی صداقت پر آپ کے وقیع ایمان کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے:۔

(۱) وہ قربانیاں جو ابو طالب اور اُن کے خاندان نے اپنے بھتیجے کے لئے دیں' وہ ابو طالب کے خالصتاً شریفانہ اور بے غرض کردار پر مُہر ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ محمد (ﷺ) کے خلوص کا بھی ثبوت ہیں۔ ابو طالب کسی چالباز' دھوکے باز کے لئے ایسی قربانیاں نہ دیتے کیونکہ اُنہوں نے وسیع اسباب سے (اپنے بھتیجے کا اور حالات کا) جائزہ لے لیا تھا۔ ("The Life of Mahomet" ... Sir William Muir, Vol. 2, p.195)

(۲) مشن کا پہلا عشرہ آزمائش و ابتلاء کا زمانہ تھا اور اس سارے زمانہ میں کسی بھی آدمی کو اتنے شدید طور پر نہیں آزمایا گیا جتنا محمد (ﷺ) کو۔ ناامیدیوں' استہزاء و تمسخر' ہتک آمیزیوں اور تشدد کا پورے طور پر آپ کو نشانہ بنایا گیا لیکن آپ نے ہر چیز کمال استقامت کے ساتھ برداشت کی اور آپ کا ایمان متزلزل نہیں ہوا۔
("Religions of the World"... G. M. Grant, p. 22)

(۳) جب آپ اپنے شیر خوار بچے جناب ابراہیم کے بستر مرگ پر جھکے ہوئے تھے تو اس سخت ترین صدمہ کے وقت بھی آپ کا انداز اور رویہ راضی برضا ہونے کا مظہر تھا اور جنت میں جلد ہی اپنے بچے سے ملنے کی امید میں آپ کی تسلی تھی۔ جب آپ اپنے بچے کی قبر کو گئے تو آپ نے قبرستان کے ہیبت ناک منظر میں اپنے ایمان کی مضبوطی'

توحید الٰہی اور اپنے مشنِ رسالت کو قائم رکھتے ہوئے اپنے بچے کی روح کو پکارا۔ اپنے وقتِ وفات میں بھی جب کوئی دنیاوی مقصد سامنے نہ تھا' تو آپ نے اُس وقت بھی اُسی مذہبی لگن اور اپنی رسالت کے مشن کا اظہار کیا۔ آخری الفاظ جو آپ کے ہونٹوں پر لرزاں تھے' وہ بھی انبیائے سابقہ کے ساتھ جلد ہی خوش کن ہمراہی کی امید کا مظہر تھے۔'' ("Mahomet and his Successors".. Washington Irving, Vol. 1, p. 345)

(۴) ''قرآن نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ کوئی بھی انسان کلامِ الٰہی میں تغیر و تبدل نہیں کر سکتا اور اگر محمد (ﷺ) نے کبھی ایسا کیا تو نتائج مہلک ہوں گے۔''☆ ("Muhammad -- A Biography of the Prophet"--- Karen Armstrong, p. 112)

(۵) ''اگر آپ کو اپنے (الٰہی) پیغام پر پختہ اور غالب ایمان نہ ہوتا تو یہ یقین کرنا بہت ہی مشکل ہے کہ آپ نے ایسا حتمی اعتماد کیسے حاصل کر لیا یا اپنے ماحولیات پر اتنا گہرا اثر کیونکر چھوڑا۔ محمد (ﷺ) اپنی دعوت کو انتہائی مخلصانہ سمجھتے تھے۔ قیامت کے دن آپ احکم الحاکمین کے حضور پیش ہونے سے لرز لرز جاتے تھے اور آپ اپنے خدائی مشن کو ترساں اور لرزیدہ ادا فرماتے تھے۔'' ("Muhammad the Man and his Faith"--- Tor Andrae, p. 178)

(۶) ''محمد (ﷺ) کو اپنے الٰہی مشن اور اللہ کی طرف سے اپنی بعثت و رسالت پر پورا یقین تھا اور اس حیثیت سے آپ ملک میں بڑی اصلاح لائے۔ اس الٰہی مشن کی بنیاد ذرا بھی غلط نہ تھی۔ تمسخر و استہزاء اور تشدد کے درمیان آپ نے اپنے ایمان کو متزلزل نہیں ہونے دیا۔ کوئی بھی دھمکی اور کوئی بھی دل آزاری آپ کو وحدانیتِ الٰہی اور صراطِ مستقیم کی تبلیغ سے نہ روک سکی۔ آپ نے لوگوں کو ملک میں رائج عام بد اخلاقی سے کہیں بہتر اعلیٰ اخلاقیات کی ترغیب دی۔'' ("The Message of the Qur'an",Chapter III, p. 339 --- John Davenport)

(۷) ''متدین اور زاہد و متقی مسلمان کے نزدیک محمد (ﷺ) کا اسمِ (مبارک) ہر زمینی نام سے کہیں بلند و بالا ہے اور ایسے شخص کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کے حق و صداقت کے پُر جوش جذبے اور الٰہی مقصد کی درخشاں پیشکش نے اپنے پیروکاروں کے دلوں کو وجد و کیف' حمد و ستائش اور ایمان کی پختگی کا جوش دلایا۔ پیغمبر (علیہ السلام) کے سفرِ حیات کے دوران فیصلہ کن تاریخی لمحات کی عکاسی میں قرآن (مجید) نے ہر چیز سے بڑھ کر آپ کے کردار کے مرکزی نقطے یعنی آپ کے غیر متزلزل یقین' الٰہی مشن پر آپ کے مستقل اور پُرعزم ایمان اور اپنی دعوت کے حق ہونے پر زیادہ زور دیا ہے۔ اور یہی چیز آپ کو ایک ممتاز و نمایاں ہستی بناتی ہے۔'' ("The Great Religions of the World"--- Edward J. Jurji. p. 179)

☆ درحقیقت کرن آرمسٹرانگ یہاں سورۃ الحاقّۃ (۶۹) کی آیات ۴۴ تا ۴۷ کی ترجمانی کر رہی ہیں۔

(۸) ''محمد (ﷺ) کی شخصیت کی اُن کے پیروکاروں نے حد سے زیادہ تعریف وستائش کی ہے اور اُنہیں مثالی بنا دیا ہے اور برابر کے اُسی مبالغہ کے ساتھ عیسائیوں نے آپ کی مذمّت کی ہے۔ آپ (ﷺ) عہد نامہ عتیق (تورات) کے کلاسیکی طور کے پیغمبروں سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ مخلصانہ ایمان کی دولت سے لبریز تھے جس کا منبع آپ کا اللہ کے ساتھ حقیقی رابطے کا تجربہ تھا۔ آپ کی طرف نازل شدہ وحی کے مقابل ہر چیز ہیچ اور کم تر تھی۔'' (New Caxton Encyclopaedia, Vol. XIII, p. 4236)

(۹) ''تا دم آخر آپ (ﷺ) نے پُر جوش طور پر اللہ کو خوش کرنے اور اپنی قوم کی نجات کے لئے کوشش کی اور بدر حقیقت الٰہی مشن پر آپ کے ایمان میں کوئی کمی نہیں آئی۔'' ("Geschichte des Qurans", Vol. 1 --- Theodre Noldeke, p. 6)

(۱۰) ''ہمیں معلوم ہے کہ محمد (علیہ الصلوٰۃ والسلام) اپنے مذہبی مشن کی آگاہی سے اتنے گہرے طور پر متاثر تھے کہ آپ دنیاوی دھن دولت اور عزت وحشمت کے مقام کو خیرباد کہنے اور اہلِ مکّہ کے سالوں تک کے تمسخر واستہزاء اور نفرت کا مقابلہ کرنے کو تیار تھے۔'' ("Medieval and Modern History"--- Hutton Webster, p. 73)

(۱۱) ''محمد (ﷺ) کے خلوص کے لازمی وصف کی بابت کسی سوال کی ضرورت نہیں ہے۔'' ("Introducation to the Qur'an"--- Richard Bell, p. 36)

(۱۲) ''لہٰذا سائنس (علومِ عقلیہ) کا طالب علم محمد (ﷺ) میں چالباز آدمی کی کوئی بات نہیں پاتا بلکہ وہ آپ (ﷺ) کے خلوص وصداقت کے نقوش سے پوری طرح متفق ہے جس کا اظہار پہلے نبیوں کی وحیوں میں کیا گیا تھا۔ سورہ یونس کی آیت ۱۶ اور سورۃ القصص کی آیت ۸۵ وغیرہ ہمیں بتاتی ہیں کہ آپ نے مکّی زندگی میں اپنے اعلیٰ وارفع کام پر غیر متزلزل یقین کے ساتھ لوگوں کی دشمنی اور ذلت کو بے غرضانہ طور پر برداشت کیا۔'' (Shorter Encyclopaedia of Islam -- H.A.R. Gibb & Kramers,p.393)

(۱۳) ''ایک سے زیادہ مرتبہ آپ کی زندگی کو خطرہ ہوگیا لیکن ایک مقتدرِ اعلیٰ ذات نے اپنے اس پیغام رساں نمائندے کو اپنی حفاظت میں رکھا۔ ایک دشمن کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی جس نے آپ کے سر کے اوپر سے اُسے گھمایا تھا۔'' ("Historians' History of the World", Vol. 8, p. 123)

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب سورۂ المائدہ کی مذکورہ آیت ۶۷ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو

حفاظت کا یقین دلا دیا تھا تو آپ جنگِ اُحد میں زخمی کیوں ہوئے؟ مفسرینِ قرآن نے اس کا کئی طرح سے جواب دیا ہے۔ لیکن سب سے واضح جواب مولانا اشرف علی تھانوی نے دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کی حفاظت کا وعدہِ الٰہی تبلیغ کے سیاق میں کیا گیا تھا اور وہ بھی قتل ہونے کی حفاظت سے متعلق تھا جیسا کہ امام بغوی نے اپنی تفسیر معالم التنزیل میں لکھا ہے:

يَعْصِمُكَ مِنَ الْقَتْلِ فَلَا يَصِلُوْنَ اِلٰى قَتْلِكَ

''اللہ آپ کو قتل ہونے سے محفوظ رکھے گا تو لوگ آپ کو قتل نہیں کر سکیں گے۔''

(21) لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ O (الشعراء: ۳)

''شاید کہ آپ (اے حبیب!) اُن کے ایمان نہ لانے پر اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔'' (۲۶:۳)

اوپر کی آیت ۳ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اپنی اُمتِ (دعوت) کے لئے کمال شفقت کا اور کفار کے منفی ردِّ عمل پر آپ کے دکھ درد اور شدید رنج والم کا اظہار ہے۔ علاّمہ آلوسی بغدادی نے اس آیت ۳ سے دو نکات اخذ کئے ہیں: اوّل یہ کہ نبی علیہ السلام اپنی امت کے لئے بہت ہی مشفق اور مہربان ہیں۔ دوم یہ کہ کفار کو ایمان کی راہ پر لگانے میں آپ کی فکر الٰہی فیصلہ کے خلاف نہیں ہے۔ (روح المعانی' جزء ۹' صفحہ ۵۹ طبع بیروت)

دیگر مفسرین نے کچھ اور بھی نکات اخذ کئے ہیں مثلاً: (۳) اگر کفار اور گمراہ لوگوں کو راہِ حق پر لانے میں ہماری کوششیں بارآور نہیں ہوتیں تو ہمیں بے دل نہیں ہونا چاہئے۔ (۴) ہدایت دینا پیغمبر علیہ السلام کے ذمہ نہیں' بلکہ رشد و ہدایت کی عطا صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۷۲ اور سورۃ القصص کی آیت ۵۶ میں ارشاد ہوا۔

مکّی زندگی کے وسط کا زمانہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے بڑا ہی صبر آزما زمانہ تھا کہ کفارِ مکّہ اپنے پیغمبر کی طرف سے لائے ہوئے الٰہی پیغام کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوئے جو اُن کے حق و صداقت کے انکار پر ہمیشہ مضطرب اور پریشان رہتے تھے اور حد درجہ آرزومند تھے کاش کہ وہ اسلام قبول کر کے نارِ جہنم سے بچ جائیں۔ اُن ناگفتہ بہ اور تکلیف دہ حالات میں محولہ بالا آیت آپ ﷺ کے لئے بڑے ہی سکون و راحت کا باعث بنی۔

''مکّہ کے مادّی تجارتی شہر میں جہاں زراندوزی اور سودی کاروبار اپنے عروج پر تھے' جہاں فارغ اوقات کو گزارنے کا مشغلہ عورتیں' شراب اور جوا تھے' جہاں ''جس کی لاٹھی اُس کی بھینس'' کا راج تھا اور جہاں بیواؤں' یتیموں اور کمزور و ناتوانوں سے زائد از ضرورت بوجھ کا برتاؤ کیا جاتا ہو' وہاں محمد ﷺ کی حساس جان ہی تھی جس نے انتہائی المناک جذبات کا تجربہ کیا۔ آپ نے اپنے صبر و ضبط سے بڑھ کر ان صدمات و آلام کو برداشت کیا۔'' (Hurgronje)

(22) لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ O (اَلحِجر : ۷۲)
''(اے حبیبِ مکرّم!) آپ کی عمرِ مبارک کی قسم! بے شک یہ لوگ اپنی بدمستی میں سرگرداں پھر رہے ہیں۔'' (۷۲ : ۱۵)

نفسانی خواہشات اور گناہوں کا دیوانہ پن اپنی تباہی خود ہی اپنے ہاتھوں لاتا ہے جس سے توبہ وندامت یا رحمت کی آخری امید بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ یہ آیت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حد درجہ تعظیم میں نازل ہوئی کیونکہ:

(۱) قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُمَا: مَا خَلَقَ اللّٰہُ نَفْسًا أَكْرَمَ عَلَيْهِ مِنْ مُحَمَّدٍ ﷺ وَمَا أَقْسَمَ بِحَيَاةِ أَحَدٍ إِلَّا بِحَيَاتِهٖ
''ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ سے بڑھ کر زیادہ عزت وتعظیم والا کسی کو پیدا نہیں کیا اور اللہ نے محمد ﷺ کی زندگی کی قسم کے سوا کسی اور کی زندگی کی قسم نہیں کھائی۔''

(۲) هٰذَا نِهَايَةُ التَّعْظِيمِ وَغَايَةُ الْبِرِّ وَالتَّشْرِيفِ (قرطبی)
''پیغمبر علیہ السلام کی یہ انتہا درجے کی تعظیم وتکریم ہے۔''

(23) يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ O (الانفال : ۶۴)
''اے نبی (مکرّم!) آپ کے لئے اللہ کافی ہے اور وہ مسلمان جنہوں نے آپ کی پیروی اختیار کرلی۔'' یا
''اے نبی (مکرم!) آپ کے لئے اور اُن مسلمانوں کے لئے جنہوں نے آپ کی پیروی اختیار کرلی' اللہ کافی ہے۔'' (۶۴ : ۸)

مفسرین کے نزدیک آیت کے درجِ بالا دونوں ترجمے درست ہیں کیونکہ وَمَنِ اتَّبَعَكَ کا عطف لفظ اللّٰہ پر بھی ہوسکتا ہے اور حَسْبُكَ کے ك پر بھی۔ تفسیر قرطبی کے حاشیہ کے مطابق آیت میں اِضمار (Ellipsis) یعنی تخفیفِ عبارت ہے اور اصل عبارت یوں ہے: حَسْبُكَ اللّٰهُ وَحَسْبُكَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ یعنی اے نبی (معظم!) اللہ اور آپ کے جاں نثار پیروکار آپ کی مدد کے لئے کافی ہیں اور اُن کے بعد آپ کسی اور کی نصرت و امداد کے محتاج نہیں ہیں۔ اوپر پہلا ترجمہ اسی تاویل کی رُو سے کیا گیا ہے۔ سورۃ الزُّمر کی آیت ۳۶ میں نبی علیہ السلام کو اس طرح راحت وسکون کا سامان مہیا کیا گیا ہے:
أَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ''کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کافی نہیں؟'' (۳۶ : ۳۹)

(24) طٰهٰ O مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقٰى O (طٰہٰ : ۱، ۲)

”طٰهٰ ہم نے قرآن (اے محبوبِ مکرّم!) آپ پر اس لئے نازل نہیں فرمایا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں۔“ (۲۰ : ۱'۲)

سورت کے افتتاحی لفظ طٰهٰ کی متعدد تاویلات کی گئی ہیں جن میں سے چند ایک حسبِ ذیل ہیں:

(i) کچھ مفسرین کے نزدیک بروئے حدیث طٰهٰ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسمِ مبارک ہے۔ (ضیاء القرآن جلد سوم، صفحہ ۱۰۳)

(ii) کچھ علماء کے نزدیک حرف طا، طہارہ (پاکیزگی) کے لئے اور حرف ھا ہدایت کے لئے ہے اور تخفیفِ عبارت (اِضمار) کے بعد عبارت یوں ہے:

يَا طَاهِرًا مِّنَ الذُّنُوْبِ يَا هَادِيَ الْخَلْقِ اِلٰى عَلَّامِ الْغُيُوْبِ (تفسیر قرطبی)

”اے گناہوں سے پاک ذات! اے مخلوقات کو مخفی باتوں کے بہت زیادہ جاننے والے کی طرف ہدایت دینے والے!“

(iii) علامہ نظام الدین نیشاپوری نے اپنی تفسیر میں ایک باریک نکتہ پیدا کیا ہے اور کہا ہے کہ علمِ جُمل کے مطابق ط کے حرف کے ۹ عدد اور ہ کے حرف کے ۵ عدد بنتے ہیں اور اِن دونوں کا مجموعہ ۹ + ۵ = ۱۴ ہے۔ اب طٰهٰ کا معنیٰ یہ ہوگا: ”اے چودھویں رات کے مہِ کامل“۔ علامہ موصوف کی عبارت یوں ہے:

قِيْلَ اَلطَّاءُ تِسْعَةٌ فِي الْحِسَابِ وَالْهَاءُ خَمْسَةٌ وَمَعْنَاهُ: يَا اَيُّهَا الْبَدْرُ (تفسیر نیشاپوری)

”کہا گیا ہے کہ علمِ جُمل میں ط کے حرف کے ۹ عدد اور ہ کے پانچ عدد ہیں۔ اب طٰهٰ کا معنیٰ یہ ہوگا: اے چودھویں رات کے کامل واکمل چاند!

(iv) علامہ نیشاپوری کی اس تاویل کا ذکر کرنے کے بعد علامہ سید محمود آلوسی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

فَكَاَنَّهٗ قِيْلَ: يَا بَدْرَ سَمَاءِ عَالَمِ الْاِمْكَانِ (روح المعانی)

”گویا کہ یوں کہا گیا ہے: اے عالمِ امکان کے آسمان کے کامل واکمل چاند!“

کافروں کے اسلام قبول کرنے کی شدید آرزو اور انتہائی خواہش میں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنی بدعملیوں کی وجہ سے جہنم کا ایندھن بنیں۔ اس وجہ سے آپ ہمیشہ مضطرب اور پریشان رہتے تھے۔ ربِ تعالیٰ سے اپنے محبوب ﷺ کی یہ بے آرامی اور بے چینی برداشت نہ ہوئی تو اُس نے آپ ﷺ کی تسلی و تشفی کے لئے یہ آیات نازل فرمائیں کہ ”اے اس چرخِ نیلگوں کے مہِ کامل! ہم نے یہ قرآن اس لئے نازل نہیں فرمایا کہ آپ اِن کافروں کے کفر اور نادانی پر کُڑھتے رہیں اور پریشان ہوتے رہیں۔ آپ نے تو اُن تک ہمارا پیغام پہنچانے کا فریضہ ادا کر دیا ہے اور اس کے بعد آپ پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اب یہ اُن کی مرضی ہے کہ پیغامِ حق کو قبول کریں یا نہ کریں۔ اُن کے تعصب، ہٹ دھرمی، بد دماغی اور انانیت کے رویّہ پر آپ کیوں اپنے آپ کو ہلکان کرتے ہیں؟

ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ آیت مذکورہ میں تَشْقٰی کا لفظ شقاوت (بہ معنی بدبختی) سے ہے جو سعادت (خوش بختی) کا متضاد لفظ ہے۔ ایک روایت کے مطابق ایک دن ابو جہل اور نضر بن حارث پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس آئے اور کہا: اِنَّکَ شَقِیٌّ " لِاَنَّکَ تَرَکْتَ دِیْنَ آبَاءِ کَ (معاذ اللہ!'' اپنے آباء و اجداد کے دین کو چھوڑ دینے کی وجہ سے آپ بد بخت ہو گئے ہیں۔'' اُن کے اس خود اختراعی الزام کو مسترد کرتے ہوئے محولہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں کہا گیا: اے بدبختو! قرآن لوگوں کو بدبخت بنانے کے لئے نازل نہیں ہوا بلکہ وہ تو محروم القسمت اور بدقسمت لوگوں کو فیوض و برکات کی اعلیٰ اور بلندترین چوٹیوں تک پہنچانے کے لئے نازل ہوا ہے۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں :

رَدَّ ذٰلِکَ بِاَنَّ دِیْنَ الْاِسْلَامِ وَھٰذَا الْقُرْآنُ ھُوَالسُّلَّمُ اِلٰی نَیْلِ کُلِّ فَوْزٍ وَالسَّبَبُ فِیْ دَرْکِ کُلِّ سَعَادَۃٍ (قرطبی)

''اس آیت میں ابو جہل اور نضر بن حارث کے طعن کو یہ کہتے ہوئے ردّ کیا گیا ہے کہ اسلام اور یہ قرآن ہر فوز و فلاح کی سیڑھی ہے اور ہر قسم کی برکت حاصل کرنے کا سرچشمہ ہے۔''

(25) مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (النساء : ۸۰)

"جس نے رسول (ﷺ) کا حکم مانا تو بے شک اُس نے اللہ ہی کا حکم مانا۔'' (۴:۸۰)

جب ہم نے محمد ﷺ کو اللہ کا سچا رسول تسلیم کر لیا تو ہم معقولیت اور منطق کے تمام اصولوں کی رُو سے آپ کے تمام احکامات کی واضح طور پر پیروی کرنے کے پابند ہیں چاہے ہم کسی خاص حکم کا مقصد سمجھنے کے قابل ہوں یا نہ ہوں۔ عام انسانوں کے پاس واسطۂ رسول کے سوا معرفتِ الٰہی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ آیت میں اُن گمراہ فرقوں کا ردّ آ گیا جو رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کے ہم معنیٰ نہیں سمجھتے۔ آیت عصمتِ رسول کے مضمون کو بھی واضح طور پر بیان کر رہی ہے کہ اگر رسول ﷺ سے ذرا سا بھی غلطی اور خطا کا اِمکان ہوتا تو اُن کی اطاعت عین اطاعتِ الٰہی کیسے قرار پا سکتی؟ (تفسیر کبیر) علاوہ حدیثِ نبوی کے جہاں یہ مضمون تصریحاً آیا ہے' فقہائے کرام نے اس آیت سے یہ بھی نکالا ہے کہ رسول کی نافرمانی عین حق تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔

(26) وَمَا آتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ○ (اَلْحَشْر : ۷)

"اور جو کچھ تمہیں رسول عطا فرما دیں اُسے لے لیا کرو اور جس سے تمہیں روک دیں تو (اُس سے) رک جایا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو' بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔'' (۷ : ۵۹)

یہاں ''اللہ سے ڈرتے رہو'' کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تقسیم و عطا پر بھی زبانِ طعن نہ کھولو۔

اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ رسول ﷺ کے اوامر و نواہی کا قبول نہ کرنا غضبِ الٰہی کو للکارنا ہے کیونکہ:

''پیغمبر ﷺ کی حیران کن حیاتِ طیبہ قرآن مجید کی تفسیر ہے جیسا کہ اُمّ المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا۔ ہم اس کتابِ مقدس سے انصاف اُس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک ہم صاحبِ قرآن کی مکمل طور پر پیروی نہ کریں کیونکہ صاحبِ قرآن ﷺ اللہ کی زبان ہیں۔'' ("Islam on the Crossroads" -- Mohammad Asad, p. 92)

آیت میں مَا عمومیت کا ہے۔ مَا آتَاکُمُ ہر امر کو اور مَا نَهَاکُمْ عَنْهُ ہر نہی کو شامل ہے۔ اس لئے جمہور محققین کا مسلک یہ ہے کہ گو نزولِ آیت عطائے مالِ فَئے ☆ میں ہوا ہے لیکن اس کا حکم عام ہے اور حضرت رسالتمآب ﷺ کے جملہ اوامر و احکام واجب القبول ہیں جیسا کہ امام بغوی نے ''معالم التنزیل'' میں، ابنِ کثیر اور امام بیضاوی نے اپنی اپنی تفاسیر میں بیان کیا ہے۔

آیت ''فتنہ انکارِ حدیث'' پر بھی ضربِ کاری ہے۔

(27) وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ۝ (الانفال)
''اللہ اُنہیں عذاب نہیں دے گا اس حال میں کہ آپ اُن میں موجود ہوں اور نہ اللہ اُن پر عذاب لانے کا ہے اس حال میں کہ وہ استغفار کر رہے ہوں۔'' (۸ : ۳۳)

اِس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ ربُّ العزت نے اپنے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمت و رفعت کی خاطر اپنے آفاقی نظامِ سزا کو بدل دیا ہے۔ اُممِ سابقہ کی نافرمانیوں اور حد درجہ گناہوں کی وجہ سے اُن پر مختلف قسم کے عذاب بھیجے گئے اور وہ قہرِ الٰہی کے مورد قرار پائے۔ لیکن نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تشریف آوری پر رب تعالیٰ نے اپنے اس قاعدے اور ضابطے کو تبدیل کر دیا اور یہ حقیقت نبی علیہ السلام کے علوِ درجہ اور اُس مقامِ رفیع کی غماز ہے جو اُنہیں رب تعالیٰ کے حضور حاصل ہے۔ یہ آپ علیہ السلام ہی کی بدولت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف مسلمانوں سے عذاب سے دست کشی کی بلکہ کافروں، یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی درگزر کیا۔ عذاب سے یہ دست کشی کسی خاص وقت کے لئے محدود نہیں بلکہ آپ کی رسالت و نبوّت کا جزوِ لاینفک بن گئی ہے۔ جب تک آپ کی موجودگی بہ حیثیت پیغمبر اور فرستادۂ الٰہی اس خاکدانِ گیتی میں رہے گی، لوگوں پر عذاب نہیں آئے گا اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ آپ کی رسالت روزِ قیامت تک باقی رہے گی کیونکہ آپ کی ہم میں موجودگی (وَأَنْتَ فِيهِمْ) رحمت خداوندی میں بدل گئی۔ لہٰذا جب تک آپ ہم میں موجود ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ضمانت ہے کہ اُمّتِ مسلمہ ہر قسم کی سزا سے

☆ اسلامی اصطلاح میں فَئے وہ مال ہے جو کافروں سے لڑے بغیر مسلمانوں کے ہاتھ آ جائے۔

محفوظ رہے گی۔ اس طرح پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ ستودہ صفات عذابِ الٰہی کے نہ ہونے کا ایک نشان بن گئی ہے۔'' ("Islamic Concept of Intermediation", pp. 166-167)

تاریخ کے اَن مٹ حقائق کو سامنے رکھئے کہ کفارِ مکہ اسلام کا نام صفحۂ ہستی سے مٹانے میں سرتوڑ کوشش کر رہے تھے اور اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ پر اور آپ کے صحابہ کرام پر ناگفتہ بہ تشدّد اور انسانیت سوز مظالم کی انتہا کر دی تھی۔ صورتِ حال اپنی انتہا میں یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اب اُنہوں نے ربِ تعالیٰ کو بہ ایں الفاظ چیلنج کر دیا تھا:

اَللّٰھُمَّ اِنْ کَانَ ھٰذَا ھُوَالْحَقَّ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَۃً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (الانفال: ۳۲)

''اے اللہ! اگر یہی (قرآن) تیری طرف سے حق ہے تو (اس کی نافرمانی کے باعث) ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا ہم پر کوئی دردناک عذاب بھیج دے۔'' (۸ : ۳۲)

اِن تمام حقائق کے مدِّ نظر یہ بات بالکل درست اور بے خطا تھی کہ عدل و انصاف گاڑی کا پہیہ (Chariot Wheel) حرکت میں آتا اور اُنہیں صفحۂ ہستی سے نابود کر کے رکھ جاتا۔ لیکن شانِ کریمی نے ایسا نہیں کیا۔ کیوں؟ اس کا جواب دیا جا رہا ہے کہ پیارے! میں نے تجھے رحمۃ للعالمین کا سہرا پہنا کر بھیجا ہے (بحوالہ سورۃ الانبیاء: آیت ۱۰۷)۔ جب تک تو اُن میں موجود ہے میں اُن پر عذاب نہیں بھیجوں گا۔

حیرانی کی بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے جانی و ازلی دشمن جنہوں نے آپ پر پتھر برسائے' آپ کی راہ میں کانٹے بچھائے' آپ کے جسمِ اطہر کو زخمی کیا' آپ پر آوازے کسے' آپ کو مختلف گستاخانہ القاب دیئے اور اُنہوں نے کیا کچھ نہیں کیا' اُنہی لوگوں کے عذابِ الٰہی سے محفوظ ہونے کا اعلان کیا جا رہا ہے کیونکہ وہ ہستی جو اُن کے تشدّد و مظالم کا شکار رہی ہے' اُن میں موجود ہے۔ ربِ تعالیٰ کی یہ نظرِ التفات و کرم محض اپنے محبوبِ مکرّم کی عزت و توقیر کی خاطر ہوئی اور یہ کہ آپ ﷺ کو اپنے خالق کی نظر میں کتنا بلند مقام حاصل ہے۔

غضبِ الٰہی سے اُن کے محفوظ ہونے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اُن کے کفر و شرک اور معصیت شعاری کے باوجود اللہ سے اُن کا تعلق استغفار کسی درجہ میں باقی و قائم ہے۔ چنانچہ طواف کے وقت وہ غُفرَانَكَ غُفرَانَكَ (تیری بخشش' تیری بخشش) کہتے جاتے ہیں۔

آیت کا ایک اور معنیٰ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اے حبیبِ مکرّم! تیری اُمّت میں تیرے کچھ ایسے بھی غلام ہیں جو ہر وقت میری بارگاہ میں میری رحمت و بخشش کو پکارتے ہوئے میرے حضور سجدہ ریز رہتے ہیں۔ اُن کی دعا کو قبول نہ کرنا اور اُن کی بخشش نہ کرنا میری شانِ رحیمی کے خلاف ہے کیونکہ وہ تیرے ہیں اور جو تیرا ہو گیا وہ میرے عذاب سے بچ گیا۔ سبحان اللہ! کیا شان اور عزت و تکریم ہے ربّ العالمین کے شاہکار رحمۃ للعالمین کی! ﷺ

(28) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللهَ كَثِيْرًا O (الاحزاب : ۲۱)

"فی الحقیقت تمہارے لئے رسول اللہ (ﷺ کی ذات میں) نہایت ہی حسین نمونہ (حیات) ہے ہر اُس شخص کے لئے جو اللہ (سے ملنے) کی اور یومِ آخرت کی امید رکھتا ہو اور اللہ کا ذکر بکثرت کرتا ہو۔" (۳۳:۲۱)

رَسُــــوْلِ اللهِ میں اَللہ کے لفظ نے یہ نکتہ پیدا کیا کہ رسول ﷺ کے کمالات شخصاً آپ کی جانب نہیں براہِ راست اللہ ہی کی جانب منسوب ہیں۔

"آپ کے روزمرّہ طریقِ حیات نے ایک ایسی راہ وضع کی ہے جس کی نقالی آج تک لاکھوں لوگ باشعور طور پر کرتے ہیں۔ نسلِ انسانی کا کوئی بھی طبقہ کسی کو ایسا مردِ کامل نہیں سمجھتا جتنا کہ اُس شخص کو جس کی حرف بہ حرف نقالی کی جاتی ہے۔" ("Arabia" ... Hogarth, p. 52)

قرآنی لفظ اُسْوَة" کی تعریف یوں کی گئی ہے :

اَلْاُسْوَةُ وَالْاِسْوَةُ لُغَتَانِ وَهُوَ مَا يَتَاسّٰى بِهِ الْحَزِيْنُ وَيُتَعَزّٰى بِهٖ (لسان العرب ؛ صحاح)

"اُسوہ اور اِسوہ دونوں طرح پڑھنا درست ہے اور اس سے مراد وہ شخص ہے جس سے اداس و مغموم، مصیبت زدہ اور دل شکستہ لوگ سکون و راحت پائیں۔" (لسان العرب لابن منظور افریقی ؛ الصحاح للجوھری ؛ تفسیر قرطبی)

(29) (i) وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللهَ رَمٰى (الانفال : ۱۷)

"(اے حبیبِ محتشم!) جب آپ نے (اُن پر سنگریزے) مارے تھے (وہ) آپ نے نہیں مارے تھے بلکہ (وہ تو) اللہ نے مارے تھے۔" (۸:۱۷)

(ii) اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللهَ يَدُ اللهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (الفتح : ۱۰)

"(اے حبیبِ محتشم!) بے شک جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں، اُن کے ہاتھوں پر (آپ کے ہاتھ کی صورت میں) اللہ کا ہاتھ ہے۔" (۴۸:۱۰)

(i) سورۃ الانفال کی اِس آیت ۱۷ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک معجزے کی طرف اشارہ ہے کہ جنگِ بدر اپنے زوروں پر لڑی جا رہی تھی جب نبی علیہ السلام نے جبریلِ امین کی ہدایت کے مطابق مٹھی بھر کنکریاں نیچے سے اٹھائیں اور یہ کہتے ہوئے اُنہیں کفار کی طرف پھینکا: شَاهَتِ الْوُجُوْهُ (اُن کے چہرے انتشار و افتراق کا شکار ہو جائیں!)۔ اس کے نتیجہ میں کفار فی الفور سراسیمہ اور پریشان ہو گئے اور اُنہیں دُم دبا کر بھاگنا پڑا۔ یہاں اُسی واقعہ کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ وہ کنکریاں پیغمبر علیہ السلام نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھیں جس سے

کفار کو شکست ہوئی اور اُن کا میدانِ جنگ سے فرار ہوا۔ ذرا خیال تو کیجئے کہ نبی کے فعل کو اللہ کے فعل کی طرف نسبت دی جا رہی ہے جیسا کہ سورۂ الفتح کی آیت ۱۰ میں بھی اُسی قسم کی بات کی گئی ہے :

(ii) صلح حُدیبیہ کے موقع پر جب یہ بات غیر یقینی تھی کہ آیا کفارِ مکہ پیغمبر علیہ السلام کے مکہ کو بھیجے ہوئے وفد سے اچھا برتاؤ کریں گے یا نہیں، تو چودہ سو سے پندرہ سو مسلمانوں کی جماعت میں جذبات کی پُر جوش لہر دوڑ گئی۔ وہ بڑے جوش اور عزمِ صمیم کے ساتھ نبی علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئے اور عرب دستور کے مطابق آپ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر وفاداری کی بیعت کی۔ یہ بذاتِ خود اخلاقی اور مادّی قوت کا حیران کن مظاہرہ تھا اور تاریخِ اسلام میں فتحِ مبین کا مظہر تھا۔ اُنہوں نے تو اپنے ہاتھ دستِ رسول ﷺ پر رکھے تھے لیکن کہا جا رہا ہے کہ اللہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں پر تھا۔ اُنہوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے بیعت کی تھی لیکن کہا جا رہا ہے کہ اُنہوں نے دراصل اللہ سے بیعت کی ہے۔ سبحان اللہ! عظمتِ رسول کو کن کن موقعوں پر اُس ذاتِ صمدیت نے آشکار کیا ہے! کاش کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے ہمیں صدیق رضی اللہ عنہ کی آنکھ اور بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی بصیرت حاصل ہو! آمین۔

(30) وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى ۝ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰى ۝ (اَلنَّجم : ۳، ۴)

''وہ (رسول ﷺ) (اپنی) خواہش سے بات نہیں کرتے، اُن کا ارشاد سراسر وحی ہوتا ہے جو اُنہیں کی جاتی ہے۔'' (۵۳ : ۳، ۴)

''الہام کے برعکس وحی ہمیشہ خارجی طور پر اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور اس کا تعلق انسان کی داخلی دنیا سے بالکل نہیں ہوتا۔ وحی کے وصول کرنے کے لئے پیغمبر کو اللہ کا خالصتاً غیر مزاحم اطاعت گزار، وحی کے حصول کی استعداد رکھنے والا آلہ کار ہونا چاہئے اور اس کے لئے اُسے اپنی شخصیت کو کلی طور پر مٹا دینا چاہئے۔'' (تفسیر ماجدی، صفحہ A-530 نوٹ :120)

روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو ابن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جو کچھ بھی سنتا تھا، لکھ لیتا تھا۔ قریش میں سے کچھ لوگوں نے مجھے ایسا کرنے سے روکا اور کہا کہ نبی ﷺ کسی وقت غصّے میں بھی ہوتے ہیں تو اُس وقت آپ سے کچھ ایسی بات بھی صادر ہو جاتی ہے جو لکھنے کے قابل نہیں ہوتی۔ اس پر میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ کچھ دنوں بعد معاملہ آقا علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا گیا اور میں نے لکھنے سے پرہیز کی وجہ بیان کی۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا :

اُكۡتُبۡ فَوَالَّذِىۡ نَفۡسِىۡ بِيَدِهٖ مَا خَرَجَ مِنِّىۡ اِلَّا الۡحَقّ

''(جو کچھ مجھ سے سنتے ہو اُسے) لکھ لیا کرو، اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، میری زبان سے حق بات کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔''

سورۃالانفال کی آیت ۱۷ سورۃالفتح کی آیت ۱۰ اورسورۃالنّجم کی آیات ۳ ۴ سے اخذشدہ

نکات: (۱) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ بزرگ و برتر کے ''محبوبِ اکبر'' ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کے ہرعمل کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ سابقہ انبیاء علیہم السلام نے بھی علمِ توحید کو بلند کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن کسی بھی پیغمبر کے کسی فعل کو رب تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب نہیں کیا۔ (۲) اللہ کے سچے اور مخلص بندوں کو خدائی قوت حاصل ہوتی ہے' وہ اُس خدائی قوّت سے دیکھتے' سنتے' بولتے اور چلتے پھرتے ہیں جو اُنہیں حاصل ہوتی ہے اور اُن میں یہ قوت وتوانائی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہوتی ہے جیسا کہ حدیثِ قُدسی میں وارد ہوا کہ بندہ (فرائض کی ادائیگی کے بعد) نفل عبادات کرتے کرتے میرے اس قدر قریب ہوجاتا ہے کہ:

كُنْتُ بَصَرُهُ الَّذِىْ يُبْصِرُ بِهٖ وَ سَمْعُهُ الَّذِىْ يَسْمَعُ بِهٖ وَيَدُهُ الَّتِىْ يَبْطِشُ بِهَا وَ رِجْلُهُ الَّتِىْ يَمْشِىْ بِهَا (اربعین امام نووی)

''میں اُس کی نگاہ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے' اُس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے' اُس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ (کسی چیز کو) پکڑتا ہے اوراُس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔''

(۳) جیسا کہ سورۃالفتح کی آیت دہم سے معلوم ہوا' بیعت لینا سنتِ رسول ﷺ ہے۔ (۴) پیغمبر علیہ السلام اُس وقت بولتے ہیں جب اللہ تبارک وتعالیٰ کا اُنہیں حکم ہوتا ہے' اِسی لئے قرآن مجید اور سنتِ نبوی دونوں واجب العمل ہیں۔ غرض کہ محولہ بالا تینوں رچاروں آیات میں رب تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام کو اپنا بندہ ☆ ہونے کی ایک جھلک دکھائی ہے۔

(31)(i) مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ (اَلنَّجم : ۲)

☆ کوئی شک نہیں کہ کائنات کی ہر چیز اور ہر کس وناکس اللہ کا بندہ (عَبْد) ہے لیکن امام القبلتین ﷺ عبد نہیں بلکہ عبدہ' ہیں (بحوالہ سورہ بنی اسرائیل: آیت اوّل وسورۃ الجنّ: آیت:۱۹) عبد اور عَبدُہٗ' میں فرق یہ ہے کہ (۱) عبد وہ ہے جو رضائے الٰہی کا متلاشی ہو جبکہ عَبدُہٗ' وہ ہے جس کی رضا اللہ کی رضا ہو (بحوالہ سورۃ الضُّحیٰ: ۵) (۲) عبد وہ ہے جسے اللہ کا بندہ ہونے پر ناز ہو جبکہ عَبدُہٗ' وہ ہے جس کی عبدیت میں اللہ فخر کرے جیسا کہ ایک حدیثِ قدسی میں وارد ہوا جس میں رب نے فرمایا کہ میں محمد رّسول اللہ کا رب ہوں۔ (۳) عبد وہ ہے جن کی شان کا منبع رب کی ذات ہو عَبدُہٗ' وہ ہے جو رب کی شان کا مظہر ہو۔ (۴) عبد وہ ہے جسے کسی کے لئے پیدا کیا گیا ہو جبکہ عَبدُہٗ' وہ ہے جس کی خاطر دوسروں کو پیدا کیا گیا ہو۔ (۵) عبد وہ ہے جو یہاں بننے کے لئے آیا ہو جبکہ عَبدُہٗ' وہ ہے جو دوسروں کو بنانے کے لئے آیا ہو۔ (۶) عبد وہ ہے جو اللہ سے ملنے کا مشتاق ہو۔ عَبدُہٗ' وہ ہے جس سے ملنے کا اللہ مشتاق ہو (بحوالہ سورہ بنی اسرائیل: آیت اوّل)۔ (۷) عبد وہ ہے جو اللہ کی رحمت تک خود پہنچے۔ عَبدُہٗ' وہ ہے جس کی رحمتِ الٰہی کو تلاش ہو۔ (موسیٰ علیہ السلام پیغامِ الٰہی لینے کے لئے طور پر خود گئے جبکہ قرآن جو سورۃ النّحل کی آیت ۸۹ کی رُو سے رحمت ہے' منتقلہ طور پر حجرہِ رسول ﷺ میں آگیا (۸) عبد وہ ہے جو اپنے ہر عمل کا خود ذمّہ دار ہو۔ عَبدُہٗ' وہ ہے جس کے ہر عمل اور ہر فعل میں رحمتِ الٰہی ذمہ دار ہو۔ (تفسیر نعیمی' جلد ۹' صفحات ۵۱۱' ۵۱۲)

”تمہیں اپنے فیضِ صحبت سے صحابی بنانے والے رسول (ﷺ) نہ (کبھی) راہ بھولے اور نہ (کبھی) راہ سے بھٹکے۔“ (۲ : ۵۳)

(ii) وَ مَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ O (التّکویر : ۲۲)

”اور (اے لوگو!) یہ تمہیں اپنی صحبت سے نوازنے والے محمد (ﷺ) دیوانے نہیں ہیں (جو فرماتے ہیں) وہ حق ہوتا ہے۔“ (۲۲ : ۸۱)

لفظ صَاحِبُكُمْ نازل فرما کر اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے اپنے حبیبِ محتشم کی روشن و تابندہ زندگی کا ہر ہر صفحہ بڑے وضوح کے ساتھ کھول کر رکھ دیا ہے اور بہ بانگِ دہل اعدائے رسول سے سوال کیا ہے کہ وہ میرے رسول کی تمام زندگی میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا ایسا عیب اور ایسی خطا ڈھونڈ کے تو دکھائیں جو رسالت کے منصبِ عالی کے خلاف ہو۔ سورہ یونس میں دشمنوں کو نبی علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے یوں شرم دلائی گئی ہے:۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ O (یونس : ۱۶)

”بے شک میں اِس (قرآن کے اترنے) سے قبل (بھی) تمہارے اندر عمر (کا ایک حصہ) بسر کر چکا ہوں، تو کیا تم (اِتنی) عقل (بھی) نہیں رکھتے؟“ (۱۶ : ۱۰)

أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (کیا تم (اِتنی) عقل (بھی) نہیں رکھتے؟) فرما کر اُن کی فہم و دانش کے دروازے پر (اگر وہ اُن کے پاس ہے) دستک دینے سے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ کہہ کر اُن سے اپنے مشن کی توثیق مانگ رہے ہیں کہ کیا میں تم میں ”صادق و امین“ مشہور نہیں رہا ہوں؟ کیا تمہیں کبھی اس عرصہ کے دوران میرے جھوٹا ہونے کا شائبہ تک ہوا ہے؟ اگر ایسا کبھی نہیں ہوا تو پھر یہ کیا بوالعجبی ہے کہ جب میں نے وحدانیتِ الٰہی کی تبلیغ شروع کی اور تمہارے بتوں کی بہ اعلان مذمت کی تو تم نے مجھے جھوٹا کہنا شروع کر دیا!“

پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صداقت مکّہ مکرّمہ میں ضرب المثل تھی۔ ذیل میں عیسائی فرمانروا ہرقل اور ابو سفیان کے درمیان مکالمے کا کچھ حصہ دیا گیا ہے۔ ابوسفیان اُن دنوں پیغمبر علیہ السلام کی دشمنی میں پیش پیش تھا:

ہرقل : کیا تم نے اُس شخص پر کبھی جھوٹا ہونے کا شک کیا؟
ابوسفیان : نہیں۔
ہرقل : ”کیا وہ شخص کسی سے عہد و پیمان کر کے اُسے توڑ بھی دیتا ہے؟
ابوسفیان : نہیں۔ (”صبح الاعشیٰ“ للقلقشندی)

”آپ ایک ایماندار، راستباز، اپنے گھریلو تعلقات میں خوش کردار اور ناقابلِ گرفت اور اپنے تمام دوستوں میں معزز و مکرّم تھے۔“ ("The Qur'an" Intro. Palmer, p. 19)

''کم آمیز نوجوان کے صاف و شفاف کردار اور قابلِ تعظیم و تکریم رکھ رکھاؤ نے اُن کے دوستوں کی تعریف حاصل کر لی اور آپ متفقہ طور پر ''صادق و امین'' کے القاب کے مستحق ہو گئے۔'' ("Life of Mahomet"... Sir William Muir, p. 20)

''آپ ایک سیدھے سادے، راستباز انسان کے طور پر پہچانے جاتے تھے جس کی زندگی انتہائی پاکیزہ اور نفیس تھی اور جس کی عزت اور وفائے عہد کی صحرائی حس نے اُنہیں ''الامین'' کا لقب دلا دیا۔'' (Lane and Lane-Poole's "Selections from the Kuran", Intro. p. XXXIX)

(32) وَمَا اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (الانبیاء : ۱۰۷)
''ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے'' (۲۱ : ۱۰۷)

اس آیت میں جو جامعیت ہے اُس نے اِسے دیگر آیات سے ممتاز کر دیا ہے۔ جو کمالات اور صفاتِ عالیہ متفرق اور منتشر تھیں، اُن سب کو یہاں یکجا کر دیا ہے۔ اس قسم کی آیات کو پڑھ کر جہاں ایک طرف عبدِ محبوب کے مرتبہ کمال کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف ان کمالات کے بخشنے والے کی شانِ کریمی اور ادائے بندہ نوازی دیکھ کر بے ساختہ دل و زبان سے سبحان اللہ! سبحان اللہ! کی صدا بلند ہوتی ہے۔''

''امام راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ رحمت دو چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ یعنی رحمت اُس رقت کا نام ہے جو اس شخص پر احسان کرنے کا تقاضا کرے جس پر رحمت کی جا رہی ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت میں رقت نہیں کیونکہ وہ اس سے پاک ہے بلکہ صرف تعطف اور احسان ہے اور کہیں صرف رقت ہوتی ہے اور یارائے احسان نہیں ہوتا (المفردات امام راغب)۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو رحمتِ جامعہ یعنی رحمت کے دونوں مفہوموں سے نوازا ہے۔ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ (جس سے تمہیں تکلیف ہوتی ہے وہ چیز میرے محبوب کو بڑی شاق گزرتی ہے: سورۃ التوبۃ : ۱۲۸) میں رقت کا اظہار ہے اور بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ میں شانِ تعطف و احسان کا۔ یعنی ہر دردمند کے درد کا احساس بھی ہے اور ہر درد کا درماں بھی ہے۔ کسی غم زدہ اور دکھ درد کے مارے کو دیکھ کر غایت رأفت سے آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں اور نوکِ مژگاں پر دُرِّ یتیم سے ارجمند تر آنسوؤں کے موتی سراپا التجا بن کر بارگاہِ ربّ العالمین میں گرتے ہیں تو مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں اور غم و اندوہ کی کالی گھٹائیں کافور ہو جاتی ہیں۔''

''آپ خود غور فرمائیے کہ جن افراد نے یا جن قوموں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دامنِ رحمت کو تھاما، آپ کے لائے ہوئے دین کو صدقِ دل سے قبول کیا اور حضور علیہ السلام کے پیش کردہ نظامِ حیات کو اپنی عملی زندگی میں اپنایا، وہ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ گمراہ تھے لیکن اس نورِ مبین سے اکتسابِ نور کرنے کے بعد ظلمت کدہ

عالم میں ہدایت کے چراغ روشن کر گئے۔ جاہل تھے لیکن اس چشمۂ علم و عرفان سے سیراب ہونے کے بعد دنیا کے جس جس گوشہ میں گئے، علم و حکمت کے چمن کھلاتے گئے۔ گنوار اور اُجڈ تھے لیکن پاکیزہ تہذیب و تمدن کے بانی بن گئے۔ جہانگیری و جہانبانی کا ایک اچھوتا تصور دنیا کے سامنے پیش کیا جس میں کسی ایسے بادشاہ کی گنجائش نہیں جو مطلق العنان ہو، جو قانون کی گرفت سے باہر ہو، جو سب کا محاسبہ کر سکے لیکن وہ خود بھی محاسبہ سے آزاد نہ ہو۔''

''لیکن جو لوگ اپنی کج فہمی کے باعث یا بے جا تعصبات میں مبتلا ہو کر اِس چشمۂ صافی سے براہِ راست اور بلا واسطہ سیر کام نہ ہوئے، وہ بھی اس فیضان سے دانستہ یا نادانستہ فیضیاب ہوتے رہے۔ آفتاب کی شعاعیں ہر وادی و کوہسار کو روشن کرتی رہیں حتی کہ وہ مذاہب جن کی بنیاد ہی اصنام پرستی اور شرک پر تھی، وہ بھی اپنے مشرکانہ عقائد میں ترمیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ ہندوستان میں آریہ سماج اور عیسائی دنیا میں پروٹسٹنٹ نظریات کا فروغ اس دعویٰ کی صداقت پر شاہدِ عدل ہیں۔ ملوکیت اور ڈکٹیٹر شپ کے نظام ہائے حکومت کی جگہ جمہوری اور شورائی طرزِ حکومت کی مقبولیت اسلام کے پیش کردہ نظریہ سیاست کی فتح نہیں تو اور کیا ہے؟ اور پھر یہ رحمت کیا کم ہے کہ اپنے فسق و فجور اور کفر و شرک کے باوجود پہلی قوموں کی طرح اُن پر فوری عذاب نازل کر کے اُنہیں نیست و نابود نہیں کر دیا گیا۔''

''یہ تو عالمِ ناسوت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی گوناگوں رحمتوں کا ظہور ہے لیکن صرف یہاں ہی نہیں بلکہ عالمِ ملکوت میں بھی حضور علیہ السلام کی رحمت کا پرچم لہرا رہا ہے اور آپ کا دستِ شفقت گل افشانی کر رہا ہے۔ وہاں رحمتِ محمدی کے ظہور میں جو بانکپن ہے اور بحرِ کرم میں جو مٹھاس اور روانی ہے، اُس کا حال تو فقط وہ نفوسِ قدسیہ ہی جانتے ہیں جنہیں اُس عالم کی سیاحت ارزانی ہوئی ہو۔''

''غرضیکہ یہ وہ آفتاب ہے جس کی تابانیوں سے صرف عالمِ رنگ و بو ہی روشن نہیں بلکہ وہ جہانِ لطیف بھی درخشاں ہے جو رنگ و بو، کم و کیف، بالا و پست کے تعینات سے ماوراء ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہاں اس آفتاب کی نور افشانی کا رنگ ہی نرالا ہے جو نہ زبان پر لایا جا سکے اور نہ قلم سے لکھا جا سکے۔ اس رحمتِ عامہ کی برکتوں سے عقل بھی بہرہ ور ہے اور دل کی دنیا بھی شاد کام ہے۔ ترجمانِ حقیقت شاعرِ مشرق نے کیا خوب کہا ہے:

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے — عقلِ غیاب جستجو، عشق حضور و اضطراب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود — فقرِ جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب

''حضور کریم ﷺ نے اپنی شانِ رحمت سے نقاب سرکاتے ہوئے فرمایا: اِنَّمَا اَنَا رَحْمَۃٌ مُّھْدَاۃٌ یعنی میں وہ رحمت ہوں جو اللہ رب العزت نے اپنی مخلوق کو بطور تحفہ عطا فرمائی۔''

''حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تمام کائنات کے لئے رحمت ہونا اِس اعتبار سے ہے کہ عالمِ امکان کی ہر چیز کو

حسبِ استعداد جو فیضِ الٰہی ملتا ہے وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واسطہ ہی سے ملتا ہے۔'' (ضیاء القرآن' ج ۳' ص ۱۹۲)

اس سلسلہ میں سید محمود احمد آلوسی اپنی تفسیر ''روح المعانی'' کی جلد ۱۷ کے صفحہ ۹۷ پر رقمطراز ہیں :

اِنَّمَا بُعِثَ ﷺ رَحۡمَةً لِّکُلِّ فَرۡدٍ مِّنَ الۡعَالَمِیۡنَ : مَلآئِکَتِھِمۡ وَاِنۡسِھِمۡ وَجِنِّھِمۡ وَلاَفَرۡقَ بَیۡنَ الۡمُؤۡمِنِ وَالۡکَافِرِ مِنَ الۡاِنۡسِ وَالۡجِنِّ فِیۡ ذٰلِکَ وَالرَّحۡمَةُ مُتَفَاوِتَةٌ''

''کائنات کے ہر فرد کے لئے آپ ﷺ یقیناً رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں' خواہ وہ فرشتے ہوں' انسان ہوں یا جنات۔ یہاں مؤمن اور کافر' انسان اور جن میں کوئی فرق نہیں۔ (البتہ اتنا ضرور ہے کہ) رحمت آدمی کے ایمان و عمل میں مقام کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔''

''**محسن انسانیت کا پیغام محبت و امن آج سوالیہ نشان کیوں؟** جس ذاتِ اقدس کی سچائی اور امن پسندی کی گواہی اُس کے جانی دشمن بھی دیتے ہوں' آج چودہ صدیوں بعد اُس کے کلمہ گو افراد آخر کس وجہ سے اس موضوع پر لکھنے' پڑھنے' بولنے اور سننے پر مجبور ہوئے ہیں؟ اگر آپ غور کریں تو ہمیں اس کی دو وجوہات سمجھ میں آتی ہیں: (۱) ہماری داخلی کیفیت (۲) درپیش خارجی صورتِ حال

''داخلی کیفیت سے مراد اہلِ اسلام کی باہمی تفرقہ پروری' مار دھاڑ' قتل و غارت گری اور فساد انگیزی ہے جس میں کم و بیش پورا عالمِ اسلام ہی شامل ہے۔ بین الممالک افتراق ہیں' بین المسالک اختلاف ہیں اور پھر ہر ملک کے اندر رہنے والے لوگ معمولی معمولی مسائل پر درجنوں گروپوں میں نہ صرف تقسیم ہیں بلکہ باہم دست و گریبان بھی ہیں۔''

''خارجی صورتِ حال سے مراد اسلام مخالف قوتوں کی دشمنی' مخالفانہ سازشیں اور عالمگیر منفی پروپیگنڈہ ہے۔ آج جب مسلمان ہر طرف سے غیروں کے ظلم و ستم کا شکار بھی ہو رہے ہیں او ر اُن پر الزام بھی لگ رہا ہے کہ وہ ''دہشت گرد ہیں اور اُن کی تاریخ وحشیانہ مظالم سے بھری پڑی ہے' مسلمان محبت' مروّت اور رواداری کے مفہوم سے آشنا ہی نہیں۔ اسلام جہاں بھی پھیلا' تلوار کے زور پر پھیلا۔'' یورپ اور امریکہ کے دانشور یکے بعد دیگرے کتابیں لکھ رہے ہیں۔ پاپائے روم بینی ڈکٹ کہتا ہے: ''مسلمانوں نے دنیا میں ہمیشہ فتنے برپا کئے ہیں۔'' امریکہ کے پادری اپنے چرچوں کے باہر یہ لکھ کر لگاتے ہیں کہ ''قرآن مسلمانوں کو غیر مسلموں کے قتل پر اکساتا ہے' اس لئے اُسے تلف کر دیا جائے۔'' اُن کی یہ ساری کاوشیں درحقیقت تاریخ کی سب سے بڑی سچائی کو جھٹلانے کے مترادف ہیں۔ بطور اُمت قومی اور ملی سطح پر اور بطور مسلمان انفرادی اور ذاتی سطح پر ان دونوں محاذوں پر پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں اور سازشوں کا توڑ ہر فریق پر واجب ہے۔ یہی وہ بڑا چیلنج ہے جو اس وقت اسلام کو ایک مرتبہ پھر درپیش ہے۔ ''ایک مرتبہ پھر'' اس لئے کہ یہ نیا مسئلہ نہیں ؂

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

(ماہنامہ منہاج القرآن لاہور' جولائی ۲۰۰۸ء' صفحہ ۲۱)

(33) يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّا اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰهُ وَ لٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَاسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَا اَنْ تَنْكِحُوْا اَزْوَاجَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ اَبَدًا اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًاO

(الاحزاب : ۵۳)

''مومنو! نبی مکرم ﷺ کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو سوائے اس کے کہ تمہیں کھانے کے لئے اجازت دی جائے (پھر وقت سے پہلے پہنچ کر) کھانا پکنے کا انتظار کرنے والے نہ بنا کرو' ہاں جب تم بلائے جاؤ تو (اُس وقت) اندر آیا کرو۔ پھر جب کھانا کھا چکو تو فوراً منتشر ہو جایا کرو اور وہاں باتوں میں دل لگا کر بیٹھے رہنے والے نہ بنو۔ یقیناً تمہارا ایسے (دیر تک بیٹھے) رہنا نبی اکرم ﷺ کو تکلیف دیتا ہے اور وہ تم سے (اُٹھ جانے کا کہتے ہوئے) شرماتے ہیں اور اللہ حق (بات کہنے) سے نہیں شرماتا۔ اور جب تم اُن (ازواجِ رسول) سے کوئی چیز مانگو تو اُن سے پردہ کے باہر سے مانگا کرو۔ یہ تمہارے اور اُن کے دلوں کے پاک رہنے کا عمدہ ذریعہ ہے۔ اور تمہیں جائز نہیں کہ تم رسول اللہ (ﷺ) کو کسی طرح بھی تکلیف پہنچاؤ اور نہ یہ کہ آپ کے بعد آپ کی بیویوں سے کبھی نکاح کرو' بے شک یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔'' (۳۳:۵۳)

اذیّت سے مراد نبی محتشم ﷺ کو پریشان کرنا' آپ کے جذبات کو یا جسم کو مجروح کرنا' آپ کی توہین کرنا' آپ سے بدسلوکی کرنا' آپ پر کوئی الزام لگانا یا کسی ناموافق صورتِ حال سے آپ کو دوچار کرنا ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نوعِ انسان کو الٰہی پیغام پہنچانے اور اُنہیں صراطِ مستقیم پر لگانے کے لئے تشریف لائے' اس لئے آپ کی تعظیم وتوقیر کرنا اپنوں کے علاوہ اُن لوگوں پر بھی فرض ہے جنہوں نے آپ کی رسالت کو تسلیم نہیں کیا۔ آیت کے آخری حصہ (کہ آپ کے بعد آپ کی بیویوں سے کبھی بھی نکاح نہ کرو) سے کچھ مفسرین نے حیات النبی ﷺ کو ثابت کیا ہے کیونکہ کسی زندہ آدمی کی منکوحہ اُس کے عقد میں ہوتے ہوئے کسی اور کے نکاح میں نہیں جا سکتی۔ لہٰذا اس عقیدے کی رُو سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام دارالبقاء کو منتقل ہونے کے بعد بھی حیات ہیں اور اِسی وجہ سے لوگوں کو آپ کی ازواجِ مطہرات کے ساتھ نکاح کرنے سے روک دیا گیا ہے۔

اس آیت پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد اسد رقم طراز ہیں :

''نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ کرام کو آپ ﷺ کی تعظیم وتوقیر کرنے کی تاکید کرنے میں قرآنِ حکیم تمام مسلمانوں کو ہمہ وقتی اُس مرتبہ ومقام کی یاددہانی کراتا ہے جو آپ کو اللہ کے ہاں حاصل ہے۔ علاوہ ازیں وہ اُنہیں رویّہ اور وطیرہ کے کچھ اصول بھی بتاتا ہے جو اُن کی زندگی پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ یہ اصول

بادی النظر میں اگرچہ غیر اہم ہیں لیکن اُس سماج میں نفسیاتی قدر کے حامل ہیں جس میں اخوت، باہم روا داری اور ایک دوسرے کے تقدس اور تخلیہ کا احترام ہو۔'' ("The Message of the Qur'an" ... Muhammad Asad, p. 650) Gibraltar, 1980.

آیت سے ماخوذ چند مفید نکات: (۱) کسی کے گھر میں بغیر اجازت داخل نہیں ہونا چاہئے۔ (۲) اگر کوئی کھانے پر بلائے تو اتنا پہلے نہیں پہنچنا چاہئے کیونکہ دعوت کھانا کھانے کی دی گئی ہے نہ کہ کھانا پکنے کی انتظار کی۔ (۳) وقتِ معیّن پر پہنچنا چاہئے تاکہ آمد توقع کے مطابق ہو اور میزبان کو انتظار کی کوفت نہ اٹھانی پڑے۔ (۴) کھانا کھانے کے بعد میزبان سے رخصت کی اجازت لے کر فوراً واپس آجائیں تاکہ اُس کا وقت ضائع نہ ہو۔ (۵) گپ شپ اور فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کریں جو میزبان کے اضطراب اور ناراضی کا باعث ہو۔ (۶) فہم و دانش سے کام لیتے ہوئے مناسب و موزوں رویہ اختیار کریں۔ (۷) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ازواجِ مطہرات سے نکاح کی ممانعت کا ایک پہلو تو احترامِ رسالت ہے لیکن دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ نبی اکرم ﷺ حیات ہیں اسی لئے اُن کی ازواجِ مطہرات سے نکاح کی حرمت کا حکم وارد ہوا کیونکہ کسی زندہ شخص کی منکوحہ اُس کے عقدِ نکاح میں ہوتے ہوئے کسی اور کے نکاح میں نہیں جاسکتی۔

یہ تمام اخلاقی اور سماجی اطرازِ حیات ہیں کہ دوسروں کی عزت کرنا اور اُن سے نفاست و لطافت سے پیش آنا اعلیٰ اخلاقی اقدار ہیں۔'' (عبداللہ یوسف علی، نوٹ: ۳۷۵۵)

اِلَّآ اَنۡ یُّؤۡذَنَ لَکُمۡ (جب تمہیں بلایا جائے تو داخل ہوا کرو) میں بن بلائے مہمان کی بندش ہے۔

(34) يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوۡلُ لَا يَحۡزُنۡكَ الَّذِيۡنَ يُسَارِعُوۡنَ فِى الۡـكُفۡرِ مِنَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِاَفۡوَاهِهِمۡ وَلَمۡ تُؤۡمِنۡ قُلُوۡبُهُمۡ (المائدۃ: ۴۱)

''اے رسول! وہ لوگ آپ کو رنجیدہ خاطر نہ کریں جو کفر میں تیزی (سے پیش قدمی) کرتے ہیں، اُن میں (ایک) وہ (منافق) ہیں جو اپنے منہ سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے حالانکہ اُن کے دل ایمان نہیں لائے۔'' (۵: ۴۱)

فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا اپنے نبی ﷺ کو (يٰٓاَيُّهَا النَّبِىُّ) ''نبی'' کے لفظ سے خطاب کرنا اکثر و بیشتر ہے لیکن پورے قرآن مجید میں (يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوۡلُ) ''رسول'' کے لفظ سے خطاب کرنا دو جگہوں پر آیا ہے: سورۃ المائدۃ کی آیتِ بالا ۴۱ میں اور سورۃ المائدۃ کی آیت ۶۷ میں۔ بہر حال خطاب کسی بھی لقب رسول سے ہو یا نبی سے، دونوں میں آپ کی تعظیم وتوقیر ہے (تفسیر کبیر) کیونکہ پورے قرآن میں یا مُحَمَّد کہیں نہیں آیا۔

آیتِ مذکورہ (۴۱) میں دو طبقات کا ذکر ہے: منافقین اور یہود۔ تاریخ شاہد ہے کہ اِن دونوں طبقات کی ہدایت کے لئے نبی محتشم ﷺ نے اعصاب شکن محنت کی لیکن یہ بات آپ کے انتہائی رنج والم کا باعث تھی کہ اُن میں سے اکثر نے انتہائی غیر خلوص، عیاری و مکاری، سنگدلی اور دل شکن مہمات کا اظہار کیا۔ یہاں اس آیت میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تسلی و تشفی کی جارہی ہے اور حوصلہ دلایا جارہا ہے کہ آپ اُن کی چالوں سے افسردہ خاطر نہ ہوں کیونکہ آپ کے بھیجنے والے اللہ کا دستِ نصرت آپ کے ساتھ ہے جو ہمیشہ آپ کی دستگیری کرتا رہے گا۔

(35) فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ (مریم: ۹۷؛ اَلدُّخان: ۵۸)

''سو بے شک ہم نے اِس (قرآن) کو آپ کی زبان میں ہی آسان کردیا ہے۔'' (۱۹:۹۷ ؛ ۴۴:۵۸)

قرآن کو سمجھنا اور اُسے زبانی یاد کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ ہاں اگر اُسے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبانِ مبارک ادا نہ کرتی اور اگر آپ نے اس کی تعلیم نہ دی ہوتی تو واقعی اُس کا سمجھنا اور حفظ کرنا مشکل ہوتا اور اُس کے معانی ومفہوم کی گہرائیوں تک پہنچنا امت کے لئے خاصا دشوار ہوجاتا۔ اب چونکہ زبانِ رسالت نے اُس کی تلاوت اُمت کے سامنے کردی ہے اس لئے اُس کا سمجھنا اور حفظ کرنا آسان کردیا گیا ہے۔ علمائے حق نے اس بحرِ ذخار میں سے بہ توفیقِ الٰہی ایسے نایاب جواہر اور باریکیاں نکالی ہیں کہ قرآن کے نازل کرنے والے اللہ کو بھی اُن پر ناز ہے۔

(36) وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ (التوبة: ۶۱)

''اور جو لوگ رسول اللہ (ﷺ) کو (اپنی بدعقیدگی، بدگمانی اور بدزبانی کے ذریعے) اذیت پہنچاتے ہیں، اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔'' (۹ : ۶۱)

''اس لئے میدانِ کربلا میں جن لوگوں نے امام پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف جنگ بندی کی اور اُن پر، اُن کے اہل وعیال اور دوستوں پر مظالم ڈھائے، وہ دنیا اور آخرت میں ملعون اور دوزخ کا ایندھن ہیں کیونکہ اُنہوں نے یہ حرکت کرکے سیّدہ زہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قلبِ مبارک کو صدمہ پہنچایا جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دکھ دینے کے مترادف ہے اور جس نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دکھ پہنچایا، اس کے بارے میں سورۃ التوبۃ کے علاوہ سورۂ الاحزاب میں بھی واضح فیصلہ موجود ہے کہ وہ ملعون اور عذاب کا مستحق ہے۔'' (ماہنامہ ''منہاج القرآن''، لاہور، فروری ۲۰۰۷، صفحات ۱۴ تا ۲۰، مضمون نگار: علامہ محمد معراج الاسلام)

(37) وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ، وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗ، (التوبة: ۵۹)

''اور کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ لوگ اس پر راضی ہوجاتے جو اُنہیں اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) نے

یہ آیت اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی مخالفت کرنے والوں کے لئے زبردست تنبیہ ہے اور اس سے سبق یہ ملتا ہے کہ اللہ یا اللہ کے رسول ﷺ کو ناراض کرنا دونوں ایک ہی چیز ہیں جو کفر کا موجب ہے۔ یہ بات توجہ طلب ہے کہ اس دنیا میں معزز ترین رشتہ والدین کا ہے اور اُن کی نافرمانی اور بے ادبی بلاشک وشبہ گناہِ کبیرہ ہے لیکن کفر نہیں ہے۔ جبکہ اس کے برعکس نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی معمولی سی بے ادبی بھی گستاخ کو کافر بنا دیتی ہے۔

یہ بات بھی خاصی اہمیت کی حامل اور توجہ طلب ہے کہ اللہ کا گستاخ بھی کافر ہے اور اُس کا قتل واجب ہے لیکن وہ نادم اور تائب ہو تو اُس کی توبہ قبول کر لی جائے گی اور اُسے معاف کر دیا جائے گا۔ اس کے برعکس اگر کوئی (معاذ اللہ) رسول ﷺ کی گستاخی کرنے کا مرتکب ہو، وہ بھی بالیقین کافر ہے اور اُس کا توبہ کرنا اُسے موت کی سزا سے نہیں بچا سکے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حق اللہ توبہ کرنے سے معاف ہو جاتا ہے لیکن حق العبد (یعنی حق رسول ﷺ) توبہ کرنے سے معاف نہیں ہوتا۔ (دُرّ المختار: باب المرتدین)

عبداللہ بن ابی سرحہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کاتبِ وحی تھا جو نازل شدہ وحیِ قرآن لکھا کرتا تھا۔ بعد میں وہ مرتد ہو گیا اور امام الانبیاء ﷺ پر یہ الزام لگایا کہ قرآن محمد (علیہ السلام) کی ذاتی اختراع ہے۔ اُس نے دعویٰ کیا کہ آپ کا کاتب ہونے کی حیثیت سے اُسے معاملے کی پوری طرح واقفیت ہے۔ جب وہ مر گیا اور اُسے دفن کیا گیا تو قبر نے اُس کی لاش کو باہر اُگل دیا۔ اُس کی قبر کئی مرتبہ گہری سے گہری کھودی گئی لیکن زمین نے اُسے قبول نہ کیا اور ہر دفعہ اُس نے اُسے باہر اُگل پھینکا۔

(40) لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝ (اَلقیامۃ : ۱۶ تا ۱۹)

"(اے حبیبِ محتشم!) آپ (قرآن کو یاد کرنے کی) جلدی میں (نزولِ وحی کے ساتھ) اپنی زبان کو حرکت نہ دیا کریں۔ بے شک اُسے (آپ کے سینہ میں) جمع کرنا اور اُسے (آپ کی زبان سے) پڑھانا ہمارا ذمہ ہے۔ پھر جب ہم اُسے (زبانِ جبریل سے) پڑھ چکیں تو آپ اِس پڑھے ہوئے کی پیروی کیا کریں۔ پھر بے شک اُس (کے معانی) کا کھول کر بیان کرنا ہمارا ہی ذمہ ہے۔" (۷۵:۱۶-۱۹)

نزولِ وحی کے دوران آپ ﷺ اس خیال سے کہ کہیں یہ الفاظ ذہن سے نکل نہ جائیں، خود بھی جلدی جلدی انہی کو دہرانے لگتے تھے جس سے آپ کو کوفت کا سامنا ہوتا تھا۔ رب تعالیٰ سے آپ کی یہ کلفت اور کوفت برداشت نہ ہوئی اور حکم ہوا کہ آپ نزولِ وحی کے وقت بس سکون وخاموشی سے سنتے رہا کیجئے اور یہ اندیشہ بھی دل میں نہ لائیے کہ وحی کا کوئی خفیف سا جزو بھی قلب سے نکل جائے گا۔ اس کی محفوظیت کے ذمہ دار تو ہم خود ہیں۔ آپ جبریلِ امین کے پڑھنے کی طرف متوجہ ہو جایا کیجئے اور اُس کے دہرانے کی فکر میں نہ رہئے۔ قرآن کو آپ کے سینہ میں جمع کرنا اور آپ کو اس کا پڑھانا ہمارا ذمہ ہے۔

حق تعالیٰ نے اسنادِ مجازی کے طور پر یہاں فرشتۂ وحی کے سنانے کو اپنے ہی سنانے سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ آیت جبریل علیہ السلام کے شرفِ عظیم پر دلالت کرتی ہے۔ ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ایسی متعدد آیات ہیں جن میں رب تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کے فعل کو اپنا فعل قرار دیا ہے۔ مثالیں گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہیں۔

مفسرین کرام نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت جبریل دوبارہ آپ کے پاس آئیں اور آپ کے سامنے اُن آیات کو پڑھیں اور آپ سن کر اُنہیں دہرائیں حتیٰ کہ آپ کو وہ آیات حفظ ہو جائیں۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ اے حبیبِ محتشم! ہم یہ آیات آپ سے اس طرح پڑھوائیں گے کہ آپ اُنہیں نہیں بھولیں گے جیسا کہ سورۃ الاعلیٰ میں فرمایا:

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى O (الاعلیٰ: ۶)

"ہم عنقریب آپ کو (خود) ایسا پڑھائیں گے کہ آپ (کبھی) نہیں بھولیں گے۔" (۸۷ : ۶)

یہ چاروں آیات منکرینِ حدیث پر ضربِ کاری ہیں۔ منکرین کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام پر صرف قرآن نازل کیا ہے' قرآن کے علاوہ اور کچھ بھی نازل نہیں کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ حدیث لٹریچر میں پائی جانے والی قرآن سے متعلق تفسیر وتشریح پیغمبر علیہ السلام کی ذاتی رائے ہے اور اُس کا قرآنی تشریح سے کوئی تعلق نہیں۔ ساجی ضرورتوں اور وقت کے حالات کی روشنی میں آپ نے جو کچھ قرآن کو سمجھا وہ لوگوں کو بتا دیا۔ اب چودہ صدیاں گزرنے کے بعد انسانی کارواں اُس نقطے تک پہنچ گیا ہے جس کا پہلے کبھی تصوّر بھی نہ ہوا تھا اور زمانے کی ضروریات بالکل بدل چکی ہیں۔ اُن کا اِصرار ہے کہ ان بدلتے ہوئے حالات کے تحت قرآن کے معانی اور مفہوم کو اُس پسماندہ اور ناخواندہ زمانے کے اندر محدود کر دینا قرآن کے ساتھ بڑی ناانصافی کی بات ہے۔ سائنس اور علم کی ترقی کے اِس دَور میں مسلم اُمّت کے ساتھ اس سے بڑھ کر دشمنی نہیں ہوسکتی کہ اُس زمانہ میں کی گئی قرآنی تفسیر کا اُسے پابند کر دیا جائے اور اس طرح قومی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی جائیں۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ محولہ بالا قرآن کی انتہائی مختصر اور جامع آیت ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ' (اُس (کے معانی) کا کھول کر بیان کرنا ہمارا ہی ذمّہ ہے) نے حدیث اور سنت کی اتباع کے خلاف اعتراضات کی کلّی طور پر جڑ کاٹ کے رکھ دی ہے۔

رب تعالیٰ کے فرمان کا دراصل مقصد یہ ہے کہ اے حبیبِ مکرّم! (۱) آپ کو قرآن کا حفظ کرانا ہمارا ذمّہ ہے۔ (۲) آپ کے سینہ میں اس کا جمع کرنا بھی ہمارا ذمہ ہے۔ (۳) اس کی وضاحت آپ سے کرانا بھی ہماری ذمّہ داری ہے۔ ہم نے اپنے اوپر یہ ذمہ داری لے لی ہے کہ آپ کو قرآنی کا معنیٰ ومفہوم' اُس کے مخفی

حکمِ الٰہی کے تحت صحابہ کرام کا عمل تھا (بحوالہ سورۃ النساء: ۶۴) (۲) صدقہ وخیرات بھی ایک قسم کی عبادت ہے لیکن ان کی قبولیت بھی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وسیلہ سے ہوتی ہے۔ (۳) اللہ تعالیٰ اور اُس کا رسول ﷺ ہم پر اس سے زیادہ مہربان ہیں جتنا ہم اپنے آپ پر ہیں۔ (۴) اُن خطا کاروں نے اپنے تمام مال ومتاع پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں پیش کر دیئے تھے کہ وہ اُنہیں راہِ خدا میں تقسیم کر دیں لیکن رسول اللہ ﷺ نے صرف اُس مال کا تہائی حصّہ قبول فرمایا اور دو تہائی اُنہیں واپس کر دیا۔ یہ نکتہ قرآنی الفاظ مِنْ اَمْوَالِهِمْ (اُن کے مالوں میں سے) سے ماخوذ ہوا۔ (۵) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہر مسلمان کو گناہوں کی آلودگی سے پاک وصاف فرماتے ہیں۔ (۶) اُن کے حق میں آپ ﷺ کی دعا اُن کے سکون اور راحت کا ذریعہ ہے۔ (۷) اللہ تبارک وتعالیٰ قادرِ مطلق اور خود مختار ہستی ہونے کے حوالے سے پیغمبر علیہ السلام کے وسیلہ کے بغیر بھی اُن خطا کاروں کو بخش سکتا تھا لیکن اپنے محبوبِ محتشم ﷺ کے مرتبہ ومقام کو بڑھانے کے لئے حکم ہوا کہ آپ مجھ سے اُن کی بخشش کی دعا اور التجا کریں تو میں اُنہیں بخش دوں گا۔

(42) سورۃُ الحج میں خاتم النّبیّین ﷺ کے لئے الٰہی امداد کی پُرزور یقین دہانی کرائی گئی ہے اور اس طرح آپ کے مشن کے پکے دشمنوں اور حاسدوں کی فریبانہ چالوں کو ناکام بنا دینے کا مژدہ سنایا گیا ہے :

مَنْ كَانَ يَظُنُّ أَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ○ (الحج : ۱۵)

''جو شخص یہ خیال کرے کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اپنے رسول کی مدد نہیں کرے گا تو اُسے چاہئے کہ ایک رسی آسمان تک تان لے پھر اُس (سلسلہ رسی) کو کاٹ دے' تو غور کرنا چاہئے کہ کیا اُس کی تدبیر اُس کی ناگواری کی چیز کو موقوف کرا سکتی ہے۔'' (۱۵ : ۲۲)

حاصل کلام یہ ہے کہ نصرتِ الٰہیہ آپ ﷺ کے ساتھ وحی ونبوت کی وجہ سے ہے' تو آپ کی ناکامی کی کوشش کرنا تب مفید ہو سکتی ہے جب اس نبوت اور وحی کے قصہ کو پاک کر دیا جائے اور یہ محال بالذات ہے۔ تو اے دشمنانِ رسول! میرے محبوب علیہ السلام کے بارے میں تمہارے حاسدانہ عزائم پھلنے پھولنے کے نہیں۔ میں اپنے پیغمبرِ برحق کی بہرصورت ضرور بالضرور مدد کرتا رہوں گا اور بالآخر اُنہیں فوز وفلاح سے ہمکنار کر کے رہوں گا۔ اے حاسدین! اُس وقت کے آنے سے پہلے جس میں تم حسد وعناد کی آگ میں جل بھُن جاؤ' تمہارے لئے خودکشی کر لینا بہتر ہے؟ سبحان اللہ! کیا معجزانہ اور بلیغانہ انداز ہے محبوب کے مقامِ عظیم کو اجاگر کرنے کا اور دشمنوں کو خاموش کرانے کا!!

(43) عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ○ (التوبۃ)

''اللہ نے آپ سے درگزر فرمایا ہے' آپ نے اُنہیں رخصت ہی کیوں دی (کہ وہ شریکِ جنگ نہ ہوں) یہاں تک کہ وہ لوگ (بھی) آپ کے لئے ظاہر ہو جاتے جو سچ بول رہے تھے اور آپ جھوٹ بولنے والوں کو (بھی) معلوم فرما لیتے۔'' (۴۳ : ۹)

منافقین بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر جہاد میں شرکت نہ کرنے کے لئے عذر بیان کرتے۔ آقائے ہر جہاں ﷺ اپنی کریم النفسی کے باعث اُنہیں پیچھے رہنے کی اجازت فرما دیتے حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اگر اُنہیں رخصت نہ دی جاتی تو بھی وہ تبوک کی اِس مہم میں شرکت سے انکار کر دیتے۔ بہتر یہی تھا کہ اُن کی معذرتوں کو ٹھکرا دیا جاتا تاکہ جب وہ پیچھے رہ جاتے تو اُن کے نفاق کا حال سامنے آجاتا۔ یہ دریافت کرنے سے پیشتر کہ اے محبوب! تو نے اُنہیں پیچھے رہنے کی اجازت ہی کیوں دی یعنی اُنہیں ننگا کیوں نہ ہونے دیا؟ اِتنا فرمانے سے پہلے عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ کے الفاظ ارشاد فرمائے۔ یہاں یہ کلمات کسی گناہ کی معافی کے لئے نہیں بلکہ اظہارِ تعظیم و تکریم کے لئے ہیں جیسا کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: إِنَّ ذٰلِكَ يَدُلُّ عَلٰى مُبَالِغَةِ اللّٰهِ فِيْ تَعْظِيْمِهٖ وَتَوْقِيْرِهٖ یعنی اِن کلمات سے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب علیہ السلام کی تعظیم و توقیر میں بڑے مبالغہ کا اظہار فرمایا ہے۔ (تفسیر کبیر)

''عصمتِ انبیاء کے منکرین نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ انبیاء سے (معاذ اللہ) گناہ کا صدور ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ معاف کرنا گناہ کی فرع ہے۔ اگر آپ (ﷺ) نے کوئی گناہ نہیں کیا تو پھر معاف کرنے کا کیا معنیٰ ہوا؟ حضرات قتادہ اور عمرو بن میمون رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نبی ﷺ نے دو کام بغیر وحی کے کیے تھے: ایک تو منافقین کو غزوہ تبوک میں شریک نہ ہونے کی اجازت دی اور دوسرا کام یہ کیا کہ آپ نے بدر کے قیدیوں سے فدیہ لیا۔''

''امام رازی نے اس اعتراض کے دو جواب دیے ہیں: (۱) عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ (اللہ آپ کو معاف فرمائے!) کلامِ عرب میں تعظیم اور تکریم کا کلمہ ہے جسے کلام کے ابتدا میں ذکر کیا جاتا ہے اور جو شخص متکلم کے نزدیک بہت معظم اور مکرم ہو اُس کے متعلق وہ کہتا ہے کہ ''اللہ آپ کو معاف فرمائے' آپ نے میرے معاملہ میں کیا کیا ہے؟'' یا ''اللہ آپ سے راضی ہو میری بات کا کیا جواب ہے؟'' لہٰذا عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ نے کوئی گناہ کیا ہو۔ (۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ کا منافقین کو جہاد میں شامل نہ ہونے کی اجازت دینا آیا گناہ تھا یا نہیں؟ اگر یہ گناہ نہیں تھا تو یہ کیوں فرمایا کہ اللہ نے آپ کو معاف فرما دیا؟ خلاصہ یہ کہ یہ فرمانا گناہ کو مستلزم نہیں' لہٰذا اس قول کو ترکِ اولیٰ اور ترکِ اکمل پر محمول کیا جائے گا۔'' (تفسیر کبیر' جلد ۶' ص ۵۸)

''علامہ سمرقندی نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ اگر کلام اس طرح شروع ہوتا کہ آپ نے اُنہیں کیوں اجازت دی؟ تو اس کا اندیشہ تھا کہ اس کلام کی ہیبت سے آپ کا قلب شق ہو جاتا۔ اس لئے رب تعالیٰ نے اپنی رحمت کے حوالے سے فرمایا: ''اللہ آپ کو معاف کرے!'' تاکہ آپ کا قلبِ مبارک مطمئن اور پُرسکون رہے۔ اس کے بعد اصل سوال کیا کہ آپ نے اُنہیں اجازت کیوں دی؟ اس اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نبیِ اکرم ﷺ کا بہت بڑا مرتبہ ہے۔'' (تبیان القرآن' ج ۵' ص ص ۱۴۶' ۱۴۷' بحوالہ ''الشفاء'')

علامہ سید محمود آلوسی حنفی (م ۱۲۷۰ھ) لکھتے ہیں :

معافی مانگ لیں اور اُس کی شفاعت کے مستحق ہو جائیں۔ چنانچہ اُسی وقت ایک ہزار منافق اُس قمیص کی برکت اور قمیص والے کے حسنِ اخلاق سے مشرف بہ اسلام ہوا (تفسیر کبیر)۔ جو ڈوب چکا تھا وہ تو ڈوب ہی چکا تھا لیکن ہزاروں ڈوبتے ہوؤں کو تو بچا لیا۔ جب وہ مر گیا تو اُس کا بیٹا جو مخلص مسلمان تھا حاضر ہوا اور اپنے باپ کی موت کی اطلاع دی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: جاؤ اور اُس کا جنازہ پڑھ کر اُسے دفن کر آؤ۔ اُس نے عرض کی: حضور خود کرم فرمائیں۔ اُس پیکرِ عفو و عنایت نے نہ نہیں کی۔ اُٹھے اور اس کی نمازِ جنازہ پڑھنے کے لئے روانہ ہونے لگے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پھر گزارش کی: یا رسول اللہ! اللہ اور رسول کے اِس دشمن کی نمازِ جنازہ نہ پڑھئے۔ اُس وقت سورۃ التوبہ کی آیت ۸۴ نازل ہوئی اور جبریل علیہ السلام نے حضور علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنایا: ''اے نبی مکرم! اُن میں سے جو مر جائے اُس کی نمازِ جنازہ کبھی نہ پڑھئے اور نہ ہی اُس کی قبر پر کھڑے ہوں۔''

<u>عبداللہ بن اُبی کے کفن کے لئے قمیص عطا فرمانے کی وجوہ</u>: عبداللہ بن اُبی منافقوں کا سردار تھا۔ پھر اس کی کیا وجہ تھی کہ آپ ﷺ نے اُسے اپنی قمیص عطا فرمائی۔ علماء کرام نے اس کے متعدد جواب دیئے ہیں: (۱) جنگِ بدر میں جب حضرت عباس جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے گرفتار ہوئے تو اُن کی اپنی قمیص پھٹ گئی تھی۔ حضور علیہ السلام نے اُنہیں قمیص پہنانا چاہی کیونکہ عباس دراز قامت تھے۔ عبداللہ بن اُبی کا قد بھی بڑا لمبا تھا' اس لئے اُس کی قمیص کے سوا اور کوئی قمیص اُنہیں پوری نہ آئی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے چاہا کہ اُس کا یہ احسان دنیا ہی میں اتار دیا جائے۔ (صحیح بخاری) (۲) اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول علیہ السلام کو یہ تعلیم دی تھی کہ کسی سائل کو نہ جھڑکئے (سورہ الضحیٰ: ۱۰) اس لئے حضور علیہ السلام نے اُس کے سوال کو رَدّ نہ کیا۔ (۳) سب سے بڑی وجہ وہی تھی جو حضور علیہ السلام نے خود بیان فرمائی کہ اس قمیص کی وجہ سے اللہ ایک ہزار منافقوں کو دولتِ ایمان سے مالا مال کرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

باقی رہا یہ سوال کہ عبداللہ بن اُبی کا نفاق مشہور تھا پھر آپ نے اُس کی نمازِ جنازہ پڑھانے میں کیوں رغبت کی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات مقرر ہے کہ جب منافق ایمان کا اظہار کرنے تو ان میں کفر کے باوجود اُس پر اسلام کے احکام جاری کئے جاتے ہیں اور اُس کی نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے کیونکہ احکامِ شرعیہ ظاہر حال پر مبنی ہیں۔ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ہم ظاہر پر حکم لگاتے ہیں اور باطن کا معاملہ اللہ کی طرف مفوّض ہے اور ابن اُبی کے معاملہ میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: میری قمیص اور میری نماز اُس سے اللہ کے عذاب کو دُور نہیں کر سکتی اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے سبب سے اُس کی قوم کے ایک ہزار آدمیوں کو مشرف بہ اسلام کرے گا۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ نبی اکرم ﷺ نے حصولِ مغفرت کے لئے اُس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھائی تھی۔ آپ پر اعتراض تب ہوتا جب آپ حصولِ مغفرت کے لئے اس کی نمازِ جنازہ پڑھاتے۔ (تبیان القرآن۔۔ علامہ غلام رسول سعیدی' ج ۵' ص ص ۲۱۲' ۲۱۳)

گستاخانِ رسول نے اس آیت سے یہ استنباط کیا کہ نبی علیہ السلام کی دعا (معاذ اللہ) غیر مقبول ہے۔

مؤلف انسائیکلو پیڈیا بجا طور پر یہ سمجھتا ہے کہ اس دعا کے قبول نہ فرمانے میں محبوب علیہ السلام کی انتہائی عظمت کا اظہار ہے۔ وہ منافقین اللہ کے محبوب اور اُس کے محبوبین یعنی صدیق و عمر اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم وغیرہ کے منکر تھے اور اُن کے خلاف باتیں کرنے میں ادب کا دامن اُنہوں نے جھٹک دیا تھا۔ اس لئے فرمایا کہ پیارے! اُنہیں معاف کرنے اور اپنی جنت سے نوازنے کو میری غیرت گوارا نہیں کرتی۔ پیارے! تجھے تو میں نے رَحْمَةً لِّلْعالَمِین کا سہرا پہنا کر بھیجا ہے' لہٰذا منافقین کے لئے دعائیں فرمانا تیری رحمتِ غیر اختیاری کا تقاضا ہے۔ تیرے دربارِ عالی میں جو بھی طالبِ دعا آتا ہے تو اُسے محروم نہیں فرماتا اور اُن کے لئے تیرے ہاتھوں کا اُٹھ جانا شرعاً ممنوع بھی نہیں کیونکہ شریعت ظاہر پر ہے اور وہ لوگ بہ ظاہر مسلمان بھی ہیں۔ پیارے حبیب! اگر وہ صرف میرے مجرم اور میرے گستاخ ہوتے' بے نماز ہوتے اور توبہ کرتے تو ہم معاف کر بھی دیتے لیکن وہ تو تیرے مجرم ہیں لہٰذا اُن کی مغفرت نہیں کروں گا۔ بعض اوقات ترکِ امر میں ادب ہوتا ہے مثلاً میرا استاد کہے کہ سرہانے بیٹھ جاؤ مگر میرا نہ بیٹھنا عین ادب ہے نہ کہ نافرمانی۔ لہٰذا آیت میں عتاب نہیں بلکہ شانِ محبوبی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ تو اپنی مخلوق پر بہت مہربان اور رحیم وکریم ہے اور اپنی رحمت کے باعث وہ اپنے حقوق کی عدم ادائی کو معاف کر دیا کرتا ہے لیکن وہ اپنے پیغمبر کے حق میں معمولی سی بے ادبی یا ایذا کو ہرگز برداشت نہیں کرتا۔ سورۃ النّحل کی درج ذیل آیات اس اہم نکتے کی وضاحت کر رہی ہیں:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ○ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ○ (اَلنّحل: ۱۱۲' ۱۱۳)

"اور اللہ ایک بستی والوں کی مثال بیان کرتا ہے کہ وہ امن واطمینان میں رہتے تھے' اُن کے کھانے کا سامان بہ فراغت اُن کے پاس ہر طرف سے آتا رہتا لیکن اُنہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی' اس پر اللہ نے اُنہیں اُن کے کرتوتوں کے سبب ایک محیط قحط اور خوف کا مزہ چکھایا۔ اور بے شک اُن کے پاس اُنہی میں سے ایک رسول آیا تو اُنہوں نے اُسے جھٹلایا پس اُنہیں عذاب نے آ پکڑا اور وہ ظالم ہی تھے۔" (۱۱۲' ۱۱۳: ۱۶)

آیت میں قَرْيَةً سے مراد شہرِ مکہ ہے جو نبی علیہ السلام کو وہاں سے نکال دینے کی وجہ سے سالوں قحط کا شکار رہا۔ آیت میں رسول سے مراد نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ ستودہ صفات ہے۔ جُوع (بھوک) مکہ کے سات سالہ زبردست قحط کا نتیجہ تھی اور کفارِ مکہ کے سروں پر ہر وقت یہ خطرہ منڈلاتا رہتا تھا کہ بس اب گئے سو گئے۔ سبحان اللہ! اُس فخرِ ہر جہاں ﷺ کی مکہ میں دوبارہ آمد سے مکہ مکرمہ میں پھر سے خوشحالی اور شادمانی کی بہار آ گئی!

آیت سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ دنیوی نعمتوں کی ناشکری بھی عذاب کا مستحق بنا دیتی ہے۔ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ کی بات اہلِ مکہ کے حق میں اُن کے انکارِ رسول کی پاداش میں پوری ہو کے رہی۔ مکہ میں شدید قحط پڑا' جانور مرنے لگے اور آدمی جان سے گزرنے لگے۔ مکہ بالآخر مسلمانوں ہی کے ہاتھ پر فتح ہوا اور قریش کے بڑے بڑے سرداروں کا سرنگوں ہوا۔

بھی فرمایا۔ افسوس کہ قرآن کا یہ حکم آج مسلمانوں نے بھلا دیا ہے۔ دنیاوی مصلحتوں کی ڈوری میں بندھے ہوئے ہمارے مسلمان حاکم اپنے آقاؤں کی خوشنودی کے لئے دہریوں، کافروں اور دشمنانِ اسلام کی قبروں پر جاتے بھی ہیں اور وہاں پھول چڑھا کر اُن مُردوں کی تعظیم و توقیر بھی کرتے ہیں۔ اللہ کی رحمت آئے تو کیسے آئے!!

آیت کے آخری حصّے میں ان ممانعتوں کی وجہ بیان کی جا رہی ہے کہ اگرچہ وہ زبانی طور پر مسلمان محسوس ہوتے ہیں لیکن فی الحقیقت وہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے منکر اور پکے کافر ہیں اور کفار کے لئے نہ تو دعائے مغفرت جائز اور نہ ہی اُن کی قبروں پر جانا جائز۔ وَرَسُوْلِہٖ کے لفظ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کی عظمت و رفعت کا انکار رب تعالیٰ کا انکار ہے۔ منافقین کے فسق سے مراد اُن کا رسول آزار ہونا اور مسلم آزار ہونا ہے۔

یہاں زیرِ نظر آیت میں بھی خالقِ لم یزل نے محبوب علیہ السلام کی عالی مرتبتی اور رعلوّ منصب کا خوب خوب خیال رکھا اور یہ آیت دراصل اپنے محبوب علیہ السلام کی نعت و توصیف ہے۔ منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے اور اُن کی قبروں پر جانے کی ممانعت سے یہ بتا دیا کہ اے رحمتِ عالمیان کی چادر اوڑھنے والے! یہ ہو نہیں سکتا کہ تو کسی کی مغفرت کے لئے ہمارے حضور لب کشا ہو اور ہم اُسے قبول نہ فرمائیں لیکن پیارے! ہم اُنہیں بخشنا نہیں چاہتے کیونکہ وہ زندگی بھر تیرے درپئے آزار رہے ہیں۔ چنانچہ آپ کو اُن کی نماز جنازہ جو دعائے بخشش ہی ہوتی ہے، سے روکنا اپنے محبوب علیہ السلام کی عظمت و رفعت کی جلوہ گری کا ایک ناقابلِ تردید رُخ ہے۔ اسی طرح رب نے یہ بھی نہیں چاہا کہ میرے پیارے رحمتِ عالمیان کے اُن کی قبروں کے پاس سے گزرنے کی وجہ سے میں اُن کے عذاب میں کمی کر دوں۔ چنانچہ منافقین اور کفار کی قبروں پر عذاب کو پوری شدّت کے ساتھ برقرار رکھنے کے لئے اپنے محبوبِ محتشم کو وہاں جانے سے روک دیا کہ پیارے! تیرے وہاں جانے سے اُن کی قبروں پر برستے ہوئے میرے قہر و غضب میں کہیں کمی نہ آجائے۔ میری رحمت اور لطف و کرم کی برکھا تو اُن پر برستی ہے جنہوں نے اپنی زندگیاں اور اُس کی ساری رعنائیاں تجھے خوش کرنے کے لئے تجھ پر وار ڈالیں۔ جو تیرے ہو چکے وہی میرے ہیں۔ جو تیرا نہیں میرا اُس سے کیا تعلق؟ سبحان اللہ! کیا شانِ بندہ پروری ہے اور اس عتاب میں بھی جو شانِ دلبری پنہاں ہے، وہ محبوب جانے اور اُسے رحمۃ للعالمین کی خلعتِ فاخرہ اُڑھانے والا جانے۔

(46) عَبَسَ وَتَوَلّٰۤی ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ۝ وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰۤی ۝ اَوْ یَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی ۝ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ۝ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ۝ وَمَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّكّٰی ۝ وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰی ۝ وَهُوَ یَخْشٰی ۝ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی ۝ (عَبَس: ۱ تا ۱۰)

''چیں بہ جبیں ہوئے اور منہ پھیر لیا (بایں وجہ کہ) اُن کے پاس ایک نابینا آیا اور آپ کیا جانیں شاید وہ پاکیزہ تر ہو جاتا یا نصیحت قبول کر لیتا اور اُسے نصیحت کرنا فائدہ ہی پہنچاتا، سو جو شخص (دین سے) بے پروائی کرتا ہے آپ اُس کی تو فکر میں پڑ جاتے ہیں حالانکہ آپ پر کوئی الزام نہیں اگر وہ نہ سنورے، اور جو شخص آپ کے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ خشیتِ (الٰہی) رکھتا ہے تو آپ اُس سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔'' (۸۰ : ۱ تا ۱۰)

واقعہ یوں ہوا کہ ایک مرتبہ ختمی مرتبت ﷺ بڑی دلسوزی اور محویت سے مکہ کے مشرک سرداروں (ابو جہل، عتبہ، شیبہ پسرانِ ربیعہ، امیہ بن خلف، ولید بن مغیرہ وغیرہ) کو اس امید میں تبلیغ اسلام فرما رہے تھے اور انہیں کفر و شرک کے اندھیروں سے نکالنے کی سعی فرما رہے تھے کہ وہ اسلام قبول کر لیں گے۔ "حَرِيصٌ عَلَيْكُم" کی شان اپنے پورے جوبن پر تھی۔ دریں اثنا عبداللہ ابنِ اُمِّ مکتوم رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے۔ نابینا ہونے کی وجہ سے محفل کا رنگ نہ دیکھ سکے۔ انہوں نے اپنے شوقِ فراواں سے مجبور ہو کر آتے ہی عرض کی: يَا رَسُوْلَ اللهِ اَعَلِّمْنِيْ مِمَّا عَلَّمَكَ اللهُ" (اے اللہ کے رسول! جو اللہ نے آپ کو سکھایا، اُس میں سے مجھے بھی سکھایئے)

یہ مداخلتِ بے جا حضور علیہ السلام کو پسند نہ آئی۔ رخِ انور پر ناگواری کے آثار نمایاں ہوئے، جبینِ سعادت پر شکن پڑ گئے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ گوارا نہ ہوا۔ اُس وقت درجِ بالا آیات نازل ہوئیں۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ یہاں ایک سوال اٹھاتے ہیں، پھر خود ہی اُس کا جواب دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ غلطی حضرت عبداللہ سے ہوئی تھی۔ حضور علیہ السلام کفار کو دعوتِ اسلام دے رہے تھے۔ جناب عبداللہ نے قطع کلام کرتے ہوئے اپنی بات چھیڑ دی۔ نیز ایک کافر کو دعوتِ اسلام دینا ایک مسلمان کو قرآن کی تعلیم دینے سے مقدّم ہے۔ آدابِ مجلس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ جو سلسلۂ کلام پہلے شروع ہے، وہ ختم ہو جائے تو نئی بات چھیڑی جائے۔ عبداللہ پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے اُن کے پاس بے شمار مواقع تھے۔ بہ ظاہر غلطی جنابِ عبداللہ کی ہے کہ اُنہوں نے مجلسِ نبوّت کے آداب کا پاس نہ رکھا۔ نیز حضور علیہ السلام اپنے کسی ذاتی کام میں مصروف نہ تھے بلکہ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ کے حکم کی تعمیل میں مشغول تھے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ عبداللہ کو سرزنش کی جاتی کہ اُنہوں نے فرائضِ نبوت کی ادائیگی میں مداخلت کیوں کی ہے لیکن اُن کی بجائے اپنے محبوب کریم کو تنبیہ فرما دی کہ آپ نے ناگواری کا اظہار کیوں کیا اور اُس سے بے رُخی کیوں برتی۔ اس میں کیا حکمت ہے؟" ان تمام باتوں کے پیشِ نظر عتاب حضرت عبداللہ کو ہونا چاہیے تھا۔ حضور علیہ السلام کو عتاب کرنے میں کیا حکمت ہے؟

"امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ ساری باتیں بجا ہیں اور عتاب کی اس کے بغیر کوئی حکمت نہیں کہ وہ کفار جو اُس وقت حاضر تھے، وہ مکہ کے سردار اور دولتمند لوگ تھے، اُنہیں اپنی اس برتری کا احساس بھی تھا اور اُس پر اُنہیں گھمنڈ بھی تھا۔ اُن کی موجودگی میں اپنے کسی نیاز مند کے ساتھ یہ بے اعتنائی عام لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر سکتی تھی کہ یہ بے رُخی، تبلیغ میں انہماک کی وجہ سے نہیں برتی گئی بلکہ محض ان لوگوں کی دولت و ثروت اور اُن کی ریاست کی وجہ سے اُن کی پاسداری کی گئی ہے اور عبداللہ کو محض اس وجہ سے نظر انداز کیا گیا ہے کہ وہ غریب عوام کا ایک فرد ہے اور جس نبی کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہی غریب نواز بنا کر ہو اور جس کا مقصدِ اوّلیں ہی شکستہ دلوں اور غمزدوں کی دلجوئی اور دل داری ہو اور جو تشریف ہی اس لئے لایا ہو کہ فقراء و مساکین کی عزت افزائی کرے، اُس ہستی سے کسی ایسی بات کا صدور جس سے اُس کے منصبِ رفیع کے خلاف کوئی واہمہ پیدا ہو سکے، اللہ تعالیٰ کو ہرگز گوارا نہیں۔"

نے منہ پھیر لیا) یعنی غیاب کے پردے میں عتاب کیا گیا ہے کیونکہ رُوبرو عتاب خاطرِ عاطر پر بہت گراں گزرتا۔''

''ان آیات کے نزول کے بعد نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں جب حضرت عبداللہ حاضر ہوتے تو حضور علیہ السلام فرماتے: مَرْحَبًا بِمَنْ عَاتَبَنِیْ رَبِّیْ (خوش آمدید! اے وہ شخص جس کے بارے میں میرے رب نے مجھے عتاب فرمایا)۔ پھر آپ پوچھتے: هَلْ لَكَ مِنْ حَاجَةٍ ؟ (کوئی کام ہے تو بتاؤ)۔ کسی مہم کے سلسلہ میں حضور علیہ السلام بیرونِ مدینہ تشریف لے جاتے تو مدینہ منورہ میں اپنا کسی کو نائب بنا جاتے۔ جنابِ عبداللہ کو یہ شرف دوبار حاصل ہوا۔''

''یہاں اس بات کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے کہ جنابِ عبداللہ بن اُمِّ مکتوم کو (أَعْمٰی) یعنی ''نابینا'' کہنے میں اُن کی تحقیر مقصود نہیں بلکہ اُن کی طرف سے معذرت پیش کی جا رہی ہے کہ یہ نابینا معذور تھا' نہ محفل کے رنگ کو دیکھ سکا اور نہ حاضرین کو پہچان سکا اور نہ اُسے یہ پتہ چلا کہ آپ ﷺ اس قدر مصروف ہیں۔''

''جو لوگ اِن آیات سے سرورِ عالم ﷺ کے مرتبہ عالیہ کی تنقیص کرتے ہیں' وہ پرلے درجے کے کم فہم اور گستاخ ہیں۔ علامہ اسماعیل حقی لکھتے ہیں کہ فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معلوم ہوا کہ ایک امام ہمیشہ نماز میں اسی سورت عَبَسَ کی تلاوت کرتا ہے تو آپ نے ایک آدمی بھیجا جس نے اُس کا سر قلم کر دیا۔ چونکہ وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مرتبہ عالی کی تنقیص کے ارادے سے اس کی قرأت کیا کرتا تھا تاکہ مقتدیوں کے دل میں بھی نبوت کی عظمت کم ہو جائے' اس لئے نگاہِ فاروقی میں وہ مرتد تھا اور مرتد واجب القتل ہوتا ہے (روح البیان)۔ ایسے مقامات پر انسان کو سنبھل کر قدم اٹھانا چاہئے کہ کہیں ایمان کی شمع گل نہ ہو جائے۔'' (''ضیاء القرآن'' جلد ۵' صفحات ۴۸۹ تا ۴۹۲)

سورہ عَبَسَ کی ابتدائی آیات کے حوالے سے کچھ غیر مسلموں اور عیسائیوں نے حضور علیہ السلام کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے جن میں سے دو کا حوالہ یہاں دیا جاتا ہے:

(۱) ''اس آیت میں بیان کئے گئے عظیم جذبے کی بدولت محمد (ﷺ) کی بجا طور پر تعریف کی جاتی ہے۔ اُن کے تمام سفرِ حیات میں ہم اُنہیں شاذونادر ہی کسی امیر یا بڑے منصب والے کی طرفداری کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور آپ اپنے پیروکاروں میں سے غریب ترین آدمی کے بھی اندر کے جوہر کو بھانپ لیتے تھے۔'' (Rev. E. M. Wherry, quoted in Tafsir Majidi, p. 607-A, Note: 105)

(۲) ''یہ واقعہ ہمیں محمد (ﷺ) کی باریک بینی کی یاد دلاتا ہے کہ آپ نے کس طرح کا رویہ ایک نابینا شخص کو دیا اور یہ کہ یہ واقعہ آپ کی بے مثال عظمت کا آئینہ دار ہے۔'' (William Muir)

(47) وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًاO (الاحزاب : ۳۶)

''نہ کسی مومن مرد کو (یہ) حق حاصل ہے اور نہ کسی مومن عورت کو کہ جب اللہ اور اُس کا رسول ﷺ کسی کام کا فیصلہ (یا حکم) فرما دیں تو اُن کے لئے اپنے (اُس) کام میں (کرنے یا نہ کرنے کا) کوئی اختیار حاصل ہو اور جو شخص اور اُس کے رسول (ﷺ) کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ یقیناً کھلی گمراہی میں بھٹک گیا۔'' (۳۶ : ۳۳)

آیت کے شانِ نزول کے بارہ میں حضرات قتادہ' مجاہد' ابن عباس اور دیگر ائمہ تفسیر کا یہ قول ہے کہ یہ آیت اُس وقت نازل ہوئی جب رحمتِ عالم ﷺ نے اپنی پھوپھی عمیمہ کی صاحبزادی اور اپنے جدِّ امجد حضرت عبدالمطلب کی نواسی' خاندانِ بنی ہاشم کی معزز خاتون حضرت زینب بنتِ جحش رضی اللہ عنہا کو اپنے آزاد کردہ غلام زید کے لئے شادی کا پیغام بھیجا اور اُنہوں نے اور اُن کے بھائی عبداللہ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ رب تعالیٰ کی طرف سے جبریل یہ آیتِ طیبہ لے کر حاضر ہوئے کہ کسی مومن مرد اور عورت کو اس بات کی اجازت نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا رسولِ مکرّم اُسے کوئی حکم دے تو وہ انکار کر دے۔ جب یہ ارشادِ خداوندی حضرت زینب اور اُن کے بھائی عبداللہ نے سنا تو فوراً زید سے نکاح کرنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود اُن کا نکاح حضرت زید سے پڑھا دیا۔

اگرچہ یہ آیت اُس خاص موقع پر نازل ہوئی لیکن اپنے الفاظ کے اعتبار سے یہ عام ہے اور حضور علیہ السلام کے قانون ساز ہونے اور مختار کاری (Authority) کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بالغ' ذی ہوش لڑکی کو اسلام نے نکاح کے معاملہ میں خیارِ بلوغ کا حق دیا ہے کہ وہ جس سے چاہے نکاح کے لئے رضامندی کا اظہار کر دے اور جس کو چاہے ناپسند کر دے اور اس میں اُس کے والد تک کو اُس پر جبر کرنے کا کوئی حق اسلام نہیں دیتا۔ لیکن پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قانون ساز ہونے کے حوالہ سے معاملہ کچھ اور ہے کہ ''خیارِ بلوغ'' کا حق ملنے کے باوجود آقا علیہ السلام کے فیصلہ پر سرِ تسلیم خم کرنا پڑے گا اور یہی سچے ایمان کا تقاضا ہے۔

(48) اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَO (سورۃ الکوثر : ۱)

''بے شک ہم نے آپ کو (ہر خیر وفضیلت میں) بے انتہا کثرت بخشی ہے۔'' (۱ . ۱۰۸)

''اَعْطَيْنٰكَ صیغۂ ماضی ہے اور صیغۂ ماضی میں فعل بسا اوقات یقین اور تعین کے لئے آتا ہے۔ اَعْطَيْنٰكَ میں تیقن ہے کہ بالیقین اور اِنَّـآ کے ذریعے تیقن پر تکرار آ گیا۔ فرمایا کہ یقیناً ہم نے آپ کو خیرِ کثیر عطا فرما دی۔ کہا جا سکتا ہے کہ کوثر تو جنت کی ایک نہر ہے تو آپ نے خیرِ کثیر کا ترجمہ کہاں سے کر دیا! جواب یہ ہے کہ کوثر کا ایک

معنیٰ نہر کا بھی ہے۔ امام بخاری نے صحیح البخاری میں ''کوثر'' کی تشریح کی ہے کہ اس سے مراد ''خیرِ کثیر'' ہے۔ گویا امام بخاری کی تفسیر پر مدار کرتے ہوئے معنیٰ یہ ہوا کہ ''اے محبوبِ مکرّم! یقیناً ساری خیر ہم نے آپ کو عطا کر دی۔'' جب سب خیر کی نہریں حضور ﷺ کو عطا کر دی ہیں تو پھر جس نے جو لینا ہے' وہ درِ مصطفیٰ کا رُخ کرے۔''
(ماہنامہ ''منہاج القرآن'' لاہور' جنوری ۲۰۰۷ء' صفحات ۲۱' ۲۲)

''کــوثــر'' سے مراد حوضِ کوثر یا نہرِ جنت بھی ہے اور قرآن اور نبوت و حکمت بھی' فضائل و معجزات کی کثرت یا اصحاب و اتباع اور امت کی کثرت بھی مراد لی گئی ہے۔ رفعتِ ذکر اور خُلقِ عظیم بھی مراد ہے اور دنیا و آخرت کی نعمتیں بھی' نصرتِ الٰہیہ اور کثرتِ فتوحات بھی مراد ہیں اور روزِ قیامت مقامِ محمود اور شفاعتِ عظمٰی بھی مراد لی گئی ہے۔'' [''عرفان القرآن''۔۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری' صفحہ ۹۹۹ (ذیلی نوٹ)]۔

حوضِ کوثر کے بارے میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ گرامی ہے :
''حوضِ کوثر کا حجم (سائز) عدن اور عمان (یا یمن اور شام) کی درمیانی مسافت کا ہے۔ اُس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔ اِس کے آبخوروں کی تعداد آسمان کے ستاروں جتنی ہے۔ جو کوئی اُس سے ایک مرتبہ پی لے گا' اُسے کبھی پیاس نہیں لگے گی۔ لوگوں کا پہلا گروہ جو اس سے پینے آئے گا وہ غریب مہاجرین ہوں گے (جنہوں نے نبی علیہ السلام کے ساتھ مکہ سے مدینہ کو ہجرت کی)۔ یہ لوگ دنیاوی زندگی میں مفلس و نادار تھے۔ اُن کے بال بکھرے ہوتے تھے اور اُن کا لباس مٹی سے اٹا ہوتا تھا۔ کوئی بھی مالدار عورت اُن سے شادی کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اُنہیں نظرانداز کر دیا گیا تھا اور جب بھی اُنہوں نے دنیادار لوگوں سے مدد چاہی تو اُنہیں نفرت سے دُھتکار دیا جاتا تھا۔''

علامہ قرطبی لکھتے ہیں :
''ہمارے قائد و راہنما محمد ﷺ کو دو حوض عطا کئے جائیں گے۔ پہلا حوض آپ کو اُس سرزمین پر عطا کیا جائے گا جہاں لوگ قیامت کے دن اکٹھے ہوں گے تاکہ لوگ قبروں سے اٹھ کر اپنی پیاس محمد ﷺ کی سبیل سے بجھا سکیں۔ ہر پیغمبر کا پانی کا حوض ہوگا تاکہ اُس کے پیروکار اس سے پیاس بجھائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے امید ہے کہ لوگوں کی کثیر تعداد میرے حوض پر جمع ہوگی۔ دوسرا حوض جنت میں صرف اور صرف آپ کو عطا کیا جائے گا اور کسی پیغمبر کو جنت میں کوئی حوض نہیں ملے گا۔''

ایک حدیث میں یہ بھی آیا کہ برائیوں کی تشہیر کرنے والوں اور نبی علیہ السلام کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد دینِ اسلام میں نئی نئی اختراعات کرنے والوں کو اس حوض سے کچھ نہیں ملے گا بلکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نفرت سے اُنہیں دھتکار دیں گے اور کہیں گے کہ اپنی راہ پکڑو۔

سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِنِّیْ فَرَطُکُمْ عَلَی الْحَوْضِ مَنْ مَرَّ عَلَیَّ وَمَنْ شَرِبَ لَمْ یَظْمَأْ اَبَدًا لَیَرِدَنَّ عَلَیَّ اَقْوَامٌ اَعْرِفُھُمْ وَیَعْرِفُوْنَنِیْ ثُمَّ یُحَالُ بَیْنِیْ وَبَیْنَھُمْ فَاَقُوْلُ: اِنَّھُمْ مِّنِّیْ فَیُقَالُ: اِنَّکَ لَاتَدْرِیْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَکَ فَاَقُوْلُ: سُحْقًا سُحْقًا لِّمَنْ غَیَّرَ بَعْدِیْ (مُتَّفَق" عَلَیْہِ)

"(تمہاری حاجات کی دیکھ بھال کے لئے) میں حوضِ کوثر پر موجود ہوں گا۔ جو بھی میرے پاس سے گزرے گا' وہ اُس میں سے پانی پیئے گا اور جس شخص نے حوضِ کوثر سے پانی پی لیا' اُس کو کبھی بھی پیاس نہیں لگے گی۔ میرے پیروکاروں میں سے بہت سے لوگ میرے پاس آئیں گے جنہیں میں پہچانتا ہوں گا اور وہ بھی مجھے پہچانتے ہوں گے' پھر میرے اور اُن کے درمیان پردہ حائل ہو جائے گا تو میں کہوں گا: یہ لوگ میرے پیروکار ہیں لیکن مجھے بتایا جائے گا کہ اُنہوں نے آپ کے (دارِ فانی سے جانے کے) بعد برائیوں کی تشہیر کی اور مذہب میں نئی نئی اختراعات کیں۔ یہ معلوم ہونے کے بعد میں کہوں گا: دُور ہو جاؤ اور اپنی راہ پکڑو کہ تم نے میرے جانے کے بعد دین میں تغیر و تبدّل کیا اور اختراعات کو جنم دیا۔" (صحیح بخاری' صحیح مسلم)

(49) اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَالْاَبْتَرُ O (الکوثر: ۳)

"بے شک آپ کا دشمن ہی دُم بریدہ (بے نسل اور بے نام ونشان) ہوگا۔" (۳ : ۱۰۸)

کفارِ مکہ کے کچھ سرداروں کو جن میں عاص بن وائل پیش پیش تھا' نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کمسن صاحبزادے جناب ابراہیم کے انتقال پر (جو اُمّ المؤمنین سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطنِ پاک سے تھے) تعریض و تشنیع کا ایک نیا عنوان ہاتھ آ گیا۔ وہ خوش ہو کر کہنے لگے کہ: اِن کا کوئی نام لیوا تو رہا نہیں' ابراہیم کی وفات کے بعد میدان صاف ہے اور اُن کے دین کا کہیں نام ونشان بھی نہیں رہے گا۔ آقا علیہ السلام اُن کے طعن وطنز کو سن کر آزردہ خاطر ہوئے لیکن ربِّ محمد نے آپ کی یہ دل گرفتگی برداشت نہ ہوئی۔ چنانچہ آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اِن بدبخت معاندین کے طنز وطعن کی طرف توجہ نہ فرمایئے۔ بے نام ونشان تو یہ آپ کے دشمن رہیں گے جبکہ آپ کی (روحانی) اولاد تا قیامت پھلتی پھولتی رہے گی۔ چنانچہ یہ پیشگوئی حرف بہ حرف پوری ہو کر رہی۔ ابوجہل' ابولہب' عتبہ' شیبہ' ولید اور عاص بن وائل وغیرہ کا "ذکرِ خیر" آج اس خاکدانِ گیتی میں کہیں بھی نہیں ہے جبکہ آقا علیہ السلام کا ذکرِ خیر سینوں کے اندر اور زبانوں کے اوپر ہر طرح جاری وساری ہے۔ ﷺ

(50) وَمِنَ الَّیْلِ فَتَھَجَّدْ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا O

(بنی اسرائیل: ۷۹)

"(اے حبیب!) اور رات کے کچھ حصہ میں (بھی) قرآن کے ساتھ (شب خیزی کرتے ہوئے) نمازِ تہجد پڑھا کیجئے' یہ خاص آپ کے لئے زیادہ (کی گئی) ہے' یقیناً آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود پر فائز کرے

گا (یعنی وہ مقامِ شفاعتِ عظمیٰ جہاں جملہ اوّلین و آخرین آپ کی طرف رجوع اور آپ کی حمد کریں گے)۔'' (۷۹ : ۱۷)

''اِس آیتِ کریمہ میں ''عَسٰی'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو عام طور پر شک کا معنیٰ دیتا ہے مگر جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی طرف ہو تو اس میں یقین کا معنیٰ پایا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ وہ شک والی بات کرے۔ اُس کی ہر بات حتمی اور قطعی ہوتی ہے۔ اس لئے ''عَسٰی'' یہاں یقین کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔''

''اِس آیت میں ایک خاص نکتہ پوشیدہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا: اے محبوب! آپ نمازِ تہجد ادا کیجئے جو کہ نفلی نماز ہے اور آپ کی اس نفلی نماز کا صلہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ روزِ قیامت آپ کو مقامِ محمود پر فائز فرمائے گا۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ رب تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے نوافل میں سے ایک نفلی نماز تہجد کا صلہ یہ دیا کہ اُنہیں مقامِ محمود پر فائز فرما دیا تو آپ ﷺ کے فرائض کے صلے کا کیا عالم ہوگا!!''

''مقامِ محمود: ''محمود'' ایک مقام ہے جس پر حضور نبی اکرم ﷺ کو فائز کیا جائے گا۔ بعض علماء نے اس سے حضور نبی کریم ﷺ کا قیام فرما ہونا مراد لیا ہے کہ مقام چونکہ ظرف ہے' اس لئے حضور نبی کریم کو روزِ قیامت میں جس مقام پر کھڑا کیا جائے گا وہ مقامِ محمود ہے۔ جبکہ بعض علماء نے مذکورہ معنی کی بجائے یہ کہا ہے کہ مقامِ محمود سے مراد وہ خاص مقام' منصب' درجہ' مرتبہ اور منزلت ہے جس پر حضور نبی کریم ﷺ کو روزِ قیامت فائز کیا جائے گا۔ اس معنی میں زیادہ وسعت' زیادہ صحت اور زیادہ بلاغت ہے۔ مقامِ محمود کی تمام روایات اور احادیث جو مقامِ محمود کو بیان کرتی ہیں' اُنہیں جمع کیا جائے تو یہی معنی اُن کی مراد کو سموتا ہے۔ اکثر علماء اور ائمہ تفسیر نے اسی دوسرے معنی کو اختیار کیا ہے اور یہی مذہبِ مختار ہے۔''

''مقامِ محمود کی وجہ تسمیہ: امام ابن کثیر (۷۰۰۔۷۷۴ھ) مقامِ محمود کا معنی یہ بیان کرتے ہیں:

اِفْعَلْ هٰذَا الَّذِیْ اَمَرْتُكَ بِهٖ لِنُقِیْمَكَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مَقَامًا یَّحْمَدُكَ فِیْهِ الْخَلَائِقُ كُلُّهُمْ وَخَالِقُهُم تَبَارَكَ وَتَعَالٰی (تفسیر القرآن العظیم ۵ : ۱۰۳)

''(اے محبوب!) آپ یہ عمل (نمازِ تہجد) ادا کیجئے جس کا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے تاکہ روزِ قیامت آپ کو اُس مقام پر فائز کیا جائے جس پر تمام مخلوقات اور خود خالقِ کائنات بھی آپ کی حمد و ثنا بیان فرمائے گا۔''

''محمود کا معنیٰ: محمود ''حمد'' سے ہے بمعنیٰ تعریف۔ اور اللہ تعالیٰ کا اپنا اسم گرامی بھی محمود ہے یعنی جس کی تعریف کی جائے۔ محمود اُسے کہتے ہیں جس کے ذاتی کمالات' خصائص' فضائل اور عظمت و کمال کی حمد کی جائے۔''

''حمد و شکر میں فرق: کسی کی ذاتی خوبیوں' ذاتی حسن' ذاتی عظمت' ذاتی سطوت' ذاتی جلال و جمال کو سراہنا اور اُس کی تعریف کرنا اور کیے جانا حمد ہے جبکہ اُس کے احسانات پر تعریف کرنا شکر ہے۔ رب تعالیٰ نے قرآن مجید کا آغاز اَلشُّکرُ للّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن سے نہیں کیا کہ شکر ہے اُس اللہ ربّ العزت کا جو سارے جہانوں کا رب ہے۔ شکر اس لئے نہیں کہا کہ شکر تو نام ہی کسی کے احسانات پر تعریف کرنے کا ہے اور رب کی ذات پر کسی کا احسان تو کیا' وہ تو خود احسان کرنے والا (محسن) ہے۔ جب اُس پر کسی کا احسان نہیں تو تعریف کیسی! شکر حمد کا حصّہ ہے لیکن حمد' شکر میں شامل نہیں ہے۔ حمد کا دائرہ وسیع ہے اور شکر کا دائرہ محدود ہے۔ اس لئے اَلشُّکرُ للّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن کہہ دینے میں اُس کی تعریف محدود ہو جاتی۔ لامحدود کی تعریف محدود ہو جائے' یہ اُسے پسند نہیں۔''

''حمد بڑی عظیم شے ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اس بناء پر وہ محمود بھی ہے۔ وہ اُس وقت بھی محمود تھا جب اُس کی تعریف کرنے والا کوئی بھی نہ تھا۔ حمد اُس کی ذاتی خوبی ہے اور ذاتی خوبی مخلوق کی احتیاج سے بھی ماوراء ہوتی ہے۔ وہ تعریف کرنے والوں کا محتاج نہیں ہے۔ اس لئے اُس نے یہ نہیں کہا کہ سب تعریف کرنے والوں کی تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ اُس نے تعریف کرنے والوں کو ایک طرف رکھ دیا ہے۔ کوئی حامد تعریف کرے یا نہ کرے' وہ اپنی ذات میں ہر حمد کا حق دار ہے اور ہر خوبی کا سزاوار ہے۔ اس حمد کی بناء پر وہ محمود ہے۔''

''لفظ حمد کا اطلاق: لفظ ''حمد'' کے اطلاق کے بارے میں کچھ لوگوں کے ہاں یہ نظریہ پایا جاتا ہے کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے بولا جا سکتا ہے اور حضور نبی کریم ﷺ کے لئے اس لفظ کا استعمال جائز نہیں۔ اُن کے نزدیک حضور ﷺ کے لئے ''نعت'' کا لفظ تو ٹھیک ہے' حمد کا لفظ ٹھیک نہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ رب تعالیٰ نے حضور نبی اکرم ﷺ کا نام ہی محمد رکھا ہے جو مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا معنیٰ ہے جس کی بار بار اور بے حد و حساب حمد کی جائے۔ حضور ﷺ کی حمد ہی اللہ تعالیٰ کی حمد ہے بلکہ حضور نبی کریم ﷺ کی حمد اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی اور اعلیٰ حمد ہے۔''

''مثال کے طور پر ایک کاریگر کوئی عمارت تعمیر کرتا ہے۔ لوگ اس کی تعمیر کردہ عمارت کی خوبیاں بیان کریں ور اُس کے حسنِ تعمیر کو سراہیں تو کیا کاریگر اُس تعریف سے ناراض ہوگا؟ ہاں اگر ساتھ کوئی دوسری عمارت ہے' اُس کی تعریف کی جائے تو وہ کاریگر ناراض ہوگا لیکن اگر عمارت ہی ایک ہو اور آپ ساری عمر اُس کی تعریف کرتے رہیں تو اُس عمارت کا تعمیر کرنے والا کبھی ناراض نہ ہوگا۔ کاریگر کو تو کسی نے دیکھا' کسی نے نہیں دیکھا لیکن عمارت تو سب نے دیکھی ہے تو گویا عمارت کی تعریف دراصل کاریگر کی تعریف ہے۔ اس طرح اللہ رب العزت کو تو کسی نے نہیں دیکھا لیکن حضور نبی اکرم ﷺ کو تو سب نے دیکھا۔ اب حضور نبی اکرم ﷺ کی تعریف کرنا دراصل اللہ ہی کی تعریف ہے۔''

اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلْحَمْدُ للّٰہِ ساری تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ یہ سن کر ذہن میں سوال

پیدا ہوتا ہے کہ اے بارے تعالیٰ! تو ساری تعریفوں کا حق دار کیوں ہے' اس کی کوئی دلیل بھی تو ہوگی؟ اُس نے ساتھ ہی جواب دیا: رَبِّ الْعٰلَمِیْن اس لئے کہ میں سارے جہانوں کا پالنہار ہوں اور مخلوق کی پیدائش سے لے کر اُن کے تا دمِ آخر اُن کی ضروریات کا کفیل ہوں۔ میں نے ہی سارے جہانوں کو بنایا ہے۔ جو کچھ میں نے بنایا ہے' اُسے دیکھو لوکہ میں قابلِ تعریف ہوں کہ نہیں۔ جو اللہ تعالیٰ بنا تا ہے اگر وہ قابلِ تعریف ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے۔ اگر کسی نے اولیاء کی تعریف کی تو رب کبھی ناراض نہ ہوگا کہ اُسی نے ہی تو ولایت دی ہے۔ کسی نے انبیاء کرام کی تعریف کی تو اللہ تعالیٰ کبھی ناراض نہ ہوگا کہ اُسی نے ہی تو نبوت دی ہے لہٰذا اُن کی تعریف اللہ تعالیٰ ہی کی تعریف ہے۔ اسی طرح اگر کوئی ساری عمر حضور نبی اکرم ﷺ کی ہی تعریف کرتا رہے تو اس سے اللہ تعالیٰ ناراض نہیں ہوگا، حضور نبی کریم ﷺ کی تعریف جس جس جہت سے کرتے رہیں' وہ سب اَلْحَمْد کے ضمن میں ہے اور وہ اللہ ہی کی تعریف ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جو کچھ ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے بنانے سے ہیں۔ آپ ﷺ کا خالق و معمار رب تعالیٰ ہے' اس لئے ذہن میں یہ سوال پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ حمد کا لفظ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے جائز ہے۔''

جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ مُحَمَّد مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس کا معنی ہے جس کی بہت زیادہ کثرت کے ساتھ تعریف کی جائے۔ ایمان اور معرفت کے بغیر عقلِ مادّی یہ سوچتی ہے کہ باری تعالیٰ! بہت زیادہ تعریف تو تیری ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جتنا بھی مرتبہ ہو' بہر صورت وہ تیری مخلوق ہیں' تیرے بھیجے ہوئے رسول ہیں اور تیرے محبوب و مقرب بندے ہیں۔ محمد تو تیرا نام ہونا چاہئے تھا کہ سب سے زیادہ تعریف تو تیری ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال غلط ہے۔ میں نے کبھی کوئی نام غلط نہیں رکھا' میں غلطی سے پاک ہوں۔ میں نے اگر اپنا نام محمود اور اپنے محبوب کا نام محمد رکھا ہے تو درست رکھا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو کہ جس ذات کی تعریف تمام مخلوقات کے ساتھ ساتھ میں خود کروں تو وہ محمد ہوگا کہ نہیں! حضور نبی کریم ﷺ کو مقامِ محمدیت اس لئے ملا کہ اللہ رب العزت آپ کی تعریف بیان کرتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی تعریف بیان نہ کرتا تو آپ ﷺ مقامِ محمدیت تک نہ پہنچتے۔ مقامِ محمود تو نوافل کا صلہ تھا اور مقامِ محمدیت حضور ﷺ کے فرائض کا صلہ ہے۔ مگر اصل بات اس سے بھی بڑھ کر ہے کہ حمد کسی عمل کے صلہ میں نہیں ہوتی اور وہ عمل کے صلہ سے بے نیاز ہے۔ اس لئے حضور نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے والے تو بعد میں بنے لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اوّل دن سے محمد کر دیا۔ جس کی تعریف اللہ کرے' اُس کی تعریف حد سے بڑھ گئی۔ حضور ﷺ کی تعریف تو اللہ تعالیٰ نے حد سے بڑھا دی۔ ہم کون ہوتے ہیں حد سے بڑھانے والے! ہم خود محدود ہیں' محدود کسی کو حد سے کیسے بڑھا سکتا ہے!''

''یہاں پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ اے باری تعالیٰ! تو جو روزِ قیامت اپنے محبوب کی تعریف کرے گا' تو کیا تیرا یہ عمل صرف یومِ قیامت کے ساتھ خاص ہے یا یہ کام پہلے بھی کیا ہے؟ فرمایا: مقام کا نام آج رکھا ہے' کام پہلے سے کرتا چلا آ رہا ہوں۔ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (ہم نے آپ کی خاطر آپ کا ذکر بلند کر دیا)۔ محبوب کی حمد تو میں ہمیشہ سے کرتا چلا آ رہا ہوں' اُسی سے تو ذکر بلند ہوتا آ رہا ہے۔ کام ایک ہی رہا ہے عنوان بدلتے رہے ہیں۔ کبھی اس کو

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کے پردے میں سمجھا دیا کبھی اِنَّ اللهَ وَمَلٰۤئِكَتَه' يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِىِّ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا کے حکم میں بیان کر دیا اور کبھی عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا کے نام سے اجاگر کر دیا کہ میں حمد تو اول دن سے کر رہا ہوں اور روزِ قیامت بھی کروں گا۔ حمد کر رہا ہوں تو نام محمد رکھا ہے۔''

''یہی وہ مقام ہے جہاں سے آپ ﷺ شفاعتِ کبریٰ فرمائیں گے۔ جملہ مخلوق آپ کی تعریف کرے گی۔ تمام اہلِ محشر تو پُل صراط سے گزرنے میں مشغول ہوں گے مگر حضور شافعِ محشر ﷺ پُل صراط کے کنارے کھڑے کمال گریہ وزاری سے اپنی عاصی وگنہگار امت کی نجات کی فکر میں غلطاں و پیچاں اپنے خالق و مالک سے دعا کر رہے ہوں گے: رَبِّ سَلِّمْ' رَبِّ سَلِّمْ' پروردگار! اُنہیں سلامتی وعافیت سے پار لگا دے۔ مولا! ان خطا کاروں کو بچا لے' اُنہیں اپنے عفو وکرم میں پناہ عطا فرما دے۔ اے احکم الحاکمین! تجھے تیری رحمت کا واسطہ! اِن عاصیوں اور سیاہ کاروں کو نجات عطا فرما۔''

''نفسا نفسی کا عالم ہوگا۔ باپ بیٹے سے بھاگ رہا ہوگا' بیٹا باپ کو نہیں پہچانتا ہوگا۔ جن سے کچھ توقع اور امید تھی' وہ سب بیگانے ہو چکے ہوں گے۔ ہاتھ' پاؤں اور جسمانی طاقت جواب دے گئی ہوگی۔ ٹوٹی ہوئی کمریں اور اوپر سے گناہوں کا بوجھ عجیب ندامت کا سماں ہوگا۔ اب تمام اوّلین وآخرین کا بار حضور شافعِ محشر ﷺ کے کندھوں پر آ پڑے گا۔ یومِ حشر حضور ﷺ تمام مقامات کا دَورہ فرمائیں گے۔ میزان قائم ہوگی' نامہ اعمال کھولے جا رہے ہوں گے' ہنگامہ دار وگیر گرم ہوگا اور وہاں آپ ﷺ جس کے اعمالِ حسنہ میں کمی دیکھیں گے' اُس کی شفاعت فرما کر نجات دلوائیں گے اور کبھی دیکھو تو حوضِ کوثر پر تشریف فرما ہیں اور تشنہ لب پیاسوں کو سیراب فرما رہے ہیں کہ پانی پی کر ہوش وحواس باقی رکھیں۔ اگر آپ ﷺ ایک ہی جگہ پر جلوہ افروز رہتے تو اللہ جانے میزان پر آفت رسیدوں اور غم زدوں پر کیا گزرتی! کون سا پلہ بھاری ہو جائے۔ اُدھر کرم نہ فرمائیں تو یہ بے کس و بے چارے' بے یار و مددگار برباد ہو جائیں۔ پھر وہاں سے پُل صراط پر رونق افروز ہوئے اور گرتوں کو تھام لیا۔ غرض ہر جگہ آپ کے نام کی دُہائی ہوگی۔ ایک آپ ﷺ کا دَم ہوگا اور جہاں بھر کی خبر گیری ہوگی۔ اتنا عظیم اژدہام اور اس قدر مختلف کام اور پھر عطائے مصطفیٰ ﷺ کی عطر بیز ضوفشانیاں عجیب سماں بندھا ہوگا۔ زبان پر اللہ کا نام ہوگا' آنکھوں سے اشک رواں ہوں گے۔ اِدھر گرتوں کو سنبھال رہے ہوں گے اور اُدھر ڈوبتوں کو نکال رہے ہوں گے۔ یہاں روتوں کے آنسو پونچھے جا رہے ہوں گے اور وہاں آگ میں جلتوں کو دوزخ سے نکالا جا رہا ہوگا۔ الغرض ہر جگہ آپ ﷺ کی دُہائی ہوگی۔ ہر شخص عام وخاص آپ ﷺ ہی کو پکار رہا ہوگا اور آپ ﷺ مقامِ محمود پر فائز ہو کر اوّلین وآخرین کو فیضیاب فرما رہے ہوں گے۔'' (تلخیص: ماہنامہ منہاج القرآن' لاہور' جون ۲۰۰۷ء' صفحات ۵ تا ۱۰)

''شفاعت عامہ کا یہی مقام اوّل حضور ﷺ کا مقامِ محمود ہوگا کہ اس پر حضور نبی اکرم ﷺ کی تعریف

شروع ہو جائے گی اور تمام مخلوقات آپ ﷺ کی حمد کریں گی۔ قیامت کے اس مرحلہ کی ابتداء سے ہی حضور ﷺ کی تعریف شروع ہو جائے گی اور جنت کے داخلے تک آپ ﷺ کی حمد جاری رہے گی۔ یومِ قیامت کی ابتداء سے یومِ قیامت کی انتہاء تک حضور نبی اکرم ﷺ کا مقام محمود چھایا رہے گا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی درج ذیل حدیث مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ اپنے اس مقام محمود کا اظہار یوں فرماتے ہیں:

إِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ مَاجَ النَّاسُ بَعْضُهُمْ فِيْ بَعْضٍ فَيَأْتُوْنَ آدَمَ فَيَقُوْلُوْنَ: اِشْفَعْ لَنَا إِلٰى رَبِّكَ فَيَقُوْلُ: لَسْتُ لَهَا وَلٰكِنْ عَلَيْكُمْ بِإِبْرٰهِيْمَ فَإِنَّهُ خَلِيْلُ الرَّحْمٰنِ فَيَأْتُوْنَ إِبْرٰهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَيَقُوْلُ: لَسْتُ لَهَا وَلٰكِنْ عَلَيْكُمْ بِمُوْسٰى فَإِنَّهُ كَلِيْمُ اللهِ فَيَأْتُوْنَ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ فَيَقُوْلُ: لَسْتُ لَهَا وَلٰكِنْ عَلَيْكُمْ بِعِيْسٰى فَإِنَّهُ رُوْحُ اللهِ وَكَلِمَتُهُ فَيَأْتُوْنَ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ فَيَقُوْلُ: لَسْتُ لَهَا وَلٰكِنْ عَلَيْكُمْ بِمُحَمَّدٍ ﷺ فَيَأْتُوْنَنِيْ فَأَقُوْلُ: أَنَا لَهَا فَأَسْتَأْذِنُ عَلٰى رَبِّيْ فَيُؤْذَنُ لِيْ وَيُلْهِمُنِيْ مَحَامِدَ أَحْمَدُهُ بِهَا لَا تَحْضُرُنِي الْآنَ فَأَحْمَدُهُ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ وَأَخِرُّ لَهُ سَاجِدًا فَيُقَالُ: يَا مُحَمَّدُ! اِرْفَعْ رَأْسَكَ وَسَلْ تُعْطَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَأَقُوْلُ: يَا رَبِّ! أُمَّتِيْ أُمَّتِيْ فَيُقَالُ: اِنْطَلِقْ فَأَخْرِجْ مِنْهَا مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ شَعِيْرَةٍ مِنْ إِيْمَانٍ فَأَنْطَلِقُ فَأَفْعَلُ ثُمَّ أَعُوْدُ فَأَحْمَدُهُ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ وَأَخِرُّ لَهُ سَاجِدًا فَيُقَالُ: يَا مُحَمَّدُ! اِرْفَعْ رَأْسَكَ وَسَلْ تُعْطَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَأَقُوْلُ: يَا رَبِّ! أُمَّتِيْ أُمَّتِيْ فَيُقَالُ: اِنْطَلِقْ فَأَخْرِجْ مِنْهَا مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ أَوْ خَرْدَلَةٍ مِنْ إِيْمَانٍ فَأَنْطَلِقُ فَأَفْعَلُ ثُمَّ أَعُوْدُ فَأَحْمَدُهُ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ وَأَخِرُّ لَهُ سَاجِدًا فَيُقَالُ: يَا مُحَمَّدُ! اِرْفَعْ رَأْسَكَ وَسَلْ تُعْطَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَأَقُوْلُ: يَا رَبِّ! أُمَّتِيْ أُمَّتِيْ فَيُقَالُ: اِنْطَلِقْ فَأَخْرِجْ مِنْهَا مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ أَدْنٰى أَدْنٰى أَدْنٰى مِثْقَالِ حَبَّةِ خَرْدَلَةٍ مِنْ إِيْمَانٍ فَأَخْرِجْهُ مِنَ النَّارِ ثُمَّ أَعُوْدُ الرَّابِعَةَ فَأَحْمَدُهُ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ وَأَخِرُّ لَهُ سَاجِدًا فَيُقَالُ: يَا مُحَمَّدُ! اِرْفَعْ رَأْسَكَ وَقُلْ يُسْمَعْ لَكَ وَسَلْ تُعْطَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَأَقُوْلُ: يَا رَبِّ! اِئْذَنْ لِيْ فِيْمَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ فَيَقُوْلُ: وَعِزَّتِيْ وَجَلَالِيْ وَكِبْرِيَائِيْ وَعَظَمَتِيْ لَأُخْرِجَنَّ مِنْهَا مَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ

''قیامت کے دن لوگ دریا کی موجوں کی طرح بے قرار ہوں گے۔ پھر وہ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور کہیں گے کہ آپ ہمارے لئے اپنے رب سے شفاعت کیجئے۔ وہ کہیں گے کہ میں اس کے لئے نہیں ہوں۔ لیکن تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ کہ وہ خلیل الرحمن ہیں۔ تو لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جائیں گے۔ وہ کہیں گے کہ میں اس کے لئے نہیں ہوں۔ لیکن تم موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ کہ وہ اللہ کے کلیم ہیں۔ تو لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے۔ وہ کہیں گے کہ میں اس کے لئے نہیں ہوں۔ لیکن تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ کہ وہ اللہ کی پسندیدہ روح اور اُس کا کلمہ ہیں۔ تو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے۔ وہ کہیں گے کہ میں اس کے لئے نہیں ہوں۔ لیکن تم پر لازم ہے کہ تم سیّدنا محمد ﷺ کے پاس جاؤ۔ پھر وہ میرے پاس آئیں گے۔ پس میں کہوں گا اَنَا لَهَا اَنَا لَهَا کہ میں ہی اس کے لئے ہوں۔ پھر میں اپنے رب سے اجازت طلب کروں گا تو میرے لئے اجازت دی جائے گی اور میرے دل میں اللہ تعالیٰ کی حمد سے ایسے کلمات ڈالے

جائیں گے جو اِس وقت مجھے مستحضر نہیں ہیں اور میں ان کلمات سے اللہ تعالیٰ کی حمد کروں گا اور اللہ کے لئے سجدہ میں گر جاؤں گا۔ پھر کہا جائے گا: یَا مُحَمَّدُ! اِرْفَعْ رَأْسَكَ فَاشْفَعْ تُشَفَّعْ سَلْ تُعْطَ ''اے سراپا حمد وستائش! اپنا مُکھ تو دکھلایئے۔ آپ شفاعت کیجئے' آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی اور مانگ کے تو دیکھئے' خالی ہاتھ نہ لوٹاؤں گا۔'' میں کہوں گا: اے میرے رب! میری امت' میری امت۔ آپ سے کہا جائے گا کہ آپ جایئے اور دوزخ سے اُنہیں نکال لیجئے جن کے دل میں ایک جَو کے برابر بھی ایمان ہو۔ میں جاؤں گا اور اسی طرح کروں گا۔ پھر میں واپس آ کر انہی کلمات سے اللہ تعالیٰ کی حمد کروں گا اور پھر اللہ کے حضور سجدہ میں گر جاؤں گا۔ پھر کہا جائے گا: ''اے سراپا حمد و ستائش! اپنا مُکھ تو دکھلایئے۔ آپ شفاعت کیجئے' آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی اور مانگ کے تو دیکھئے' خالی ہاتھ نہ لوٹاؤں گا۔'' میں کہوں گا: اے میرے رب! میری امت' میری امت۔ آپ سے کہا جائے گا کہ آپ جایئے اور دوزخ سے اُنہیں نکال لیجئے جن کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو۔ میں جاؤں گا اور اسی طرح کروں گا۔ پھر میں واپس آ کر انہی کلمات سے اللہ تعالیٰ کی حمد کروں گا اور پھر اللہ کے حضور سجدہ میں گر جاؤں گا۔ پھر کہا جائے گا: ''اے سراپا حمد وستائش! اپنا مُکھ تو دکھلایئے۔ آپ شفاعت کیجئے' آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی اور مانگ کے تو دیکھئے' خالی ہاتھ نہ لوٹاؤں گا۔'' میں کہوں گا: اے میرے رب! میری امت' میری امت۔ آپ سے کہا جائے گا کہ آپ جایئے اور دوزخ سے اُنہیں نکال لیجئے جن کے دل میں ادنیٰ' ادنیٰ رائی کے درجہ کے برابر بھی ایمان ہو۔ میں جاؤں گا اور اسی طرح کروں گا۔ پھر میں چوتھی بار جاؤں گا اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حمد کروں گا۔ پھر اللہ کے لئے سجدہ میں گر جاؤں گا۔: ''اے سراپا حمد وستائش! اپنا مُکھ تو دکھلایئے۔ آپ شفاعت کیجئے' آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی اور مانگ کے تو دیکھئے' خالی ہاتھ نہ لوٹاؤں گا۔'' میں کہوں گا: اے میرے رب! مجھے اُس شخص کے لئے اجازت دیجئے جس نے لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللہ پڑھا ہو۔ رب فرمائے گا: میری عزت' میرے جلال' میری کبریائی اور میری عظمت کی قسم! جس شخص نے لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللہ پڑھا ہو' میں اُسے دوزخ سے نکال لوں گا۔'' (صحیح بخاری' کتاب التوحید' باب: قول اللہ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ رقم الحدیث: ۷۵۱۰ ؛ صحیح مسلم' رقم الحدیث: ۱۹۳ ؛ السنن الکبریٰ للنسائی' رقم الحدیث: ۱۱۲۴۳؛ سنن ابن ماجہ' رقم الحدیث: ۴۳۱۲)

''اس حدیث سے یہ اہم بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ لوگ قیامت کے دن اللہ کے بندوں سے شفاعت کا سوال کریں گے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کی عدالت ہوگی اور لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے شفاعت کا سوال اللہ کے انبیاء علیہم السلام سے کریں گے تو لوگوں کے اس عمل سے اللہ تعالیٰ ناراض نہیں ہوگا کہ پریشانی اور مشکل کو تو میں نے ختم کرنا ہے تو پھر کیوں کسی اور سے مانگنے جا رہے ہو' مجھ ہی سے مانگو بلکہ وہ اپنے انبیاء' اولیاء اور صلحاء کی شفاعت قبول فرمائے گا۔ نیز یہ بات بھی غور طلب ہے کہ توحید کا عروج اُس وقت ہوگا جب اللہ تعالیٰ عرش پر جلوہ افروز ہوگا اور یہ آواز آ رہی ہوگی: لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ (آج کس کی بادشاہی ہے؟) اُسی ربِّ جبّار کی جو آج کے دن کا مالک ہے۔ جس رب نے قیامت کے دن توسل' وسیلہ اور شفاعت کو سنت بنا رکھا ہے' وہ رب آج توسل اور شفاعت کو کیسے منع فرمائے گا۔ معلوم ہوا کہ توسل اور شفاعت توحید کے منافی نہیں۔''

(51) (i) لَوْ اَنْزَلْنَا ھٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَہ' خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ (الحشر: ۲۱)
(ii) نَزَلَ بِہِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ O عَلٰی قَلْبِکَ (الشُّعراء: ۱۹۳' ۱۹۴)

(i) ''اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل فرماتے تو (اے مخاطب!) تو اُسے دیکھتا کہ وہ اللہ کے خوف سے جھک جاتا' پھٹ کر پاش پاش ہو جاتا۔'' (۲۱ : ۵۹)

(ii) اِسے روح الامین (جبریل علیہ السلام) لے کر اترا ہے۔ آپ کے قلبِ (انور) پر'' (۱۹۳' ۱۹۴ : ۲۶)

اِن دونوں آیاتِ مبارکہ کو اکٹھا ملا کر پڑھنے سے ختمی مرتبت آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خداداد مقام رفعت وعظمت کا معلوم ہونا چنداں مشکل نہیں۔ پہلی آیت (۲۱) میں فرمایا جا رہا ہے کہ پتھر کے پہاڑ پر جو جمود اور بے حسی کا انتہائی نمونہ معلوم ہوتا ہے اگر ہم قرآن نازل کرتے اور پہاڑ میں بہ قدرِ ضرورت فہم وعقل کا مادّہ رکھ دیتے تو پہاڑ تک فرطِ تاثر سے ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ جبکہ دوسری آیات ۱۹۳' ۱۹۴ میں ارشاد ہوا کہ ہم اِسی قرآن کو جس کے سہارنے کی پہاڑ جیسی سخت ترین مخلوق میں تاب نہ تھی' اپنے محبوب علیہ السلام کے قلبِ اطہر پر اتارا جسے وہ میرے فضل وکرم اور عنایتِ خاصّہ سے سہارنے کے قابل ہو گئے یعنی میں نے اُن کے قلبِ اطہر میں پہاڑ سے بھی بڑھ کر صلابت اور قوّتِ برداشت ودیعت فرما دی۔ سُبحانَ اللہ! کن کن طریقوں اور جہتوں سے خالقِ لم یزل اپنے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شانِ رسالت کو اجاگر کر رہا ہے!!

(52) لَا اُقْسِمُ بِھٰذَا الْبَلَدِ O وَاَنْتَ حِلٌّ" بِھٰذَا الْبَلَدِ O (اَلْبَلَد: ۱' ۲)

''میں اِس شہر (مکّہ) کی قسم کھاتا ہوں (اے محبوبِ محتشم!) اس لئے کہ آپ اِس شہر میں تشریف فرما ہیں۔'' (۱' ۲ : ۹۰)

مکّہ مکرّمہ کی مسجدِ حرام میں بذاتِ خود حجرِ اَسْوَد' مطاف' مَسْعٰی' میلینِ اخضرَین' زمزم' ملتزم' مقامِ ابراہیم' حطیم' میزابِ رحمت' رکنِ یمانی' رکنِ شامی' اور سب سے بڑھ کر کعبۃ اللہ سبھی مقدّس ترین مقامات ہیں۔ لیکن ربِّ ذوالجلال والاکرام نے اِن مقدّس مقامات میں سے کسی کی بھی قسم نہیں کھائی بلکہ اُس نے شہرِ مکّہ کی قسم کھائی ہے جس کی وجہ آیت ۲ میں بیان کی جا رہی ہے کہ پیارے! کیونکہ تیرے سانسوں کی عطر بیزیاں اِس شہر کو فرحت آشنا کر رہی ہیں اور تیرا وجودِ مسعود یہاں تشریف فرما ہے' اس لئے میں نے اس شہر کی قسم کھانے کو ترجیح دی ہے اور اس کے مقابل کسی اور مقدّس مقام کی قسم نہیں کھائی (اُن مقاماتِ مذکورہ کو بھی تقدّس دینے والا میں اور اپنے گھر کعبہ کو بھی تقدّس دینے والا میں ہی ہوں)۔ شہرِ مکّہ کی قسم اٹھانے کے پسِ پردہ مقصد فخرِ ہر جہاں ﷺ کی عظمت ورفعت کو اجاگر کرنا ہے (تفسیر مظہری)۔

وَاَنْتَ حِلٌّ" بِھٰذَا الْبَلَد کی دو دیگر تاویلات بھی کی گئی ہیں: (۱) کفارِ مکّہ کی جانب سے نبی ﷺ

اور آپ کے صحابہ کرام کو دی جانے والے تشدّد اور اذیتیں حیران کن ہیں کیونکہ شہرِ مکّہ تو خود اِن کفار کے نزدیک بھی امن وراحت کا شہر ہے لیکن اُنہوں نے میرے رسولِ مکرّم اور آپ کے ساتھیوں پر ظلم و بربریت کو جائز قرار دے رکھا ہے۔ (۲) پیارے حبیبِ لبیب! یہ شہرِ مکّہ آپ کے لئے حلال ہے اور آپ کو اپنے دشمنوں کو سزا دینے اور اُنہیں قتل کرنے کا پورا اختیار ہے۔

حِلّ'' کے لفظ میں اس بات کی پیشگوئی اور پیغام بھی ہے کہ ہم آپ کو عنقریب آپ کے آبائی وطن مکّہ کو واپس پہنچا دیں گے جس کا ذکر ذیل کی آیت میں کیا گیا ہے :۔

(53) اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ (القصص : ۸۵)

''جس اللہ نے آپ پر قرآن کو فرض کیا ہے' وہ آپ کو آپ کے وطن میں پہنچا کر رہے گا۔'' (۲۸:۸۵)

''یعنی اُس وقت آپ آزاد' غالب اور صاحب حکومت ہوں گے۔ یہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تسلی میں اُس وقت ارشاد ہوا جب ہجرت کے بعد مفارقتِ وطن سے آپ کو طبعی صدمہ ہو رہا تھا۔ کیا ربّ ذوالجلال والاکرام نے اپنے حبیب علیہ السلام کو مکہ کی شاندار فتح کی صورت میں اُن کے وطنِ مالوف مکہ میں پہنچا کر شادکام کر کے اپنا وعدہ پورا نہیں کر کے دکھایا؟''

(54) وَمَا کُنْتَ تَرْجُوْا اَنْ یُّلْقٰۤی اِلَیْكَ الْکِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ (القصص : ۸۶)

'' (اے حبیبِ مکرّم!) آپ کچھ اس کا آسرا لگائے ہوئے نہ تھے کہ آپ پر (یہ) کتاب اُتاری جائے گی مگر آپ کے پالنہار کی رحمت سے نازل ہوئی۔'' (۸۶ : ۲۸)

درحقیقت اللہ کے نبی یا رسول پر وحی کا نازل ہونا رب تعالیٰ کی عظیم نعمت اور انعام ہے جو نبی ر رسول کی طرف غیر متوقع طور پر آتی ہے جیسا کہ تمام انبیاء علیہم السلام پر وحی اُن کی درخواست کے بغیر نازل ہوئی۔ اس حقیقت کا ثبوت سورۃ القصص میں موسیٰ علیہ السلام کے تذکرے میں موجود ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اِسی بے مثال خدائی انعام کی یاد دہانی کرائی جا رہی ہے کہ اے محبوبِ محتشم! آپ کو یہ امید نہ تھی کہ قرآن آپ پر نازل ہوگا تاہم آپ کو ہماری طرف سے منصب رسالت عطا کئے جانے کی امید ضرور تھی۔ اس لئے زیرِ نظر آیت (۸۶) میں رَحْمَة سے مراد رسالت ہے جیسا کہ سورۃ الزّخرف (۴۳) کی آیت ۳۲ میں ''وحی'' سے مراد رسالت ہے۔

(55) وَکَذٰلِكَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ (الشّورٰی: ۵۲)

''سو اسی طرح ہم نے آپ کی طرف وحی یعنی اپنا حکم بھیجا ہے اور آپ (وحی سے قبل اپنی ذاتی درایت و فکر سے) نہ یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان (کے شرعی احکام کی تفصیلات کو ہی جانتے تھے جو بعد میں نازل اور مقرر ہوئیں) مگر ہم نے اُسے نور بنا دیا' ہم اِس نور کے ذریعہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں' ہدایت سے نوازتے ہیں اور بے شک آپ ہی صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت عطا فرماتے ہیں۔''
(۴۲ : ۵۲)

یہاں ''روح'' سے مراد قرآنِ حکیم ہے۔ جس طرح روح سے جسم میں جان آ جاتی ہے اور وہ زندہ رہتا ہے' اسی طرح قرآن مجید دلوں کو ابدی زندگی عطا کرتا ہے۔ لفظ کَذٰلِکَ (اسی طرح) سے مراد وحی کی وہ تمام اقسام ہیں جن کا ذکر اس سے سابقہ آیت ۵۱ میں ہوا۔

آیت میں آپ ﷺ کی شانِ اُمیت کی طرف اشارہ ہے تاکہ کفار آپ کی زبان سے قرآن کی آیات اور ایمان کی تفصیلات سن کر یہ بدگمانی نہ پھیلائیں کہ یہ سب کچھ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اپنے ذاتی علم اور تفکر سے گھڑ لیا ہے' کچھ نازل نہیں ہوا۔ سو یہ از خود نہ جاننے کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا عظیم معجزہ بنا دیا گیا۔

یہ بات تحقیق طلب ہے کہ آیا انبیاء علیہم السلام کو ایمان اور صحیفے کا علم ہوتا ہے کہ نہیں؟ آیئے دیکھیں کہ اس سلسلہ میں ہمیں قرآن و حدیث سے کیا ثبوت ملتا ہے:۔

(۱) سورہ مریم کی آیت (۱۲) کی رُو سے اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اُن کے بچپن ہی میں حکمت و دانش عطا فرما دی تھی۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق آپ کی عمر اُس وقت تین سال تھی۔

(۲) سورہ مریم کی آیات ۳۰' ۳۱ کی رُو سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ماں کی گود ہی میں شیر خوارگی کے زمانہ میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ ''میں اللہ کا بندہ ہوں' اُس نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے اور جہاں کہیں بھی میں ہوں' مجھے بابرکت بنایا ہے۔''

(۳) جب یوسف علیہ السلام کو اُن کے برادران کنویں میں ڈال رہے تھے تو رب تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو یہ مژدہ سنایا کہ تم اُنہیں یقیناً اُن کا یہ کام جتلاؤ گے اور اُنہیں (تمہارے بلند رتبہ کا) شعور نہ ہوگا۔ (بحوالہ سورہ یوسف: آیت ۱۵)

(۴) جناب اسمٰعیل علیہ السلام نے اپنے والد محترم جناب ابراہیم علیہ السلام سے اپنے لڑکپن میں عرض کیا تھا: ''اے پدرِ بزرگوار! جس کام کے کرنے کا آپ کو حکم دیا گیا ہے' اُسے کر ڈالئے' انشاء اللہ آپ مجھے صابرین میں سے پائیں گے۔'' (بحوالہ سورۃ الصّافّات: آیت ۱۰۲)

اگر اِن مقدس ہستیوں کو اُن کے بچپنے میں اُن کے مقام و مرتبہ کے متعلق بتا دیا گیا تھا۔ تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ امام الانبیا ﷺ کو نہ تو کتاب کا علم تھا اور نہ ہی ایمان کا پتہ تھا؟ بعثت سے قبل آپ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ اس

مفروضے کی تکذیب کرتا ہے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا :

''جب میں بڑا ہوا تو بتوں کے خلاف نفرت اور بغض میرے دل میں بڑھ گیا اور میں نے زمانہ جاہلیت کے کسی بھی کام کے کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔''

اپنے لڑکپن کے زمانہ میں آپ ﷺ اپنے چچا جناب ابو طالب کے ہمراہ ملکِ شام کو گئے۔ اُس سفر کے دوران بحیرہ نامی ایک راہب آپ کو ملا۔ آپ میں علاماتِ نبوّت دیکھ کر بحیرہ نے بطور آزمائش لات اور عزّیٰ نامی دو مشہور بتوں کی قسم کھانے کو کہا لیکن کم عمر ہونے کے باوجود آپ نے فرمایا:

لَا تَسْئَلْنِیْ بِهِمَا فَوَاللهِ مَا اَبْغَضْتُ شَيْئًا قَطُّ بُغْضَهُمَا (ضیاءالقرآن' ج ۴' ص ۳۹۴)

''(اے راہب!) مجھ سے ان بتوں کے واسطہ سے کوئی بات مت پوچھو۔ بخدا! مجھے جتنی نفرت اِن سے ہے اور کسی سے نہیں۔''

جب حقیقتِ حال یہ ہے تو اب اس آیت کا مفہوم کیا ہے۔ علامہ قرطبی نے متعدد جواب نقل کئے ہیں جن میں سے زیادہ قابلِ ترجیح اُن کا یہ جواب ہے :

مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَاالْكِتٰبُ لَوْلَا اِنْعَامُنَا عَلَيْكَ وَلَا الْاِيْمَانُ لَوْلَا هِدَايَتُنَا لَكَ

''آپ پر اگر ہمارا لطف وانعام نہ ہوتا تو آپ کتاب کو نہ جان سکتے اور اگر ہم آپ کی راہ نمائی نہ فرماتے تو آپ کو ایمان کا بھی علم نہ ہوتا۔'' (تفسیر قرطبی)

نیز درایت کی نفی سے علم کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ درایت کہتے ہیں کسی چیز کو ظن وتخمین سے یا اٹکل پچو سے جاننا۔ تاج العروس میں اس کا یہ معنیٰ لکھا ہے کہ کسی حیلہ سے کسی چیز کے جاننے کو درایت کہتے ہیں' اسی لئے اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر نہیں ہوتا۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ ہیں جنہیں دلائلِ عقلیہ سے پہچانا جا سکتا ہے اور دوسری وہ ہیں جن کی معرفت دلائلِ سمعیہ کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ دوسری قسم کی معرفت نبوت سے پہلے آپ کو حاصل نہ تھی۔ (تفسیر کبیر بحوالہ ضیاءالقرآن' جلد چہارم' صفحہ ۳۹۵)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کندھوں کے درمیان مہرِ رسالت کندہ تھی جس کے متعلق مارٹن لنگز کہتا ہے :

''محمد (ﷺ) اپنا کرتہ اوپر کرنے میں نہیں جھجکے جب راہب نے بالآخر آپ سے کہا کہ وہ آپ کی پشت دیکھنا چاہتا ہے۔ بحیرہ نامی راہب کو پہلے علم الیقین تھا لیکن وہ اب عین الیقین سے اُس مہرِ نبوّت کو دیکھنا چاہتا تھا جیسا کہ اُس کی اپنی کتاب (انجیل) میں اُسی مقام پر مُہرِ نبوّت ہونے کی نشاندہی کی گئی تھی۔''

("Muhammad--- His Life Based on the Earliest Sources".. Martin Lings, p. 30)

(56) وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِن قَبْلِهِ مِن كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ۝
(العنکبوت: ۴۸)

''اور (اے حبیبِ محتشم!) اس سے پہلے آپ کوئی کتاب نہیں پڑھا کرتے تھے اور نہ ہی آپ اُسے اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے ورنہ اہلِ باطل اُسی وقت شک میں پڑ جاتے۔'' (۴۸ : ۲۹)

یعنی اُس وقت کچھ تو منشائے اشتباہ ان لوگوں کے پاس ہوتا اور یہ لوگ آپ ﷺ کی بابت یہ کہنے لگتے کہ آدمی پڑھے لکھے ہیں' کسی دوسری آسمانی کتاب سے مضامین چُرا لیتے ہیں حالانکہ قرآن کے وجوہِ اعجاز اتنے کھلے ہیں کہ اُس وقت بھی دعویٰ کو چلنے نہ دیتے لیکن بہر حال کچھ تو گنجائش ہوتی اور اب تو اتنی بھی نہیں۔ رسولِ کریم ﷺ کی اُمیّت اور ناخواندہ ہونے پر اس سے بڑھ کر صریح شہادت اور کیا ہوگی۔ اس پر بھی ناحق شناسوں کا ایک گروہ (خصوصاً مسیحی پادریوں کا) آج تک اس پر مصر چلا آرہا ہے کہ آپ ضرور پڑھے لکھے تھے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اُمّی ہونا تسلیم شدہ اور متفق علیہ تاریخی حقیقت ہے جسے اسلام کے انتہائی متعصب اور پکے' عادی دشمنوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ مثلاً:

(۱) ''اس نوجوان کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم نہیں دی گئی تھی۔'' ("Decline and Fall of the Roman Empire",... Edward Gibbon, p. 376)

(۲) ''جہاں تک تحصیلِ علم کا تعلق ہے تو یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ محمد (ﷺ) نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔'' ... ("Preliminary Discourse to the Translation of the Koran" George Sale, p. 730

(۳) ''بات غالباً یہی ہے کہ محمد (ﷺ) نہ ہی لکھنا اور نہ ہی پڑھنا جانتے تھے۔'' ("The Quran" -- Introduction --- Palmer, p. XLVII)

(۴) ''اس بات کی کوئی شہادت نہیں مل سکی کہ محمد (ﷺ) نوشت و خواند سے واقف تھے۔''
(انسائیکلو پیڈیا بریٹینیکا' جلد ہشتم' صفحہ ۴۸۳)

(۵) ''یہ بات یقینی ہے کہ محمد (ﷺ) نے نہ تو بائبل پڑھی تھی اور نہ ہی کوئی دوسری کتب۔''
(Historians' History of the World, Vol. VIII, p. 11)

(۶) ''اگر محمد (ﷺ) واقعی ناخواندہ تھے جیسا کہ مسلمان آپ کے بارے میں بتاتے ہیں تو اُن کے اس نتیجہ نکالنے سے فرار ممکن نہیں کہ قرآن آپ کا مستقل معجزہ ہے۔''
("The Koran" Preface
--- Rodwell, p. 21)

(57) قُلْ مَا كُنتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ O (الاحقاف : ۹)

''فرمادیجئے کہ میں کوئی انوکھا رسول تو نہیں ہوں اور میں ازخود (یعنی محض اپنی عقل و درایت سے) نہیں جانتا کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا' (میرا علم تو یہ ہے کہ) میں صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف بھیجی جاتی ہے اور میں تو صرف واضح ڈر سنانے والا ہوں۔'' (۴۶:۹)

علمائے محققین نے آیت کے اس مفہوم کو مسترد کر دیا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی عاقبت اور انجام کے بارے میں (معاذ اللہ) کچھ خبر نہ تھی اور نہ ہی دوسرے لوگوں کے احوالِ آخرت کا کوئی علم تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو حکم دیں کہ تم کفار کو بتا دو کہ مجھے اپنے اور تمہارے انجام کی کوئی خبر نہیں۔ کفار بڑی آسانی سے یہ کہہ کر حضور علیہ السلام کی دعوت کو مسترد کر سکتے تھے کہ جب آپ کو اپنے بارے میں کچھ خبر نہیں تو پھر ایک غیر یقینی چیز کی طرف دعوت دینے کے لئے یہاں کیسے آ دھمکے؟ چنانچہ ابن جریر طبری' قرطبی' مظہری اور دیگر اکابر نے اس قول کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو روزِ ازل سے اپنی نجات کا یقین تھا۔

''قرآن کریم کی کثیر التعداد آیات میں اہلِ ایمان کو مغفرت کا مژدہ ہے اور منکرین کو دوزخ کی وعید۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اعزازات کا ذکر قرآن مجید اور احادیثِ طیّبہ دونوں میں بڑی شرح و بسط سے موجود ہے۔ مقامِ شفاعتِ کبریٰ اور کوثر وغیرہ جیسے امور کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے؟ ایک مرتبہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ بِيَدِي لِوَاءُ الْحَمْدِ وَلَا فَخْرَ وَآدَمُ وَمَا سِوَاهُ تَحْتَ لِوَائِي وَلَا فَخْرَ

''قیامت کے دن اولادِ آدم کا میں سردار ہوں گا' حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا' آدم اور دیگر پیغمبروں کو میرے جھنڈے کے نیچے پناہ ملے گی۔ یہ باتیں فخریہ طور پر نہیں' اظہارِ حقیقت کر رہا ہوں۔''

''ایسی بے شمار احادیثِ صحیحہ ہیں جن میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقاماتِ رفیعہ اور درجاتِ سنّیہ کا ذکر موجود ہے۔ حضور سرورِ ہر عالم ﷺ نے تو اپنے متعدد غلاموں کے نام لے لے کر اُن کے جنّتی ہونے کی بشارت دی۔ عشرہ مُبشّرہ کے ناموں سے کون واقف نہیں۔ حسنین کریمین کے بارے میں فرمایا: سَيِّدَا شَبَابِ أَهْلِ الْجَنَّةِ ''یہ دونوں شہزادے اہلِ جنت کے جوانوں کے سردار ہوں گے۔'' اپنی نورِ نظر صاحبزادی سیّدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرمایا: هِيَ سَيِّدَةُ نِسَاءِ أَهْلِ الْجَنَّةِ ''وہ جنتی عورتوں کی سردار ہوں گی۔'' حضرت

ثابت بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق فرمایا: اے ثابت! اَمَا تَرْضٰی اَنْ تَعِیْشَ حَمِیْدًا وَّتُقْتَلَ شَھِیْدًا وَّتَدْخُلَ الْجَنَّۃَ ''کیا تم اِس بات سے راضی نہیں کہ تم عزت و اکرام سے زندگی بسر کرو، تمہیں شہادت کا شرف بخشا جائے اور تم جنت میں داخل ہو جاؤ۔'' اور یہ وہی ثابت بن قیس ہیں جنہیں خلافتِ صدیقی کے دوران جنگِ یمامہ میں شہادت کا شرف حاصل ہوا۔

اس قسم کے سینکڑوں واقعات سے کتبِ احادیث بھری پڑی ہیں اور اِن آیاتِ محکمات اور احادیثِ صحیحہ کی موجودگی میں یہ کہنا بڑی گستاخی ہے کہ (معاذ اللہ) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنے انجام کی خبر نہ تھی۔

اب آیئے آیتِ مذکورہ کے لفظ مَا اَدْرِیْ کی طرف جس کی تحقیق کرنے سے ساری تشویش دُور ہو جاتی ہے۔

علامہ راغب اصفہانی اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''مفردات القرآن'' میں اس لفظ کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
''درایت اُس معرفت کو کہتے ہیں جو ظن و تخمین (Self-estimation) سے حاصل ہوتی ہے اور فہم و ذہانت سے کسی چیز کو سمجھنا درایت کہلاتا ہے۔''

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ درایت کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔

علامہ ابنِ عابدین شامی نے درایت کی تشریح اس طرح کی ہے:
''عقل کا بذریعہ قیاس کسی چیز کو جاننا درایت کہلاتا ہے۔'' (ردّ المختار، جلد اوّل، صفحہ ۹۷)

''اِن تصریحات سے واضح ہو گیا کہ درایت کا مفہوم یہ ہے کہ غور و فکر، ظن و تخمین اور قیاس آرائی سے کسی چیز کا علم حاصل کرنا۔ یہ مفہوم ذہن نشین کر کے اب آیت میں غور کیجئے تو ادنیٰ سا شبہ بھی باقی نہیں رہے گا اور آیاتِ قرآنی میں باہمی تضاد یا احادیثِ صحیحہ سے تعارض کی نوبت بھی نہ آئے گی۔''

''اللہ تعالیٰ اپنے حبیب مکرّم ﷺ کو حکم دے رہا ہے کہ آپ ان کفار کو بتا دیجئے کہ میں اپنی عقل و فہم، ذہانت و فطانت اور قیاس سے نہ یہ جانتا ہوں کہ آخرت میں میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا، نہ میں یہ جان سکتا ہوں کہ اس دنیا میں میرا اور مجھ پر ایمان لانے والوں کا اور میری اِس دعوت کا انجام کیا ہوگا یا تمہاری سرکشی کی تمہیں کب اور کیا سزا ملے گی۔ اِن امور کو میں اپنی فہم و فراست سے نہ تفصیلاً جان سکتا ہوں اور نہ اِجمالاً۔ میرا علمی سرمایہ میری عقل، شعور کا اثر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ اگر میں نے غور و فکر سے اِن حقائق کو جانا ہوتا تو اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہو سکتی تھی اور تمہیں یہ حق پہنچتا تھا کہ اُسے جانچو اور اپنی کسوٹی پر پرکھو لیکن میرا علم تو اللہ

تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔اس میں شک وشبہ کا ذرا شائبہ نہیں۔مَا اَدْرِیْ سے درایت کی نفی ہے۔مَایُوْحٰی اِلَیَّ سے علمِ خداداد کا ثبوت ہے۔سکھلانے والا اللہ تعالیٰ ہو اور سیکھنے والا مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء ہو' استاد عالم الغیب والشہادۃ ہو اور تلمیذ غارِ حرا کا گوشہ نشین ہو' بھیجنے والا ربّ العالمین ہو اور آنے والا رحمۃ للعالمین ہو' وہاں کمی رہے گی تو کیسے؟ کوئی نقص ہوگا تو کس جانب سے؟''

''آخر میں چند مفسرین کی آراء بھی ملاحظہ فرمایئے۔آپ کا آئینۂ دل ہر قسم کے گرد وغبار سے پاک ہو جائے گا''

''علامہ ابن جریر طبری نے اِس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے متعدد اقوال لکھے ہیں۔اُن میں سے ایک قول حضرت حسن بصری کا ہے۔وہ فرماتے ہیں:

''یہ کہنا کہ حضور علیہ السلام کو یہ علم نہ تھا کہ آخرت میں آپ ﷺ کے ساتھ کیا کیا جائے گا تو ایسی نازیبا حرکت سے ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔حضور علیہ السلام کو اُس وقت سے اپنے ناجی ہونے کا علم تھا جب روزِ اوّل ارواحِ انبیاء سے حضور علیہ السلام پر ایمان لانے کا وعدہ لیا گیا تھا۔بلکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں نہیں جانتا کہ دنیا میں مجھے سابقہ انبیاء کی طرح جلاوطن کر دیا جائے گا یا نہیں۔''

''ابنِ جریر طبری' حسن بصری کے مذکورہ قول کو صحیح قرار دیتے ہیں۔پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو اِس دنیا میں جو معاملہ آپ علیہ السلام سے کیا جانے والا تھا اور جو سلوک آپ کی قوم اور دوسرے کذّابین کے ساتھ ہونے والا تھا' اُس کو بیان کر دیا۔''

''علامہ نیشاپوری لکھتے ہیں:

''آیت میں خود بخود جان لینے کی نفی کی گئی ہے اور جو بذریعہ وحی عطا ہو' اُس کی نفی نہیں۔''

''علامہ سید محمود آلوسی نے بڑی شرح وبسط کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کیا ہے۔فرماتے ہیں:

''میرے نزدیک پسندیدہ قول یہ ہے کہ نفی اُس درایت کی ہے جو وحی کے بغیر ہو خواہ تفصیلی ہو یا اجمالی' اُس کا تعلق دُنیوی واقعات سے ہو یا اُخروی حالات سے۔میرا عقیدہ یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام نے اِس دنیا سے انتقال نہیں فرمایا جب تک حضور علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی ذات' اُس کی صفات اور اُس کے شئون کا علم اور تمام ایسی اشیاء کا علم جو وجہِ کمال ہے' نہ دے دیا گیا ہو۔'' (روح المعانی)

(58) وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (البقرۃ: ۴)

''اور وہ لوگ جو آپ کی طرف نازل کیا گیا اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا' (سب) پر ایمان لاتے ہیں۔'' (۲ : ۴)

اِس آیت میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس پر خاتمیتِ رسالت کا بیان ہے کیونکہ آیت میں وحی کے دو زمانوں کا ذکر ہے ایک تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اور دوسرا انبیائے سابقہ پر وحی کے نزول کا ذکر۔ اگر آپ ﷺ کے بعد کسی اور نبی یا رسول نے آنا ہوتا تو اُس پر بھی ایمان لانے کا ذکر یہاں یا قرآن میں کسی اور جگہ ضرور ہوتا۔ قرآن مجید میں ہر جگہ اسی طرزِ بیان کو اختیار کیا گیا ہے جس سے ختمِ نبوّت کا بالوضاحت ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً فرمایا:

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتٰبِ الَّذِي نَزَّلَ عَلٰى رَسُولِهِ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ (النسآء : ۱۳۶)

''اے ایمان والو! اللہ پر اور اُس کے رسول (ﷺ) پر اور اُس کتاب پر جو اُس نے اپنے رسول (ﷺ) پر نازل فرمائی ہے اور اُس کتاب پر جو اُس نے (اس سے پہلے) نازل فرمائی ہے' ایمان لے آؤ۔'' ☆ (۴ : ۱۳۶)

(۲) لٰكِنِ الرّٰسِخُونَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُونَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (النسآء : ۱۶۲)

''لیکن اُن میں سے پختہ علم والے اور مؤمن لوگ اس (وحی) پر جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اور اُس (وحی) پر جو آپ سے پہلے نازل کی گئی (برابر) ایمان لاتے ہیں۔'' (۴ : ۱۶۲)

(۳) قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُونَ مِنَّا إِلَّا أَنْ آمَنَّا بِاللهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ (المائدة : ۵۹)

''(اے نبیِ محتشم!) فرما دیجئے: اے اہلِ کتاب! تمہیں ہماری کون سی بات بری لگی ہے سوائے اس کے کہ ہم اللہ پر اور اس (کتاب) پر جو ہماری طرف نازل کی گئی ہے اور اُن (کتابوں) پر جو پہلے نازل کی جا چکی ہیں' ایمان لائے ہیں۔'' (۵ : ۵۹)

(59) يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا لَّكُمْ وَإِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (النسآء : ۱۷۰)

''اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے یہ رسول (ﷺ) حق کے ساتھ تشریف لایا ہے' سو تم (اُن پر) اپنی بہتری کے لئے ایمان لے آؤ اور اگر تم کفر (یعنی اُن کی رسالت سے

☆ یہاں مؤمنوں سے فرمایا جا رہا ہے کہ ایمان لے آؤ' اس میں تحصیلِ حاصل ہے جو محال ہے۔ پھر یہ حکم کیوں دیا گیا' وہ تو پہلے ہی سے مؤمن ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مؤمنوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اسی طرح ایمان پر قائم رہو۔ نماز میں مسلمانوں کو اس دعا کی تعلیم دی گئی: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (اے اللہ! ہمیں سیدھی راہ دکھا) نمازی تو پہلے ہی سے سیدھی راہ پر ہوتا ہے۔ مطلب وہی ہے کہ ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت پر قائم رکھ۔ یا جیسے سورۃ الاحزاب کی اوّل آیت میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے خطاب ہوا: يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللهَ (اے نبیِ مکرّم! اللہ سے اسی طرح ڈرتے رہئے۔) (تفسیر نعیمی)

انکار) کرو گے تو (جان لو وہ تم سے بے نیاز ہے کیونکہ) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے' یقیناً (وہ سب) اللہ ہی کا ہے۔'' (۴ : ۱۷۰)

غور کیجئے کہ شانِ صمدیت کا حامل رب کس طرح آرزومند ہے کہ تمام نوعِ انسانی اُس کے آخری رسول ﷺ پر ایمان لے آئے کیونکہ یَا اَیُّھَا النَّاسُ کے الفاظ میں خطاب تمام نوعِ انسان سے ہے نہ کہ صرف قومِ عرب سے۔ رب تعالیٰ کا یہ حکم ہمارے اپنے مفاد میں ہے نہ کہ اُس بے نیاز ذات کا جو ہر چیز سے مستغنی ہے اور کائنات کا ذرّہ ذرّہ اُسی کا محتاج ہے۔ یہاں بھی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کل کائناتی اور آفاقی مشن کا پتہ چلتا ہے۔

(60) یَا اَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَ کُمْ بُرْھَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا O (النساء: ۱۷۴)

''اے لوگو! بے شک تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے (ذاتِ محمدی کی صورت میں) دلیلِ قاطع آ گئی ہے اور ہم نے تمہاری طرف (بہ صورتِ قرآن) واضح اور روشن نور (بھی) اتار دیا ہے۔'' (۴:۱۷۴)

بُرْھَان کا معنیٰ سب سے زیادہ مضبوط' کامل اور واضح دلیلِ قاطع کا ہے جسے توڑا نہ جا سکے۔ تقریباً سب مفسرین کے نزدیک یہاں بُرْھَان سے مراد نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ ستودہ صفات ہے۔ غور کیجئے کہ یہاں بھی خطاب پوری نوعِ انسانی سے ہے نہ کہ صرف قومِ عرب سے جس کا مفہوم یہی ہے کہ کائنات وآفاق کے تمام لوگ اکٹھے ہو کر میرے حبیبِ مکرّم کو خوب خوب پرکھ لیں اور آزما لیں۔ جس زاویہ اور جس جہت سے بھی وہ اُن کی آزمائش کریں گے' ہر طرح اُنہیں مکمل و اکمل اور اتم پائیں گے۔ اکملیت اور اِتمامیت میرے حبیبِ محتشم پر ختم ہے۔ وہ تمہارے رب کی دلیل ہیں۔ تم بگاڑنے کی کوشش کرو گے' نہیں بگاڑ سکو گے۔ تمہارا مقدّر تو بگڑ سکتا ہے مگر یہ دلیل نہیں بگڑ سکتی کیونکہ برہانِ ربانی ہونے کی حیثیت سے اُن کی حیاتِ طیبہ اور اُن کی عزت وآبرو ہماری حفاظت میں ہے۔

<u>دعویٰ اور دلیل کا باہمی تعلق</u>: اصول یہ ہے کہ آدمی پہلے دعویٰ کرتا ہے اور پھر اُس پر دلیل دیتا ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ دعویٰ کچھ بھی نہ ہو اور دلیل دینا شروع کر دیا جائے۔ تو ہمیں قرآن وحدیث کی روشنی میں دیکھنا یہ ہے کہ محمد رّسول اللہ ﷺ کو آخر کس دعویٰ کی دلیل کہا گیا ہے۔ اسلام کا دعویٰ ہے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور اس دعویٰ کی دلیل ہیں: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ پہلے دلیل کو سمجھاتے ہیں تب دعویٰ سمجھ میں آتا ہے۔ دلیل کا بذاتِ خود سمجھانا مقصود نہیں ہوا کرتا بلکہ مقصود یہ ہوتا ہے کہ لوگ دعویٰ کو سمجھ لیں۔

اس ناگزیر حقیقت کو سمجھنے کے لئے ایک مثال ذہن نشین کر لیں۔ مثلاً میں اگر کوئی دعویٰ کروں تو آپ چاہیں دعویٰ کو مانیں یا نہ مانیں۔ فوراً یہی کہیں گے کہ دلیل دو۔ دعویٰ کی مخالفت فوراً شروع نہیں کی۔ پہلے فرمایا کہ

دلیل دو۔ میں نے جب دلیل دے دی تو کہنے لگے: یہ کیسی دلیل دی' اس میں یہ نقص ہے' یہ تو بہت کمزور دلیل ہے۔ میں نے دوسری دلیل دی' کہا: اس میں یہ عیب۔ تیسری دلیل دی گئی کہا کہ اس میں یہ کھوٹ۔ میں نے چوتھی دلیل دی۔ غرضیکہ میں دلیل پر دلیل دیئے جا رہا ہوں اور وہ دلیل کو بگاڑتے جا رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ دعویٰ سے کوئی نہیں الجھا کرتا' الجھتے ہیں تو دلیل سے الجھتے ہیں۔ اسی لئے ہمیں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سے کوئی کلمہ گو ٹکراتا ہوا نظر نہیں آیا۔ جو بھی الجھ رہا ہے مُحَمَّد" رَسُولُ اللّٰہ سے الجھ رہا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ دلیل ناقص ثابت ہوگئی تو دعویٰ خود بخود ناقص ہو جائے گا اور اگر یہ دلیل ٹوٹ گئی تو دعویٰ بھی ٹوٹ جائے گا۔ یاد رہے کہ شیطان لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا منکر کبھی نہ تھا۔ جب امتحان کی منزل آئی تو کہا گیا کہ تم دعویٰ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی دلیل مُحَمَّد" رَسُولُ اللّٰہ کی روشنی میں مانتے ہو کہ نہیں؟ تو وہ انکار کر گیا۔ تو جو دلیل کا منکر ہوا' اُسے دعویٰ کا بھی منکر سمجھا گیا۔

جب تک آدمی دلیل کو نہیں سمجھتا' دعویٰ پر ایمان نہیں لاتا۔ جب مصر کے جادوگروں نے موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام سے مقابلہ کیا تھا جس کے نتیجہ میں وہ جادوگر رب العالمین پر ایمان لا رہے ہیں جو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا رب ہے۔ غور طلب مقام ہے کہ کمال تو دیکھا موسیٰ علیہ السلام کا اور ایمان لا رہے ہیں ربِّ موسیٰ پر۔ معجزہ دیکھا حضرت کلیم اللہ کا اور ایمان لائے ربِّ موسیٰ پر۔ معلوم ہوا کہ جو دلیل کو مانتا ہے' اُسے دعویٰ کو ماننا پڑتا ہے اور جب تک بندہ دلیل سے دُور رہتا ہے' دعویٰ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ مثال اس کی عمر (جو ابھی فاروق نہیں بنا) سے سمجھئے۔ نبی علیہ السلام کا (معاذ اللہ) خاتمہ کرنے وہ ننگی تلوار لئے جا رہا ہے' تیور ٹھیک نہیں ہیں۔ قدرت کا انتظام تو دیکھئے' دعویٰ کو اپنی دلیل کے قریب کر رہا ہے۔ بڑے ہی غصے میں ہیں لیکن چشمِ کائنات نے دیکھا کہ۔

عمر سوئے نبی گئے' نظر سوئے عمر گئی   پڑی نگاہِ مصطفیٰ تو زندگی سنور گئی

دیکھا آپ نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دلیل کو سمجھ لیا تو دعویٰ کا ماننا پڑ گیا۔

طریقہ تبلیغ: حبیبِ محتشم ﷺ نے فاران کی چوٹی سے اپنی قوم کو بلایا۔ اُن کے بلانے کے بعد جس قوم میں فخرِ ہر جہاں ﷺ نے چالیس سال تک خاموش زندگی گزاری تھی' اُن سے پوچھا: دیکھو تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ سب نے بہ یک زبان کہا: آپ صادق و امین ہیں۔ فرمایا: اچھا اگر تم مجھے ایسا ہی سمجھتے ہو تو اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے دامن میں ایک لشکر تم پر حملہ آور ہونے کو ہے تو کیا میرے کہنے سے تم اس بات کو مان لو گے؟ سب نے کہا: ضرور' اس لئے کہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اچھا تو جب تم میرے کہنے سے اُس بن دیکھے لشکر کو مان رہے ہو تو پھر میرے ہی کہنے سے اُس بن دیکھے وحدہٗ لاشریک لہٗ' اللہ کو بھی مان لو۔ قُوْلُوْا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفْلِحُوْا (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ ڈالو' نجات پا جاؤ گے)۔ دیکھئے رسول نے پہلے اپنے آپ کو منوا لیا پھر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا پیغام اُن کے سامنے رکھا۔ اس لئے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دعوت ہے۔ مُحَمَّد" رَّسولُ اللّٰہ داعی ہیں۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہدایت ہے' مُحَمَّد" رَّسولُ اللّٰہ ہادی ہیں۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ارشاد ہے' مُحَمَّد" رَّسولُ اللّٰہ مرشد ہیں۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کلام ہے' مُحَمَّد" رَّسولُ اللّٰہ متکلم ہیں۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ذکر ہے' مُحَمَّد" رَّسولُ اللّٰہ ذاکر ہیں۔ جو داعی کو نہ مانے وہ دعوت کو کیا

مانے گا؟ جو ہادی کو نہ مانے' وہ ہدایت کو کیا مانے گا؟ جو قائل کو نہ مانے' وہ قول کو کیا مانے گا۔ جو ذاکر کو نہ مانے' وہ ذکر کو کیسے مانے گا؟ تو رسول نے تبلیغ کا جو طریقہ ہمیں دیا ہے' وہ یہی ہے کہ پہلے ہمیں منواؤ' پھر اللہ کو وہ خود ہی مان لیں گے۔

بُرھان کے حوالہ سے یہاں چند اہم نِکات کا ذکر کرنا ضروری ہے:

(۱) ہر شخص کا علم برابر نہیں ہوا کرتا۔ میں نے ایک دلیل دی تو میرے استاد نے اُسے توڑ دیا اس لئے کہ میرے استاد کا علم میرے علم سے زیادہ ہے۔ میرے استاد نے دلیل دی تو اُن کے استاد نے اُسے توڑ دیا۔ معلوم ہوا کہ جب علم بڑھتا جاتا ہے تو دلیل کو توڑنے اور اُس کے اندر نقص پیدا کرنے کی بھی صلاحیت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تمہارے رب کی دلیل ہے۔ اب اُسے توڑنے کے لئے رب کے علم سے بڑھ کر یا کم از کم رب کے برابر علم لے آؤ۔ اور جب دونوں چیزیں محال ہیں تو اس کے اندر عیب اور نقص کا ہونا بھی محال ہے۔

(۲) یہ بات بھی محلِ نظر رہے کہ اگر دلیل ٹوٹے گی تو دلیل کا کیا ہوگا؟ یہ تو دلیل دینے والے کے ناموس کا سوال ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ ہماری دلیل ٹوٹنے نہ پائے لیکن ہم اپنی کوشش میں ناکام ہو سکتے ہیں۔ اگر قادرِ مطلق یہ چاہے کہ اُس کی دلیل ٹوٹنے نہ پائے تو کون اُسے توڑ سکے گا؟ جسے خدا سنوارے' اُسے کون بگاڑ سکتا ہے!

(۳) دیکھنے والے اس دلیل کو اس حیثیت سے نہیں دیکھ رہے کہ یہ لَآاِلٰـــہَ اِلَّا اللّٰہُ کی دلیل ہیں بلکہ اس حیثیت سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ چلتا پھرتا ہے' کھاتا پیتا ہے' سوتا ہے' جاگتا ہے' اُٹھتا بیٹھتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اے میرے رسول کی زندگی کا مطالعہ کرنے والو! میرا یہ اصرار ہرگز نہیں ہے کہ میرے رسول کا اُٹھنا بیٹھنا نہ دیکھو' اُن کا چلنا پھرنا نہ دیکھو' اُن کا سونا جاگنا اور کھانا پینا نہ دیکھو۔ اے دیکھنے والو! دیکھو اور ضرور دیکھو۔ اگر تم میرے رسول کا اُٹھنا بیٹھنا نہ دیکھو گے تو تمہیں اُٹھنے بیٹھنے کا طریقہ کہاں سے آئے گا' اگر تم اُن کا کھانا پینا نہ دیکھو گے تو تمہیں کھانے پینے کا سلیقہ کہاں سے آئے گا۔ مگر اے دیکھنے والو! میری گزارش صرف اِتنی ہے کہ ایک ہی منظر مت دیکھو۔ زمین پر چلتا پھرتا دیکھو تو کہکشاں سے گزرتا ہوا بھی دیکھ لو۔ مکّہ کی گلیوں میں کسی کا بوجھ اُٹھاتا دیکھو تو سورج کا پلٹانا بھی تو دیکھ لو۔ اگر دندان مبارک کا شہید ہونا دیکھو تو سینہ مبارک شق ہونے کے باوجود قطرۂ خون نہ نکلا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھی دیکھو وہ بھی دیکھو اس لئے کہ جب تک تم میرے رسول کو اُٹھتا بیٹھتا' چلتا پھرتا' کھاتا پیتا' سوتا جاگتا اور اُن کے دندانِ مبارک کا شہید ہونا دیکھو گے' جب تک تم یہ سب دیکھتے رہو گے' اُس رسولِ خدا کو خدا نہیں کہہ سکو گے۔ اور جب قابَ قوسین میں دیکھو گے' جب سِدرہ کے اوپر دیکھو گے' جب سورج کو پلٹاتا دیکھو گے' جب چاند کو دولخت کرتا دیکھو گے' جب جانوروں سے سجدہ کراتا دیکھو گے' جب سنگریزوں سے کلمہ پڑھاتا دیکھو گے تو اس رسول کو اپنے جیسا نہ کہہ سکو گے۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ یہ بھی دیکھو' وہ بھی دیکھو۔ نہ اُنہیں خدا کہہ سکو اور نہ اپنے جیسا کہہ سکو۔

جیسا کہ بیان ہوا کہ لَآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دعویٰ ہے اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ اُس دعویٰ کی دلیل ہے۔ دعویٰ اور دلیل کو اکٹھا ملا کر پڑھنے سے وہ کلمہ طیّبہ بن گیا جس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے (یعنی لَآاِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ) کا تعلق خالق یعنی الوہیت سے اور دوسرے حصے (یعنی مُحَمَّد" رَّسُوْلُ اللّٰہ) کا تعلق مخلوق یعنی رسول سے ہے۔ اصول یہ ہے کہ جب دو باتیں کہی ہوں تو دونوں کے درمیان عربی زبان میں واؤ، اردو میں "اور" اور انگریزی میں لفظ And لاتے ہیں جیسے میں نے کھانا کھایا اور پانی پیا۔ زید آیا اور بکر گیا۔ یہ "اور" کا لفظ بتا رہا ہے کہ پہلے اور دوسرے جملہ میں مغایرت (یعنی غیریت) ہے۔ اس اصول کی روشنی میں کلمہ یوں ہونا چاہئے تھا: لَآاِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَمُحَمَّد" رَّسُوْلُ اللّٰہ مگر نہیں، یہاں درمیان میں واؤ لانے سے ایمان رخصت ہو جائے گا۔ تو گویا اصل کلمہ طیبہ میں رب تعالیٰ نے اپنے اور رسول کے درمیان واؤ کی ہمراہی کو بھی برداشت نہیں کیا۔ اگر واؤ درمیان میں لایا جاتا تو دونوں جملوں یعنی دعویٰ اور دلیل میں مغایرت (غیریت) ثابت ہو جاتی۔ اگر دلیل دعویٰ سے جدا ہو جائے تو دعویٰ کو کون سمجھائے؟ رسالت کو الوہیت سے جدا کرنا کج روی ہے اور قرآنِ مجید ایسی کج روی کے بارے میں حسبِ ذیل وعید سناتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًاO اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا وَ اَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًاO وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَلَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ اُولٰٓئِکَ سَوْفَ یُؤْتِیْھِمْ اُجُوْرَھُمْ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًاO (اَلنِّسَآء: ۱۵۰-۱۵۲)

"بلاشبہ جو لوگ اللہ اور اُس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اُس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ اِس (ایمان و کفر) کے درمیان کوئی راہ نکال لیں۔ ایسے ہی لوگ درحقیقت کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لئے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ اللہ اور اُس کے (سب) رسولوں پر ایمان لائے اور ان (پیغمبروں) میں سے کسی کے درمیان (ایمان لانے میں) فرق نہ کیا تو عنقریب وہ اُنہیں اُن کے اجر عطا فرمائے گا اور اللہ بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔" (۴: ۱۵۰-۱۵۲)

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کا آخری رسول ﷺ اپنے خالق و مالک اللہ کا محبوب ہے اور اللہ اُس کا محبّ ہے۔ ہر زبان کا دستور یہ ہے کہ محبوب کا نام اُس کے محبّ کے نام سے پہلے ہوتا ہے جیسے سسی پنوں۔ ہیر رانجھا۔ شیریں فرہاد وغیرہ۔ لیکن یہاں معاملہ الٹ ہے کہ کلمہ طیّبہ میں محبّ (اللہ) کا نام پہلے اور محبوب (یعنی محمد) کا نام بعد میں ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلوی نے اِس معمہ کا جواب دیا ہے کہ جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے نورِ محمدی کو پیدا فرمانا چاہا تو اُس نے ارشاد فرمایا: مُحَمَّد" رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ نورِ محمدی نے پیدا ہو کر جواب میں کہا: لَآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ رب نے پھر فرمایا: مُحَمَّد" رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ نورِ محمدی نے پھر کہا: لَآاِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ تو لَآاِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ رسول کا کلام ہے اور مُحَمَّد" رَّسُوْلُ اللّٰہِ خدا کا کلام ہے۔ اب کلمہ کی ترتیب سمجھ میں آ گئی۔ پہلے لَآاِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ اس لئے کہ جو لَآاِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ کہے گا وہ سنتِ مصطفیٰ ادا کرے گا اور جو مُحَمَّد" رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہے گا وہ سنتِ کبریاء ادا کرے گا تو پہلے سنتِ

مصطفیٰ ہے' پھر سنتِ کبریاء ہے اور مقصد یہ ہے کہ جب تک سنتِ مصطفیٰ ادا نہ کر پاؤ گے' ہم تمہیں آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔ عارفینِ کاملین نے اس سے بڑھ کر ادب و محبت کی بات کی ہے کہ کلمہ طیّبہ میں رب نے اپنے نام کو محبوب کے نام سے پہلے اس لئے رکھا کہ اے کلمہ کے پڑھنے والے! میرا نام پہلے لے کر اپنے ظاہر و باطن اور زبان کی صفائی کر لے' پھر اس کے بعد میرے محبوبِ محتشم کا نام زبان پر لے آنا۔☆

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ دلیل کا کام اطمینان و سکون دینا اور دعویٰ کا کام اضطراب و بے قراری دینا ہوتا ہے۔ دعویٰ اگر اضطراب دیتا ہے تو دلیل سکون بخشتی ہے۔ انسانی زندگی کے لمحات کا آخری مرحلہ نزع کی کیفیت ہے جو بہت ہی سخت مرحلہ ہے۔ یوں محسوس کریں کہ کیکر کے خاردار درخت پر بھیگی ہوئی ہلکی چادر ڈال کر اُسے کھینچیں تو ریشے ریشے کی حالت خراب نظر آتی ہے۔ یوں محسوس ہوگا جیسے جسم کے ہر حصّے سے کوئی کانٹے کو کھینچ رہا ہو مگر میرے اور آپ کے رسولِ معظّم نے فرمایا کہ مؤمن کی روح ایسے نکلے گی جیسے پھول سے خوشبو نکل جاتی ہے۔ دعویٰ نے تو بہت ہیبت دے رکھی تھی' دلیل نے سکون دے دیا۔ تفسیر روح البیان میں اس کی تفسیر ہمیں ملی کہ ایک بزرگ نے خواب میں رسولِ پاک ﷺ کی زیارت کی تو پوچھ لیا کہ حضور! نزع کی تکلیفیں تو بہت ہیں مگر آپ فرماتے ہیں کہ مؤمن کی روح ایسے نکلے گی جیسے پھول سے خوشبو نکل جائے۔ سرکار! آپ کا یہ کلام بلاغت نظام ہماری سمجھ میں نہ آسکا۔ تو سرکار نے فرمایا: سورہ یوسف میں غور کرو کہ جمالِ یوسفی جب مصر کی عورتوں کے سامنے بے حجاب ہوا تو اُن کے سارے ہوش و حواس جمالِ یوسفی میں گم ہو گئے اور اُنہوں نے پھلوں کی بجائے اپنی انگلیاں کاٹ ڈالیں اور اُنہیں درد کا احساس تک نہ ہوا۔ سارے احساس اُدھر متوجہ ہو گئے۔ تو رسول اللہ ﷺ فرمانا یہ چاہتے ہیں کہ جب مؤمن کی روح نکلے گی تو جمالِ مصطفیٰ نگاہوں کے سامنے ہوگا' سارے ہوش و حواس گم ہو جائیں گے۔ روح نکل جائے گی' پتہ نہ چلے گا۔ درد ہوگا مگر محسوس نہ ہوگا۔ (رب تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اُس حالت کا مصداق بنائے!) تو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ نے ایک اضطراب پیدا کر دیا تھا' جمالِ مصطفیٰ نے سکون دے دیا کیونکہ دلیل کا کام ہی سکون دینا ہے☆☆

دوسری سخت منزل قبر کی ہے۔ وہاں بھی جہاں دعویٰ ہے' وہیں دلیل ہے۔

تیسری منزل میدان حشر کی ہے جس میں آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عجیب کیفیت ہوگی۔ کبھی آپ باب

☆اسی سے عارفینِ کاملین نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ بیت اللہ شریف کا حج دو طرح کا ہے۔ پہلے حج کیا جائے اور پھر روضہ رسول ﷺ پر حاضری دی جائے۔ دوسرا طریقہ اس کے برعکس ہے یعنی پہلے دربارِ رسول میں حاضری دی جائے اور پھر حج کیا جائے۔ وہ فرماتے ہیں کہ دونوں طرح اگرچہ حج ہو جاتا ہے لیکن افضل یہ ہے کہ پہلے حج کیا جائے تاکہ بندہ گناہوں کی کثافت و آلائش سے منزہ و مطہر اور پاک و صاف ہو کر اپنے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جائے۔

☆☆زائرین نے لازماً محسوس کیا ہوگا کہ مکّہ مکرّمہ میں رب کا جلال ہی جلال ہے لیکن مدینہ منوّرہ میں آقا علیہ السلام کا جمال ہی جمال ہے۔ وہاں کی گلیاں اور کوچے نو وارد کو بھی جانی پہچانی اور مانوس معلوم ہوتی ہیں کہ وہ رحمۃ للعالمین کا شہر ہے۔

جہنم پر دکھائی دے رہے ہیں، کبھی پُل صراط پر ہیں، کبھی میزان کے سامنے ہیں۔ تاجداروں کی طرح آرام سے بیٹھ کر آپ ہر حکم نافذ کر سکتے تھے مگر ایسا نہیں۔ بات یہ ہے کہ آپ ﷺ کو تو ایک عجیب منظر پیش کرنا ہے۔ اُنہیں جہنم کے دروازے پر بھی رہنا ہے، پُل صراط پر بھی رہنا ہے، میزان کے پاس بھی رہنا ہے۔ صرف حکم دینے پر آپ اکتفا نہیں فرمارہے، اس لئے کہ جب میری اُمت کے گنہگار جہنم کی طرف لائے جائیں گے، اُس وقت اُن کے قدم ڈگمگا رہے ہوں گے، اُن کے دلوں میں اضطراب ہوگا اور جب جہنم کے دروازے پر مجھے دیکھیں گے تو اُنہیں سکون مل جائے گا کہ میرا نکالنے اور بچانے والا تو پہلے ہی سے موجود ہے۔ تو لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ نے بے قرار کیا تو رسول ﷺ نے اطمینان دے دیا۔ اسی طرح جب بندہ گناہوں کی گٹھڑی لے کر لرزتے ہوئے قدم، دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میزان کی طرف بڑھے گا تو کتنی پریشانی اور کتنا اضطراب ہوگا مگر جب وہ وہاں رسول کو دیکھے گا تو اُسے اطمینان ہو جائے گا۔ یہی حال پُل صراط پر سے گزرنے کا ہوگا۔ غرض جہاں جہاں دعوے کا جلال ہے، وہاں وہاں دلیل کا جمال ہے۔ جہاں جہاں دعوے کی ہیبت ہے، وہاں وہاں دلیل کی رحمت ہے۔

ذرا یاد تو کیجئے رسول کے دستِ مبارک سے لگے ہوئے اُس رومال کو جو صحابیِ رسول کے پاس محفوظ تھا۔ وہ رومال جب میلا ہو جاتا یا اُسے کبھی دھونے کی ضرورت پیش آتی تو وہ اُسے جلتے ہوئے تنور میں ڈال دیتے تھے اور جب اُسے وہاں سے نکالتے تھے تو وہ بالکل دُھل کر صاف و شفاف نکلتا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ نارِ نمرود میں ابراہیم علیہ السلام کے جانے سے وہ آتش کدہ گل کدہ ہو گیا اور آگ ٹھنڈی ہو گئی لیکن خیال رہے کہ جنابِ ابراہیم علیہ السلام کی ذاتِ بابرکات وہاں گئی تھی۔ یہاں رومال کے حوالے سے رسول خود تنور میں نہیں گئے تھے، رسول کی نسبت گئی تھی۔ وہاں آتش کدہ گل کدہ بن گیا مگر یہاں آگ ہے اور اپنی حرارتوں کو جس نے کھویا نہیں ہے لیکن جلانے کی ہمت نہیں ہے۔ یہیں سے معلوم ہو گیا کہ جب نسبت لے کر ایک کپڑا تنور میں جاتا ہے تو آگ نہیں جلا پاتی۔ اگر ہمارے دل میں رسول ﷺ کی محبت ہو تو جہنم میں جلانے کی طاقت کہاں سے آئے گی!

حرفِ آخر: ایک سچا اور سُچا مسلمان ہونے اور غیر متزلزل ایمان والا ہونے کے لئے رسول اللہ ﷺ کو اس سے زیادہ برہانِ الٰہی ماننا لازمی امر ہے کہ وہ کھاتا پیتا، چلتا پھرتا، سوتا جاگتا اور نکاح کرتا ہے۔ افضل الملائکہ جبریل علیہ السلام نے کیا رسول اللہ ﷺ کے چلنے پھرنے، کھانے پینے اور سونے جاگنے کے بشری حالات کو نہیں دیکھا تھا؟ تو پھر بات کیا ہے کہ جب شبِ معراج رسول نے جبریل امین سے کہا تھا کہ یہ کیسی رفاقت کہ یہاں ٹھہر گئے تو سیّدنا جبریل علیہ السلام نے جو عرض کیا، شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے اس کی کیا خوب ترجمانی کی ہے!

اگر یک سرِ موئے برتر پرم — فروغِ تجلّی بسوزد پرم

(اے رسولِ معظم! آپ تشریف لے جایئے۔ میں اب اگر آپ کے ساتھ آگے چلا تو تجلّی کے فروغ سے میرے پر جل جائیں گے۔ گویا جبریل علیہ السلام نے اپنے اس عمل سے ظاہر کر دیا کہ میرے پر جل

جائیں گے، وہ نہ جلیں گے۔ غور کا مقام ہے کہ سیّدنا جبریل علیہ السلام اپنے آپ کو رسول کی طرح نہ سمجھ سکے اور رسول کو اپنی طرح نہ سمجھ سکے۔ اگر اپنے آپ کو رسول کی طرح سمجھتے تو آگے بڑھ جاتے اور اگر رسول کو اپنی طرح سمجھتے تو روک لیتے۔ نہ آگے بڑھے، نہ روکا اور دکھا دیا کہ میں رسول کی طرح نہیں ہوں اور نہ رسول میری طرح ہیں۔ مقام فکر وغور ہے کہ سیّد الملائکہ سدرہ نشیں اور حاملِ وحی اپنی طرح نہ سمجھ سکے، معصوم فرشتے اپنی طرح نہ سمجھ سکے، اب اگر دو ٹانگ کا جانور انہیں اپنی طرح سمجھے تو یہ دماغ کی خرابی نہیں تو اور کیا ہے؟

اگر خموش رہوں تو تو ہی سب کچھ ہے ۔ جو کچھ کہا تو تیرا حُسن ہو گیا محدود

(61) يَاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ O يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ O (المائدة: ۱۵، ۱۶)

''اے اہلِ کتاب! بے شک تمہارے پاس ہمارے (یہ) رسول تشریف لائے ہیں جو تمہارے لئے بہت سی ایسی باتیں (واضح طور پر) ظاہر فرماتے ہیں جو تم کتاب میں سے چھپائے رکھتے تھے اور (تمہاری) بہت سی باتوں سے درگزر (بھی) فرماتے ہیں۔ بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور اور ایک روشن کتاب آگئی ہے۔ اللہ اس کے ذریعے اُن لوگوں کو جو اُس کی رضا کے پیرو ہیں، سلامتی کی راہوں کی ہدایت فرماتا ہے اور اُنہیں اللہ کے حکم سے (کفر و جہالت کی) تاریکیوں سے نکال کر (ایمان و ہدایت کی) روشنی کی طرف لے آتا ہے اور اُنہیں سیدھی راہ کی سمت ہدایت فرماتا ہے۔'' (۱۵، ۱۶ : ۵)

اہلِ کتاب میں خطاب اُن یہود و نصاریٰ سے ہے جو تورات و انجیل میں نبی آخر الزماں ﷺ کے متعلق بیان کی گئی افضلیت اور فوقیت کو چھپاتے تھے۔ اُنہیں اِن آیات میں بتایا جا رہا ہے کہ تمہاری اپنی سماوی کتابیں (تورات و انجیل) ہمارے اس نبی علیہ السلام کے بارے میں گواہ ہیں کہ آپ پڑھے لکھے نہیں بلکہ نبی اُمّی ہیں اور اُمّی اور ناخواندہ ہونے کے باوجود اُنہیں خداداد علم کی راہ نمائی حاصل ہے۔ اپنے خالق کی مدد اور نصرت کے ذریعے وہ تمہاری بہت سی باتوں کو جو تم تورات و انجیل میں سے چھپاتے ہو، بے نقاب کرتے ہیں۔ اور اسی بات میں آپ کی رسالت کی صداقت چھپی ہوئی ہے اور یہ کہ اُمّی ہونے کے باوجود وہ صداقت کو چھپانے کی تمہاری کوششوں کو لاحاصل اور بے ثمر بنا دیتے ہیں۔

آپ ﷺ کا نظر انداز کرنا اور اُن کی کوتاہیوں کو برداشت کرنا آپ کی رسالت کی اخلاقیات کا مظہر ہے۔

یہاں نور سے مراد نبی علیہ السلام کی ذاتِ اقدس اور کتابِ مبین سے مراد قرآن مجید ہے جیسا کہ کچھ مستند تفاسیر میں آیا ہے:۔

(۱) يَعْنِيْ بِالنُّوْرِ مُحَمَّدًا ﷺ الَّذِیْ اَنَارَاللّٰهُ بِهِ الْحَقَّ وَاَظْهَرَ بِهِ الْاِسْلَامَ وَمَحَقَ بِهِ الشِّرْكَ فَهُوَ نُوْرٌ" لِمَنِ اسْتَنَارَ بِهٖ وَ"كِتَابٌ" مُّبِيْنٌ" هُوَالْقُرْاٰنُ الَّذِیْ اُنْزِلَ عَلٰی نَبِيِّنَا ﷺ (تفسیر ابن جریر)

''نور سے مراد نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے حق وصداقت کو روشن کیا' کلمہ حق کو بلند کیا اور شرک کی بیخ کنی کی۔ پیغمبر علیہ السلام واقعی نور ہیں لیکن آپ نور اُس کے لئے ہیں جو اپنے دل کو آپ کے ذریعے روشن کرنا چاہتا ہے اور کتابِ مبین سے مراد قرآن پاک ہے جسے اُس نے ہمارے نبی اکرم ﷺ پر نازل فرمایا۔'' (تفسیر ابن جریر)

(۲) نُوْرٌ" قِيْلَ مُحَمَّدٌ" ﷺ عَنِ الزَّجَاجِ وَكِتَابٌ" مُّبِيْنٌ" اَیِ الْقُرْاٰنُ فَاِنَّهٗ يُبَيِّنُ الْاَحْكَامَ (قرطبی)

''جیسا کہ زجاج نے کہا کہ نور سے مراد نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس ہے۔ کتابِ مبین سے مراد قرآن پاک ہے کیونکہ وہ احکام کو بیان کرتا ہے اور اُن کی وضاحت کرتا ہے۔'' (قرطبی)

رَسُوْلُنَا (ہمارا رسول) کے لفظ نے عظمتِ رسول ﷺ کو چار چاند لگا دئے ہیں کہ رب تعالیٰ آپ ﷺ کو ''ہمارا رسول'' فرما رہا ہے۔

یہ کہنا صحیح نہیں کہ ''نور'' سے مراد قرآن مجید ہے کیونکہ جیسا کہ پہلے بیان ہوا' درمیان کا واوِ عاطفہ (وَ) مغایرت (یعنی غیر ہونے) کا ہے بہ ایں معنیٰ کہ نور اور کتابِ مبین دو مختلف چیزیں ہیں اور ایک ہی جملہ میں ایک ہی چیز کا تکرار قرآن کی فصاحت و بلاغت کے خلاف ہے۔

مُبِيْن کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن مجید نہ صرف بذاتِ خود روشن نور ہے بلکہ وہ دوسروں کو بھی روشن اور نورانی بنا دیتا ہے۔ سُبُلَ السَّلَامِ اللہ تعالیٰ کی راہیں ہیں کیونکہ اَلسَّلَامُ اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام بھی ہے (بحوالہ سورۃ الحشر: آیت ۲۳) (تفسیر قرطبی' تفسیر بیضاوی)

آیتِ مذکورہ (۱۶) اس حقیقت کو واضح طور پر آشکار کر رہی ہے کہ قرآن مجید سے صرف وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو اس کے ذریعے مدد حاصل کرنے کے لئے آمادہ ہوں اگرچہ تحفظ کی راہیں ہر کس و ناکس کے لئے کھلی ہیں۔

(62) يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰی فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ" وَّنَذِيْرٌ" (اَلْمَائِدَة: ۱۹)

''اے اہلِ کتاب! بے شک تمہارے پاس ہمارے (یہ) رسول تشریف لائے ہیں جو تمہیں ایسے وقت میں صاف صاف بتاتے ہیں کہ رسولوں کا آنا بند تھا کہ کہیں تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی بھی بشارت دینے والا' نہ تنبیہ کرنے والا آیا۔ (اب تو) تمہارے پاس بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا آ گیا ہے۔'' (۵:۱۹)

فَتْـرَة کے لفظی معنیٰ انقطاعِ عمل اور سکون کے ہیں۔ اصطلاح میں اس کا معنیٰ دو نبوتوں کا درمیانی زمانہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ہمارے نبی مکرّم ﷺ کے درمیان وقفہ کم وبیش چھ سو سال کا ہے۔ حضور علیہ السلام کا سنِ ولادت ۵۷۰ عیسوی اور سالِ بعثت ۶۱۰ عیسوی ہے۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا صد ہا سال سے وحیِ تازہ کی نعمت سے محروم تھی۔ ہمارے اس رسولِ معظم کی آمد آمد تم اہلِ کتاب مدّت سے سنتے چلے آرہے تھے۔ انجیل میں بار بار ذکر ''وہ نبی'' (The Prophet) کا یہود کی زبان سے آتا ہے جس کے صاف معنیٰ یہ ہیں کہ ایک متعارف نبی کا آنا مدتوں سے مسلّم چلا آرہا تھا۔ تو اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) سے یہ کہا جارہا ہے کہ سن لو کہ یہ اُسی کی قدرت کا ایک ظہور ہے کہ اُس نے صدیوں بعد ایک پیغمبر اور وہ بھی سب پیغمبروں کا سردار مبعوث کردیا۔ اب روزِ قیامت عذر کی کوئی گنجائش تمہارے پاس باقی نہیں رہی۔ آگے ماننا نہ ماننا تمہارا فعل ہے۔ آیت کے اس ٹکڑے سے یہ پہلو بھی صاف ہوا جاتا ہے کہ گو ہم نے تمہاری حجت قطع کرنے کو یہ پیغمبر مبعوث کردیا' تاہم اگر ہم چاہتے تو اس کے بغیر بھی تم پر حجت قائم کردیتے اور تمہیں دَم مارنے کی مجال نہ تھی۔

فَتْـرَة کا کم وبیش یہ چھ صدیوں کا زمانہ درحقیقت قرونِ مظلمہ (Dark Ages) کا دَور تھا۔ مذہب تخریب و بگاڑ کا شکار ہو چکا تھا' اخلاقی اقدار کا جنازہ نکل چکا تھا' معتدد جھوٹے نظاموں اور بدعقیدگیوں نے سماج میں جڑ پکڑ لی تھی۔ اس طول طویل عرصہ کے بعد رحمان و رحیم اللہ نے اپنی رحمتِ خاصہ سے اپنے برگزیدہ پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو دنیا سے اِن برائیوں کو پاک وصاف کرنے کے لئے مبعوث فرمایا۔ اہلِ کتاب سے فرمایا جارہا ہے کہ میرے اس نبیِ موعود کے خلاف سازشیں کرنے کی بجائے اُن پر ایمان لاکر موقع سے فائدہ اٹھالو اور صحابیتِ رسول کے زمرے میں شامل ہوکر اپنی بدبختی کو خوش بختی میں تبدیل کرلو ورنہ قیامت کے دن تمہارے عذرِ لنگ کو کوئی پذیرائی حاصل نہ ہوگی۔

(63) اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ (اَلشُّوریٰ : ۲۴)

''کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اِس (رسول ﷺ) نے اللہ پر جھوٹا بہتان تراشا ہے' سو اگر اللہ چاہے تو آپ کے قلبِ اطہر پر (صبر واستقامت کی) مُہرِ ثبت فرمادے (تاکہ آپ کو اُن کی بیہودہ گوئی کا رنج نہ پہنچے)۔'' (۴۲ : ۲۴)

کفار عموماً ہرزہ سرائی کرتے کہ حضور (ﷺ) کا یہ کہنا کہ یہ اللہ کا کلام ہے' محض غلط اور بہتان ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی اس بے باکی پر اظہارِ حیرت کرتے ہوئے اُن کے الزام کی تردید فرمارہا ہے کہ اُن کے اس الزام کی کوئی وقعت نہیں کیونکہ کلامِ الٰہی کا حسن و جمال اور اُس کی اثر پذیری کی قوّت افترا پردازی اور جھوٹ میں نہیں پائے

جاتے۔ اُس کی نصرت و مدد تو ہمیشہ حق و صداقت کے ساتھ رہتی ہے نہ کہ جھوٹ کے ساتھ۔ پیارے محبوب! اگر آپ جھوٹے اور افترا پرداز ہوتے تو رب تعالیٰ آپ کے دل پر اسی طرح مہر لگا دیتا جس طرح وہ جھوٹے شخص کے دل پر مہر لگا دیا کرتا ہے جس سے آپ کسی چیز کا ادراک نہ کر سکتے، نہ کسی حرف یا لفظ کا تلفظ کر سکتے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل پر ایسی مُہر نہیں لگائی تو معلوم ہوا کہ پیارے! آپ نے اللہ پر افترا نہیں باندھا اور کفار کا یہ دعویٰ جھوٹا اور لغو ہے۔ اس طرح یہ آیت آپ کی رسالت کی رفعت اور عظمت کو سلام کر رہی ہے۔ جس طرح سورۃ الحاقۃ کی ذیل کی آیت عظمتِ رسالت کو چار چاند لگا رہی ہے۔

(64) وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ○ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ○ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ ○ (الحآقۃ: ۴۴-۴۶)

''اور اگر نبی (علیہ السلام) ہم پر کوئی (ایک) بات بھی گھڑ کر کہہ دیتے تو ہم یقیناً انہیں پوری قوت وقدرت کے ساتھ پکڑ لیتے، پھر ہم ضرور اُن کی شہ رگ کاٹ دیتے، پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اُس سے روکنے والا نہ ہوتا۔'' (۶۹ : ۴۴-۴۶)

قضیہ صغریٰ: اگر نبی ہم پر کوئی (ایک) بات بھی گھڑ کر کہہ دیتے تو ہم یقیناً اُن کی شہ رگ کاٹ دیتے۔
قضیہ کبریٰ: محذوف ہے اور وہ یہ ہے کہ نبی علیہ السلام کی شہ رگ کبھی نہیں کاٹی گئی۔
نتیجہ: لہٰذا نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ تعالیٰ کے متعلق کوئی بھی بات نہیں گھڑتے اور آپ اللہ کے سچے رسول ہیں ﷺ۔

محولہ بالا آیات میں مقامِ نبوت کی نازک اور گراں ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے یعنی جس کی نبوت کو ہم معجزات اور دلائل سے ثابت کر دیں، وہ ہرگز ہرگز اپنے رب کے کلام میں اپنی طرف سے کوئی ملاوٹ نہیں کرتا۔ بفرضِ محال اگر وہ اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ کر ہماری طرف منسوب کر بھی دے تو یہ کوئی معمولی سا جرم نہیں جس کا نوٹس نہ لیا جائے یا جس سے چشم پوشی کی جائے بلکہ یہ تو اتنا بڑا گناہ اور سنگین جرم ہے کہ اگر اُسے گوارا کر لیا جائے تو سلسلۂ نبوت کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا اور کسی کو نبی کی بات پر اعتماد ہی نہیں رہے گا۔ اس لئے بفرضِ محال اگر ہمارا کوئی فرستادہ ایسی حرکت کرے تو ادنیٰ توقف کے بغیر ہمارے انتقام کی تلوار بے نیام ہو جائے گی اور آنِ واحد میں اُس کی رگِ دل کاٹ کر رکھ دی جائے گی تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اگر خدا کا بھیجا ہوا نبی بھی (معاذ اللہ) ایسی قبیح حرکت کرے تو عذابِ الٰہی ایک لحظہ بھی اُسے مہلت نہیں دیتا اور فوراً اُسے فنا کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

اس طرح درج بالا آیات نبی آخر المرسلین ﷺ کی ذاتِ والا صفات کے حق میں پُر عطر خراجِ تحسین کا

سدا بہار سہرا اور نبوت کے ماتھے کا پُر نور اور لازوال جھومر ہیں۔ یہ آیات آپ ﷺ کی مذمت میں ہرگز ہرگز نہیں ہیں جیسا کہ بعض پُر عناد طبقات کی جانب سے سننے میں آتا ہے۔ نبوت کے مقام کو سمجھنے کے لئے:

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب — کہ آنکھ کا نور دل کا نور نہیں (اقبالؔ)

''اِس آیت سے مرزا قادیانی کے چیلے یہ استدلال کرتے ہیں کہ ''اگر مرزا سچا نبی نہ ہوتا اور اللہ تعالیٰ کی طرف غلط باتیں منسوب کرتا تو اِس ارشادِ الٰہی کے مطابق اُس کی رگِ دل کاٹ دی جاتی اور اُسے اُسی وقت ہلاک کر دیا جاتا لیکن چونکہ ایسا نہیں کیا گیا اس لئے ثابت ہوا کہ وہ (معاذ اللہ) سچا نبی تھا۔''

''اگر عقل کے یہ اندھے اس آیت میں ذرا سا غور کرتے تو اُنہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ سزا اُس جھوٹے شخص کے لئے نہیں جس نے نبوّت کا جھوٹا دعویٰ کیا ہو بلکہ اُس کے لئے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنا نبی بنا کر بھیجا ہو' پھر معجزات اور دلائلِ قطعیہ سے اُس کی نبوت کی صداقت کو ثابت کیا ہو۔ اگر ایسا نبی کوئی غلط بات اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرے گا تو اُسے یہ سزا ملے گی اور اِن دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔ مرزا صاحب پہلے شخص تو نہیں جنھوں نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا ہو۔ اُن سے پہلے بھی کئی طالع آزما لوگوں نے نبوت کا سوانگ رچایا۔ کیا مرزا صاحب اور اُن کے چیلے بتا سکتے ہیں کہ ایسے لوگوں کی رگِ جاں کاٹ کر اُنہیں ہلاک کر دیا گیا؟ کیا اُن کے ساتھ ایسا معاملہ نہ ہونا اُن کی نبوّت کی دلیل بن سکتا ہے؟ لوگ تو خدا بننے کا بھی دعویٰ کرتے رہے ہیں اور بڑے ٹھاٹھ سے اُنہوں نے اپنی زندگیاں گزاری ہیں۔ فرعون وغیرہ کی بیسیوں مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔'' (ضیاء القرآن' ج ۵' صفحات ۳۵۴' ۳۵۵)

(65) اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَ اَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ۝ (المؤمنون : ۶۹' ۷۰)

''کیا اُنہوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا سو (اِس لئے) وہ اس کے منکر ہو گئے ہیں' یا وہ یہ کہتے ہیں کہ اس (رسول ﷺ) کو جنون (لاحق) ہو گیا ہے (ایسا ہرگز نہیں) بلکہ وہ اُن کے پاس حق لے کر تشریف لائے ہیں اور اُن میں سے اکثر لوگ حق کو پسند نہیں کرتے۔'' (۲۳:۷۰'۶۹)

ایک جاندار سوال کفار سے پوچھا جا رہا ہے کہ کیا اُنہوں نے میرے رسول کا اس لئے انکار کیا ہے کہ وہ آپ ﷺ کی امانت و دیانت سے متعارف نہیں ہیں؟ یا اس لئے کہ اُنہیں آپ کے خلوص اور دیانت پر شک ہے۔ یہ بات بڑی عجیب ہے کہ کل تک تو تم اُنہیں ''صادق و امین'' کے معزز القاب سے نوازتے رہے اور آج جب اُنہوں نے حق و صداقت کو تمہارے سامنے پیش کیا ہے' تو اُن کے بارے میں تمہاری رائے یکسر بدل گئی ہے! اور اب وہ تمہارے نزدیک (معاذ اللہ) دیوانے اور عقل سے عاری ہیں! دراصل تمہارے انکار کی وجہ یہی ہے کہ ہمارا پیغمبر ﷺ رشد و ہدایت اور ایسا ضابطہ حیات لایا ہے جو تمہارے دنیاوی' مادّی مفادات اور تمہارے آبائی عقائد

کے خلاف ہے جسے تم پسند نہیں کرتے۔ لیکن تمہاری اس ناپسند کی کوئی معقول بنیاد نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد تمہاری اس سوچ پر ہے کہ اگر تم نے اُن کی رسالت کو تسلیم کر لیا تو تمہاری سرداری ختم ہو کے رہ جائے گی اور تمہاری مادر پدر آزادی، فحاشی اور رنگ رنگیلی زندگی کی شیطانیت رک جائے گی۔

یہ بات بھی بڑی عجیب اور حیران کن ہے کہ آج ''یورپ کا جاہل طبقہ'' بھی اُس زمانہ کے عرب کفار کے خیالات میں برابر کا شریک ہے۔ ایک طرف تو اُنہیں اس بات کا اعتراف ہے کہ محمد (ﷺ) نے اپنی ذہانت اور بہترین حکمتِ عملی اور منصوبہ بندی کے ذریعے عرب کے باہم متحارب (لڑنے والے) قبیلوں کو ایک اخوت اور ایک دین میں متحد کر دیا اور مشرکوں اور یہودیوں جیسے اپنے دشمنوں پر غلبہ حاصل کر لیا جبکہ دوسری طرف وہ یہ کہتے تھکتے نہیں کہ آپ (معاذ اللہ) دیوانے اور مرگی کے مریض تھے۔ آخر ایسی تضاد بیانی کو کیا نام دیا جائے؟

(66) وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ اَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (المؤمنون : ۷۱ تا ۷۳)

''اور اگر حق (تعالیٰ) اُن کی خواہشات کی پیروی کرتا تو (سارے) آسمان اور زمین اور جو (مخلوقات و موجودات) اُن میں ہیں، سب تباہ و برباد ہو جاتے بلکہ ہم اُن کے پاس وہ (قرآن) لائے ہیں جس میں اُن کی عزت و شرف (اور ناموری کا راز) ہے، سو وہ اپنی عزت ہی سے منہ پھیر رہے ہیں۔ کیا آپ اُن سے (تبلیغِ رسالت پر) کچھ اُجرت مانگتے ہیں؟ (ایسا بھی نہیں ہے) آپ کے رب کا تو اجر (ہی بہت) بہتر ہے اور وہ سب سے بہتر روزی رساں ہے۔ اور بے شک آپ تو (اُنہی کے بھلے کے لئے) اُنہیں سیدھی راہ کی طرف بلاتے ہیں۔'' (۲۳ : ۷۳-۷۱)

اللہ تبارک و تعالیٰ سراپا حکمت و دانش، سراپا بھلائی اور اپنی مخلوقات کا خیرخواہ ہے۔ کائنات کی تعمیر میں اُس کا منصوبہ بے خطا اور ہر طرح مکمل ہے۔ اگر کائنات کے نظام کو اِن خودغرض، جاہل اور کوتاہ نظر مخلوقات کی خواہشات اور توہمات کے مطابق چلایا جائے تو دنیا ہیبت ناک شکل اختیار کر جائے اور چاروں طرف تباہی و بربادی کا دَور دَورہ ہو اور نتیجہ اس کے سوا کچھ بھی نہ ہو۔

''ذکر'' عموماً نصیحت اور یاددہانی کے معنیٰ میں لیا جاتا ہے لیکن یہاں ''ذکر'' سے مراد اُن دشمنوں کی عزت و ناموری ہے جنہوں نے امام الانبیاء ﷺ کی رسالت کا انکار کر کے اپنی بدبختی کو خود ہی خرید لیا۔ بتایا یہ جا رہا ہے کہ ہم نے اُنہیں ایسی بے مثال کتاب عطا کی ہے جو اُنہیں اقوامِ عالم میں عزت و ناموری دینے کے لئے کافی ہے۔ اگر اُن کا اِس کتاب (قرآن) پر ایمان ہو اور وہ اس پر عمل پیرا ہوں تو اُن کی عزت اور شان و

شوکت چوگنی ہو جائے۔ وہ کتنے ہی کوتاہ نظر، غیر محتاط اور بدقسمت ہیں کہ جب اُن کی شان وشوکت کا آفتاب طلوع ہونے کو ہے تو وہ اپنے مقدر اور خوش بختی کو دھکا دے رہے ہیں اور غصے میں جل بھن کر یہ کہہ رہے ہیں کہ ''آخر یہ کیوں ہو رہا ہے؟''

کیا ہمارا پیغمبر کریم ﷺ اُن سے اپنی تبلیغ رسالت کی اجرت کا طلب گار ہے؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں بلکہ اُنہوں نے تو دنیاوی دھن دولت کو اپنے پائے حقارت سے ٹھکرا دیا ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ گلشنِ خلیل کا یہ لالہ رنگین قبا شرف انسانیت کی جاوداں اور ہر دَم جواں عظمتوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ تو پھر یہ دشمنانِ رسول ہمارے پیغمبر کی بے غرض، بے لوث اور نہایت وفادارانہ کوششوں کا اپنے مفاد و بہتری کو برقرار رکھنے کی خاطر کیوں انکار کر رہے ہیں؟ نوعِ انسان کو صراطِ مستقیم کی طرف لانا اور نبیِ اکرم ﷺ کی بے لوث کوششوں کا جدید ناقدین تک کو بھی اعتراف ہے۔ ولیم میور کہتا ہے:

''محمد (ﷺ) کا اپنے پیروکاروں کے ساتھ برتاؤ جو اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی اُس سے کم نہ تھا، اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ آپ نائب خدا ہیں اور اُس کی مرضی کے ترجمان ہیں۔'' ("The Life of Mahomet" ... Sir William Muir, p. 126)

(71-67) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ O يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ O إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ O إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنْ وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ O وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّىٰ تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ O (الحُجُرٰت)

''اے ایمان والو! (کسی بھی معاملے میں) اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) سے آگے نہ بڑھا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو (کہ کہیں رسول ﷺ کی بے ادبی نہ ہو جائے)، بے شک اللہ (سب کچھ) سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔ اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبیِ مکرّم (ﷺ) کی آواز سے بلند مت کیا کرو اور اُن کے ساتھ بلند آواز سے بات (بھی) نہ کیا کرو جیسے تم ایک دوسرے سے بلند آواز کے ساتھ کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے سارے اعمال ہی (ایمان سمیت) غارت ہو جائیں اور تمہیں (اُن کے برباد ہونے کا) شعور تک بھی نہ ہو۔ بے شک جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں (ادب و نیاز کے باعث) اپنی آوازوں کو پست رکھتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لئے چُن کر خاص کر لیا ہے، ان ہی کے لئے بخشش ہے اور اجرِ عظیم ہے۔ بے شک جو لوگ آپ کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں، اُن میں سے اکثر (آپ کے بلند مقام و مرتبہ اور

آدابِ تعظیم کی) سمجھ نہیں رکھتے۔ اور اگر وہ لوگ صبر کرتے یہاں تک کہ آپ خود ہی اُن کی طرف باہر تشریف لے آتے تو یہ اُن کے لئے بہتر ہوتا' اور اللہ بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے۔'' (۱۔۵:۴۹)

اِن آیاتِ مبارکہ کے شانِ نزول کے ضمن میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث امام شعبی نے بیان کی ہے کہ کچھ صحابہ کرام نے یوم الاضحٰی کو رسالتمآب ﷺ کی طرف سے قربانی ہونے سے پہلے قربانی کر لی۔ اُنہیں حکم ہوا کہ اپنی قربانیاں دوبارہ کرو اور سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث بروایت حضرت مسروق یہ ہے کہ رمضان المبارک کا چاند نظر آنے سے پہلے اور رسالتمآب ﷺ کا روزہ رکھنے سے پہلے کچھ صحابہ کرام نے روزہ رکھ لیا۔ اس موقع پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی (حاشیہ تفسیر جلالین از جلال الدین سیوطی)

مقامِ غور ہے کہ صحابہ کرام نے کسی برائی کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔ قربانی ہو یا روزہ' دونوں بہر حال عبادات ہیں اور اپنے خالق و مالک کو راضی کرنے کا ذریعہ ہیں لیکن چونکہ صاحبِ قرآن ﷺ کے عمل سے پہلے اُن کا ارتکاب ہوا لہٰذا ضائع گئے اور ربّ المشرقین والمغربین کو یہ منظور نہ ہوئے کہ ابھی میرے محبوبِ محتشم نے قربانی کی نہیں' تم نے کیسے کر لی؟ ابھی میرے محبوبِ مکرّم نے روزہ رکھا نہیں' تم نے کیسے رکھ لیا؟ لہٰذا میرے محبوب کے عمل سے پہلے یہ دونوں نامنظور۔

انسانی سوچ کو ایک مہمیز سی لگی کہ یہ سبقت تو رسولِ معظم ﷺ پر سبقت تھی' ربِ تعالیٰ پر تو نہ تھی کہ رسول نے ابھی قربانی کی نہیں' صحابہ نے پہلے کر لی۔ رسول نے ابھی روزہ شروع کیا نہیں' اُنہوں نے شروع کر دیا تو اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ پر سبقت کی نہ کہ اللہ پر اور اللہ تو قربانی کرنے اور روزہ رکھنے دونوں سے پاک ہے' لہٰذا یہاں اللہ کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟ نکتہ یہاں یہی سمجھانا مقصود ہے کہ رسول سے سبقت کرنے والا گویا اللہ سے سبقت کرنے والا ہے۔ چنانچہ مؤمنوں کو سبق یہ ملا کہ وہ ایسی بے ادبی نہ کر بیٹھیں کہ رسول جس کام کا آغاز نہ فرمائیں' مؤمن از خود اُن سے پہلے کرنے لگیں۔ رسول ﷺ نے یہ کب فرمایا کہ میرے برابر یا میرے آگے آگے چلو؟ بلکہ رسول نے تو یہی فرمایا: فَاتَّبِعُوْنِیْ (میرے پیچھے پیچھے آؤ) تو پیچھے پیچھے آنے والا پہلے کام نہیں کرتا اور نہ ہی اُن سے آگے آگے چلتا ہے۔

سورۃ الحُجُرات کی دوسری آیت میں ارشاد ہوا کہ میرے نبی علیہ السلام کی آواز سے اپنی آوازوں کو بلند مت کرو۔ آواز ایک فطری چیز ہے مگر اس فطری چیز کو بھی قابو میں رکھنے کا حکم ہے کہ نبی کی بارگاہ میں اپنی فطری آواز کو بلند نہ ہونے دینا اور آپ (علیہ السلام) کو ایسے گھک کر نہ پکارنا جیسے تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو ورنہ تمہارے اعمال چھن جائیں گے اور تمہیں اس کا احساس تک نہ ہوگا۔ عقل نے بارگاہِ ایزدی میں عریضہ پیش کیا کہ اے احکم الحاکمین! قیس بن ثابت تیرے رسول کے صحابی ہیں۔ وہ ایک عارضے کی وجہ سے اونچا بولنے کے عادی ہیں۔ تیرا

اپنا فرمان ہے کہ میں کسی جان کو اُس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔ لہٰذا قیس کی مجبوری پر اُنہیں کسی حد تک چھوٹ عطا فرمائی جائے تو جواب ملا کہ قیس مجبور و معذور ضرور ہیں مگر یہاں میرے رسول کی بارگاہ کے ادب کا سوال آ گیا۔ ایسا نہ ہو کہ میں کوئی قانون نہ دوں تو مستقبل کا انسان اونچی آواز سے بارگاہِ نبوت میں شور مچائے اور کہے کہ صحابیِ رسول حضرت قیس کی یہ سنت ہے' لہٰذا قانون کا دینا ضروری ہو گیا۔

اگر چہ صحابہ کرام کے نزدیک دیدارِ رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں تھی مگر جنابِ قیس رضی اللہ عنہ نے حکمِ خداوندی کی سنجیدگی کو بھانپتے ہوئے بارگاہِ نبوی میں آنا چھوڑ دیا۔ سرکار کی فرمائش پر کچھ صحابہ جنابِ قیس کے پاس پہنچے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام یاد فرما رہے ہیں۔ عرض کیا کہ آیت میرے لئے اتری ہے' میں تو جہنم کا مستحق ہو گیا۔ سرکار نے جب یہ سنا تو فرمایا 'نہیں' وہ جنتی ہیں اور رب نے اُن کی خطاؤں کو معاف فرما دیا ہے۔ علاوہ ازیں ختمی مرتبت رسول علیہ السلام نے اُنہیں شہادت کے مرتبہِ جلیلہ کا بھی مژدہ سنایا۔

اعمال کا چھن جانا اور اس کا احساس تک نہ ہونا بہت بڑی سزا اور بہت ہی خطرناک بات ہے۔ فرمایا کہ اے رسول کے بے ادبو! ہم تم سے نمازیں بھی پڑھوائیں گے' روزے بھی رکھوائیں گے' زکوٰۃ بھی دلوائیں گے' حج بھی کرائیں گے اور دیگر اعمالِ خیر بھی کرائیں گے اور تم اپنی دانست میں اپنے کو بڑے ہی اللہ والے' متقی سمجھتے پھرو گے۔ ادھر میں ان اعمال کو مٹاتا چلا جاؤں گا مگر مٹنے کا احساس تک تمہیں نہ ہونے دوں گا۔ یعنی تم سے کام بھی کراؤں گا اور کچھ دوں گا بھی نہیں۔ اس طرح روزِ قیامت تم سے زیادہ کوئی محتاج نہ ہو گا۔

اس آیت کے نزول پر صحابہ کرام بالخصوص صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا تو یہ حال ہو گیا تھا کہ بارگاہِ رسالت کو کئی باران سے پوچھنا پڑتا تھا کہ کیا کہتے ہو۔ اس کے باوجود ادب والوں نے اپنے انداز کو نہیں بدلا اور انتہائی مدھم آواز میں بارگاہِ رسالت کے ادب کو ملحوظ رکھا۔ اُن کی شان میں سورہ مذکورہ کی تیسری آیت نازل ہوئی کہ جو لوگ بارگاہِ رسالت میں اپنی آواز پست رکھتے ہیں یعنی جسے ابھارنے کی طاقت ہے' اُسے دبا رہے ہیں تو یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لئے چن کر خاص کر لیا ہے۔

یہاں یہ نہیں فرمایا کہ نماز پڑھنے والوں یا روزہ رکھنے والوں یا زکوٰۃ و خیرات دینے والوں یا حج کرنے والوں کو تقویٰ کے لئے چن لیا بلکہ فرمایا کہ رسول کی بارگاہ میں ادب کرنے والوں کو تقویٰ کے لئے چن لیا جس میں اشارہ یہی ہے کہ عبادت سے تقویٰ نہیں ملا کرتا بلکہ یہ تو عطائے خداوندی اور فضلِ ربانی سے ملتا ہے اور اُنہی لوگوں کو ملتا ہے جو رسول کی بارگاہ میں اپنی آواز کو پست رکھتے ہیں۔ بے ادبوں کو وہ تقویٰ نہیں دیتا اور صرف یہی نہیں بلکہ رسول کے اِن نیازمندوں کے لئے مغفرت بھی ہے اور اجرِ عظیم بھی ہے۔ یہ بارگاہِ رسول ﷺ کا دوسرا ادب ہے۔

اب آیئے بارگاہِ نبوت کے تیسرے ادب کی طرف۔ قبیلہ بنو تمیم کے کچھ لوگ دوپہر کے وقت بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے۔ سرکار اپنے حجرہ مبارکہ میں آرام فرمارہے تھے۔ ان لوگوں نے باہر ہی سے سرکار کو اُن کا نام لے کر پکارنا شروع کر دیا۔ نام سے پکارنا ربِّ مصطفیٰ کو ناگوار لگا۔ فوراً ادب کا ایک قانون بھیج دیا کہ اے محبوب! جو حجرے کے پیچھے سے آپ کو پکارتے ہیں ان میں سے اکثر نا سمجھ ہیں۔ اے حبیب! اگر وہ آپ کے انتظار میں کھڑے رہتے' آواز نہ دیتے یہاں تک کہ آپ خود ہی باہر تشریف لاتے تو اُن کے لئے یہ بہتر ہوتا۔ پکارنا ادب نہیں بلکہ کھڑے رہنا ادب ہے۔ فہم و ذکا نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی کہ الہ العالمین! ان نادانوں نے تو تیرے حبیب علیہ السلام کو اُن کا نام لے کر پکارا تھا جسے تیری غیرت نے گوارا نہ کیا اور فوراً ادب کا قانون بھیج دیا۔ اچھا تو اُنہیں اُن پیارے القاب سے پکارنے کی اجازت تو ہے جو تو نے خود اپنی اس مایہ ناز مخلوق کو پکارنے میں استعمال فرمائے ہیں یعنی یا رسول اللہ' یا رحمۃ للعالمین' یا سیّد المرسلین' یا شفیع المذنبین وغیرہ۔ فرمایا کہ ندا کرنا ہی جرم ہے' خود تشریف لائیں گے۔ اسلامی اصول تو یہی ہے کہ تین بار آواز دیں۔ صاحبِ خانہ سے اگر جواب مل گیا تو خیر' ورنہ پلٹ آیئے۔ یہاں پکارنے کی بھی اجازت نہیں تو پھر سرکار کو معلوم کیسے ہوگا کہ باہر کون آیا ہے؟ ارے نادان! پکارا اُسے جاتا ہے جو بے خبر ہو' آواز اُسے دی جاتی ہے جسے اطلاع نہ ہو۔ بھلا جو عرش کی بات بتاتا ہے کیا وہ اپنے دروازے سے بے خبر ہوگا؟ جو لوحِ محفوظ کے نوشتے پڑھ پڑھ کر سنا رہا ہو' کیا اُسے معلوم نہ ہوگا کہ ہمارے در پر کون آیا ہے۔ معلوم ہوا کہ بے خبر کو پکارنا تو کوئی بات نہیں مگر خبر والے کے یہاں چلانا صریحاً بے ادبی ہے۔

رسالتمآب ﷺ کی بارگاہ میں رئیس صحابہ کرام بھی حاضر ہوتے تھے اور کافی دیر تک دین کے مسائل معلوم کرتے رہتے تھے۔ رب تعالیٰ کو ان قدسی صفات ہستیوں کا یہ انداز پسند نہ آیا اور فرمایا کہ اس بارگاہ کے آداب کا خیال رکھو۔ بعدہ' یہ حکم نازل ہوا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةً (المجادلة : ۱۲)

"اے ایمان والو! جب تم رسول (ﷺ) سے کوئی راز کی بات تنہائی میں عرض کرنا چاہو تو اپنی راز دارانہ بات کہنے سے پہلے کچھ صدقہ و خیرات کر لیا کرو۔" (۱۲ : ۵۸)

جناب علی کرّم اللہ وجہہ' نے رسالتمآب ﷺ سے دس مسائل پوچھے تھے تو دس بار صدقہ کیا تھا۔ اگرچہ اس آیت کا حکمِ وجوبی بعد میں ختم ہو گیا اور استحباب باقی رہا۔ سمجھانا یہی مقصود تھا کہ ایمان والے جب زر خرچ کر کے بارگاہِ نبوت میں آئیں گے تو کچھ اہمیت محسوس کریں گے۔ عقل سوچ میں پڑ گئی کہ رب اپنے ہاں بلاتا ہے تو کہتا ہے کہ وضو کر کے آؤ اور رسول ﷺ کے ہاں آؤ تو صدقہ کر کے آؤ۔

اسی سے ایک اور نکتہ سمجھ میں آیا کہ ہر محب چاہتا ہے کہ اُس کے محبوب کا گھر اُس کے اپنے گھر کے قریب ہو۔ تو یہ کیا بات ہوئی کہ رب تعالیٰ نے اپنے گھر یعنی خانہ کعبہ کو مکّہ مکرّمہ میں رکھا اور محبوب علیہ السلام کو مدینہ پہنچا دیا۔

بات دراصل یہ ہے کہ اگر رسول ﷺ کا گنبدِ خضراء مکہ میں ہوتا تو اُس کی زیارت مسلمان حج کے طفیل کر لیتے اور رب تعالیٰ کو طفیلی زیارت پسند نہیں ہے بلکہ یہ پسند ہے کہ وہاں کے لئے ساڑھے چار سو کلومیٹر کے فاصلے کے لئے شدِّ رحال کیا جائے، رقم خرچ ہو اور سفر کی صعوبت اٹھائی جائے اور ادب کے ارادے سے جایا جائے۔ جو ارادہ نہ رکھے وہ وہاں پہنچ بھی نہ سکے۔

آخر میں آدابِ دربارِ رسالت کے حوالے سے ایک بات کہنا ضرور چاہوں گا کہ دنیاوی بادشاہوں اور شہنشاہوں نے اپنے درباروں کو خود سجایا، اپنے دربار میں آنے والوں کے لئے قواعد وضوابط خود متعین کئے کہ ان آداب کی پابندی ہر آنے والے کے لئے لازمی ہے۔ لیکن اس قانون بنانے والے کے رخصت ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کا بنایا ہوا قانون بھی رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرا بادشاہ آیا تو اُس نے ع ''ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت'' کے مصداق اپنے مزاج کے مطابق آداب اور ضابطے مقرر کئے۔ غرض کہ بادشاہ اور شہنشاہ آتے رہے اور جاتے رہے اور اُن کے جانے کے ساتھ اُن کے وضع کردہ ضابطے بھی جاتے رہے۔ لیکن اس فرشِ خاکی پر اور اسی آسمان کے نیچے ایک ایسا پیارا دربار بھی ہے کہ دربار کسی کا ہے اور قانون کوئی اور بنا رہا ہے۔ یہ دربار مصطفیٰ کا ہے اور قانون ہے کبریاء کا۔

آخر کیوں؟ اس کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہئے۔ جواب ملا کہ اے پیارے رسول! اپنی بارگاہ کے آداب و ضوابط تو آپ بھی مرتب کر سکتے ہیں لیکن ہم احکم الحاکمین ایسا ہونے نہیں دیں گے۔ اس لئے کہ اے حبیب! آپ اپنے دربار کے آداب وقوانین خود بنائیں گے تو وہ بن جائے گی حدیث اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس پر قیل وقال ہو گی۔ بعض اُسے ضعیف کا درجہ دیں گے، بعض لوگ راویوں پر جرح وتنقیص کریں گے اور اس طرح آپ کی حدیث سے الجھ کر آپ کے دربار کے آداب سے پہلو تہی کرنا چاہیں گے جو ہمیں گوارا نہیں۔ لہٰذا اے محبوب! آپ خاموش رہیں۔ میں جبریل کو بھیج کر آپ کے دربار کے آداب کو حدیث نہیں رہنے دوں گا، قرآن بنا دوں گا۔

اس میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اے محبوب! اپنے دربار میں آنے کے آداب وضوابط اگر آپ نے خود وضع کئے تو انسان ہونے کے ناطے سے آپ کا وضع کردہ قانون صرف انسانوں پر لاگو ہوگا۔ لیکن میں خالق کا بنایا ہوا قانون میری ہر مخلوق پر چلے گا۔ اب آپ کی بارگاہ کا ادب صرف انسانوں ہی کے لئے ضروری نہیں بلکہ جن وانس، شجر وحجر، نباتات، جانوروں، سمندروں اور دریاؤں کے قطروں، آسمان کے ستاروں اور زمین کے ذرّوں سب کے لئے ضروری ہے کیونکہ سب میری مخلوق ہیں۔

اس میں تیسرا باریک نکتہ یہ ہے کہ یہ قانون حیّ وقیّوم کا قانون ہے۔ جب اُسے زوال نہیں تو اُس کے قانون کو کیسے زوال ہوگا؟ لہٰذا یہ خدائی قانون بھی ابدالآباد رہے گا۔ مصطفیٰ اِس دنیا میں جلوہ گر ہوں تو بھی اور اگر اِس خاکدانِ گیتی سے پردہ پوش ہو جائیں تو بھی۔ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم۔

(72) لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا (اَلنُّور : ٦٣)
''تم لوگ رسول کے بلانے کو ایسا مت سمجھو جیسا تم میں ایک دوسرے کو بلا لیتا ہے۔'' (۲۴ : ۶۳)

کہ جی چاہا آئے' نہ جی چاہا نہ آئے بلکہ رسول کا بلانا ایک حاکمانہ حیثیت رکھتا ہے جس کی اطاعت واجب ہے اور بلا اجازت چلے آنا حرام ہے۔

سورۃ الحجرات کی مذکورہ بالا آیات ۱ تا ۵ کی طرح ایک اور معنیٰ کی رُو سے یہاں بھی امتِ مسلمہ کو آدابِ نبوی کی تعلیم دی جارہی ہے کہ میرے پیغمبر کو تم ایسے نہ پکارا کرو جیسا تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو بلکہ اُن کے لئے خصوصی الفاظِ ادب و تعظیم کا اہتمام کیا کرو جیسا کہ سورۃ الفتح میں حکم ہوا :

وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ (الفتح : ۹)
''اور ان (رسول) کی مدد کرو اور ان کی تعظیم کرو۔'' (۴۸ : ۹)

کوئی شک نہیں کہ امام الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام تمام نسلِ انسانی کے معلمِ اعظم ہیں۔ ایک اور مفہوم کی رُو سے یہاں جس نکتے پر زور دینا مقصود ہے وہ یہ کہ ایک متعلم کو اپنے معلم کے لئے باادب اور فرماں بردار شاگرد بن کر رہنا چاہئے جسے نہ صرف اپنے قول میں صاف گو اور مخلص و ایماندار ہونا چاہئے' بلکہ اُسے ہمہ تن گوش ہو کر اپنے معلم کے فرمودات کو سننا چاہئے تاکہ معلم کو اپنے الفاظ دُہرانے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔

(73) مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ O (آلِ عمران : ۱۷۹)
''اللہ مسلمانوں کو ہرگز اِس حال پر نہیں چھوڑے گا جس پر تم (اِس وقت) ہو جب تک وہ ناپاک کو پاک سے جدا نہ کردے اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ (اے عامۃ الناس!) تمہیں غیب پر مطلع فرمادے لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے (غیب کے علم کے لئے) چن لیتا ہے' سو تم اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لے آؤ اور اگر تم ایمان لے آؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو تمہارے لئے بڑا ثواب ہے۔'' (۳ : ۱۷۹)

آیت کے الفاظ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے (غیب کے علم کے لئے) مجتبیٰ بنا لیتا ہے یعنی چن لیتا ہے) پر ذرا غور ہو کہ ہمارے نبی علیہ السلام کا ایک صفاتی نام مجتبیٰ بھی تو ہے جس میں اس بات کا صاف اشارہ ہے کہ میں نے علمِ غیب اپنے اس پیغمبر کو دے رکھا ہے جس کا ایک

نام مجتبیٰ ہے۔

ہر نازک موقع پر منافقین مسلمانوں کے لئے افتراق اور خوف و ہراس پیدا کر کے اور اُن کے سیاسی رازوں کو بے نقاب کر کے رنج والم کا سبب تھے۔ اس لئے الٰہی حکمت و مصلحت مسلمانوں اور منافقوں کے دونوں طبقات کو ایک دوسرے میں گڈمڈ رہنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی' اس لئے اُن کا ایک دوسرے سے جدا ہونا لازمی امر تھا۔ اِن دونوں گروہوں کو الگ الگ کرنے کا انتظام اِن طریقوں سے کیا گیا: (۱) اچھے لوگوں کو مسلسل تکالیف اور مصائب کے ذریعے آزمایا گیا اور برے لوگوں کو دنیاوی حظ اندوزیوں میں مستغرق کر کے۔ (۲) اسلام کو فتحیاب کر کے اور کفر کو شکست و ہزیمت دے کر۔ (۳) اپنے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ علم دے کر کہ کون سچا اور سُچا مسلمان ہے اور کون کافر و منافق ہے۔ منافقین نے یہ کہا تھا: ''اگر محمد (ﷺ) اللہ کا سچا رسول ہے تو وہ ہمیں بتائے کہ ہم میں کون مسلمان ہے اور کون نہیں۔'' اس سلسلہ میں امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذیل کی حدیثِ مبارکہ کا حوالہ دیا ہے:

إِنَّهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ: عُرِضَتْ عَلَيَّ أُمَّتِيْ وَأُعْلِمْتُ مَنْ يُّؤْمِنُ بِيْ وَمَنْ يَّكْفُرُ فَقَالَ الْمُنَافِقُوْنَ: إِنَّهُ يَزْعَمُ أَنَّهُ يَعْرِفُ مَنْ يُّؤْمِنُ وَمَنْ يَّكْفُرُ وَنَحْنُ مَعَهُ وَلَا يَعْرِفُنَا فَنَزَلَتْ

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری اُمّت میرے سامنے پیش کی گئی اور میں نے اُس شخص کو بھی پہچان لیا جس کا مجھ پر ایمان تھا اور اُسے بھی جس نے میری رسالت کا انکار کیا۔ اس پر منافقین نے طنزاً کہا: اس شخص کا دعویٰ ہے کہ اُسے مسلمانوں اور کافروں کا علم ہے لیکن اُسے ہماری حقیقت کا علم نہیں' حالانکہ ہم ہمیشہ اُس کی صحبت میں رہتے ہیں۔ اُس موقع پر سورہ آلِ عمران کی آیتِ بالا نازل ہوئی۔'' (بیضاوی)

سورہ آلِ عمران کی آیت بالا (۱۷۹) سے دو باتیں معلوم ہوئیں: اوّل تو یہ کہ نبی علیہ السلام کو منافقین کا بخوبی علم تھا اور دوم یہ کہ ضروری نہیں کسی چیز کے علم ہونے کو ظاہر نہ کرنے کا مطلب اُس چیز سے ناواقفیت ہو۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تو حبیبِ محتشم ﷺ کے وسیع و بیکراں علم پر شادماں ہو کر خوشیاں مناتے تھے جبکہ یہ بات منافقین کے لئے ناقابلِ تسلیم تھی اور الرجی زدہ اور مردم بیزار (Cynic) ہو کر اُنہوں نے ہمیشہ اس حقیقت کو اپنی رسوا کن بدذاتی کا نشانہ بنایا۔

تفسیر خازن اور معالم التنزیل نے درج بالا حدیث کو شرح و بسط کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:

فَبَلَغَ ذٰلِكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَامَ عَلَى الْمِنْبَرِ فَحَمِدَاللّٰهَ تَعَالٰى وَ أَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ: مَابَالُ أَقْوَامٍ طَعَنُوْافِيْ عِلْمِيْ لَا تَسْئَلُوْنِيْ عَنْ شَيْءٍ فِيْمَا بَيْنِيْ وَبَيْنَ السَّاعَةِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمْ بِهٖ فَقَامَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ حُذَافَةَ فَقَالَ: مَنْ أَبِيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ فَقَالَ: حُذَافَةُ فَقَامَ عُمَرُ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ رَضِيْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَّبِالْقُرْآنِ إِمَامًا وَّبِكَ نَبِيًّا فَاعْفُ عَنَّا عَفَااللّٰهُ عَنْكَ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: فَهَلْ أَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ؟ فَهَلْ أَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ؟ ثُمَّ نَزَلَ عَنِ الْمِنْبَرِ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ هٰذِهِ الْآيَةَ (ضیاء القرآن' ج ۱ ص ۳۰۰)

''منافقوں کی اس طعنہ زنی کا علم اللہ کے رسول ﷺ کو ہوا تو آپ منبر پر جلوہ افروز ہوئے' اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: اُس قوم کا کیا حال ہوگا جو میرے علم پر اعتراض کرتے ہیں۔ اس وقت سے لے کر قیامت

تک ہونے والی کوئی بات مجھ سے پوچھو تو میں یہاں کھڑے کھڑے تمہیں اس کا جواب دوں گا۔ عبداللہ بن حذافہ اٹھے (جن کے نسب پر طعن کیا جاتا تھا) اور کہا: اے اللہ کے رسول! میرا باپ کون ہے؟ آپ نے فرمایا: تمہارا باپ حذافہ ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے معذرت طلب کی اور معافی کے خواستگار ہوئے۔ حضور علیہ السلام نے دو مرتبہ فرمایا: کیا میرے علم پر اعتراض کرنے سے باز آؤ گے یا نہیں؟ پھر آپ منبر سے اترے۔ اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔''

''علوم نبوّت : اللہ کے سچے رسول کو اللہ کی ذات' اُس کی صفات' اُس کے احکام اور اُس کی طرف وحی کی گئی کتاب کے مخفی معانی کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ اُسے اپنی اُمت کے ایمان و یقین والوں کا' اُن میں سے منافقین کا اور اُن کی نیکیوں اور بدیوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ مرئی اور غیر مرئی (نظر آنے والی اور نظر نہ آنے والی) چیزوں پر اُس کی برابر نظر ہوتی ہے۔ جوہرِ نبوّت پر روشنی ڈالتے ہوئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''انسانی عقل سے ماوراء ایک مرحلہ ہر چیز کو جاننے کا بھی ہے جہاں قوّتِ مشاہدہ کی ایک اور آنکھ کھلتی ہے۔ جس کے ذریعے اللہ کا رسول مستقبل میں ہونے والے واقعات اور اُن حقیقتوں کو دیکھنے کے قابل ہوتا ہے جن کی رسائی عقل و فہم کے ذریعے نہیں ہو پاتی۔'' (اَلْمُنقِذ مِن الضَّلال' صفحہ ۵۴)

شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے غیر مرئی (نہ دیکھی جانے والی) کی دو قسمیں بتائی ہیں: غیبِ اضافی اور غیبِ مطلق۔ غیبِ اضافی کچھ کو حاصل ہوتا ہے اور کچھ کو نہیں۔ مثلاً رنگ اور ہیئت نابینا شخص کے لئے غیر مرئی ہیں لیکن دوسروں کے لئے نہیں۔ جنت' جہنم اور جنات لوگوں کے لئے غیر مرئی ہیں لیکن فرشتوں کے لئے نہیں۔ بھوک' پیاس' غصہ اور شہوانی خواہشات فرشتوں کے لئے غیر مرئی ہیں لیکن انسانوں کے لئے نہیں۔ ان سب کا تعلق غیبِ اضافی سے ہے۔

غیب کی دوسری قسم یعنی غیبِ مطلق وہ ہے جسے تمام مخلوقات سے چھپا کر رکھا گیا ہے۔ حکیمِ مطلق اللہ اس غیر مرئی کا علم صرف اپنے رسولوں اور نبیوں کو دیتا ہے۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس وضاحت سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ غیبِ اضافی کا علم ایک عام آدمی اور فرشتوں کو بھی حاصل ہوتا ہے لیکن غیبِ مطلق کی خصوصیت صرف رسولوں کے لئے مختص ہے جو غیبِ اضافی سے کلی طور پر مختلف ہے اور جسے غیرِ نبی سے چھپا کر رکھا گیا ہے۔ سورۃ الجن کی مندرجہ ذیل آیات میں غیبِ مطلق کی قسم کا ذکر ہے:

عَالِمُ الْغَیْبِ فَلَایُظْھِرُ عَلٰی غَیْبِہٖٓ اَحَدًاO اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (الجنّ : ۲۶'۲۷)

''وہی غیب کا جاننے والا ہے' سو وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا بجز اُس رسول کے جسے اُس نے پسند فرما لیا ہو۔'' (۷۲ : ۲۶'۲۷)

اس سے معلوم ہو گیا کہ کوئی انسان خواہ کتنا ہی ذہین و فطین کیوں نہ ہو' اُس کے علم و عرفان کا پایہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو اور اُس کے درجات کتنے ہی اعلیٰ و ارفع کیوں نہ ہوں' وہ نہ اپنے حواس سے' نہ قوّتِ شعور سے' نہ فراست سے' نہ قیاس اور عقل سے غیب کو جان سکتا ہے بجز اس کے کہ خداوندِ عالم جو عالم الغیب ہے' وہ خود کسی کو اس نعمت سے سرفراز فرما دے۔ یہ بھی بتا دیا کہ علم غیب کے دروازے ہر اَیرے غیرے کے لئے کھلے نہیں بلکہ وہ صرف اُن رسولوں کو اس نعمت سے نوازتا ہے جنہیں وہ چن لیتا ہے۔ یہ ہے وہ صاف اور سیدھا مطلب جو اِن آیات سے کسی تکلف کے بغیر سمجھ میں آتا ہے۔

علامہ زمخشری معتزلی ہیں۔ اپنے عقیدہِ اعتزال کے مطابق اس آیت سے اُنہوں نے اولیائے کرام کی کرامات کی نفی کی ہے لیکن انبیاء علیہم السلام کے لئے علمِ غیب کا انکار اُنہوں نے بھی نہیں کیا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے شیطان کو دئے گئے علم کا ذکر سورۃ الاعـــراف کی آیت ۲۷ میں ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہوا کہ اللہ کے رسول کا علم شیطان سے کہیں زیادہ ہو ورنہ شیطان کو فوقیت حاصل ہو گی اور وہ علم میں پیغمبر سے بڑھ جائے گا اور یہ بات دو وجہ سے لایعنی اور غیر معقول ہو گی: (۱) اللہ نے اعلان فرمایا: کَتَبَ اللّٰہُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي إِنَّ اللّٰہَ قَوِيٌّ "عَزِيزٌ" (المجادلۃ: ۲۱) (اللہ نے یہ بات لکھ دی ہے کہ میں اور میرے پیغمبر غالب آ کر رہیں گے' بے شک اللہ بڑی قوّت والا' بڑے غلبے والا ہے ۲۱:۵۸)۔ (۲) اگر شیطان کے علم کو رسولوں کے علم سے برتر اور فائق مانا جائے تو دوسرے لوگوں کے گمراہ کرنے کی طرح اُسے العیاذ باللہ رسولوں کو بھی گمراہ کرنے کی قوت حاصل ہوتی جبکہ اُس نے روزِ ازل کو اللہ کے حضور اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ اُس کا بس اُس کے مخلص بندوں پر نہیں چل سکے گا (سورہ صٓ: ۸۲' ۸۳)۔

چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے پکے دشمن شیطان کو تمام عالم کا علم عطا فرمایا ہے' اُس نے شیطان سے کہیں زیادہ اپنے رسولوں کو علم عطا کیا ہے اور یہ بات کتنی ہی تعجب انگیز معلوم ہوتی ہے کہ کچھ لوگ شیطان کو تمام جہان کا عالم مانتے ہیں لیکن رسول کے پسِ دیوار تک کے علم کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔

اصولی طور پر یہ بات ذہن نشین رہے کہ امام الانبیاء ﷺ کا علم "(۱) اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم کی طرح قدیم نہیں بلکہ حادث ہے یعنی پہلے نہیں تھا' بعد میں اللہ تعالیٰ کے عطا کرنے سے حاصل ہوا۔ (۲) اللہ تعالیٰ کے علم کی طرح ذاتی نہیں بلکہ عطائی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سکھانے سے حاصل ہوا۔ (۳) اللہ تعالیٰ کے علم کی طرح لامحدود نہیں بلکہ محدود اور متناہی ہے اور اللہ تعالیٰ کے علمِ محیط کے ساتھ آپ ﷺ کے علم کی نسبت اتنی بھی نہیں جتنی پانی کے ایک قطرے کو دنیا بھر کے سمندروں سے ہے۔"

"ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ آقائے نامدار ﷺ کا یہ حادث' عطائی اور محدود علم اتنا محدود نہیں جتنا بعض

حضرات نے سمجھ رکھا ہے۔ اُس کی وسعتوں کو یاد دینے والا جانتا ہے یا لینے والا۔ یا سکھانے والے کو معلوم ہے یا سیکھنے والے کو۔ ہم شاکس گنتی میں ہیں! جبریلِ امین بھی وہاں دَم مارنے کی مجال نہیں رکھتا۔ علم و معرفت کی وہ وسعتیں اور بے کرانیاں جن پر بیان کا ہر جامہ تنگ ہے' اُن کی حد برآری ہم کرنے لگیں تو ٹھوکریں نہیں کھائیں گے تو اور کیا ہوگا۔''

''اُس تلمیذِ رحمٰن نے اپنی زبانِ حق ترجمان سے ہمیں خود جو کچھ بتایا ہے' ہم اُسے حق تسلیم کرتے ہیں اور اُسی پر ہمارا ایمان ہے۔ اُسی کی زبانِ پاک سے نکلا ہوا یہ قولِ طیب ہم نے سنا ہے :

قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: رَأَيْتُ رَبِّيْ عَزَّوَجَلَّ فِيْ أَحْسَنِ صُوْرَةٍ قَالَ : فِيْمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْأَعْلٰى قُلْتُ: أَنْتَ أَعْلَمُ قَالَ: فَوَضَعَ كَفَّهٗ بَيْنَ كَتِفِيَّ فَوَجَدْتُّ بَرْدَهٗ بَيْنَ ثَدَيَّ فَعَلِمْتُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (ضیاء القرآن' جلد سوم' صفحہ ۴۵۸)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آج میں نے اپنے بزرگ و برتر پروردگار کی بڑی حسین اور پیاری صورت میں زیارت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی ہتھیلی میرے دونوں کندھوں کے درمیان رکھی جس کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینے میں محسوس کی تو میں نے آسمانوں اور زمین کی چیزوں کو جان لیا۔''

اس حدیثِ پاک کی شرح کرتے ہوئے شیخ عبد الحق محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مشکوٰۃ کی شرح اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں کہ اس ارشادِ نبوی کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کو تمام علومِ جزوی اور کلی حاصل ہو گئے اور آپ نے اُن کا احاطہ کر لیا ہے۔

علامہ علی القاری علیہ الرحمۃ نے بھی اپنی کتاب ''المرقاۃ شرح المشکوٰۃ'' میں اسی سے ملتی جلتی بات لکھی ہے۔

(74) عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ أَحَدًاo اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (الجن:۲۶' ۲۷)

''وہی علمِ غیب کا جاننے والا ہے' سو وہ غیب پر کسی کو بھی مطلع نہیں کرتا سوائے اُس رسول کے جسے اُس نے پسند فرما لیا ہو۔'' (۷۲: ۲۶' ۲۷)

آیت کے الفاظ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ أَحَدًاo اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (سو وہ غیب پر کسی کو بھی مطلع نہیں کرتا سوائے اُس رسول کے جسے اُس نے مرتضٰی بنا لیا ہو) پر ذرا توجہ اور غور ہو کہ ہمارے نبیِ مکرّم کا ایک صفاتی نام مرتضٰی بھی تو ہے۔ جس میں اس بات کا صاف اشارہ ہے کہ میں نے علمِ غیب اپنے اس پیغمبر کو دے رکھا ہے جس کا ایک نام مرتضٰی ہے۔

''یہ پسند کیا گیا رسول'' نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ بابرکات ہے جو ایک طرف تو اپنے خالق و

مالک سے علم اور دیگر نوازشات وعطیات وصول کرتا ہے تو دوسری طرف انہیں اُس کی مخلوقات میں تقسیم فرماتا ہے جیسا کہ آپ کا فرمودہ بھی ہے: اَللّٰہُ مُعْطِیْ وَاِنَّمَا اَنَا قَاسِم" یعنی عطا کرنے والا تو اللہ پاک ہے، میں تو (اُس کی جانب سے) تقسیم کرنے والا ہوں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خداداد علوم کی بے کرانیوں کا کچھ اندازہ اُن احادیثِ صحیحہ سے ہوتا ہے جن سے کتب احادیث بھری پڑی ہیں۔

(75) اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَ يَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ مَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِيْرُO

(المجادلہ: ۸)

" کیا آپ نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں سرگوشیوں سے منع کیا گیا تھا پھر وہ لوگ وہی کام کرنے لگے جس سے روکے گئے تھے اور وہ گناہ اور سرکشی اور نافرمانیِ رسول (ﷺ) سے متعلق سرگوشیاں کرتے ہیں اور جب وہ (منافقین) آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو ایسے لفظ سے سلام کرتے ہیں جس سے اللہ نے آپ کو سلام نہیں کیا اور اپنے دل ہی دل میں کہتے ہیں کہ اللہ ہمیں ہمارے اس کہنے پر (فوراً) سزا کیوں نہیں دے دیتا؟ اُن کے لئے جہنم کافی ہے کہ اُس میں وہ داخل ہوں گے' سو وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔" (۵۸ : ۸)

منافقین کی خفیہ مجلسوں جن میں مسلمانوں کے خلاف ہر وقت سازشوں کے منصوبے بنتے رہتے تھے اور جن میں نبی علیہ السلام سمیت مداخلت کرنے والا کوئی نہ تھا' اُن کے متعلق آخر کس نے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو باخبر کیا۔ ظاہر ہے کہ علم الغیب والشھادۃ اور قرآن کے نازل کرنے والے اُس اللہ نے اُن کے ناپاک عزائم کو بے نقاب کیا جو سات سمندروں کی اتھاہ گہرائیوں میں بھی موجود ہے۔ اس طرح آیت بارِ دگر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے منصب رسالت کی توثیق وتصدیق اور آپ ﷺ کی رفعتِ جلیلہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

یہود اور منافقینِ مدینہ کی بدنفسی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ جب مجلسِ نبوی میں آتے اور عام ملکی تہذیب کے لحاظ سے شرماشری سلام کرنا ہی پڑتا تو اس میں بھی ایک پہلو اپنے خبث اور بے تمیزی کا ڈھونڈھ لیتے یعنی زبان سے بجائے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کے اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ تلفظ کرتے جس کے معنی ہیں کہ تم پر موت آئے۔

یُحَیِّكَ بِهِ اللّٰهُ میں جو لطافت اور رسول مکرم ﷺ کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کو جو التفاتِ واقعی ہے اُس کا مزا ہما شما کیا جانیں! سچ کہا کسی نے

آنکھ والا تیرے جلوے کا تماشا دیکھے ۔۔۔ دیدۂ کور کو کیا نظر آئے کیا دیکھے!

الفاظ کو توڑنے موڑنے' کج روذہنیت' بغض وعناد اور پیغمبرِ حق ﷺ کے ساتھ گستاخانہ رویہ میں

اُن کی پیدائشی فطرت کو سورۂ البقرۃ کی آیت ۱۰۴ میں بھی بے نقاب کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ پیغمبر علیہ السلام کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے ان منافقوں کے نقشِ قدم پر نہ چلیں۔

(75) یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا إِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰکُمْ صَدَقَةً ذٰلِكَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَأَطْھَرُ فَإِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَإِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ O (المجادلة : ١٢)

"اے ایمان والو! جب تم رسول (ﷺ) سے کوئی راز کی بات تنہائی میں عرض کرنا چاہو تو اپنی رازدارانہ بات کہنے سے پہلے کچھ صدقہ وخیرات کرلیا کرو۔ یہ (عمل) تمہارے لئے بہتر اور پاکیزہ تر ہے' پھر اگر (خیرات کے لئے) کچھ نہ پاؤ تو بے شک اللہ بخشنے والا' بہت رحم فرمانے والا ہے۔" (۱۲ : ۵۸)

یہ حکم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حد درجہ خلوص اور نبی علیہ السلام کی تعظیم وتکریم کے مدِّ نظر کیا گیا تا کہ اُن کا صدقہ وخیرات کرنا اُن کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔ لیکن صدقہ وخیرات کا یہ حکم خوشحال صحابہ کے لئے تھا کہ وہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں حاضر ہونے سے پہلے اپنے غریب ومحتاج مسلمان بھائیوں کے لئے کچھ نہ کچھ خیرات کر دیا کریں۔ لیکن یہ مخصوص صدقہ وخیرات واجب نہیں تھا کہ کہیں کچھ لوگ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیماتِ عالیہ کے سننے سے محروم نہ رہ جائیں۔ یہ حکم آپ کی رسالت کے ابتدائی دَور میں تھا اور بہت ہی تھوڑے عرصہ کے لئے رہا۔ بعد میں اُسے کلیتاً منسوخ کر دیا گیا۔ آیت مذکورہ کا آخری حصّہ اور اس سے بعد کی آیت (۱۳) اس تنسیخ کی طرف اشارہ کررہی ہیں۔

جناب علی کرّم اللہ وجہہٗ نے رسالتمآب ﷺ سے دس مسائل پوچھے تھے تو دس بار صدقہ کیا تھا۔ اگرچہ اس آیت کا حکمِ وجوبی بعد میں ختم ہوگیا اور استحباب باقی رہا۔ سمجھانا یہی مقصود تھا کہ ایمان والے جب زر خرچ کر کے بارگاہِ نبوّت میں آئیں گے تو کچھ اہمیت محسوس کریں گے۔ عقل سوچ میں پڑ گئی کہ رب اپنے ہاں بلاتا ہے تو کہتا ہے کہ وضو کر کے آؤ اور رسول ﷺ کے ہاں آؤ تو صدقہ کر کے آؤ۔ (ضیاء القرآن' جلد پنجم' صفحہ ۱۴۸)

<u>نبی اکرم ﷺ کے ادب وتعظیم میں کیا چیز شامل ہے؟</u> ادبِ رسول ﷺ میں حسبِ ذیل شامل ہیں:

(۱) ہر شعبہ حیات میں آپ کی مکمل پیروی اور اتباع کا دوسرا نام آدابِ نبوی کا ملحوظ رکھنا ہے۔

(۲) آپ کی محبت اور تعظیم وتوقیر کرنے میں کوئی آپ کا مقابل نہیں چاہے وہ والدین اور قرابتدار ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی سلسلہ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مرتبہ فرمایا تھا:

لَا یُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی أَکُوْنَ أَحَبَّ إِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِیْنَ

"تم میں سے کوئی بھی کامل ایمان والا اُس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک میں اُس کے نزدیک اُس کے والدین' اُس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔"

(۳) مسلمان کے لئے یہ بات شایانِ شان ہے کہ وہ اپنے پیغمبر ﷺ کے دشمن کو اپنا دشمن اور اُن کے دوست اور پیاروں کو اپنا دوست اور محبوب سمجھے۔ اسی طرح پیغمبر علیہ السلام کے نزدیک پسندیدہ کاموں کو پسندیدہ اور اُن کے نزدیک مکروہ اور ناپسندیدہ کاموں سے نفرت کرے۔ پیغمبر علیہ السلام کی ناراضی کی موجب چیزوں پر غصّے اور بیزاری کا اظہار بھی آدابِ نبوی کو ملحوظ رکھنے کی ایک صورت ہے۔

(۴) پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذکرِ خیر پر اُن کی عظمت و رفعت کو مدِّنظر رکھنا' اُن پر درود و سلام کے گلہائے عقیدت نچھاور کرنا' آپ کی عادات و شیم اور بے مثال خصوصیات کو عظیم تر سمجھنا بھی آدابِ نبوی میں شامل ہے۔

(۵) پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جانب سے اس دنیا اور آخرت سے متعلق تمام معلومات کی توثیق کرنا۔

(۶) آپ ﷺ کی سنتِ مبارکہ کا اِحیاء (زندہ کرنا)' شریعت کے احکام اور فیصلوں کو مشتہر کرنا' آپ کے پیغام کی تشہیر اور آپ کی وصیتوں کو نافذ کرنا بھی آدابِ نبوی کو ملحوظ رکھنا ہے۔

(۷) مسجدِ نبوی میں مواجہہ شریف کے سامنے کھڑے ہونے کی صورت میں آپ ﷺ پر مدھم آواز میں درود و سلام بھیجنا بھی آدابِ نبوی کا حصّہ ہے۔

(۸) نیک لوگوں سے محبت کرنا' اُنہیں دوست بنانا اور حبِّ رسول کی بنیاد پر اور سنتِ رسول کی اتباع میں لُچے لفنگوں سے نفرت کرنا اور اُن کے خلاف دل میں کینہ اور بغض رکھنا بھی آدابِ رسالت کو ملحوظِ خاطر رکھنا ہے۔ (''منہاج المسلم''۔۔۔ ابوبکر الجزائری (اردو ترجمہ) صفحہ ۱۵۱)

(77) اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ O (التوبۃ: ۴۰)

''اگر تم اُن کی (یعنی رسول اللہ ﷺ کی) مدد نہ کرو گے (تو کیا ہوا) سو بیشک اللہ نے اُنہیں (اُس وقت بھی) نوازا تھا جب کافروں نے اُنہیں (وطنِ مکّہ سے) نکال دیا تھا درآنحالیکہ وہ دو (ہجرت کرنے والوں) میں سے دوسرے تھے جبکہ دونوں غارِ (ثور) میں تھے جب وہ اپنے ساتھی (ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ) سے فرما رہے تھے: غمزدہ نہ ہو بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پس اللہ نے اُن پر تسکین نازل فرما دی اور اُنہیں (فرشتوں کے) ایسے لشکروں کے ذریعے قوّت بخشی جنہیں تم نہ دیکھ سکے اور اُس نے کافروں کی بات کو پست و فروتر کر دیا اور اللہ کا فرمان تو (ہمیشہ) بلند و بالا ہی ہے اور اللہ غالب' حکمت والا ہے۔'' (۹ : ۴۰)

اپنے وطنِ مالوف شہر مکہ سے نکالے جانے کے بعد نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مدینہ کو ہجرت لائقِ ذکر واقعہ ہے۔ آپ کے دشمنوں نے آپ کی حیاتِ طیّبہ کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس سے پہلے آپ نے اپنے پیروکاروں کو مدینہ بھیج دیا تھا۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے کاشانۂ نبوی میں آپ کے دشمنوں سے نمٹنے کے لئے اپنے آپ کو

رضا کارانہ طور پر پیش کیا تھا۔ رسالتمآب ﷺ کے اکیلے ساتھی جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ اِن دونوں بابرکات ہستیوں نے مکہ مکرّمہ سے تین میل کے فاصلے پر ثور نامی غار میں اپنے آپ کو چھپا لیا جہاں وہ تین دن اور تین رات رہے جبکہ دشمن کی کثیر تعداد اُن کی بے ثمر تلاش میں مارے مارے پھرتی رہی۔ جنابِ صدیق بولے کہ ہم دو ہیں۔ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: نہیں، اللہ بھی تو ہمارے ساتھ ہے۔ ایمان و یقین نے اُن کے ذہنوں کو تسلی و تشفی دی اور وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہے۔ بالآخر وہ بہ فضلِ خدا مدینہ پہنچ گئے جس سے اسلام کا ایک نیا باب وا ہوا۔ اُن کی مدد کرنے والی قوّتیں دکھائی نہیں دیتی تھیں لیکن اُن کی قوّت وتوانائی ناقابلِ دفاع تھی۔

اس مختصر سی جماعت میں ایک نبیِ اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی تھی اور آپ کے اکیلے ساتھی جنابِ ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کے سوا اور کوئی نہ تھا جو آپ ﷺ کی وفات کے بعد اسلام کے پہلے خلیفہ بنے۔ ثَانِیَ اثْنَیْن (دو میں سے دوسرا) جنابِ صدّیق اکبر کا انتہائی معزز لقب بن گیا۔

''آپ (ابوبکر رضی اللہ عنہ) کی حیات کو نقطۂ عروج مل گیا جب محمد (ﷺ) نے مکہ سے نکلنے پر آپ کو اپنا ساتھی بنانا منتخب کیا اور آپ کی خود کو قربان کر دینے کی دوستی کا صلہ یہ ملا کہ قرآن میں آپ کو ثَانِیَ اثْنَیْن کا لقب عطا کر کے آپ کو زندہ جاوید بنا دیا گیا۔'' (Houtsma and Wensink's Encyclopaedia of Islam, Vol. 1, p. 80)

مکہ مکرمہ کے جنوب مشرق میں یہ غار ''ثور'' نامی پہاڑ پر ہے جہاں اِن دو مقدس ہستیوں نے دشمن کی سرتوڑ تلاش سے بچتے ہوئے تین دن پناہ لی تھی۔ دشمن بھاگے ہوئے کو ڈھونڈ نکالنے میں ماہر تھا اور وہ ہر قیمت پر اِن دونوں کو اپنے قبضہ میں لینے کے لئے آمادہ تھا لیکن ان دونوں ہستیوں کا ان ماہر دشمنوں سے بچ نکلنا رب تعالیٰ کی مدد اور معجزہ تھا۔

''یہ غار بالکل تنہا اور دور دراز ہونے کی وجہ سے اِن دونوں (دشمن سے) فرار ہستیوں کے لئے حفاظت کی جگہ نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ دشمن کی تلاش مستعد اور فعّال تھی۔ ایک مرتبہ تو متلاشی غار کے دہانے تک پہنچ چکے تھے اور پیغمبر (ﷺ) اور اُنؓ کے ساتھی نے اُن کی آوازوں کو سُن بھی لیا تھا۔'' ... ("The Saracens" Gilman, p. 121)

''اونٹوں پر مسلّح سوار پہاڑ پر آپ کی تلاش میں تھے۔ اُنہیں ایک چرواہا ملا تو اُنہوں نے ان مفرورین کے بارے میں اُس سے پوچھا۔ غار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس نے جواب دیا: ''شاید وہ اُدھر چھپے ہیں کہ وہ چھپنے کی مناسب جگہ ہے۔'' ابوبکر خوفزدہ ہو گئے اور کہا: ''اتنی بڑی تعداد کے خلاف ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟'' لیکن محمد (ﷺ) نے بڑے سکون سے جواب دیا: ''غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' ایک

مکڑی نے غار کے دہانے پر اپنا بہت پیچیدہ جال بُن رکھا تھا اور ایک سفید فاختہ غار کے داخلے کی جگہ پر گُوٹو کر رہی تھی۔ دنیا کے اُس چھوٹے سے کونے میں سناٹا چھایا ہوا تھا اور تعاقب کرنے والوں نے فاختہ اور مکڑی کے جالے کو دیکھتے ہوئے غار کے اندر جانے کی تکلیف نہ کی۔ جونہی اُن کے قدموں کی چاپ ختم ہوئی تو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔'' "Pilgrimage to Mecca"
.. Lady Cobbold, pp. 67-68)

آیت سے ماخوذ نکات :(۱) اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی کسی مخلوق کا محتاج نہیں بلکہ وہ سب اُس کے محتاج ہیں۔ اگر لوگ پیغمبر ﷺ کی تبلیغِ دین میں مدد کریں تو اس میں اُن کا اپنا مفاد اور بھلائی ہے وگرنہ آپ کا خالق آپ کے لئے کافی ہے (بحوالہ سورۃ الانفال: آیت ۶۴، سورۃ الزُّمر: آیت ۳۶) اور جیسا کہ دنیا نے آپ کی ہجرتِ مدینہ کے واقعہ میں دیکھ لیا۔ (۲) آیت میں دشمنانِ رسول کے لئے یہ کھلا چیلنج ہے کہ آپ کا لایا ہوا مشن بالآخر فتحیاب ہوگا اور دشمنوں کو منہ کی کھانی پڑے گی۔ (۳) سیّدنا ابوبکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کبھی گمراہ نہیں ہو سکتے کیونکہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا آپ کے لئے یہ مژدہ جاں فزا ہے کہ ''اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

(78) یٰسٓ O وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ O إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ O عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ O (یٰس: ۱-۴)
''یاسین (حقیقی معنیٰ اور اُس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں) حکمت سے معمور قرآن کی قسم' بیشک آپ ضرور بالضرور رسولوں میں سے ہیں' سیدھی راہ پر قائم ہیں۔'' (۱-۴ : ۳۶)

یٰسٓ بالعموم نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا صوفیانہ لقب کہا جاتا ہے۔ نبی محتشم ﷺ کی بہترین اَسناد اور تعارفی خطوط (۱) وحیِ الٰہی یعنی قرآن مجید (۲) آپ کی دلیرانہ' بے لوث و بے غرض زندگی ہے جو آپ نے ہمیشہ صراطِ مستقیم پر گزاری۔ اس لئے اُنہیں اللہ کا نبی مان لینے کی الٰہی ترغیب کو اِنہی دو حقائق کی بنیاد پر بنایا گیا۔

قرآن کی قسم کھانا اور دو تاکیدی الفاظ اِنَّ اور اس کے ساتھ لِ (اگرچہ اُن کی ضرورت نہ تھی کیونکہ کلامِ الٰہی سے بڑھ کر کس کا کلام سچا ہوسکتا ہے) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے منصبِ رسالت کی توثیق وتصدیق کے لئے ہیں اور یہ بات کفارِ مکّہ کے اس اعتراض کے جواب میں ہے کہ (معاذ اللہ) آپ (ﷺ) خود اپنی طرف سے گھڑ کر اس کلام کو اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ نیز آیت میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تسکین وراحت کا سامان یہ کہہ کر کیا گیا ہے کہ اے پیارے نبی! اس قرآن کی قسم کھاتے ہوئے آپ کا رب آپ کی رسالت کا گواہ ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی بدنصیب آپ کی رسالت کا منکر ہو تو آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہاں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سیدھی راہ پر گامزن بتایا گیا ہے جبکہ قرآن کا اتارنے والا رب بھی صراط

مستقیم پر ہے (بحوالہ سورہ ھود : آیت ۵۶)۔ جب قرآن کا بھیجنے والا اور اُس کا وصول کرنے والا دونوں صراطِ مستقیم پر ہیں تو اسلام کے مشن کی صداقت میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے؟

یہاں ایک انتہائی اہم نکتے کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ ایک حدیثِ مبارکہ کے مطابق سورہ یٰسٓ قرآن مجید کا دل ہے۔ دل خون کا امین اور خزینہ ہوتا ہے جو جسم کے مختلف اعضاء میں اُن کی ضرورت کے مطابق خون تقسیم کرتا ہے اور حدیث: ''دینے والا تو اللہ ہے' میں تو تقسیم کرنے والا ہوں۔'' کا صاف مطلب یہی ہے کہ کائنات میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیثیت دل کی سی ہے جبکہ سورہ یٰسٓ قرآن مجید کا دل ہے تو پھر اس سورۃ کا کتنا لطیف اور پیارا آغاز ہے کہ قرآن کے دل کو ساری کائنات کے دل (محمد ﷺ) کے ذکر سے شروع کیا جا رہا ہے!

''اب ہمیں معلوم ہوا کہ مسلمان کے وقتِ آخر میں اس سورہ کو کیوں پڑھ کر اُسے سنایا جاتا ہے۔ اس دارِ فانی سے دارِ بقا کو جانے والے کے سامنے کئی حقیقتیں اور صداقتیں کھل کر سامنے آجاتی ہیں۔ جب ہم اُسے اس سورۃ کی عظیم جمالیاتی نظم و تناسب اور خوش آہنگی کے ساتھ روزِ قیامت کا جاں فزا مژدہ سنائیں تو وہ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے ساتھ دوسری دنیا میں داخل ہوگا اور اُس کے آخری سانسوں میں یہ بات کتنی حسین و جمیل اور راحت بخش ہے! یہ اُس مرنے والے شخص کو سبز درخت سے نکلنے والی اُس حیات بخش آکسیجن (بحوالہ سورہ یٰسٓ: آیت ۸۰) کی یاددہانی کرانا اور اُس کا دوسری دنیا کو پُر مسرت طور پر جانا صرف اُسی کا حصّہ ہے جو ایمان ہی سے حاصل ہوتا ہے۔'' ("The Holy Qur'an and the Facts of Science"... Dr. Haluk Nurbaki; p. 136)

(79) وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝ (اَلشُّعراء : ۲۱۵)

''اور آپ اپنا بازو ئے (رحمت و شفقت) اُن مؤمنوں کے لئے بچھا دیجئے جنہوں نے آپ کی پیروی اختیار کرلی ہے۔'' (۲۶ : ۲۱۵)

یہ استعارہ اُس پرندے سے ہے جو اپنے پروں کو مشفقانہ اشتیاق کے ساتھ اپنے بچوں کے لئے بچھاتا ہے۔ پَر بچھانے کا ذکر سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۲۴ میں بھی بوڑھے والدین کی خدمت کرنے کے ضمن میں آیا ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام جنہیں ''امام الانبیاءؑ'' جیسے انتہائی معظم و مشرّف لقب کا سہرا پہنایا گیا' کو حکم دیا جارہا ہے کہ وہ مؤمنوں کے ساتھ اسی طرح مہربان و شفیق اور بُردبار رہیں جس طرح اونچی پرواز والا پرندہ اپنے بچوں کے لئے ہوتا ہے جب وہ اُن کے لئے نیچے آکر اپنے پروں کو بچھا دیتا ہے۔ پَر بچھانے کا ذکر سورۃُ الحِجر کی آیت ۸۸ میں بھی آیا ہے۔

مقام و مرتبہ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے پیروکاروں میں بُعد المشرقین سے بھی کہیں زیادہ کا فرق ہے۔ لیکن یہاں مخدوم کو حکم دیا جارہا ہے کہ وہ اپنے خادموں کے ساتھ متواضع اور شفیق بن کر رہیں جو اعلیٰ اخلاق

اقدار کا ایسا سبق ہے جو کسی دوسرے مذہب میں نہیں پایا جاتا۔

لفظ وَاخْفِضْ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خداداد عالی اور رفیع مرتبہ کی طرف صاف اشارہ ہے کہ ''پیارے حبیب! اہلِ ایمان کے لئے اپنے پروں کو نیچا کر لیجئے۔ وہ پر جن کے لئے عرش کی بلندیاں بھی سمٹ آتی ہیں اور لامکان کی رفعتیں بھی سرنگوں ہو جاتی ہیں۔ ان پروں کو نیچا کیجئے تاکہ آپ کے غلام بھی آپ سے زیادہ سے زیادہ فیضیاب ہوسکیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر حضور علیہ السلام مقامِ محبوبیت کی رفعتوں ہی میں محوِ پرواز رہتے تو خاک نشین اس دامنِ رحمت کا سہارا کیسے لے سکتے اور وہ اس چشمہِ فیض سے اپنی تشنہ لبی کا درماں کیونکر کر سکتے۔ فرمایا اپنے پروں کو نیچے کیجئے تاکہ تمہاری ردائے رحمۃ للعالمینی کا سایہ اُن کے سروں پر بھی پڑے۔ راعی اپنے ریوڑ کی کمزور اور لاغر بکریوں کو پیچھے چھوڑ کر چلا نہیں جاتا۔ تیز رفتار قائد کو اپنے ضعیف اور سست رَو ساتھیوں کا لحاظ رکھنا ہی پڑتا ہے۔ آیت کے اِس حصے میں جو مٹھاس اور معنویت ہے' اُسے اہلِ دل ہی سمجھ سکتے ہیں۔'' (ضیاء القرآن' جلد دوم' صفحہ ۵۵۰)

(80) اَلَّذِیْ یَرٰاکَ حِیْنَ تَقُوْمُO وَتَقَلُّبَکَ فِی السّٰاجِدِیْنَO (اَلشُّعراء: ۲۱۸' ۲۱۹)

''(وہ) جو آپ کو (رات کی تنہائیوں میں بھی) دیکھتا ہے جب آپ (نمازِ تہجد کے لئے) قیام کرتے ہیں اور سجدہ گزاروں میں (بھی) آپ کا پلٹنا دیکھتا (رہتا) ہے۔'' (۲۱۸'۲۱۹: ۲۶)

اس آیت کے مختلف معانی بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً (۱) نماز کے دوران نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تمام حرکات وسکنات: قیام سے رکوع تک' رکوع سے قومہ تک' قومہ سے سجدہ تک اور پھر سجدہ سے قیام تک اللہ تبارک وتعالیٰ کی نظر میں ہیں اور اُس سے کچھ بھی مخفی نہیں ہے۔ (۲) آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مرتبہ نماز پڑھائی۔ کچھ صحابہ نے آپ سے پہلے رکوع اور سجدہ کر لیا۔ نماز کے بعد آپ نے اُنہیں ایسا کرنے سے منع فرمایا اور تنبیہ کی کہ یہ نہ سمجھو کہ جب میں قبلہ رُو کھڑا ہوتا ہوں تو میں تمہاری حرکات وسکنات سے بے خبر ہوتا ہوں:

فَوَاللہِ مَا یَخْفٰی عَلَیَّ خُشُوْعُکُمْ وَلَا رَکُوْعُکُمْ اِنِّیْ لَاَرَاکُمْ مِنْ وَّرَآءِ ظَھْرِیْ (بخاری)

''بخدا! مجھ پر نہ تمہارا (قلبی) خشوع وخشوع چھپا ہوتا ہے اور نہ تمہارا رکوع۔ میں تمہیں اپنی پُشت کے پیچھے بھی دیکھ رہا ہوتا ہوں۔'' (صحیح بخاری)

حدیثِ مذکورہ میں اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ پیارے رسول! جب آپ کے صحابہ کی داخلی اور خارجی کیفیات آپ کی نظروں کے سامنے ہیں تو آپ کے خالق کی بھی نظر آپ کے تمام اعمال وافعال پر ہوتی ہے۔ غرض کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی نماز میں اپنے لئے بھی اور اپنے صحابہ کے لئے بھی حد درجہ پُر خلوص' گرم جوش اور سرگرم ہوا کرتے تھے۔ آپ کی طہارت اور راست روی اللہ تبارک وتعالیٰ کو بخوبی معلوم تھے۔

(81) وَقُلْ اِنِّیْ اَنَا النَّذِیْرُ الْمُبِیْنُO (اَلْحِجر: ۸۹)

''اور فرما دیجئے کہ بے شک (اب) میں ہی (عذابِ الٰہی کا) واضح ڈرسنانے والا ہوں۔'' (۱۵:۸۹)

اس آیت میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ دشمنانِ اسلام کو اپنے تبلیغ کا فریضہ انجام دیں۔ اگرچہ اُن کا ہدایت پر آنا' نہ آنا صرف اللہ پر موقوف ہے اور اُن کی کج روی اور گمراہی کا ذمہ دار پیغمبر علیہ السلام کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ پیارے! آپ نے جب فریضہ تبلیغ ادا کر دیا اور اُنہوں نے اِسے نہیں مانا تو اُنہیں اُن کی گمراہی میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے چھوڑ دیجئے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت و حاکمیت میں بناوٹ سے کام نہیں لیا جاتا تھا اور برائی اور بدی سے کوئی مصالحت نہیں ہوتی تھی۔ بدی کی غیر مبہم طور پر بیخ کنی کر دی گئی تھی اور لفظ ''مبیـــــن'' کا مطلب واضح ہونے اور ابہام سے دُور ہونے کا ہے۔

(82) فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ O عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ O فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ O (اَلْحِجر: ۹۲ تا ۹۴)

''سو آپ کے رب کی قسم! ہم ان سب سے ضرور بالضرور پُرسش کریں گے اُن اعمال سے متعلق جو وہ کرتے رہے تھے۔ پس آپ وہ (باتیں) اعلانیہ کہہ ڈالیں جن کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اور آپ مشرکوں سے منہ پھیر لیجئے۔'' (۹۲ تا ۹۴ : ۱۵)

اپنے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو رنج و اَلم اور اعصاب شکن زندگی سے نجات دینے کے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو تسلی دے رہا ہے اور وہ بھی اپنی قسم کھا کر کہ پیارے! میں ربِّ محمد ہونے کے ناطے سے تیرے دشمنوں سے یقینی طور پر پُرسش کر کے رہوں گا کہ وہ تیرے خلاف کیا کیا سازشیں کرتے رہے ہیں۔ یہ پُرسش سوال کے طور پر نہیں بلکہ اُن پر ہونے والی سزا کی خبر کے طور پر ہوگی۔ اُن سب لوگوں کی ضرور جواب طلبی ہوگی جو میرے کلام کا کسی بھی صورت میں مذاق اُڑاتے ہیں کیونکہ پیارے! وہ اور تجھے دکھ دینے والے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

آیت مذکورہ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تسلی و تشفی تین طرح سے کی جا رہی ہے: (۱) اپنی ذات (یعنی ربِّ محمد) کی قسم کھا کر (۲) فعل سے (لَنَسْئَلَنَّ) پہلے لامِ تاکیدی لا کر اور (۳) اور اُسی فعل کے ساتھ نونِ ثقیلہ (نّ) لا کر جس سے معانی میں زبردست زور پیدا ہو گیا ہے۔

اِصْدَعْ کا معنیٰ کسی چیز کو بالوضاحت بیان کرنا' جیسا کہ امام راغب اصفہانی نے ''مفردات'' میں بیان کیا ہے۔

(83) اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ O الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ O (اَلْحِجر: ۹۵'۹۶)

''بے شک مذاق کرنے والوں (کو انجام تک پہنچانے) کے لئے ہم آپ کو کافی ہیں۔ جو اللہ کے ساتھ دوسرا معبود بناتے ہیں، سو وہ عنقریب (اپنا انجام) جان لیں گے۔'' (۹۵، ۹۶ : ۱۵)

امام الانبیاء محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو ایک بار پھر یہ کہہ کر تسلی و تشفی دی جا رہی ہے کہ پیارے! اگر ساری دنیا بھی تیرے خلاف غم و غصہ سے بھر جائے اور تیرا مذاق اُڑائیں تو کیا ہم قادرِ مطلق ہوتے ہوئے تیری حفاظت کے لئے کافی نہیں؟ ہماری قوّت اور قدرت اُن سب پر بھاری ہے۔ پیارے! فکر کی ضرورت نہیں کیونکہ تیرا یہ مذاق اُڑانے والے ایک دو روز کی مخلوق ہیں۔ جلد ہی وہ اپنے انجام کو پالیں گے اور اُنہیں باطل کو اپنانے کی سزامل کے رہے گی۔ اُن کی طرف آپ کا لایا ہوا پیغامِ الٰہی ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گا اور آپ کے خلاف اُن کے کمینے منصوبوں کو ناکامی اور رسوائی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔

''پیغمبر (ﷺ) جو چاروں طرف سے اپنے دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے اور بظاہر کوئی پناہ گاہ نظر نہ آتی تھی جبکہ اُن کے پیروکاروں کا مختصر سا دستہ جو شیر کے منہ میں نوالے کی طرح تھا، اِن سب حقائق کے باوجود آپ کا اللہ کی قدرتِ کاملہ پر پورا ایمان تھا اور اپنے آپ کو اُس کا سچا رسول ہونے کا پورا یقین تھا۔ آپ اپنے مشن کی تکمیل میں زندگی بھر مستقل مزاج رہے اور دشمنوں کی فریب کاریوں سے ذرّہ بھر متاثر نہیں ہوئے۔ آپ کا یہ عظیم کردار اعلیٰ فطانت اور برگزیدگی کا ایسا نمونہ پیش کرتا ہے جس کا مقابلہ شاید ہی انبیائے سابقہ کا کوئی پیغمبر کر سکے۔'' ("The Life of Mahomet" ... Sir William Muir, p. 126)

(84) وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ○ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ○ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ○ (اَلْحِجْر : ۹۷-۹۹)

''اور بے شک ہمیں معلوم ہے کہ آپ کا سینہ (مبارک) اُن باتوں سے تنگ ہوتا ہے جو وہ کہتے ہیں۔ سو آپ حمد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح کیا کریں اور سجدہ کرنے والوں میں (شامل) رہا کریں۔ اور اپنے پالنہار کی عبادت کرتے رہیں یہاں تک کہ آپ کو (آپ کی شان کے لائق) مقامِ یقین مل جائے (یعنی انشراحِ کامل نصیب ہو جائے یا لمحۂ وصالِ حق)۔'' (۹۷-۹۹:۱۵)

یہاں ایک اور طریق سے پیغمبر علیہ السلام کی تسلی و تشفی اور راحت کا سامان کیا جا رہا ہے۔ آپ ﷺ کے دشمنوں کی جانب سے ایذا رسانیوں کے لامتناہی سلسلے کے باعث آپ کی دل گرفتگی اور آپ کے سینہ مبارک کے تنگ ہونے کی تلافی اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (کیا ہم نے آپ کا انشراحِ صدر نہیں فرما دیا؟) کہہ کر کی گئی۔

آیتِ بالا ۹۸ (فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ) سے یہ سبق ملا کہ انسان جب بھی زندگی

کی ناخوشگواریوں سے تنگ آجائے اور اس بھری دنیا میں کوئی بھی اُس کا مونس و غمخوار نہ ہو تو اُسے فوراً اپنے خالقِ برحق کے حضور سجدہ ریز ہو جانا چاہئے جس سے ناامیدی اور قنوطیت کے بادل چھٹ جائیں گے اور بفضلہٖ تعالیٰ اُمید و رجائیت اور زندگی کی نئی کرن پھوٹے گی۔

اَلْيَقِيْن کا یہاں معنیٰ موت کا ہے کیونکہ ہر جاندار کے لئے موت یقینی ہے۔ حوالہ جات ملاحظہ ہوں:

(۱) يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ أَىْ يَأْتِيَكَ الْمَوْتُ (لسان العرب لابن منظور افریقی)

''آپ کو یقین آئے تو یہاں یقین سے مراد موت ہے۔''

(۲) اَلْيَقِيْنُ اَلْمَوتُ لِاَنَّهُ تُيَقَّنُ لِحَاقُهُ لِكُلِّ مَخْلُوْقٍ حَيٍّ (تاج العروس لجوهری)

''یقین سے مراد موت ہے کیونکہ وہ ہر جاندار مخلوق کے لئے یقینی بات ہے۔''

سورۃ المدثّر میں بھی یقین کا لفظ موت کے معنیٰ میں آیا ہے:

وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِO حَتّٰى اَتٰنَا الْيَقِيْنُO (الْمُدَّثِّر: ۴۶، ۴۷)

''اور ہم روزِ جزا کو جھٹلایا کرتے تھے یہاں تک کہ ہم پر جس کا آنا یقینی تھا (وہ موت) آ پہنچی۔'' (۴۶، ۴۷ : ۷۴)

سیّدنا عثمان ابن مظعون رضی اللہ عنہ کی شہادت پر بھی نبی مکرّم ﷺ نے ''یقین'' کا لفظ موت کے معنیٰ میں استعمال فرمایا:

اَمَّا هُوَ فَقَدْ جَاءَهُ الْيَقِيْنُ وَاِنِّىْ لَارْجُوْا لَهُ الْخَيْرَ (صحيح بخاری: كتاب الجنائز)

<u>ایک ایمان افروز نکتہ</u>: اوپر سورۃ الحجر کی آیت ۹۹ میں ''موت'' کا لفظ چونکہ نبوت و رسالت کے شایانِ شان نہیں تھا' اس لئے اُسے عظمتِ رسول کے مدِّنظر اَلْيَقِيْن سے بدل دیا گیا۔

(85) مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰىO وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰىO (اَلضُّحیٰ: ۳، ۴)

''آپ کے رب نے آپ کو نہیں چھوڑا اور نہ ہی آپ سے ناراض ہوا ہے اور بیشک (ہر) بعد کی گھڑی آپ کے لئے پہلی سے بہتر (یعنی باعثِ عظمت و رفعت) ہے۔'' (۳، ۴ : ۹۳)

بعثتِ نبوی کے ابتدائی دنوں میں چند روز کے لئے وحی کا آنا بند ہو گیا تو کفار نے آپ پر تمسخر و استہزاء کے تیر برسانے شروع کر دئے کہ اُس کے خدا نے اُس سے ناراض ہو کر اُسے چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ روشن دن اور تاریک و پُرسکون رات کی قسم کھا کر کفار کے اعتراضات اور مطاعن کی تردید فرمائی' اور ساتھ ہی اپنے حبیب علیہ

السلام کی دلجوئی کر دی کہ اے محبوبِ محتشم! آپ کے پروردگار نے نہ تو آپ کو چھوڑا ہے اور نہ ہی وہ آپ سے ناراض ہوا ہے بلکہ وحی کے نزول میں بھی اُس کی حکمت تھی اور اُس کے رُک جانے میں بھی کئی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ آپ پر تو آپ کے رب کے لطف و کرم اور انعام و احسان کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا' ہر آنے والی ساعت گزری ہوئی ساعت سے' ہر آنے والی گھڑی گزری ہوئی گھڑیوں اور ہر آنے والی حالت گزشتہ حالات سے اعلیٰ' بہتر سے بہتر اور ارفع سے ارفع ہوگی۔ اس ایک جملہ سے کفار کے طعن و تشنیع اور الزام تراشیوں کا سدِّ باب بھی ہو گیا اور اسلام کے درخشاں مستقبل کے بارے میں نویدِ جانفزا بھی سنا دی گئی۔''

''دعوتِ اسلام کے ابتدائی دَور کا تصوّر کیجئے جس میں یہ سورت نازل ہوئی۔ گنتی کے چند افراد نے اس دینِ حق کو قبول کیا تھا۔ باقی تمام اہلِ مکّہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خون کے پیاسے تھے۔ اُنہوں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اسلام کے چراغ کو بجھا کے رہیں گے' توحید کا یہ گلشن جو مصطفیٰ (ﷺ) لگا رہے ہیں' اُس کا ایک ایک پودا جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔ اُس وقت کون یہ خیال کر سکتا تھا کہ یہ دین چند سالوں میں اتنی ترقی کر جائے گا کہ سارا جزیرہ عرب اُس کے نور سے جگمگانے لگے گا۔ اِس نبی معظّم کو رب تعالیٰ وہ عزت و سروری اور شانِ محبوبی عطا فرمائے گا کہ آج جو لوگ خون کے پیاسے ہیں' کل آپ کے اشارۂ ابرو پر اپنی جانیں قربان کرنا سعادت سمجھیں گے اور حضور علیہ السلام کے وضو کا پانی نیچے نہیں گرنے دیں گے بلکہ اُسے اپنے چہروں اور سینوں پر مَل لیں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں :

أُرِیَ النَّبِیُّ ﷺ مَایَفْتَحِ اللّٰہُ عَلٰی أُمَّتِہٖ بَعْدَہٗ' فَسُرَّ بِذٰلِکَ وَنَزَلَ جِبْرَئِیْلُ بِقَوْلِہٖ تعالیٰ : وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی

''حضور علیہ السلام کے بعد اُمّت جو فتوحات کرے گی وہ سب کی سب حضور ﷺ کو دکھا دی گئیں جنہیں دیکھ کر آپ بہت مسرور ہوئے۔ اُسی وقت جبریلِ امین یہ آیت لے کر نازل ہوئے: وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی یعنی ہماری نوازشات صرف ان فتوحات ہی میں منحصر نہیں بلکہ آپ کی ہر آنے والی شان پہلی شان سے اعلیٰ و بالا ہوگی۔'' (''ضیاء القرآن'' — پیر سیّد کرم شاہ الازہری' جلد پنجم' ص ص ۵۸۶'۵۸۷)

(86) وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی O (اَلضُّحٰی : ۵)

''اور عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔'' (۹۳:۵)

مستند روایات کی رُو سے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی انتہائی خوشی یہ ہے کہ وہ اپنے آخری اُمّتی کو بہ اذنِ الٰہی اپنے ساتھ جنت میں لے جائیں۔ یہ بات آپ کے خالق کے حضور اپنی امت کے گنہگاروں' توبہ کرنے والوں' نادم و پشیمان لوگوں کے لئے شفیع ہونے کا مظہر ہے۔ امام غزالی (۴۵۰۔۵۰۵ھ/۱۰۵۸۔۱۱۱۱ء) کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا محمد (ﷺ) کو خوش کن تحفہ آپ کی امت کے لئے شفیع بنانا ہے۔'' (''احیاء علوم الدین'')

مقام محمود کی وضاحت میں چند احادیث نبویہ

(۱) حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جبریلِ امین میرے پاس آئے اور مجھے پیغامِ الٰہی دیا:

فَخَيَّرَنِي رَبِّي بَيْنَ اَنْ يَّدْخُلَ نِصْفُ اُمَّتِي اَلْجَنَّةَ وَبَيْنَ الشَّفَاعَةِ فَاخْتَرْتُ الشَّفَاعَةَ
''میرے رب نے مجھے اختیار دیا کہ وہ یا تو میری آدھی اُمت کو جنت میں داخل کر دے یا میں شفاعت کو قبول کر لوں' تو میں نے شفاعت کو پسند کیا۔'' (ابن ماجہ' ترمذی)

(۲) شَفَاعَتِي لِاَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِي
''میری شفاعت میری اُمّت کے کبیرہ گناہوں کے مرتکب لوگوں کے لئے ہوگی (جو توبہ کرنے والے' پشیمان اور نادم ہوں)۔''

(۳) ''حضرت اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ آپ روزِ محشر میری اللہ تعالیٰ کے حضور شفاعت کرائیں جس کا آپ نے وعدہ فرما لیا۔ میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! اُس دن میں آپ کو کہاں تلاش کروں؟ فرمایا: پہلے تم مجھے پُل صراط پر پاؤ گے۔ میں نے پوچھا: اگر میں وہاں آپ کو نہ پاؤں تو کہاں؟ فرمایا: پھر میں تمہیں میزان پر ملوں گا (یہ وہ جگہ ہے جہاں لوگوں کے اعمال تولے جائیں گے)۔ میں نے پھر پوچھا: وہاں بھی اگر آپ نہ مل سکے تو؟ آپ نے فرمایا: تو پھر تم مجھے حوضِ کوثر پر پاؤ گے کیونکہ میں نے ان تین جگہوں میں سے کسی نہ کسی جگہ پر ملنا ہے۔'' (ترمذی)

(۴) حضرت سیدنا علی کرّم اللہ وجھہ' سے مروی ہے کہ حضور کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں اپنی امت کے لئے شفاعت کرتا رہوں گا یہاں تک کہ میرا رب مجھے ندا کرے گا اور پوچھے گا: کیا آپ راضی ہو گئے ہیں؟ میں عرض کروں گا: ہاں میرے پروردگار میں راضی ہو گیا۔

(۵) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک دن حضور ﷺ نے یہ آیت پڑھی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی تھی: فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ (جس نے میری پیروی کی وہ میرے گروہ سے ہے) پھر یہ آیت پڑھی جس میں عیسیٰ علیہ السلام نے عرض کی تھی: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ O (سورة المائدة: ۱۱۸) (یعنی اگر تو اُنہیں عذاب دے تو وہ تیرے (ہی) بندے ہیں اور اگر تو اُنہیں بخش دے تو بیشک تو ہی بڑا غالب' حکمت والا ہے)۔ پھر اپنے دونوں مبارک ہاتھوں کو دعا کے لئے اٹھایا اور عرض کی: الٰہی! میری اُمّت' میری اُمّت۔ پھر آپ زار و قطار رونے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے جبریل کو حکم دیا کہ فوراً میرے حبیب کے پاس جاؤ اور اُنہیں یہ پیغام پہنچاؤ:

اِنَّا سَنُرْضِیْكَ فِیْ اُمَّتِكَ وَلَانَسُوْءُكَ (صحیح بخاری، صحیح مسلم بحوالہ تفسیر نعیمی، ج ۱ ص ۳۹۸)
''ہم یقیناً آپ کو آپ کی اُمّت کے بارے میں راضی کر کے رہیں گے اور آپ کو غم زدہ نہیں ہونے دیں گے۔''

(87) وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْیُنِنَا (الطُّور: ۴۸)
''(اے حبیبِ مکرّم!) آپ اپنے رب کے حکم کی خاطر صبر جاری رکھئے، بیشک آپ (ہر وقت) ہماری آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں۔'' (۴۸ : ۵۱)

اَعْیُن (عین کی جمع بمعنیٰ آنکھ) کا لفظ یہاں استعارۃً لایا گیا ہے جس کا معنیٰ حفاظت، نگہداشت اور ذمہ داری کا ہے جیسا کہ تفسیر روح البیان میں ہے۔ مطلب یہ کہ اے حبیب! اگر ان ظالموں اور بدبختوں نے آپ سے نگاہیں پھیر لی ہیں تو کیا ہوا، ہم تو آپ کی طرف سے نگاہیں ہٹاتے ہی نہیں کہ آپ کو ہم ہر وقت تکتے رہتے ہیں۔ آپ ہر وقت ہماری حفاظت میں ہیں اور کوئی آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ دشمن کی ایذا رسانیوں اور دل آزاریوں کا اُن سے انتقام لینے میں جلدی نہ کیجئے بلکہ رسالت کے اپنے عالی وارفع منصب کے پیشِ نظر صبر و تحمل سے کام لیجئے اور اس انتظار میں رہیے کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

مَعْنَاهُ التَّعْظِیْمُ وَالتَّفْخِیْمُ وَنَظِیْرُهٗ فِی الْجَمْعِ لِلتَّفْخِیْمِ وَالتَّعْظِیْمِ قَوْلُهٗ تَعَالٰی تَجْرِیْ بِاَعْیُنِنَا وَقَوْلُهٗ تَعَالٰی مِمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَا (غرائب القرآن للجستانی)
یعنی یہاں اَعْیُن (عین کی جمع بمعنیٰ آنکھ) کا لفظ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے منصبِ رسالت کی حد درجہ عظمت و رفعت کو اجاگر کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔ ایسی اور مثالیں بھی قرآن پاک میں ہیں، مثلاً سورۃ القمر کی آیت ۱۴ میں (تَجْرِیْ بِاَعْیُنِنَا) اور سورہ یٰسٓ کی آیت ۷۱ میں (مِمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَا)۔

لیکن یہ خیال رہے کہ موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر کی پرورش کے تذکرے میں رب تعالیٰ نے اپنی صرف ایک آنکھ کا ذکر فرمایا: وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ (سورہ طٰہٰ: ۳۹) (تا کہ تمہاری پرورش میری آنکھ کے سامنے کی جائے)۔ لیکن خاتم الانبیاء ﷺ کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ پیارے رسول! ہم اپنی تمام ذاتی اور صفاتی آنکھوں سے آپ کو دیکھتے رہتے ہیں جس کی مثال نہ تو کہیں ملتی ہے اور نہ ہی کسی اور پیغمبر کے بارے میں ہم نے ایسی کوئی بات کہی ہے۔

(88) اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًاO لِیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَیُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكَ وَیَهْدِیَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًاO وَّیَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِیْزًاO (الفتح: ۱-۳)
''(اے حبیبِ محتشم!) بے شک ہم نے آپ کے لئے (اسلام کی) روشن فتح (اور غلبہ) کا فیصلہ فرما دیا

تا کہ آپ کی خاطر اللہ آپ کی اُمت (کے اُن تمام افراد) کی اگلی پچھلی خطائیں معاف فرمادے☆ اور یوں آپ پر اپنی نعمت (ظاہراً و باطناً) پوری فرمادے اور آپ (کے واسطہ سے آپ کی امت) کو سیدھی راہ پر ثابت قدم رکھے اور اللہ آپ کو نہایت باعزت مدد و نصرت سے نوازے۔'' (۱-۳ : ۴۸)

''فتح مبین'' سے مراد فتح مکّہ کی پیشگوئی ہے اور بعض مفسرین کے نزدیک اس سے مراد صلح حُدیبیہ ہے جس سے کفارِ مکّہ نے اسلام کو اپنے برابر کی قوت تسلیم کرلیا۔ دراصل پورے ملکِ عرب میں اور اُس کے بعد پوری دنیا میں اسلام کی تشہیر کا دروازہ اِسی واقعہ سے کھلا۔

ذَنْب اور اِثْم میں فرق ہے۔ اِثْم (بمعنی گناہ) کا ارتکاب بالخصوص عمداً اور ارادتاً ہوتا ہے جبکہ ذَنْب یا تو ارادی ہوتا ہے یا بے توجہی اور بے خیالی سے ہوتا ہے (E.W. Lane's Arabic English Lexicon, Part 3, p. 981) جب اس لفظ (ذَنْب) کو پیغمبروں کے حوالہ سے بولا جائے تو اس میں بے خیالی کا عنصر غالب ہوتا ہے اور اُن کے لئے قابلِ الزام نہیں ہوتا لیکن اُن کے عالی مقام کے شایانِ شان بھی نہیں ہوتا۔ محض خطا یا کسی فیصلہ میں خطا جس میں کوئی اخلاقی لغزش نہ ہو' اُسے گناہ کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

اگر آیت مذکورہ کے الفاظ کے ظاہر معنی لئے جائیں تو یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ سرورِ عالم ﷺ صغیرہ و کبیرہ تمام گناہوں سے معصوم ہیں اور استغفار کی تو اُس وقت ضرورت پڑتی ہے جب کوئی گناہ سرزد ہوجائے۔ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام معصوم عن الخطا ہیں تو پھر استغفار کا کیا مطلب ہے؟ اس اِشکال کے متعدّد جواب دیے گئے ہیں:

(۱) ''ذَنْب'' کا معنیٰ عام طور پر ''گناہ'' کیا جاتا ہے۔ گناہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی کو

☆ یہاں حذف مضاف واقع ہوا ہے، مراد مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِ اُمَّتِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ہے کیونکہ آگے اُمت ہی کے لئے نزولِ سکینہ' دخولِ جنت اور گناہوں کی بخشش کی بشارت کا ذکر ہے۔ یہ مضمون آیت ۱ تا ۵ تک ملا کر پڑھیں تو معنیٰ خود بخود واضح ہوجائے گا۔ جیسا کہ سورۃ المؤمن کی آیت نمبر ۵۵ کے تحت مفسرینِ کرام نے بیان کیا ہے کہ لِذَنْبِكَ میں ''امت'' مضاف ہے جو کہ محذوف ہے' لہٰذا اس بناء پر یہاں وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ سے مراد امت کے گناہ ہیں۔ امام نسفی' امام قرطبی اور علامہ شوکانی نے یہی معنیٰ بیان کیا ہے۔ حوالہ جات ملاحظہ ہوں:

(۱) وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ اَیْ لِذَنْبِ اُمَّتِكَ یعنی اپنی اُمّت کے گناہ (نسفی' مدارک التنزیل وحقائق التاویل ۴:۳۵۹)

(۲) وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ اَیْ لِذَنْبِ اُمَّتِكَ حَذَفَ الْمُضَافَ وَاُقِيْمَ الْمُضَافُ اِلَيْهِ مَقَامَهٗ' "وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد امت کے گناہ ہیں۔ یہاں مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اُس کا قائم مقام کردیا گیا۔'' (الجامع لاحکام القرآن لقرطبی' ۱۵:۳۲۴) بحوالہ ترجمہ قرآن از ڈاکٹر طاہر القادری)

لیکن اہلِ لغت لفظ ''ذَنب'' کو ''الزام'' کے معنیٰ میں بھی استعمال کرتے ہیں اور الزام میں یہ ضروری نہیں کہ وہ فعل اُس شخص سے صادر بھی ہوا ہو بلکہ بسا اوقات بلا وجہ اِس فعل کی نسبت اُس شخص کی طرف کر دی جاتی ہے۔''

''قرآنِ کریم میں بھی ''ذَنب'' کا لفظ ''الزام'' کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ ایک دن موسیٰ علیہ السلام نے ایک اسرائیلی اور ایک قبطی کو باہم لڑتے دیکھا۔ قبطی' اسرائیلی کو زدوکوب کر رہا تھا۔ اسرائیلی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا تو اُنہیں مدد کے لئے پکارا۔ آپ نے پہلے قبطی کو منع کیا کہ غریب اسرائیلی پر ظلم وزیادتی نہ کرے۔ جب وہ باز نہ آیا تو آپ نے اُسے ایک مُکّا دے مارا جو اُس کے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔ اپنے زیرِدست ساتھی کی مدد کرنا' اُس کے بچاؤ اور اپنے دفاع کے لئے حملہ آور کو مُکّا مارنا نہ شرعاً کوئی جرم ہے' نہ عرف میں یہ فعلِ قبیح ہے لیکن فرعون چونکہ آپ کا دشمن تھا اور انہیں حکومت کا باغی سمجھتا تھا' اُس نے آپ پر قتل کا الزام رکھا تھا اور اگر اُس کا بس چلتا تو وہ آپ کو وہی سزا دیتا جو قتلِ عمد کی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ فرعون کے پاس جاؤ اور اُسے دعوتِ حق دو تو آپ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی :

وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَّقْتُلُوْنِ ۝ (الشُّعراء : ۱۴)

''اُنہوں نے مجھ پر الزامِ قتل لگا رکھا ہے' پس مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔'' (۲۶:۱۴)

''اِس آیت میں ''ذَنب'' سے مراد گناہ نہیں بلکہ الزام ہے کیونکہ آپ نے اپنے اور اپنے اُمّتی کے بچاؤ کے لئے یہ اِقدام کیا تھا۔ آپ کا ارادہ اُسے قتل کرنے کا ہرگز نہ تھا اور نہ عام طور پر مُکّا لگنے سے موت واقع ہوتی ہے۔''

''اِن آیات کے سیاق وسباق کو مدِّ نظر رکھا جائے تو یہی معنیٰ (الزام) یہاں موزوں اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔ غَفَرَ کا معنیٰ چھپا دینا' دُور کر دینا۔ مَا تَقَدَّمَ سے مراد ہجرت سے پہلے اور مَا تَأَخَّرَ سے مراد ہجرت کے بعد۔ یعنی اے حبیبِ مکرّم! جو الزامات کفار آپ پر ہجرت سے پہلے عائد کیا کرتے تھے اور جو الزامات ہجرت کے بعد اب تک وہ آپ پر لگاتے رہے ہیں' اِس فتحِ مبین سے وہ سارے کے سارے نیست ونابود ہو جائیں گے اور اُن کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہے گا۔''

''پہلے ہم قرآنِ حکیم اور کتبِ حدیث سے اِن الزامات کی چھان بین کرتے ہیں اور اس کے بعد یہ وضاحت کریں گے کہ وہ الزامات اِس فتحِ مبین سے کس طرح دُور ہو گئے۔''

''ہجرت سے پہلے جو الزامات کفار کی طرف سے حضور سرورِ عالمیان ﷺ پر عائد کئے جاتے تھے' وہ یہ ہیں: یہ کاہن ہے' یہ شاعر ہے' یہ مجنون ہے' یہ ساحر ہے' یہ اوروں سے سن سن کر افسانے بنا لیتا ہے' اُسے کوئی اور پڑھاتا ہے' وغیرہ وغیرہ۔''

''ہجرت کے بعد کے الزامات کی فہرست کچھ یوں ہے :

''وہ کہتے کہ یہ شخص قوم میں اختلاف' انتشار پیدا کرنے والا ہے' اُس نے جنگ کی آگ بھڑکا کر مکہ کو اُجاڑ ڈالا ہے' بھائی کو بھائی سے' اولاد کو اپنے ماں باپ سے جدا کرنے والا ہے۔ اُس نے ہمارے محفوظ تجارتی راستوں کو خطرناک بنا دیا ہے اور ہمارے قومی انتظامات کو درہم برہم کر دیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔'' (''ضیاء القرآن'' ۔۔ پیر کرم شاہ الازہری' جلد چہارم' صفحات ۵۳۲' ۵۳۳)

(۲) علامہ قرطبی نے سورہ محمّد کی آیت ۱۹ کے الفاظ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ کے دو معنی ذکر کئے ہیں: (۱) اِسْتَغْفِرِاللّٰہَ اَنْ یَّقَعَ مِنكَ ذَنْب'' یعنی آپ اس بات سے اللہ کی مغفرت طلب کریں کہ آپ سے کوئی گناہ سرزد ہو۔ چنانچہ اوپر ترجمہ اِسی کے مطابق کیا گیا ہے۔ (۲) اِسْتَغْفِرْ لِیَعْصِمَكَ مِنَ الذُّنُوبِ یعنی استغفار کریں تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو گناہوں سے بچائے رکھے۔''

(۳) ''علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے درجات میں ہر لحظہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اوپر والے درجے پر پہنچ کر جب نیچے والے درجے پر نگاہ پڑتی تو موجودہ رفعت کے مقابلہ میں وہ قصور محسوس ہوتا۔ اس لئے آپ ﷺ کثرت سے استغفار کیا کرتے۔'' (روح المعانی)

(۴) ''عارف باللہ حضرت مولانا ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں کہ اِس حکم میں دو حکمتیں ہیں:

(i) ''اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اُس کے احکام کی بجا آوری میں خواہ کتنی ہی کوشش کی جائے' انسان پر لازم ہے کہ اپنے قصور کا اعتراف کرتا رہے اور یہ سمجھے کہ جیسا مجھے کرنا چاہئے تھا مجھ سے نہیں ہو سکا۔ منعمِ حقیقی نے جو بے پایاں احسانات مجھ پر فرمائے ہیں' میں اُن کا شکر ادا نہیں کر سکا۔ یہ تصوّر انسان کا کمال ہے' نقص نہیں۔''

(ii) ''دوسری حکمت یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس لئے کثرت سے استغفار فرمایا کرتے تا کہ اُمت آپ ﷺ کی اِس سنت پر عمل پیرا رہے اور کوئی بھی اُمتی اِستغفار اور توبہ سے غفلت نہ برتے۔'' (مظہری)

(۵) ''امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اِس آیت کے ضمن میں لکھا ہے کہ اِس آیت کی دو توجیہیں کی گئی ہیں: ایک توجیہ تو یہ ہے کہ خطاب اگرچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہے لیکن مراد اُمت ہے۔ یہ توجیہ درست نہیں کیونکہ مؤمنین کے لئے استغفار کا علیحدہ حکم دیا گیا ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ یہاں ''ذَنْب'' سے مراد گناہ یا نافرمانی نہیں بلکہ ترکِ افضل ہے۔ امام لکھتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ والا صفات اس سے منزہ ہے کہ وہ افضل کو چھوڑ کر غیر افضل کریں۔ اس لئے امام رازی نے اپنی توجیہ پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں: اِنَّ الْمُرَادَ

تَوْفِيْقُ الْعَمَلِ الْحَسَنِ وَاجْتِنَابُ الْعَمَلِ الشَّنِيْءِ یعنی اچھے کام کی توفیق اور بُرے کاموں سے پرہیز۔ کیونکہ استغفار کا معنٰی طلبِ غفران ہے اور غفران کا معنٰی کسی قبیح چیز کا ڈھانپ دینا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی قبیح چیز کے ارتکاب ہی سے محفوظ رکھے جس طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان ہے' یا گناہ کے ارتکاب کے بعد اُسے ڈھانپ دے جس طرح کہ مؤمنین اور مؤمنات کا حال ہے۔'' (''ضیاء القرآن'' ج ۴' ص ۵۱۵)

''رب تعالیٰ نے اپنے محبوبِ مکرّم ﷺ کو فتحِ مبین سے بہرہ ور کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے پے در پے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اے محبوب! ہم نے آپ پر اپنی نعمتوں کی انتہا کر دی' دین کو مکمل کر دیا' اسلام کی عظمت کا ڈنکا آفاقِ عالم میں بج رہا ہے اور اُس کے غلبہ کو دشمن نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ گویا کہ یہ ''تکمیلِ نعمت'' دین کی سربلندی اور دُور دراز ممالک میں اُس کے پھیل جانے سے عبارت ہے۔ اس کے علاوہ جو دینی اور دُنیوی نعمتیں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب علیہ السلام پر نچھاور فرمائی ہیں' وہ سب اس میں داخل ہیں۔''

''فرائضِ رسالت کی انجام دہی اور احکامِ شریعت کی تنفیذ کوئی معمولی کام نہیں۔ اس میں سرِ مُو کوتاہی بھی ناقابلِ برداشت ہے اور سنگین نتائج کا باعث بن جاتی ہے۔ رب تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اے میرے حبیب! ہم نے آپ کو ان کٹھن' دشوار اور زہرہ گداز ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے خود راہِ راست تک راہ نمائی فرما دی ہے اور اب کوئی مشکل راہ میں حائل نہیں ہو سکتی اور کوئی اِشکال باعثِ اضطراب نہیں بن سکتا۔''

''اِن انعاماتِ خصوصی کے آخر میں فرمایا: وَيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا یعنی اللہ تعالیٰ آپ کی ایسی نصرت فرمائے گا کہ آپ ہمیشہ غالب رہیں گے اور کسی قسم کی کمزوری رُوپذیر نہ ہوگی۔''

''یہاں ایک نکتہ غور طلب ہے کہ اِن آیات میں مذکور تمام افعال کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے لیکن لِيَغْفِرَ اور وَيَنْصُرَكَ کے بعد اللہ کے اسم کو ظاہراً ذکر کیا۔ اس کی حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ مغفرت کا تعلق آخرت کے ساتھ ہے اور نصرت و غلبہ کا تعلق دنیا کے ساتھ ہے۔ گویا فرمادیا: اے محبوب! تیری دنیا اور تیری آخرت کے تمام امور ہمارے سپرد ہیں۔ نہ اس دنیا میں آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت ہے اور نہ عقبیٰ کے بارے میں کسی اندیشہ کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے دُنیوی اور اُخروی تمام امور کا ذمہ دار ہے۔''

(89) اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًاO لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًاO (الفتح: ۸' ۹)

''بے شک ہم نے آپ کو (روزِ قیامت گواہی دینے کے لئے اعمال و احوالِ امت کا) مشاہدہ فرمانے والا اور خوشخبری سنانے والا اور ڈر سنانے والا بنا کر بھیجا ہے تاکہ (اے لوگو!) تم اللہ

اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اُن (کے دین) کی مدد کرو اور اُن کی بے حد تعظیم و تکریم کرو اور (ساتھ ہی) اللہ کی صبح و شام تسبیح کرو۔'' (۸، ۹ : ۴۸)

سورۃ الاعراف کی ذیل کی آیت ۱۵۷ کے پیشِ نظر وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ میں ہٗ کی ضمیر نبی علیہ السلام کی طرف راجع ہے' اللہ کی طرف نہیں:

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (الاعراف : ۱۵۷)

''جو لوگ اِس رسول (ﷺ) کی پیروی کرتے ہیں جو اُمّی (لقب) نبی ہیں جن (کے اوصاف و کمالات) کو وہ لوگ اپنے پاس تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں' جو اُنہیں اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور اُن کے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال کرتے ہیں اور اُن پر پلید چیزوں کو حرام کرتے ہیں اور اُن سے اُن کے بارِ گران اور طوق (قیود) جو اُن پر (نافرمانیوں کے باعث مسلّط) تھے' ساقط فرماتے (اور اُنہیں نعمتِ آزادی سے بہرہ یاب کرتے) ہیں' پس جو لوگ اس (رسول) پر ایمان لائیں گے اور اُن کی تعظیم و توقیر کریں گے اور اُن (کے دین) کی مدد و نصرت کریں گے اور اس نور (قرآن) کی پیروی کریں گے جو اُن کے ساتھ اتارا گیا ہے' وہی لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں۔'' (۱۵۷ : ۷)

سورۃ الفتح کی محولہ بالا آیات ۸، ۹ میں تین باتوں کی حسین و جمیل ترتیب ملاحظہ ہو۔ سب سے پہلے ایمان کا ذکر فرمایا اور سب سے آخر میں اپنی عبادت کا اور درمیان میں اپنے محبوب ﷺ کی تعظیم و توقیر کا۔ اس لئے کہ بغیر ایمان' تعظیم کسی کام کی نہیں۔ بہت سے مستشرقین اور نصاریٰ و یہود و ہنود نے نبی آخر الزماں ﷺ کی تعظیم و تکریم کی اور آپ کی ذاتِ ستودہ صفات سے اعتراضات کا رد کیا لیکن یہ سب کچھ بیکار گیا کیونکہ وہ ایمان کی دولت سے محروم تھے۔ اگر آپ ﷺ کی تعظیم و توقیر دل میں ہوتی تو ضرور ایمان لاتے۔ معلوم ہوا کہ اگر دل میں سرورِ ہر عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سچی عظمت نہ ہو' تو قائم اللیل اور صائم النہار ہونا حتیٰ کہ بیت اللہ شریف کے صحن میں مرنا سب منہ پر مار دیا جائے گا۔

بہ نظرِ غائر اگر دیکھا جائے تو قرآنِ حکیم کی بسم اللہ کی ب سے لے کر وَالنَّاس کی س تک میں حُبِّ رسول ﷺ کی خوشبو رچی بسی نظر آتی ہے اور اُس کی ہر ہر آیت عظمتِ رسول کی ترجمان ہے۔ ہاں شرط یہ ہے کہ اس متاعِ بے بہا کو پانے کے لئے صدیق کی آنکھ اور بلالِ حبشی کا دل لے کر آنا ہوتا ہے (رضی اللہ عنہما)۔

(90) سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ

بَارَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ آیٰتِنَا اِنَّہٗ ھُوَالسَّمِیْعُ الْبَصِیْرُO (بنی اسرائیل : ۱)
"وہ ذات (ہر نقص اور کمزوری سے) پاک ہے جو رات کے تھوڑے سے حصّہ میں اپنے (محبوب) بندے کو مسجدِ حرام سے (اس) مسجد اقصیٰ تک لے گئی جس کے گرد و نواح کو ہم نے بابرکت بنا دیا ہے تا کہ ہم اس (بندۂ کامل) کو اپنی نشانیاں دکھائیں' بیشک وہی خوب سننے والا' خوب دیکھنے والا ہے۔" (۱ : ۱۷)

سورہ بنی اسرائیل کی اِس آیت میں نبی اکرم ﷺ کے واقعۂ معراج کے ضمن میں آپ کے مکّہ مکرّمہ سے مسجدِ اقصیٰ تک کے زمینی سفر کا ذکر ہے جبکہ مسجدِ اقصیٰ سے آگے سدرۃ المنتہیٰ اور پھر سدرۃ المنتہیٰ سے عالمِ بالا اور لامکاں تک کے سفر کا ذکر سورۃ النّجم کی ابتدائی آیات (۶ تا ۱۸) میں ہے۔☆

اس آیتِ اوّل کا شانِ نزول یہ ہے کہ نبوت کے دسویں سال جب آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دو انتہائی غم گسار اور ہمدرد ہستیاں یعنی جنابِ ابو طالب اور سیّدہ خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کو یکے بعد دیگرے داغِ مفارقت دے گئیں اور کفارِ مکّہ کو اُن کی انسانیت سوز کارستانیوں سے روکنے والا اور اُن کی بہیمانہ روِش پر ملامت کرنے والا کوئی بھی نہ رہا جس کے باعث اُن کی ایذا رسانیاں ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ گئیں۔ آپ ﷺ اہلِ مکّہ سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے کہ شاید وہاں کے لوگ دعوتِ توحید کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں لیکن وہاں جو ظالمانہ اور بہیمانہ برتاؤ کیا گیا' اُس نے سابقہ زخموں پر نمک پاشی کا کام کیا۔ اِن حالات میں جب بظاہر ہر طرف مایوسی کا اندھیرا پھیل چکا تھا' ظاہری سہارے ٹوٹ چکے تھے اور ہر طرف ظلم و بربریت کے گمبھیر سائے دراز سے دراز تر ہوتے چلے جا رہے تھے تو رحمتِ کبریاء نے اپنی عظمت و کبریائی کی آیاتِ بیّنات کا مشاہدہ کرانے کے لئے اپنے محبوب کو عالمِ بالا کی سیر کے لئے بلایا تا کہ آپ کو اپنے ربِّ کریم کی تائید و نصرت پر حق الیقین ہو جائے اور حالات کی ظاہری ناسازگاری خاطرِ عاطر کو کسی طرح پریشان نہ کر سکے۔ غور کیا جائے تو سفرِ اسریٰ کے لئے اس سے زیادہ موزوں ترین وقت کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

اِس سفرِ مقدّس کی تفصیلات کا اجمالی ذکر از روئے احادیثِ صحیحہ یہاں کیا جاتا ہے۔ حضور علیہ السلام ایک رات خانہ کعبہ کے قریب حطیم میں اور بعض روایات کے مطابق اپنی پھوپھی اُمِّ ہانی کے ہاں آرام فرما تھے کہ جبریلِ امین حاضرِ خدمت ہوئے' خواب سے بیدار کیا اور ارادۂ خداوندی سے مطلع کیا۔ آپ اُٹھے' چاہِ زمزم کے قریب لائے گئے' سینہ مبارک چاک کیا گیا' قلبِ اطہر میں ایمان و حکمت سے بھرا ہوا طشت اُنڈیل دیا گیا اور پھر سینہ مبارک درست کر دیا گیا۔ بیت الحرام سے باہر تشریف لائے تو سواری کے لئے بُراق نامی ایک تیز رفتار جانور موجود تھا جس کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ تاحدِّ نگاہ اُس کا ایک قدم جاتا تھا۔ آپ اُس پر سوار ہو کر مسجدِ اقصیٰ (بیت المقدس) آئے جہاں جملہ انبیاء علیہم السلام آپ کے لئے چشم براہ تھے۔ حضور علیہ السلام کی اقتداء میں سب

☆ سیرت ابنِ ہشام کے مطابق معراجِ نبوی دسویں سالِ نبوّت میں ہوا۔ امام زُہری نے لکھا کہ ہجرت سے ۱۸ ماہ قبل ہوا۔

نے نماز ادا کی اور اس طرح لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ کا جو عہدِ روزِ ازل کو انبیاء علیہم السلام سے لیا گیا تھا کہ تم میرے محبوب پر ضرور ایمان لانا' کی تکمیل ہوئی۔ بعد ازاں موکبِ ہمایوں بلندیوں کی طرف پر کشا ہوا۔ مختلف آسمانوں پر مختلف انبیاء علیہم السلام سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ساتویں آسمان پر اپنے جدِّ اعلیٰ' ابوالانبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی جنہوں نے مَرحَبا بالنبیِّ الصَّالح والابن الصّالح کے محبت بھرے کلمات سے آپ کا استقبال کیا۔ آپ آگے بڑھے اور سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے جو جبریلِ امین کا مسکن ہے اور انوارِ ربانی کی تجلی گاہ ہے۔ جبریل نے عرض کی کہ حضور! میری یہاں انتہا اور آپ کی یہاں سے ابتدا ہے۔ عقابِ ہمت یہاں بھی آشیاں بند نہیں ہوا۔ آگے بڑھے' کہاں تک گئے' اُسے ما وشما کیا سمجھیں۔ قرآنِ حکیم نے مقامِ قرب کا ذکر اس طرح کیا ہے: ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی (اَلنَّجم: ۸' ۹) ''یعنی پھر وہ (ربّ العزت اپنے حبیب محمد ﷺ سے) قریب ہوا' پھر اور زیادہ قریب ہو گیا ☆۔ پھر (جلوۂ حق اور حبیبِ مکرم ﷺ میں صرف دو کمانوں کی مقدار کا فاصلہ رہ گیا یا (انتہائے قرب میں) اس سے بھی کم (ہو گیا)۔ وہاں کیا ہوا' یہ بھی میری اور آپ کی عقل کی رسائی سے بالاتر ہے۔ قرآن نے بتایا ہے: فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''پھر شاہدِ مستورِ ازل نے چہرہ سے پردہ اٹھایا اور خلوت گاہِ راز میں ناز و نیاز کے وہ پیغام عطا ہوئے جن کی لطافت و نزاکت بارِ الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔'' (سیرت النبی' جلد سوم بحوالہ ضیاء القرآن)

اِسی مقامِ قرب میں دیگر انعامات کے ساتھ ساتھ پچاس نمازیں ادا کرنے کا حکم ملا۔ جنابِ موسیٰ علیہ السلام کی عرضداشت پر آپ ﷺ نے کئی مرتبہ بارگاہِ ربّ العزت میں تخفیف کے لئے التجا کی چنانچہ نمازوں کی تعداد پچاس سے کم کر کے پانچ کر دی گئی لیکن ثواب پچاس ہی کا رہا۔ فرازِ عرش سے محبوبِ کبریاء مراجعت فرمائے خاکدانِ گیتی ہوئے۔ ابھی یہاں رات کا سماں تھا' ہر سُو رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی' سپیدۂ سحر کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ #

''یہ تھا واقعۂ معراج کا انتہائی مختصر ذکر۔ اس طویل سفر میں پیش آنے والا ہر واقعہ واقعی عجیب و غریب ہے۔ اسی لئے وہ دل جو نورِ ایمان سے خالی تھے' اُنہوں نے اسے اسلام اور داعیٔ اسلام کے خلاف سب سے بڑا اعتراض قرار دیا۔ کئی ضعیف الایمان لوگوں کے پاؤں ڈگمگا گئے۔ لیکن جن کے دلوں میں یقین کا چراغ ضَوفشاں

☆ یہ معنی امام بخاری نے حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے الجامع الصحیح میں روایت کیا ہے۔ مزید حضرت عبداللہ ابن عباس' امام حسن بصری' امام جعفر الصادق' محمد بن کعب القرظی التابعی' ضحاک اور دیگر ائمۂ تفسیر کا قول بھی یہی ہے۔

حضرت خواجہ نظام الاولیاء دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''فوائد الفوائد'' میں حضور علیہ السلام کے اس مقدس مرحلہ وار سفر کے ضمن میں تین اصطلاحات استعمال فرمائی ہیں: (۱) اسراء: مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک کا سفر۔ (۲) معراج: بیت المقدس سے مرحلہ وار ساتوں آسمانوں اور سدرۃ المنتہیٰ کا سفر۔ (۳) اعراج: سدرۃ المنتہیٰ سے مقامِ قابَ قوسَین تک عروج۔

تھا' اُنہیں قطعاً کوئی پریشانی اور تذبذب نہیں ہوا اور نہ دشمنانِ اسلام کی ہرزہ سرائی اور غوغا آرائی سے وہ متاثر ہوئے بلکہ جب حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ سے اس واقعہ کا ذکر ابوجہل نے کیا تو آپ نے بلا جھجک اُسے یہ جواب دیا کہ اگر میرے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسا فرمایا ہے تو یقیناً سچ ہے اور میں سب سے پہلے اس پر آمنّا و صدّقنا کہتا ہوں۔ اہلِ ایمان کے نزدیک کسی واقعہ کی صحت و عدمِ صحت کا انحصار اس پر نہیں تھا کہ اُن کی عقل اس بارے میں کیا رائے رکھتی ہے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ بے پایاں کے سامنے کسی چیز کو ناممکن خیال نہیں کرتے تھے۔ اُن کا یہ یقین تھا کہ وہ قادرِ مطلق جو چاہے' جس طرح چاہے کر سکتا ہے۔ ہمارے وضع کئے ہوئے قواعد و ضوابط اُس کی قدرت کی بیکرانیوں کو محیط نہیں ہو سکتے اور جو اِس واقعہ کی خبر دینے والا ہے وہ اِتنا سچا ہے کہ اُس کی صداقت کے متعلق شک و شبہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ جب محبوب علیہ السلام نے شبِ اسریٰ کی صبح کو حرمِ کعبہ میں کفار کے بھرے مجمع میں اِس عنایتِ ربّانی کا ذکر فرمایا تو لوگ دو حصّوں میں بٹ گئے۔ بعض نے صاف انکار کر دیا اور بعض نے بلا چون و چرا تسلیم کر لیا۔''

''لیکن آج صورتِ حال قدرے مختلف ہے۔ ایک گروہ تو وہی منکرین کا ہے۔ دوسرا گروہ وہی ماننے والوں کا ہے لیکن اب تیسرا گروہ بھی نمودار ہو گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اذہان اس منکر گروہ کی علمی اور مادّی ترقی کے حلقہ بگوش ہیں اور ادھر اسلام سے بھی اُن کا رشتہ ہے۔ نہ وہ اسلام سے رشتہ توڑنے پر رضامند ہیں اور نہ اپنے ذہنی مربّیوں کے مزعومات و نظریات ردّ کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ ناچار وہ اس واقعہ کی ایسی ایسی تاویلیں کرتے ہیں کہ واقعہ کا نام تو رہ جاتا ہے لیکن اس کے سارے حسن و جمال پر پانی پھر جاتا ہے اور اس کی معنویت کالعدم ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ اپنے اس طریقہ کار پر بڑے مطمئن نظر آتے ہیں اور دل میں یہ سمجھتے ہیں کہ اُنہوں نے اسلام پر وارد ہونے والا ایک بہت بڑا اعتراض دُور کر دیا۔ اس لئے ہمیں مختصراً تینوں گروہوں کو ایسے دلائل فراہم کرنا ہیں کہ اگر وہ تعصّب کو بالائے طاق رکھ کر اُن سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو اٹھا سکیں۔''

''جو لوگ اللہ تعالیٰ کی قدرت و عظمت اور اُس کی شانِ کبریائی پر ایمان رکھتے ہیں اور فخرِ موجودات ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا سچا رسول مانتے ہیں' اُن کے لئے تو واقعۂ معراج کی صداقت پر اِس آیتِ نوید کے بعد مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ اسی موقع پر اس آیتِ جلیلہ کی مختصر تشریح کی جاتی ہے :

''آیت کا آغاز سُبحان کے کلمہ سے کیا گیا ☆ جس کا معنیٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے عیوب و نقائص سے

☆ جیسا کہ محبوب علیہ السلام ''غم کے اِس سال (عام الحزن)'' میں بڑے ہی دل گرفتہ اور غمگین تھے۔ پوری کائنات میں معراج جیسے عالی مرتبت واقعہ پر کوئی بھی تو سبحان اللہ کہنے والا نہ تھا۔ رب نے فرمایا: محبوب! کیا ہوا اگر تیری اس عظیم نعمت پر پوری کائنات میں سبحان اللہ کہنے والا کوئی نہیں تو سبحان اللہ ہم کہے دیتے ہیں۔

مبرّا اور منزّہ ہے۔ سبحان کے کلمہ میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب و نقص، کمزوری اور بے بسی سے پاک ہے۔ اس کے لئے دلیل کی ضرورت تھی کیونکہ کوئی دعویٰ دلیل کے بغیر قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ بطور دلیل ارشاد فرمایا: اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلاً کہ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے اپنے محبوب بندے کو رات کے تھوڑے سے حصّہ میں اتنا طویل سفر طے کرایا (لَیْلاً میں تنوین یعنی دوسرے لام پر ڈبل زبر تقلیل یعنی قلت کی ہے) اور اپنی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں اور آیات بیّنات دکھائیں، جو ذات اتنے طویل سفر کو اتنے قلیل وقت میں طے کرا سکتی ہے، واقعی اُس کی قدرت بے پایاں اور اُس کی عظمت بیکراں ہے اور اُس کی کبریائی کے دامن پر کسی قسم کی کمزوری اور بے بسی کا کوئی داغ نہیں، تو جس واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی سبحانیت کی دلیل کے طور پر ذکر فرمایا وہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہو سکتا بلکہ کوئی بڑا!! ہم عظیم الشان اور محیّر العقل واقعہ ہوگا۔ اس لئے معراج کا انکار کرنا گویا اللہ تعالیٰ کی قدرت اور سبوحیّت کی ایک قرآنی دلیل کو منہدم کرنا ہے۔

یہ سفرِ معراج جسم اور روحِ پاک دونوں کے ساتھ ہونے کے بھی متعدد دلائل ہیں کیونکہ (۱) خواب کے بیان پر تو کوئی جھگڑا نہیں ہوا کرتا۔ اگر کوئی ملتان میں رہتے ہوئے یہ کہے کہ گزشتہ شب میں بحالتِ خواب قطب شمالی یا قطبِ جنوبی کی سیر کر آیا ہوں تو کوئی سر پھرا بھی اُس سے جھگڑنے کو تیار نہیں ہوگا۔ معلوم ہوا کہ کفارِ مکّہ نے اس واقعہ پر جو شور و غوغا کیا، وہ سفرِ خواب پر ہرگز نہ تھا بلکہ بحالتِ بیداری پر تھا کہ آپ روح اور جسم دونوں کے ساتھ وہاں کیسے تشریف لے گئے! (۲) عَبْد کے لفظ نے بھی یہ عقدہ حل کیا کہ یہ سفر جسم اور روح دونوں کے ساتھ ہوا کیونکہ عَبد نام ہے روح اور جسم دونوں کے ایک ساتھ اکٹھا ہونے کا، نہ ہم صرف روح کو عبد کہہ سکتے ہیں اور نہ صرف جسم کو جو روح سے خالی ہو عبد کہہ سکتے ہیں۔ اس کی ایک مثال جنازہ اور ظعینہ کے الفاظ کی ہے کہ جنازہ نام ہے اُس میّت کا جو تابوت میں ہو۔ نہ تو محض میّت کو اور نہ ہی میت سے خالی تابوت کو ہم جنازہ کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح ظعینہ ہودج (کجاوہ) نشین عورت کا نام ہے۔ کجاوے سے باہر عورت کو یا عورت سے خالی کجاوے کو ہم

نوٹ: قاعدہ کلیہ ہے کہ ہر فعل اپنے فاعل کی قوّت و استعداد کے لحاظ سے اپنی نوعیت میں مختلف ہوتا ہے۔ قرآن حکیم اعلان کر رہا ہے کہ عقل کے حصار میں پابند رہ کر ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے والو! یہ کام کسی بشری طاقت سے نہیں ہوا جو تمہاری عقل اُسے تسلیم نہ کرے۔ نبی خود نہیں گئے بلکہ لے جائے گئے۔ لے جانے والا کون ہے؟ وہی جو ہر قسم کی چھوٹی بڑی کمزوری سے پاک اور سبحان ہے۔ منکرین کے انکار کی بڑی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے اس قدر قلیل وقت میں اس سفرِ مقدّس کی طاقت کو انسان کی طرف منسوب کیا اور رب کی بے پناہ قدرت کی طرف اُن کی نگاہ نہیں گئی۔ علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے جو ارشادِ نبوی نقل کیا ہے، وہ بھی اسی معنی کی تائید کرتا ہے۔

یہ بھی حقیقتِ ثابتہ ہے کہ قوّت کے اضافہ پذیر ہونے کی نسبت سے فاصلے اور مسافتیں سمٹ کر کم رہ جاتے ہیں۔ موٹر بائیک کی قوّت بائیسکل کی قوّت سے زیادہ ہے لہٰذا موٹر بائیک سے سفر کرنے سے فاصلہ بائیسکل کی نسبت کم رہ جائے گا۔ اسی طرح ریل گاڑی اور طیّارے کی مثال ہے۔ کون ہے جو عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر کی قوّت کا اندازہ لگا سکے۔ لہٰذا جب لے جانے والا وہ ہوا تو خود اندازہ لگا لیجئے کہ کتنے کم وقت میں یہ سفر طے ہوا ہوگا بلکہ زمانے کی قید لگانا بذاتِ خود بوالعجبی ہوگی۔

ظـعینـــہ نہیں کہہ سکتے۔ یہی حال لفظِ عبد کا ہے جو جسم اور روح دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ (۳) علامہ ابن العربی نے ''احکام القرآن'' میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر معراج عالمِ خواب کا واقعہ ہوتا تو کوئی اس سے فتنہ (آزمائش) میں مبتلا نہ ہوتا اور کوئی اس کا انکار نہ کرتا۔ نیز اگر یہ سفر بحالتِ خواب ہوتا تو آیت کے الفاظ یہ ہوتے: 'اَسریٰ بِرُوحِ عَبْدِہٖ نہ کہ اَسریٰ بِعَبْدِہٖ (شرح شفا از مُلّا علی قاری جلد اوّل' صفحہ ۴۰۶)

آگے چل کر فرماتے ہیں:

وَیَدُلُّ عَلٰی کَوْنِہٖ یَقْظَۃً لَّا مَنَامًا قَوْلُہٗ تعالیٰ: مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی اِذْ لَیْسَ لِلرُّوحِ بَصَرٌ'' بَلْ بَصِیرَۃٌ''وَلَوْ کَانَ الاسراءُ مَنَامًا لَمَا کَانَ فِیْہِ آیَۃٌ لَقَدْ رَآی مِنْ آیَاتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی وَلَا مُعْجِزَۃٌ'' وَ اِنْ کَانَ رُؤْیَا الْاَنْبِیَاءِ حَقًّا وَاِخْبَارُھُمْ عَنْھَا صِدْقًا وَلَما اسْتَبْعَدُوْہُ الْکُفَّارُ وَلَا کَذَّبُوْہُ فِیْہِ (اَیضًا)

''سفرِ معراج کے بحالتِ بیداری نہ کہ بحالتِ خواب ہونے کی ایک دلیل باری تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے کہ میرے محبوب کی آنکھ نہ کسی اور طرف مائل ہوئی اور نہ حد سے بڑھی (جس کو تکنا تھا اُسی پر جمی رہی) کیونکہ روح کے لئے بَصَر کا لفظ استعمال نہیں ہوتا بلکہ بصیرت کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور اگر یہ سفر بہ عالمِ خواب ہوتا تو یہ آیت نہ ہوتی کہ ''آپ ﷺ نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔'' اور نہ ہی یہ سفر معجزہ کہلاتا اگرچہ انبیاء علیہم السلام کے خواب حق ہوا کرتے ہیں اور اُن کے بارے میں معلومات سچ پر مبنی ہوتی ہیں۔ اگر بہ عالم خواب سفرِ معراج ہوتا تو کفار اُسے نہ تو خلافِ عقل سمجھتے اور نہ ہی اُس کو جھٹلاتے۔'' (شرح شفا از مُلّا علی قاری' جلد اوّل' صفحہ ۴۰۶)

آیت میں حضور علیہ السلام کا ذکر بِـعَبْـدِہٖ کے لفظ سے فرمایا گیا جس کی ایک حکمت تو یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بے مثل رفعتِ شان اور علوِّ مرتبت کو دیکھ کر اُمّت اُس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے جس میں عیسائی کمالاتِ عیسوی کو دیکھ کر مبتلا ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ مفسرین نے لکھا ہے کہ جب حضور ﷺ بارگاہِ صمدیت میں مقامِ قابَ قوسَین اَو اَدنیٰ پر فائز ہوئے تو رب تعالیٰ نے دریافت فرمایا: بِمَ اُشَرِّفُکَ یَا مُحَمَّدُ! (اے سراپا حمد وستائش! آج میں تمہیں کس لقب سے سرفراز کروں؟) تو حضور علیہ السلام نے جواباً عرض کی: بِنِسْبَتِیْ اِلَیْکَ بِالْعُبُوْدِیَۃِ (مجھے اپنا بندہ کہنے کی نسبت سے مشرف فرما دیجئے)۔ اس لئے رب تعالیٰ نے ذکرِ معراج کے وقت اسی لقب کو ذکر فرمایا جو اُس کے حبیب علیہ السلام نے اپنے لئے خود پسند فرمایا تھا۔

آیت کے اگلے کلمات میں اس سفر کی غرض وغایت بیان فرمائی کہ یہ سفر یوں نہیں کہ بھاگم بھاگ کرتے ہوئے حضور علیہ السلام گئے ہوں اور اُسی عجلت سے واپس آ گئے ہوں' نہ کچھ دیکھا اور نہ کچھ سنا۔ نہیں' بلکہ صحیفۂ کائنات کے ہر ہر صفحہ پر اور گلشنِ ہستی کی ہر ہر پتّی پر اللہ تعالیٰ کی قدرت' عظمت' علم اور حکمت کے جتنے کرشمے تھے' سب بے نقاب کر کے اپنے محبوبِ محتشم کو دکھا دئے۔

یہاں ایک اور نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ سورہ بنی اسرائیل کی اوّل آیت میں سفرِ معراج کی غرض و غایت بتلاتے ہوئے فرمایا کہ تاکہ ہم اپنے محبوب کو اپنی نشانیاں دکھا دیں لیکن سورۃ النّجم کی آیت ۱۸ میں ارشاد ہوا کہ میرے محبوب نے (شبِ معراج) اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔ فرق یہ ہے کہ یہاں عالمِ ارضی میں آپ بشریت کے جامے میں تھے اس لئے رب تعالٰی نے آپ کو اپنے جمال کے جلوے دکھائے اور جب بشریت کے مدارج طے کرتے ہوئے جب عالمِ ملکوت میں پہنچے تو رب نے فرمایا: محبوبؐ! ہم نے تمام حجابات اٹھا دیئے ہیں، آپ خود ہی ملاحظہ فرماتے جایئے۔

اب ہم اُن لوگوں کے اعتراضات کی طرف آتے ہیں جو معراجِ جسمانی اور دیگر معجزات کو عقلِ انسانی کے خلاف سمجھتے ہوئے اُن کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فطرت کے قوانین اٹل ہیں اور اُن میں ردّ و بدل ممکن نہیں ورنہ کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے اس لئے معجزات کا تسلیم کرنا عقل کے خلاف ہے اور اسی لئے معراج بھی معجزہ ہونے کے لحاظ سے عقلاً محال ہے۔ اگر ان معترضین کی معجزہ کی اس تعریف کو مان لیا جائے کہ معجزہ وہ ہے جو قانونِ فطرت کے خلاف ہو تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ قانونِ فطرت ہمارے اِدراک کی حدود سے باہر ہو۔ فطرت کے تمام قوانین اور قدرت کے تمام نوامیس کا ذہنِ انسانی نے ابھی کہاں احاطہ کیا ہے اور وہ کہاں کُلّی طور پر ابھی بے حجاب ہوئے ہیں؟ انسائیکلوپیڈیا آف بریٹینیکا کی پندرھویں جلد کے صفحہ ۵۸۶ پر مقالہ نگار معجزہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''یہ ایک خوش فہمی اور غیر معقول تصور ہے جس کے مطابق فطرت کا طریق کار اتنا دانشمندانہ اور بہترین ہے کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نا قابلِ یقین اور ناجائز ہے۔''

اِن منکرینِ معجزات سے ہمارا یہ سوال بھی اہم ہے کہ اگر یہ لوگ ذاتِ خداوندی کے وجود اور اُس کی بے پناہ طاقتوں اور قدرتوں کے منکر ہیں تو ان سے معجزات کی بحث کرنا ہی بے فائدہ ہے لیکن اگر یہ لوگ اُس کے وجود کو ماننے کے ساتھ ساتھ اس کی بیکراں قدرت اور بے پایاں اختیارات کو بھی تسلیم کرتے ہیں تو پھر قوانینِ فطرت کو غیر متبدل اور اٹل تسلیم کرنا چہ معنیٰ دارد؟ وہ بااختیار اور قادرِ مطلق ذات اپنی حکمت و قدرت کے پیشِ نظر جب چاہے، اپنے معمول کو بدل دے اور اس خلافِ معمول وقوع پر نظام کائنات میں ذرّہ بھر دگرگونی نہ ہو، یہ سب کچھ اُس کے اختیار میں ہے۔ اسی حقیقت کو انسائیکلوپیڈیا آف بریٹینیکا کے فاضل مقالہ نگار نے یوں بیان کیا:

''نوامیسِ قدرت اور قوانینِ فطرت کو معمولِ ربانی اور عادتِ الٰہی سمجھنا چاہئے اور معجزہ یہی ہے کہ رب تعالٰی نے کسی مصلحت اور حکمت کے پیشِ نظر خلافِ عادت ایسا کیا ہے جو قطعاً ناروا نہیں۔''

<u>ڈیوڈ ہیوم (David Hume) اور معجزات</u>: مغرب کا ممتاز فلسفی ڈیوڈ ہیوم، سرسید احمد خان کے زمرہ

سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس نے بڑی شدّ ومد سے معجزات کے اِمکان کی تردید کی ہے۔ اپنے نقطۂ نظر کو تقویت دینے اور اُسے ثابت کرنے کے لئے اُس نے منطق اور استدلال کا عجیب طریقہ اختیار کیا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ ہمارا تجربہ اور مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ کائنات کا نظام ایک خاص طرز اور غیر متبدّل' معیّن سطور پر چل رہا ہے اور وہ نظام ''علت ومعلول'' کے قانون سے ایک قدم بھی باہر نہیں جا سکتا جبکہ معجزات جو ''علّت ومعلول'' کے قانون کے خلاف ہیں' ہمارے تجربے اور مشاہدے کے بھی خلاف ہیں۔ اس لئے ڈیوڈ ہیوم کے نزدیک معجزے کے جواز کو تسلیم کرنا ممکن نہیں ہے بالخصوص جبکہ ہمارے تجربے اور مشاہدے کے مقابل کوئی مدلّل اور ٹھوس دلائل موجود نہ ہوں۔ اُس کے نزدیک معجزے کے مستند ہونے کے لئے کوئی باوزن دلائل موجود نہیں۔☆

انسائیکلو پیڈیا بری ٹینیکا کا مضمون نگار ڈیوڈ ہیوم کے مفروضے پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اِس ''مفروضہ اصول'' کی کہ معجزات انسانی مشاہدات اور تجربات کے خلاف ہوتے ہیں' کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اور پھر ''تجربات'' کا مطلب کیا ہے؟ اس بیان کو بھی کسی ٹھوس ثبوت کی ضرورت ہے کہ معجزہ تمام تجربات کے خلاف ہوتا ہے۔ پہلے تو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ آیا معترض نے تمام تجربات کا احاطہ کرلیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ تجربات سے مراد عام تجربات ہیں اور معجزہ عام تجربات کے خلاف ہوتا ہے تو پھر اس سے صرف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ معجزات عام تجربات کے خلاف ہوتے ہیں' تمام تجربات ومشاہدات کے مخالف ہونا تو لازم نہ آیا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ معجزہ کسی تجربہ کے مطابق ہو اور وہ تجربہ آپ کے فہم کی رسائی سے بھی بلند وبالا ہو۔ (جلد ۱۵' صفحہ ۵۸۶)

ایک مصری عالم' استاد احمد امین نے بھی ڈیوڈ ہیوم کے معجزات سے انکار کی منطق کا خوب جواب دیا ہے۔ وہ اپنی کتاب قصّة الفلسفة الحديث کی جلد اوّل کے صفحہ ۲۴۵ پر لکھتے ہیں کہ ڈیوڈ ہیوم کو اس حقیقت سے انکار نہیں کہ قبل ازیں جتنی بھی چیزیں معرضِ وجود میں آئیں وہ علّتِ حقیقیہ کے بغیر موجود تھیں اور معراجِ جسمانی جیسا معجزہ بغیر علّت کے وقوع پذیر ہوا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک کو تسلیم کرتے ہو اور دوسرے کے انکار میں تم اِتنا مبالغہ کرتے ہو کہ تمہیں اپنے فلسفہ کی بنیاد بھی سرے سے فراموش ہوگئی ہے۔

معجزات کے بارہ میں سرسیّد احمد خاں اپنے ایک مفصّل مقالہ میں لکھتے ہیں کہ معجزہ کا خلافِ قانون ہونا ضروری ہے کیونکہ قانونِ قدرت کے مطابق ہونے کی صورت میں اُس کا وقوع کسی غیرِ نبی سے بھی ہونا ممکن ہے۔ لیکن چونکہ قوانینِ قدرت اٹل ہیں اور اُن میں کسی قسم کی تبدیلی یا ردّ وبدل ممکن نہیں۔ قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ

☆ ''علمائے اسلام نے معجزہ کی یہ تعریف نہیں کی کہ وہ قوانینِ فطرت کے خلاف ہو بلکہ معجزہ وہ ہے جو خارقِ عادت ہو۔ نیز معجزات کو قوانینِ فطرت کے خلاف کہنے کا دعویٰ تو تب درست ہوسکتا ہے جب کہ پہلے تمام قوانینِ فطرت اور سننِ الٰہیہ کا احاطہ کرنے کے دعویٰ کو کوئی ثابت کرلے اور جب تک یہ ثابت نہ ہو اور جو یقیناً ثابت نہیں تو پھر معجزات کو سننِ الٰہیہ کے خلاف ٹھہرانا سراسر لغو ہے۔'' (ضیاء القرآن' جلد دوم' صفحہ ۶۳۲)

لَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰہِ تَبدِیلًا یعنی آپ اللہ کے دستور میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پائیں گے (سورۃ الفتح:۲۳)۔ اس لئے بقول اُن کے ثابت ہوا کہ معجزہ کا واقع ہونا ایک خیالِ خام ہے۔

سرسید کے اس من گھڑت مفروضہ کے جواب میں معجزہ کی اُس تعریف کو سامنے رکھنا ہوگا جو سابقہ صفحہ کے ذیلی نوٹ میں بیان ہوئی۔ نیز معجزات کو قوانینِ فطرت کے خلاف کہنے کا دعویٰ تب درست ہوتا جب پہلے تمام قوانینِ فطرت کا احاطہ کرنے کے دعویٰ کو کوئی ثابت کر دے اور جب تک یہ ثابت نہ ہو جو یقیناً ثابت نہیں تو پھر معجزات کو سنتِ الٰہیہ کے خلاف قرار دینا ایک دُور از کار اور بے فائدہ بات ہے۔ سرسیّد کے مقالہِ مذکور کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دشمنانِ اسلام کے اعتراضات سے بوکھلا گئے ہیں اور زہر میں بجھے ہوئے اُن کے طعن و تشنیع کے نیزوں سے وہ بہر حال اسلام اور داعیِ اسلام کو بچانا چاہتے ہیں خواہ اس کوشش میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کا روشن چہرہ ہی (معاذ اللہ) کیوں نہ بگڑ جائے۔ کاش کہ سرسیّد عظمتِ مصطفوی کے غیر متزلزل عقیدے کی پناہ میں آ کر ربِّ ذوالجلال والاکرام کے بے پایاں اختیار اور ناپیدا کنار قدرتِ مطلقہ کو مدِّ نظر رکھتے تو اپنے تاریخی اور علمی ورثے کو اَغیار کی نظروں میں مشکوک اور مشتبہ نہ بناتے۔ سرسیّد محترم کے اِس جذبہِ خلوص کا ہمیں اعتراف ہے لیکن ہم موصوف سے یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ سیّد صاحب! کیا آپ کی تاویلات کو دشمنانِ اسلام نے قبول کر کے آپ کے پیش کردہ ''ماڈرن اسلام'' پر اظہارِ عداوت چھوڑ دیا ہے۔ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو پھر اس محنت کا کیا حاصل اور نصِ قرآنی میں حسبِ منشا تغیر و تبدل کر کے آپ کو اور آپ کے معتقدین کو کیا ملا؟

معراجِ جسمانی کے منکرین سورہ بنی اسرائیل کی اِس آیت کا بھی سہارا لیتے ہیں:

وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِیٓ أَرَيْنٰكَ إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ

''اور ہم نے جو منظر آپ کو دکھایا تھا' اُسے ہم نے لوگوں کی آزمائش کا سبب بنا دیا۔'' (۶۰ : ۱۷)

اِس آیت میں اُنہوں نے لفظ اَلــرُّءْیَــا کا معنیٰ خواب لیا ہے اور اس طرح معراج روحانی ثابت کی ہے حالانکہ یہاں اَلــرُّءْیَــا خواب کے معنیٰ میں نہیں آیا بلکہ عالمِ بیداری میں دیکھنے کے معنیٰ میں آیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: اَلْـمُـرَادُ ھٰهُـنَـا رُؤْیَا عَیْن (ضیاء القرآن' جلد دوم' صفحہ ۶۲۷) یعنی یہاں مراد رُؤیت العین یعنی عالمِ بیداری میں انہی ظاہری آنکھوں کے ساتھ دیکھنا ہے۔

نیز اکثر مفسرین کی یہ رائے ہے کہ اِس آیت کا تعلق واقعہ معراج سے ہے ہی نہیں بلکہ کسی دوسرے خواب سے ہے اور اگر اِسی پر اصرار ہو کہ اس آیت میں معراج کا ہی ذکر ہے تو پھر حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی تصریح کے بعد کوئی التباس نہیں رہتا۔ علامہ ابن العربی اندلسی نے ''احکام القرآن'' میں سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول بھی نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اگر معراج عالمِ خواب کا واقعہ ہوتا تو کوئی اس سے فتنہ میں مبتلا نہ

ہوتا اور کوئی اس کا انکار نہ کرتا کیونکہ اگر کوئی شخص خواب میں اپنے آپ کو دیکھے کہ وہ آسمان کو چیرتا ہوا اوپر جا رہا ہے یہاں تک کہ وہ کرسی پر جا کر بیٹھ گیا اور اللہ تعالیٰ نے اُس سے گفتگو فرمائی تو ایسے خواب کو کبھی مستبعد اور خلافِ عقل قرار دے کر اُس کا انکار نہیں کیا جاتا۔'' (احکام القرآن لابن العربی)

''یہ لوگ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ واقعہ معراج بیان کرنے کے بعد حضور علیہ السلام نے فرمایا: ثُمَّ اسْتَيْقَظْتُ وَأَنَا فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَام یعنی ''پھر میں نیند سے بیدار ہوا تو اپنے آپ کو مسجدِ حرام میں پایا۔'' اِس روایت کے متعلق فنِّ حدیث کے ماہرین کی تصریح ملاحظہ ہو تو شبہ خود بخود دُور ہو جائے گا۔''

''علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ حضرت اَنس سے شُریک نے نقل کئے ہیں اور شُریک لَيْسَ بِالْحَافِظِ عِنْدَ أَهْلِ الْحَدِيْثِ (روح المعانی جلد ۱۵) یعنی ''اہلِ حدیث کے نزدیک شُریک حافظِ حدیث نہیں ہے۔''

''دوسری روایت ابن العربی کی ہے۔ وہ ''احکام القرآن'' میں فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ حضرت اَنس سے صرف شُریک نے نقل کئے ہیں۔ اُن کا حافظہ آخر میں کمزور ہو گیا تھا' اس لئے اُن کی روایت کی بجائے اُن روایات پر بھروسہ کیا جائے گا جو باقی تمام راویوں نے بیان کی ہیں۔''

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ''ان الفاظ کا شمار شریک کی غلطیوں میں ہوتا ہے۔ اس حدیث کے علاوہ سیّدہ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے اقوال سے بھی استشہاد کیا جاتا ہے کہ اِن حضرات کا بھی یہی خیال تھا کہ یہ خواب کا واقعہ ہے۔ لیکن محدّثین پہلے تو اس قول کی نسبت ان حضرات کی طرف کرنے کو ہی مشکوک سمجھتے ہیں اور اگر روایت ثابت ہو بھی جائے تو اُن کے قول پر جمہور صحابہ کے ارشادات کو ہی ترجیح دی جائے گی کیونکہ حضرت صدّیقہ رضی اللہ عنہا سے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نکاح ہجرت کے بعد ہوا جبکہ واقعہ معراج ہجرت سے پہلے یعنی دس سالِ نبوّت کا ہے۔ رہا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا قول تو وہ معراج کے موقع پر اسلام ہی نہیں لائے تھے۔ یہی بات علامہ ابن حیان نے ''بحر المحیط'' میں لکھی ہے۔'' (ضیاء القرآن)

جسمانی معراج کے منکرین اپنے دلائل میں یہ بھی کہتے ہیں کہ مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک جانا خواب میں ہوا کیونکہ اُن کے نزدیک اسراء کا معنیٰ خواب میں سیر کرانا ہوتا ہے حالانکہ لغوی لحاظ سے یہ دلیل غلط ہے' اس لئے کہ قرآنِ پاک میں یہ لفظ ہر جگہ بحالتِ بیداری رات کو چلنے کے معنیٰ میں آیا ہے۔ مثلاً:

(۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا: فَأَسْرِ بِعِبَادِي لَيْلًا (الدُّخان: ۲۳) ''تم میرے بندوں کو راتوں رات لے کر چلے جاؤ۔'' (۲۳ : ۴۴)

(۴) حضرت لوط علیہ السلام سے فرمایا گیا: فَاَسۡرِ بِاَهۡلِكَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّيۡلِ (الحجر:۶۵) " پس آپ اپنے اہلِ خانہ کو رات کے کسی حصّہ میں لے کر نکل جایئے۔" (۶۵ : ۱۵)۔ قاضی عیاض نے "الشفاء" میں فرمایا: لِاَنَّہٗ' لَا یُقَالُ فِی النَّوۡمِ اَسۡرٰی یعنی خواب کی حالت میں لفظ اَسۡرٰی نہیں بولا جاتا اور اس کا معنیٰ بہ حالتِ بیداری ہی نکلنا اور جانا ہے۔

اُمّ المؤمنین جنابہ سیّدہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کی پیش کردہ آیت: لَاتُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ وَهُوَ يُدۡرِكُ الۡاَبۡصَارَ (الانعام:۱۰۳) "آنکھیں اُس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ سب نگاہوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔" (۶:۱۰۳) کو نفیِ رؤیت کے ثبوت کے طور پر پیش کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ یہاں رؤیت کا لفظ نہیں بلکہ اِدراک کا لفظ آیا ہے کہ آنکھیں اُس کا احاطہ نہیں کر سکتیں' وہ آنکھوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور یہ اُمّتِ مسلمہ کا عقیدہ ہے کہ رب احاطہ کئے جانے سے پاک ہے۔ اگر (معاذ اللہ) رب کا احاطہ کیا جا سکتا ہوتا تو اس صورت میں احاطہ کرنے والی آنکھ محیط اور ربّ محاط ہو جاتا اور مُحاط ہونا شانِ الوہیت کے خلاف ہے اور ایسا عقیدہ رکھنا سراسر کفر ہے۔ سیّدہ صدّیقہ کے قرآن کی یہ آیت پیش کرنے کا مطلب یہی ہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنے رب کا احاطہ نہیں کیا۔ یہ مطلب نہیں کہ رب کو دیکھا نہیں اور ہمارا اِصرار بھی اسی بات میں ہے کہ رب سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات احاطہ کئے جانے سے ماوراء اور پاک ہے۔ المختصر یہ کہ حضور علیہ السلام نے اپنے رب کو جسم مبارک کی آنکھوں سے دیکھا کہ آپ کی نگاہ اپنے مقصود کی دید میں محو رہی۔ اِدھر اُدھر' دائیں' بائیں کسی چیز کی طرف مائل نہیں ہوئی۔

اگر امکانِ رؤیت باری تعالیٰ محال ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام ایک محال چیز کی فرمائش ہی کیوں کرتے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو ممکن' محال اور ممتنع کا علم ہوتا ہے اور ممتنع کے بارے میں سوال کرنا درست نہیں ہوتا۔ ہمارے موقف کی تائید سورۃ القیامۃ کی یہ آیات بھی کرتی ہیں: وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ "اُس دن بہت سے چہرے شگفتہ وتر وتازہ ہوں گے اور اپنے رب (کے حسن و جمال) کو تک رہے ہوں گے۔" (۲۲' ۷۵:۲۳) اور سورۃ المطفّفین کی یہ آیت بھی: كَلَّاۤ اِنَّهُمۡ عَنۡ رَّبِّهِمۡ يَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ ۝ "حق یہ ہے کہ اُس دن بیشک اُن (کفار) کو اپنے رب کے دیدار سے روک دیا جائے گا۔" (۸۳:۱۵) آیت کی دلالۃ النص سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ مؤمن رب کے دیدار سے بہرہ ور ہوں گے۔

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے جب دریافت کیا جاتا کہ آیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے رب کا دیدار کیا تو آپ جواب میں فرماتے: رَاٰهُ رَاٰهُ حَتّٰی یَنۡقَطِعَ نَفَسَہٗ' "ہاں ہاں' حضور علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا' ہاں ہاں حضور علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ یہ جملہ آپ اتنی بار دہراتے کہ آپ کی سانس ٹوٹ جاتی۔"

جس طرح امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو اپنے دیدار کی دولت

سرمدی سے سرفراز فرمایا مگر یہ دیدار ایسا تھا جیسے حبیب اپنے حبیب کا دیدار کرتا ہے۔ نہ وہ آنکھیں بند کر سکتا ہے اور نہ ٹکٹکی باندھ کر روئے دلدار کو دیکھ سکنے کی قدرت رکھتا ہے۔ سورۃ النّجم کی آیت مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی کا یہی مفہوم ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی ''تبیان القرآن'' کی جلد ۱۱ کے صفحہ ۵۰۶ پر رقمطراز ہیں:
''مسلمان دنیا میں اللہ تعالیٰ کو سر کی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے کیونکہ دنیا میں یہ آنکھیں فانی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات باقی ہے اور فانی آنکھوں سے باقی ذات کو نہیں دیکھا جا سکتا۔ جنت میں مسلمان اللہ تعالیٰ کو دیکھ لیں گے کیونکہ جنت میں مسلمانوں کے لئے خلودِ دوام (ہمیشہ رہنا) اور بقاء ہو گی۔ اب مسلمان بھی باقی ہوں گے اور اللہ تعالیٰ بھی باقی ہے اور باقی آنکھوں سے باقی ذات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ہمارے نبی مکرم ﷺ نے اپنے رب کو سر کی آنکھوں سے جاگتے میں دیکھا ہے۔ معلوم ہوا کہ ساری کائنات کی آنکھیں فنا کے لئے ہیں اور سرکارِ ہر عالم ﷺ کی آنکھیں بقاء کے لئے ہیں۔''

رؤیت باری تعالیٰ کے منکرین کے دلائل اور اُن کے جواب: معتزلہ اور دیگر منکرین رؤیت کی ایک دلیل یہ ہے کہ جو چیز دکھائی دے، وہ دیکھنے والے کی مقابل جانب میں ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ دکھائی دے تو اُس کے لئے ایک جانب اور جہت کا ہونا لازم آئے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پھر تو اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کا بھی انکار کر دیا جائے کیونکہ دیکھنے والا بھی دکھائی دینے والی چیز کے مخالف جانب میں ہوتا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ دیکھنے اور دکھائی دینے کا یہ قاعدہ ممکنات اور مخلوقات کے اعتبار سے ہے، اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کے لئے نہ تو جانب اور مقابلہ کی شرط ہے اور نہ دکھائی دینے کے لئے۔''

منکرین کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے جن لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا مطالبہ کیا تھا، اس مطالبہ پر اُن کو بجلی کی کڑک نے پکڑ لیا (سورۃ البقرۃ: ۵۵)۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اُنہوں نے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے اور اُن کی باتوں پر یقین کرنے کو از راہِ عناد اور سرکشی اللہ تعالیٰ کے دیکھنے پر معلق کر دیا تھا، اس وجہ سے نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور شوق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو دیکھنا چاہتے تھے۔ (ایضاً صفحہ ۵۰۷، ۵۰۸)

''واقعہ معراج کی اہمیت صرف اسی قدر نہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے اور برگزیدہ رسول ﷺ کو زمین و آسمان بلکہ اُن سے بھی ماوراء اپنی قدرت و کبریائی کی آیاتِ بیّنات کا مشاہدہ کرایا بلکہ اس میں ستم رسیدہ اہلِ اسلام کے لئے بھی ایک مژدہ ہے کہ شبِ غم اب سحر آشنا ہونے والی ہے۔ تمہارا آفتابِ اقبال ابھی طلوع ہوا چاہتا ہے۔ مشرق و مغرب میں تمہاری سطوت کا ڈنکا بجے گا لیکن مسندِ اقتدار پر متمکن ہونے کے بعد اپنے منعمِ حقیقی اور رحیم و کریم پروردگار کو فراموش نہ کر بیٹھنا۔ اُس کی یاد اور اُس کے ذکر میں غفلت سے کام نہ لینا اور اگر تم نے نشۂ حکومت سے بدمست ہو کر نافرمانی اور سرکشی کی راہ اختیار کی تو پھر اُن کے ہولناک

نتائج سے تمہیں دوچار ہونا پڑے گا۔ دیکھو تم سے پہلے بنی اسرائیل کو ہم نے فرعون کی غلامی اور ظلم و ستم سے نجات دی' بحرِ احمر کو اُن کے لئے پایاب کیا' اُن کی آنکھوں کے سامنے اُن کے جابر دشمن کو سمندر کی موجیں خس و خاشاک کی طرح بہا لے گئیں۔ لیکن جب اُنہیں عزت و وقار بخشا گیا تو وہ اپنے مالکِ حقیقی کے احکام سے سرتابی کرنے لگے تو ہم نے اُن پر ایسے سنگدل دشمن مسلط کر دئے جنہوں نے اُن کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا اور اُن کے مقدس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اسی عبرت آموزی کے لئے واقعہ معراج کے بعد بنی اسرائیل کا ذکر فرمایا۔'' (ضیاء القرآن' ج ۲)

(91) وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى O (اَلنَّجم : ۱)
''قسم ہے روشن ستارے (محمد ﷺ) کی جب وہ (شبِ معراج اوپر جا کر) نیچے اُترے۔'' (۵۳:۱)

هَوٰى فعل ہے جس کا استعمال دو طرح ہوتا ہے: (۱) اگر یہ باب عَلِمَ يَعْلَمُ'' سے ہو یعنی هَوِىَ يَهْوٰى تو اس کا معنیٰ محبت کرنا ہوتا ہے۔ (۲) اگر یہ باب ضَرَبَ يَضْرِبُ سے ہو یعنی هَوٰى يَهْوِىْ جیسا کہ اُوپر کی آیت میں ہے تو اس صورت میں یہ دو متضاد معنوں میں استعمال ہوتا ہے: نیچے گرنا اور بلند ہونا۔ جب کوئی چیز اوپر سے نیچے گرے یا جب وہ پستی سے بلندی کی طرف جائے' تو ہر دو صورتوں میں هَوَى الشَّيْءَ استعمال ہوگا۔ البتہ دونوں حالتوں میں مصدر الگ الگ ہوگا۔ نیچے گرنے کے معنیٰ میں ہو تو کہیں گے هَوَى يَهْوِىْ هَوِيًّا اور بلند ہونے کے معنیٰ میں ہو تو کہیں گے هَوٰى يَهْوِىْ هُوِيًّا۔

جب ستارہ آسمان کے وسط میں ہو تو وہ کوئی راہ نمائی نہیں کر سکتا۔ اس لئے آیتِ مذکورہ میں صرف ستارے ہی کی قسم نہیں کھائی گئی بلکہ اس کی خاص حالت کی جب وہ طلوع ہو رہا ہو یا ڈھل رہا ہو کیونکہ طلوع و غروب کے اِنہی دو اوقات میں اس سے راہ نمائی لینے کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :
هُوَ النَّبِىُّ ﷺ وَهُوِيُّه' نُزُوْلُه' مِنَ السَّمَاءِ لَيْلَةَ الْمِعْرَاجِ وَجُوِّزَ عَلٰى هٰذَا اَنْ يُّرَادَ بِهَوَاهُ صُعُوْدُه' وَعُرُوْجُه' عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ اِلٰى مُنْقَطِعِ الْاَ ين (روح المعانی)
''نجم سے مراد نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس ہے۔ اِذَا هَوٰى کا مطلب نبی علیہ السلام کا آسمان سے واپس زمین پر نزول فرمانا ہے۔ هَوٰى سے یہ مراد لینا بھی جائز ہے کہ حضور علیہ السلام کا شبِ معراج وہاں تک عروج کرنا جہاں مکان کی سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں۔'' (ضیاء القرآن' جلد ۵' صفحہ ۹)

درج بالا وضاحت کے پیشِ نظر اب آیت کا ترجمہ یہ ہوگا :
''مجھے قسم ہے روشن ستارے (محمد ﷺ) کی جب آپ نے (شبِ معراج اللہ تعالیٰ کے متعدد انعامات و عنایات لے کر) اپنی امت کی طرف آسمان سے زمین کی طرف نزول فرمایا۔''

(92) عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی O ذُوْ مِرَّۃٍ فَاسْتَوٰی O وَ ھُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی O ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی O فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی O فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی O مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی O اَفَتُمٰرُوْنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی O وَ لَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی O عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَھٰی O عِنْدَھَا جَنَّۃُ الْمَاْوٰی O اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی O مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰی O لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی O (اَلنَّجم : ۵ ـ ۱۸)

''اُنہیں (رسول ﷺ کو) زبردست قوّتوں والے نے علم (کامل) سے نوازا' بڑے دانا نے' پھر اُس نے بلندیوں کا قصد کیا اور وہ سب سے اونچے کنارہ پر تھا' پھر وہ (ربّ العزت اپنے حبیب محمد ﷺ سے) قریب ہوا' پھر اور زیادہ قریب ہو گیا ☆ (یہاں تک کہ) صرف دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا' پس اللہ نے اپنے (محبوب) بندے کی طرف وحی فرمائی جو (بھی) وحی فرمائی' (اُن کے) دل نے نہ جھٹلایا جو اُنہوں نے دیکھا' کیا تم اُن سے اس پر جھگڑتے ہو جو اُنہوں نے دیکھا' اور اُنہوں نے اُسے دوبارہ بھی دیکھا' سدرۃ المنتہٰی کے پاس' اسی کے پاس جنت الماویٰ ہے' جب سدرہ کو اُس چیز نے ڈھانپ لیا جس نے ڈھانپ لیا' چشمِ (مصطفٰی) نہ درماندہ ہوئی اور نہ حدّ (ادب) سے آگے بڑھی (جسے تکنا تھا اُسی پر جمی رہی)' بیشک اُنہوں نے معراج کی شب اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔'' (۵ـ۱۸ : ۵۳)

''علمائے اَعلام کے سرخیل امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عَلَّمَہٗ' کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے۔ شَدِیْدُ الْقُوٰی اور ذُوْ مِرَّۃٍ اللہ تعالیٰ کی صفتیں ہیں یعنی اللہ تعالیٰ جو زبردست قوّتوں والا دانا ہے' اُس نے اپنے نبی کریم ﷺ کو قرآن کی تعلیم دی جس طرح اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ میں صراحۃً مذکور ہے۔ فَاسْتَوٰی کا فاعل نبی کریم ﷺ ہیں یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قصد فرمایا جبکہ آپ سفرِ معراج میں افقِ اعلیٰ پر تشریف فرما ہوئے۔ پھر نبی کریم ﷺ مکان کی سرحدوں کو پار کرتے ہوئے لامکان میں ربّ العزت کے قریب ہوئے اور وہاں فائز ہو کر فَتَدَلّٰی (سجدہ ریز ہو گئے) اور اتنے قریب ہوئے جتنا دو کمانیں قریب ہوتی ہیں جب اُنہیں ملایا جاتا ہے بلکہ ان سے بھی زیادہ قریب #۔ اس حالتِ قرب میں ربّ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے پر وحی فرمائی جو وحی فرمائی۔

☆''یہ معنٰی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے الجامع الصحیح میں روایت کیا ہے۔ مزید حضرت عبد اللہ بن عباس' امام حسن بصری' امام جعفر الصادق' محمد بن کعب القرشی التابعی' ضحاک رضی اللہ عنہم اور دیگر ائمہ تفسیر کا قول بھی یہی ہے۔'' (ذیلی نوٹ ترجمہ قرآن صفحہ ۸۴۵ از پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری)

#''نہایت قرب کو بیان کرنے کے لئے اہلِ عرب یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عہدِ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ دو قبیلوں کے سردار جب اپنی باہمی دوستی کا اعلان کرنا چاہتے' تو وہ اپنی اپنی کمانوں کو ملا دیتے۔ یکجا شدہ کمانوں میں ایک تیر رکھ کر دونوں سردار اُسے چھوڑتے۔ یہ گویا اس بات کا اعلان ہوتا کہ یہ دونوں سردار باہم متحد ہو گئے ہیں۔ ان میں سے کسی پر کسی نے حملہ کیا تو دونوں مل کر اُس کے مقابلہ میں سینہ سپر ہوں گے۔'' (ضیاء القرآن' ج ۵)

قَابَ قَوسَینِ اَوۡ اَدۡنٰی میں لفظ اَوۡ (بمعنیٰ یا) اپنی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہونے کے باعث ہماری خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ اَوۡ تخییر کا ہے اور فرمایا جارہا ہے کہ اللہ رب العزت اور محبوب علیہ السلام کے درمیان دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا۔ لفظ اَوۡ نے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقامِ بے مثال کے تعین کرنے کی نفی کر دی کہ جب ہم احکم الحاکمین ہوتے ہوئے اپنے محبوب کے ارفع و اعلیٰ مقام کا تعین نہیں کر رہے تو ہما شما کو اس کا کیا حق پہنچتا ہے۔ اِسی سلسلہ میں نبی علیہ السلام نے ایک مرتبہ فرمایا تھا: لَمۡ یَعۡرِفۡ حَقِیۡقَتِیۡ غَیۡرَ رَبِّیۡ (میری حقیقت کو میرے رب کے سوا کسی نے نہیں جانا)۔

مَازَاغَ الۡبَصَرُ وَمَاطَغٰی میں یہی فرمایا کہ میرے محبوب کی آنکھیں میرے انوار کی چمک دمک سے خیرہ ہو کر چندھیا نہیں گئیں اور درماندہ ہو کر بند نہیں ہوگئیں بلکہ جی بھر کے رب کا دیدار کیا۔ اُس حریم ناز میں صفاتی تجلیات اور ذاتی انوار کا جو مشاہدہ بے تاب نگاہوں نے کیا' دل نے اُس کی تصدیق کی اور تمہارا یہ جھگڑا کہ یہ دیکھا وہ نہیں دیکھا' محض بے کار اور عبث ہے۔ دکھانے والے نے جو دکھانا تھا' وہ دکھا دیا اور دیکھنے والے نے جو دیکھنا تھا وہ جی بھر کے دیکھ لیا۔ اب تم بے مقصد بحثوں میں وقت ضائع کر رہے ہو۔ یہ نعمتِ دیدار فقط ایک بار نصیب نہیں ہوئی بلکہ اترتے ہوئے دوسری بار بھی نصیب ہوئی۔ یہ دوبارہ شرف سدرۃ المنتہٰی کے پاس ہوا۔'' (ضیاء القرآن' جلد پنجم' ص ۱۵)

''اِن آیات میں اگر ختم المرسلین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی جبریلِ امین سے ملاقات کا ذکر ہوتا تو ایک ہی آیت کافی تھی۔ کیف انگیز اندازِ بیان صاف بتا رہا ہے کہ یہاں عبدِ کامل کی اپنے معبودِ برحق کے ساتھ ملاقات کا ذکر ہے۔ جہاں ایک طرف عشق ہے' نیاز ہے اور سرافگندگی ہے تو دوسری طرف حُسن ہے' شانِ صمدیت ہے اور شانِ بندہ نوازی اپنے جوبن پر ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ملاقات جبریل علیہ السلام سے بھی بلاشک وشبہ بڑے فوائد کی حامل ہے لیکن امام الانبیاء ﷺ کے لئے باعثِ ہزار سعادت اور وجہِ فضیلت اپنے محبوبِ حقیقی کی ملاقات ہے۔''

''نیز کفار کا اعتراض تھا کہ جو کلام آپ پڑھ کر اُنہیں سناتے ہیں' اللہ کا کلام نہیں۔ یا یہ خود گھڑ کر لاتے ہیں یا اُنہیں کوئی آ کر سکھا پڑھا جاتا ہے۔ اس کی تردید اسی طرح ہونی چاہئے کہ فرمایا جائے کہ یہ کلام نہ اُنہوں نے خود گھڑا ہے اور نہ کسی نے اُنہیں سکھایا ہے بلکہ اُس خالقِ کائنات نے اُنہیں اس کی تعلیم دی ہے جو بڑی قوّتوں والا ہے اور حکیم و دانا ہے۔ اس کے علاوہ انتشارِ ضمائر کی وجہ سے ذہن میں جو پریشانی پیدا ہوتی ہے اور جو قرآن کے معیارِ فصاحت سے بھی مناسبت نہیں رکھتی' اُس سے رُستگاری کا صرف یہی راستہ ہے کہ حضرت حسن بصری کے قول کو تسلیم کیا جائے۔''

''اِن تمام وجوہِ ترجیح کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو وہ احادیثِ صحیحہ جن میں واقعاتِ معراج کا بیان ہے' وہ اس مفہوم کی تائید کے لئے کافی ہیں۔'' (ایضاً' صفحہ ۱۶)

پیر محمد کرم شاہ الازہری ''ضیاء القرآن'' میں پچاس نمازوں کی تخفیف کے بیان میں فرماتے ہیں :

''کیا جس مقام کا یہاں ذکر ہے' وہاں جبریل موجود تھے؟ کیا اُن کی رسائی وہاں ممکن تھی؟ کیا نمازوں کی فرضیت میں جبریل واسطہ تھے یا بار بار کی تخفیف میں کوئی اور واسطہ تھا؟ اب یہ آپ کے ذوق پر منحصر ہے کہ آپ عَلَّمَہٗ' شَدِیْدُ الْقُوٰی سے لے کر مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰی تک کی آیات کو جبریل پر منطبق کرتے ہیں یا اُن احوال و واقعات پر جو زبانِ رسالت سے ان احادیثِ صحیحہ میں ذکر کئے گئے ہیں۔'' (ایضاً' صفحہ ۱۸'۱۹)

دَنَا فَتَدَلّٰی کی ضمیروں کا مرجع : دَنَا اور فَتَدَلّٰی کی ضمیروں میں اختلاف ہے کہ کون کس کے قریب ہوا؟ علامہ ابن جوزی (م ۵۹۷ ھ) لکھتے ہیں:

''مقاتل نے کہا: رب العزت عز و جل شبِ معراج سیّدنا محمد ﷺ کے قریب ہوا تو نبی ﷺ اللہ سے دو کمانوں کی مقدار کے قریب ہو گئے' پھر زیادہ قریب ہوئے۔''

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قرظی نے کہا: سیّدنا محمد ﷺ اپنے رب عز و جل کے قریب ہوئے۔''

''حسن بصری اور قتادہ نے کہا: حضرت جبریل جب زمین سے افقِ اعلیٰ پر مستوی ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ کی طرف نازل ہوئے۔''

''مجاہد نے کہا: حضرت جبریل اپنے رب عز و جل کے قریب ہوئے تو وہ دو کمانوں کے قریب بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب ہوئے۔''

''علامہ ابن جوزی نے کہا: ان اقوال میں قولِ مختار مقاتل کا ہے کیونکہ اس کی تائید میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی حدیث ہے۔'' (زاد المسیر' ج ۸' ص ص ۶۵' ۶۶ مکتب اسلامی بیروت ۱۴۰۷ ھ)

علامہ ابن جوزی نے جس حدیث کا حوالہ دیا' وہ یہ ہے :

وَدَنَا الْجَبَّارُ رَبُّ الْعِزَّةِ فَتَدَلّٰی حَتّٰی کَانَ مِنْهُ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی

''اور جبار رب العزت آپ کے قریب ہوا حتیٰ کہ وہ آپ سے دو کمانوں کی مقدار کے قریب بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب ہوا۔'' (صحیح بخاری' رقم الحدیث: ۷۵۱۷ ؛ صحیح مسلم' رقم الحدیث : ۱۶۲)

''قاضی عیاض نے ''الشفاء'' میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی طرف جو قریب ہونے کی اضافت کی گئی ہے' اس سے زمان و مکان اور جگہ کا قرب مراد نہیں ہے بلکہ اس سے نبی ﷺ کے عظیم مرتبہ اور

آپ کے شرف والے درجہ کو ظاہر کرنا اور نبی ﷺ کو خود سے مانوس کرنا اور آپ کا اکرام کرنا مراد ہے۔''

حافظ ابنِ حجر عسقلانی لکھتے ہیں :
'' ثُمَّ دَنَا سے مراد قربِ معنوی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ یہ ظاہر فرمادے کہ اُس کے نزدیک اپنے نبی علیہ السلام کا کتنا عظیم مرتبہ ہے اور فَتَدَلّٰی کا معنیٰ زیادہ قرب کو طلب کرنا ہے اور قَابَ قَوْسَیْن کا معنیٰ ہے نبی ﷺ کو لطیف محل عطا کرنا اور اللہ تعالیٰ کی معرفت عطا کرنا' آپ کی دعا کو قبول کرنا اور آپ کے درجہ کو بلند کرنا۔'' (فتح الباری' ج ۱۵' ص ۴۵۶)

علامہ بدرالدین عینی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں :
'' اس حدیث میں جبار رب العزت کے قریب ہونے سے مراد قربِ معنوی ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو آپ کا مرتبہ ہے' اُسے ظاہر کرنا ہے۔ اور تَدَلّٰی کا معنیٰ زیادہ قرب کو طلب کرنا ہے اور قَابَ قَوْسَیْن سے مراد آپ کی دعاؤں کو قبول کرنا اور آپ کے درجہ کو بلند کرنا ہے۔'' (عمدۃ القاری' ج ۲۵' ص ۲۵۹)

علامہ شہاب الدین احمد القسطلانی نے بھی اس حدیث کی یہی تاویل کی ہے اور الماوردی سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے ثُمَّ دَنَا کی تفسیر میں فرمایا کہ رب' سیّدنا محمد ﷺ سے قریب ہوا اور فَتَدَلّٰی کی تفسیر میں فرمایا کہ آپ کی طرف اپنے احکام نازل فرمائے۔'' (النکت والعیون للماوردی' ج ۵' ص ۳۹۳ ؛ ارشاد الساری' ج ۱۵' ص ۵۶۵)

علامہ سیّد محمود آلوسی حنفی (م ۱۲۷۰ھ) لکھتے ہیں :
'' حسن بصری حلف اٹھا کر کہتے تھے کہ سیدنا محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا ہے اور اللہ تعالیٰ جو نبی ﷺ کے قریب ہوا' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے نبی ﷺ کا مقام اپنے نزدیک بلند کیا اور تَدَلّٰی کا معنیٰ یہ ہے کہ اُس نے آپ کو بالکلیہ جانبِ قدس میں جذب کر لیا اور اسی کو اللہ تعالیٰ کی ذات میں فنا ہونا کہتے ہیں۔ معظم صوفیہ جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ آپ ﷺ کے قریب ہوا یا آپ ﷺ اُس کے قریب ہوئے' اس سے قرب کا وہ معنیٰ مراد ہے جو اللہ تعالیٰ اور آپ ﷺ کی شان کے لائق ہے۔'' (روح المعانی' جز ۲۷' ص ۸۳)

<u>قَابَ قَوْسَیْن کا معنیٰ</u>: قَاب کا معنیٰ مقدار کا ہے اور قَوْسَیْن تثنیہ ہے قوس کا جو کمان کے معنیٰ میں ہے اور اس میں تین مضاف محذوف ہیں۔ اس کا معنیٰ ہے: وہ دو کمانوں کی مقدار کی مسافت کی مثل قریب ہو گئے۔ یہ اس کا ظاہری معنیٰ ہے اور اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی کو انتہائی قرب عطا کرنا ہے۔ اس سے قرب

مسافت مراد نہیں ہے۔'' (الجامع لاحکام القرآن' جز ۱۷' ص ص ۸۳' ۸۴)

'' آیت کا یہ محمل نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ میں کوئی فاصلہ نہ رہا یا اللہ اور رسول گڈ مڈ ہو گئے بلکہ اس کا محمل یہ ہے کہ سیدنا محمد ﷺ کی قوس کی تجلیات رب العزت کی قوس کے جلووں میں گم ہو گئیں اور آپ فنا فی الذات کے مرتبہ سے واصل ہو گئے جیسا کہ علامہ آلوسی نے بعض اللہ والوں سے نقل کیا ہے۔'' (روح المعانی' جز ۲۷' ص ۸۰) یا اس کا محمل آپ کا اللہ سے انتہائی قرب اور آپ کے مرتبہ کی تکریم اور آپ کے درجہ کی تعظیم کو بیان کرنا ہے جیسا کہ قاضی عیاض نے ''الشفاء'' کی جلد اوّل کے صفحہ ۱۵۹ پر بیان کیا ہے۔'' (تبیان القرآن' جلد ۱۱' صفحہ ۴۹۵)

قَابَ قَوْسَيْنِ سے مقصود یہ ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول کا معاملہ واحد ہے: امام رازی نے لکھا ہے کہ اس آیت سے واضح کر دیا گیا کہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا معاملہ واحد ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا رسول اللہ ﷺ کی رضا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی رسول اللہ ﷺ کی ناراضگی ہے۔ رسول اللہ سے بیعت کرنا اللہ سے بیعت کرنا ہے (سورۃ الفتح' آیت ۱۰)۔ رسول ﷺ کی اطاعت کرنا اللہ کی اطاعت کرنا ہے (سورۃ النساء: آیت ۸۰)۔ رسول کا حکم اللہ کا حکم ہے اور رسول کا منع کرنا اللہ کا منع کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو دھوکا دینا اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینا ہے۔ رسول اللہ کو ایذاء پہنچانا اللہ کو ایذاء پہنچانا ہے اور آپ ﷺ کا فعل اللہ کا فعل ہے۔ قرآن مجید میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔

فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى کی تفسیر: امام جعفر صادق سے روایت ہے کہ جب اللہ کے حبیب ﷺ اللہ سے غایتِ قریب میں پہنچے تو آپ پر بہت زیادہ ہیبت طاری ہوئی تو رب تعالیٰ نے اس کے ازالہ کے لئے آپ پر انتہائی لطف و کرم فرمایا اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ''پھر اللہ نے اپنے بندے کی طرف وحی فرمائی جو بھی وحی فرمائی۔''

''یوں کہئے کہ جو ہونا تھا' وہ ہو چکا اور حبیب نے اپنے حبیب سے وہ کہا جو ایک حبیب اپنے حبیب سے کہتا ہے اور آپ سے وہ راز کی باتیں کیں جو راز ایک حبیب اپنے حبیب سے کہتا ہے۔ پس دونوں نے اس راز کو مخفی رکھا اور ان کے راز و نیاز پر کوئی بھی مطلع نہیں ہوا۔'' (روح المعانی' جز ۲۷' ص ۸۳' بحوالہ تبیان القرآن)

سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى: یہ بیری کا درخت ہے جس کی جڑیں چھٹے آسمان میں اور اُس کا تنا ساتویں آسمان میں ہے۔ ساتویں آسمان اور اس سے اوپر والوں کے درمیان برزخ ہے۔ نیچے سے جو چیزیں اوپر چڑھتی ہیں وہ سدرہ سے اوپر نہیں جا سکتیں اور اوپر سے جو چیزیں نیچے اترتی ہیں وہ سدرہ سے نیچے نہیں جا سکتیں اور ہمارے نبی

ﷺ شب معراج جاتے ہوئے سدرہ سے اوپر گئے اور واپسی میں سدرہ سے نیچے بھی آئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر مخلوق کی ایک حد ہے اور تمام مخلوق میں صرف نبی اکرم ﷺ ایسے ہیں جن کی کوئی حد نہیں ہے۔ آپ جب نیچے سے اوپر گئے تو نیچے والوں کی حد توڑ دی اور جب اوپر سے نیچے تشریف لائے تو اوپر والوں کی حد توڑ دی۔ علامہ بوصیری رحمۃ اللہ نے کیا خوب کہا:

فَإِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ لَیْسَ لَہٗ حَدٌّ" فَیَعْرِبَ عَنْہُ نَاطِقٌ" بفم

"بے شک رسول اللہ ﷺ کے کمالات کی کوئی ایسی حد نہیں ہے جسے کوئی بتانے والا اپنے منہ سے بتا سکے۔"

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے سدرۃ المنتہیٰ کا ذکر کیا گیا تو میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ سدرہ کی ایک شاخ کے سائے میں ایک سوار سو سال تک سفر کرتا رہے گا یا ایک سو سوار اُس کے سائے میں ہوں گے۔ امام ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن ہے۔ (سنن ترمذی: ۲۵۴۱)

حضرت اَنس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جب مجھے اوپر کی طرف لے جایا گیا تو وہاں ساتویں آسمان پر سدرۃ المنتہیٰ تھی جس پر مقام ہجر کے مٹکوں کے برابر بیر تھے اور اس کے پتے ہاتھی کے کانوں کے برابر تھے۔ اس کے تنے سے دو ظاہری دریا اور دو باطنی دریا نکل رہے تھے۔ میں نے جبریل سے پوچھا: یہ کیسے دریا ہیں؟ اُنہوں نے کہا: دو باطنی دریا تو جنت میں ہیں اور دو ظاہری دریا فرات اور دجلہ ہیں۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۱۶۴؛ سنن دارقطنی، رقم الحدیث: ۲۹ بحوالہ "تبیان القرآن" ج ۱۱، ص ۴۹۹)

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی: حضور علیہ السلام کے کمالِ بصارت ☆ کے ذکر کے بعد قرآن آپ ﷺ کے قلبِ انور کا بھی ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ آپ کے قلبِ مبارک نے تجلیاتِ الٰہیہ کی تصدیق کی:
مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی "قلبِ مبارک نے اس کے خلاف نہ کہا جو (چشمِ اقدس نے) دیکھا۔"

جَنَّةُ الْمَاْوٰی: اَلْمَاْوٰی کا معنیٰ ہے رجوع کرنے کی جگہ، پناہ حاصل کرنے کی جگہ، ٹھکانا۔ جنۃ الماویٰ کے متعلق حسبِ ذیل اقوال ہیں:

(۱) حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ وہ جنت ہے جس میں متقین جائیں گے۔
(۲) ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ وہ جنت ہے جس میں ارواحِ شہداء ٹھہرتی ہیں۔
(۳) ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ جنت ہے جس میں آدم علیہ السلام ٹھہرے تھے حتیٰ کہ آپ وہاں سے زمین پر آئے۔ یہ جنت ساتویں آسمان میں ہے۔
(۴) ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ جنت ہے جس میں تمام مؤمنین کی ارواح ٹھہرتی ہیں۔ اسے جنۃ الماوی

☆ کسی صاحبِ نظر نے بصارتِ مصطفوی ﷺ کا بصارتِ موسیٰ علیہ السلام سے کیا خوبصورت موازنہ کیا ہے۔
موسیٰ ز ہوش رفت بہ یک پرتو صفات تو عین ذات می نگری در تبسمی

اس لئے کہتے ہیں کہ یہ ارواحِ مؤمنین کا مسکن ہے اور یہ عرش کے نیچے ہے' پس وہ روحیں جنت کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوتی ہیں اور اس کی خوشبو سے شاد کام ہوتی ہیں۔

(۵) ایک قول یہ ہے کہ یہ جنت حضرت جبریل اور حضرت میکائیل علیہما السلام کا مسکن ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن' جز ۱۷' صفحہ ۹۰)

سدرہ کو ڈھانپنے والی چیزیں: یہ اُن انوار و تجلیات کا ہجوم ہے جنہیں بیان کرنے کے لئے نہ کسی لغت میں کوئی لفظ موجود ہے اور نہ اس کی حقیقت کو سمجھنے کی کسی میں طاقت ہے۔ یہ جس طرح ذکر و بیان سے ماوراء ہے' اُسی طرح فہم و ادراک کی رسائی بھی بالاتر ہے۔ اس دلآویز منظر کی تصویر کشی اس کے بغیر ممکن نہیں کہ یہ کہہ دیا جائے: اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی (جب سدرہ کو اُس چیز نے ڈھانپ لیا جس نے ڈھانپ لیا)۔ اس کی مثال بھی فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی کی طرح ہے کہ پس اللہ نے اپنے (محبوب) بندے کی طرف وحی فرمائی جو (بھی) وحی فرمائی۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (چشمِ (مصطفیٰ) نہ درماندہ ہوئی اور نہ حدّ (ادب) سے آگے بڑھی (جسے تکنا تھا اُسی پر جمی رہی): امام فخرالدین محمد بن عمر رازی (م ۶۰۶ھ) نے فرمایا:

''ظہورِ نور کے وقت سیّدنا محمد ﷺ کی نظر اِدھر اُدھر نہ ہٹی' نہ نور سے متجاوز ہوئی۔ اس کے برخلاف جب کوئی شخص سورج کو دیکھتا ہے تو اُس کی نظر بے اختیار اِدھر اُدھر ہو جاتی ہے اور آپ نے اتنے عظیم نور کو دیکھا اور آپ کی نظر اِدھر اُدھر نہیں ہوئی۔'' (تفسیر کبیر' ج ۱۰' ص ۲۴۶)

علّامہ سیّد محمود آلوسی (م ۱۲۷۰ھ) لکھتے ہیں:۔

''نبی ﷺ کی نظر نہ جنت اور اُس کی زیب و زینت کی طرف مڑی اور نہ دوزخ اور اُس کے ہولناک عذاب کی طرف بلکہ آپ صرف اللہ عزّ وجلّ کی ذات کو دیکھنے میں محو و مستغرق رہے۔'' (روح المعانی)

علّامہ اسماعیل حقی لکھتے ہیں:

''اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے رب کو بیداری میں سر کی آنکھوں سے دیکھا تھا کیونکہ اگر آپ نے اپنے رب کو اپنے قلب سے دیکھا ہوتا تو اللہ تعالیٰ یوں فرماتا: مَا زَاغَ قَلْبُ مُحَمَّدٍ وَّمَا طَغٰی (محمد ﷺ کا قلب نہ بہکا اور نہ کج ہوا)۔ اس کے برخلاف رب نے فرمایا: آپ کی بصر نہ بہکی اور نہ کج ہوئی اور بصر سر کی آنکھ کو کہتے ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ نبی ﷺ نے اپنے رب کو عالم بیداری میں اپنے سر کی آنکھ سے دیکھا۔'' (روح البیان' جلد ۹' ص ۲۶۹)

جن نشانیوں کو نبی ﷺ نے شبِ معراج دیکھا: قرآن آگے چل کر رؤیتِ آیاتِ الٰہیہ کے ضمن

میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کمالِ بصارت کا ذکر بایں الفاظ کرتا ہے:
لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی ''بے شک آپ نے اپنے رب کی بے شمار نشانیاں دیکھیں۔''

اپنے رب کی نشانیوں کے متعلق حسب ذیل اقوال ہیں:
(۱) ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ نے دیکھا کہ سونے سے بنے ہوئے پروانوں نے سدرہ کو ڈھانپ لیا۔
(۲) انہی کا دوسرا قول یہ ہے کہ آپ نے حضرت جبریل کو اُن کی اصل صورت میں دیکھا کہ انہوں نے اپنے پروں سے افق کو گھیر لیا تھا۔ (النکت والعیون ج ۵' ص ۳۹۷)
(۳) انہی کا تیسرا قول یہ ہے کہ آپ نے جنت کے رفرف (سبز رنگ کے تخت) کو دیکھا۔
(زاد المسیر ج ۸' ص ۷۱)

علامہ اسماعیل بن محمد قونوی (م ۱۱۹۵ھ) لکھتے ہیں:
''آپ نے شبِ معراج اُن علامات اور دلائل کو دیکھا جو اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت اور اُس کی دوسری بلند صفات پر دلالت کرتی ہیں اور جنہیں دیکھ کر دیکھنے والا متعجب ہوتا ہے یعنی عالمِ ملک اور شہادت اور عالم الغیب اور جبروت۔'' (حاشیۃ القونوی علی البیضاوی ج ۱۸' ص ۲۸۱)

الغرض اقلیمِ رسالت کے آخری تاجدار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وبارك وسلّم کا سفرِ معراج، عروجِ آدمِ خاکی کا وہ دروازہ ہے جس میں داخل ہوئے بغیر انسان پتھر اور دھات کے زمانے کی طرف تو لوٹ سکتا ہے لیکن ارتقاء کی سیڑھی کے پہلے زینے پر بھی قدم نہیں رکھ سکتا۔ اگر سفرِ معراج کو جدید سائنسی انکشافات کی بنیاد قرار دیا جائے تو یہ اس عظیم معجزہ کے محض ایک پہلو کا اعتراف ہوگا لیکن جوں جوں سائنس ترقی کرے گی' ذہنِ انسانی میں تحقیق وجستجو کے نئے نئے دروازے کھلیں گے' توں توں سفرِ معراج کے حوالے سے اَن گنت کائناتی پیچیدگیاں خود بخود حل ہوتی جائیں گی اور حضور علی الصلوٰۃ والسلام کا یہ زندہ معجزہ اللہ رب العزت کی قدرتِ مطلقہ کا مظہر بن کر شاہراہِ حیات کا وہ سنگِ میل ثابت ہوگا کہ جسے بوسہ دیئے بغیر ارتقاء کے سفر پر روانہ ہونے والا انسان ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکے گا۔

(93) وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِىْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ
''اور ہم نے جو منظر آپ کو دکھایا تھا' اُسے ہم نے لوگوں کی آزمائش کا سبب بنا دیا۔'' (۱۷ : ۶۰)

اِس آیت کی مختلف تاویلات کی گئی ہیں۔ اُن میں سے ایک تاویل واقعہِ معراج کی ہے جس کا ذکر سورۃ الاسراء کی ابتدائی آیت میں ہوا ہے۔ اس صورت میں اَلرُّءْيَا کا لفظ خواب کے معنی میں مستعمل نہیں بلکہ اس سے مراد رُویت العین یعنی عالمِ بیداری میں انہی ظاہری آنکھوں کے ساتھ دیکھنا ہے:

قَالَ الْجُمْهُوْرُ: هِيَ رُؤْيَا عَيْنٍ وَّيَقْظَةٍ

"جمہور علماء کا کہنا ہے کہ رؤیا عالمِ بیداری میں ظاہری آنکھوں کے ساتھ دیکھنا ہے۔" (تفسیر طبراسی؛ الدُّرُّ الثمین لجلال الدین السیوطی، ج ۴، ص ۲۱۰؛ تفسیر شوکانی ج ۳، ص ۲۴۰)

فِتْنَةً لِّلنَّاس (لوگوں کی آزمائش) سے مراد یہ کہ کسی نے اس کی تصدیق کی اور کسی نے تکذیب کی۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ معراج خواب کا تھا تو پھر کسی کو اس کے انکار کرنے کی کیا ضرورت تھی اور یہ واقعہ لوگوں کی آزمائش کس طرح ہوتا؟ (تفسیر کبیر، ج ۷، ص ۳۱۱)

امام ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا کہ یہ رُءْیا آنکھ سے تھا۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو آنکھ سے دکھایا تھا، یہ خواب کا واقعہ نہیں ہے۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۶۹۱۷؛ سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۳۴)

نیز اکثر مفسرین کی یہ رائے ہے کہ اِس آیت کا تعلق واقعہ معراج سے ہے ہی نہیں بلکہ کسی دوسرے خواب سے ہے اور اگر اِسی پر اصرار ہو کہ اس آیت میں معراج کا ہی ذکر ہے تو پھر حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی تصریح کے بعد کوئی التباس نہیں رہتا۔ علامہ ابن العربی اندلسی نے "احکام القرآن" میں سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول بھی نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اگر معراج عالمِ خواب کا واقعہ ہوتا تو کوئی اس سے فتنہ میں مبتلا نہ ہوتا اور کوئی اس کا انکار نہ کرتا کیونکہ اگر کوئی شخص خواب میں اپنے آپ کو دیکھے کہ وہ آسمان کو چیرتا ہوا اوپر جا رہا ہے یہاں تک کہ وہ کرسی پر جا کر بیٹھ گیا اور اللہ تعالیٰ نے اُس سے گفتگو فرمائی تو ایسے خواب کو بھی مستبعد اور خلافِ عقل قرار دے کر اُس کا انکار نہیں کیا جاتا۔" (احکام القرآن لابن العربی)

(94) تَبَّتْ يَدَآ أَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ○ مَآ أَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ○ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ○ وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ○ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ○ (اللَّهَب: ۱-۵)

"ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ برباد ہوگیا، نہ اُس کا مال اُس کے کام آیا اور نہ ہی اُس کی کمائی، عنقریب وہ شعلوں والی آگ میں جا پڑے گا اور اُس کی عورت بھی جو (کانٹے دار) لکڑیوں کا بوجھ اُٹھائے پھرتی ہے (اور ہمارے حبیب کے تلووں کو زخمی کرنے کے لئے اُن کی راہوں میں بچھا دیتی ہے) اُس کی گردن میں کھجور کی چھال کا (وہی) رسّہ ہوگا (جس سے وہ کانٹوں کا گٹھا باندھتی ہے)" (۱-۵ : ۱۱۱)

پورے قرآن مجید میں یہ ایسی سورۃ ہے جس میں گستاخِ رسول کو اُس کے نام سے پکارا گیا ہے اور پوری سورۃ غضبِ الٰہی کی نمود ہے۔ اس کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ ابولہب تھا تو رسولِ اکرم ﷺ کا چچا لیکن وہ اور

اُس کی بیوی اُمِّ جمیل ایسے بد بخت اور مردود تھے کہ اُنہوں نے رسولِ اکرم ﷺ کی مخالفت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ ابولہب کو اپنے مال و دولت اور اولاد پر بڑا بڑا گھمنڈ اور غرور تھا۔ خاتم الانبیاء ﷺ کی آمد سے زراندوزی اور زر پرستی کا زور بھی ختم ہوتا جارہا تھا جس سے ابولہب بوکھلا اُٹھا اور اسلام اور پیغمبرِ اسلام کا وہ دشمن بن گیا۔

بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما آنجناب ﷺ نے سورۃ الشعراء کی آیت ۲۱۴ وَأَنْـذِرْ عَشِيْـرَتَكَ الْأَقْـرَبِيْنَ کے نازل ہونے پر حکمِ الٰہی کی تعمیل میں اپنے اقرباء اور اہلِ قبیلہ کو خبردار کرنے کے لئے کوہِ صفا کی چوٹی سے انتباہ دے کر پکارا اور جب صوتِ ہادی علیہ السلام وادیوں میں گونجی اور تمام لوگ جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے اُن سے پوچھا: ''اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک فوج تم پر حملہ کرنے کو ہے تو کیا تم اس بات کا یقین کر لو گے؟'' سب نے بہ یک زبان کہا: یقیناً کیونکہ ہم نے آج تک کوئی جھوٹی بات آپ کے منہ سے نہیں سنی۔ جس پر آپ نے اُنہیں خبردار کیا کہ اگر اُن کے یہی لیل و نہار رہے تو اُن پر ایک عذابِ شدید آنے والا ہے۔ یہ سن کر ابولہب چیخ اُٹھا: تَبًّا لَّكَ أَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا (تیرا بُرا ہو، کیا تو نے ہمیں اِسی لئے جمع کیا تھا؟)۔

اپنے حبیب ﷺ کے بارے میں اس بدبخت کی یہ بات باری تعالیٰ کو اتنی ناگوار گزری کہ اس نامراد کا نام لے کر اس پر اپنی نفرت و غضب کا اظہار فرمایا۔

اس سورت کے نزول کے وقت ابولہب اپنی قوت و اقتدار کے ساتھ ایک زندہ شخصیت تھا۔ واقعہ کے گزر جانے کے آج چودہ صدیاں بعد محض اُس کا ذکر کتاب میں پڑھ لینا اور بات ہے لیکن ایک معاصر رئیس اور سردار کے منہ پر اُس کے لئے یہ ہولناک پیشگوئی سنا دینا اس سے کتنے مختلف معنی رکھتی تھی اور اُس وقت کیسی کھلبلی مچ گئی ہوگی۔

عربی زبان میں فعل مضارع پر س داخل ہو تو مستقبل کا معنی دیتا ہے۔ سَیَصْلٰی کہہ کر رب تعالیٰ نے مستقبل کی بات ماضی کی زبان میں بیان کر دی۔ اللہ اکبر! قرآنِ حکیم کس جزم و قطعیت کے ساتھ مستقبل کی پیش گوئی کر رہا ہے۔ وہ شخص اچھا خاصا زندہ و سلامت اپنے اثر و اقتدار کے ساتھ موجود ہے اور ایک بیکس و بے یار و شخص پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اُس کا یہ انجام ہو چکا! دنیا نے دیکھ لیا کہ ابولہب اور اُس کی بیوی اُمِّ جمیل جس کی اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف مخالفت مبالغے کی حد تک پہنچی ہوئی تھی' کا انجام بڑا ہی عبرتناک ہوا اور اسی طرح ہوا جس کی قرآنِ حکیم نے پیش گوئی فرمائی تھی۔

''معرکہ بدر میں مسلمانوں کی فتح یابی ابولہب کے لئے ناقابلِ برداشت صدمہ تھا اور بالآخر وہ طاعون جیسے موذی زہرناک اور سوزش والے مرض میں مبتلا ہو گیا اور تڑپ تڑپ کر واصلِ جہنم ہوا۔ بیماری کے دوران اور مرنے کے بعد بھی اُس کی اپنی اولاد اور عزیز و اقارب میں سے کوئی بھی اُس کے قریب تک نہیں پھٹکا۔ اس طرح نہ تو

اُس کا مستقل سرمایہ اور نہ ہی اُس سرمائے پر حاصل ہونے والا نفع اُس کے کام آسکا۔ مرنے کے بعد جب اُس کی لاش میں سخت بدبو اور تعفن پیدا ہوا تو لوگوں نے شور مچایا جس پر اُس کے بیٹوں نے حبشی مزدوروں سے اُس کی لاش اُٹھوا کر ایک گڑھے میں پھینکوا دی اور اوپر سے پتھر مٹی ڈال کر اُسے بند کر دیا۔"

"آخرت میں اُس کے اور اُس کی بیوی کے بارے میں مفسرین بتاتے ہیں کہ وادیِ جہنم میں جہاں ابولہب جل رہا ہوگا' وہاں اُس کی بیوی بھی لکڑیاں ڈھوڈھو کر لانے کے بعد' اُنھیں اُس میں ڈال کر اپنے لئے اور اُس کے لئے آتشِ جہنم کو اور بھی بھڑکاتی رہے گی۔ یہ تھا ابولہب کے لئے وہ عبرتناک عذاب الیم جو آپ کا چچا ہونے کے باوجود گستاخِ رسول ہونے کی پاداش میں عذابِ الٰہی کی گرفت سے نہ بچ سکا اور نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں اپنے آپ کو اور اپنی بیوی کو بچا سکا۔" ("ناموسِ رسول ﷺ اور قانونِ توہینِ رسالت"۔ محمد اسمٰعیل قریشی' سینئر ایڈووکیٹ سپریم کورٹ' ص ص ۹۱' ۹۲)

"ابولہب (شعلے کا باپ) عبدالعزیٰ کی کنیت تھی۔ وہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا چچا اور آپ کے مشن کا زبردست دشمن اور شدید ترین مخالف تھا۔ اُسے ابولہب اس کی گرم مزاجی اور سرخی مائل جلد کی وجہ سے کہا جاتا تھا۔ نبی علیہ السلام کو ایذا پہنچانا اُس کا مشغلہ بن چکا تھا۔" ("Islamic Culture"... Pickthall)

"بعض محققین نے لکھا ہے کہ قرآن میں جو ابولہب آیا ہے' یہ بطور کنیت کے نہیں بلکہ بطور پیش خبری کے ہے کہ اس شخص کا انجام جہنمی ہونا ہے۔ وہ ریاست مکّہ کا ایک ذی اثر رئیس تھا۔ خوب خیال رہے کہ جس وقت یہ سورۃ نازل ہوئی' ابولہب اپنی پوری قوّت واقتدار کے ساتھ ایک زندہ شخصیت کا مالک تھا۔ آج واقعہ کے گزر جانے کے چودہ صدیاں بعد اُس کا ذکر محض ایک چھپی ہوئی کتاب میں پڑھ لینا اور بات ہے اور ایک معاصر رئیس اور سردار کے منہ پر اُس کے لئے یہ ہولناک پیشگوئی سنا دینا اس سے کتنے مختلف معنیٰ رکھتی تھی! اللہ اکبر! قرآن کس جزم وقطعیت کے ساتھ مستقبل کی پیشگوئی کر رہا ہے کہ اُس کا مال و دولت عذابِ الٰہی سے اُسے نہ بچا سکا۔ وہ شخص اچھا خاصا زندہ وسلامت اپنے اثر واقتدار کے ساتھ موجود ہے اور ایک بیکس اور بے یار شخص (ﷺ) پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اُس کا یہ انجام ہو چکا! صیغہ ماضی (تبّ اور ما أغنیٰ) برابر ملحوظِ خاطر رہے جو عربی اسلوبِ بیان میں مستقبل کے اظہارِ قطعیت کے لئے آتا ہے۔" (ماجدی)

ابولہب کی بیوی اُمِّ جمیل بنت حرب' ہمشیرہِ ابوسفیان' نبی ﷺ کی مقدس شخصیت اور آپ کے مشن سے اس کی مخالفت بھی حدِّ غلو تک پہنچی ہوئی تھی۔

"وہ نبی (ﷺ) کی ریتلی راہ میں کانٹے بچھانے میں خوشی محسوس کرتی تھی کہ اُسے یقینی طور پر معلوم تھا کہ

آپ (ﷺ) وہاں سے ننگے پاؤں گزریں گے۔'' (ایضاً)

حَمَّالَةَ الْحَطَب۔ اُمِّ جمیل شدتِ بغض وعداوت سے جنگل کی خاردار لکڑیاں چُن کر رات کے وقت اُن راستوں میں ڈال دیتی جن سے رسول اللہ ﷺ گزرتے۔ حَمَّالَةَ الْحَطَب محاورہ عرب میں مُفسد اور اِدھر سے اُدھر لگائی بجھائی کرنے والے کو بھی کہتے ہیں۔

جِیْد کا معنی بالعموم لمبی اور حسین وجمیل گردن کا یا پتلی اور لمبی گردن کا لیا جاتا ہے۔ (Lane's Arabic English Lexicon, part 7, p. 2716)

حَبْل'' مِنْ مَّسَد کا ایک معنی سورۃ الحاقۃ کی آیت ۳۲ کی رُو سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ستر گز لمبی ایسی فولادی زنجیر اُس کے گلے میں ڈال کر اُسے جہنم میں ڈال دو جو خوب بٹی ہوئی ہو۔ (ایضاً)

فِیْ جِیْدِ هَا حَبْل'' مِنْ مَّسَد (اُس کی گردن میں خوب بٹی ہوئی رسی پڑی ہو گی) میں راز یہ ہے کہ وہ مکہ کے ایک بڑے رئیس کی رفیقہِ حیات تھی۔ اُس کی گردن میں بڑے قیمتی جواہر کا ہار پڑا رہتا تھا جس کے بارے میں وہ کہا کرتی کہ ''لات اور عزیٰ بتوں کی قسم! میں اس ہار کو بیچ کر محمد (ﷺ) کے خلاف اپنی بغض و عداوت کی تسکین کا سامان کروں گی۔'' ربِّ محمد علیہ السلام فرما رہا ہے کہ ہم اُسے گھسیٹ کر اُس اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ جہنم میں ڈال دیں گے جس میں وہ قیمتی جواہر کا ہار ڈالے رہتی تھی۔

<u>سورۃ اللّھب سے اخذ شدہ نکات</u>: (۱) اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیشہ اپنے وفادار بندے کا ساتھ دیتا ہے اور اُسے تن تنہا اور اکیلا کبھی نہیں چھوڑتا اگرچہ وہ سماج کی نظروں میں گرا ہوا، محروم القسمت کیوں نہ ہو۔ (۲) ظلم کا انجام بہرحال اُس کی اپنی تباہی و بربادی ہے اور ظلم وتشدد ظالم و جابر کے سر پر الٹی دھکیل کرتے ہوئے پڑتا ہے۔ (۳) مقدس ومتبرک چیزوں کے خلاف غیظ وغضب رکھنے والا شخص اپنے ہی غیظ وغضب کی آگ میں جل مرتا ہے اور اُسے اُس کی دولت کی شیخی یا اعلیٰ منصب پر فخر وغرور انجامِ بد سے نہیں بچا سکتا۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ لوگ اُنہی ذرائع سے تباہ و برباد ہوتے ہیں جن کے ذریعے وہ دوسروں کی تباہی کا سامان کرتے ہیں۔ (۴) وہ عورتیں جو بدی کی راہ پر چل کر اللہ کے پیارے بندوں کے خلاف جل بھُن جاتی ہیں، خود ہی اپنے ہاتھوں جہنم کی سزا خرید کرتی ہیں۔

(95) <u>نبی اکرم ﷺ تمام انبیاء علیہم السلام کے خصائل وشیم کا مجموعہ ہیں</u>:

أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ <u>فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ</u> قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا (الانعام: ۹۰)

''یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی تھی، سو آپ بھی اُن کے طریقہ پر چلئے' آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔'' (۹۰ : ۶)

آیت بالا کا خط کشیدہ حصہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ (۱) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ مقدسہ تمام انبیاء علیہم السلام کے خصائص و خصائلِ حمیدہ (بہ شمول صبر و استقامت) کا مجموعہ ہے اور اسی لئے آپ کو اُن سب پر فضیلت اور فوقیت حاصل ہے۔ (۲) کسی بھی نبی نے منصبِ رسالت کو بطور پیشہ کے نہیں اپنایا بلکہ تمام نے انسان کی بے لوث اور بے غرض خدمت کی (حوالہ جات کے لئے سورۂ الشّعراء کی مختلف آیات ملاحظہ ہوں)۔ (۳) یہی بے غرضی اور بے لوث خدمت خاتم الانبیاء ﷺ کے کردار میں نظر آتی ہے کہ آپ نے کبھی بھی کسی سے کچھ نہیں لیا بلکہ آپ تو اپنے خالق و رحمت کی رحمتیں اور عنایات اُس کی مخلوق میں بانٹنے کے لئے تشریف لائے ہیں۔

(96) نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ○ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ○ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ○ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ○ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ○ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ○ (القلم : ۱-۶)

''نون، قلم کی قسم اور اُس (مضمون) کی قسم جو (فرشتے) لکھتے ہیں۔ (اے حبیبِ مکرّم!) آپ اپنے رب کے فضل سے (ہرگز) دیوانے نہیں ہیں۔ اور بیشک آپ کے لئے ایسا اجر ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔ اور بیشک آپ عظیم الشان خُلق پر قائم ہیں۔ پس عنقریب آپ (بھی) دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون دیوانہ ہے۔'' (۱-۶ : ۶۸)

نٓ حروفِ مقطعات میں سے ہے جن کا حقیقی معنیٰ اللہ اور اُس کا حبیب لبیب ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔ اس کے کئی معنیٰ ہیں: (۱) مچھلی ☆ (۲) دوات جو علمِ اجمالی سے عبارت ہے کیونکہ حروف جو علم کی صورتیں ہیں، بالاجمال اس میں موجود ہیں (۳) عربی زبان کا حرف تہجی ن۔ اس سورۃ میں عربی قافیہ نون کے حرف پر ختم ہوتا ہے۔

''واؤ قسم کے لئے ہے۔ اَلْقَلَم سے بعض حضرات نے وہ قلم مراد لیا ہے جس نے امرِ الٰہی سے تقادیرِ عالَم کو لوحِ محفوظ میں تحریر کیا جس کی ماہیت سے اللہ تعالیٰ ہی آگاہ ہے۔ اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ اَلْقَلَم سے مراد جنسِ قلم ہے اور اسی کی قسم کھائی جا رہی ہے۔ علوم و فنون، نظریات و افکار کی تعلیم و اشاعت میں بے شک زبان کی قوّتِ بیانیہ کا بڑا حصّہ ہے لیکن اُس کی افادیت زمان و مکان کی حد بندیوں میں محصور ہے۔ قلم ایک ایسا آلہ ہے جو زمان و مکان کی مسافتوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ گزشتہ صدیوں کے علوم و فنون سے حال و مستقبل کو روشن کرتا ہے اور دُور دراز علاقوں میں پیدا ہونے والے اولوالعزم حکماء و فضلاء کے نظریات اور افکار کو دنیا کے گوشہ گوشہ تک پہنچاتا ہے۔''

☆ ذوالنّون (مچھلی والا) پیغمبر حضرت یونس علیہ السلام کا لقب ہے کہ وہ مچھلی کے پیٹ میں کچھ دن رہے تھے۔

''قرآنِ حکیم جو علم و حکمت کی برتری کا علمبردار ہے' جس نے آدم خاکی کی عظمت کا راز اِس بات کو قرار دیا ہے کہ اُس کا سینہ علوم و فنون کا گنجینہ تھا' کوئی مخلوق حتیٰ کہ نورانی فرشتے بھی اُس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اس لئے قرآن کریم نے قلم کی جلالتِ شان کو ظاہر کرنے کے لئے اس کی قسم کھائی جو علم کی نشر و اشاعت کا مؤثر اور بے مثال ذریعہ ہے تاکہ اس قرآنِ کریم کے ماننے والے قیامت تک حکمت و دانش کے کارواں کی قیادت کرتے رہیں اور دنیا کے گوشہ گوشہ کو اس کی روشنی سے منور کرنے کے لئے اپنی ہر امکانی کوشش کرتے رہیں۔ صرف قلم کی قسم کھا کر اُس کی عزت افزائی نہیں کی گئی بلکہ وَمَا یَسْطُرُوْنَ فرما کر علم کے اُن جواہر پاروں کی بھی قسم کھائی گئی ہے جو نوکِ قلم سے صفحۂ قرطاس کی زینت بنتے ہیں۔ اس طرح اُن کی شان کو بھی دوبالا کر دیا۔''

''سورۃ کی دوسری آیت جوابِ قسم ہے۔ کفار و مشرکین حضور سرورِ عالم ﷺ پر جنون کا بہتان لگاتے تھے۔ اُن کے اس جھوٹے الزام کی تردید خود خالقِ ہر جہاں قسم اٹھا کر کر رہا ہے۔ اس میں اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جس ذاتِ پاک کے بارے میں یہ ایسی لغو باتیں کرتے ہیں' وہ تو ایسی ستودہ صفات ہستی ہے کہ قلم کو اُس کی تعریف و ثنا سے فرصت نہ ملے گی۔ وہی تحریریں علمی دنیا کے لئے باعثِ عز و افتخار رہیں گی جن میں اِس محبوب دلربا کا ذکر پاک ہوگا۔ اُس پر اُس کے رب نے فضل و کرم فرمایا ہے۔ اُس کے روئے زیبا کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں' اُس کی حکمت بھری باتیں سن کر دلوں کے ویرانوں میں بہار آ جاتی ہے۔ بدبخت اُس کی صحبت میں پل برابر بیٹھیں تو اُنہیں ابدی سعادت کا تاج پہنایا جاتا ہے۔ اُس کے نام مبارک پر جو لوگ اپنا سر کٹا دیتے ہیں' اُنہیں حیاتِ سرمدی سے سرفراز کر کے شہادت کے منصبِ عالی پر فائز کیا جاتا ہے۔ ہر سچائی' ہر صداقت کے لئے اُس کا قول شاہدِ عدل تسلیم کیا جاتا ہے۔ خود سوچو جس کا خُلق عظیم ہو' جس کا علم بیکراں ہو' جس کا گلشنِ حکمت سدا بہار ہو' جس کی برکات بے شمار اور خوبیاں اَن گنت ہوں' جس کی فصاحت و بلاغت کا دنیا بھر میں کہیں جواب ہی نہ ہو' کیا اُس کو مجنون (دیوانہ) کہنا روا ہے؟ جو اس مرقعِ زیبائی و دلبری کو مجنون کہتا ہے' اُس سے بڑا دیوانہ اور پاگل کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔''

سورۃ کی تیسری آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ''اے حبیبِ محتشم! نبوت کے اس بارِ گراں کو جس خوبی سے آپ نے اٹھایا ہے' میرے دین کی تبلیغ و اشاعت میں جس استقامت اور عزیمت کا مظاہرہ آپ نے کیا ہے' میری مخلوق کے قلوب و اذہان کو میرے نورِ توحید سے جس طرح آپ نے روشن کیا ہے' اس کی کوئی نظیر نہیں۔ یہ آفتابِ صداقت ابد تک درخشاں و تاباں ہی رہے گا۔ توحید کے یہ دل نشیں نغمے بلند ہوتے ہی رہیں گے۔ قیامت تک آنے والے انسان اس سے فیضیاب ہوتے رہیں گے' اس لئے آپ کا اجر بھی ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے گا اور کبھی نہیں ٹوٹے گا۔''

سورۃ کی زیرِ نظر آیت چہارم میں خالق کی زبان اپنی تخلیق کے شاہکار کی توصیف فرما رہی ہے۔ فخر المفسرین امام رازی علیہ الرحمۃ خُلُق کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ خُلق نفس کے اُس ملکہ اور استعداد کو کہتے ہیں جس میں وہ پایا جائے اور اس کے لئے افعالِ جمیلہ اور خصالِ حمیدہ پر عمل پیرا ہونا آسان ہو جائے۔ پھر فرماتے ہیں کہ کسی اچھے اور

خوبصورت فعل کا کرنا الگ چیز ہے لیکن اُسے سہولت اور آسانی سے کرنا الگ چیز ہے۔ کوئی کام خُلق اُسی وقت کہلائے گا جس کے کرنے میں تکلف سے کام لینے کی نوبت نہ آئے (تفسیر کبیر)۔ یعنی جس طرح آنکھ بے تکلف دیکھتی ہے' کان بے تکلف سنتے ہیں' زبان بے تکلف بولتی ہے' اُسی طرح سخاوت' شجاعت' حیا' حق گوئی' تقویٰ وغیرہ تجھ سے کسی تردّد اور توقف کے بغیر صدور پذیر ہونے لگیں تو اُس وقت ان امور کو تیرے اخلاق شمار کیا جائے گا۔

آیت میں عَلٰی استعلاء کے لئے ہے یعنی کسی پر حاوی ہونا' چھا جانا اور قابو پا لینے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ آیت یوں نہیں ہے وَاِنَّ لَكَ خُلُقًا عَظِيْمًا بلکہ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اَخلاقِ حمیدہ اور افعالِ پسندیدہ پر حضور علیہ السلام کا قبضہ ہے اور وہ سب آپ کے زیر فرمان ہیں۔ وہ سب مَرکب ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اُن کے راکب اور شہسوار ہیں۔ اس لئے حضور علیہ السلام کو ان امور کے لئے کسی تکلف اور بناوٹ کی ضرورت نہیں۔ آفتابِ ذاتِ محمدی سے صفاتِ محمدیہ اور کمالاتِ احمدیہ کی کرنیں خود بخود پھوٹتی رہتی ہیں۔''

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ فرما کر بتا دیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ بابرکات تمام کمالات کی جامع ہے۔ وہ کمالات جو پہلے نبیوں اور رسولوں میں متفرق طور پر پائے جاتے تھے' وہ مجموعی طور پر اپنی تمام جلوہ سامانیوں اور اپنی جملہ زعنائیوں کے ساتھ اس ذاتِ اقدس واطہر میں موجود ہیں۔ شکرِ نوح' خُلتِ ابراہیم' اخلاصِ موسیٰ' صدقِ اسماعیل' صبرِ یعقوب' تواضعِ سلیمان علیہم الصلوٰۃ والسلام سب یہاں جمع ہیں:

حُسنِ یوسف' دمِ عیسیٰ' یدِ بیضا داری — آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

امام شرف الدین بوصیری علیہ الرحمۃ نے اپنے مخصوص انداز میں کیا خوب فرمایا ہے۔

فَاقَ النَّبِيِّيْنَ فِيْ خَلْقٍ وَّفِيْ خُلُقٍ — وَلَمْ يُدَانُوْهُ فِيْ عِلْمٍ وَّلَا كَرَمٍ

فَاِنَّهٗ شَمْسُ فَضْلٍ هُمْ كَوَاكِبُهَا — يُظْهِرْنَ اَنْوَارَهَا لِلنَّاسِ فِيْ ظُلَمٍ

''آپ علیہ السلام اپنی ظاہری شکل وصورت اور سیرت واخلاق کے اعتبار سے تمام انبیاء سے برتر ہیں۔ کوئی نبی آپ کے مقامِ علم اور شانِ کرم کے قریب بھی نہیں پہنچ سکتا۔ حضور علیہ السلام کی ذات بزرگی کا آفتاب ہے' سارے انبیاء علیہم السلام آپ کے ستارے ہیں اور وہ ستارے عہدِ جاہلیت کے اندھیروں میں آپ کے انوار اور تابانیوں کو ظاہر کرتے رہے ہیں۔''

شاعرِ دربارِ رسول ﷺ حضرت حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ نے کیا خوب ترجمانی کی ہے۔

لَهٗ هِمَمٌ لَا مُنْتَهٰى لِكِبَارِهَا — وَهِمَّتُهُ الصُّغْرٰى اَجَلُّ مِنَ الدَّهْرِ

''آپ ﷺ کی ہمتیں اور حوصلے بے شمار ہیں۔ جو ان میں سے بڑے حوصلے ہیں' اُن کی تو حد ہی نہیں۔ حضور علیہ السلام کی چھوٹی سے چھوٹی ہمت اور حوصلہ' زمانہ سے بزرگ تر ہے۔'' (ضیاء القرآن' ج ۴)

مزید برآں آپ علیہ السلام کے خالق و مالک نے آپ کو رحمۃ للعالمین کے ابدی اور تابندہ تاج کے ساتھ مزیّن کر کے مبعوث فرمایا اور سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بقول کَانَ خُلُقُهُ القرآن (آپ چلتا پھرتا قرآن تھے)۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ گرامی ہے : اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ تَادِیْبًا حَسَنًا (میرے پروردگار نے مجھے ادب سکھایا اور اُس کا ادب سکھانا بہت خوب ہے!)۔ جب اس عبدِ کریم کا مؤدِّب اور مربی خود ربّ العالمین ہے تو پھر اس تلمیذِ ارشد کے حسنِ ادب، حسنِ تربیت اور کمالِ علم کا کون اندازہ لگا سکتا ہے!

جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ انتقام لینا انسانی فطرت میں شامل ہے اور یہ کہ انتقام لیتے وقت مظلوم اکثر اوقات اخلاقی حدود کو پھاند جاتا ہے اور اب وہ خود ظالم بن جاتا ہے۔ لیکن ہمارے پیغمبر آخرالزماں علیہ السلام کے ہاں یہ بات ہرگز نہیں ہے۔ آپ نے فتح مکہ کے دن اپنے اُن خون کے پیاسوں کو جن کی شرانگیزیاں مدینہ کی دیواروں سے بار بار آ کے ٹکراتی تھیں، غیر مشروط معافی نامہ دے کر اپنے رحمۃ للعالمین ہونے کا عملی ثبوت تاریخ کے صفحات پر رقم کر دیا۔

اس موقع پر انتہائی متعصب اور کینہ پرور مستشرق Stanley Lane-Poole بھی حضور علیہ السلام کو خراجِ تحسین دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :

"محمد (ﷺ) کی اپنے دشمنوں پر عظیم فتح کا دن اُن کی اپنی ذات پر بھی عظیم فتح کا دن تھا۔ آپ نے قریش کی طرف سے دیئے گئے اُن تمام رنج و ملال کے سالوں اور بے رحم نفرت کو فیاضانہ طور پر معاف کر دیا جن میں اُنہوں نے آپ کو اذیت پہنچائی تھی اور مکہ کی تمام آبادی کو معافی دے دی۔۔۔۔۔۔ کسی گھر کو لُوٹا نہیں گیا، کسی عورت کی بے حرمتی نہیں کی گئی۔۔۔۔ اس طرح محمد (ﷺ) ایک بار پھر اپنے پیدائشی شہر میں داخل ہوئے۔ فتح کی تمام روئداد میں اِس فاتحانہ داخلہ کے مقابلہ میں کوئی اور واقعہ نہیں ملتا۔" ("The Speeches & Table-talk of the Prophet Muhammad", p. 47;London, 1882)

پانچویں اور چھٹی آیت کا مفہوم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما یہ بیان کرتے ہیں کہ اے دشمنانِ اسلام! آج تو تم جو جی میں آتا ہے، کہہ دیتے ہو۔ حقیقت سے پردہ اُس وقت اٹھے گا جب حشر برپا ہوگا۔ اُس دن تمہیں پتہ چلے گا کہ دیوانہ کون تھا۔ اپنے خالق کو وحدہٗ لاشریک لہٗ ماننے والا، اُس کے احکام کی بہ دل و جان تعمیل کرنے والا، اُس سے ہر وقت ڈرنے والا دیوانہ ہے یا بُتوں کی پوجا کرنے والے، نفسِ امارہ کی فرمانبرداری کرنے والے اور روزِ قیامت کا انکار کرنے والے دیوانے ہیں۔

اس سے اگلی آیت ہفتم میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پھر تسلی و تشفی دی جا رہی ہے کہ پیارے! آپ کا رب

جانتا ہے کہ راہِ حق سے کون منحرف ہو گیا اور صراطِ مستقیم پر ہمت و جوانمردی سے کون قدم بڑھاتا ہوا منزل کی طرف جا رہا ہے۔ نہ اُسے اپنے آرام کا خیال ہے' نہ اُسے لوگوں کی مخالفت کا اندیشہ ہے' نہ مصائب و آلام سے گھبراتا ہے' نہ طولِ سفر اور بُعدِ منزل سے دل برداشتہ ہوتا ہے۔ جب دونوں فریقوں کے حالات سے وہ اللہ واقف ہے تو وہی اُنہیں مناسب حال جزا بھی دے گا۔'' (ضیاء القرآن جلد پنجم' ص ۳۳۴)

(97) يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآأَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ O (اَلتَّحريم : ۱)

''اے نبی (مکرّم!) آپ خود کو اُس چیز (یعنی شہد کے خوش کرنے) سے کیوں منع فرماتے ہیں جسے اللہ نے آپ کے لئے حلال فرمایا ہے۔ (کیا یوں) آپ اپنی ازواج کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ بڑا بخشنے والا' نہایت مہربان ہے۔'' (۱ : ۶۶)

''امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی صحیحین میں نقل کیا ہے کہ سرورِ عالم ﷺ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ نمازِ عصر کے بعد ازواجِ مطہرات کے حجروں میں تشریف لے جاتے اور تھوڑا تھوڑا وقت ہر رفیقہ حیات کے پاس تشریف رکھتے۔ ایک دفعہ اُمّ المؤمنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی خدمت میں کسی نے شہد تحفۃً بھیجا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جب اُن کے کاشانہ اقدس میں رونق افروز ہوتے تو وہ بڑے اہتمام سے شہد پیش کرتیں۔ آپ کو طبعی طور پر شہد بہت پسند تھا' اس لئے شوق فرماتے اور اس طرح حضرت زینب کے ہاں معمول سے زیادہ قیام ہو جاتا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی مسرت کی حد نہ تھی کہ اُنہیں اللہ کے محبوب علیہ السلام اور اپنے سرتاج کے روئے زیبا کے دیدار کا موقع زیادہ ملتا۔ لیکن جن اُمہات المؤمنین کے حصّہ سے یہ لمحے صَرف ہوتے' اُن کے لئے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہوتی گئی۔ محبت جتنی زیادہ ہوتی ہے' رقابت کا جذبہ اُتنا ہی قوی ہوتا ہے۔ آخر حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما سے ضبط نہ ہو سکا۔ اُنہوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت زینب کے پاس سے اٹھ کر اُن میں سے جس کے پاس آئیں وہ یہ کہے کہ حضور! آپ کے دہن مبارک سے مغافیر کی بُو آ رہی ہے۔ کیا حضور نے مغافیر تناول فرمایا ہے؟ (مغافیر عرفط کی گوند ہوتی ہے جس میں خفیف سی بساند ہوتی ہے)۔ اُنہیں علم تھا کہ حضور علیہ السلام اپنی نفاستِ مزاج کے باعث بدبو کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: میں نے مغافیر تو نہیں کھایا البتہ زینب کے ہاں شہد نوش کیا ہے۔ اس کے بعد میں شہد نہیں پیوں گا' تم کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔'' (ضیاء القرآن' جلد پنجم' صفحہ ۲۹۳)

''زمخشری معتزلی اور اُس کے پیروکاروں نے یہاں بڑی ٹامک ٹوئیاں ماری ہیں اور ایسی باتیں لکھی ہیں جن سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دامنِ عصمت پر حرف آتا ہے۔ آپ ائمہ اہلِ تفسیر ملاحظہ فرمائیں جنہیں رب تعالیٰ نے حق فہمی اور حبِّ مصطفیٰ دونوں نعمتوں سے مالا مال فرمایا ہے۔''

علامہ ابوحیان اندلسی اپنی تفسیر ''البحر المحیط'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یَـا اَیُّهَـا النَّبِیُّ سے خطاب فرما کر اپنے حبیب علیہ السلام کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے' شرفِ ندا سے سرفراز فرمایا ہے اور ازراہِ لطف و محبت دریافت کیا ہے کہ اے حبیبِ محتشم! آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اس کا قرینہ یہ ہے کہ پہلے بڑے احترام سے خطاب فرمایا' پھر سوال کیا جس طرح سورۃ التوبہ کی آیت ۴۳ عـفَـا اللهُ عَـنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ میں ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ تحریم سے مراد تحریم شرعی نہیں یعنی جس طرح وحیِ الٰہی سے کسی چیز کو جو پہلے حلال تھی حرام کر دیا جاتا ہے اور اس کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ یہ حرام ہے بلکہ یہاں تحریم سے مراد امتناع ہے یعنی کسی چیز کے استعمال سے رُک جانا جیسے کوئی شخص کسی حلال اور مباح چیز کے استعمال سے اپنے آپ کو باز رکھ لیتا ہے اور کبھی یہ امتناع کسی ایسے شخص کی دلجوئی کے لئے ہوتا ہے جس کی خوشنودی مطلوب ہوتی ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں کہ ہم زمخشری کی عبارت نقل کرنے سے دانستہ گریز کر رہے ہیں کیونکہ اُس نے ایسی باتیں لکھی ہیں جو عصمتِ نبوت کے خلاف ہیں۔ علامہ آلوسی نے بھی تحریم کا مفہوم امتناع ہی بیان کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ایک حلال چیز کو استعمال کرنے سے کیوں رک گئے ہیں۔''

علامہ آلوسی اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''اگرچہ آپ نے کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا' زیادہ سے زیادہ اَولیٰ کا ترک ہوا لیکن آپ کے عالی اور کریم مقام کے لئے یہ بھی مناسب نہ تھا لیکن ہم غفور ہیں ہم نے معاف کر دیا۔ مزید فرماتے ہیں کہ آیت میں جو عتاب ہے وہ کسی ناراضگی کی وجہ سے نہیں بلکہ مزید اعتنا کی وجہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کو آپ کی ہر ہر ادا کا خیال ہے۔ اُسے یہ گوارا نہیں کہ آئینۂ نبوت پر ادنیٰ سا بھی غبار پڑے۔ زمخشری کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ اُس کا قدم یہاں بھی پھسل گیا ہے۔ اس نے تحریم سے مراد شرعی تحریم لی ہے جو گناہ ہے اور لفظ ''غـــفـــور'' میں اسی گناہ کی آمرزش کی طرف اشارہ ہے۔ آلوسی کہتے ہیں کہ ابن منیر نے یہاں زمخشری کے خوب بخیے اُدھیڑے ہیں۔ ابن منیر کی تنقید کا حاصل یہ ہے کہ زمخشری نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں جو کچھ کہا ہے وہ اُس کا اپنا گھڑا ہوا افترا ہے اور حضور علیہ السلام کی ذاتِ اقدس اس سے بَری ہے کیونکہ حلال کی تحریم کی دو صورتیں ہیں : ایک یہ کہ کسی حلال چیز کو حرام اعتقاد کر لیا جائے۔ یہ ممنوع ہے بلکہ کفر ہے اور نبی معصوم سے اس کا صدور ممکن نہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ حلال کو حلال ہی سمجھا جائے لیکن اس کے استعمال سے اجتناب کیا جائے۔ ایسا کرنا مباح اور حلال ہے (جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے عرق النسا بیماری کی وجہ سے اونٹ کا گوشت اور دودھ اپنے اوپر ممنوع کر لیا تھا بحوالہ سورہ آلِ عمران : آیت ۹۳ حالانکہ یہ دونوں چیزیں حلال ہیں) اور حضور علیہ السلام کی تحریم کی یہی صورت تھی۔

آگے چل کر علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے عتاب کی وجہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنی ازواج کی خوشنودی کے لئے اپنے اوپر پابندی عائد کر لی جس سے حضور علیہ السلام کو تکلیف ہوئی۔ رب تعالیٰ کو یہ ہرگز

گوارا نہیں کہ اُس کے محبوب کو تکلیف پہنچے۔ اس لئے فرمایا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ آپ کو اپنی ازواج کی خوشنودی مطلوب ہے تو مجھے آپ کا آرام اور آپ کی راحت مرغوب ہے۔ ایسی ناروا پابندیوں کی اجازت میں آپ کو کیونکر دے سکتا ہوں!''

''نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا شہد کو حرام کرنا اس لئے نہیں کہ آپ کو علم نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ قرآنِ کریم نے خود بتادی کہ آپ اپنی ازواج کی دلجوئی کرنا چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی وجہ کو پسِ پشت ڈال کر اپنی طرف سے عدمِ علم کو اس کا سبب قرار دینا ایک مؤمن کو تو ہرگز زیب نہیں دیتا۔ اللہ تعالیٰ حق فہمی کی صلاحیت سلب کر لیتا ہے تو اسی قسم کے دل خراش الفاظ انسان کی زبان سے نکلتے ہیں۔'' (ضیاءالقرآن' جلد ۵' صفحہ ۲۹۶)

(98) وَ اِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَ اَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُO اِنْ تَتُوْبَا اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَیْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِیْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِیْرٌO عَسٰى رَبُّهٗ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓىِٕبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓىِٕحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًاO (التحریم:۳-۵)

''اور جب نبی (ﷺ) نے اپنی ایک زوجہ سے ایک رازدارانہ بات ارشاد فرمائی' پھر جب وہ اُس (بات) کا ذکر کر بیٹھیں اور اللہ نے نبی (ﷺ) پر اُسے ظاہر فرما دیا تو نبی (ﷺ) نے اُنہیں اُس کا کچھ حصّہ جتا دیا اور کچھ حصّہ (بتانے) سے چشم پوشی فرمائی' پھر جب نبی (ﷺ) نے اُنہیں اس کی خبر دے دی (کہ آپ راز افشاء کر بیٹھی ہیں) تو وہ بولیں: آپ کو یہ کس نے بتا دیا؟ نبی (ﷺ) نے فرمایا کہ مجھے بڑے علم والے نے' بڑی آگاہی والے (رب) نے بتا دیا ہے۔ اگر تم دونوں اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرو (تو تمہارے لئے بہتر ہے) کیونکہ تم دونوں کے دل (ایک ہی بات کی طرف) جھک گئے ہیں' اگر تم دونوں نے اس بات پر ایک دوسرے کی اعانت کی (تو یہ نبی مکرّم ﷺ کے لئے باعثِ رنج ہو سکتا ہے) سو بیشک اللہ ہی اُن کا دوست و مددگار ہے' اور جبریل اور صالح مؤمنین بھی اور اس کے بعد فرشتے بھی (اُن کے) مددگار ہیں۔ اگر وہ تمہیں طلاق دے دیں تو عجب نہیں کہ اُن کا رب اُنہیں تم سے بہتر بیویاں بدلہ میں عطا فرما دے (جو) فرمانبردار' ایماندار' اطاعت گزار' توبہ شعار' عبادت گزار' روزہ دار' (بعض) شوہر دیدہ اور (بعض) کنواریاں ہوں گی۔'' (۶۶:۳-۵)

''وہ بات کیا تھی جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے رازداری سے اپنی ایک رفیقۂ حیات کو بتائی تھی اور کسی دوسری سے اس کا ذکر کرنے سے منع فرما دیا تھا۔ جن علماء نے شہد والی حدیث کو ان آیات کے نزول کا سبب تسلیم کیا ہے' اُن کے نزدیک وہ راز حضور علیہ السلام کا یہ قول تھا کہ میں پھر شہد نہیں کھاؤں گا اور تم یہ کسی کو نہ بتانا کہ میں نے شہد نہ کھانے کی قسم کھائی ہے۔'' (ضیاءالقرآن' جلد پنجم' صفحہ ۲۹۷)

"ہمارے لئے اتنا سمجھنا ہی کافی ہے کہ کوئی راز کی بات تھی جو حضور علیہ السلام نے اپنی ایک زوجہ کو بتائی اور اُنہیں تاکید کردی کہ کسی دوسری کو اس کا پتہ نہ چلے لیکن وہ اس راز کو اِفشا کر بیٹھیں۔ رب تعالیٰ نے اپنے حبیب علیہ السلام کو آگاہ کردیا کہ آپ کی اہلیہ نے وہ راز افشا کردیا ہے۔ حضور علیہ السلام نے جب اُس زوجہ کو بتایا کہ تم نے یہ راز ظاہر کردیا ہے تو وہ حیران رہ گئیں اور خیال کیا کہ شاید دوسری بیوی نے بتایا ہوگا۔ پوچھا: حضور! آپ کو کس نے آگاہ کیا ہے کہ میں نے یہ راز فاش کردیا؟ تو آپ نے فرمایا کہ مجھے میرے رب نے خبر دی ہے جو سب کچھ جاننے والا اور ہر راز سے باخبر ہے۔ قرآن میں صراحت سے اُس راز کو بیان نہیں کیا گیا لیکن راز کے افشا ہونے اور اس پر افشا کرنے والی کو سرزنش کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔"

تَتُوبَا کا فاعل حضرت حفصہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ سے اِس آیت کا مصداق پوچھا تو آپ نے ان ہی دو کا نام لیا۔ توبہ کی وجہ بتادی فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا (تمہارے دل مائل ہوگئے ہیں) کہ آپ کا دل دوسری ازواج کی طرف سے ہٹا کر آپ کو صرف اپنا بنالیں۔ اِس میں چونکہ دوسری بیویوں کے حقوق کا اِتلاف ہے اس لئے اس سے توبہ کرانا ضروری قرار پایا (تفسیر ماجدی، صفحہ ۱۱۲۱، نوٹ: ۷)۔

خیال رہے کہ یہاں زَاغَتْ (بہ معنی ٹیڑھا ہونا) کا لفظ نہیں استعمال ہوا بلکہ صَغَتْ کا لفظ استعمال ہوا ہے تو اس کا ترجمہ "تمہارے دل ٹیڑھے ہوگئے ہیں یا سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں" کسی طرح مناسب نہیں۔ یہاں رب تعالیٰ نبی علیہ السلام کی ازواج کا بھی آپ ﷺ کی وجہ سے اکرام فرما رہا ہے۔

وَاِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر تم دونوں نے میرے حبیب ﷺ کو ایذا دینے پر ایکا کرلیا تو تم اُن کا کچھ بگاڑ نہ سکوگی کیونکہ آپ ﷺ کا مددگار رب تعالیٰ ہے، کرّوبین کا سردار جبریل اور نیک بخت اہلِ ایمان آپ کے مددگار ہیں۔ ان کے علاوہ فرشتوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ آپ کی اعانت کے لئے تیار کھڑے ہیں۔ جس کی مدد کرنے والا اللہ تعالیٰ ہو، جس کی نصرت و تائید کرنے والے ایسے جلیل القدر لوگ ہوں، اُسے بھلا کوئی کیا گزند پہنچا سکتا ہے!

آیت پنجم میں ازواجِ مطہرات کو تادیب کی جارہی ہے کہ بے شک تمہاری بڑی شان ہے، تم معزز خاندانوں کی چشم و چراغ ہو لیکن اگر تم نے میرے نبیِ مکرّم کی خوشنودی حاصل نہ کی اور تمہاری کسی غلطی سے ناراض ہوکر آپ نے تمہیں اپنے شرفِ زوجیت سے محروم کردیا تو نقصان تمہارا ہی ہوگا، اُنہیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ ہم اُن کی زوجیت کے لئے ایسی بیبیاں فراہم کردیں گے جو تم سے بہتر ہوں گی اور ان تمام مذکورہ خوبیوں سے بدرجہ اتم موصوف ہوں گی جن کا نبی آخرالزماں ﷺ کی ازواجِ مطہرات میں پایا جانا ضروری ہے۔

خَيْرًا مِّنْكُنَّ سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ پیغمبر علیہ السلام کی ازواجِ مطہرات سے بہتر کوئی اور بیبیاں

تھیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی تبدیلی واقع ہو تو قادرِ مطلق اللہ اپنے پیغمبر کو موجودہ بیویوں سے بہتر بیویاں فراہم کر سکتا ہے۔ لیکن چونکہ کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اس لئے آپ کی موجودہ ازواج کے بدلے میں کوئی اور بیویاں نہیں لائی گئیں کیونکہ آپ کی یہ ازواج اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ سے وفاداری اور حق و صداقت کو ترقی دینے کا عملی نمونہ تھیں۔

آیات سے اخذ شدہ نکات: (۱) آیت سے جہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ اپنے اہلِ خانہ سے راز کی بات کہنا درست ہے، وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس کو رازدار بنایا جائے وہ اُس راز کی پوری پوری نگہداشت کرے۔ (۲) اُس راز کا افشا کرنا گناہ کی بات ہے جس کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے۔ (۳) اعتماد کو ٹھیس پہنچانے والے فریق کو فوراً توبہ کر کے اپنے عمل کی تطہیر کر لینا ضروری ہے۔ (۴) کھلم کھلا اور علانیہ توبہ سے جھجکنا نہیں چاہئے اور اس میں ضد، تعصب یا نفسِ امارہ کے دواعی کو مانع نہیں ہونا چاہئے۔ (۵) اگر لوگ لاشعوری طور پر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خطرات میں ڈالیں تو کوئی اُنہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا کیونکہ رب تعالیٰ خود، اُس کے ساتھ صالح مؤمنین اور جبریل علیہ السلام جیسا طاقتور فرشتہ اُن کا حامی و ناصر ہے جس نے اپنے زورِ بازو سے قومِ لوط کی بستی کو زمین و آسمان کے درمیان اس طرح اُلٹا دیا تھا جس طرح کسی طشتری کو پلٹا دیا جاتا ہے۔ اس سے ہمیں یہ عمومی سبق ملتا ہے کہ نیک و صالح آدمی بہ اذنِ الٰہی اپنے آس پاس کی روحانی طاقتوں کی حفاظت میں ہوتا ہے۔ (۶) ضروری نہیں کہ دوشیزگان اور اٹھتی جوانی والی لڑکیاں اپنے خاوند کے لئے ہمیشہ خوش اندام، لائقِ محبت اور دوست دار (Amiable) ہوں۔ بعض صورتوں اور بعض حالات میں بیوگان اور طلاق یافتہ عورتیں بھی دوست دار اور خوش آئند ثابت ہو سکتی ہیں اور اسی لئے انسانی فطرت اور اس کے مزاج کو خوب سمجھنے والے اللہ نے اُن کا ذکر کرنے کو ضروری سمجھا۔

(۶۶) اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًاO (الاحزاب: ۵۶)

''بے شک اللہ اور اُس کے فرشتے نبی علیہ السلام پر رحمت بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی آپ پر رحمت بھیجا کرو اور خوب خوب سلام بھیجا کرو۔'' (۵۶ : ۳۳)

اللہ کی رحمت بھیجنا تو ظاہر ہی ہے۔ مسلمانوں اور فرشتوں کی صلوٰۃ بھیجنے کے معنی یہ ہیں کہ اُنہیں حکم مل رہا ہے کہ رسول پر اُس رحمتِ خاص کی دعا کرتے رہیں اور اسے اُن کے حق میں طلب کرتے رہیں۔ اسی کو عرفِ عام میں درود بھیجنا کہتے ہیں۔ یہاں صلوٰۃ سے مراد رحمتِ عام نہیں بلکہ نبی کے شایانِ شان رحمتِ خاص مراد ہے۔ یہ خیال بھی بالکل غلط ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود و سلام بھیجنے سے نبی ﷺ کا کوئی فائدہ ہے بلکہ پڑھنے اور بھیجنے والے کے درجات کی بلندی کا ایک بہانہ رب تعالیٰ نے بنا دیا ہے۔

امام مرتضی الزبیدی ''تاج العروس'' میں صلوٰۃ کا معنی لکھتے ہیں:

قَالَ ابْنُ الاعرابی اَلصَّلاۃُ مِنَ اللہِ اَلرَّحْمَۃُ وَمِنْہُ ھُوَالَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ اَیْ یَرْحَمُ
''ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے صلوٰۃ کا معنیٰ ''رحمت'' ہے اور یہی اس آیت کا معنیٰ ہے'' وہ تم پر صلوٰۃ بھیجتا ہے'' یعنی ''وہ تم پر رحمت بھیجتا ہے۔''

علامہ راغب اصفہانی (م ۵۰۲ ھ) لکھتے ہیں:
''اللہ تعالیٰ کا محمد ﷺ پر صلوٰۃ پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُن کی حمد و ثنا فرماتا ہے اور اُن کا تزکیہ فرماتا ہے۔ فرشتوں کی صلوٰۃ پڑھنے کا مطلب ہے کہ وہ اللہ سے نبی علیہ السلام کے لئے رحمت طلب کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی صلوٰۃ پڑھنے کا مطلب ہے کہ وہ اپنے نبی علیہ السلام کے لئے اللہ کی برکت ورحمت کے نزول کی دعا کرتے ہیں۔'' (المفردات' ج ۲' ص ۳۷۴' مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ' ۱۴۱۸ھ)

قاضی عیاض نے فرمایا:
''سلام کا معنیٰ ہے تسلیم کرنا' مان لینا' اطاعت کرنا اور سرِ تسلیم خم کرنا۔ گویا مؤمنوں سے فرمایا ہے کہ تم لوگ آپ پر صلوٰۃ پڑھو اور اس حکم کو مان لو' تسلیم کرلو اور اس کی اطاعت کرو۔'' (الشفاء' ج ۲' ص ۵۱' ۵۰)

''ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ہمیں آپ پر صلوٰۃ پڑھنے کا حکم دیا اور ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آپ کا مرتبہ کیا ہے اور آپ پر کس طرح صلوٰۃ پڑھنی چاہیئے تو ہم نے صلوٰۃ پڑھنے کو اللہ کے سپرد کر دیا اور ہم نے کہا: اے اللہ! اپنے رسولِ مکرّم کے مرتبہ کو تو ہی جاننے والا ہے' اُن کے مرتبہ کے موافق تو ہی اُن پر صلوٰۃ پڑھ سکتا ہے' سو تو ہی اُن پر صلوٰۃ پڑھ۔'' (مجمع بحار الانوار' ج ۳' ص ۳۴۷ بحوالہ تبیان القرآن' ج ۹' ص ۵۳۴)

صَلُّوْا اَمر کا صیغہ ہے جس کا معنیٰ ہے ''تم درود بھیجو'' اور سَلِّمُوْا بھی امر کا صیغہ ہے جس کا معنیٰ ہے ''تم سلام بھیجو''۔ دونوں صیغوں کی نوعیت یکساں ہے لیکن سَلِّمُوْا کے ساتھ تَسْلِیْمًا کا اضافہ ہونے سے وہ مفعولِ مطلق بن گیا اور سلام کی معنویت میں زور پیدا ہو گیا کیونکہ مفعولِ مطلق سے معنیٰ میں زور (Emphasis) پیدا ہو جاتا ہے۔ نبی مکرّم ﷺ نے سلام بھیجنے کا طریقہ یہ بتایا: اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّھَا النَّبِیُّ اور درود بھیجنے کا طریقہ یہ بتایا: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ۔ صلوٰۃ و سلام کسی بھی انداز سے پڑھا جائے' جائز ہے۔ چاہے کوئی اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللہِ پڑھے یا اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی مُحَمَّدٍ پڑھے' ہر صورت میں اللہ کے حکم پر عمل ہو جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے اور بھی کئی درُود مروی ہیں جن کے صیغے مختلف ہیں اور اپنی ضرورت و خواہش کے مطابق اُنہیں پڑھنا بھی جائز ہے۔

معلوم ہوا کہ درود بھیجنا ذکرِ الٰہی اور عبادت کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ تمام عبادات یعنی نماز' روزہ' حج' صدقات و خیرات و زکوٰۃ یہاں تک کہ اللہ کی راہ میں سر کٹانا وغیرہ کسی بھی کارِ خیر کی قبولیت کی ضمانت نہیں دی جا سکتی

لیکن درود پاک بہرصورت رب کے ہاں منظور ومقبول ہے کیونکہ رب تعالیٰ خود اِس عمل میں شامل ہے۔ تفسیر روح البیان میں ہے کہ بجائے اسمِ ذات مُحَمّد لانے کے جیسا کہ قرآن کا عام دستور حضرت انبیاء علیہم السلام کے معاملہ میں ہے' اسمِ صفت النّبی کا لانا حضور علیہ السلام کے مزید اعزاز واکرام کے لئے ہے اور اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو اپنے محبوبِ مکرّم ﷺ کی تعظیم وتوقیر کا بڑی سختی سے حکم فرمایا:

لِتُؤْمِنُوْا بِاللهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ (سورة الفتح : ۹)

''تا کہ (اے لوگو!) تم اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اُن (کے دین) کی مدد کرو اور اُن کی (بہ دل وجان) تعظیم وتوقیر کرو۔'' (۴۸ : ۹)

درود کے ساتھ سلام کا حکم کیوں؟ اس ضمن میں پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری لکھتے ہیں:

''نبی مکرّم ﷺ کے اعلیٰ اور رفیع مرتبہ کے پیشِ نظر مؤمنوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے نبی پر نہ صرف صلوٰۃ یعنی درود بھیجیں بلکہ سلام بھی بھیجیں۔ سلام بالعموم کسی ممتاز شخصیت' قائد و پیشوا یا سیاست دان کو کیا جاتا ہے۔ لیکن نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مرتبہ ومقام رب تعالیٰ کے نزدیک اُن شخصیات سے کہیں زیادہ بلند وبالا ہے جنہیں سلام کیا جانا چاہئے اور یہ چیز آپ ﷺ کے خصائل حمیدہ اور بے مثل طرزِ زندگی کی وجہ سے ہے۔''

درود وسلام کا حکم صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے خاص کیوں؟ اس کی اصل وجہ تو مالکِ کون ومکاں ہی بہتر جانتا ہے لیکن کچھ مفسرین کے نزدیک اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ دینِ حق کی تبلیغ اور جبینِ انسانیت کو ایک خدائے واحد کے حضور جھکانے میں جن تکالیف اور اعصاب شکن مصائب کو آپ نے جھیلا' کسی اور نبی یا رسول نے نہیں جھیلا اور اس ضمن آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی بھی ہے کہ مجھ سے پہلے اگر تمام انبیائے کرام کی جھیلی ہوئی تکالیف ومصائب کو ترازو کے ایک پلڑے میں اور مجھ اکیلے کی تکالیف کو ترازو کے دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے' تو میرا پلڑا اُن سب سے بھاری ہوگا۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود بھیجنا سنتِ الٰہیہ ہے: جیسا کہ سورۃ الاحزاب کی مندرجہ بالا آیت ۵۶ سے معلوم ہوا کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود بھیجنے کا نہ صرف حکم ہے بلکہ یہ سنت الٰہیہ بھی ہے۔ ماحول' ضرورت اور زمانے کے بدلنے سے احکام میں تبدیلی ہوجاتی ہے مگر سنتِ الٰہیہ میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ سنت کو ہمیشہ ابدی' دائمی اور آفاقی قانون کا درجہ حاصل رہتا ہے جو ہر دَور میں بحالہٖ ایک ہی شکل میں قائم وبرقرار رہتا ہے (بحوالہ سورہ فاطر: ۴۳ وسورۃ الفتح: ۲۳)۔ لہٰذا مؤمنوں کے لئے فرض ہے کہ وہ سنتِ الٰہیہ میں شریک ہوتے ہوئے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بکثرت درود وسلام بھیجا کریں۔

یہاں پہنچ کر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اپنے رب کے ہاں رفعتِ مقام کا پتہ چلتا ہے۔ اسلام کی تمام اقسامِ عبادات (نماز' روزہ' حج وغیرہ) نبی علیہ السلام کی سنتِ مبارکہ ہیں نہ کہ اللہ کی کیونکہ اللہ نماز نہیں پڑھتا' نہ ہی وہ روزہ رکھتا ہے اور نہ ہی حج کرتا ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود بھیجنا اُس کی سنتِ مبارکہ ہے اور اسی لئے درودِ پاک کو سب عبادات سے زیادہ معزز' شاندار' ترجیحی اور ارفع عمل سمجھا گیا ہے۔

مختلف طریقہ ہائے عبادات سے متعلق احکاماتِ الٰہیہ کچھ اصول وضوابط کے ماتحت ہیں مثلاً پنجگانہ نماز اپنے وقت پر ادا کی جاتی ہے اور اس کی قبولیت سنتِ رسول کے مطابق ادا ہونے کے ساتھ مشروط ہے۔ اسی طرح روزوں میں بھی کچھ اصولوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے یعنی سنتِ رسول کے تمام طریقہ ہائے عبادت کے اپنے اپنے تقاضے ہیں۔ لیکن چونکہ صلوٰۃ وسلام چونکہ خالقِ کائنات کا طریقہ ہے اس لئے وہ وقت اور دوسرے ذیلی واجبات کا پابند نہیں۔

''آیت مذکورہ کا سادہ سا گرائمری تجزیہ اس نکتے کو مزید واضح کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ عربی گرامر میں جملے کی دو قسمیں ہوتی ہیں: جملہ فعلیہ جس میں فعل ظاہر ہوتا ہے اور جملہ اسمیہ جو محض نام کا جملہ ہوتا ہے۔ جملہ فعلیہ کسی خاص وقت (ماضی' حال یا مستقبل) سے متعلق ہوتا ہے اور وہ تینوں زمانوں میں سے کسی ایک میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ وقت بھی غیر مستقل اور عارضی چیز ہے۔ اگر یہ زمانہ حال میں ہے تو اُسے بہر حال جانا ہے اور اگر زمانہ مستقبل سے متعلق ہے تو اُسے ابھی آنا ہے۔''

''تاہم جملہ اسمیہ تمام اوقات کو اپنے اندر لئے ہوتا ہے۔ یہ دائمی اور مستقل ہوتا ہے۔ ایک نام سے منسلک ہونے کے بعد اس کا تعلق تمام اوقات سے ہو جاتا ہے۔ آیت مذکورہ ۵۶ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جملہ اسمیہ سے بات شروع کی ہے۔ زمانہ ماضی کا صیغہ کہ ''اللہ اور اس کے فرشتوں نے درود بھیجا'' کی بجائے یا زمانہ مستقبل کا صیغہ کہ ''اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجیں گے'' استعمال کرنے کی بجائے زمانہ حال میں بات کی ہے کہ ''اللہ اور اُس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں''۔ یہ کوئی حکم یا ہدایت نہیں بلکہ ایک حقیقت کا اعلان ہے جو ہمیشہ جاری رہے گا۔ اس طرح نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود وسلام کا عمل ایک غیر منقطع اور دائمی عمل ہے۔''

''صلوٰۃ'' اور ''سلام'' میں فرق: جیسا کہ آیت مذکورہ ۵۶ سے معلوم ہوا کہ زور سلام پر ہے' صلوٰۃ پر نہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ مانوسیت اور پہچان سلام سے ہوتی ہے اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام فوراً اپنے اُس اُمتی کو پہچان لیتے ہیں جو بڑے خلوص' محبت اور تعظیم کے ساتھ آپ پر بکثرت سلام بھیجتا ہے۔ اس طرح حکمِ الٰہی نبوت کی رفعتِ مقامی کا مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ مؤمنوں کے لئے اُس کی لامحدود رحمت کا مظہر بھی ہے۔

''مؤمنوں کو درود وسلام پڑھنے پر ثواب دیئے جانے کی قسم میں بھی امتیاز روا رکھا گیا ہے اور وہ امتیاز

درجے اور مرتبے میں ہے۔ نبی علیہ السلام پر درود بھیجنے والوں کو اپنے اس عمل کی روحانی اجرت دی جاتی ہے۔ جس طرح ایک مزدور کو اپنی محنت کی اجرت رقم کی شکل میں دی جاتی ہے' اسی طرح درود بھیجنے والے کو اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اُس کی طرف سے برکات کی شکل میں روحانی طور پر نوازا جاتا ہے۔ پیغمبر کریم ﷺ نے اپنے اُن اُمتیوں کے لئے شفاعت کی ضمانت دی ہے جو آپ پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ عبداللہ بن عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اُنھوں نے نبیِ اکرم ﷺ کو یہ فرماتے سنا:

إِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ فَقُولُوا مِثْلَ مَا يَقُولُ ثُمَّ صَلُّوا عَلَيَّ فَإِنَّهُ مَنْ صَلَّى عَلَيَّ صَلَاةً صَلَّى اللّٰهُ بِهَا عَشْرًا ثُمَّ سَلُوا اللّٰهَ لِيَ الْوَسِيلَةَ فَإِنَّهَا مَنْزِلَةٌ فِي الْجَنَّةِ لَا تَنْبَغِي إِلَّا لِعَبْدٍ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ وَأَرْجُوا أَنْ أَكُونَ أَنَا هُوَ فَمَنْ سَأَلَ لِيَ الْوَسِيلَةَ حَلَّتْ لَهُ الشَّفَاعَةُ (صحیح مسلم: کتاب الصلوٰۃ' سنن ابی داؤد: کتاب الصلوٰۃ' جامع ترمذی: کتاب المناقب' سنن نسائی: کتاب الاذان' مسند احمد بن حنبل' صحیح ابن خزیمہ' مشکوٰۃ المصابیح لخطیب تبریزی: کتاب الصلوٰۃ' شرح السنۃ لحسین بن مسعود بغوی' کنزالعمال لعلاء الدین علی ۲۰۰۷' بحوالہ ڈاکٹر محمد طاہر القادری)

''جب تم مؤذّن کو اذان کہتا سنو تو اُس کے کہے ہوئے الفاظ دُہرادو' پھر مجھ پر درود بھیجو' اس لئے کہ جو کوئی مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے' اللہ تعالیٰ اُس پر اُس کی وجہ سے دس رحمتیں نازل فرماتا ہے۔ پھر تم اللہ سے میرے لئے مقامِ وسیلہ کی درخواست کرو جو جنت میں ایک مقام ہے جو اللہ کے ایک (خاص) بندے کو عطا کیا جائے گا اور مجھے اُمید ہے کہ وہ بندہ میں ہی ہوں۔ اور جو کوئی میرے لئے مقامِ وسیلہ مانگے گا' تو اس کے لئے میری شفاعت واجب ہوگئی۔''

درود و سلام معرفتِ مصطفیٰ ﷺ کا باعث: اعمالِ صالحہ' نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' صدقات وخیرات سے بھی بڑھ کر ایک اور عمل دوست کی حیثیت سے قبر میں ہمارا محافظ بنے گا اور وہ عمل حضور ﷺ پر کثرت سے درود و سلام بھیجنا ہے۔ بقیہ اعمال نے تو فرشتوں کو قریب آنے سے روکنا ہے اور اس عمل نے اس سوال مَا تَقُولُ فِي حَقِّ هٰذَا الرَّجُلِ (اس شخصیت کے بارے میں تو کیا کہا کرتا تھا؟) کا جواب ہمیں عطا کرتا ہے یعنی معرفتِ مصطفیٰ ﷺ ہمیں عطا کرنی ہے کہ جب حضور ﷺ ہمارے سامنے ہوں گے تو یہ عمل ہمیں آپ علیہ السلام کو پہچاننے میں معاونت کرے گا۔ ذرا سوچئے! اُس شخص کا کیا حال ہوگا کہ جس کے پاس اس عملِ درود و سلام کی قلّت ہوگی' عشق و محبتِ مصطفیٰ کی کمی ہوگی اور وہ قبر میں حضور ﷺ کی پہچان نہ کر سکے گا۔ (العیاذ باللہ)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر صلوٰۃ و سلام بھیجنے کی اہمیت پر چند احادیث مبارکہ

(۱) عَنْ طَلْحَةَ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ جَاءَ ذَاتَ يَوْمٍ وَالْبِشْرُ يُرَى فِي وَجْهِهِ فَقَالَ: إِنَّهُ جَاءَنِي جِبْرِيلُ فَقَالَ: أَمَا يُرْضِيكَ يَا مُحَمَّدُ! أَنْ لَا يُصَلِّيَ عَلَيْكَ أَحَدٌ مِنْ أُمَّتِكَ إِلَّا صَلَّيْتُ عَلَيْهِ عَشْرًا وَلَا يُسَلِّمُ عَلَيْكَ أَحَدٌ مِنْ أُمَّتِكَ إِلَّا سَلَّمْتُ عَلَيْهِ عَشْرًا (سنن نسائی: باب السھو)

رکھتا ہے کہ میں اور زیادہ دوں ۔ ہرگز (ایسا) نہ ہوگا' بیشک وہ ہماری آیتوں کا دشمن رہا ہے ۔ عنقریب میں اُسے سخت مشقت (کے عذاب) کی تکلیف دوں گا ۔ بے شک اُس نے سوچ بچار کی اور (دل میں) ایک تجویز مقرر کرلی ۔ اُس پر اللہ کی مار (یعنی لعنت) ہو کہ اُس نے کیسی تجویز کی ۔ اس پر پھر (اللہ کی مار) (یعنی لعنت) ہو اور اُس نے کیسی تجویز کی ۔ پھر اُس نے (اپنی تجویز پر دوبارہ) غور کیا ۔ پھر تیوری چڑھائی اور منہ بگاڑا ۔ پھر (حق سے) پیٹھ پھیر لی اور تکبر کیا ۔ پھر کہنے لگا کہ یہ (قرآن) جادو کے سوا کچھ نہیں جو (اگلے جادوگروں سے) نقل ہوتا چلا آرہا ہے ۔ یہ (قرآن) سوائے انسان کے کلام کے (اور کچھ نہیں) ۔ میں عنقریب اُسے دوزخ میں جھونک دوں گا اور آپ کو کس نے بتایا ہے کہ سقر کیا ہے ۔ وہ (ایسی آگ ہے جو) نہ باقی رکھتی ہے اور نہ چھوڑتی ہے ۔ وہ (جسمانی) کھال کو جھلسا کر سیاہ کر دینے والی ہے ۔ اُس پر اُنیس (۱۹ فرشتے داروغے مقرر) ہیں ۔'' (۱۱ تا ۳۰ : ۷۴)

یہ آیات ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئیں جو ملکِ عرب کا مالدار اور خوشحال آدمی تھا' کٹر قسم کا بُت پرست اور نبی آخرالزماں ﷺ کا پکا دشمن تھا ۔ تبلیغ اسلام کے آغاز ہی سے اُس نے مبلّغِ اسلام ﷺ کو گالیاں بکنے' اُنہیں اذیت دینے' اُن کے مشن کو ناکام بنانے اور آپ کے صحابہ کو تکالیف دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی ۔ اِن مندرجہ بالا آیات میں ربّ ذوالجلال والاکرام ولید کے خلاف سخت غصّے اور بیزاری کا اظہار فرما رہا ہے اور اس الٰہی غصّے کا سبب آیت ۱۸ میں بیان ہوا (کہ اُس نے سوچ بچار کی اور ایک تجویز مقرر کرلی) جس کی تفصیل نیچے آرہی ہے ۔

کفارِ مکّہ اسلام کی روز افزوں ترقی سے بہت پریشان تھے اور پیغمبر علیہ السلام کے مشن کو روکنے کے طور طریقوں پر غور کرنے کے لئے حج کے موسم میں دارالندوہ میں اُنہوں نے ایک میٹنگ منعقد کی تا کہ اِس ''نئے مذہب'' سے متعلق کسی متفقہ فیصلہ تک پہنچا جا سکے اور عوام الناس کو اس مشن کی ''حقیقت'' سے باخبر کیا جا سکے ۔ ولید نے ہی گفتگو کا آغاز کیا اور لوگوں کو اس مجلس کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کیا ۔ اُس نے کہا کہ ہمیں چاہئے کہ ہم سب ایک بات پر متفق ہو جائیں اور جو شخص بھی اُن کے بارے میں پوچھے' سب کا جواب ایک ہی ہو ۔ چنانچہ بعض لوگوں نے کاہن کا لفظ تجویز کیا ۔ ولید بولا : بخدا! وہ کاہن نہیں ۔ کاہنوں کے بے جوڑ' بے ربط فقرے میں نے بارہا سنے ہیں ۔ قرآن کو بھلا اُن سے کیا نسبت؟ کچھ لوگ کہنے لگے کہ انہیں مجنون (دیوانہ) کہنا چاہئے ۔ ولید نے اس کی بھی تردید کی اور کہا اگر تم نے ایسی بیہودہ بات کی تو لوگ تمہارا مذاق اڑائیں گے ۔ کچھ نے کہا کہ ان کے لئے مناسب لفظ شاعر ہے ۔ ولید سے نہ رہا گیا ۔ کہنے لگا : تم شعر کی تمام اَصناف سے واقف ہو ۔ کیا قرآن کی کسی آیت پر ان میں سے کسی صنف کا اطلاق ہو سکتا ہے ۔ جو لوگ اب تک گفتگو میں شریک نہیں ہوئے تھے' وہ کہنے لگے اور کوئی لفظ اُن کے لئے موزوں نہیں ۔ البتہ ہم اُنہیں بڑے اطمینان سے ساحر کہہ سکتے ہیں ۔ ولید نے کہا : دوستو! جادوگروں کی غلیظ زندگی اور ناپاک کردار کو بھلا مکارم اخلاق کے اِس حسین و جمیل پیکر سے کوئی نسبت ہو سکتی ہے؟ ان الفاظ میں سے کوئی لفظ بھی اگر تم نے استعمال کیا تو بیرونی مہمان تم پر بدگمان ہو جائیں گے اور اُسے جھوٹی تہمت خیال کریں گے ۔ پھر وہ کہنے لگا :

وَاِنَّ لَه' لَحَلاَوَة'' وَاِنَّ عَلَيْهِ لَطَلاَوَة'' وَاِنَّ اَعْلاَهُ لَمُثْمِر'' وَاِنَّ اَسْفَلَه' لَمُغْدِق'' وَاِنَّه' لَيَعْلُوْا وَلَا يُعْلٰی عَلَيْهِ

''بخدا! اس کلام میں بڑی مٹھاس ہے' اُس کی جڑیں بہت گہری ہیں' اُس کی ٹہنیاں پھلوں سے لدی ہوئی ہیں' اس کا نچلا حصّہ سدا بہار ہے' یہ ہر ایک سے اونچا ہے اور کوئی اس سے اونچا نہیں ہو سکتا۔''

ولید یہ کہہ کر مجلس سے اٹھ کر گھر چلا گیا۔ مجمع میں شور مچ گیا کہ ولید صابی ہو گیا۔ ابو جہل نے کہا: ٹھہرو' یہ مشکل میں حل کر دیتا ہوں۔ چنانچہ بڑی افسردہ شکل بنا کر اُس کے پاس گیا۔ ولید نے پوچھا: خیر تو ہے؟ بڑے غمگین نظر آ رہے ہو۔ ابو جہل نے کہا: اب غمزدہ ہونے کے بغیر چارہ ہی کیا ہے؟ قریش کے لوگ تیرے لئے گھر گھر سے چندہ جمع کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ولید بھوکا ہو گیا ہے' اس لئے (حضور کا اسمِ گرامی لے کر) اُس کی طرف اور ابو بکر کی طرف راغب ہو گیا ہے تا کہ وہ اُس کی مالی امداد کریں۔ ولید فوراً مشتعل ہو گیا۔ کہنے لگا: لات وعزیٰ کی قسم! میرے جیسا رئیسِ اعظم محمد (ﷺ) اور ابو بکر کے ٹکڑوں کا محتاج نہیں ہو سکتا۔ لیکن اُن کے بارے میں جو الفاظ تم کہتے ہو وہ غلط ہیں۔ پھر بڑے غور سے سوچنے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا بحرِ فکر میں غوطہ زنی کر رہا ہے تا کہ آپ کے لئے کوئی موزوں لفظ نکالے۔ کافی دیر تک اسی حالت میں رہا اور آخر کار کہنے لگا کہ ہم اُسے ساحر کہہ سکتے ہیں کیونکہ اُس نے بھائی کو بھائی سے اور بیٹے کو باپ سے جدا کر دیا ہے۔

اب ذرا اِن آیات کو گہری نظر سے دیکھیں۔ ایسے شخص کی جو تصویر کشی کی گئی ہے' یہ بھی اپنے اندر ایک اعجازی شان رکھتی ہے۔

وہ اس بارے میں غور وفکر کرنے لگا کہ اس نبی مکرم کے لئے کون سا لفظ تجویز کیا جائے۔ کاہن' مجنون' شاعر یا ساحر؟ طویل غور وخوض کے بعد اُس نے طے کر لیا کہ اُنہیں ساحر کہنا درست ہے۔ ایسی سمجھ اور ایسی عقل پر پھٹکار کہ کتاب کی خوبیوں کو پوری طرح جاننے اور صاحبِ کتاب ﷺ کے مکارمِ اخلاق کو تسلیم کرنے کے باوجود وہ ایسا لفظ منہ سے نکالنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

آخری اعلان سے پہلے وہ ایک مرتبہ پھر رعونت کا مجسمہ نظر آتا ہے' اُس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں' پھر وہ منہ بسورتا ہے' چہرے کو کرخت بناتا ہے' پھر غرور وتکبر سے منہ پھیر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ جادو ہے اور اس کتاب کا لانے والا جادوگر ہے۔ پھر لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے کہتا ہے کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں۔ اس کا رواج قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ ہر زمانے کے جادوگر اپنے شاگردوں کو اس کی تعلیم دیتے آئے ہیں اور یوں ہی یہ سلسلہ جاری رہا ہے۔ اُنہیں بھی کسی بڑے جادوگر نے یہ چیزیں سکھا دی ہیں اور گھر گھر میں جو انتشار وافتراق پیدا ہو گیا ہے' وہ اسی جادو کا کرشمہ ہے۔

فرمایا جا رہا ہے کہ اس پر ہم نے اتنے احسانات کئے' اولاد دی' بے حد و بے حساب دولت دی' عزت و سرداری بخشی اور اتنی لمبی عمر عطا فرمائی اور وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ نہ آپ ساحر ہیں اور نہ یہ کلام سحر ہے لیکن محض اپنے جھوٹے نام و نمود کے لئے اور چند روزہ سرداری کے لئے وہ ایسا ناپاک الزام میرے پاک نبی پر لگا رہا ہے۔ ایسے نابکار کو ہم ضرور دوزخ کا ایندھن بنا دیں گے۔ وہ دوزخ ایسی ہے کہ دوزخیوں کو نہ تو زندہ رہنے دیتی ہے اور نہ اُنہیں جلا کر فنا کر دیتی ہے۔ جل کر کوئلہ ہوتے ہیں اور عذاب جھیلنے کے لئے ہم پھر اُنہیں زندہ کر دیتے ہیں۔

ہم نے اس کشادہ اور وسیع دوزخ کی حفاظت کے لئے اُنیس داروغے مقرر کئے ہیں۔ کفار نے جب یہ آیت سنی تو بڑے زور سے قہقہے لگانے لگے۔ اس نبی کے خدا کی فوج بس یہی کچھ ہے۔ ہم تو سمجھے تھے کہ بے شمار لشکر ہوگا جو دوزخ کو چاروں طرف سے گھیرے کھڑا ہوگا اور اُن کی گرفت سے بچ کر نکلنے کی کسی میں ہمت نہ ہوگی۔ کیا حقیقت ہے اِن اُنیس کی؟ کفار کا مجمع لگا تھا۔ یہی بات موضوعِ بحث بنی ہوئی تھی۔ ہر شخص چٹخارے لے لے کر نکتہ آفرینیاں کر رہا تھا۔ ابوجہل کہنے لگا: دوستو! تم نے سن لیا اِس نبی کے خدا کی فوج صرف اُنیس سپاہیوں پر مشتمل ہے۔ کیا ہم دس دس مل کر بھی ایک کو پکڑ کر اُس کا کچومر نہ نکال دیں گے؟ ابن اُسید الجمحی جو اپنے قبیلہ بنی جمح کا زور آور پہلوان تھا' وہ بھی وہاں موجود تھا۔ کہنے لگا: ابوجہل جی مہاراج! اُن میں سے سترہ کو تو میں اکیلا کافی ہوں۔ باقی رہے دو تو آپ سب مل کر اُن دو کو سنبھال لینا۔ اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ اے بیوقوفو! وہ تمہاری طرح بشر نہیں' وہ گوشت پوست کے آدمی نہیں کہ دس دس یا سولہ مل کر اُنہیں پچھاڑ دیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں جن کی قوت و طاقت کا تم تصوّر نہیں کر سکتے۔ اگر تمہیں کچھ غلط فہمی ہو تو عاد و ثمود اور سدوم و عمورہ سے پوچھو۔ وہ تمہیں اُن کی قوّت کے بارے میں بتا دیں گے۔

جہنم کے داروغوں کی یہ تعداد بیان کرنے میں کیا حکمت ہے؟ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سن کر کفار نے اودھم مچا دیا اور رسول ﷺ کو ہدفِ تنقید و استہزاء بنا دیا۔ اس لئے اس کی حکمت بتائی جا رہی ہے کہ جن کے دلوں میں کفر بھرا ہوا ہے اور وہ کسی مصلحت کے باعث ظاہر نہیں کر رہے تو وہ کفر بھی کھل کر سامنے آ جائے۔ نیز یہ کہ اہلِ کتاب کو بھی یقین آ جائے کہ واقعی یہ اللہ کا رسول ہے اور اپنے رب کا فرمان ہی سنا رہا ہے۔ مسلمان تو پہلے ہی سے نورِ ایمان سے مشرف ہیں اور وہ بے حیل و حجت' شرحِ صدر کے ساتھ اس عدد کو تسلیم کر لیں گے۔ اس طرح اُن کے ایمان اور قوّتِ ایمان دونوں میں اضافہ ہو جائے گا۔ مسلمانوں کے ایمان میں اضافہ کی بات تو واضح ہے لیکن اہلِ کتاب کو اس سے کیسے یقین آ گیا۔ اس کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض کی رائے ہے کہ اہلِ کتاب کی کتب میں اُن کی یہی تعداد مذکور ہے۔ اس بارے میں یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ اہلِ کتاب کی کتب کی ورق گردانی کے باوجود یہ کہیں نہیں ملا کہ اُن کے نزدیک بھی دوزخ کے داروغوں کی تعداد اُنیس ہے۔ اس بارے میں عرض ہے کہ اہلِ کتاب کی کتب میں تحریف و تبدّل کا سلسلہ مدتوں جاری رہا۔ ہو سکتا ہے یہ عدد کسی تحریف کی زد میں آ گیا ہو اور آپ کو نہ ملا ہو۔ دوسرا شبہ یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اگر اُنیس کا عدد اُن کی کتب میں مل

بھی جائے تو اس سے بھی اُن کے یقین میں اضافہ کی کوئی صورت نہیں۔ وہ تو الٹا یہ کہہ دیں گے کہ آپ نے ہماری کتابوں سے نقل کیا ہے۔ اس کے لئے گزارش ہے کہ تمام اہلِ کتاب تو ہٹ دھرم اور متعصب نہیں' اُن میں کئی حق پسند بھی تو ہوں گے۔ وہ تو یہ جانتے ہیں کہ اس نبی کریم نے عبرانی کتب کا مطالعہ تو کجا اپنی مادری زبان میں بھی ابجد شناسی تک نہیں سیکھی' چہ جائیکہ وہ عبرانی کتب سے اخذ کر کے قرآن مرتب کرتے رہے ہوں۔ باقی رہے متعصب تو ایسے لوگوں کے حصہ میں ہدایت لکھی ہی نہیں' اُن کا کیا ذکر۔''

''ایک اور توجیہ بھی کی گئی ہے کہ اہلِ کتاب نے دیکھا کہ یہ تعداد سن کر کفار نے وہ اودھم مچایا کہ الامان والحفیظ۔ لیکن حضور علیہ السلام نے اُن کی اس مخالفت اور استہزاء کو کوئی اہمیت نہ دی اور اُسی وثوق سے قرآن کا پیغام پہنچایا تو اُنہیں یقین آ گیا کہ مخالفت کے طوفانوں میں حق بات کہنا اور کہتے رہنا صرف پیغمبرانہ شیوہ ہے اور عام آدمی کے بس کا روگ نہیں۔'' (ضیاء القرآن' جلد پنجم' صفحات ۴۲۱' ۴۲۲)

آیت ۱۱ کے لفظ وَحِیۡدًا کے دو مطالب ہو سکتے ہیں: (۱) میں نے اُسے کسی کی مدد کے بغیر تنہا پیدا کیا ہے اور مجھے اُس کو ہلاک کرنے کے لئے کسی دوسرے کی مدد کی ضرورت نہیں۔ (۲) اُسے میں نے اس حالت میں پیدا کیا ہے کہ وہ تنہا تھا۔ نہ اُس کے پاس مال تھا' نہ دولت' نہ زمین' نہ باغات' نہ اس کے پاس کوئی بیٹا تھا اور نہ کوئی ملازم۔ اب ہم نے اُس پر یہ احسان کیا کہ اُسے اتنا مال دے دیا جو ختم ہونے میں نہیں آتا۔ ایک روایت کے مطابق دس اور بہ روایت آخر اُس کے بارہ بیٹے تھے جو کسبِ رزق سے مستغنی تھے۔ تجارت و کاروبار کے لئے اُنہیں دُور دراز ملکوں کی خاک چھاننا نہیں پڑتی تھی۔ کھیتی باڑی میں سارا سارا دن مصروف نہیں رہتے بلکہ تمام ضروریات سے بے نیاز ہو کر ہر وقت اپنے باپ کے پاس حاضر رہتے ہیں۔ شُھُوۡد کا معنیٰ معروف ومشہور بھی کیا گیا ہے یعنی باپ کی طرح وہ نامور اور معزز ہیں۔ لوگ اپنی حاجات میں اُن کے پاس بھی حاضر ہوتے رہتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی گستاخی کرنے کی پاداش میں ولید کا کاروبار ماند پڑ گیا۔ زراعت و تجارت کی ترقی رک گئی اور خسارے کا چکر چلنے لگا۔

آیت ۱۷ میں فرمایا ہم اُسے جبراً حکم دیں گے کہ وہ جہنم کے اُس پھسلواں پہاڑ پر چڑھے جس کا نام صَعود ہے۔ جان جوکھوں میں ڈال کر جب وہ چوٹی کے قریب پہنچے گا تو اُس کا پاؤں پھسل جائے گا اور وہ دھڑام سے نیچے آ گرے گا۔ پھر اُسے اسی طرح اوپر چڑھنے کا حکم ملے گا تو اُسے مجالِ انکار نہ ہوگی۔ تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا معنیٰ یہ بتایا کہ ہم اُسے ایک ایسے عذاب کی مشقتوں میں مبتلا کر دیں گے جس میں اُسے پَل بھر کے لئے بھی آرام نصیب نہ ہوگا۔

۱۱ تا ۳۰ تک کی آیات نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اعزاز و اکرام اور ولید بن مغیرہ کی مذمت میں نازل ہوئی جس نے نبی برحق ﷺ کے لئے ''ساحر'' کا لقب تجویز کیا تھا۔

(122) وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا○ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا○ (الفرقان: ۳۲،۳۳)

''اور کافر کہتے ہیں کہ اس (رسول) پر قرآن ایک ہی بار (یکجا کر کے) کیوں نہیں اتارا گیا۔ یوں (تھوڑا تھوڑا کر کے اُسے تدریجاً اس لئے اتارا گیا ہے) تا کہ ہم اس سے آپ کے قلب (اطہر) کو قوّت بخشیں اور (اسی وجہ سے) ہم نے اُسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھا ہے (تا کہ آپ کو ہمارے پیغام کے ذریعے بار بار سکونِ قلب ملتا رہے)۔ اور یہ (کفار) آپ کے پاس کوئی (ایسی) مثال (سوال اور اعتراض کے طور پر) نہیں لاتے مگر ہم آپ کے پاس (اس کے جواب میں) حق اور (اس سے) بہتر وضاحت کا بیان لاتے ہیں۔'' (۳۲، ۳۳ : ۲۵)

یہ آیات بھی امام القبلتین ﷺ کے اعزاز و اکرام اور اُن کے ارفع منصب کی روشن گری کے لئے نازل ہوئیں۔ قرآن مجید کے کلامِ الٰہی ہونے پر مخالفین کا یہ اعتراض بھی تھا کہ یہ بہ یک وقت ایک مرتب اور مدوّن کتاب کی صورت میں کیوں نہیں اترا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحب اُسے خود تصنیف کرتے ہیں یا اُن کے معاون لوگ اُنہیں سکھاتے ہیں۔ جس قدر یہ خود بناتے ہیں یا اُن سے سیکھتے ہیں' اُسی قدر آ کر سنا دیتے ہیں۔

چنانچہ ایک ہی جملہ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا میں قرآن کو تدریجاً نازل کرنے کی کئی حکمتیں بیان فرما دیں:

(۱) تا کہ لوحِ قلب پر وہ اچھی طرح نقش ہو جائے۔

(۲) ہر آیت کا مفہوم خوب ذہن نشین ہو جائے۔

(۳) ضرورت کے مطابق قرآن کا نزول ہونے سے دلالاتِ لفظیہ کے ساتھ جب قرائنِ حالیہ بھی مل جائیں تو آیات کا مفہوم اور مصداق زیادہ واضح ہو جائے۔

(۴) ہر موقع پر جب وحیِ الٰہی اُترے گی تو دل کو اطمینان رہے گا کہ جس خالق نے مجھے اس کارِ عظیم کو سرانجام دینے کے لئے مقرر فرمایا ہے' اُس کی نظرِ عنایت ہر وقت میرے شاملِ حال رہتی ہے۔

(۵) چونکہ قرآن مجید ایک دستورِ حیات ہے اس لئے اُسے تدریجاً نافذ کرنا ہی مناسب ہے تا کہ اُسے اپنانے میں آسانی ہو۔ اگر کسی قوم کو اپنے تمام اطوار و رسوم کو یک بارگی ترک کر کے بالکل جدید دستورِ حیات اپنانے کا حکم دیا جائے تو اس کے لئے بڑا مشکل ہو جاتا ہے لیکن اگر آہستہ آہستہ احکام نازل ہوں تو اس طرح اُن پر عمل کرنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

اس سے اگلی آیت (۳۳) میں فرمایا کہ (اے حبیبِ محتشم!) کہ جب بھی مخالفینِ قرآن آپ پر کوئی اعتراض کریں گے تو ہم آپ کو اُس کا صحیح اور دندان شکن جواب سکھا دیں گے اور اُس کی ایسی وضاحت فرما دیں گے کہ پھر اُنہیں مجالِ شک نہ رہے گی۔ (ضیاء القرآن' جلد سوم' صفحات ۳۶۳' ۳۶۴)

(123) قُلْ اِنَّمَا اَنَابَشَر" مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ" وَّاحِد" (الکھف:۱۱۰، فُصّلت:۶)
''فرما دیجئے: میں تو صرف (خلقتِ ظاہری) بشر ہونے میں تمہاری مِثل ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے، وہ یہ کہ تمہارا معبود، معبودِ یکتا ہے۔'' (۱۸:۱۱۰ ؛ ۶ : ۴۱)

اس آیت سے بعض لوگوں کو یہ دھوکہ ہوا ہے کہ نبی علیہ السلام (معاذ اللہ) ہمارے جیسے ہیں جس کی ایک وجہ تو عربی زبان سے اُن کی ناواقفیت ہے، یا پھر دشمنِ رسول سے سنی سنائی بے بنیاد اور لغو باتوں پر اُنہوں نے یقین کر کے بات کو آگے پھیلا دیا ہے۔ کیا صحابہ کرام کے پیشِ نظر یہ آیت نہیں تھی اور کیا اُن کا اس پر ایمان نہ تھا لیکن کبھی بھی اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے جیسا کہنے کی گستاخی نہیں کی ☆۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سورہ ھُود کی آیت ۲۷، سورہ اِبراھیم کی آیت ۱۰ اور سورۃ المؤمنون کی آیت ۳۳ کی رُو سے رسول کو اپنے جیسا بشر کہنے کی رَٹ لگانا ہمیشہ سے کفار اور مخالفینِ انبیاء علیہم السلام کا شیوہ رہا ہے۔

''بَشَرَہ نام ہے چہرے اور اُس سطح اور جِلد کا جس پر بال اُگتے ہیں۔'' (E.W. Lane's Arabic English Lexicon, part 1, p. 207)

اَلْبَشَرُ ظَاهِرُ جِلْدِ الْاِنْسَانِ (القاموس المحیط لمجد الدین فیروز آبادی، ج ۱، ص ۳۷۲)
یعنی ''انسان کی ظاہری جسمانی جِلد کا نام بشر ہے۔''

لفظِ بَشَر کے یہ معنیٰ پیشِ نظر ہونے سے اب آیت کا مفہوم روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ اے دشمنانِ اسلام! بظاہر میرے جسم، اُس کے گوشت پوست اور اُس میں اعضاء کی تعداد کے حوالے سے میں تمہارے جیسا ہوں اور مجھ میں اور تم میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن میری حقیقت اس کے برعکس ہے جسے میرے رب کے سوا کوئی بھی تو نہیں جانتا جیسا کہ فرمایا: لَمْ يَعْرِفْ حَقِيْقَتِيْ غَيْرُ رَبِّيْ (میرے رب کے سوا میری حقیقت کو کسی نے نہیں جانا)۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن مجید جس نے آپ والا صفات کو جبریل و میکائیل جیسے مقرب فرشتوں سے بھی بلند مقام عطا کیا ہو، آپ کے مرتبہ و مقام کو عام انسان جیسا بنا دے!!

سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۲ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ازواجِ مطہرات سے فرمایا گیا: ''اے نبی کی ازواج! تم عورتوں میں سے کسی ایک کی بھی مِثل نہیں ہو۔'' تو جب نبی کی ازواج کسی بھی عورت کی مثل نہیں ہیں تو اُن کا سرتاج ﷺ جو اُن کی فضیلت اور فوقیت کا سبب ہے، دوسرے عام لوگوں کی طرح کیسے ہو سکتا ہے!

☆ ہم اِن بے ادبوں اور گستاخانِ رسول سے یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ بہ فرضِ محال اگر تمہارا یہ دعویٰ درست ہے کہ پیغمبر ہمارے جیسا ہے تو ذرا تم بھی چاند کو دولخت اور سورج کو پلٹا کے دکھا دو۔ سچ ہے کہ ہدایت دینا رب کے ہاتھ میں ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ (۱) ہندوستان کے شہرہ آفاق مذہبی سکالر شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک آیت إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ از قبیلِ متشابہات ہے۔ (۲) قرآن میں جہاں کہیں بھی إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ آیا تو اُس سے متصل ہی يُوحَىٰ إِلَيَّ کے الفاظ لائے گئے۔ تو گویا نزولِ وحی اور عدمِ نزولِ وحی کے مابین فرق کو طشت از بام کر دیا۔ يُوحَىٰ إِلَيَّ کا مطلب ہی یہی ہے کہ میرا اپنے خالق و مالک کے ساتھ تعلق بذریعہ وحی براہِ راست ہے جبکہ دیگر لوگوں کا اُس کے ساتھ تعلق بالواسطہ اور بواسطہ رسول ہے تو چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک! (۳) نبی علیہ السلام کو یہ حکم از راہِ تواضع دیا جا رہا ہے اور کسی دوسرے شخص کے لئے ایسا کہنا مناسب نہیں کیونکہ جیسا کہ بیان ہوا نبی یا رسول کو اپنے جیسا کہنا ہمیشہ کفار کا شیوہ رہا ہے جو رسول کے حق میں بڑی بے ادبی اور گستاخی ہے۔

جناب ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا حوالہ دیتے ہوئے قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے آیت کی تفسیر یوں کی ہے:

عَلَّمَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَزَّوَجَلَّ رَسُوْلَهٗ ﷺ اَلتَّوَاضُعَ لِئَلَّا يُزْهِيَ عَلٰى خَلْقِهٖ (تفسیر مظہری)

''اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر نے اپنے رسول ﷺ کو متواضع اور حلیم و بُردبار رہنے اور اُس کی مخلوق سے خود نمانہ ہونے کا حکم دیا ہے۔''

بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو خود انبیاء علیہم السلام اپنے لئے استعمال کر سکتے ہیں لیکن اگر ہم اُن الفاظ کو استعمال کریں تو یہ اُن مقدّس ہستیوں کے بارے میں صریحاً گستاخی اور بے ادبی ہوگی۔ مثلاً:

(۱) آدم علیہ السلام سے جنت سے زمین کو تشریف لانے کے بعد باری تعالیٰ سے انہوں نے عرض کیا تھا: رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا (سورۃ الاعراف: ۲۳) (اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا)۔

(۲) جناب یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں رب تعالیٰ سے فریاد میں عرض کیا تھا: إِنِّي كُنتُ مِنَ الظَّالِمِينَ (سورۃ الانبیاء: ۸۷) (بیشک میں ہی اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہوں)۔ لیکن اگر ہم ان مقدّس اور معصوم ہستیوں کے لئے ظالم کا لفظ استعمال کریں تو گستاخ کہلائیں گے جو پیغمبر کے حوالے سے یقیناً کفر ہے۔

(۳) جناب موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کو قتل کرنے کے بعد کہا تھا: فَعَلْتُهَا إِذًا وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ (سورۃ الشعراء: ۲۰) جب میں نے وہ کام کیا تو میں ضالّین میں سے تھا (کہ ایک گھونسے سے اُس کی موت واقع ہو سکتی ہے)۔

ظالم اور ضال کے الفاظ پیغمبروں نے اپنے لئے از راہِ تواضع اور فروتنی (منکسر المزاجی) استعمال فرمائے ہیں اور اگر ہم اُن مقرّب و مقدّس ہستیوں کے لئے یہ الفاظ استعمال کریں تو یہ صریحاً گستاخی اور بے ادبی ہوگی اور اُسی وقت ایمان رخصت ہو جائے گا۔

کچھ مفسرین کرام کے نزدیک یہ آیت عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث کے ردّ میں نازل ہوئی۔ اپنے پیغمبر

عیسیٰ علیہ السلام کے تین یا چار معجزوں سے متاثر ہو کر عیسائیوں نے اُن کی طرف الوہیت منسوب کر دی۔ لیکن یہاں تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو رب تعالیٰ نے متعدّد معجزات سے نوازا ہے جس سے یہ خدشہ ہو سکتا تھا کہ عیسائیوں کی پیروی میں کہیں خاتم الانبیاء کو وہی درجہ الوہیت نہ دے دیا جائے۔ اس لئے اسی مصلحت کے تحت پیغمبر علیہ السلام کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا گیا کہ آپ فرما دیں : اِنَّمَا اَنَابَشَر" مِّثْلُکُمْ (میں تمہارے جیسا بشر ہوں)۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ بَشَر" مِّثْلُکُمْ فرمایا گیا ہے نہ کہ اِنْسَان" مِّثْلُکُمْ جس کا صاف مطلب یہی ہے کہ (۱) یہ مماثلت ظاہری شکل و صورت میں ہے (۲) میرا پیغمبر اور تم سب ایک خدائے واحد کی مخلوق ہو۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بشریت بالکل حق اور نا قابلِ تردید حقیقت ہے اور اس کی تردید کرنا صریحًا کفر ہے۔ (۲) آپ کی بشریت اتنے اعلیٰ وارفع مرتبہ کی ہے کہ کروڑوں' اربوں بشریتیں آپ کی بشریت کی قربان گاہ پر قربان جائیں۔ (۳) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نزولِ وحی نے آپ ﷺ اور آپ کی اُمّت کے درمیان ایک واضح حدّ فاصل قائم کر دی ہے۔

لیکن ہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ ایک سچے مسلمان کا زور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بشریت پر ایمان لانے کے عقیدہ کے ساتھ ساتھ اُن کی اکملیت اور افضلیت کے پہلو پر زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں ہی صدّیقیت اور بوجہلیّت کے مابین فرق دکھائی دیتا ہے۔ جناب صدّیق اکبر رضی اللہ عنہ کا تمام زورِ بیان نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اکملیت و افضلیت پر ہوتا تھا جبکہ ابوجہل آپ ﷺ کے اکملیت اور افضلیت کے پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے آپ کی بشریت پر زور دیتا تھا۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اکملیت و افضلیت کے پہلو کا انکار بھی اسی طرح کفر ہے جیسا کہ آپ کی بشریت کا انکار کفر ہے۔

روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مسلسل روزے رکھنے کی اتباع میں آپ کے صحابہ کرام نے بھی بغیر کسی وقفہ کے مسلسل روزے رکھنے شروع کر دئے۔ تو اس موقع پر نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: اَیُّکُمْ مِّثْلِیْ؟ اَبِیْتُ وَھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِیْ "تم میں سے کون مجھ جیسا ہے؟ میں تو رات اس حال میں گزارتا ہوں کہ میرا پروردگار مجھے کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے۔"

محمد رّسول اللہ ﷺ کی تخصیصات : (۱) ہماری نیند ہمارے وضو کو توڑ ڈالتی ہے جبکہ نبی علیہ السلام کی نیند آپ کے وضو کو نہیں توڑتی کیونکہ بروئے حدیث آپ کی آنکھیں سوتی ہیں اور دل نہیں سوتا تو وضو ٹوٹے تو کیسے ٹوٹے؟

(۲) اُمت کے لئے اسلام کے پانچ ارکان ہیں یعنی کلمہ طیبہ' نماز' زکوٰۃ' روزہ اور حج جبکہ نبی علیہ السلام

کے لئے چار ارکان ہیں کیونکہ زکوٰۃ آپ پر فرض نہیں (شامی: کتاب الزکوٰۃ)۔

(۳) اُمت پر پانچ نمازیں فرض ہیں جبکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بہ شمول نماز تہجد چھ نمازیں فرض ہیں (بحوالہ سورہ بنی اسرائیل: آیت ۷۹)۔

(۴) افرادِ اُمت کو کچھ شرائط کے تحت چار تک کی شادیوں کی اجازت ہے جیسا کہ سورۃ النّساء کی آیات ۳ اور ۱۲۹ میں آیا۔ لیکن نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے ایسی کوئی حد بندی نہیں کی گئی اور سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۰ کی رُو سے آپ جتنے نکاح چاہیں کر سکتے ہیں۔

(۵) ہماری بیویاں ہماری وفات کے بعد جس آدمی سے چاہیں نکاح کر سکتی ہیں۔ لیکن مسلمان کے لئے نبی علیہ السلام کی کسی زوجہ سے نکاح کرنا حرام ہے☆ کیونکہ وہ مسلمانوں کی مائیں ہیں (سورۃ الاحزاب: ۵۳، ۶)۔

(۶) ہمارے مرنے کے بعد ہماری میراث وارثوں میں تقسیم ہو جاتی ہے لیکن چونکہ نبی اپنے پیچھے کوئی ترکہ نہیں چھوڑتا' اس لئے اس کی تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۷) نبی علیہ السلام کا بول و براز آپ کی اُمت کے لئے پاک و مطہّر ہے (فتاویٰ شامی: باب الانجاس) جبکہ ہمارا بول و براز پلید اور حرام ہے۔

(۸) ہمارا کلمہ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے جبکہ نبی علیہ السلام کا کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ ہے۔

(۹) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایمان بصری و عینی (Visual) ہے جبکہ ہمارا ایمان سمعیاتی (Audio) ہے جسے پیغمبر علیہ السلام کی وساطت سے ہم میں پیدا کیا گیا۔

(۱۰) پیغمبر علیہ السلام کا اپنے خالق سے براہِ راست تعلق ہے جبکہ اللہ سے ہمارا تعلق بالواسطہ اور پیغمبر کے ذریعہ سے ہے۔

(۱۱) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لاتعداد معجزات ہیں جبکہ ہم گنہگاروں کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جس کا دعویٰ کیا جا سکے۔ اگر ہمارے گناہ بخش دئے گئے تو یہ ہمارے خالق و مالک کی شانِ کریمی کا بڑا اظہار ہوگا۔

(۱۲) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہماری کبھی بھی ضرورت نہیں بلکہ ہمیں اُن کی ضرورت ہے کہ بروزِ قیامت ہم اُن کی شفاعت کے امیدوار ہیں۔

اِن روشن تفاوتوں کے پیشِ نظر یہ تصور تک نہیں کیا جا سکتا کہ (معاذ اللہ) آپ ہمارے جیسے ہیں۔

اور پھر یہ بات کتنی روح پرور ہے کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے قرآن مجید میں نبی آخر الزماں ﷺ کے ہر جسمانی عضو کا ذکر کیا ہے جبکہ انبیائے سابقہ میں سے کسی بھی نبی کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

☆ اسی سے حیات النبی ثابت ہوگئی کیونکہ کسی زندہ شخص کی منکوحہ سے کوئی اور شخص نکاح نہیں کر سکتا۔

۴۴۲۸) محمد ﷺ (Mohammad

آپ کا قلبِ مبارک : نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ O عَلٰى قَلْبِكَ (الشعراء: ۱۹۳، ۱۹۴)
''اس (قرآن) کو جبریلِ امین نے آپ کے قلب پر اتارا ہے۔(۱۹۳، ۱۹۴:۲۶)

آپ کی زبان مبارک : فَاِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ (مریم: ۹۷، اَلدُّخان : ۵۸)
''سو بیشک ہم نے اس (قرآن) کو آپ کی زبان میں ہی آسان کر دیا ہے۔''

آپ کی آنکھ/آنکھیں مبارک : (۱) مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى O (اَلنَّجم : ۱۷)
''اُن کی آنکھ نہ کسی اور طرف مائل ہوئی اور نہ حد سے بڑھی۔''(۵۳:۱۷)
(۲) لَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ (الکہف : ۲۸)
''آپ کی (محبت اور توجہ کی) آنکھیں اُن سے نہ ہٹیں۔''(۱۸:۲۸)

آپ کا چہرہ انور: قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ (البقرۃ : ۱۴۴)
''ہم نے آپ کے چہرہ (انور) کو آسمان کی طرف (بار بار) پلٹنے کو دیکھ لیا ہے۔''

آپ کا دستِ مبارک اور گردن مبارک: وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ (بنی اسرائیل:۲۹)
''اور اپنا ہاتھ اپنی گردن سے باندھا ہوا نہ رکھئے۔''(۱۷:۲۹)

آپ کا سینہ مبارک : اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (الانشراح : ۱)
''کیا ہم نے آپ کا شرحِ صدر نہیں فرما دیا؟''(۹۴ : ۱)

آپ کی کمر مبارک: وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ O الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ O (الانشراح:۲،۳)
''اور ہم نے آپ کا (غمِ اُمت کا وہ) بار آپ سے اتار دیا جو آپ کی پشت پر گراں ہو رہا تھا۔'' (۹۴ : ۲،۳)

آپ کی ذات پاک : (۱) اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ O (یونس : ۹۹)
''تو کیا آپ اُن لوگوں پر جبر کریں گے یہاں تک کہ وہ مومن ہو جائیں۔''(۱۰:۹۹)
(۲) لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ O (الشعراء : ۳)
''(اے حبیبِ مکرّم!) شاید آپ (اس غم میں) اپنی جان (عزیز) ہی دے بیٹھیں گے کہ وہ ایمان نہیں لائے۔'' (۲۶ : ۳)

آپ کے بازو مبارک: وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ O (اَلشُّعراء : ۲۱۵)
''اور آپ اپنا بازوئے (رحمت وشفقت) اُن مومنوں کے لئے بچھا دیجئے جنہوں نے آپ کی پیروی اختیار کر لی ہے۔'' (۲۶ : ۲۱۵)

نبی محتشم ﷺ کا اپنے خالق کے ہاں اعزاز واکرام کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ آپ سے پہلے انبیاء علیہم السلام پر اُن کی قوم نے جو الزامات لگائے تو اُن کا جواب پیغمبرِ وقت نے خود دیا اگرچہ اُن کا جواب قرآن مجید میں درج ہے۔ لیکن ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے معاملہ اس کے برعکس ہے۔ دشمنانِ رسول کو رب تعالیٰ نے اپنے رسول پر لگائے گئے الزامات کا ہر موقع پر اور ہر گھڑی خود جواب دیا اور رسول کو جواب دینے کی تکلیف نہیں دی۔ اِن ہر دو صورتوں کا ذرا ملاحظہ فرماتے جائیے :

(الف)

(۱) نوح علیہ السلام کی قوم کے سرداروں نے جناب نوح پر الزام لگایا :
اِنَّا لَنَرٰكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ O (اَلاعراف: ۶۰)
''ہم تمہیں کھلی گمراہی میں (مبتلا) دیکھتے ہیں۔'' (۷:۶۰)

تو نوح علیہ السلام نے خود اس کا جواب یوں دیا :
یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ O (الاعراف: ۶۱)
''اے میری قوم! مجھ میں کوئی گمراہی نہیں لیکن (یہ حقیقت ہے کہ) میں تمام جہانوں کے رب کی طرف سے رسول (مبعوث ہوا) ہوں۔'' (۷:۶۱)

(۲) کافروں نے ہود علیہ السلام کو اس الزام سے متہم کیا :
اِنَّا لَنَرٰكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ O (الاعراف : ۶۶)
''بے شک ہم تمہیں حماقت (میں مبتلا) دیکھتے ہیں اور بیشک ہم تمہیں جھوٹے لوگوں میں گمان کرتے ہیں۔'' (۷ : ۶۶)

تو ہود علیہ السلام کا اُنہیں یہ جواب تھا :
یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ O (الاعراف: ۶۷)
''اے میری قوم! مجھ میں کوئی حماقت نہیں لیکن (یہ حقیقت ہے کہ) میں تمام جہانوں کے رب کی طرف سے رسول (مبعوث ہوا) ہوں۔'' (۷ : ۶۷)

(۳) مصر کے فرعون نے اپنے وقت کے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام سے طنزاً یہ کہا تھا :
اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا O (بنی اسراء یل : ۱۰۱)

''اے موسیٰ! میں تو یہی خیال کرتا ہوں کہ تم پر جادو کر دیا گیا ہے۔'' (۱۰۱ : ۱۷)

اُس کے اس طنز کا بھی جواب موسیٰ علیہ السلام نے خود دیا اور فرمایا :
اِنِّیۡ لَاَظُنُّكَ یٰفِرۡعَوۡنُ مَثۡبُوۡرًاO (بنی اسرائیل : ۱۰۲)
''اے فرعون! میں تو یہی خیال کرتا ہوں کہ تو (جلد ہی) ہلاک ہوا چاہتا ہے۔'' (۱۷:۱۰۲)

(۴) شعیب علیہ السلام کی قوم نے اپنے وقت کے پیغمبر جناب شعیب کو یہ دھمکی دی :۔
یٰشُعَیۡبُ مَا نَفۡقَهُ کَثِیۡرًا مِّمَّا تَقُوۡلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِیۡنَا ضَعِیۡفًا وَلَوۡلَا رَهۡطُكَ لَرَجَمۡنٰكَ وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡنَا بِعَزِیۡزٍO (هود : ۹۱)
''اے شعیب! تمہاری اکثر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم تمہیں اپنے معاشرے میں کمزور شخص جانتے ہیں' اور اگر تمہارا کنبہ نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے اور (ہمیں اسی بات کا لحاظ ہے ورنہ) تم ہماری نگاہ میں کوئی عزت والے نہیں ہو۔'' (۹۱ : ۱۱)

تو اُن کی ان باتوں کا جواب بھی شعیب علیہ السلام نے خود دیا اور اُنہیں فرمایا :
یٰقَوۡمِ اَرَهۡطِیۡۤ اَعَزُّ عَلَیۡكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاتَّخَذۡتُمُوۡهُ وَرَآءَكُمۡ ظِهۡرِیًّا ؕ اِنَّ رَبِّیۡ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ مُحِیۡطٌ"O وَیٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَكَانَتِكُمۡ اِنِّیۡ عَامِلٌ" سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ یَّاۡتِیۡهِ عَذَابٌ" یُّخۡزِیۡهِ وَمَنۡ هُوَ كَاذِبٌ" وَارۡتَقِبُوۡۤا اِنِّیۡ مَعَكُمۡ رَقِیۡبٌ"O (هود : ۹۲' ۹۳)
''اے میری قوم! کیا میرا کنبہ تمہارے نزدیک اللہ سے زیادہ معزز ہے؟ اور تم نے اُسے (اللہ کو گویا) اپنے پسِ پشت ڈال رکھا ہے۔ بیشک میرا رب تمہارے (سب) کاموں کو احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ اور اے میری قوم! تم اپنی جگہ کام کرتے رہو' میں اپنا کام کر رہا ہوں۔ تم عنقریب جان لو گے کہ کس پر وہ عذاب آ پہنچتا ہے جو رُسوا کر ڈالے گا اور کون ہے جو جھوٹا ہے؟ اور تم بھی انتظار کرتے رہو اور میں (بھی) تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔'' (۹۲' ۹۳ : ۱۱)

(۵) ھود علیہ السلام کی قوم نے وقت کے پیغمبر کے خلاف اپنی بیزاری کا یوں اظہار کیا :
یٰهُوۡدُ مَا جِئۡتَنَا بِبَیِّنَةٍ وَّمَا نَحۡنُ بِتَارِكِیۡۤ اٰلِهَتِنَا عَنۡ قَوۡلِكَ وَمَا نَحۡنُ لَكَ بِمُؤۡمِنِیۡنَO اِنۡ نَّقُوۡلُ اِلَّا اعۡتَرٰىكَ بَعۡضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوۡٓءٍ (هود : ۵۳' ۵۴)
''اے ھود! تم ہمارے پاس کوئی واضح دلیل لے کر نہیں آئے اور نہ ہم تمہارے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے ہیں اور نہ ہی ہم تم پر ایمان لانے والے ہیں۔ ہم اِس کے سوا (کچھ) نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی نے تمہیں (دماغی خلل کی) بیماری میں مبتلا کر دیا ہے۔''
(۵۳'۵۴ : ۱۱)

تو اُن کی اِن بہکی باتوں کا جواب بھی ھود علیہ السلام نے خود دیا اور فرمایا:

اِنِّیْٓ اُشْهِدُاللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَO مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِیْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِO اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَرَبِّكُمْ مَامِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍO (هود: ۵۴۔۵۶)

''بیشک میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں ان (تمہارے معبودوں) سے لاتعلق ہوں جنہیں تم شریک گردانتے ہو۔ اُس (اللہ) کے سوا تم سب (بشمول تمہارے معبودانِ باطلہ) مل کر میرے خلاف (کوئی) تدبیر کرلو پھر مجھے مہلت بھی نہ دو۔ بے شک میں نے اللہ پر توکل کرلیا ہے جو میرا (بھی) پالنہار ہے اور تمہارا (بھی) پالنہار ہے۔ کوئی چلنے والا (جاندار) ایسا نہیں مگر وہ اُسے اُس کی چوٹی سے پکڑے ہوئے ہے (یعنی مکمل طور پر اُس کے قبضہ قدرت میں ہے) بیشک میرا رب (حق و عدل میں) سیدھی راہ پر (چلنے سے ملتا) ہے۔'' (۱۱ : ۵۴۔۵۶)

(۶) حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کا اپنے پیغمبر کے خلاف ردِّعمل کو قرآن مجید نے یوں بیان کیا ہے:

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِیْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍO (هود: ۶۲)

''کہنے لگے: اے صالح! اِس سے پہلے ہماری قوم میں تم ہی امیدوں کا مرکز تھے، کیا تم ہمیں اِن (بتوں) کی پرستش کرنے سے روک رہے ہو جن کی ہمارے باپ دادا پرستش کرتے رہے ہیں اور جس (توحید) کی طرف تم ہمیں بلا رہے ہو، یقیناً ہم اس کے بارے میں بڑے اضطراب انگیز شک میں مبتلا ہیں۔'' (۱۱:۶۲)

اُن کے اس ردِّعمل کا جواب رب تعالٰی نے نہیں بلکہ صالح علیہ السلام نے خود دیا اور اُن سے فرمایا:

يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَآتٰنِیْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِیْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍO (هود: ۶۳)

''اے میری قوم! ذرا سوچو تو سہی اگر میں اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر (قائم) ہوں اور مجھے اُس کی جانب سے (خاص) رحمت نصیب ہوئی ہے (اُس کے بعد اُس کے احکام تم تک نہ پہنچا کر) اگر میں اُس کی نافرمانی کر بیٹھوں تو کون ہے جو اللہ (کے عذاب) سے بچانے میں میری مدد کرسکتا ہو؟ سوائے نقصان پہنچانے کے تم میرا (اور) کچھ نہیں بڑھا سکتے۔'' (۱۱ : ۶۳)

(۷) جب لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو ہم جنس پرستی (Sodomy) کے مہیب نتائج کے بارے میں سرزنش کی تو وہ آپ سے یوں گویا ہوئے:

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَO (اَلشُّعَرَاء: ۱۶۷)

''اے لوط! اگر تم (اِن باتوں سے) باز نہ آئے تو تم ضرور شہر بدر کیے جانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔''

تو اُن کے ایسے دل شکن رویّے کا جواب لوط علیہ السلام نے خود دیا اور قوم سے فرمایا :
اِنِّیْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ O رَبِّ نَجِّنِیْ وَاَهْلِیْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ O (اَلشعراء : ۱۶۸ ؛ ۱۶۹)
"بے شک میں تمہارے عمل سے بیزار ہونے والوں میں سے ہوں ۔ اے میرے پروردگار! تو مجھے اور میرے گھر والوں کو اس (کام کے وبال) سے نجات عطا فرما جو وہ کررہے ہیں ۔" (۱۶۸؛۱۶۹:۲۶)

(۸) جب نوح علیہ السلام حکمِ الٰہی کے تحت کشتی تیار کررہے تھے تو "جب بھی اُن کی قوم کے سرداراُن کے پاس سے گزرتے تو اُن کا مذاق اڑاتے ۔" (سورہ ھود : ۳۸) ۔ رب تعالیٰ نے اُن کے تمسخر کا جواب نہیں دیا بلکہ نوح علیہ السلام اُن سے جواباً فرماتے :
اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ O فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ O (ھود : ۳۸؛ ۳۹)
"اگر آج تم ہم سے تمسخر کرتے ہو تو (کل) ہم بھی تم سے اسی طرح تمسخر کریں گے جیسے تم تمسخر کررہے ہو ۔ سو تم عنقریب جان لو گے کہ کس پر (دنیا میں ہی) عذاب آتا ہے جو اُسے ذلیل ورسوا کردے گا اور پھر (آخرت میں بھی کس پر) ہمیشہ قائم رہنے والا عذاب آتا ہے ۔" (۳۸؛۳۹ : ۱۱)

(ب)

لیکن رب تعالیٰ کی سنتِ کریمہ اپنے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ایسی نہ تھی کہ دشمن اُن پر الزامات کی بوچھاڑ کردیں اور پیغمبر خود اُن کا جواب دے اور رب خاموش رہے ۔ بلکہ محبوب علیہ السلام کا جب بھی اُن کے دشمنوں نے مذاق اڑایا تو ربِّ جلیل فوراً بیچ میں آڑے آگیا اور محبوب علیہ السلام کی طرفداری میں اُنہیں مُسکت اور ناقابلِ تردید جواب دیئے ۔ ملاحظہ ہوں :

(۱) کفار نے نبی علیہ السلام پر الزام لگاتے ہوئے کہا تھا :
يَا اَيُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ O لَوْمَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلَائِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِيْنَ (الحجر : ۶؛۷)
"اور (کفار گستاخی کرتے ہوئے) کہتے ہیں : اے وہ شخص جس پر قرآن اتارا گیا ہے، بیشک تم دیوانے ہو ۔ تم ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لے آتے اگر تم سچے ہو ۔" (۶؛۷:۱۵)

قرآن کریم نے صاحبِ قرآن ﷺ کی جانب سے یہ جواب دیئے :
(i) مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ O ۔۔ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ O بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ O (القلم: ۲؛۵؛۶)
"(اے حبیبِ مکرّم!) آپ اپنے رب کے فضل سے (ہرگز) دیوانے نہیں ہیں ۔۔ پس عنقریب آپ (بھی) دیکھ لیں گے اور وہ (بھی) دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون دیوانہ ہے ۔" (۲؛۵؛۶:۶۸)

(ii) مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ O (اَلْحِجر: ۸)
''ہم فرشتوں کو نہیں اتارا کرتے مگر (فیصلہ) حق کے ساتھ (یعنی جب عذاب کی گھڑی آ پہنچے تو اُس کے نفاذ کے لئے اُتارتے ہیں) اور اُس وقت اُنہیں مہلت نہیں دی جاتی۔'' (۸ : ۱۵)

(۲) کفار نے طنزاً کہا تھا:
ءَاِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ O (اَلصَّافات: ۳۶)
''کیا ہم ایک دیوانے شاعر کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے ہیں؟'' (۳۶ : ۳۷)

رب تعالیٰ نے اس کا جواب دیا:
بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ O (اَلصَّافات: ۳۷)
''(وہ نہ مجنون ہے نہ شاعر) بلکہ وہ (دین) حق لے کر آئے ہیں اور اُنہوں نے (اللہ کے) پیغمبروں کی تصدیق کی ہے۔'' (۳۷ : ۳۷)

(۳) کفار نے مسلمانوں سے کہا تھا:
اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا O (الفرقان: ۸)
''تم تو محض ایک سحر زدہ شخص کی پیروی کر رہے ہو۔'' (۸ : ۲۵)

قرآنِ کریم نے اُس کا جواب یہ دیا:
اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا O (الفرقان: ۹)
''(اے حبیبِ مکرّم!) ملاحظہ فرمائیے یہ لوگ آپ کے لئے کیسی (کیسی) مثالیں بیان کرتے ہیں، پس وہ (بوجہ بے ادبی) گمراہ ہو چکے ہیں، سو وہ ہدایت کا کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔'' (۹ : ۲۵)

محبوبِ محتشم کی تسلی و تشفی کا سامان کیا جا رہا ہے کہ پیارے رسول! تیرے مقام کو نہ پہچان کر، تیری عظمت سے بے خبر رہ کر اور تیری شان کا انکار کر کے وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور لوگوں کو بھی گمراہ کیا۔ کاش اُنہیں صدیقؓ کی آنکھ اور بلالؓ کا دل نصیب ہوتا تو اُنہیں تیرے حسنِ سرمدی اور تیری محبوبیت کا پتہ چلتا!

(۴) کفار نے قرآن کی اعلیٰ درجے کی فصاحت و بلاغت سے بوکھلا کر کہا تھا:
لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ O (اَلانفال: ۳۱)
''اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس (کلام) کے مثل کہہ سکتے ہیں، یہ تو اگلوں کی (خیالی) داستانوں کے سوا (کچھ بھی) نہیں ہے۔'' (۳۱ : ۸)

قرآن ہی نے اس کا جواب محبوب علیہ السلام کی زبانی دیا:
قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْجِنُّ وَالْاِنْسُ عَلٰى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا O (بنی اسرائیل : ۸۸)
"(اے حبیبِ لبیب!) فرما دیجئے اگر تمام انسان اور جنات اِس بات پر جمع ہو جائیں کہ وہ اِس قرآن کے مثل (کوئی دوسرا کلام بنا) لائیں گے تو (بھی) وہ اس کی مثل نہیں لا سکتے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔" (۱۷ : ۸۸)

(۵) کفار نے قرآن کو موضوعی اور اختراعی قرار دیتے ہوئے نبی علیہ السلام پر اتہام لگایا تھا اور کہا تھا:
اِنْ هٰذَا اِلَّا اِفْكُ نِ افْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ (الفرقان : ۴)
"یہ (قرآن) محض افتراء ہے جسے اس (مدعیِ رسالت) نے گھڑ لیا ہے اور اُس (کے گھڑنے) پر دوسرے لوگوں نے اُس کی مدد کی ہے۔" (۲۵ : ۴)

قرآن کے نازل کرنے والے اللہ نے اس کا جواب دیا:
فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا O (اَلفُرقان : ۴)
"بیشک کافر ظلم اور جھوٹ پر (اُتر) آئے ہیں۔" (۲۵ : ۴)

(۶) کفار نے کہا تھا:
اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا O (اَلفرقان : ۵)
"(یہ قرآن) اگلوں کے افسانے ہیں جنہیں اِس شخص نے لکھوا رکھا ہے' پھر وہ (افسانے) اُسے صبح و شام پڑھ کر سنائے جاتے ہیں (تاکہ اُنہیں یاد کر کے آگے سنا سکے)۔" (۲۵:۵)

رب تعالیٰ نے خود اس کا جواب محبوب علیہ السلام کی زبانی یوں دیا:
قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الفرقان : ۶)
"فرما دیجئے: اِس (قرآن) کو اُس (اللہ) نے نازل فرمایا ہے جو آسمانوں اور زمین میں (موجود) تمام رازوں کو جانتا ہے۔" (۲۵ : ۶)

(۷) کفار نے ختم المرسلین ﷺ سے کہا تھا کہ "آپ اللہ کے بھیجے ہوئے نہیں ہیں۔" (الرّعد: ۴۳)
رب تعالیٰ نے محبوب علیہ السلام کی زبانِ پاک سے اس کا جواب دیا:
قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ (الرّعد: ۴۳)
"فرما دیجئے (میری رسالت پر) میرے اور تمہارے درمیان اللہ بطور گواہ کافی ہے۔" (۱۳:۴۳)

"حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں اُنہوں نے کہا کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ چمکتے دمکتے اور ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ تشریف لائے اور فرمایا کہ میرے پاس جبریل یہ پیغام لے کر آئے کہ اے قابلِ صد ستائش! (آپ کا رب فرماتا ہے کہ) کیا آپ کو یہ بات پسند نہیں کہ جب آپ کا کوئی اُمتی آپ پر ایک مرتبہ درود بھیجے تو میں اُس پر دس مرتبہ رحمت بھیجوں اور آپ کا کوئی اُمتی آپ کو ایک مرتبہ سلام کہے تو میں اُس پر دس مرتبہ سلامتی بھیجوں!"

(۲) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: مَنْ ذُكِرْتُ عِنْدَهُ فَلْيُصَلِّ عَلَيَّ وَمَنْ صَلّٰى عَلَيَّ صَلَاةً وَّاحِدَةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ عَشْرَ صَلَوَاتٍ وَحَطَّ عَنْهُ عَشْرَ سَيِّآتٍ وَّرَفَعَهُ بِهَا عَشْرَ دَرَجٰتٍ (مسند احمد، متدرک للحاکم، سنن نسائی، صحیح ابن حبان)

"انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کسی کے پاس میرا ذکر کیا جائے، اُسے چاہئے کہ مجھ پر درود بھیجے اور جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا، اللہ تعالیٰ اس پر دس مرتبہ رحمت بھیجے گا اور اُس کے دس گناہ مٹا دے گا اور اس کے دس درجے بلند فرمائے گا۔"

(۳) قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ سَلَّمَ عَلَيَّ عَشْرًا فَكَاَنَّمَا أَعْتَقَ رَقَبَةً (الشفا لقاضی عیاض)

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے مجھ پر دس مرتبہ درود بھیجا تو گویا اُس نے ایک غلام آزاد کیا۔"

(۴) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَكْثَرُهُمْ عَلَيَّ صَلٰوةً (ترمذی، ابن حبان، شرح السنۃ للبغوی، مشکوٰۃ المصابیح لخطیب تبریزی، میزان الاعتدال للذھبی)

"حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میرے قریب ترین وہ شخص ہوگا جو مجھ پر بکثرت درود پڑھتا ہوگا۔"

(۵) عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ حِيْنَ يُصْبِحُ عَشْرًا وَّحِيْنَ يُمْسِيْ عَشْرًا أَدْرَكَتْهُ شَفَاعَتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (طبرانی)

"حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص مجھ پر صبح دس مرتبہ اور شام دس مرتبہ درود بھیجے گا، اُس کے لئے میری شفاعت واجب ہو جائے گی۔"

(۶) عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: أَكْثِرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ عَلَيَّ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَإِنَّهُ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ تَشْهَدُهُ الْمَلَائِكَةُ وَإِنَّ أَحَدًا لَنْ يُّصَلِّيَ عَلَيَّ إِلَّا عُرِضَتْ عَلَيَّ صَلٰوتُهُ حَتّٰى يَفْرُغَ مِنْهَا قَالَ قُلْتُ: وَبَعْدَ الْمَوْتِ؟ قَالَ: إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَى الْأَرْضِ

أَنْ تَأْكُلَ اَجْسَادَ الْاَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ (ابن ماجہ' السخاوی' مُلا علی قاری)

''حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جمعہ کے دن مجھ پر بہ کثرت درود پڑھا کرو اس لئے کہ جمعہ کا دن برکت کا دن ہے جس میں فرشتے بہ کثرت حاضر ہوتے ہیں اور جو کوئی بھی مجھ پر درود بھیجتا ہے تو جب تک بھیجنے والا فارغ نہیں ہو جاتا' وہ درود مجھ پر برابر پیش کیا جاتا رہتا ہے۔ ابوالدرداء کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: کیا آپ کی وفات کے بعد بھی ایسا ہی ہوگا؟ اس پر آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء علیہم السلام کے جسموں کو کھانا حرام کر دیا ہے۔''

(۷) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلصَّلٰوةُ عَلَيَّ نُوْرٌ عَلَى الصِّرَاطِ وَمَنْ صَلّٰى عَلَيَّ يَوْمَ الْجُمُعَةِ ثَمَانِيْنَ مَرَّةً غُفِرَتْ لَهُ ذُنُوْبُ ثَمَانِيْنَ عَامًا (شرح شفا لعلی قاری)

''ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھ پر درود کا بھیجا جانا پل صراط پر نور ہوگا اور جو کوئی جمعہ کے دن مجھ پر اسّی مرتبہ درود بھیجے گا' اُس کے اَسّی برس کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔''

(۸) عَنِ الْحَسَنِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ ذُكِرْتُ عِنْدَهُ فَخَطِيءَ الصَّلَاةَ عَلَيَّ خَطِيءَ طَرِيْقَ الْجَنَّةِ (منذری ۲: ۲۳۱)

''امام حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کے پاس میرا ذکر ہوا اور وہ مجھ پر درود پڑھنا بھول گیا' وہ جنت کا راستہ بھول جائے گا۔''

شیخ ابن حجر مکّی فرماتے ہیں کہ ایک شخص اپنی تحریروں میں صرف صَلَّى اللّٰهُ کے الفاظ لکھتا تھا اور وَ سَلَّمَ نہیں لکھتا تھا۔ اُس نے نبی علیہ السلام کو خواب میں یہ فرماتے سنا کہ تم وَ سَــلَّـــم نہ لکھ کر چالیس ثواب کیوں ضائع کرتے ہو؟'' (''فضائل درود شریف'' ۔۔۔مولانا محمد زکریا' صفحہ ۹۲) تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی۔

نوٹ: وَ سَلَّم میں چار حروف ہیں اور ہر حرف کے دس ثواب ہیں' اس طرح ۴x۱۰=۴۰ ثواب ہوئے۔

اُن لوگوں کی مذمّت میں احادیث جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود و سلام نہیں بھیجتے

(۱) اِنَّ اَبْخَلَ النَّاسِ مَنْ ذُكِرْتُ عِنْدَهُ وَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ (کنز العمال لعلاء الدین علی ۱: ۴۸۹)

''لوگوں میں بخیل ترین وہ ہے جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔''

(۲) رَغِمَ أَنْفُ رَجُلٍ ذُكِرْتُ عِنْدَهُ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ (الجامع الصحیح ترمذی' کتاب الدعوات)

''اُس شخص کی ناک خاک آلود ہو جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔''

(۳) عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: مَا جَلَسَ قَوْمٌ مَجْلِسًا لَمْ یَذْکُرُوا اللّٰہَ تَعَالٰی فِیْہِ وَلَمْ یُصَلُّوْا عَلٰی نَبِیِّھِمْ ﷺ اِلَّا کَانَ عَلَیْھِمْ تِرَةً یَوْمَ الْقِیَامَةِ فَاِنْ شَاءَ عَذَّبَھُمْ وَاِنْ شَاءَ غَفَرَلَھُمْ (احمد وابوداؤد وغیرھما)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر لوگ ایسی مجلس میں بیٹھیں جس میں نہ تو وہ اللہ کا ذکر کریں اور نہ ہی اس کے رسول ﷺ پر درود بھیجیں تو وہ مجلس اُن کے لئے قیامت کے دن حسرت وندامت کا باعث بن جائے گی۔ اللہ چاہے تو اُنہیں عذاب دے اور چاہے تو اُنہیں معاف کر دے۔''

(۴) عَنْ کَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اُحْضُرُوا الْمِنْبَرَ فَحَضَرْنَا فَلَمَّا ارْتَقٰی دَرَجَةً قَالَ: آمِیْنَ ثُمَّ ارْتَقَی الثَّانِیَةَ فَقَالَ: آمِیْنَ ثُمَّ ارْتَقَی الثَّالِثَةَ فَقَالَ: آمِیْن فَلَمَّا نَزَلَ قُلْنَا: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! قَدْ سَمِعْنَا مِنْكَ الْیَوْمَ شَیْئًا مَاکُنَّا نَسْمَعُہٗ فَقَالَ: اِنَّ جِبْرِیْلَ عَرَضَ لِیْ فَقَالَ: بَعُدَ مَنْ أَدْرَكَ رَمَضَانَ فَلَمْ یُغْفَرْلَہٗ فَقُلْتُ: آمِیْن۔ فَلَمَّا رَقِیْتُ الثَّانِیَةَ قَالَ: بَعُدَ مَنْ ذُکِرْتَ عِنْدَہٗ فَلَمْ یُصَلِّ عَلَیْكَ فَقُلْتُ: آمِیْن فَلَمَّا رَقِیْتُ الثَّالِثَةَ قَالَ: بَعُدَ مَنْ أَدْرَكَ أَبَوَیْہِ الْکِبَرَ عِنْدَہٗ أَوْ أَحَدَھُمَا فَلَمْ یُدْخِلَاہُ الْجَنَّةَ قُلْتُ آمِیْن (صحیح بخاری فی برّ الوالدین، مستدرک لحاکم، صحیح ابن حبان، السخاوی)

''حضرت کعب بن عجرۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ منبر لاؤ۔ ہم نے منبر پیش کیا۔ جب آپ پہلی سیڑھی پر چڑھے تو آپ نے آمین فرمایا۔ جب آپ دوسری سیڑھی پر چڑھے تو آپ نے آمین فرمایا۔ پھر آپ تیسری سیڑھی پر چڑھے تو آپ نے آمین فرمایا۔ جب آپ نیچے اترے تو ہم نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! ہم نے آج آپ سے وہ چیز سنی ہے جو پہلے نہیں سنی تھی۔ آپ نے فرمایا: جبریل میرے پاس آئے اور کہا کہ وہ شخص اللہ کی رحمت سے دُور ہو جس نے ماہِ رمضان پایا لیکن (اُس کا احترام نہ کرنے کی وجہ سے) اُس کی بخشش نہ ہو سکی تو میں نے آمین کہا۔ جب میں دوسری سیڑھی پر چڑھا تو جبریل نے کہا: وہ شخص رحمتِ الٰہی سے دُور ہو جس کے سامنے آپ کا نام لیا گیا اور اُس نے آپ پر درود نہ پڑھا تو میں نے آمین کہا۔ جب میں تیسری سیڑھی پر چڑھا تو جبریل نے کہا: وہ شخص رحمتِ الٰہی سے دُور ہو جس نے اپنے بوڑھے والدین یا اُن میں سے ایک کو پایا اور وہ اُسے جنت میں لے جانے کا سبب نہ بن سکے۔ تو (اس پر) میں نے کہا آمین۔

فرشتوں کا درود وسلام: منصبِ نبوت کی عظمت ورفعت کا یہ ایک اور بیّن اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ صرف مؤمنوں کو درود وسلام بھیجنے کا حکم دیتا ہے بلکہ وہ آسمانی مخلوق کو بھی جو کہ معصوم عن الخطا، نیک و پاک اور نوری ہیں، اسی قسم کا حکم دیتا ہے۔ فرشتے بھی صبح سے لے کر شام تک مؤمنوں کے پُر خلوص محبت بھرے درود وسلام پہنچاتے رہتے ہیں۔ حضور علیہ السلام اپنی اُمت کے اِن تحائف کو پسند فرماتے ہیں اور ان بھیجنے والوں پر برکات ورحمتِ الٰہی

کے نزول کی دعا کرتے ہیں جیسا کہ آپ نے فرمایا :

(۱) اِنَّ للہِ مَلَائِکَۃ'' سَیَّاحِیْنَ فِی الْاَرْضِ یُبَلِّغُوْنَنِیْ مِنْ اُمَّتِیَ اَلسَّلَامَ (سنن نسائی، المعجم الکبیر لطبرانی، شعب الایمان لاحمد بن حسین البیہقی)

''روئے زمین پر اللہ کے چلنے پھرنے والے فرشتوں کے دستے مجھ تک میری اُمّت کے بھیجے گئے سلام پہنچا دیتے ہیں۔''

(۲) صَلُّوْا عَلَیَّ فَاِنَّ صَلَاتَکُمْ تَبْلُغُنِیْ حَیْثُ کُنْتُمْ (سنن ابی داؤد، مجمع الزوائد للہیثمی)

''مجھ پر درود بھیجا کرو اس لئے کہ تمہارا درود مجھ تک پہنچ جاتا ہے جہاں کہیں بھی تم ہو۔''

(۳) مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ عِنْدَ قَبْرِیْ سَمِعْتُہ' وَمَنْ صَلّٰی عَلَیَّ نَائِیًا اُبْلِغْتُہ' (شعب الایمان للبیہقی، کنز العمال لعلاء الدین علی)

''جو شخص میرے مزارِ مبارک کے قریب مجھ پر درود بھیجے، میں اُسے سنتا ہوں اور جو شخص مجھ پر دُور سے درود بھیجے، تو وہ مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔'' (پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری، صفحات ۴۱، ۴۲)

''صلوٰۃ وسلام کا قبول ہونا : صلوٰۃ وسلام کو اللہ تعالیٰ ہر وقت قبول فرماتا ہے اور ہمیشہ اس ہدیے کو تسلیم کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی معصیت پیشہ اور فاسق و فاجر شخص بھی صلوٰۃ وسلام کا تحفہ پیش کرے تو اُسے بھی بہر حال قبول کر لیا جاتا ہے۔''

''سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک معصیت پیشہ اور فاسق و فاجر کی طرف سے پیش کیا گیا درود وسلام آخر کیوں قبول کیا جاتا ہے اور اس کے پس پردہ حکمت کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ صلوٰۃ اور سلام کے معانی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی رحمت و برکات، قربِ الٰہی اور نبی علیہ السلام کے نام نامی کی بلندی اور رفعت کے لئے دعائیہ کلمات ہیں۔ نبی ﷺ پر نوازشات وعنایاتِ ربانی پہلے ہی سے ہیں (بحوالہ سورۃ النجم : آیات ۸، ۹ اور سورۃ الانشراح : آیت چہارم)۔ جب بندہ اللہ سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر رحمتیں بھیجنے کی درخواست کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : میں تو پہلے ہی اپنے نبی پر رحمتیں اور عنایتوں کی برکھا کر رہا ہوں اور اُنہیں اپنا قرب عطا کر رہا ہوں۔ تاہم اے میرے پرستار بندے! چونکہ تو نے اپنی ذات کے لئے مجھ سے کچھ نہیں مانگا بلکہ بے غرضی اور کمال خلوص سے میرے نبی پر درود وسلام کا تحفہ بھیجا ہے، اس لئے تمہارے عریضے کو پذیرائی بخشتے ہوئے اُسے قبول کیا جاتا ہے، قطع نظر اس بات کے کہ تو گنہگار ہے یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صلوٰۃ وسلام کو بہر حال قبول کر لیا جاتا ہے۔''

سلام اور دوسری عبادتوں کی قبولیت : جیسا کہ پہلے بیان ہوا کسی بھی عبادت (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، وخیرات وغیرہ یہاں تک کہ اللہ کی راہ میں گردن کٹوانے تک) کی عند اللہ قبولیت کی ضمانت کسی کے پاس نہیں کہ شاید

اُن میں کسی قسم کا سُقم یا خامی رہ گئے ہوں اور اس وجہ سے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں قبول کرے یا نہ کرے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ تبارک وتعالیٰ کو اُس کی تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ پیارے اور محبوب ہیں اور جو شخص اللہ کے اِس محبوبِ مکرّم پر درود وسلام کا تحفہ ارسال کرتا ہے' رب تعالیٰ اُس سے خوش ہو کر اُس کے اس عمل کو یقیناً شرفِ قبولیت عطا فرماتا ہے کیونکہ یہ عمل خود رب تعالیٰ کا اپنا عمل بھی تو ہے۔

''نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے صحابی اُبی ابن کعب رضی اللہ عنہ کو ہدایت کی کہ وہ اپنے نبی (یعنی مجھ) پر بہ کثرت اور بالعموم درود وسلام بھیجا کریں۔ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں :

قُلْتُ : يَا رَسُوْلَ اللهِ اِنِّیْ اُكْثِرُ الصَّلٰوةَ عَلَيْكَ فَكَمْ اَجْعَلُ لَكَ مِنْ صَلٰوتِیْ؟ فَقَالَ: مَا شِئْتَ قُلْتُ : اَلرُّبُعُ قَالَ: مَاشِئْتَ فَاِنْ زِدْتَّ فَهُوَخَيْرٌ '' لَّكَ - قُلْتُ: اَلنِّصْفُ قَالَ: مَاشِئْتَ فَاِنْ زِدْتَّ فَهُوَخَيْرٌ '' لَّكَ - قُلْتُ: فَالثُّلُثَيْنِ؟ قَالَ: مَاشِئْتَ فَاِنْ زِدْتَّ فَهُوَخَيْرٌ '' لَّكَ - قُلْتُ: اَجْعَلُ لَكَ صَلَاتِیْ كُلَّهَا؟ قَالَ: اِذًا تُكْفٰى هَمُّكَ وَيُغْفَرُلَكَ ذَنْبُكَ (ترمذی ومستدرک للحاکم)

''میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں آپ پر بہ کثرت درود بھیجتا ہوں تو میں اس عمل پر اپنا کتنا وقت آپ کے لئے مخصوص کردوں؟ آپ نے فرمایا: اس قدر کہ جتنا تم چاہو۔ میں نے عرض کیا: کیا یہ چوتھائی وقت ہو جائے؟ آپ نے فرمایا: جیسے تمہاری مرضی' لیکن اگر تم اس میں کچھ اور اضافہ کردو تو وہ تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ میں نے عرض کیا: تو کیا یہ آدھا وقت ہو جائے؟ آپ نے فرمایا: جیسے تمہارے مرضی' لیکن اگر تم اس میں کچھ اور اضافہ کردو تو وہ تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ میں نے پھر عرض کیا: تو کیا وہ دوتہائی ہو جائے؟ آپ نے فرمایا: جیسے تمہاری مرضی' لیکن اگر تم اس میں کچھ اور اضافہ کردو تو وہ تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ میں نے عرض کیا: تو کیا میں اپنا سارا وقت آپ پر درود پڑھنے کے لئے وقف نہ کردوں؟ اِس پر آپ نے فرمایا: تب تو یہ بات تمہیں فکر وغم سے محفوظ رکھے گی اور تمہارے گناہ معاف کردئے جائیں گے۔''

صلوٰۃ وسلام کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قبول فرمانا: اس سوال پر کہ آیا نبی علیہ السلام اپنی اُمّت کی طرف سے بھیجے گئے درود وسلام کو قبول فرماتے ہیں کہ نہیں' عموماً بحث سننے میں آتی ہے۔ لیکن سچے اور مخلص مسلمان ایسی بحثوں میں نہیں پڑتے کیونکہ درود وسلام بھیجنے کے الٰہی حکم پر اُن کا غیر متزلزل اور پختہ ایمان ہوتا ہے۔ مسلمان اس بات پر مطمئن ہوتا ہے کہ اگر درود وسلام آپ تک فرشتوں کی وساطت سے پہنچایا جاتا ہے تو فرشتے بھی تو اسے حکمِ الٰہی کے تحت ہی پہنچاتے ہیں اور اگر درود وسلام آپ تک براہِ راست پہنچتا ہے تو یہ آپ پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا خاص انعام و احسان ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ہی سے وابستہ ایک معجزہ بھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر درود وسلام آپ تک بالواسطہ یا بلاواسطہ نہیں پہنچتا تو پھر اس حکمِ الٰہی میں کیا معنی باقی رہ جاتا ہے؟ کیا رسول اللہ ﷺ کا کوئی فرمان (معاذ اللہ) مبہم اور بے معنی ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ خود اپنے نبی کی زبان پر بولتا ہے (سورۃ النّجم: آیات ۳'۴)۔

کسی صحیح اور حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لئے اِس عمومی اعتراض کو دُور کرنے میں آیئے ہم اسے معروضی طور پر (بغیر کسی جذباتیت اور جانب داری کے) قرآن وحدیث کی روشنی میں پرکھیں تاکہ کسی صحیح اور قطعی فیصلے تک پہنچ سکیں۔

قرآن وحدیث اور Palaeontology ☆ سائنس کی رُو سے انبیاء ورُسُل علیہم السلام کے اجسام گلنے' سڑنے' خراب ہونے اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے محفوظ رہتے ہیں جس کا ثبوت مندرجہ ذیل حقائق سے ہوتا ہے:

(1) سورہ سَبا کی آیت ۱۴ میں جناب سلیمان علیہ السلام کا واقعہ بیان ہوا ہے جس کی رُو سے جنّات ہیکلِ سلیمانی آپ کی نگرانی میں تعمیر کر رہے تھے۔ نماز کی ادائی کے دوران جبکہ آپ عصا کے سہارے کھڑے تھے' وفات پا گئے۔ آپ اُسی حالت میں ایک سال اور بقولِ بعض چھ ماہ تک کھڑے رہے یہاں تک کہ تعمیر مکمل ہوگئی۔ جنّات آپ کو اس حالت میں دیکھ کر آپ کو زندہ سمجھے اور کسی کو قریب آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ بدستور اپنے کام میں لگے رہے۔ اس دوران دیمک نے آپ کے عصا کو کھانا شروع کیا۔ جب وہ اُسے پوری طرح کھا چکی اور عصا اندر سے بالکل خالی اور کھوکھلا ہوگیا تو آپ کے جسمِ اطہر کو نہ سہار سکا جس کے نتیجے میں وہ گر گیا اور آپ نیچے آرہے۔

یہ واقعہ انبیاء علیہم السلام کی بعداز وفات حیاتِ طیّبہ کی درخشاں مثال ہے کہ اس جہانِ فانی سے گزرنے کے بعد بھی اُن کے اجسام ہر قسم کے تغیر وتبدّل سے محفوظ رہتے ہیں۔ عام قدرتی قانون کے برعکس ایک سال یا چھ ماہ کے طویل عرصے نے آپ کے بلا رُوح جسم پر کسی قسم کا کوئی اثر نہیں ڈالا اور وہ گلنے' سڑنے اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بالکل محفوظ اور اٹل بندھا رہا۔ اس واقعہ سے متعلق قرآنی متن حسب ذیل ہے:

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۝ (سَبَا: ۱۴)

''پھر جب ہم نے اُن (سلیمان) پر موت کا حکم جاری کر دیا (اور اُن کا انتقال ہوگیا) تو کسی چیز نے اُن کی موت کا پتہ نہ بتایا سوائے ایک زمینی کیڑے کے کہ وہ سلیمان کے عصا کو کھاتا تھا۔ سو جب آپ نیچے آرہے تب، تب جنّات پر حقیقت ظاہر ہوئی کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس ذلت کی مصیبت میں نہ رہتے۔'' (۳۴:۱۴)

اسی قسم کی بات اور مشابہت ہمیں سورۂ البقرۃ کی آیت ۲۵۹ میں بیان کردہ عزیر علیہ السلام کے واقعہ اور سورۃ الکہف کی آیات ۱۷ تا ۱۹ میں بیان شدہ اصحابِ کہف کے واقعہ میں ملتی ہے۔ اصحابِ کہف انبیاء یا رسول تو نہیں تھے بلکہ اولیاء اللہ تھے جنہوں نے اپنے ایمان کے تحفظ میں اپنے گھر بار کو چھوڑ دیا تھا۔ تین سو نو (309) برس تک بے روح ہونے کے باوجود اُن کے جسم گلنے' سڑنے' خراب ہونے اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے محفوظ رہے۔

(2) گزشتہ صفحہ ۴۳۷۱ کے آخر میں بیان کردہ حدیث (۶) جس کے راوی حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ

☆ معدوم حیوانات ونباتات اور متحجر ڈھانچوں کا مطالعہ

ہیں' کی رُو سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء علیہم السلام کے جسموں کو کھانا حرام کردیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا رسول اپنی قبر میں زندہ ہوتا ہے اور اُسے اللہ کی طرف سے رزق فراہم کیا جاتا ہے۔ (سُنن ابن ماجہ: کتاب الجنائز ؛ السخاوی ؛مُلّا علی قاری)

علاوہ ازیں اس بات کا ثبوت نبی علیہ السلام کا فرمان بھی ہے کہ میں نے معراج کی رات موسیٰ علیہ السلام کو اُن کی قبر مبارک میں نماز پڑھتے دیکھا۔مزید برآں نبی علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا:
مَنْ کَلَّمَہٗ رُوْحُ الْقُدُس لَنْ یُؤْذَنَ لِلْاَرْض اَنْ تَاْکُلَ مِنْ لَحْمِہٖ (درِّ منثور لجلال الدین السیوطی)
''جس سے جبریل علیہ السلام نے کلام کیا ہو' زمین کو اُس کا جسم کھانے کی ہرگز اجازت نہیں دی گئی۔''

(3) مولانا قاسم نانوتوی انبیاء علیہم السلام کے اجسامِ اطہر اُن کی قبورِ مبارکہ میں محفوظ رہنے کے متعلق لکھتے ہیں:
''انبیاء و رُسُل کے اَجسام کی تعظیم و توقیر کی جاتی ہے کیونکہ وہ زندہ ہیں۔بے جان اور بے رُوح جسموں کو زمین پر کوئی طاقت حاصل نہیں ہوتی۔'' (آبِ حیات بحوالہ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری' صفحہ ۵۸)

(4) اللہ کی راہ میں اپنی جانیں قربان کرنے والے شہید ہیں اور قرآن مجید نے اُنہیں مُردہ کہنے بلکہ مُردہ تک سمجھنے سے سختی سے روکا ہے اور بروئے سورہ آلِ عمران' آیت ۱۶۹'' وہ اللہ کی طرف سے رزق پاتے ہیں۔'' ضروری نہیں کہ یہ شہداء تمام کے تمام نبی یا رسول ہوں' وہ عام مسلمان بھی ہو سکتے ہیں۔باوجود اس بات کے کہ شہداء پیغمبر یا رسول نہیں' وہ اپنی قبور میں زندہ ہیں تو انبیاء و رُسُل علیہم السلام جو اِن عام مسلمان شہداء سے مرتبہ و فضیلت میں کہیں ارفع و اعلیٰ ہیں' کیوں زندہ نہ ہوں!!

اس تمام بحث اور حوالہ جات کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے پیغمبر اور رسول اپنی قبورِ مبارکہ میں صحیح و سالم جسموں کے ساتھ زندہ ہیں اور وہ رب تعالیٰ کے انعامات واحسانات سے فیض یاب ہوتے ہیں اگرچہ ہمیں اُن کی حیات کا شعور حاصل نہیں۔اسی وجہ سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:
(۱) اَسْمَعُ صَلَاۃَ اَھْلِ مَحَبَّتِیْ وَاَعْرِفُھُمْ (مطالع المسرّت لمحمد مہدی ص ۸۱)
''میں اہلِ محبت کے درود کو سنتا ہوں اور اُنہیں پہچانتا ہوں۔''
(۲) مَامِنْ اَحَدٍ یُسَلِّمُ عَلَیَّ اِلَّا رَدَّاللہُ عَلَیَّ رُوْحِیْ حَتّٰی اَرُدَّ عَلَیْہِ السَّلَامَ (ایضًا)
''جو بھی مسلمان مجھے سلام کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ میری روح مجھ پر لوٹا دیتے ہیں یہاں تک کہ میں سلام کا جواب دیتا ہوں۔''
(۳) وَلَئِنْ قَامَ عَلٰی قَبْرِیْ فَقَالَ: یَامُحَمَّدُ لَاُجِیْبَنَّہٗ (''المطالب العالیہ'' لحافظ ابن حجر عسقلانی)
''اگر عیسیٰ علیہ السلام میرے مزار پر پہنچ کر مجھے میرے نام سے پکاریں تو میں ضرور اُنہیں جواب دوں گا۔''

(۴) مَا مِنْ مُسْلِمٍ سَلَّمَ عَلَيَّ فِي شَرْقٍ وَّلَا غَرْبٍ إِلَّا أَنَا وَ مَلَائِكَةُ رَبِّي نَرُدُّ عَلَيْهِ السَّلَامَ
(''حِلية الاولياء'' لابی نعیم الاصفہانی)

'' مشرق ومغرب میں جو بھی مسلمان مجھے سلام بھیجتا ہے تو میں اور میرے رب کے فرشتے اُس کا جواب دیتے ہیں۔'' (یعنی تمام اکنافِ عالم شرق' غرب' شمال اور جنوب سب اس میں شامل ہیں)

(۵) لَيْسَ مِنْ عَبْدٍ يُصَلِّيْ عَلَيَّ إِلَّا بَلَغَنِيْ صَوْتُه' حَيْثُ كَانَ (''حُجَّةُ اللهِ علی العالمین'' لیوسف بن اسمٰعیل النبہانی' ص ۷۱۳)

''جو بھی بندہ مجھ پر درود بھیجتا ہے تو اُس کی آواز مجھ تک پہنچ جاتی ہے' وہ جہاں کہیں بھی ہو۔''

(۶) قَدْ تَضَمَّنَتِ الْاَحَادِيْثُ الْمُتَقَدِّمَةُ اَنَّ رُوْحَ النَّبِيِّ ﷺ تَرُدُّ عَلَيْهِ وَاِنَّه' يَسْمَعُ وَيَرُدُّ السَّلَامَ
''درجِ بالا احادیث اس بات کا ٹھوس ثبوت ہیں کہ نبی علیہ السلام کی روحِ پاک آپ پر لوٹتی ہے۔ آپ سنتے ہیں اور سلام کا جواب مرحمت فرماتے ہیں۔'' (شِفاء السّقام فی زیارۃ خیر الانام تقی الدین سبکی' ص ۱۳۳)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس دارِ فانی سے پردہ فرما جانے کے بعد بھی آپ پر درود وسلام بھیجنا آپ کے صحابہ اور تابعین کا غیر منقطع اور مسلسل عمل رہا ہے۔ اس سلسلے میں احمد شہاب الدین خفاجی لکھتے ہیں:۔

وَكَانَ مَا دَأْبُ السَّلَفِ أَنَّهُمْ يُرْسِلُوْنَ السَّلَامَ إِلَى رَسُوْلِ اللهِ ﷺ وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يَفْعَلُه' وَ يُرْسِلُ لَه' عَلَيْهِ الصَّلَاةَ وَالسَّلَامَ وَلِأَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا وَرَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَاِنْ كَانَ يَبْلُغُه' سَلَامَ مَنْ سَلَّمَ عَلَيْهِ وَاِنْ كَانَ بَعِيْدًا عَنْهُ لٰكِنْ فِيْ هٰذَا فَضِيْلَةُ خِطَابِه' عِنْدَه' وَ رَدِّه' عَلَيْهِ السَّلَامَ بِنَفْسِه (نسیم الریاض لاحمد شہاب الدین خفاجی ۳ : ۵۱۶)

''نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر سلام بھیجنا ہمارے اسلاف کا طریقہ رہا ہے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بھی یہی طریقہ تھا اور نبی علیہ السلام پر درود وسلام بھیجنے کے ساتھ ساتھ آپ حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو بھی سلام کہتے تھے۔ ہر اُمتی کا درود آپ تک پہنچتا ہے خواہ وہ کتنے ہی دُور فاصلے پر ہو اور آپ اُس کا جواب دیتے ہیں۔ فضیلت اس بات میں ہے کہ آدمی بذاتِ خود سلام کہے اور اس طرح نبی علیہ السلام کی طرف سے رحمتوں اور برکتوں کا جواب حاصل کرے۔'' (بحوالہ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری)

<u>نبی علیہ السلام کی وفات اور حیات دونوں اُمّتِ مسلمہ کے لئے رحمت ہیں</u> : نبی علیہ السلام کی ذاتِ مقدسہ اپنی اُمّت کی بھلائی اور منفعت کے لئے بڑی ہی آرزومند اور مشتاق ہے (بحوالہ سورۃ التوبۃ: ۱۲۸) کیونکہ آپ ہمارے لئے مغفرتِ الٰہی کے طلب گار ہیں۔ درج ذیل احادیثِ مبارکہ اس حقیقت کا ٹھوس ثبوت ہیں:

(۱) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: حَيَاتِيْ خَيْرٌ ''لَكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَ وَفَاتِيْ خَيْرٌ'' لَكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَسَكَتَ الْقَوْمُ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ

عَنْهُ : بِأَبِيْ أَنْتَ وَأُمِّيْ ! كَيْفَ يَكُوْنُ هٰذَا؟ قَالَ: حَيَاتِيْ خَيْرٌ لَّكُمْ يَنْزِلُ عَلَيَّ الْوَحْيُ مِنَ السَّمَاءِ فَأُخْبِرُكُمْ بِمَا يَحِلُّ لَكُمْ وَمَا يُحَرَّمُ عَلَيْكُمْ وَمَوْتِيْ خَيْرٌ لَّكُمْ تُعْرَضُ عَلَيَّ أَعْمَالُكُمْ كُلَّ خَمِيْسٍ فَمَا كَانَ مِنْ حَسَنٍ حَمِدْتُ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ عَلَيْهِ وَمَا كَانَ مِنْ ذَنْبٍ اِسْتَوْهَبْتُ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ("حُجَّةُ اللّٰهِ عَلَى العالمين" لیوسف بن اسمٰعیل النبھانی، ص ۷۱۳)

''حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے تین تین بار فرمایا کہ میری زندگی اور میری وفات تمہارے لئے بہتر ہے۔ صحابہ خاموش بیٹھے رہے لیکن عمر ابن الخطاب بول اُٹھے اور کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! ایسا کیونکر ہے؟ آپ نے فرمایا: میری زندگی تمہارے لئے اس لئے بہتر ہے کہ آسمان سے مجھ پر وحی اترتی ہے تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہارے لئے کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے۔ میری وفات تمہارے لئے بہتر ہے کہ تمہارے اعمال ہر جمعرات کو مجھے پیش کئے جاتے ہیں، تو اُن میں سے اچھے اعمال پر میں اللہ بزرگ و برتر کی حمد وثنا اور اُس کا شکر ادا کرتا ہوں اور بُرے اور گناہ کے کاموں پر میں تمہارے لئے مغفرت کی دعا کرتا ہوں۔'' (بحوالہ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری، صفحہ ۶۴)

(۲) حَيَاتِيْ خَيْرٌ لَّكُمْ تُحَدِّثُوْنَ وَيُحَدَّثُ لَكُمْ فَإِذَا أَنَا مِتُّ كَانَتْ وَفَاتِيْ خَيْرٌ لَّكُمْ تُعْرَضُ عَلَيَّ أَعْمَالُكُمْ فَإِذَا رَأَيْتُ خَيْرًا حَمِدْتُ اللّٰهَ فَإِذَا رَأَيْتُ شَرًّا اِسْتَغْفَرْتُ اللّٰهَ لَكُمْ (مجمع الزوائد لعلی بن ابوبکر الھیثمی ؛ "مطالب العالية" لحافظ ابن حجر عسقلانی ؛ "طبقات" لابن سعد)

''میری زندگی تمہارے لئے بہتر ہے جس میں تم مجھ سے باتیں کرتے ہو جس کا تمہیں جواب دیا جاتا ہے۔ جب میں وفات پا جاؤں تو میری وفات تمہارے لئے بہتر ہے کہ تمہارے اعمال مجھ پر پیش کئے جاتے ہیں۔ جب میں اچھے عمل دیکھتا ہوں تو میں اللہ کی حمد وثنا اور اُس کا شکر ادا کرتا ہوں اور جب بُرے اعمال دیکھتا ہوں تو میں تمہارے لئے بخشش کی دعا کرتا ہوں۔''

<u>صلوٰۃ وسلام کے روحانی فوائد</u>: ٹیکنالوجی کی ترقی کے اِس دَور میں فاصلوں کے ختم ہونے اور ابلاغ کے قریب تر ہونے کے باوجود انسان عرصۂ حیات میں اپنے آپ کو تن تنہا محسوس کرتا ہے۔ انسان اپنی تمام مادّی ضروریات و احتیاجات کو پانے میں کامیاب رہا ہے لیکن اندرونی طور پر وہ امن وسکون کا پیاسا ہے۔ بے چارہ مسلمان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اسلام کا سرسری اور سطحی علم اور ہمارے دینِ اسلام کی حقیقی روح تک پہنچنے میں کمی صرف ظاہری رسوم ورواج تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ آج کا مسلمان عبادت کی محض مبادیات کے کر لینے ہی کو کافی سمجھتا ہے اور اُس کی توجہ اُن اندرونی تقاضوں کی طرف نہیں جاتی جو ذہنی سکون اور طمانیتِ قلبی کا باعث ہیں۔

اس روحانی خلا کو پُر کرنے کے لئے اُمّت مسلمہ کو اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ روحانی تعلق قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ ﷺ کے ساتھ خلوص اور محبت ایسا مضبوط رشتہ قائم کرتے ہیں کہ کوئی دنیاوی یا

شیطانی حملہ اس بندھن کو نہیں کھول سکتا۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ یہی طاقتور، مستحکم اور نا قابلِ جدا رشتہ ہی تو تھا جو آپ کے صحابہ کرام کے اعلیٰ و ارفع مقام کا سبب بنا۔ نبی علیہ السلام نے انہی معزز ہستیوں کو بہترین مثالی ہستیاں قرار دیا تھا جب آپ نے فرمایا تھا:

خَیرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِی ثُمَّ الَّذِینَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِینَ یَلُوْنَھُمْ (صحیح بخاری: کتاب الشھادات' کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ' کتاب الرقاق ؛ جامع ترمذی: کتاب المناقب)

''زمانے کے بہترین لوگ میرے زمانے کے لوگ ہیں' پھر وہ جو اُن کے بعد آئیں گے' اور پھر وہ جو اُن کے بعد آئیں گے۔''

''اس قابلِ رشک عزت وعظمت کا بڑا سبب اُن کا نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے قریبی اور نا قابلِ جدا رابطہ اور تعلق تھا۔ صحابہ کرام آپ ﷺ ہی کے ساتھ رہتے تھے' آپ ہی کے ساتھ عبادت کرتے تھے' آپ ہی کی جانب سے کفر و طاغوتی طاقتوں سے لڑتے تھے اور ہر مشکل وقت میں آپ کی مدد کرتے تھے۔ اُنہیں آپ سے وہ محبت اور تعظیم تھی جو کسی اور سے نہ تھی۔ ایسی وفا اور خلوص کے بدلے میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اُنہیں وہ مقام اور رتبہ عطا کیا جو بعد میں آنے والے کسی مسلمان کو عطا نہیں کیا۔ صحابہ کرام کے بعد کے زمانوں میں آنے والے کئی مسلمان علماء و فضلاء تقویٰ اور روحانیت میں اپنی مثال آپ تھے اور اُن کے علم و فضل کو آج دشمنِ اسلام بھی تسلیم کرتا ہے۔ عبدالقادر جیلانی' غزالی' رازی' رومی اور جامی کے نام کس نے نہیں سنے؟ لیکن ان تمام فضیلتوں اور کمالات کے باوجود اُن میں سے کوئی بھی ابوبکر صدیق' عمرِ فاروق' عثمانِ غنی اور علی بن طالب رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مقام حاصل نہ کر سکا۔''

''ہر کہ و مہ کو بخوبی معلوم ہے کہ تعلق قائم کرنے کی ابتدا سلام کرنے سے ہوتی ہے۔ کسی اجنبی شخص سے تعلق قائم کرنے اور باہمی محبت و اخوت پیدا کرنے کا واحد طریقہ اُسے سلام پیش کرنا ہوتا ہے۔ اسلام نے ہمیں ہر مسلمان بھائی کو' خواہ وہ اپنا ہو یا بیگانہ' سلام کہنے کا حکم دیا ہے۔ اس طرح مسلمان بھائی کو سلام پیش کرنا بڑی مضبوط اتحادی قوت ہے جو بغض و عداوت اور نفرت کے تمام منفی جذبات کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے اور جس کی وجہ سے دشمن بھی دوست بن جاتا ہے۔ لہٰذا نبی ﷺ پر درود و سلام بھیجنا' آپ کے ساتھ رابطہ رکھنے کا بہترین طریقہ ہے۔''

''پس جب ایک پُر جوش مسلمان باقاعدگی سے مستقل طور پر نبی ﷺ کے ساتھ رشتہ استوار کرنے کا آغاز درود و سلام سے کرتا ہے تو نبی علیہ السلام کی جانب سے اُس کی ستائش کا تدریجی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ ایک سچے مسلمان کی اس سے بڑی کون سی آرزو ہو سکتی ہے کہ اس کا تعلق اللہ کے محبوب سے استوار ہو جائے!!'' صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَسْلِیمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا

''صلوٰۃ و سلام کے کچھ روحانی فوائد السخاوی کی کتاب ''القولُ البدیع فی الصَّلوٰۃ علی الحَبیب الشَّفیع'' سے ماخوذ ہیں۔''
("Greetings & Salutations on the Holy Prophet " .. Prof. Dr.Muhammad Tahir-ul-Qadri, pp. 69-72)

(Mohammad ﷺ ۴۳۸۱ (محمد

(100) اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ (القصص:۵۶)

''جسے آپ (ہدایت پر لانا) چاہتے ہیں' اُسے صاحبِ ہدایت آپ خود نہیں بناتے بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے' صاحبِ ہدایت بنا دیتا ہے۔'' (۲۸ : ۵۶)

اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ جب حضور علیہ السلام کے چچا ابو طالب کا آخری وقت آ پہنچا تو حضور علیہ السلام نے اُنہیں کہا کہ چچا! تم صرف اتنا کہہ دو کہ لَا اِلٰـــــهَ اِلَّا اللّٰہ تاکہ میں اپنے رب سے تیری شفاعت کر سکوں لیکن اُنہوں نے ایسا کہنے سے انکار کر دیا تو اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بات بھی مروی ہے کہ آخری وقت میں جنابِ ابو طالب کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ حضرت عباس نے کان لگا کر سنا۔ حضور ﷺ نے پوچھا کہ کیا کہہ رہے تھے تو آپ نے جواباً عرض کیا کہ وہی کہہ رہے تھے جس کا آپ نے اُن سے مطالبہ فرمایا تھا۔ (سیرت ابنِ ہشام)

لیکن اگر کسی کے نزدیک دوسری روایتیں اس روایت سے زیادہ قابلِ اعتبار ہوں تب بھی اسے آپ کے حق میں کوئی ناشائستہ بات کہنے سے گریز کرنا چاہئے۔ جنابِ ابو طالب کی بے مثل خدمات کا یہ معاوضہ ہماری طرف سے نہیں دیا جانا چاہئے کہ ہم منبروں پر کھڑے ہو کر اپنا سارا زورِ بیان اُنہیں کافر ثابت کرنے اور کہتے چلے جانے پر ہی صَرف کرتے رہیں۔ اس سے بڑھ کر ناشکری اور احسان فراموشی کی کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ علاّمہ آلوسی لکھتے ہیں :

''حضرت ابو طالب کے ایمان کا مسئلہ اختلافی مسئلہ ہے۔ جو لوگ آپ کے ایمان کے قائل نہیں' اُنہیں بھی یہ مناسب نہیں کہ اپنی زبان پر کوئی ناروا جملہ لے آئیں کیونکہ اس سے حضرت سیّدنا علی کرّم اللہ وجہہ' کی اولاد کو اذیّت پہنچتی ہے اور کوئی بعید نہیں کہ حضور سرورِ عالم ﷺ کا دل مبارک بھی رنجیدہ ہوتا ہو۔ ہر عقلمند آدمی جانتا ہے کہ ایسے نازک مقامات پر احتیاط سے کام لینا چاہئے۔'' (ضیاء القرآن' ج ۳' ص ۵۰۰)

رب تعالیٰ اِس آیت میں اپنے محبوب کریم ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے حبیب! ہدایت بخشنا تیرا کام نہیں کہ جسے تو چاہے ہماری مرضی نہ ہونے کے باوجود تو اُسے ہدایت دے دے کیونکہ ہم خوب جانتے ہیں کہ کون اس قابل ہے کہ اُس کے دل میں ایمان کی شمع فروزاں کی جائے اور کس میں اس نعمتِ جلیلہ کو قبول کرنے کی استعداد ہے۔ لَا تَهْـــدِىْ کے ایک معنیٰ تو راہ دکھانے کے ہوتے ہیں۔ یہاں اس کی نفی پیغمبر کی ذات سے نہیں ہو رہی۔ وہ تو پیغمبر کے عین فرائض میں داخل ہے جیسا کہ فرمایا: اِنَّكَ لَتَهْـدِىْٓ اِلٰـى صِـرَاطٍ مُّسْتَـقِيْـمٍ (سورۃ الشُّـورىٰ:۵۲) یعنی ''بیشک آپ ہی صراطِ مستقیم دکھاتے ہیں''۔ اس کے دوسرے معنیٰ منزل مقصود تک پہنچا دینے کے ہیں۔ یہاں نفی اس کی کی جا رہی ہے کہ یہ رسول کے بس کی چیز نہیں بلکہ تمام تر مشیتِ تکوینی کے تابع ہے۔

(Mohammad ﷺ ۴۳۸۲) محمد

علامہ احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ رب تعالیٰ ہدایت کی روشنی اپنی حکمت و مصلحت کے تحت ہی دیا کرتا ہے۔ اُس نے رُشد و ہدایت کی قوّت اور اختیار اپنے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عزت و عصمت کے تحفظ کی خاطر اُنہیں نہیں دیا کہ کہیں ہدایت سے محروم لوگ آپ کی عظمت و رفعت کو یہ کہہ کر گھٹانے کی کوشش نہ کریں کہ ہمیں تو اس (نبی) نے رشد و ہدایت نہیں دی۔

آیت مذکورہ میں ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایسے حالات میں ہمیں افسردہ نہیں ہونا چاہئے۔ جن سے ہمیں محبت ہے، ضروری نہیں کہ وہ ہمارے نظریات اور عقیدے سے متفق ہوں اس لئے ہمیں اپنی ناقص عقل کی روشنی میں نہیں پرکھنا چاہئے۔ خالقِ حقیقی ہی چیزوں کے باطن کو بخوبی جانتا ہے۔

(101)، یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا مَعَہٗ نُوْرُھُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَ بِاَیْمَانِھِمْ (التّحریم : ۸)

"اُس دن اللہ تعالیٰ (اپنے) نبی (ﷺ) کو اور اُن اہلِ ایمان کو جو اُن کی معیّت میں ہیں، رسوا نہیں کرے گا، اُن کا نور اُن کے آگے اور اُن کے دائیں طرف (روشنی دیتا ہوا) تیزی سے چل رہا ہوگا۔" (۸ : ۶۶)

کفارِ مکّہ کو اپنی دولتمندی اور سرداری پر بڑا گھمنڈ تھا۔ مسلمانوں کی غربت و ناداری اور بے بسی کو دیکھ کر وہ غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے اور اُنہوں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا تھا کہ اوّل تو قیامت واقع ہونے کی نہیں اور اگر وہ آ بھی گئی تو تمام تر عزت اور شان صرف اُنہی کی ہوگی اور یہ بیچارے مسلمان اسی طرح محروم اور بدحال رہیں گے جیسے وہ اِس دنیا میں ہیں۔ اُن کی اس غلط فہمی کو دُور کرنے کے لئے محوّلہ بالا آیت کا نزول ہوا جس میں مسلمانوں کو یہ مژدۂ جانفزا سنایا گیا کہ وہ دن میرے محبوب علیہ السلام اور اُن کے پیروکاروں کے لئے شادمانی اور مسرّت کا دن ہوگا۔ ربِّ ذوالجلال والاکرام اقلیمِ رسالت کے اِس آخری تاجدار ﷺ کو مقامِ محمود پر سرفراز فرما کر اُس کی عزت و توقیر میں اضافہ کرے گا، لواء الحمد (حمد وثنا کا جھنڈا) اُس کے مقدس ہاتھوں میں ہوگا اور تمام انبیاء علیہم السلام آپ کے اُس جھنڈے کے نیچے پناہ لیں گے۔ مسلمان جو آپ پر ایمان لائے، کیا ہی خوب اور عمدہ اُن کا مقام ہوگا! اپنے خالق کی جانب سے اُنہیں لاتعداد عطیات و تحائف ملیں گے اور اُنہیں اپنے والدین، اپنے اہلِ خانہ، اولاد، اپنے دُور و قریب رشتہ داروں اور دوستوں اور لواحقین کی شفاعت کرنے کی اجازت ملے گی۔ وہ نورِ الٰہی کو زیادہ سے زیادہ پائیں گے اور بدی کی ظلمت و تاریکی اُن سے دُور کر دی جائے گی۔ پس اُس دن اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے محبوب علیہ السلام اور آپ کے پیروکاروں کو رُسوا نہیں کرے گا۔ اِن کفار کے قیاسات تخیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے اور اُن کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

خیال رہے کہ جدّ الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اِن الفاظ میں فریاد کی تھی : لَا

تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ (سورة الشعراء: ۸۷) یعنی ''اے پروردگار! مجھے اُس دن رُسوا نہ کرنا جس دن لوگ قبروں سے اُٹھائے جائیں گے۔'' (۲۶:۸۷)۔ اُن کی اس دعا کو شرفِ قبولیت بخشا گیا' لیکن کب؟ صرف اُن کے مانگنے اور اُن کی التجا پر یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن کائنات کے دولھا کی شان ہی نرالی ہے۔ فرمایا کہ نہ صرف اپنی تخلیق کے اِس شاہکار کو رسوانہیں کروں گا بلکہ آپ کے ماننے والوں اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو حرزِ جاں بنانے والوں کو بھی رُسوانہیں کروں گا۔ نہ صرف یہ بلکہ اُنہیں ایسی نوازشات سے نوازوں گا جو نہ کسی آنکھ نے دیکھے ہوں گے اور نہ ہی تخیل کے لاکھ گھوڑے دوڑانے سے وہ کسی کے حیطۂ خیال میں آسکتے ہیں (سورہ الٓمّ السجدۃ: ۱۷)۔

اہلِ ایمان میدانِ حشر میں بالکل ممتاز حیثیت کے ہوں گے۔ اُن کے آگے اُن کا نورِ ایمان چمک رہا ہوگا' اُن کے دائیں جانب بھی روشنی ہی روشنی ہی ہوگی اور دوسرے لوگ اندھیروں میں ٹھوکریں کھا رہے ہوں گے۔ اہلِ ایمان پر یہ نوازشاتِ کریمانہ صرف اور صرف اسی وجہ سے ہوں گی کہ اُنہوں نے میرے محبوب کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا اور اُنہیں بہ دل و جان میرا سچا رسول تسلیم کرلیا جبکہ میرے رسول کے مخالفین میرے رسول کے نہ ہو سکے تو وہ میرے کیسے ہو سکتے ہیں اِس لئے انجام بد اُن کا مقدر بن کے رہ گیا۔ سبحان اللہ! کس کس طریق سے شانِ صمدیّت اپنے بے مثال شاہکار کی عظمت کو اجاگر کر رہی ہے!

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ وَ بِأَيْمَانِهِمْ (اُن کا نور اُن کے سامنے اور اُن کے داہنے دَوڑ رہا ہوگا) یہ اُس وقت ہوگا جب اہلِ ایمان پُل صراط پر سے گزر رہے ہوں گے۔ (تفسیر ماجدی' ص ۱۱۲۳' نوٹ: ۱۴)

(102) إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًاo (الاحزاب:۳۳)
''اے (رسول کے) اہلِ بیت! دراصل اللہ چاہتا ہے کہ تم سے ہر قسم کے گناہ کا میل (اور شک و نقص کی گرد تک) دُور کر دے اور تمہیں (کامل) طہارت سے نواز کر بالکل پاک وصاف کر دے۔'' (۳۳:۳۳)

یہ آیت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اَزواجِ مطہرات کی شان میں نازل ہوئی جو ''آیتِ تطہیر'' کے نام سے موسوم ہے۔

<u>ایک اعتراض اور اُس کا ازالہ:</u> کچھ شارحینِ قرآن' نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ازواج کو آپ کے اہلِ بیت میں شامل کرنے کو نہیں مانتے کیونکہ اُن کے بقول آیتِ بالا (۳۳) میں مذکر ضمیر کُـــمْ کی دوہری تکرار اُنہیں نبی علیہ السلام کے اہلِ بیت میں شامل کرنے میں رکاوٹ ہے۔ اُن کا اصرار ہے کہ آیتِ مذکورہ کے نزول پر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت فاطمہ' حضرت علی' حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کو بلا کر فرمایا:
هٰؤُلَاءِ أَهْلِ بَيْتِىْ (یہ میرے اہلِ بیت ہیں)

<u>جواب</u>: اہلِ بیت کا مطلب ہوتا ہے گھر والے۔ اس لئے ہر قوم اور معاشرے میں اور عرفِ عام میں

اس سے انسان کے اپنے گھر والے' بیوی بچے اور اہل وعیال مراد لئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیوی کو ''اہلیہ'' اور ''گھر والی'' کہتے ہیں۔ قرآن پاک اس پر مستقل سند ہے اور وہ ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ سیّدہ سارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو (سورہ ھود: ۳۷ میں) اور موسیٰ علیہ السلام کی زوجہ محترمہ سیّدہ صفورا رضی اللہ عنہا کو (سورۃ النمل: ۷' سورۃ القصص: ۲۹ میں) اُن کے خاوندوں کے ''اہلِ بیت'' کہتا ہے۔ اس لئے جب ان مذکور انبیاء علیہا السلام کی ازواج اُن کے اہلِ بیت ہیں تو حبِ آخرالزماں ﷺ کی ازواج آپ کی اہلِ بیت کیوں نہ ہوں!

رہا آیت مذکورہ (۳۳:۳۳) میں ضمیر کُمْ کی تکرار کا سوال تو اس کا جواب یہ ہے کہ آیت کا لفظِ اَھْل مذکر ضمیر کا متقاضی ہے جس کا ثبوت درج ذیل آیات ہیں:

(۱) قَالُوْا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِاللّٰهِ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ (ھود: ۷۳)
یہاں اَھْل کی وجہ سے مذکر ضمیر کُمْ استعمال ہوئی ہے۔

(۲) قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْا اِنِّيْ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْجَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ O (القصص: ۲۹)☆

''موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی اہلیہ سے فرمایا: تم یہیں ٹھہرو' میں نے آگ دیکھی ہے شاید میں تمہارے لئے اس (آگ) سے کچھ (اس کی) خبر لاسکوں یا آتشِ سوزاں کی کوئی چنگاری تاکہ تم تاپ سکو۔'' (۲۹ : ۲۸) [یہاں بھی اَھْل کی وجہ سے مذکر ضمیر کُمْ استعمال ہوئی ہے۔]

پہلی آیت میں جناب خلیل اللہ کی زوجہ محترمہ کو اور دوسری آیت میں موسیٰ علیہ السلام کی زوجہ مطہرہ کو اور پھر آیتِ تطہیر میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ازواجِ مطہرات کو ''اہلِ بیت'' کہا گیا ہے جو اس حقیقت کا غماز ہے کہ بنیادی طور پر انسان کے اہل وعیال اور بیوی بچوں ہی کو اہل کہتے ہیں۔ بات کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یہاں ایک اور حقیقت کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ انسان کا نسب بیٹے کی طرف سے جاری ہوتا ہے' بیٹی کی طرف سے نہیں۔ پوتا اپنے دادا کے نسب کا وارث اور اُس کے خاندان کا ایک فرد شمار ہوتا ہے' نواسہ نہیں کیونکہ وہ بیٹی کی اولاد ہوتا ہے اور بیٹی جس خاندان میں چلی جائے' اُس کی اولاد بھی اُسی خاندان کی متصوّر ہوتی ہے لیکن حضور ﷺ نے ایک خاص حکمت کے پیشِ نظر اپنی ذات کی حد تک اِن دونوں تصوّرات کو بدل دیا جن کی تفصیل یہ ہے:

''حضور ﷺ خاتم النّبیین ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی پیدا نہیں ہوسکتا۔ آپ کے اِسی مقام ومرتبہ کی وجہ

☆ موسیٰ علیہ السلام کا اپنی زوجہ محترمہ کے لئے آتِیْکُمْ اور تَصْطَلُوْن کے جمع کے صیغے استعمال کرنے میں ایک وجہ تو اُن کی تکریم اور عزت ہوسکتی ہے (تفسیر کبیر) اور یا پھر اس خطاب میں اُن کی زوجہ' اُن کا بچہ اور خادم شامل ہیں (روح البیان)۔ تیسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ مصر کو واپسی میں کچھ چرواہے آپ کی بھیڑ بکریوں کی نگرانی کے لئے آپ کے ہمراہ ہو لئے تھے کیونکہ تورات کی ایک آیت اس اغلبیت کی تائید کرتی ہے (پیدائش ۲:۱)۔ ان وجوہ کے باعث جمع مذکر کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔

سے آپ کے حقیقی بیٹے اِس دنیا سے رخصت ہو گئے کیونکہ وہ اگر اس دنیا میں زندہ رہتے اور نبی نہ ہوتے تو یہ ایک عیب تھا کہ عظیم الشان نبی کا بیٹا نبی نہیں۔ اس لئے حکمتِ الٰہی کو یہ منظور ہوا کہ وہ اس دنیا میں نہ رہیں' اس لئے اُنہیں بچپن ہی میں دنیا سے اٹھا لیا گیا۔''

''اب ایک دوسری صورت پیدا ہو گئی کہ اولاد کا نہ ہونا بھی ایک عیب ہے۔ معاشرے میں ایسے شخص کو بہت مطعون اور پریشان کرتے ہیں اور اہلِ مکہ نے ایسا ہی کیا۔ جب کئی مرتبت آقا علیہ السلام کے تمام بیٹے یکے بعد دیگرے فوت ہو گئے تو اُنہوں نے آپ کو طعنہ دینا شروع کیا کہ آپ ''اَبْتَر'' ہیں یعنی بیٹوں سے محروم ہیں اس لئے آپ کا سلسلۂ نسب منقطع ہو گیا اور نسل آگے نہیں بڑھے گی۔ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ نر اولاد نہ ہونے کے باوجود آپ کی نسل پھلے پھولے اور نسب آگے بڑھے۔ چنانچہ سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد کو ایک خاص خصوصیت عطا کی گئی اور آپ ﷺ نے امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کے بارے میں فرمایا:
هٰذَانِ اِبْنَایَ وَابْنَا بِنْتِی (میری بیٹی کے یہ دونوں بیٹے' میرے بیٹے ہیں)۔

آپ حسنین کریمین کو بیٹوں ہی کی طرح چومتے' سونگھتے' چمٹاتے اور بے حد پیار کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اللہ کی بارگاہ میں عرض کی: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اُحِبُّهُمَا فَاحِبَّهُمَا وَاَحِبَّ مَنْ یُّحِبُّهُمَا (اے اللہ! میں اِن دونوں سے محبت کرتا ہوں' تو بھی اُنہیں محبوب بنا لے اور جو اُن سے محبت کرے تو اُسے بھی محبوب بنا لے)۔

''اس طرح حضور ﷺ نے اولادِ زہرہ رضی اللہ عنہا کو اپنی اولاد قرار دے کر سارا مسئلہ ہی حل کر دیا۔ یہ اعزاز صرف سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولادِ پاک ہی کو حاصل ہے کہ اُنہیں حضور ﷺ کی اولاد کہا جاتا ہے اور یہ بھی حضور ﷺ ہی کی خصوصیت ہے کہ آپ کا نسب بیٹی کی طرف سے جاری ہوا۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے ایسی برکت دی کہ آج ساداتِ کرام پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔''

''حضور ﷺ نے خاص حکمت کے تحت ''اہلِ بیت'' کے تصور میں بھی تبدیلی فرمائی۔ عرفِ عام میں صرف اپنے اہل و عیال اور صُلبی اولاد ہی کو ''اہلِ بیت'' یا ''آل'' کہتے ہیں لیکن آپ نے ایک خاص فرمان کے ذریعہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ' کو بھی اس میں شامل فرمایا۔

آیت دراصل اپنے عبارۃ النص کی رُو سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ازواجِ مطہرات کی شان میں نازل ہوئی لیکن اُنہیں یہ فضیلت اُن کے سروں کے تاج حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بدولت حاصل ہو رہی ہے لہٰذا اشارۃ النص کی رُو سے آیت میں آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمت و رفعت کا بیان ہے۔

یہاں پھر خیال رہے کہ جناب ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے رب تعالیٰ سے دعا کی تھی: وَاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ

اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (سورہ ابراھیم : ۳۵) یعنی ''مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچالے۔'' (۱۴:۳۵) اُن کی دعا اور التجا کو اُن کی فریاد اور درخواست پر پذیرائی بخشی گئی لیکن یہاں محبوب علیہ السلام کے گھرانے پر بن مانگے عنایتِ خسروانہ کی جارہی ہے۔ اُس شانِ کریمی کے مالک کی بندہ پروری اور بندہ نوازی کے کیا کہنے!

(103) اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ O (الانشراح : ۱)

''کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ (انوارِ علم و حکمت اور معرفت کے لئے) کشادہ نہیں فرما دیا؟'' (۹۴:۱)

امام راغب اصفہانی ''مفردات القرآن'' میں لکھتے ہیں کہ گوشت کاٹنے اور اُس کے ٹکڑے کرنے کو الشرح کہتے ہیں ☆۔ اسی سے شرحِ صدر ماخوذ ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ نورِ الٰہی سے سینہ کا کشادہ ہو جانا' اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسکین و طمانیت کا حاصل ہو جانا اور اُس کی طرف سے مسرت و راحت کا شعور پیدا ہو جانا۔

علامہ سید محمد آلوسی نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ الشرح اصل میں کشادگی اور فراخی کا مفہوم

☆ یہ آیت بھی تشریح الابدان' عملِ جراحی اور اس میدان میں تحقیقات کے لئے محرّک بنی ہے۔ اس کی مزید تائید اُس واقعہ سے ہوتی ہے جو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لڑکپن کے زمانہ میں ہوا جب آپ اپنے رضاعی والدین کے ہمراہ تھے۔ یہ واقعہ کتبِ حدیث اور کتبِ تاریخ میں درج ہے۔ آپ کے رضاعی والدین کہتے ہیں:۔

''مکہ سے ہماری واپسی کے چند ماہ بعد آپ ﷺ اور آپ کا رضاعی بھائی خیموں کے پیچھے ہماری بھیڑ بکریوں کے ساتھ تھے جبکہ آپ کا بھائی بھاگتا ہوا آیا اور ہمیں کہا کہ سفید لباس میں ملبوس دو آدمیوں نے میرے اُس قریشی بھائی کو پکڑ کر نیچے گرا دیا ہے' اُن کا پیٹ چاک کیا ہے اور اُسے خوب ہلا رہے ہیں۔ ہم آپ کی طرف گئے اور پوچھا کہ معاملہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: سفید لباس میں ملبوس دو آدمی آئے' مجھے نیچے گرا کر میرا پیٹ چاک کیا اور اُس میں۔۔ مجھے نہیں معلوم۔۔ کہ کیا تلاش کرنے لگے۔''

کچھ مفسرین کے نزدیک سورۃ الانشراح کی اوّل آیت کا تعلق درج بالا واقعہ سے ہے اور اِس واقعہ اور آیت نے اسلامی تہذیب کے ابتدائی زمانہ میں عملِ جراحی اور تشریح الابدان کو تحریک دی ہے اور علاج کے اس پہلو کو اختیار کرنے میں بہت سے معالجین کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں اگر ہم ابن سینا' ابوالقاسم الزہراوی' علاؤ الدین ابنِ نفیس' ابن القف اور شمس الدین عکفانی جیسے مشہور زمانہ معالجین کو عملِ جراحی کرتا ہوا دیکھتے ہیں۔

("Quranic Sciences"... Afzalur Rahman, p. 127)''

پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے حکیم مطلق' علیم و خبیر خالق سے جراحی کا علم پا کر ''علاج بذریعہ آپریشن'' کی بنیاد رکھی اور اس طرح جراحی کی عظیم مثال قائم کی۔ جراحی (سینگی لگوانے) سے متعلق چند احادیث کا ذکر حدیث لٹریچر میں آتا ہے۔

ادا کرتا ہے۔ کسی الجھی ہوئی اور مشکل بات کی توضیح کو بھی شرح کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ شرح کے لفظ کا استعمال دلی مسرت اور قلبی خوشی کے لئے بھی ہوتا ہے۔ آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ شرحِ صدر کا یہ مفہوم بھی لیا جاتا ہے کہ نفس کو قوتِ قدسیہ اور انوارِ الٰہیہ سے اس طرح مؤید کرنا کہ معلومات کے قافلوں کے لئے میدان بن جائے' ملکات کے ستاروں کے لئے آسمان بن جائے اور گوناگوں تجلیات کے لئے عرش بن جائے۔ جب کسی کی یہ کیفیت ہوتی ہے تو اُسے ایک حالت' دوسری حالت سے مشغول نہیں کرسکتی۔ اُس کے نزدیک مستقبل' حال اور ماضی سب یکساں ہو جاتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ اس مقام پر اللہ تعالیٰ اپنے احسان کا ذکر فرما رہا ہے' اس لئے یہاں شرحِ صدر کا یہی آخری معنیٰ زیادہ مناسب ہے۔''

''اس تحقیق کے بعد علامہ آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ کیا ہم نے آپ کے سینہ کو کشادہ نہیں کردیا کہ غیب و شہادت کے دونوں جہاں اس میں سما گئے ہیں' استفادہ اور افادہ کی دونوں ملکتیں جمع ہو گئی ہیں۔ علائقِ جسمانیہ کے ساتھ آپ کی وابستگی ملکاتِ روحانیہ کے انوار کے حصول میں رکاوٹ نہیں۔ خلق کی بہبودی کے ساتھ آپ کا تعلق معرفتِ الٰہی میں استغراق سے رکاوٹ نہیں۔'' (ضیاء القرآن' جلد پنجم' ص ۵۹۷)

علامہ ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کی تفسیر بیان کی ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں :

''اس میں علوم و معارف کے سمندر اتار دئے اور لوازمِ نبوت اور فرائضِ رسالت برداشت کرنے کو بڑا وسیع حوصلہ دیا۔''

''اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوبِ مکرم ﷺ کو جو علوم و معارف عطا فرمائے' امام بوصیری نے قصیدہ بردہ میں اُنہیں یوں بیان کیا ہے :

فَاِنَّ مِنْ جُوْدِكَ الدُّنْيَا وَضَرَّتَهَا وَمِنْ عُلُوْمِكَ عِلْمُ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

''دنیا اور آخرت دونوں آپ کی جود و کرم کے مظہر ہیں اور لوح و قلم کا علم آپ کے علوم کا ایک حصہ ہے۔''

شاعرِ مشرق علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے بھی اس قسم کی بات منظوم کی :

لوح بھی تو' قلم بھی تو' تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے وجود میں حباب

''حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ساری زندگی اس آیت کی آئینہ دار ہے۔ آپ نے جس بلند حوصلگی اور اولوالعزمی سے فرائضِ نبوت کو ادا کیا' جس صبر و شکر کے ساتھ اِس راہ میں آنے والی مشکلات کو برداشت کیا' وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے شرحِ صدر کے بغیر ممکن نہ تھا۔ پھر آپ نے انسانی زندگی کے ہر پہلو کو اپنے علم کے نور سے

منوّر کیا‘ اسے بھی شرح صدر کی برکت کے بغیر اور کیا کہا جا سکتا ہے۔‘‘

’’اِس آیت میں غور کرنے سے کلیم اور حبیب کے درمیان فرق بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ دونوں کو شرحِ صدر بخشا گیا لیکن کلیم کو مانگنے پر (بحوالہ سورہ طٰہٰ: آیت ۲۵) اور حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بن مانگے۔ پھر دونوں کے شرحِ صدر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔‘‘

(۱۰۵) (104) وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ (الانشراح : ۴)

’’اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا ذکر (اپنے ذکر کے ساتھ ملا کر) بلند فرما دیا۔‘‘ (۴ : ۹۴)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خصائلِ حمیدہ‘ آپ کی عظمتِ کردار اور نوعِ انسانی کے لئے آپ کی والہانہ محبت کو آپ کی حیاتِ طیّبہ ہی میں تسلیم کر لیا گیا تھا اور آپ کا نامِ نامی دنیا کے عظیم قائدین میں سرِ فہرست ہے۔ آپ کی شان میں محولہ بالا آیت اپنے معنیٰ و مفہوم میں سورہ الصّافّات کی اُس آیت ۱۱۹ سے کہیں زیادہ جامع ہے جو مختلف انبیاء علیہم السلام کے بارے میں آئی ہے : وَتَرَكۡنَا عَلَيۡهِمَا فِي الۡاٰخِرِيۡنَ ’’ اور ہم نے اُن دونوں یعنی موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے حق میں (بھی) پیچھے آنے والوں میں ذکرِ خیر باقی رکھا۔‘‘ (۱۱۹:۳۷)

<u>ذِكۡرَكَ سے پہلے لَكَ لانے کی افادیت</u>: یہاں صرف وَرَفَعۡنَا ذِكۡرَكَ کہہ دینا ہی کافی تھا جس سے معنیٰ پوری طرح سمجھ میں آ جاتا تھا۔ لیکن نہیں‘ الٰہی حکمت و دانش تاجدارِ انبیاء ﷺ کے عظیم مرتبہ کو مزید اجاگر کرنے کی متقاضی تھی۔ ذِكۡرَكَ سے پہلے لَكَ کا لفظ لا کر اس حقیقت کو جتلانا مقصود ہے کہ (۱) پیارے حبیب! یہ اعزاز و اکرام صرف آپ کے لئے ہے‘ کسی اور کے لئے نہیں۔ (۲) ہم نے نہ صرف آپ کے ذکر کو بلند کیا ہے بلکہ اُن کے ذکر کو بھی بلند کر دیا ہے جو آپ کی شان و عظمت کے ڈنکے بجاتے ہیں۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
اَتَانِي جِبۡرِيۡلُ عَلَيۡهِ السَّلَامُ وَقَالَ : إِنَّ رَبَّكَ يَقُوۡلُ : اَتَدۡرِيۡ كَيۡفَ رَفَعۡتُ ذِكۡرَكَ؟ قُلۡتُ : اَللّٰهُ تَعَالٰى اَعۡلَمُ قَالَ : إِذَا ذُكِرۡتُ ذُكِرۡتَ مَعِيۡ

’’جبریل میرے پاس آئے اور کہا کہ آپ کا ربِّ کریم پوچھتا ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ میں نے آپ کے ذکر کو کس طرح بلند کیا؟ میں نے جواب دیا: اسے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کے رفعِ ذکر کی کیفیت یہ ہے کہ جہاں میرا ذکر کیا جائے گا‘ وہاں آپ کا بھی میرے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔‘‘

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

''اس سے بڑھ کر رفعِ ذکر کیا ہو سکتا ہے کہ کلمۂ شہادت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نام کے ساتھ اپنے محبوب کا نام ملا دیا' حضور کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا' ملائکہ کے ساتھ آپ پر درود بھیجنا اور مومنوں کو درود پڑھنے کا حکم دیا اور جب بھی خطاب کیا' معزز القاب سے خطاب فرمایا' پہلے آسمانی صحیفوں میں بھی آپ کا ذکرِ خیر فرمایا' تمام انبیاء اور اُن کی اُمتوں سے وعدہ لیا کہ وہ آپ پر ایمان لے آئیں۔آج دنیا کا کوئی آباد ملک ایسا نہیں جہاں روز و شب میں پانچ بار حضور کی رسالت کا اعلان نہ ہو رہا ہو۔''

''جن حالات میں یہ آیت نازل ہوئی' کون تصور کر سکتا تھا کہ اُن کا ذکرِ پاک دنیا کے گوشہ گوشہ میں بلند ہوگا' اُن کے دین کی روشنی سے مہذب دنیا کو بہت بڑا علاقہ منور ہوگا اور کروڑوں انسان اُن کے نام پر جان دینے کو اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھیں گے۔لیکن جو وعدہ مولا کریم نے اپنے بندے اور محبوب رسول کے ساتھ کیا وہ پورا ہو کر رہا اور تا قیامت ذکرِ محمدی کا آفتاب ضوفشانیاں کرتا رہے گا۔اعلیٰ حضرت بریلوی نے کیا خوب فرمایا:

مٹ گئے' مٹتے ہیں' مٹ جائیں گے اعداء تیرے　　　　نہ مٹا ہے نہ مٹے گا کبھی چرچا تیرا

''حضور علیہ السلام کے سوانح پر اپنوں اور بیگانوں نے جتنی کتابیں لکھی ہیں' دنیا کے کسی نبی' مُصلح' فاتح اور سلطان کے بارے میں نہیں لکھی گئیں۔بے شمار اعلیٰ پایہ کے لوگوں نے حضور کریم کے ذکرِ پاک کو بلند کرنے کے لئے جس طرح اپنی زندگیاں' اپنی علمی قوتیں' روحانی لطافتیں' اپنا مال اور اپنے وسائل وقف کئے ہیں' کسی دوسرے کے بارے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔آپ ﷺ کے عشاق نے نثر و نظم میں انسانیت کو جو پاکیزہ ادب (Literature) عطا فرمایا ہے' اُس کی نظیر بھی نہیں ملتی۔لادینیت کے اِس دَور میں آپ کے دین کی تبلیغ اور آپ کی سنت کے اِحیاء کی کوششیں بڑے خلوص سے کی جا رہی ہیں۔آپ کا نامِ پاک لے کر' آپ کا ذکرِ خیر کر کے اور آپ کے محاسن سُن کر کروڑوں دلوں کو جو سرور و فرحت نصیب ہوتی ہے' اُس کا جواب نہیں۔اپنے تو رہے ایک طرف' بیگانوں اور متعصب مخالفوں کو بھی بارگاہِ رسالت میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے بغیر چارہ نہ رہا۔''

مثل مشہور ہے: اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ یعنی فضیلت تو اس بات میں ہے کہ دشمن بھی تمہاری خوبیوں کے معترف ہوں اور خوش نصیب ہے وہ عورت جس کی سوکن اُس کے حسن و جمال کی معترف ہو۔

غیر مسلمین کی طرف سے آقا علیہ السلام کے حضور خراجِ عقیدت کی اس بیش بہا لڑی کے کچھ نمونے موقع بہ موقع گزشتہ متعدد صفحات میں ہدیۂ قارئین کرتا آیا ہوں۔اِنہی مستشرقین کے چند اور بیانات ملاحظہ ہوں:

(۱) ''محمد (ﷺ) نے اپنی بساط میں جو کچھ بھی کیا اُس کا محرک آپ کی یہ پُر خلوص آرزو تھی کہ وہ اپنے ہم وطنوں کو بت پرستی کی گھٹیا عادت سے نجات دلائیں۔۔۔آپ کو اس اعلان کی شدید خواہش نے تحریص دلائی کہ اللہ جلّ جلالہٗ کی وحدانیت ہی اصل حق ہے اور اسی جذبہ کا آپ کی روح (پاک) پر کامل قبضہ تھا۔'' (Preface to the Koran.. Rev. Rodwell, p. XXI)

(۲) ''محمد (ﷺ) کا سفرِ حیات اُس قوت اور جانداری کی حیران کن مثال ہے جو صرف اُسی شخص میں ہو سکتے ہیں جو ایمانِ کامل کا مالک ہو، جس کا عقیدے اور اپنے ابنائے جنس کی زندگی اور اخلاقیات پر اثر ہو اور یہ خصوصیات فی الواقع ایک عظیم انسان ہی میں ہو سکتی ہیں۔'' (ایضاً)

(۳) ''یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اگر کسی شخص نے تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا، تو وہ ہستی محمد (ﷺ) کی ہے۔'' (Article "Muhammad's Historical Role" by Charles Issawi, published in "The Muslim World", April, 1950, p. 95)

(۴) محمد (ﷺ) کا موازنہ لوگوں کی اُس طول طویل فہرست سے کیجئے جنہیں دنیا نے مشترک رائے سے ''عظیم'' کہا ہے۔۔۔آپ کے کردار کو بوجوہ کل لیجئے کہ آپ کیا ہیں اور آپ نے کیا کیا اور جن لوگوں نے آپ سے تحریک پائی، اُنہوں نے کیا کیا۔ غرض آپ کی شخصیت تو مجھے اُن سب سے یگانہ، نمایاں اور منفرد معلوم ہوتی ہے۔'' ("Muhammad and Muhammadanism".. Bosworth Smith, pp. 339, 340)

(۵) ''فانی زندگی کے مختصر عرصہ میں محمد (ﷺ) نے مایوس کن مادے (مسالے) سے ایک قوم کو دُہائی دے کر بلایا جو اس سے پہلے کبھی متحد نہ ہوئے تھے اور ایک ایسے ملک میں جو اُس وقت تک محض جغرافیائی اظہارِ بیان تھا، ایک ایسے مذہب کو مستحکم کیا جو وسیع علاقوں میں عیسائیت اور یہودیت سے سبقت لے گیا اور جسے اب تک نسلِ انسانی کے ایک اچھے خاصے حصے کی پذیرائی حاصل ہے آپ نے ایک ایسی مملکت کی بنیاد رکھی جس نے بہت جلد اپنی دُور دراز سرحدوں میں اُس وقت کی مہذب دنیا کے عمدہ ترین علاقوں کو سمو لیا۔'' ("History of the Arabs".. P.K. Hitti, pp. 121, 122)

(۶) ''ایمان کے پہلے ستون کا خلاصہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ میں ہے۔ نوزائیدہ مسلمان بچے کے کان میں پڑنے والے یہ پہلے لفظ ہیں اور یہی الفاظ اُس کی قبر پر پڑھے جانے والے آخری بھی ہیں۔ اِن دونوں سلسلہِ واقعات کے دوران ان الفاظ سے زیادہ کوئی اور الفاظ نہیں دہرائے جاتے۔''

(۷) ''تاریخ میں بیان شدہ ایک ایسا شخص بھی ہے جو بہ یک وقت قانون ساز بھی ہے، ایک مذہب کا بانی بھی ہے اور ایک مملکت کی تاسیس رکھنے والا بھی ہے۔'' ("The Saracens".. Gilman, p. 207)

(۸) ''کیا ہم اس شخص کے متعلق بے تعظیمی سے بات کر سکتے ہیں؟ آپ (ﷺ) کے فرامین اور

ضابطے آج تک نسلِ انسانی کے ایک تہائی کے لئے مذہبی راہنما ہیں۔'' ("Conflict between Religion and Science"... Draper, p. 8)

(۹) ''یہ ابھی انہی سالوں کی بات ہے کہ ہم محمد (ﷺ) اور آپ کے مذہب اسلام کے متعلق مختلف طور پر سوچنے لگے ہیں۔ اب اس بات کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ آپ کو خدا کی طرف سے وحی آتی تھی اور آپ کے مذہب نے کئی لاکھ انسانوں کو شرمناک بُت پرستی سے بچا لیا اور انہیں خدائے واحد کا شریفانہ تصور دیا۔'' (Book of Knowledge, Vol. IV, p. 2282) Educational Book Company, London.

(۱۰) ''یہ یقینی بات ہے کہ کسی اور پیغمبر کی ذاتی عادات ایسے مخلصانہ طور پر ضبطِ تحریر میں نہیں لائی گئیں اور اُن کے پیرکاروں سے ایسے خلوص کے ساتھ اُن کی اتباع نہیں کی گئی اور نہ ہی اُن کے فیصلوں کو الٰہی سند کا درجہ دیا گیا ہے۔'' ("Foundations of Living Faith".. Bhattacharya, p. 45)

بھارت کا ایک وسیع العلم عالم و فاضل پنڈت نور بہار لکھنوی آقائے نامدار ﷺ کو یوں گلدستۂ عقیدت پیش کرتا ہے:۔

دَیر سے نُور چلا یوں کہ حرم تک پہنچا ۔۔۔ فاصلہ میرے گناہوں کا تیرے کرم تک پہنچا
تیری معراج کہ تو لوح و قلم تک پہنچا ۔۔۔ میری معراج کہ میں تیرے قدم تک پہنچا

بھارت کا ہی ایک ہندو وکیل اپنے ایک قصیدے میں یوں گوہر افشانی کرتا ہے:
گر شمس و قمر کو کوئی ہاتھوں پہ اٹھا لے ۔۔۔ اور دولتِ کونین کو دامن میں چھپا لے
پھر کالکا پرشاد سے پوچھے کہ وہ کیا لے ۔۔۔ نعلین محمد کے وہ آنکھوں سے لگا لے

ایک اور ہندو شاعر چوہدری دِتّو رام نے آپ ﷺ کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:
جس دَم دبایا مجھ کو گناہوں کے بار نے ۔۔۔ میں شافعِ گناہ کو لگا پھر پکارنے
حضرت نے آ کے مجھ کو سبکدوش کر دیا ۔۔۔ رحمت بڑی کی شافعِ روزِ شمار نے
دیکھا بنا کے جبکہ محمد کا حُسن و نور ۔۔۔ محبوب اپنا کر لیا پروردگار نے

ہے نام دِتّو رام تخلّص ہے کوثری
دَیر و حرم کی سیر کی اِس خاکسار نے

۴۳۹۲ (محمد ﷺ Mohammad)

سکھ مذہب کے بانی گرو نانک نے محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام نامی کی یوں روشن گری کی ہے:

ہر عدد کو چو گن کرلو، دو کو اُس میں دو بڑھائے — پورے جوڑ کو پنچ گن کرلو، بیس سے اس میں بھاگ لگائے
باقی بچے کو نو گن کرلو، دو کو اُس میں دو بڑھائے — گرو نانک یوں کہے ہر شے میں محمد کو پائے

یعنی ایک چیز کے اعداد معلوم کرلو۔ ان اعداد کو 4 سے ضرب دو، حاصل ضرب میں 2 جمع کر کے اُسے 5 سے ضرب دو۔ پھر حاصل ضرب کو 20 سے تقسیم کرو۔ باقی بچے ہوئے کو 9 سے ضرب دے کر اُس میں 2 جمع کرلو تو جواب 92 آئے گا۔ گرو نانک کو یقین ہے کہ ہر چیز میں آپ کو محمد (ﷺ) کے نام کے اعداد کی خوشبو محسوس ہوگی جو 92 ہے۔ حروفِ تہجی کے مندرجہ ذیل اعداد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

مُحَمّد: م(۴۰)+ح(۸)+م(۴۰)+د(۴)=۹۲x۴=۳۶۸+۲=۳۷۰x۵=۱۸۵۰÷۲۰
20 پر تقسیم کرنے کے بعد باقی 10 بچے۔ ۱۰x۹=۹۰+۲=۹۲

رمضان: ر(۲۰۰)+م(۴۰)+ض(۸۰۰)+ا(۱)+ن(۵۰)=۱۰۹۱x۴=۴۳۶۴+۲=۴۳۶۶
۴۳۶۶x۵=۲۱۸۳۰÷۲۰=باقی بچے 10 ۱۰x۹=۹۰+۲=۹۲

ثاقب: ث(۵۰۰)+ا(۱)+ق(۱۰۰)+ب(۲)=۶۰۳x۴=۲۴۱۲+۲=۲۴۱۴x۵=
۱۲۰۷۰÷۲۰=باقی بچے 10 ۱۰x۹=۹۰+۲=۹۲

عاطف: ع(۷۰)+ا(۱)+ط(۹)+ف(۸۰)=۱۶۰x۴=۶۴۰+۲=۶۴۲x۵=۳۲۱۰
۳۲۱۰÷۲۰=باقی بچے 10 ۱۰x۹=۹۰+۲=۹۲

وقاص: و(۶)+ق(۱۰۰)+ا(۱)+ص(۹۰)=۱۹۷x۴=۷۸۸+۲=۷۹۰x۵=۳۹۵۰
۳۹۵۰÷۲۰=باقی بچے 10 ۱۰x۹=۹۰+۲=۹۲

ایک اور ہندو شاعر شیام سُندر شیام (مدیر "پارس" لاہور) نے حضور علیہ السلام کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا:

دنیا کو تم نے آکر پُرنور کر دیا ہے — اور ظلمتوں کو یکسر کافور کر دیا ہے
پیغامِ حق سنا کر مسرور کر دیا ہے — وحدت کی مے پلا کر مخمور کر دیا ہے
اک بار تو دیارِ یثرب کو دیکھ لیتا — پابندیِ جہاں نے مجبور کر دیا ہے
سُندر سے کیا رقم ہو وہ شان ہے تمہاری — جس نے گداگروں کو فغفور کر دیا ہے☆

اردو حروفِ تہجی کے ہر حرف کے اعداد حسبِ ذیل ہیں:

الف (۱)، ب (۲)، پ (۲)، ت (۴۰۰)، ٹ (۴۰۰)، ث (۵۰۰)، ج (۳)، چ (۳)، ح (۸)، خ (۶۰۰)، د (۴)، ڈ (۴)، ذ (۷۰۰)، ر (۲۰۰)، ڑ (۲۰۰)، ز (۷)، ژ (۷)، س (۶۰)، ش (۳۰۰)، ص (۹۰)، ض (۸۰۰)، ط (۹)، ظ (۹۰۰)، ع (۷۰)، غ (۱۰۰۰)، ف (۸۰)، ق (۱۰۰)، ک، گ (۲۰، ۲۰)، ل (۳۰)، م (۴۰)، ن (۵۰)، و (۶)، ہ (۵)، ی، ے (۱۰)

☆ فغفور چین کے شہنشاہوں کا شاہی لقب تھا۔

لالہ دھرمپال وفاؔ نامی ایک اور ہندو شاعر (مدیر روزنامہ "تیج" دہلی) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نامِ نامی کو نوعِ انسانی کے تمام قائدین کے ناموں سے اعلیٰ وارفع سمجھتا ہے اور اس حقیقت کو اُس نے اپنے منظوم کلام میں اس طرح پیش کیا ہے:

چھڑا کے بُت کی پرستش سکھائی تھی وحدت — مرے خیال کی ترویج عام ہو جائے
سیاسیات سے مذہب ملا دیا تو نے — کہ دین و دنیا کا سب انتظام ہو جائے
رفاہِ عام ہی ترا تھا جبکہ نصب العین — لقب نہ کیوں ترا خیر الانام ہو جائے

وفا جہاں میں وہ عالی مقام ہوتا ہے
عطا جسے ے ءِ عرفان نہ ہو جائے

مہاراجہ سری کشن پرشاؔد (سابق مدار المہام ریاست نظام حیدر آباد دکن) ختم المرسلین ﷺ کو یوں خراجِ تحسین پیش کرتا ہے:

مرحبا سیّد مکی مدنی العربی

رفعت کے معنیٰ میں بہت وسعت ہے۔ یہاں بڑوں کا ذکر تو زمین پر ہے مگر اس رفعت والے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر زمین پر بھی ہے اور عرش پر بھی' جنت میں بھی اور ربّ کائنات کے ہاں بھی۔ دیکھئے پاؤں سے آنکھ زیادہ کام کرتی ہے' آنکھ سے زیادہ کان کام کرتا ہے کہ آگے پیچھے ہر طرف سے سنتا ہے اور کان سے زیادہ خیال اور تصوّر کام کرتا ہے' خصوصاً خیالِ شاعر کہ زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں ☆۔ مگر جہاں خیالِ شاعر بھی تھک جائے وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رفعت اور بلندی ہے۔ شاعرِ دربارِ رسول جناب حسّان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

مَا اِنْ مَدَحْتُ مُحَمَّدًا بِمَقَالَتِیْ وَلٰکِنْ مَدَحْتُ مَقَالَتِیْ بِمُحَمَّدٍ

یعنی میں نے یہ قصیدہ کہہ کر محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ستائش نہیں کی بلکہ محمد علیہ السلام کی مدح و توصیف کر کے اپنے کلام کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

اپنی تخلیق کی شاہکار ہستی ﷺ کا مدّاح قادر وقدیر رب خود فرماتا ہے کہ لاکھوں کروڑوں گناہوں کی گٹھڑی سر پر لئے میرے محبوب کے در پر حاضر ہو کر مجھ سے معافی مانگ لو اور رسول بھی تمہارے حق میں مجھ سے سفارش کر دیں تو مجھے تم یقیناً توّاب و رحیم پاؤ گے۔ پوچھا: یا الٰہ العالمین! آپ تو جبّار بھی ہیں۔ فرمایا: کوئی شک نہیں کہ میں جبّار بھی ہوں' قہّار بھی ہوں لیکن جب مدینے والے کے در پر منگتے بن کر پہنچتے ہو تو میں جبّار نہیں بلکہ غفورٌ رحیم ہو جاتا ہوں۔

☆ اس کی مثال مرزا غالب کا یہ شعر ہے:

رات رو کا میں نے غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے — اُس کے سیلِ گریہ سے گردوں کفِ سیلاب تھا

رَفَعۡنَا ماضی مطلق سے معلوم ہوا کہ ہم اس سے پہلے ہی اپنے حبیب محتشم کو رفعت دے چکے ہیں۔ اس اعلان میں یہ صاف فرما دیا کہ اے محبوب! میں جس کا ذکر کروں وہ تو ہے یعنی:

شان و مرتبہ دینے والا میں ہوں' لینے والا تو ہے۔
مزّمّل کی چادر تجھے اُڑھانے والا میں ہوں' اُس چادر میں گنہگاروں کو چھپانے والا تو ہے۔
مُدثّر کے کمبل میں حقیقتِ محمدیہ کو چھپانے والا میں' چھپنے والا تو۔
ربّ العالمین میں' رحمة للعالمین تو۔
ربوبیت میری' ختمِ نبوّت تیری۔
عبادت میری' نماز میں تعظیم تیری۔
کلام میرا' زبان تیری۔
کتاب میری' ادا تیری۔
تیری زبان پر بولنے والا میں' آگے اُس کی عملی تفسیر کرنے والا تو۔
قرآن کو نازل کرنے والا میں' دنیا کو عملی نمونہ دینے والا تو۔
پیارے! جنت میری' مالک تو۔
کوثر میرا' ساقی تو۔
قدرت میری' رحمت تیری۔
بخشش میری' شفاعت تیری۔
تقدیر میری' تدبیر تیری۔
برکت میری' حرکت تیری۔
عطا میری' تقسیم تیری۔
مخلوق میری' اُمّت تیری۔

نبی کا غلام نبی کی غلامی میں آنے سے پہلے ذرّہ تھا' ستارہ ہو گیا۔ ادنیٰ تھا' اعلیٰ ہو گیا۔ قطرہ تھا' بوند بن گیا۔ بوند تھی' لہر بن گئی۔ لہر تھی' موج بن گئی۔ موج تھی' دریا بن گئی۔ دریا تھا' سمندر بن گیا۔ پست تھا' بلند ہو گیا۔ فرش تھا' عرش بن گیا۔ ابوبکر تھا' صدّیقِ اکبر بن گیا۔ عمر تھا' فاروقِ اعظم بن گیا۔ عثمان تھا' جامع القرآن بن گیا۔ علی تھا' حیدرِ کرّار بن گیا۔ بلالِ حبشی غلام تھا' دنیا کا امام بن گیا۔ پھر یہ شان کہ اے بلال! سب سے پہلے تم جنت میں جاؤ گے۔ اُس وقت تک صبح نہیں ہوتی جب تک بلال اذان نہیں کہتے۔

واقعہ یوں ہوا کہ شہِ دوسرا ﷺ کی خدمتِ اقدس میں صحابہ نے شکایت کی کہ بلال کی زبان میں لکنت ہے اور اذان میں وہ اَشۡهَدُ میں شین کی بجائے سین بولتے ہیں لہٰذا اُن کی بجائے آپ کوئی اور مؤذّن مقرر فرما

دیجئے ۔ رحمت مجسم نے اپنے غلام کی عظمت و شان کو صحابہ پر آشکارا کرنے کے لئے صحابہ کے مطالبے کو مان لیا اور جنابِ بلال کو حکم دیا کہ صبح آپ اذان نہ کہنا ۔ بلال کی آنکھوں میں نم' چہرے پر اَلم اور دل میں غم ۔ بلال کا رونا تھا کہ اللہ کی رحمت کو جوش آنا تھا ۔ عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ بارگاہِ نبوی میں عرض کناں ہوئے کہ حضور! رات لمبی ہو گئی' سوسو کے کمر درد کرنے لگی ۔ صبح کاذب جاتی نہیں' صبح صادق آتی نہیں ۔ محبوبِ ربّ العالمین نے فرمایا: اِصْبِرْ یَا عُمَرُ اَنَا اُصَلِّیْ رَکْعَتَیْنِ (عمر! ذرا صبر کرو' میں دو رکعت نماز نفل پڑھ لوں) ۔ میرے اور آپ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی جبینِ نیاز اپنے خالق و مالک کے حضور زمین پر رکھی ہی تھی کہ جبریلِ امین حاضر ہو کر بولے: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ یَقُوْلُ اللّٰہُ تَعالٰی : سِیْنُ بِلاَلٍ عِنْدَ اللّٰہِ شِیْن" (اے اللہ کے رسول! رب فرما رہا ہے کہ بلال کی سین میرے نزدیک شین ہے) ۔ مطلب یہ کہ جب تک بلال لکنت والی زبان سے اذان کہے گا نہیں' سورج طلوع نہیں کروں گا' چاہے لوگ قیامت تک بستروں میں کروٹیں بدلتے رہیں ۔

پیغمبر کے فرمان پر جنابِ بلال کی تلاش کی گئی تو آپ مسجدِ نبوی کے ایک کونے میں غم سے نڈھال گریہ و زاری کر رہے تھے ۔ روتے ہوئے عرض کی: یا رسول اللہ! میں کہیں جہنمی تو نہیں ہو گیا؟ زبانِ رسالت نے جنابِ بلال کو اپنے سینۂ اقدس سے لگا کر فرمایا: بلال! میرے ہوتے ہوئے تم دوزخ میں نہیں جا سکتے' تم تو جنت میں جاؤ گے ۔ عرض کیا: آقا! کیا میں جنتی ہوں؟ فرمایا: ہاں تم جنتی ہو اور جنت میں پہلے تم جاؤ گے ۔ جنابِ بلال نے بڑے ادب سے پوچھا: کیا نمازیوں سے بھی پہلے؟ فرمایا: جی ہاں' نمازیوں سے بھی پہلے ۔ عرض کیا: کیا عابدین سے بھی پہلے؟ فرمایا: ہاں' عابدین سے بھی پہلے ۔ پھر عرض کیا: اچھا' شہیدوں سے بھی پہلے؟ فرمایا: ہاں' شہیدوں سے بھی پہلے ۔ پوچھا: اچھا' صحابہ سے بھی پہلے؟ میرے نبی نے فرمایا: ہاں' صحابہ سے بھی پہلے ۔ جنابِ بلال نے پھر وضاحت چاہی کہ اچھا' آپ کے صدّیق سے بھی پہلے؟ فرمایا: جی ہاں' میرے صدّیق سے بھی پہلے ۔ اچھا' تو آپ کے مانگے ہوئے عمر سے بھی پہلے؟ فرمایا: ہاں ۔ اچھا' عثمانِ غنی سے بھی پہلے؟ فرمایا: جی ہاں ۔ پھر پوچھا: آپ کے علی سے بھی پہلے؟ فرمایا: ہاں علی سے بھی پہلے ۔ جنابِ بلال نے پھر پوچھا کہ تمام انبیاء و رُسل سے بھی پہلے؟ فرمایا: ہاں اُن سے بھی پہلے ۔ جنابِ بلال عشق و جذب کی لہر میں آ کر پوچھنے لگے: کیا آپ کے اہلِ بیت سے بھی پہلے؟ فرمایا: ہاں' میرے اہلِ بیت سے بھی پہلے ۔ بلال تڑپ اٹھے اور مؤدّبانہ پوچھ بیٹھے کہ حضور! آپ سے بھی پہلے؟ فرمایا: ہاں' ہاں مجھ سے بھی پہلے ۔ اس پر بلال قدموں میں گر پڑے ۔ عرض کیا: یا رسول اللہ! دنیا والے کیا نہیں گے کہ اُمتی آگے اور نبی پیچھے ۔ آقا! محبت میں بات ہو گئی' اب بات بدل دیجئے ۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا چہرۂ انور سرخ ہو گیا اور فرمایا: بلال! سُن لے' کائنات اِدھر کی اُدھر ہو سکتی ہے' زمین پھٹ سکتی ہے' سورج مغرب سے طلوع ہو سکتا ہے' سمندروں کے پانی خشک ہو سکتے ہیں لیکن خاتم النبیین کی زبان سے نکلی ہوئی بات تبدیل نہیں ہو سکتی ۔ فرمایا: قیامت کے دن میں جس سواری پر سوار ہوں گا' اے بلال! اُس کی لگام تیرے ہاتھ میں ہو گی ۔ ذرا بتا تو سہی کہ لگام تھامنے والا پہلے اندر جاتا ہے یا سواری پر سوار پہلے جاتا ہے ۔ سُن لے تو آگے آگے غلام بن کے جائے گا اور میں پیچھے پیچھے آقا بن کے آؤں گا ۔

ذرا اُس واقعہ کی طرف توجہ ہو جب فتح مکّہ کے موقع پر نبی الثقلین ﷺ نے بیت اللہ شریف پہنچ کر جنابِ بلال کو حکم دیا کہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان کہہ دو۔ جنابِ بلال نے عرض کی: آقا! مدینے میں میں نے اذان دی تو کعبے کی طرف رخ کیا' سفر میں اذان دی' بدر میں اذان دی تو رخ کعبے کی طرف کیا۔ لیکن اب تو آپ نے کعبہ کے اوپر چڑھا دیا' اب رخ کدھر کروں؟ بلال کی اس بات پر امام القبلتین ۔۔ کعبے کا کعبہ۔۔ مسکرا دیئے اور فرمایا: اب تک جہاں اور جس جگہ بھی تم نے اذان کہی' رخ کعبے کی طرف کیا۔ اب نبی نے تمہیں کعبہ کی چھت پر چڑھا دیا تو اب اپنے نبی کی طرف رخ کر کے اذان کہہ دو۔ اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ اگر کعبہ کی بلندیوں پر بھی چڑھ جاؤ تو اپنے نبی سے رخ نہ پھیرو۔

(105-110) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت کی صداقت کی توثیق میں قرآن مجید کئی مقامات پر استدلال کرتا ہے' مثلاً:

(۱) ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ O (آلِ عمران: ۴۴)

''(اے محبوب!) یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی فرماتے ہیں حالانکہ آپ (اُس وقت) اُن کے پاس نہ تھے جب وہ (قرعہ اندازی کے طور پر) اپنے قلم (دریا میں) ڈال رہے تھے کہ اُن میں سے کون مریم کی کفالت کرے اور نہ آپ اُس وقت اُن کے پاس تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔''

جب مریم علیہا السلام کی ولادت کا وقت آ پہنچا تو اُن کی والدہ حنّہ کو معلوم ہوا کہ اُن کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ جہاں تک اولاد کا تعلق ہے' حنّہ کے لئے یہ لڑکی بھی لڑکے سے کم نہ تھی مگر اُنہیں یہ افسوس ضرور ہوا کہ میں نے جو نذر مانی تھی وہ پوری نہیں ہو سکے گی کیونکہ لڑکی کس طرح مقدس ہیکل کی خدمت کر سکے گی لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کے افسوس کو یہ کہہ کر بدل دیا کہ ہم نے تیری لڑکی کو ہی قبول کیا اور اُس کی وجہ سے تمہارا خاندان بھی معزز و مبارک قرار پایا۔ حنّہ نے لڑکی کا نام ''مریم'' رکھا جس کے معنیٰ سریانی زبان میں ''خادم'' کے ہیں: (فتح الباری' ج ۶' ص ۳۶۵)۔ چونکہ یہ ہیکل کی خدمت کے لئے وقف کر دی گئیں اس لئے یہ نام موزوں سمجھا گیا۔

''حضرت مریم علیہا السلام جب سنّ شعور کو پہنچیں اور یہ سوال پیدا ہوا کہ مقدس ہیکل کی یہ امانت کس کے سپرد کی جائے تو کاہنوں ☆ میں سے ہر ایک نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اِس مقدس امانت کا کفیل مجھے بنایا جائے مگر اس امانت کی نگرانی کا اہل حضرت زکریا علیہ السلام سے زیادہ کوئی نہ تھا کیونکہ وہ مریم علیہا السلام کی خالہ ایشاع کے شوہر بھی تھے اور مقدس ہیکل کے معزز کاہن اور ربّ ذوالجلال کے نبی بھی تھے۔ اس لئے سب سے پہلے اُنہوں نے ہی اپنا نام پیش کیا مگر جب سب کاہنوں نے یہی خواہش ظاہر کی اور باہمی کشمکش کا اندیشہ ہونے لگا تو آپس میں یہ طے پایا کہ قرعہ اندازی کے ذریعے اس کا فیصلہ کر لیا جائے اور بقولِ روایاتِ بنی اسرائیل تین مرتبہ قرعہ اندازی کی

☆ کاہنوں سے وہ مقدس ہستیاں مراد ہیں جو ہیکل میں مذہبی رسوم ادا کرتی اور خدمتِ ہیکل پر مامور تھیں۔

گئی۔ وہ دریا میں اپنے قلم ڈالتے جن سے وہ تورات لکھا کرتے۔ مگر قرعہ کی شرط کے مطابق ہر مرتبہ زکریا علیہ السلام ہی کا نام نکلتا۔ کاہنوں نے جب یہ دیکھا کہ اس معاملہ میں زکریا علیہ السلام کے ساتھ تائید غیبی ہے تو اُنہوں نے بخوشی اس فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس طرح یہ ''سعید امانت'' حضرت زکریا علیہ السلام کے سپرد کی گئی۔''

آیت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت کی تصدیق یوں کر رہی ہے کہ پیارے! اس سارے قضیّہ میں آپ بہ نفسِ نفیس موجود نہیں تھے اور اہلِ کتاب کو یہ بھی تسلیم ہے کہ اُمّی ہونے کے ناطے سے آپ نے اُن کی کتابیں (تورات و انجیل) بھی نہیں پڑھیں اور نہ ہی آپ اُن کے کسی پادری یا عالم سے ملے ہیں جس نے آپ کو یہ سارا واقعہ بتا دیا ہو۔ تو پھر اُن کی سماوی کتب کے مطابق من وعن آپ کا بتلا دینا اس بات کا پکا ثبوت ہے کہ آپ کو خبر دینے والا وہی اللہ ہے جس نے آپ کو ان کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔

(۲) تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهَاۤ اِلَیْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا

''یہ (بیان اُن) غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں' اس سے قبل نہ آپ اُنہیں جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم۔'' (ھود: ۴۹ : ۱۱)

یعنی (اے حبیب!) فراہم شدہ معلومات کے کسی بھی ذریعہ سے آپ کو قوم نوحؑ (علیہ السلام) کے المناک انجام کا علم حاصل نہ تھا۔ اس قدیم تاریخ کے متعلق اہلِ عرب نے کبھی سنا بھی نہ تھا' ہماری وحی کے ذریعہ ہی اس کی نقاب کشائی ہوئی ہے۔ گویا اِس خدائی بیان کا مقصدِ وحید ہمارے رسول علیہ السلام کی رسالت کی صداقت کا محکم ثبوت فراہم کرنا ہے۔

(۳) ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَهُمْ یَمْكُرُوْنَ O (یوسف : ۱۰۲)

''(اے حبیبِ مکرّم!) یہ (قصہ) غیب کی خبروں میں سے ہے جسے ہم آپ کی طرف وحی فرما رہے ہیں اور آپ اُن کے پاس موجود نہ تھے جب وہ (برادرانِ یوسف) اپنی سازشی تدبیر پر جمع ہو رہے تھے اور وہ مکر وفریب کر رہے تھے۔'' (۱۰۲ : ۱۲)

(۴) وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِیِّ اِذْ قَضَیْنَاۤ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِیْنَ O (اَلقَصَص : ۴۴)

''اور (اے حبیب!) آپ (پہاڑ کے) مغربی جانب موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کو احکام دئے تھے اور نہ آپ اُن لوگوں میں سے تھے جو (اُس وقت) موجود تھے۔'' (۴۴ : ۲۸)

(۵) وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَیْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اَتٰىهُمْ مِّنْ

نَّذِيرٍ مِّن قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ O (القصص: ۴۶)
''اور نہ آپ طور کے پہلو میں اُس وقت موجود تھے جب ہم نے موسیٰ کو آواز دی تھی لیکن آپ اپنے پروردگار کی رحمت سے (نبی بنائے گئے) تاکہ آپ ایسے لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تاکہ وہ لوگ نصیحت قبول کریں۔'' (۴۳ تا ۴۶ : ۲۸)

مطلب یہ ہوا کہ اے حبیبِ مکرّم! موسیٰ علیہ السلام پر نزولِ وحی و کتاب کے وقت آپ وہاں موجود نہ تھے۔ یعنی یہ امور آپ کو مشاہدہ سے تو معلوم ہی نہیں ہو سکتے تھے' ہماری وحی ہی سے معلوم ہو رہے ہیں۔ نہ آپ کو جسماً وہاں حضوری حاصل رہی اور نہ یہ چیزیں آپ کے مشاہدہ میں آئیں۔ پھر آپ جو اُنہیں اتنا صاف و صحیح بتا رہے ہیں تو وحی کے سوا اور کیا ذریعہ ہو سکتا ہے؟'' (ماجدی اردو' صفحہ ۷۸۹' نوٹ: ۵۸ تا ۶۰)

حضرت وہب بن منبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے حضور علیہ السلام کی فضیلت اور آپ کی اُمت کی شان بیان فرمائی تو آپ نے خواہش ظاہر کی کہ مجھے دیدار کرایا جائے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا کہ تم دیکھ نہیں سکتے۔ اگر چاہو تو میں اُنہیں بلاتا ہوں اور اُن کی آواز تمہیں سناتا ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: ہاں مجھے آواز ہی سنوا دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے ندا دی: اے محمد (ﷺ) کی امت! تو اپنے باپوں کی پشتوں سے امتِ محمدیہ نے جواب دیا تو آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ (اے حبیبِ مکرّم!) آپ اُس وقت طور کے پاس نہیں تھے جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اور آپ کی امت کو آواز دی اور موسیٰ علیہ السلام کو بتایا کہ ہم نے آپ کو اور آپ کی امت کو اتنی بڑی شان دی ہے۔

''سپرینگر' سنوک اور اُن کے ہم نوا جیسے مستشرقین کہتے ہیں کہ اگر ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام عرب کے پیغمبر ہوتے تو قرآنِ عزیز اُمتِ عربیہ کے متعلق اس طرح محمد (ﷺ) سے خطاب نہ کرتا۔ مگر یہ بھی ایک سخت مغالطہ ہے جو قرآنِ عزیز کے طرزِ خطابت' اسلوبِ بیان اور باطل پرستوں کی باطل پرستی کے خلاف دلائل کی ترتیب سے ناواقفیت کی بناء پر پیدا ہوا ہے یا گزشتہ اعتراضات کی طرح محض بغض و عناد کی خاطر اختیار کیا گیا ہے۔''

''مستشرقین کی طرف سے سورۃ القصص کی پیش کردہ آیت ۴۶ بالا لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أَتَاهُم مِّن نَّذِيرٍ مِّن قَبْلِكَ کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سرزمینِ عرب (حجاز) ہمیشہ سے اللہ کے نبی اور پیغمبر کے وجود سے محروم ہے اور اس ملک میں نبی اکرم ﷺ کی آواز سب سے پہلی آواز ہے۔ قرآنِ عزیز ایسی خلافِ حقیقت بات کیسے کہہ سکتا تھا جبکہ سورہ ابراھیم' الانعام اور النحل کی متعدد آیات میں حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے عربی ہونے کی صاف اور صریح شہادتیں موجود ہیں۔ بلاشبہ قرآنِ عزیز اس قسم کے تضاد اور اختلاف سے قطعاً بری ہے کہ ایک جگہ وہ ایک بات کا انکار کرے اور دوسری جگہ اُسی بات کا اقرار کرے۔

سورۃ القصص کی زیرِ نظر آیت ۴۶ کا مطلب اگر یوں بیان کیا جائے تو آیت کے سمجھنے میں کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ فرمایا: ہم نے آپ کو اس قوم میں مبعوث فرمایا جس میں اسماعیل علیہ السلام کے وقت سے لے کر اب تک کے عرصہ دراز میں کوئی نبی اور نذیر (ڈرانے والا) نہیں آیا تھا۔ ہدایت کی روشنی مدت سے ناپید تھی، ہر طرف کفر و جہالت کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی تاکہ آپ اُنہیں عذابِ الٰہی سے بروقت ڈرائیں۔

لہٰذا قرآن عزیز کے خلاف سنوک، اسپرنگر اور وینسنک کے یہ تمام دعاوی اور اُن کے دلائل تاریخی حقائق اور واقعات کی روشنی میں قطعاً باطل اور محض افترا ہیں اور اُن کے طرزِ عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اور اس قسم کے دوسرے ناقدین قرآنِ عزیز پر علمی دیانت کے ساتھ تنقید نہیں کرتے اور نہ اُن کی فہم اور سمجھ کا قصور ہے بلکہ اس کے برعکس وہ علمی بددیانتی سے کام لے کر قرآن کے خلاف زہر اگلتے، غلط الزام قائم کرتے اور صریح اور واضح مسائل میں اپنے پیشِ نظر مقاصد کے مطابق تخلک پیدا کر کے ناواقف دنیا کو گمراہ کرتے ہیں بلکہ اس قسم کے الزامات سے اُن کا صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے جسے قرآن عزیز نے اس قسم کے معاندین کے لئے ایک مستقل قانون کی طرح واضح کر دیا ہے:

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً (النساء : ۸۹)

''یہ (منکرینِ قرآن و اسلام) تو دل سے چاہتے ہیں کہ کاش تم بھی اُنہی کی طرح منکر بن جاؤ تاکہ وہ اور تم (سب) برابر ہو جاؤ۔'' (۴:۸۹)

''بہر حال قرآنِ حکیم کی مسطورہ بالا زیرِ بحث آیت کا مطلب صاف اور واضح ہے اور اُس کے درمیان اور الانعام، ابراھیم اور النّحل جیسی سورتوں میں ابراہیم علیہ السلام کے پیغمبرِ عرب ہونے کے درمیان قطعاً کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔ اس پیش کردہ تفصیل و تشریح کے علاوہ عام مفسرین نے اس قسم کی آیات کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ یہ خطاب صرف اُنہی لوگوں سے متعلق ہے جو نبیِ اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں موجود تھے۔ اُن کے گزشتہ آباء و اجداد اور گزشتہ تاریخ عرب سے اس خطاب کا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' (''قصص القرآن''۔ حفظ الرحمٰن سیوہاروی، ج ۱، ص ص ۱۵۱ تا ۱۶۷ ملخصاً)

(۶) مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ○ (صٓ : ۶۹)

''مجھے تو (از خود) عالمِ بالا کی جماعت (ملائکہ) کی کوئی خبر نہ تھی جب وہ (تخلیقِ آدم کے بارے میں) بحث و تمحیص کر رہے تھے۔'' (۶۹ : ۳۸)

يَخْتَصِمُوْنَ سے مراد روزِ ازل کو اللہ تعالیٰ سے فرشتوں کی گفتگو ہے جس کا ذکر سورۃ البقرۃ کی آیات ۳۰ تا ۳۲ میں ہوا۔ اور پیغمبر علیہ السلام کو اب جو اس کی خبر ہوئی ہے، محض وحی کے ذریعہ سے ہوئی ہے اور جب وحی کے ذریعے معلوم ہونا ثابت ہو گیا تو آپ کی رسالت کے سچ ہونے میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے!!

(111) هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًاO مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ (الفتح : ۲۸، ۲۹)

"وہی ہے جس نے اپنے رسول (ﷺ) کو ہدایت اور دینِ حق عطا فرما کر بھیجا تا کہ اُسے تمام اَدیان پر غالب کر دے اور (رسول ﷺ کی صداقت و حقانیت پر) اللہ ہی گواہ کافی ہے۔ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔" (۴۸ : ۲۸، ۲۹)

آیتِ بالا کا ابتدائی لفظ ھُوَ اسمِ اشارہ ہے اور اس سے متصل اگلا لفظ اَلَّذِیْ اسم موصول ہے۔ یہ خیال رہے کہ اسم اشارہ اور اسم موصول دونوں اپنے معانی میں مبہم اور غیر واضح ہوتے ہیں۔ اسم اشارہ کا ابہام اُس مرجع سے دُور کیا جاتا ہے جس کا حوالہ اسم اشارہ دے رہا ہوتا ہے۔ جبکہ اسم موصول کا ابہام اُس سے متصل لفظ یعنی صلہ سے دُور کیا جاتا ہے۔ یوں کہیے کہ صلہ اسم موصول کے ابہام کو دُور کرتا ہے جبکہ مرجع اسم اشارہ کے ابہام کو دُور کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اِن دونوں مبہم اسماء ھُوَ اور اَلَّذِیْ کو لایا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ھُوَ کون ہے اور اَلَّذِیْ کون ہے۔ اَلَّذِیْ اسم موصول ہے اور اس کا صلہ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ ہے۔ اس کا مقصد ہمیں یہ سمجھانا ہے کہ جس طرح اسم موصول کا ابہام اُس وقت تک دُور نہیں ہوتا جب تک صلہ کی طرف رجوع نہ کیا جائے اور اسم اشارہ کا ابہام مرجع کے بغیر دُور نہیں ہوتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی معرفت کے بارے میں تمہارے ذہنوں میں جو انتشار پیدا ہوا ہے، وہ پیغمبر کے بغیر دُور نہیں ہوسکتا۔ مرجع کے بغیر اسم اشارہ ادھورا ہے اور صلہ کے بغیر اسم موصول مخفی اور پوشیدہ رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح رب تعالیٰ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے توسل کے بغیر مخفی رہتا ہے۔

یہاں ایک جاندار سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اپنے پیغمبر علیہ السلام کے وسیلہ کے بغیر نہیں مل سکتی جبکہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اُس کی قدرت کا مظہر اور علامت ہے اور علامت مقصد کی طرف راہ نما ہوتی ہے۔ کیا کائنات میں اتنی کثیر تعداد میں پھیلے ہوئے مظاہر اللہ رب العزت کی معرفت کے لئے کافی نہیں ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دلیل دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک خاموش دلیل ہوتی ہے، دوسری ناطق دلیل ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ رب تعالیٰ کی ہستی کی علامت ہے لیکن یہ تمام مظاہر (شمس و قمر، آسمان، زمین، شجر و حجر، پہاڑ، آگ، حیوانات وغیرہ) اُس کے وجود کے خاموش دلائل ہیں۔ لوگ ان مظاہر و علامات کی مسلسل پرستش کرتے رہے اور یہ علامات و مظاہر خاموش ہی رہے اور انہیں پرستش سے نہ روکا۔

کیا پتھر علاماتِ ناطق ہیں؟ ہرگز نہیں۔ لیکن جب ابوجہل نے اِن پتھروں کو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام پر مارنا چاہا تو کیا وہ نبی محتشم ﷺ کی رسالت کی توثیق و تصدیق کرتے ہوئے دلیلِ ناطق نہیں بن گئے؟ آسمان میں

چمکتا ہوا مہ کامل نبی علیہ السلام کی انگلی کے اشارے سے دو لخت ہوا اور اُس نے دلیل ناطق بن کر کائنات کو بتا دیا کہ اگر محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول نہیں ہیں تو میرے دو ٹکڑے ہوئے تو کیونکر ہوئے؟

اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی کے دو ممکن معانی ہو سکتے ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو پہلے ہی سے رشد و ہدایت سے مالا مال کر کے بھیجا۔ دوسرے لوگوں کو تو راہ نمائی اپنے والدین، اساتذہ اور دوستوں سے ملتی ہے لیکن اقلیم رسالت کے اِس آخری تاجدار ﷺ کو رشد و ہدایت کسی انسانِ فانی سے نہیں ملی بلکہ اُس کے خالق نے ہر شعبہ حیات میں اُن کی راہ نمائی کا ذمہ اپنے آپ پر لیا ہوا ہے اور اسی حقیقت کی طرف زبانِ رسالت نے یوں فرمایا تھا:

اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَادِیْبِیْ / ھَذَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَھْذِیْبِیْ

''میرے رب نے مجھے ادب سکھایا تو اُس نے کیا ہی خوب مجھے ادب سکھایا!'' یا آپ نے فرمایا:

''میرے رب نے میری تہذیب کی تو اُس نے کیا ہی خوب میری تہذیب کی!''

تفسیر ''روح البیان'' میں ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیدا ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کو سجدہ کیا۔ مزید یہ کہ رب تعالیٰ کی معرفت کے باعث آپ نے اپنی رضاعی ماں سیّدہ حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کی ایک چھاتی سے دودھ چوسا اور اُن کی دوسری چھاتی کو اپنے رضاعی بھائیوں کے لئے چھوڑ دیا۔ یہی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھی ہے کہ شہر کی تمام دایوں کے دودھ کو آپ نے قبول نہیں کیا لیکن جب آپ کی حقیقی والدہ نے چھاتی منہ میں دی تو فوراً دودھ چوسنے لگے (بحوالہ سورۃ القصص: آیت ۱۲) اس لئے کہ پیغمبر دوسروں کا حق کبھی نہیں مارا کرتا۔

(۲) اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی کا دوسرا معنیٰ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمام رُشد و ہدایت پیغمبر علیہ السلام ہی کے درِ دولت سے ملتی ہے اور نوعِ انسانی آپ کے توسل سے ہدایت سے بہرہ ور ہوگی کیونکہ آپ کی ذاتِ ستودہ صفات ہی الٰہی رُشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے۔

دِیْنِ الْحَقِّ کا معنیٰ سچا دین یا مستحکم دین ہے۔ انبیائے سابقہ کے ادیان بھی سچے تھے لیکن وہ مستحکم اور ہمیشہ رہنے والے نہیں تھے، اس لئے منسوخ ہو گئے۔ لیکن نبی علیہ السلام کا لایا ہوا دین سچا بھی ہے اور مستحکم بھی ہے اور اسی لئے وہ ہمیشہ رہنے والا ہے اور کبھی بھی منسوخ نہ ہوگا۔

مُحَمَّدٌ'' رَّسُوْلُ اللّٰہِ (محمد ﷺ اللہ کا رسول ہے)۔ اگرچہ آپ سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے لیکن یہاں آپ کا ذکر خصوصی طور پر کچھ وجوہ کے باعث کیا گیا: (۱) تمام انبیاء اور رسول علیہم السلام کو اُن کے اس دنیا میں آنے کے بعد منصب رسالت و نبوّت سے سرفراز کیا گیا جبکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی پیدائش سے پہلے بھی عالمِ ارواح میں نبی تھے۔ (۲) سابقہ انبیاء و رُسل علیہم السلام کی نبوّت و رسالت مستقل اور دائمی نہ تھی جبکہ نبی علیہ الصلوٰۃ

والسلام کی رسالت مستقل اور دائمی ہے۔ (۳) تمام انبیاء علیہم السلام کو مخصوص اور انفرادی معجزات سے نوازا گیا جبکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ایسے لاتعداد معجزات عطا کئے گئے جو زمانہ ماضی کے تمام معجزات اور اُن کی فوقیت کو اپنے اندر سمائے ہوئے ہیں۔ (۴) گزشتہ انبیاء علیہم السلام کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اُن کے معجزات بھی ختم ہو گئے جبکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سب سے بڑا اور عظیم معجزہ قرآن مجید کی شکل میں اب تک زندہ و جاوید ہے جو ابدالآباد تک چاردانگ عالم کو اپنی درخشانی اور تابانی سے منوّر کرتا رہے گا۔

اسلام حق و صداقت کی مکمل روشنی ہے۔ جس طرح مکمل روشنی اپنی توانائی کے بل بوتے پر کم تر روشنیوں کو مزید روشن کر دیتی ہے' اسی طرح اسلام بھی سب چیزوں کو روشن کر دیتا ہے۔ دوسرے تمام ادیان پر اسلام کا غلبہ اور فوقیت اُس کے مضبوط' مُسکت اور ٹھوس دلائل کی بنیاد پر ایک مسلّمہ حقیقت ہے لیکن اقوامِ عالم پر اسلام کا مادّی اور بالفعل غلبہ مسلمانوں کے اپنے خالق و مالک اللہ پر مکمل اور پختہ ایمان کے ساتھ مشروط ہے جیسا کہ سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۳۹ میں مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا ہے :

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ O

''اور غالب تم ہی رہو گے اگر تم (کامل) ایمان رکھتے ہو۔'' (۳:۱۳۹)

(111) مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا O (الاحزاب : ۴۰)

''محمد علیہ السلام تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ وہ اللہ کے رسول اور خاتم النّبیّین ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔'' (۳۳:۴۰)

''باپ ہونے کی نفی کی اور اللہ تعالیٰ کا رسول ہونے کا اعلان فرما دیا۔ بے شک باپ اپنی اولاد پر بڑا مہربان اور شفیق ہوتا ہے لیکن رسول کو جو قلبی تعلق اپنی اُمّت کے ہر ہر فرد سے ہوتا ہے اور جو لُطف و کرم وہ فرماتا ہے' اُس کے مقابلہ میں باپ کی ساری شفقتیں ہیچ ہیں۔ باپ کی مہربانیاں' اولاد کی جسمانی اور مادّی دُنیا تک محدود ہوتی ہیں۔ رسول کی نگاہِ کرم سے اُمّتی کا جسم اور رُوح' ظاہر اور باطن' دل اور عقل سب فیض یاب ہوتے ہیں۔ باپ کی شفقتیں روزِ حشر کسی کام نہیں آئیں گی بلکہ سارے دنیاوی رشتے اُس دن ٹوٹ جائیں گے (سورہ عبس : آیات ۳۴ تا ۳۷) لیکن رسول کے لطف و عنایت سے دُنیا اور آخرت دونوں میں اُن کا اُمّتی شادکام ہوتا ہے۔''

آیت ۴۰ میں ''حضور علیہ السلام کی نہایت شفقت کو بیان فرمایا جا رہا ہے کہ اگر آپ کے بعد بھی نبوّت کا سلسلہ جاری رہتا تو حضور علیہ السلام اتنی تن دہی سے اُمّت کے سامنے دینِ اسلام کے سارے گوشے آشکار کرنے کی شاید زحمت نہ فرماتے لیکن اب جبکہ نبوّت کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے اور حضور علیہ السلام ہی اِس سلسلہ ذہبیہ کی آخری

کڑی ہیں' تو آپ کی محبت اور اُلفت کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی بھی چیز ادھوری نہ رہنے دی جائے۔ ساری بُری رسموں کا قلع قمع کر دیا جائے کیونکہ اگر باطل کا کوئی پہلو اصلاح سے محروم رہا تو پھر اس کی اصلاح ممکن نہیں ہوگی اور اگر دورِ جاہلیت کی قبیح رسموں کو مٹایا نہ گیا تو پھر ایسی ہستی پیدا ہی نہیں ہوگی جو اُنہیں مٹا سکے۔ اتنی محبوبیت' اتنی جامعیت اور اتنا تقدّس کہاں پایا جائے گا تاکہ دُنیا اُس کے اشارۂ ابرو پر اپنا سب کچھ نثار کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔'' (ضیاء القرآن ۔۔ کرم شاہ الازہری' جلد چہارم' صفحات ۶۵' ۶۶)

خَاتَمُ اور خَاتِم دونوں کے لغوی معنیٰ آخر کے ہیں (لسان العرب) اور آپ کا لقب خَاتَمُ النَّبِیّٖن ہے اِس لئے کہ نبوت آپ پر ختم ہوگئی اور آپ کی آمد سے نبوت کی تکمیل ہوگئی (''مفردات الفاظ القرآن'' لاامام راغب اصفہانی) اور حضور علیہ السلام کے اسماء میں سے اَلعَاقِب بھی ہے جس کا معنیٰ آخرالانبیاء ہے۔ اس معنیٰ کی تائید کے لئے اہلِ لغت نے سورۃ المُطَفِّفِین کی آیت ۲۶ سے بھی استدلال کیا ہے: خِتَامُهٗ مِسْکٌ اَیْ آخِرُہٗ مِسْکٌ یعنی اہلِ جنت کو جو مشروب پلایا جائے گا اُس کے آخر میں اُنہیں کستوری کی خوشبو آئے گی۔ (ضیاء القرآن)

علامہ ابنِ منظور افریقی لفظ خاتَم کے بارے میں لکھتے ہیں:

خِتَامُ الْوَادِیْ اَقْصَاہُ وَخِتَامُ الْقَوْمِ وَخَاتِمِھِمْ وَخَاتَمِھِمْ آخِرُھُمْ وَ مُحَمَّدٌ ﷺ خَاتَمُ الْاَنْبِیَاءِ عَلَیْہِ وَعَلَیْھِمُ الصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ (لسان العرب)

''کسی وادی کے آخری کونے کو خِتَامُ الْوَادِیْ کہتے ہیں' کسی گروہ کے آخری آدمی کو خِتَامُ الْقَوْمِ یا خَاتِمُ الْقَوْمِ یا خَاتَمُ الْقَوْمِ کہتے ہیں تو محمد ﷺ کو خَاتَمُ الْاَنْبِیَاءِ اِسی لئے کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے آخری رسول ہیں۔''

لفظِ خاتَم کا ایک معنیٰ مُہر کا بھی ہے۔ جب کسی دستاویز پر مہر لگادی جائے تو وہ مکمل ہو جاتی ہے اور اس میں مزید کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ ابن منظور افریقی نے ''لسان العرب'' میں لکھا:

''وَمَعْنٰی خَتَمَ وَطَبَعَ فِی اللُّغَةِ وَاحِد'' وَھُوَالتَّغْطِیَةُ عَلَی الشَّیْءِ وَالْاِسْتِیْثَاقُ عَنْ اَنْ لَّایَدْخُلَہٗ شَیْءٌ'' کَمَا قَالَ جَلَّ وَعَلاَ: اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا

''ختم'' اور ''طبع'' کا معنیٰ بہ لحاظِ لغت ایک ہی ہے اور وہ کسی چیز کو ایسی مضبوطی سے ڈھانپ اور بند کر دینا ہے کہ اُس میں کسی بیرونی چیز کے اندر جانے کا امکان نہ رہے جیسا کہ سورہ محمد میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا: کیا اُن کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں؟'' (۴۷ : ۲۴)

آیت کا صاف اور واضح مطلب یہی ہے کہ نبوّت و رسالت کے سلسلہ ذہبیہ کی آخری کڑی محمد ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے کہ آپ پر نبوت کے دروازے کو بند کر کے اُسے سربہ مُہر کر دیا گیا ہے تاکہ کوئی جھوٹا اور جعلی نبی اس

میں داخل نہ ہو سکے۔ اگر کوئی اس میں جبراً داخل ہونے کی کوشش کرے گا تو اُسے سب سے پہلے مُہر کو توڑنا ہوگا اور مُہر کے توڑنے پر وہ مجرم کے طور پر پکڑا جائے گا اور نارِ جہنم کی جھلستی ہوئی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

غرض تعلیم الٰہی دائمی ہے اور دائمی رہے گی اور محمد ﷺ کے بعد کسی بھی نبی یا رسول نے نہیں آنا۔ بعد کے زمانوں میں مفکرین اور مصلحین کی ضرورت تو ہوگی لیکن رسولوں اور پیغمبروں کی نہیں۔ آپ کے آخرالانبیاء ہونے کا ذکر آپ کی متعدد احادیثِ مبارکہ سے بھی صاف اور واضح الفاظ میں ہوا ہے۔

خَاتَمَ النَّبِیّٖن کی وضاحت میں چند احادیثِ مبارکہ : نبی علیہ السلام کے آخرالانبیاء ہونے کا عقیدہ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے اور اسی پر ہر زمانہ میں اُمت کا متفقہ اجماع رہا ہے۔ علامہ طبری کا بیان ہے کہ جھوٹا نبی مُسَیلمہ کذّاب' نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت کا منکر نہیں تھا لیکن آپ ﷺ کی رسالت کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی رسالت کا بھی دعویدار تھا۔ طبری کہتے ہیں کہ مسیلمہ کی اذان میں بھی اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہ کا جملہ تھا یعنی ''میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔'' لیکن چونکہ وہ خود نبوّت کا دعویدار تھا' اس لئے خلیفہ اوّل جناب ابوبکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُسے مرتد قرار دے کر اُس کے خلاف فوج کشی کی اور اُس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھے جب تک اُس لعین کو کیفرِ کردار تک نہیں پہنچا دیا۔

ہمارے نبی معظم ﷺ کے آخری رسول ہونے کی تائید میں لاتعداد احادیثِ مبارکہ موجود ہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی مسلمان کسی مرتد سے اُس کی نبوّت کی دلیل مانگے تو اُس کا ایمان اُس سے اُسی وقت رخصت ہو جاتا ہے اور وہ کافر ہو جاتا ہے کیونکہ دلیل مانگنے میں اُس نے اپنے نبی کے آخری نبی ہونے پر شک اور غیر یقینی کا اظہار کیا ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ اور احادیث ذیل میں سپردِ قلم کی جاتی ہیں :۔

(۱) قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ : اِنَّ مَثَلِیْ وَمَثَلُ الْاَنْبِیَاءِ مِنْ قَبْلِیْ کَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰی بَیْتًا فَاَحْسَنَہٗ وَ اَجْمَلَہٗ اِلَّا مَوْضِعُ لَبِنَۃٍ مِّنْ زَاوِیَۃٍ فَجَعَلَ النَّاسُ یَطُوْفُوْنَ بِہٖ وَ یَعْجَبُوْنَ لَہٗ وَیَقُوْلُوْنَ: ھَلْ لَّا وُضِعَتْ ھٰذِہِ اللَّبِنَۃُ فَاَنَا اللَّبِنَۃُ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ (صحیح بخاری: کتاب المناقب' باب: خاتم النبیین)
''نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال دراصل اُس شخص کی سی ہے جس نے ایک مکان تعمیر کیا اور اُسے حسین وجمیل بنایا لیکن اُس گھر کے کونے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی رہ گئی۔ لوگ اُس گھر کا طواف کرنے لگے اور اُس کے حسن و جمال سے حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہنے لگے کہ اس جگہ پر اینٹ کیوں نہ رکھ دی گئی (اور اس جگہ کو خالی کیوں چھوڑ دیا گیا؟) (سن لو!) وہ اینٹ میں ہی ہوں اور میں ہی سب نبیوں کے آخر میں آیا ہوں۔'' (صحیح بخاری: کتاب المناقب)

(۲) فُضِّلْتُ عَلَی الْاَنْبِیَاءِ بِسِتٍّ : اُعْطِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمِ وَ نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ وَ اُحِلَّتْ لِیَ

اَلْغَنَائِمُ وَجُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّ طَهُوْرًا وَاُرْسِلْتُ اِلَی الْخَلْقِ کَآفَّةً وَخُتِمَ بِیَ النَّبِیُّوْنَ (صحیح مسلم، ترمذی، ابن ماجه)

''مجھے دوسرے انبیاء علیہم السلام پر چھ باتوں میں فضیلت بخشی گئی ہے: مجھے فصاحت و بلاغت عطا کی گئی ہے، رعب و دبدبے والی شخصیت سے مجھے نوازا گیا ہے، اموالِ غنیمت کو میرے لئے حلال کر دیا گیا ہے، تمام روئے زمین کو میرے لئے پاکیزہ اور سجدہ کرنے کی جگہ بنا دیا گیا، مجھے تمام مخلوقات کی طرف مبعوث کیا گیا، اور سلسلۂ نبوّت مجھ پر ختم کر دیا گیا۔''

(۳) اَنَا اٰخِرُ الْاَنْبِیَاءِ وَاَنْتُمْ اٰخِرُ الْاُمَمِ (ترمذی)

''میں آخری نبی ہوں اور تم آخری اُمّت ہو۔''

(۴) لَوْ کَانَ بَعْدِیْ نَبِیٌّ لَکَانَ عُمَرُ ابْنُ الْخَطَّاب (ترمذی: کتاب المناقب)

''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ابن الخطاب ہوتے۔''

(۵) اِنَّ الرِّسَالَةَ وَالنُّبُوَّةَ قَدِ انْقَطَعَتْ وَلَا رَسُوْلَ بَعْدِیْ وَلَا نَبِیًّا

''رسالت و نبوّت کا سلسلہ بلا شک و شبہ منقطع ہو چکا ہے، میرے بعد کسی رسول اور نبی نے نہیں آنا۔''

(۶) اِنَّهٗ سَیَکُوْنُ فِیْ اُمَّتِیْ کَذَّابُوْنَ ثَلَاثُوْنَ کُلُّهُمْ یَزْعَمُ اَنَّهٗ نَبِیٌّ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ

''میرے بعد میری اُمّت میں تیس (۳۰) جھوٹے نبی پیدا ہوں گے اور اُن میں سے ہر کوئی نبوّت کا دعویدار ہو گا جبکہ سلسلۂ نبوّت کی میں آخری کڑی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

(۷) قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِعَلِیٍّ: اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هٰرُوْنَ بِمُوْسٰی اِلَّا اَنَّهٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ

''اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت علی کرّم اللہ وجھہ سے فرمایا: ''میرے ساتھ تمہاری مثال ایسی ہے جیسی ہارون علیہ السلام کی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھی (البتہ فرق اتنا ہے کہ) میرے بعد کوئی نبی نہیں۔''

ہارون اور موسیٰ علیہما السلام ایک دوسرے کے حقیقی بھائی اور اللہ کے پیغمبر تھے۔ اُدھر جناب علی کرّم اللہ وجھہ اور نبی ﷺ ایک دوسرے کے چچا زاد بھائی ہیں۔ باہم بھائی ہونے کے لحاظ سے اپنے ساتھ جناب علی کی مثال دے کر یہ فرق بیان کر دیا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں تاکہ اس مثال سے لوگ جناب علی کو رسول یا نبی نہ سمجھ بیٹھیں۔

ابن حیّان اندلسی (م ۷۴۵ھ) اپنی تفسیر ''البحر المحیط'' میں لکھتے ہیں :

وَمَنْ ذَهَبَ اِلٰى اَنَّ النُّبُوَّةَ مُكْتَسَبَةٌ لَاتَنْقَطِعُ اَوْاِلٰى اَنَّ الْوَلِيَّ اَفْضَلُ مِنَ النَّبِيِّ فَهُوَزِنْدِيْقٌ يَجِبُ قَتْلُه وَقَدِادَّعٰى نَاس" اَلنُّبُوَّةَفَقَتَلَهُمُ الْمُسْلِمُوْنَ عَلٰى ذٰلِكَ (البحر المحیط)

''جس شخص کا یہ عقیدہ ہو کہ نبوت کسبی چیز ہے اور اس کا سلسلہ بند نہیں ہوا یا یہ عقیدہ ہو کہ ولی نبی سے افضل ہوتا ہے تو وہ دہریہ ہے اور واجب القتل ہے۔ (نبی علیہ السلام کے بعد جن لوگوں نے کسی بھی زمانہ میں) نبوّت کا دعویٰ کیا تو مسلمانوں نے اسی بنیاد پر اُسے قتل کر دیا۔''

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ختمِ نبوّت کی توثیق میں متعدد احادیث کا حوالہ دینے کے بعد علامہ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) اپنی تفسیر میں اس طرح رقمطراز ہیں :

فَقَدْ اَخْبَرَاللّٰهُ تَعَالٰى فِىْ كِتَابِهٖ وَرَسُوْلُه ﷺ فِى السُّنَّةِ الْمُتَوَاتِرَةِ عَنْهُ اَنَّه لَانَبِيَّ بَعْدَه لِيَعْلَمُوْا اَنَّ كُلَّ مَنِ ادَّعٰى هٰذَاالْمُقَامَ بَعْدَه فَهُوَ كَذَّاب" اَفَّاك" دَجَّال" ضَالّ" مُضِلّ" (تفسیر ابن کثیر)

''اللہ تعالیٰ نے اپنے کتاب قرآن مجید میں اور اُس کے رسول ﷺ نے اپنی احادیثِ مبارکہ میں یہ خبر دی ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ جو کوئی آپ ﷺ کے بعد نبوّت کا دعویٰ کرے تو وہ حق وصداقت کا منکر ہوگا' افترا پرداز' دجّال' خود گمراہ اور دوسروں کو گمراہ کرنے والا ہوگا۔''

علامہ سیّد محمود آلوسی (م ۱۲۷۰ھ) اس سلسلہ میں فرماتے ہیں :

وَكَوْنُه ﷺ خَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ مِمَّا نَطَقَ بِهِ الْكِتٰبُ وَصَرَّحَتْ بِهِ السُّنَّةُ وَاَجْمَعَتْ عَلَيْهِ الْاُمَّةُ فَيُكْفَرُ مُدَّعِيْ خِلَافِهٖ وَيُقْتَلُ اِنْ اَصَرَّ (روح المعانی)

''نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آخری نبی ہونے کا صراحت کے ساتھ بیان قرآن مجید اور سنتِ نبوی سے ثابت ہے اور اُسے اُمّت کا اجماع حاصل ہے۔ اس لئے جو کوئی آپ ﷺ کے بعد منصبِ نبوّت کا دعویدار ہو' مرتد ہو جائے گا۔ اگر وہ توبہ سے گریز کرے اور اپنے دعویٰ پر مصر رہے تو اُسے قتل کر دیا جائے گا۔''

(113) اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُه اُمَّهٰتُهُمْ (الاحزاب : ۶)

''یہ نبی مکرّم مومنوں کے ساتھ اُن کی جانوں سے زیادہ قریب اور حقدار ہیں اور آپ کی ازواج (مطہرات) اُن کی مائیں ہیں۔'' (۶ : ۳۳)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اُس تعلق کی کیفیت اور نوعیت کو بیان فرما رہا ہے جو نبی کریم ﷺ کو اپنے غلاموں کے ساتھ ہے۔ بتایا کہ تمہاری خیر خواہی' اصلاحِ احوال' فلاحِ دارین اور تم پر لطف وکرم فرمانے میں میرا

محبوب تم پر تمہارے نفسوں سے بھی زیادہ مہربان اور شفیق ہے۔ جتنا میرے نبی کو تمہاری عزت، خوشحالی اور اخلاقی برتری کا خیال ہے، تمہیں خود بھی اپنا اِس قدر خیال نہیں۔ اس حقیقت کی وضاحت سورۃ التوبہ کی اِس آیت ۱۲۸ میں بھی کر دی گئی ہے: عَزِيزٌ "عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ" عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ" رَّحِيمٌ "یعنی" جو چیز تمہارے لئے تکلیف دہ ہے، وہ اُنہیں بھی بڑی گراں گزرتی ہے۔ وہ تمہارے لئے آرزومند ہیں اور اہل ایمان کے لئے بڑے مہربان اور رحیم ہیں۔"

امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث روایت کی ہے جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

إِنَّمَا مَثَلِي وَمَثَلُ أُمَّتِي كَمِثْلِ رَجُلٍ إِسْتَوْقَدَ نَارًا فَجَعَلَتِ الدَّوَآبُّ وَالْفَرَاشُ يَقَعْنَ فِيهِ وَأَنَا آخِذٌ" بِحُجَزِكُمْ وَأَنْتُمْ تَقْتَحِمُونَ فِيهِ (تفسیر قرطبی)

"میری اور میری اُمت کی حالت اُس شخص کی طرح ہے جس نے آگ جلائی ہو اور مختلف جانور اور پروانے اُس میں گرنے کے لئے دوڑتے چلے آ رہے ہوں۔ میں تمہیں تمہاری کمروں سے پکڑ رہا ہوں جبکہ تم اُس میں گرنے پر اصرار کر رہے ہو۔"

صحیح بخاری کی یہ حدیثِ مبارکہ بھی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اپنی اُمت سے حد درجہ محبت کی آئینہ دار ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: مَا مِنْ مُّؤْمِنٍ إِلَّا وَأَنَا أَوْلَى بِهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ إِقْرَءُ وْا إِنْ شِئْتُمْ: اَلنَّبِيُّ أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَأَيُّمَامُؤْمِنٍ "مَاتَ وَتَرَكَ مَالاً فَلْيَرِثْهُ عَصَبَتُهُ مَنْ كَانُوا وَمَنْ تَرَكَ دَيْنًا أَوْ ضِيَاعًا فَلْيَأْتِنِي فَأَنَا مَوْلَاهُ

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی ایسا مومن نہیں جس کا دنیا اور آخرت میں میں والی نہیں۔ اگر تم چاہتے ہو تو یہ آیت پڑھو: اَلنَّبِيُّ أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ اور جو مومن فوت ہوا اور اپنے پیچھے مال چھوڑ جائے تو اُس کے قریبی رشتہ دار اُس کے وارث ہوں گے اور جو مومن قرضہ وغیرہ چھوڑ جائے تو وہ میرے پاس آئے، میں اُس کا والی ہوں۔"

"جب حضور علیہ السلام کا ہمارے ساتھ ایسا تعلق ہے، آپ ﷺ کی خیر خواہی اور لطف و کرم کا یہ عالم ہے تو پھر حیف ہے ہم پر اگر ہم حضور علیہ السلام کی شریعت کو چھوڑ کر اپنے نفسوں کی خواہشات کی پیروی میں لگ جائیں، اپنے دوستوں کو خوش کرنے کے لئے اور اعلیٰ حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہم اپنے نبی پاک کی اطاعت سے سرتابی کریں۔ نیز اسلامی حکومتوں اور قانون ساز اداروں کو بھی اس امر کا پورا پورا احساس ہونا چاہئے کہ وہ کس رؤف و رحیم کا دامن چھوڑ رہے ہیں اور کس کی اطاعت کو اپنا شعار بنا رہے ہیں۔"

حضور علیہ السلام کے اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْن ہونے کا مطلب یہی تو ہے کہ آپ مومنوں پر اُن کے نفسوں سے

زیادہ مہربان اور شفقت کرنے والے ہیں کیونکہ آپ اُنہیں نجات کی طرف بلاتے ہیں جبکہ اُن کے نفس اُنہیں ہلاکت کی طرف بلاتے ہیں۔

حضرت سہیل فرماتے ہیں :
مَنْ لَّمْ يَرَ نَفْسَه‘ فِيْ مِلْكِ الرَّسُوْلِ وَلَمْ يَرَوِلَايَتَه‘ عَلَيْهِ فِيْ جَمِيْعِ اَحْوَالِهٖ لَمْ يَذُقْ حَلَاوَةَ سُنَّتِهٖ
''جو شخص اپنے آپ کو حضور علیہ السلام کا غلام نہ سمجھے اور اپنے تمام حالات میں اپنے آپ پر حضور کی حکمرانی تسلیم نہ کرے‘ اُس نے سنتِ رسول کی شیرینی کا مزہ ہی نہیں چکھا۔''

آیت کے اگلے حصّہ میں حضور رسالتمآب ﷺ کی ازواجِ مطہرات کی عزت افزائی فرمائی جارہی ہے کہ وہ مسلمانوں کی مائیں ہیں۔ اس تعلق کے باعث ہر مؤمن کا فرض ہے کہ اُن کا اسی طرح احترام کرے جس طرح اپنی ماں کا احترام کرتا ہے۔ اگر ان جسمانی ماؤں کا احترام نہ کرنے والا رحمتِ الٰہی سے محروم ہو جاتا ہے تو جو بدنصیب اپنی روحانی ماؤں کے متعلق گستاخیاں کرنے سے باز نہیں آتے‘ اُنہیں اپنے حشر کا ابھی سے اندازہ کر لینا چاہئے۔

خیال رہے کہ حضور علیہ السلام کی ازواجِ مطہرات سب صورتوں میں مسلمانوں کی مائیں نہیں بلکہ بعض صورتوں میں اُن کی مائیں ہیں۔ یعنی اُن سے نکاح کرنا حرام ہے‘ اُن کی عزت واحترام اپنی ماں سے بھی بڑھ کر کرنا فرض ہے۔ لیکن اُنہیں اُن کی بے حجابی کی حالت میں دیکھنا‘ اُن کے ساتھ اکیلے سفر کرنا اور اُن کے ساتھ تخلیہ کرنا سب حرام ہیں (جبکہ اپنی حقیقی ماں کا ساتھ ایسا نہیں ہے)۔ ازواجِ مطہرات کے بھائی اور بہنیں مسلمانوں کے چچا یا چچیاں نہیں ہیں۔ مثلاً سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مؤمنوں کی ماں ہیں لیکن اُن کے بھائی حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے ماموں نہیں اور نہ ہی آپ کی ہمشیرہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا مسلمانوں کی خالہ ہیں۔

ربِّ ذوالجلال والاکرام نے اپنے بارے میں فرمایا کہ ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اُس کے قریب ہیں (سورہ قٓ: ۱۶) اور اپنے محبوب علیہ السلام کے بارے میں یہاں فرمایا: ''نبی (ﷺ) مؤمنوں سے اُن کے نفسوں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔'' (سورۃ الاحزاب: ۶) اگر شہ رگ کاٹ دی جائے یا روح جسم سے جدا ہو جائے تو دونوں صورتوں میں موت واقع ہو جاتی ہے۔ اِن دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ اگر کسی شخص کا عقیدہ یہ ہو کہ اللہ اُس کے قریب نہیں ہے تو اُس کا ایمان جاتا رہے گا اور اگر وہ نبی علیہ السلام کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے کہ آپ ﷺ اس کی جان سے زیادہ قریب نہیں ہیں تو اس کا نتیجہ بھی اوّل الذکر ہی کی طرح ہوگا۔

اِس آیت کی تفسیر میں مولانا محمد قاسم نانوتوی لکھتے ہیں: ''دو علیحدہ جملوں کہ ''آپ ﷺ مؤمنوں کے ساتھ اُن کی جانوں سے زیادہ قریب اور حقدار ہیں'' اور ''آپ کی ازواج (مطہرات) اُن کی مائیں ہیں''

آپ ﷺ کی حیات بعداز وفات کا ایسا پختہ ثبوت ہیں کہ اس کے بعد کسی انکار کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

''کیا انتہا ہے اُس شفقت وتعلق کی جو ہمارے نبی کو اپنی تمام امت کے ساتھ ہے۔ انسان خود اپنا دشمن و بدخواہ تو ہو بھی سکتا ہے اور بعض اوقات جہل وغباوت کی بناء پر بھی ہو جاتا ہے لیکن رسول اللہ ﷺ سے تو جن پر خفی سے خفی مصالح ومنافع روشن ہیں' کسی حال میں بھی بدخواہی کا امکان نہیں۔'' (ماجدی' ص ۸۴۰)

(114) وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (ابراهیم : ۴)
''اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان کے ساتھ۔'' (۴ : ۱۴)

اِس آیت میں بھی محبوب کبریاء ﷺ کی تعریف وتوصیف کی خوشبو رسی بسی نظر آتی ہے۔ اس حقیقت سے کہ آپ مختلف زبانیں بولنے والی مختلف اقوام کی طرف مبعوث کیے گئے' یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو تمام اقوامِ عالم کی تمام متداول زبانیں سکھائی گئیں۔ سلسلۂ انبیاء علیہم السلام میں ہمارے نبی مکرّم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دوہری' نمایاں حیثیت حاصل ہے: اوّل تو آپ کو تمام کائنات کے ہادی ومرشد ہونے کا اعزاز حاصل ہے جس کا ذکر قرآن مجید کے مختلف مقامات پر کیا گیا ہے اور دوم یہ کہ آپ ملکِ عرب کے بھی رسول ہیں۔ آیتِ بالا میں آپ کی اسی دوسری قسم کی حیثیت کا بیان ہے۔

(115) اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى O وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى O وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى O
(اَلضُّحٰی :٦ تا ٨)
''(اے حبیب!) کیا اُس نے آپ کو یتیم نہیں پایا' پھر (اپنی آغوشِ رحمت میں) جگہ دی۔ اور اُس نے آپ کو اپنی محبت میں خود رفتہ وگم پایا تو اُس نے منزلِ مقصود تک پہنچا دیا۔ اور اُس نے آپ کو حاجت مند پایا تو غنی کر دیا۔'' (٦ تا ٨ : ٩٣)

ہمارے نبی مکرّم یتیم پیدا ہوئے لیکن والدہ ماجدہ نے انتہائی محبت و پیار سے پروان چڑھایا۔ چھ سال کی عمر میں تھے کہ والدِ ماجد جناب عبداللہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اُن کے بعد آپ کی پرورش کی خدمت آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب نے سنبھالی۔ آٹھ سال کی عمر میں جدِّ محترم بھی داغِ مفارقت دے گئے تو یہ سعادت آپ کے حقیقی اور شفیق چچا جناب ابو طالب کے سپرد ہوئی جنہوں نے تادمِ واپسیں اس خدمت کو اُس حسن وخوبی سے انجام دیا کہ اس کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ ویسے تو ہر ماں اپنے لختِ جگر پر سو جان سے قربان ہوتی ہے اور ہر دادا اپنے متوفی فرزند کے یتیم بچے کو بڑی محبت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے اور چچا کا پیار بھی اپنے فوت شدہ بھائی کے فرزند کے لئے بڑا عمیق ہوتا ہے لیکن یہاں معاملہ ہی بالکل جدا ہے۔ بچپن ہی سے جو علاماتِ سعادت ونجابت وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتی رہیں' اُس نے ماں' دادا اور چچا کی محبت میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔

حضور علیہ السلام کی معصومانہ ادائیں اور پاکیزہ اطوار اور نجابت وسعادت کے وہ آثار جو ہر صبح و شام نمایاں ہوتے رہتے تھے' اُنہوں نے حضور علیہ السلام کی محبوبیت میں اتنا اضافہ کر دیا تھا اور آپ کی قدر و منزلت کو ان حضرات کی نگاہوں میں اِتنا بلند فرما دیا تھا جو کسی اور بچے کو نصیب نہیں ہو سکتی اور یہ ساری ادائے دلبری رب تعالیٰ کی بخشی ہوئی تھی اس لئے فَـآوٰی کی نسبت اپنی طرف فرمائی کہ ہم نے اپنی خاص مہربانی سے اُن کے دلوں میں آپ کی محبت اور ادب واحترام اور قدر و منزلت پیدا فرما دی۔

علامہ قرطبی نے مجاہد سے ایک اور تفسیر نقل کی ہے کہ یہاں یتیم سے مراد دُرِّ شہوار ہے جو اپنی آب و تاب اور قدر و قیمت میں بے مثال ہو۔ علامہ آلوسی کہتے ہیں کہ بہتر یہ ہے کہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ساری مخلوقات میں یگانہ اور عدیم النظیر پایا۔ صدفِ امکان کو آپ جیسا موتی آج تک نصیب نہیں ہوا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے آغوشِ رحمت میں آپ کو پناہ دی۔ (روح المعانی بحوالہ ضیاء القرآن' جلد پنجم صفحات ۵۸۸' ۵۸۹)

آیت ہفتم (وَوَجَدَكَ ضَـآلًّا فَهَدٰى) کے ترجمہ میں بڑے بڑے مدّعیانِ علم نے بُری طرح ٹھوکر کھائی ہے' اس لئے اسے اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرنا از حد لازم ہے تا کہ دامنِ رسالت پر ہلکا سا غبار بھی نہ آنے پائے۔

ضَآلًّا ضلالت سے اسم فاعل ہے۔ عام طور پر ضلالت کا یہی مفہوم سمجھا جاتا ہے: راہِ راست سے بھٹک جانا' گمراہ ہو جانا' عقیدہ وعمل میں غلط راہ اختیار کرنا۔ علمائے اہلِ سنت کا اس پر اجماع ہے کہ حضور سرورِ عالم ﷺ اعلانِ نبوّت سے پہلے بھی اور بعد میں بھی عقیدہ اور عمل کی ہر کجی سے معصوم تھے۔ آپ نے اُس مشرکانہ ماحول میں عمر بسر کی لیکن ایک لمحہ کے لئے بھی شرک نہیں کیا۔ زمانہ جاہلیت کی لغویات سے حضور علیہ السلام کا دامن ہمیشہ محفوظ رہا۔ تاریخ شاہد ہے کہ عرب معاشرہ جس قسم کی فکری اور عملی گمراہیوں میں مبتلا تھا' حضور علیہ السلام اُن سے ہمیشہ بالکل منزّہ اور مبرّا تھے۔ رب تعالیٰ نے اپنے حبیب کی سابقہ زندگی کو آپ کی صداقت کی دلیل کے طور پر سورہ یونس کی آیت ۱۶ میں پیش کیا ہے کہ ''میں نے اپنی عمر اس سے پہلے بھی تمہارے درمیان گزاری ہے' تو کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے؟'' سورۃ النّجم کی آیت دوم میں بھی حضور علیہ السلام سے عقیدہ اور عمل کی گمراہی کی نفی کی گئی ہے۔ ان آیات کی موجودگی میں اور تاریخ کی اٹل شہادت کے باوجود یہاں ضَآلًّا کا معنی گمراہ یا بھٹکا ہوا کرنا خود بڑی ضلالت ہے (العیاذ باللہ)۔

علمائے تفسیر نے اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے بہت سے اقوال بیان کئے ہیں۔ ان میں سے چند ہدیہ قارئین کئے جاتے ہیں:۔

(۱) ضَلَالَت کا لفظ غفلت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے لَا يَضِلُّ رَبِّىْ وَلَا يَنْسٰى (طٰہٰ:۵۲)

یعنی میرا رب نہ کسی چیز سے غافل ہوتا ہے اور نہ کسی چیز کو فراموش کرتا ہے۔ مذکورہ آیت میں ضَآلًا بمعنی غافل مستعمل ہوا ہے یعنی آپ قرآن اور احکامِ شرعیہ کو پہلے نہیں جانتے تھے۔ رب تعالیٰ نے آپ کو قرآن کا علم بھی بخشا اور احکامِ شرعیہ کی تفصیلات سے بھی آگاہ فرمایا۔ (تفسیر قرطبی بحوالہ ضیاء القرآن، جلد پنجم، صفحہ ۵۸۹)

(۲) جب پانی دودھ میں ملایا جائے اور پانی پر دودھ کی رنگت وغیرہ غالب آجائے تو عرب کہتے ہیں: ضَلَّ الْمَاءُ فِي اللَّبَنِ کہ پانی دودھ میں غائب ہوگیا۔ اس استعمال کے مطابق آیت کا معنیٰ ہوگا کہ آپ مکہ میں کفار میں گھرے ہوئے تھے پس رب تعالیٰ نے آپ کو قوت عطا فرمائی اور آپ نے اُس کے دین کو غالب کیا۔

(۳) ایسا درخت جو کسی وسیع صحرا میں تنہا کھڑا ہو اور مسافر اُس کے ذریعے اپنی منزل کا سراغ لگائیں، اُسے بھی عربی میں اَلضَّال کہتے ہیں۔ اس مفہوم کے اعتبار سے آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ جزیرہ عرب ایک سنسان ریگستان تھا جس میں کوئی ایسا درخت نہ تھا جس پر ایمان وایقان اور عرفان کا پھل لگا ہوا ہو۔ صرف آپ کی ذات جہالت کے اُس صحرا میں ایک پھلدار درخت کی مانند تھی۔ پس ہم نے آپ کے ذریعہ سے مخلوق کو ہدایت بخشی (تفسیر کبیر)۔

(۴) کبھی قوم کے سردار کو خطاب کیا جاتا ہے لیکن اصلی مخاطب قوم ہوتی ہے۔ یہاں بھی یہی معنیٰ ہے اَیْ وَجَدَ قَوْمَكَ ضَآلًّا فَهَدَاهُمْ (اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم کو گمراہ پایا تو آپ کے ذریعہ سے اُنہیں ہدایت بخشی)۔ علامہ ابوحیان اندلسی اپنی تفسیر میں اس مقام پر لکھتے ہیں کہ ایک رات خواب میں میں اس آیت کی ترکیب پر غور کررہا تھا کہ فوراً میرے دل میں خیال آیا کہ یہاں مضاف محذوف ہے اور اصل میں عبارت یوں ہے: وَجَدَ رَهْطَكَ ضَآلًّا فَهَدیٰ بِكَ۔ پھر میں نے کہا کہ جس طرح سورہ یوسف کی آیت ۸۲ میں وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ اصل میں وَاسْئَلْ اَهْلَ الْقَرْيَةِ ہے اور اَهْل جو مضاف ہے محذوف ہے۔ اسی طرح یہاں بھی رَهْط مضاف محذوف ہے (البحر المحیط)

(۵) حضرت جنید قدس سرہٗ سے منقول ہے کہ ضَآلًّا کا معنیٰ مُتَحَيِّرًا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو قرآن کریم کے بیان میں حیران پایا تو اُس کے بیان کی تعلیم دی۔

(۶) امام رازی کہتے ہیں کہ یہاں ضلال سے مراد محبت ہے جس طرح سورہ یوسف کی آیت ۹۶ میں ہے کہ برادرانِ یوسف نے اپنے والدِ ماجد حضرت یعقوب علیہ السلام سے کہا تھا: تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ''اللہ کی قسم! یقیناً آپ اپنی (اُسی) پرانی محبت کی وارفتگی میں ہیں۔'' تو اس صورت میں آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی محبت اور عشق میں وارفتہ پایا تو ایسی شریعت سے بہرہ ور فرمایا جس کے ذریعے آپ نے اپنے محبوبِ حقیقی کا قرب حاصل کرلیا۔

بعض صوفیاء فرماتے ہیں کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی محبت اور اپنے عشق میں ازحد بڑھا ہوا

پایا تو آپ کو اپنے محبوب کے وصال کی طرف رہنمائی کی یہاں تک کہ آپ قَابَ قَوْسَیْن کے مقام پر فائز ہوئے۔

(۷) اَلضَّال کا ایک معنیٰ گم ہو جانے کا بھی ہے جیسا کہ سورہ الٓمّٓ السّجدہ کی آیت دہم میں ہے: وَقَالُوْٓا ءَ اِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَ اِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ یعنی ''وہ (کفار) کہتے ہیں جب (مرنے کے بعد) ہم زمین میں گم ہو جائیں گے تو کیا ہم از سرِ نو پیدا کئے جائیں گے؟''

علامہ آلوسی نے آیت ہفتم کے ضمن میں یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ ایک بار حضور علیہ السلام عہدِ طفولیت میں اپنے دادا جان سے الگ ہو کر مکہ کی گھاٹیوں میں چلے گئے۔ جناب عبد المطلب نے بہت تلاش کیا لیکن آپ نہ ملے جس سے آپ کی بے چینی بہت بڑھ گئی اور غلافِ کعبہ کو پکڑ کر بارگاہِ الٰہی میں فریاد کرنی شروع کر دی۔ حضور علیہ السلام کسی گھاٹی میں گھوم رہے تھے۔ اِسی اثناء میں ابوجہل اپنی اونٹنی پر سوار اپنے ریوڑ کو ہانک کر لا رہا تھا۔ اُس نے جب حضور کو دیکھا تو اپنی اونٹنی کو بٹھایا' اتر کر حضور کو جا لیا اور اپنے پیچھے بٹھا لیا اور خود آگے بیٹھا پھر اونٹنی کو اٹھنے کا اشارہ کیا لیکن اونٹنی اٹھنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ جب بڑی کوشش کے باوجود اُس نے جنبش نہ کی تو ابوجہل حیران رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اونٹنی کو قوّتِ گویائی بخشی اور اُس نے کہا: اے بیوقوف! یہ امام ہیں اور امام مقتدی کے پیچھے کھڑا نہیں ہوا کرتا۔ اُس نابکار نے آپ کو اٹھا کر آگے بٹھایا تو اونٹنی فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔ تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے ذریعے اپنی والدہ تک پہنچایا تھا' اُسی طرح اللہ تعالیٰ نے اِس اُمّت کے فرعون ابوجہل کے ذریعے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنے جدِّ امجد تک پہنچا دیا۔

عَائِل کے دو معنیٰ ہیں: تنگدست اور اہل وعیال والا۔ آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عیال والا پایا (کیونکہ ساری اُمّت آپ کی عیال ہے) تو غنی کر دیا یا آپ کو تنگدست پایا تو غنی کر دیا۔ ظاہری غنیٰ کی تو صورت یہ تھی کہ سیّدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے اپنی جان' اپنا سارا مال حاضر کر دیا اور اپنے تمام رشتہ داروں کی موجودگی میں یہ اعلان کر دیا کہ یہ مال اب میرا نہیں بلکہ ان کا ہے۔ چاہے تو ابھی تقسیم کر دیں اور چاہے تو اپنے پاس رکھیں۔ اُمّ المؤمنین کے وصال کے بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنا سارا مال ومتاع حضور علیہ السلام کی خدمت کے لئے وقف کر دیا لیکن حقیقی غنیٰ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ ارزانی فرمایا کہ قلبِ مبارک کو غنی کر دیا اور زمین کے سارے خزانوں کی کنجیاں مرحمت فرما دیں اور کائنات کی ہر چیز کو تابع فرمان کر دیا۔ ایک دن فخرِ موجودات ﷺ کاشانہء اقدس میں تشریف لائے۔ مسلسل فاقہ کشی کے باعث شکم مبارک کمر کے ساتھ پیوست ہو گیا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بے تاب ہو گئیں اور اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ شکم مبارک کو بوسہ دیا اور عرض کناں ہوئیں: یا رسول اللہ! اپنے رب سے اتنا تو مانگئے کہ یوں فاقوں کی نوبت تو نہ آئے۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: اے عائشہ! اگر میں چاہوں تو یہ سارے پہاڑ سونے کے بن کر میرے پہلو میں چلنا شروع کر دیں۔ حضور علیہ السلام کا یہ فقرہ اضطراری نہ تھا بلکہ فقرِ اختیاری تھا۔ قاضی

محمد سلیمان منصور پوری نے خوب لکھا ہے ۔

گزید فقر فرماں روائے مُلک ابد　　بمشتِ خاک ندارد ہوائے سلطانی

یعنی ''حضور علیہ السلام نے فقر کو پسند فرمایا کیونکہ جسے ملکِ ابَد کی سروری بخشی گئی ہو، وہ مشتِ خاک پر حکومت کرنے کی کوئی خواہش نہیں رکھتا۔''

(116) فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ O لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ O (الغاشیۃ : ۲۱، ۲۲)

''پس آپ نصیحت فرماتے رہیے، آپ تو نصیحت ہی فرمانے والے ہیں۔ آپ اُن پر جابر و قاہر (کے طور پر) مسلّط نہیں ہیں۔'' (۸۸ : ۲۲، ۲۱)

یہاں رسالت کے عظیم منصب کی روشن گری کی جارہی ہے۔ آیتِ بالا (۲۲) میں رب تعالیٰ اپنے محبوب علیہ السلام کی اُس دل آزاری اور رنج والم کو کم کر رہا ہے جو آپ کو اپنے دشمنوں سے پہنچتی تھی۔ آپ کا دشمنوں کی فلاح و بہبود کے لئے جانفشانی اور کمال لگن سے کام کرنے کا اُن دشمنوں کے نزدیک کسی قدر و قیمت کا حامل نہ تھا اور پیغمبر علیہ السلام سے فرمایا جارہا ہے کہ جب آپ نے اپنا مفوضہ فرض باحسن طریق انجام دے دیا ہے تو آپ کو اُن کے اس متکبرانہ رویّہ پر فکر و تردد میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ وہ حق و صداقت کو قبول نہیں کرتے۔

(117) يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ O قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا O نِّصْفَهُ أَوِ انقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا O أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا O إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا O (اَلْمُزَّمِّل : ۱۔۵)

''اے کملی کی جھرمٹ والے (حبیب!) آپ رات کو (نماز میں) قیام فرمایا کریں مگر تھوڑی دیر (کے لئے)۔ آدھی رات یا اس سے تھوڑا کم کر دیں۔ یا اس پر کچھ زیادہ کر دیں اور قرآن مجید خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کریں۔ ہم عنقریب آپ پر ایک بھاری فرمان نازل کریں گے۔'' (۷۳:۵۔۱)

جیسا کہ قبل ازیں آغاز میں بیان ہوا کہ آپ ﷺ کے لئے رب تعالیٰ کی طرف سے یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ اُس نے پورے قرآن مجید میں آپ کو آپ کے نام ''محمد'' سے کہیں بھی خطاب نہیں فرمایا بلکہ یا تو ہمیشہ اُن کے القاب (مزّمّل، مدثّر، نبی اور رسول وغیرہ) سے خطاب کیا یا اُس حالت کی مناسبت سے خطاب کیا گیا جس میں آپ پائے گئے جیسا کہ اوپر کی آیت میں لفظ مزّمّل سے خطاب کیا گیا ہے جبکہ آپ اپنی نبوّت کے ابتدائی ایام میں کچھ قریشیوں کے دل خراش رویّہ سے مغموم و اداس اپنی کملی میں لپٹے بیٹھے تھے۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لفظ مُـــزّمّــل کا مصدر زَمَــلَ ہے جس کا معنیٰ ''بوجھ'' کا ہے۔ اہلِ عرب کہتے ہیں: اِزْدَمَلَ (اُس نے بوجھ اٹھالیا)۔ اس لحاظ سے آیت کا ترجمہ یہ ہوگا: ''اے بارِ نبوّت

اٹھانے والے!'' (روح المعانی بحوالہ ضیاء القرآن، جلد پنجم، صفحہ ۴۰۲)۔

معنیٰ مذکور کا حوالہ دینے کے بعد علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں کہ زمخشری نے اپنی تفسیر ''الکشاف'' میں کہا ہے کہ یَا اَیُّهَا الْمُزَّمِّل کے خطاب میں پیغمبر علیہ السلام کو اُن لوگوں کی طرح کملی میں لپٹ کر بیٹھنے سے سرزنش کی جا رہی ہے جن کے نزدیک زندگی بے مقصد ہے۔ لہٰذا اٹھئے اور اپنا فرضِ نبوت ادا کیجئے۔ علامہ کہتے ہیں کہ زمخشری کا یہ انداز ایسا گستاخانہ ہے جس کی تاویل کسی بھی طریق سے نہیں کی جاسکتی۔ کچھ لوگوں نے زمخشری کے دفاع میں جواب دینے کی کوشش کی ہے لیکن آلوسی کا کہنا ہے کہ اُس کے بیان میں گستاخانہ پہلو کا کسی بھی طرح ازالہ نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے: ''اے وہ جس نے رسالت کی معزز کملی میں اپنے آپ کو چھپا رکھا ہے۔'' قُمِ الَّیْل کے لفظ سے ساری رات نماز میں کھڑے ہونے کا تصوّر ہوسکتا تھا لیکن اِلَّا قَلِیْلًا کہہ کر اُس تصوّر کی نفی کر دی گئی اور پیغمبر سے کہا گیا کہ تھوڑی دیر کے لئے آرام بھی کرلیا کیجئے جس کی مقدار ''نصف شب'' بتا دی گئی اور اگر ''نصف شب'' کو کچھ کم یا کچھ زیادہ کرلیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ بہ الفاظِ دیگر پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ اختیار مرحمت فرمایا جارہا ہے کہ یا تو آپ نصف شب آرام فرمالیا کریں یا اس میں کمی بیشی کا بھی آپ کو اختیار ہے۔

تَـرْتِیْـل کے لفظ کا حوالہ دیتے ہوئے آلوسی فرماتے ہیں کہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ' کے بقول نبی اکرم ﷺ نے ہمیں اس کا معنیٰ یہ بتایا ہے:

''قرآن کی تلاوت اُس شخص کی طرح نہ کرو جو بے قدر و قیمت اور ردّی کھجوروں کو جلدی جلدی بکھیرتا چلا جاتا ہے یا بال کاٹتا چلا جاتا ہے۔ جب کوئی نادر نکتہ آئے تو اُس پر کچھ دیر کے لئے غور کرلیا کرو۔ اپنے دل کو قرآن کی اثرانگیزی سے متحرک کرو اور اپنی روح میں تموّج پیدا کرو اور تمہیں کسی بھی سورۃ کو جلد ختم کرنے کی فکر نہ ہو۔''

قولِ ثقیل سے مراد گراں قدر کلام (قرآن مجید) کا نزول ہے جو اوامر و نواہی' احکام و ارشادات کے ایک طویل سلسلہ پر مشتمل ہوگا۔ اس پر خود عمل کرنا اور دوسرے لوگوں سے اُس پر عمل کرانا بڑی بھاری ذمہ داری ہے۔ اس کے بوجھ کا اندازہ لگانا آسان کام نہیں۔ اگر پہاڑوں پر بھی یہ کلام نازل ہوتا تو وہ اس کی دہشت اور جلال سے ریزہ ریزہ ہوجائیں (سورۃ الحشر: ۲۱)۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نزولِ آیات کے وقت عجیب کیفیت طاری ہوتی تھی۔ سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے حضور علیہ السلام کو اس حالت میں دیکھا جب سخت سردی کے دن بھی وحی نازل ہوتی تو جب وحی کا نزول ختم ہوتا تو آپ ﷺ کی پیشانی مبارک سے پسینہ کے قطرے ٹپکنے لگتے۔

کلامِ الٰہی کے ثقیل ہونے کی یہ وجہ بھی بیان کی گئی ہے کہ پہلے حضور علیہ السلام حرا کی خلوتوں میں ذکرِ الٰہی اور

مشاہدۂ انوار و تجلیات میں مستغرق رہتے۔ اس طرح دل کو بڑی خوشی واطمینان نصیب ہوتا۔ مقام نبوت پر فائز کر کے حضور علیہ السلام کو مخلوق کی اصلاح کی طرف متوجہ کیا گیا۔ توجہ کی سمت میں یہ تبدیلی حضور پر بڑی گراں تھی۔ ارشاد و تکمیل کا درجہ اگرچہ استکمال و خلوت سے اعلیٰ و برتر ہوتا ہے لیکن صوفی کے لئے رجوع الی الخلق بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ اسی لئے بعض نے کہا ہے کہ نبی کی شانِ ولایت اُس کی شانِ نبوت سے ارفع ہوتی ہے کیونکہ پہلی حالت میں ساری توجہ محبوبِ حقیقی کی طرف ہوتی ہے اور دوسری حالت میں توجہ کا مرکز مخلوق ہوتی ہے۔ لیکن حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ قول غلط ہے کیونکہ نبوت ہر لحاظ سے ولایت سے افضل ہے کہ صوفیاء کی اصطلاح میں نبوت سیر فی الذات کا نام ہے اور ولایت سیر فی الصفات کا نام ہے اور دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ (مظہری)

(118) وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًاO وَذَرْنِیْ وَالْمُكَذِّبِیْنَ أُولِی النَّعْمَةِ وَ مَهِّلْهُمْ قَلِیْلًاO (اَلْمُزَّمِّل : ۱۰، ۱۱)

''اور آپ اُن (باتوں) پر صبر کریں جو کچھ وہ (کفار) کہتے ہیں اور نہایت خوبصورتی کے ساتھ اُن سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اور آپ مجھے اور جھٹلانے والے خوشحال لوگوں کو (انتقام لینے کے لئے) چھوڑ دیں اور اُنہیں تھوڑی سی مہلت دے دیں۔'' (۷۳ : ۱۰، ۱۱)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ آپ اللہ اور اُس کے رسول کے خلاف کفار کی گستاخیوں اور بہتان طرازیوں پر صبر سے کام لیں۔ اے محبوب! وہ جو کچھ بکتے ہیں، بکنے دو، اُن کی طرف سے رخِ انور پھیر لو۔ اُن کی گستاخیوں اور اذیت رسانیوں کا انتقام لینے کا خیال بھی آپ کے قلب مبارک میں نہ آنے پائے۔ آپ نے سب کام میرے سپرد کر دئے ہیں۔ اب آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود اُن سے نپٹ لوں گا۔ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا کا بھی یہی مطلب ہے کہ اُن سے الجھنا، اُن کے دوبدو ہونا اور اُن سے انتقام لینا آپ کے اعلیٰ وارفع منصب کو زیب نہیں دیتا۔ چنانچہ اس آیت کے نزول کے بعد بہت جلد یہ أُولِی النَّعْمَة میدانِ بدر میں ذلیل و رسوا کر کے قتل کر دئے گئے۔

(119) اِنَّ رَبَّكَ یَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ الَّیْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَكَ وَاللّٰهُ یُقَدِّرُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَیْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (اَلْمُزَّمِّل : ۲۰)

''بے شک آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ (کبھی) دو تہائی شب کے قریب اور (کبھی) نصف شب اور (کبھی) ایک تہائی شب (نماز میں) قیام کرتے ہیں اور اُن لوگوں کی ایک جماعت (بھی) جو آپ کے ساتھ ہیں (قیام میں شریک ہوتی ہے) اور اللہ ہی رات اور دن (کے گھٹنے اور بڑھنے) کا صحیح اندازہ رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ تم ہرگز اُس کے احاطہ کی طاقت نہیں رکھتے، سو اُس نے تم پر (مشقت میں تخفیف کر کے) معافی دے دی، پس جتنا آسانی سے ہو سکے قرآن پڑھ لیا کرو۔'' (۷۳:۲۰)

مشہور و معروف صوفیائے کرام نے کہا ہے کہ اس آیت کے افتتاحی الفاظ (اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ) میں محبوبِ کبریاء ﷺ کے لئے رحمتِ الٰہی اور اُن کے لئے اللہ تعالیٰ کی خصوصی توجہ اور تعلق چھپا ہوا ہے۔

''نبی اکرم ﷺ اور آپ کے پُر جوش صحابہ کا ایک دستہ اکثر رات کا دو تہائی یا ایک تہائی یا نصف حصّہ اپنی میٹھی نیند کو قربان کرتے ہوئے عبادتِ الٰہی اور تلاوتِ قرآن میں گزار دیتے تھے۔ اُنہیں بتایا جا رہا ہے کہ اُن کا یہ عمل اُن پر بہت بھاری ہے بالخصوص جبکہ یہ عمل اُن کی صحت پر اثر انداز ہو یا وہ سفر پر ہوں یا وہ تبلیغِ دین کی کوشش میں ہوں۔''

''اس کا عمومی معنیٰ یہ ہے کہ عوام الناس کے لئے دن اور رات کے صحیح اوقات کا شمار کرنا شاید ممکن نہ ہو کہ بالکل صحیح طور پر معلوم کیا جا سکے کہ رات کا نصف یا تہائی یا دو تہائی حصہ کب گزر چکا ہے۔ دن اور دن کی طوالت شمسی سال کے ہر دن میں مختلف ہوا کرتی ہے اور نصف شب کا بالکل صحیح وقت کھلے اور صاف آسمان کے مشاہدہ یا وقت ناپنے کی گھڑی (Chronometer) کے ذریعے ہی معلوم کیا جا سکتا ہے جو ہر ایک کے لئے ممکن نہیں ہے۔ وقت کا کتنا حصّہ گزرا' یہ اُنہیں معلوم نہ تھا۔ اُسے معلوم کرنے کے لئے اسلام کے ابتدائی زمانہ کے کچھ مسلمان قیام اور نماز کی حالت میں تمام رات کا مشاہدہ کرتے رہتے تھے یہاں تک کہ اُن کے پاؤں سوج جاتے تھے۔ تو یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کام کاج اور آرام کے لئے دن اور رات کا موسمی اختلافات کے مطابق مناسب تناسب سے تعیّن کرتا ہے۔ نماز اور ذکر و اذکار کے لئے اُس قسم کی نہایت باریک بین اور محتاط مشاہدات کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ ہی وہ ممکن ہیں۔ عباداتِ الٰہی کئی طریقوں سے کی جا سکتی ہے جیسا کہ آیت کے آخر میں بیان ہوا۔ لیکن ہمیں اپنی سہولت کے مطابق اپنی صحت' سفر اور مختلف فرائضِ حیات کی انجام دہی کے مختلف حالات میں عبادت کے لئے وقت ضرور نکالنا چاہئے۔''

''یہاں تلاوتِ قرآن کا قریب قریب معنیٰ نماز اور مذہب سے والہانہ وابستگی ہے۔ جیسا کہ سورہ طٰہٰ کی آیت دوم میں فرمایا گیا' اسے ذہنی اثر زدگی یا بوجھ نہ سمجھا جائے۔ ہمیں پوری دل جمعی اور کامل خلوص و توجہ سے عباداتِ الٰہی میں منہمک رہنا چاہئے نہ کہ رسمی میکانی حساب (Formal Mechanical Computations) سے۔''

(Abdullah Yusuf Ali, Notes: 5771-73)

فَتَابَ عَلَيْكُمْ (وہ رحمت کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ ہوا) کے الفاظ میں نبی علیہ السلام کے صحابہ کرام کے لئے بالخصوص اور دوسرے مسلمانوں کے لئے بالعموم رحمتِ الٰہی مخفی ہے کہ مسلمانوں کے لئے تہجد کا حکم منسوخ کر کے واپس لے لیا گیا اگرچہ وہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے حسبِ سابق برقرار رہا۔

نصف شب تک نیند کو قربان کر دینا اگر فرض کر دیا جاتا تو ظاہر ہے کہ لوگ کسی بیماری' سفر اور دن بھر کی محنت مشقت وغیرہ کے باعث ایسا نہ کر سکتے اور ایسی صورت میں وہ گنہگار اور نافرمان ہوتے۔ اس لئے رحیم و کریم اللہ

نے تمہارے لئے آسانی کردی ہے اور اب یہ آپ کی صوابدید پر ہے کہ عبادت کے لئے رات کا کتنا حصہ آپ بہ سہولت جاگ سکتے ہیں۔ سبحان اللہ! اُمّتِ مصطفیٰ ﷺ کے لئے یہ تمام تر مہربانیاں اور عنایات ونوازشات اپنے محبوب ہی کی خاطر ہی تو ہیں! کاش کہ اُمّت اپنے خالقِ حقیقی کے فائق حق اور اُس کے رسول ﷺ کی قدر و منزلت کو پہچانے اور اُنہی کے ہو کے رہ جائیں!

(120) یَآ اَیُّھَا الْمُدَّثِّرُO قُمْ فَاَنْذِرْO وَرَبَّکَ فَکَبِّرْO وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْO وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْO وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَکْثِرُO وَلِرَبِّکَ فَاصْبِرْO (اَلْمُدَّثِّر : ۱۔۷)

''اے چادر اوڑھنے والے (حبیب!)' اُٹھیں اور (لوگوں کو اللہ کا) ڈر سنائیں۔ اور اپنے رب کی بڑائی اور عظمت بیان فرمائیں اور اپنے (ظاہر و باطن کے) لباس (پہلے کی طرح ہمیشہ) پاک رکھیں۔ اور (حسبِ سابق گناہوں اور) بُتوں سے الگ رہیں۔ اور (اس غرض سے کسی پر) احسان نہ کریں کہ اس سے زیادہ کے طالب ہوں۔ اور آپ اپنے رب کے لئے صبر کیا کریں۔'' (۱۔۷ : ۷۴)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی ابتدائی وحی میں کچھ عرصہ انقطاع (وقفہ) کے بارے میں فرمایا: ''ایک مرتبہ میں نے آسمان سے آتی ہوئی ایک آواز سنی۔ میں نے آنکھیں اٹھا کر اوپر کو نظر کی تو ایک فرشتہ غارِ حرا میں میری طرف آتا ہوا دکھائی دیا جو آسمان اور زمین کے درمیان میں ایک تخت پر بیٹھا تھا۔ مجھ پر رعب اور خوفزدگی طاری ہو گئے۔ میں گھر کو پلٹا اور (اپنی زوجہ سیّدہ خدیجہ سے) کہا کہ مجھے چادر اُڑھادو' مجھے چادر اُڑھادو۔ اس پر اللہ بزرگ و برتر نے (میرے حسبِ حال) یہ آیات نازل فرمائیں: ''اے چادر اوڑھنے والے! اٹھئے اور اللہ کا ڈر سنائیے۔۔ اور بُتوں سے الگ رہیں۔'' اس کے بعد وحی مسلسل اور اپنے زورِ بیان کے ساتھ آتی رہی۔ (بخاری)

یہاں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اُن کی خصوصی جسمانی ظاہری کیفیت اور چادر کے حوالے سے خطاب کیا جا رہا ہے نہ کہ اُن کے نامِ محمد سے' یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اُنہیں اپنے خالق کی نظروں میں کتنا اعزاز و اکرام حاصل ہے

آیت دوم ''اُٹھئے اور ڈرائیے'' سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تبلیغ کے عوامی سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

نماز اور اذان میں اللہُ اکبر کے افتتاحی الفاظ کا ماخذ زیرِ نظر سورۃ کی آیت سوم وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ کا جملہ ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ اللہ بزرگ و برتر کی کبریائی اور عظمت کا عقیدہ تمہیں غلامی کی تمام قیود اور پابندیوں سے آزاد کردے گا اور کسی بھی انسانی سطوت وسلطنت کے خوف سے نڈر کردے گا۔ نہ صرف یہ کہ تم خود اُس کی کبریائی کا عقیدہ رکھو بلکہ لوگوں میں بھی اس کی تشہیر اور اعلان کرتے رہو اور اے پیارے رسول! یہ اعلان آپ پر فرض کردیا گیا ہے۔

اور اے پیارے رسول! آپ کو ہم نے رسالت کے منصب رفیع پر فائز کیا ہے اور آپ کو اپنی کبریائی اور عظمت کا اعلان کرنے کے لئے ہم نے چن لیا ہے۔ ہماری چاہت یہی ہے کہ عظمت و کبریائی والے پاک اللہ کی کبریائی کا اعلان کرنے والے کا لباس بھی (حسبِ سابق) پاک و صاف رہے اور میل مٹی اور گرد و غبار سے محفوظ رہے۔ پیارے حبیب! جس طرح آپ کا مقصدِ حیات مقدّس اور پاکیزہ ہے' اُسی طرح آپ کا لباس بھی پاک و صاف ہونا چاہئے۔ آیت کا ایک اور معنیٰ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اے محبوب برحق! آپ اپنے طرزِ عمل کو اسی طرح پاک و صاف رکھیں تا کہ کسی قسم کا دھبّہ آپ کی رسالت کے منصبِ رفیع کو داغدار نہ کرنے پائے۔ دشمنانِ اسلام کو اپنے کردار میں کسی بھی خلا یا کمزوری کی طرف انگشت نمائی کرنے کا موقع نہ دیں کہ اُن کے اعتراضات طالبانِ حق کے لئے رکاوٹ نہ بن جائیں۔ فقہاء نے اِسی سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ نماز کے لئے کپڑوں کا پاک ہونا ضروری ہے اور جب کپڑوں کا پاک ہونا ضروری ہے تو نمازی کا اپنا جسم اور وہ جگہ جہاں وہ نماز ادا کر رہا ہے' اُس کا پاک ہونا بہ طریقِ اَولیٰ ضروری ہوگا۔'' (ضیاء القرآن۔ جلد پنجم' صفحہ ۴۱۶)

سورۃ ہٰذا کی آیت ششم (وَلَاتَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ) میں قرآن مجید نے اپنے ماننے والوں کو اعلیٰ اخلاقی ضابطہ عطا کیا۔ قانونی اور تجارتی فارمولہ یہ ہے کہ آپ کسی سے لینے کے لئے اُسے کچھ دیتے ہیں اور بالعموم آپ کو یہ امید ہوتی ہے کہ آپ کی دی ہوئی چیز سے زیادہ قیمتی چیز آپ کو دی جائے۔ لیکن اس عمل کا روحانی پہلو یہ ہے کہ آپ لینے والے سے واپس دیئے جانے کی کوئی امید نہ رکھیں۔ قرآن مجید مسلمانوں سے بندگانِ خدا کی دل و جان سے آمادہ بے لوث خدمت کرنے کی امید رکھتا ہے نہ کہ اس کے بدلے میں اُن سے کچھ وصول کرنے کی۔ لہٰذا کسی کو عطا کرنے میں لینے والے سے کوئی امید نہیں رکھنی چاہئے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ اپنے اعمال کو کثیر جاننا یا اُن کے عوض میں رجوعِ خلق یا مدح کی آس لگائے رکھنا شریعت میں قطعاً ناجائز ہے۔ آیت ہفتم میں فرمایا کہ راہِ حق میں صبر و رضا حق ہی کی خاطر کیجئے کہ وہ صابرین کے ساتھ ہے۔

(120) ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًاO وَجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًاO وَبَنِيْنَ شُهُوْدًاO وَمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًاO ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَO كَلَّا اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًاO سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًاO اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَO فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَO ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَO ثُمَّ نَظَرَO ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَO ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَO فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُO اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِO سَاُصْلِيْهِ سَقَرَO وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُO لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُO لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِO عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَO

(اَلْمُدَّثِّر: ۱۱-۳۰)

'' آپ مجھے اور اُس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا (انتقام لینے کے لئے) چھوڑ دیں۔ اور میں نے اُسے بہت وسیع مال مہیا کیا تھا۔ اور (اُس کے سامنے) حاضر رہنے والے بیٹے دیئے تھے اور میں نے اُسے (سامانِ عیش و عشرت میں) خوب وسعت دی تھی۔ پھر (بھی) وہ حرص

(۸) کفار نے اعتراض کیا تھا :

لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً (الفرقان : ۳۲)

"اس (رسول) پر قرآن ایک ہی بار (یکجا کر کے) کیوں نہیں اتارا گیا؟" (۳۲ : ۲۵)

رب تعالیٰ نے اس کا جواب دیا :

كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيْلًا O (الفرقان : ۳۲)

"یوں (تھوڑا تھوڑا کر کے اُسے تدریجاً اس لئے اتارا گیا ہے) تا کہ ہم اس سے آپ کے قلب (اطہر) کو قوت بخشیں اور (اسی وجہ سے) ہم نے اُسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھا ہے (تا کہ آپ کو ہمارے پیغام کے ذریعے بار بار سکونِ قلب ملتا رہے)۔" (۳۲ : ۲۵)

(۹) کفار نے ازراہِ تعجب کہا تھا :

اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا O (بنی اسراء یل : ۹۴)

"کیا اللہ نے (ایک) بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟" (۹۴ : ۱۷)

رب تعالیٰ نے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبانِ اقدس سے اس کا جواب دیا :

لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا O (بنی اسراء یل : ۹۵)

"اگر زمین میں (انسانوں کی بجائے) فرشتے چلتے پھرتے سکونت پذیر ہوتے تو یقیناً ہم اُن پر آسمان سے کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے۔" (۹۵ : ۱۷)

(۱۰) کفار نے یہ اعتراض بھی کیا تھا :

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ (الفرقان : ۷)

"اِس رسول کو کیا ہوا ہے، وہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔" (۲۵:۷)

جس کا جواب رب تعالیٰ نے سورۂ الفرقان کی آیت ۲۰ میں یوں دیا :-

وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ

"اور ہم نے آپ سے پہلے رسول نہیں بھیجے مگر (یہ کہ) وہ کھانا (بھی) یقیناً کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے (بھی) تھے۔" (۲۰ : ۲۵)

(۱۱) کفار نے نبوت کی الٰہی تقسیم پر اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا :

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْآنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ O (اَلزُّخْرُف : ۳۱)
"یہ قرآن (مکّہ اور طائف کی) دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی (یعنی کسی وڈیرے، سردار اور مالدار) پر کیوں نہیں اتارا گیا؟" (۳۱ : ۴۳)

ربّ ذوالجلال والاکرام نے اس کا جواب خود دیا اور فرمایا :
اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَةَ رَبِّكَ (اَلزُّخْرُف : ۳۲)
"کیا آپ کے رب کی رحمت (نبوّت) کو یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟" (۳۲ : ۴۳)

اور سورۂ الانعام کی آیت ۱۲۴ میں بھی کفار کے اعتراضِ بالا کا جواب موجود ہے :
اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (الانعام : ۱۲۴)
"اللہ خوب جانتا ہے کہ اُسے اپنی رسالت کا محل کسے بنانا ہے۔" (۱۲۴ : ۶)

(۱۱) کفار نکاح و ازدواج اور اس کے نتیجہ میں بچے پیدا ہونے کو بھی رسالت کی شان کے خلاف سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ کیسا نبی ہے جو شادیاں بھی کرتا ہے اور اولاد بھی پیدا کرتا ہے۔ رب تعالیٰ نے اس کا بھی جواب خود دیا ہے اور فرمایا ہے :
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً (الرَّعْد : ۳۸)
"اور (اے رسولِ محترم!) بے شک ہم نے آپ سے پہلے (بہت سے) پیغمبروں کو بھیجا اور ہم نے اُن کے لئے بیویاں (بھی) بنائیں اور اولاد (بھی)۔" (۳۸ : ۱۳)

(۱۲) کفار کے ایک اور اعتراض کو سورہ یونس کی آیت ۱۵ میں بیان فرمایا کہ "جو لوگ ہم سے ملاقات کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لے آیئے یا اُسے بدل دیجئے۔"

تو محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبانِ اقدس سے اس کا جواب اُنہیں یوں دلوایا :
قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ اِنِّيْ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ O (یونس : ۱۵)
"فرما دیجئے : مجھے حق نہیں کہ میں اُسے اپنی طرف سے بدل دوں، میں تو فقط جو میری طرف وحی کی جاتی ہے، (اُس کی) پیروی کرتا ہوں، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو بے شک میں بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔" (۱۵ : ۱۰)

نبی آخر الزماں ﷺ کو اپنے رب کے ہاں جو قدر و منزلت حاصل ہے اُس کا اندازہ ان ایمان افروز تین واقعات سے کیجئے کہ اُمّ المؤمنین سیّدہ عائشہ صدّیقہ پر اتہام لگنے سے صدیوں پہلے جناب یوسف علیہ السلام پر

بھی اسی قسم کا الزام لگایا گیا تھا لیکن اُن کی براءت اور صفائی میں رب تعالیٰ نہیں بولا بلکہ رب کی کسی مخلوق (بروایتِ بعض پنگوڑے میں کھیلتے بچے) نے اُن کی براءت کی۔ اس واقعہ کے صدیوں بعد عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ جنابہ سیدہ مریم سلام اللہ علیہا پر یہودیوں نے بدکاری کا بہتان لگایا تو اُن کی براءت میں بھی رب تعالیٰ نہیں بولا بلکہ دودھ پیتے بچے جناب عیسیٰ علیہ السلام سے اُن کی پاکدامنی کی گواہی دلوائی۔ لیکن جب فخرِ ہر جہاں رحمۃ للعالمین کی زوجہ مطہرہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر منافقین نے اپنی فطری خباثت کے ہاتھوں بہتان لگایا تو کسی مخلوق سے اُن کی معصومیت اور پاکدامنی کی گواہی نہیں دلوائی بلکہ اپنے محبوب کو بھی خاموش رہنے کا حکم دیا۔ اس لئے کہ اگر رسول اللہ ﷺ اس ضمن کچھ تبصرہ فرماتے تو وہ بن جاتی حدیث اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس پر قیل وقال ہوتی۔ بعض اُسے ضعیف کا درجہ دے کر اور بعض راویوں پر جرح وتنقیص کر کے آپ کی حدیث سے الجھ کر آپ کی زوجہ مطہرہ کی پاکدامنی سے انکار کے مرتکب ہوتے۔ لہٰذا حکمتِ الٰہی اس بات کی متقضی ہوئی کہ پیارے! انہی وجوہ کی بناء پر ہم نہیں چاہتے کہ آپ کچھ کہیں بلکہ اب ہم گزشتہ دونوں واقعات کے برعکس معاملے کو خود ہاتھ میں لے کر آپ کی زوجہ مطہرہ کے تقدس اور اُن کی پاکیزگیٔ کردار کا اعلان کر کے اسے قرآنِ حکیم کا حصہ بنا دیں گے۔ چنانچہ فرمایا:

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ O (النور: ۲۶)

”گندی عورتیں گندے مردوں ہی کے لائق اور گندے مرد گندی عورتوں ہی کے لائق ہوتے ہیں اور پاک دامن عورتیں پاکباز مردوں کے لائق اور پاکباز مرد پاکدامن عورتوں ہی کے لائق ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اس بات سے پاک ہیں جو یہ (منافق) بکتے پھرتے ہیں۔ ان کے لئے تو بخشش اور عزت کی روزی ہے۔“ (۲۴: ۲۶)

دشمنِ اسلام ولیم میور (William Muir) نے اس آیت پر اس طرح رائے زنی کی ہے:

”سبحان اللہ! یہ ایک غیر معقول اور ناروا بہتان ہے۔ سیّدہ عائشہ کے کردار کے متعلق تبصرہ کرنا خالی از ضرورت ہے۔ نکاح سے پہلے اور نکاح کے بعد اُن کی زندگی کا ہر لمحہ ہمیں اُن کی پاکیزگیٔ کردار کو باور کرانے کے لئے کافی ہے۔“ ("Life of Mahomet", pp. 303, 304)

(ج)

ربّ ذوالجلال والاکرام نے تمام انبیاء علیہم السلام کو جو کچھ اُن کے مانگنے پر عطا فرمایا، وہ اپنے مظہرِ اتم حضرت محمد رّسول اللہ ﷺ کو بن مانگے عطا فرما دیا۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) جدّ الانبیاء وخلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی:

وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَO (اَلشّعراء : ۸۴)
''اور میرے لئے بعد میں آنے والوں میں (بھی) ذکرِ خیر اور قبولیت جاری فرما۔'' (۲۶:۸۴)
اور اپنے محبوب علیہ السلام کی شان بن مانگے یوں بڑھائی:
وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَO (الانشراح : ۴)
''اور ہم نے آپ کا ذکر (خیر) بلند کر دیا۔'' (۴ : ۹۴)

جنابِ خلیل اللہ نے درخواست کی تھی:
وَاجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِیْمِO (اَلشّعراء : ۸۵)
''اور مجھے نعمتوں والی جنت کے وارثوں میں سے بنا دیجئے۔'' (۲۶:۸۵)
جبکہ تاجدارِ انبیاء ﷺ کو یہ مژدہ جانفزا سنایا گیا:
اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَO (اَلکوثر : ۱)
''بے شک ہم نے آپ کو خیرِ کثیر عطا فرما کر اُس کا مالک بنا دیا۔'' (۱ : ۱۰۸)

جناب ابراہیم علیہ السلام عرض کناں ہوئے تھے:
وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَO (اَلشّعراء : ۸۷)
''اور مجھے (اُس دن) رسوا نہ کرنا جس دن لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔'' (۲۶:۸۷)
اور اپنے نبی محتشم کا بن مانگے یوں اعزاز و اکرام فرمایا:
یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا مَعَهٗ (اَلتّحریم : ۸)
''اُس دن اللہ (اپنے) نبی اور اُن لوگوں کو رسوا نہیں کرے گا جو آپ کے ساتھ ایمان لائے۔'' (۶۶:۸)

سیّدنا ابراہیم خلیل اللہ☆ علیہ السلام نے رب تعالیٰ سے فریاد کی تھی:
وَاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَO (ابراھیم : ۳۵)
''اور مجھے اور میرے بچوں کو بتوں کی پرستش سے بچائے رکھنا۔'' (۳۵ : ۱۴)
جبکہ محبوب علیہ السلام کے اہلِ بیتِ کرام پر الٰہی نظرِ کرم کی برکھا یوں برسی:
اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْرًاO (الاحزاب:۳۳)

☆ مفسرین کرام نے فرمایا کہ اگرچہ حبیب اور خلیل دونوں کا معنیٰ ایک ہی (یعنی دوست) ہے لیکن اصطلاحاً خلیل وہ ہے جو اللہ کی رضا میں راضی رہے اور حبیب وہ ہے جس کی رضا میں اللہ راضی رہے۔ فرمایا: وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی ''الجامع لاحکام القرآن'' میں یہ حدیث منقول ہے کہ حضور علیہ السلام نے سورۃ الضحیٰ کی اس آیت کے نزول پر فرمایا کہ اگر میرا ایک امتی بھی دوزخ میں گیا تو میں راضی نہیں ہوں گا۔ (تبیان القرآن، جلد ۵، ص ۸۱۴)

''پس اللہ یہی چاہتا ہے کہ اے (رسول ﷺ کے) اہلِ بیت! تم سے ہر قسم کے گناہ کا میل دُور کر دے اور تمہیں (کامل) طہارت سے نواز کر بالکل پاک کر دے۔'' (۳۳ : ۳۳)

جنابِ موسیٰ کلیم اللہ نے فرعونِ مصر کے دربار میں جانے سے پہلے رب سے فریاد کی تھی:

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ O (طٰہٰ : ۲۵)

''اے میرے رب! میرے لئے میرا سینہ کشادہ فرما دے۔'' (۲۵ : ۲۰)

اور اپنے محبوب علیہ السلام کا سینہ بن مانگے کشادہ فرما دیا اور فرمایا:

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ O (الانشراح : ۱)

''کیا ہم نے آپ کے لئے آپ کا سینہ کشادہ نہیں فرما دیا؟'' (۱ : ۹۴)

کلیم اور حبیب کے درمیان فرق تو ذرا ملاحظہ ہو کہ جنابِ موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کو تورات شریف اُنہیں طور پر بلا کر عطا فرمائی جبکہ سلطانِ دوراں' پناہِ دین وایماں ﷺ پر بغیر کسی وعدۂ سابق کے اور بن مانگے نزولِ قرآن شروع ہوا جس کی بابت فرمایا گیا:

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْا اَنْ يُّلْقٰى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ (القَصَص : ۸٦)

یعنی پیارے رسول! جو کتاب آپ پر نازل ہو رہی ہے' یہ آپ کے ربِّ ذوالجلال کی رحمتِ خاصہ ہی کا تو حصّہ ہے۔ آپ اس کے امیدوار تو نہ تھے۔

(و)

ربِّ ذوالمنن والاکرام نے قرآن مجید میں ہر جگہ اپنے محبوب علیہ السلام کو اُن کے القاب سے خطاب فرمایا جبکہ باقی تمام انبیاء علیہم السلام کو اُن کے ناموں سے خطاب فرمایا۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) وَقُلْنَا يَا اٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ (البقرة : ۳۵)

(۲) يَا نُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ (هود : ۴٦)

(۳) يَا مُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ (الاعراف : ۱۴۴)

(۴) يَا زَكَرِيَّا اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ (مریم : ۷)

(۵) يَا يَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ (مریم : ۱۲)

(٦) يَا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ (صٓ : ۲٦)

(۷) يَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِىْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ (المائدة : ۱۱۰)

مگر ہمارے آقا ﷺ کو ربِّ جلیل نے ہر جگہ اُن کے القاب سے خطاب فرمایا۔ جیسے:

(۱) يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ (المائدۃ: ٦٧)

(۲) يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ O (الانفال: ۶۴)

(۳) يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ (المزمّل: ۱)

(۴) يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (اَلمدثّر: ۱)

تو کہیں یٰسٓ اور کہیں طٰہٰ کے القابِ جلیلہ سے خطاب فرمایا۔ شاعرِ مشرق نے اسی لئے تو فرمایا:

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر　　وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یاسیں وہی طٰہٰ

سابقہ اُمتیں بھی اپنے وقت کے انبیاءِ علیہم السلام کو اُن کے ناموں سے خطاب کرتی تھیں۔ جیسے:

(۱) قَالُوا يٰمُوسَى اجْعَل لَّنَآ إِلٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَة" (الاعراف: ۱۳۸)

(۲) قَالُوا يٰهُودُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ (ہود: ۵۳)

(۳) قَالُوا يٰصَالِحُ قَدْ كُنتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَا (ہود: ۶۲)

(۴) قَالُوا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ (ہود: ۹۱)

(۵) قَالُوا يٰنُوحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ إِن كُنتَ مِنَ الصّٰدِقِينَ O (ہود: ۳۲)

(۶) قَالُوا ءَ أَنتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِآلِهَتِنَا يٰإِبْرٰهِيمُ O (الانبیاء: ۶۲)

(۷) إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَن يُنَزِّلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (المائدۃ: ۱۱۲)

لیکن سالارِ رُسُل ﷺ کی اُمت کو اُن کے اسمِ گرامی (محمد) کے ساتھ خطاب کرنے سے منع فرما دیا گیا۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

(۱) لَا تَجْعَلُوا دُعَآءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُم بَعْضًا (اَلنُّور: ۶۳)

"تم رسول کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کو بلانے کی مثل قرار نہ دو۔" (۶۳ : ۲۴)

(۲) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ O (اَلحُجُرات: ۲)

"اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبیِ مکرّم (ﷺ) کی آواز سے بلند مت کیا کرو اور اُن کے ساتھ بلند آواز سے بات (بھی) نہ کیا کرو جیسے تم ایک دوسرے سے بلند آواز کے ساتھ کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے سارے اعمال ہی (ایمان سمیت) غارت ہو جائیں اور تمہیں (اُن کے برباد ہونے کا) شعور تک بھی نہ ہو۔ (۲ : ۴۹)

کتنی پُر لطف بات ہے کہ سورہ آلِ عمران کی ایک آیت میں ابراہیم علیہ السلام کے نام کا تو ذکر کیا لیکن اُسی آیت میں نبی آخرالزماں کا نام لینے کی بجائے مدعا کو ھٰذَا النَّبِیُّ کے الفاظ میں بیان کیا گیا:

اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰھِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْہُ وَھٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (آلِ عمران : ۶۸)

''بیشک سب لوگوں سے بڑھ کر ابراہیم علیہ السلام کے قریب (اور حقدار) تو وہی لوگ ہیں جنہوں نے اُن (کے دین) کی پیروی کی ہے اور وہ (یہی) نبی (ﷺ) اور اُن پر ایمان لانے والے ہیں''۔

نبی اکرم ﷺ کے معجزات پر نصاریٰ کا اعتراض: عیسائیوں کا کہنا ہے کہ قرآن میں کئی انبیاء کے معجزات کا ذکر تو ہے لیکن کسی بھی قرآنی آیت سے یہ ثابت نہیں کہ محمد (ﷺ) نے کوئی معجزہ دکھایا ہو۔ اُن کا اِصرار ہے کہ کچھ قرآنی آیات سے معجزہ کا عدمِ اظہار ثابت ہوتا ہے اور کچھ قرآنی آیات میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ بیان ہے کہ مجھے معجزات دکھانے کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ وہ اپنے نقطہ نظر کی تائید میں ذیل کی آیات کا حوالہ دیتے ہیں:

(۱) وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْہِ اٰیٰتٌ مِّنْ رَّبِّہٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَاللّٰہِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝

''اور کفار کہتے ہیں کہ اُن پر (یعنی نبی اکرم ﷺ پر) اُن کے رب کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اتاری گئیں۔ فرما دیجئے کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں اور میں تو محض صریح ڈرانے والا ہوں''۔ (۵۰ : ۲۹)

(۲) وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ اِلَّآ اَنْ کَذَّبَ بِھَا الْاَوَّلُوْنَ (بنی اسرائیل : ۵۹)

''اور ہمیں (اب بھی اُن کے مطالبہ پر) نشانیاں بھیجنے سے (کسی چیز نے) منع نہیں کیا سوائے اس کے کہ اِن ہی (نشانیوں) کو پہلے لوگوں نے جھٹلا دیا تھا''۔ (۵۹ : ۱۷)

''اُن کے اِس اعتراض کا تحقیقی جواب یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس قدر معجزے دکھائے کہ کسی نبی نے اپنی اُمت کو نہیں دکھائے۔ جن دو آیتوں سے معترض نے استدلال کیا ہے' اُن میں ایسی نشانیوں کے نہ ملنے کی وجہ مذکور ہے کہ قریش جو باوجود معجزاتِ کثیرہ دیکھنے کے اور نشانیاں طلب کرتے ہیں (مثلاً کوہِ صفا کا سونا ہو جانا' مکہ کے پہاڑوں کا دُور کیا جانا تاکہ زمین قابلِ زراعت ہو جائے اور نہروں کا جاری ہونا تاکہ باغات لگ جائیں)۔ ان نشانیوں کے دینے سے ہمیں اس امر نے روکا ہے کہ اس قسم کی نشانیاں ہم نے پہلی امتوں کو اُن کے طلب کرنے پر عطا کیں مگر وہ ایمان نہ لائے اور ہلاک ہوئے۔ ہماری عادت یوں ہی جاری ہے کہ ہم کسی قوم کے سوال پر ایسی آیات کو صرف عذاب سے ڈرانے کے لئے بطور پیش خیمہ بھیجا کرتے ہیں۔ اگر وہ قوم ان آیات پر ایمان نہ لائے تو پھر ہم ضرور اُن پر عذابِ استیصال نازل کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر کفار قریش کے سوال پر وہ نشانیاں ہمارے حبیب علیہ السلام کی دعا سے عطا کر دی جائیں تو یہ بھی اُنہی کی طرح جھٹلائیں گے اور عذابِ استیصال کے موجب ہوں گے۔ مگر ہم نے بہ مقتضائے حکمت اس اُمت کو عذابِ استیصال سے محفوظ رکھا ہے۔ لہٰذا ہم نے وہ نشانیاں اُنہیں عطا نہیں کیں۔ پھر فرمایا:

اَوَلَمْ یَکْفِھِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْھِمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَرَحْمَۃً وَّذِکْرٰی لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝ (العنکبوت : ۵۱)

"کیا اُن کے لئے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر (وہ) کتاب نازل فرمائی ہے جو اُن پر پڑھی جاتی ہے' بے شک اس (کتاب) میں اُن کے لئے رحمت اور نصیحت ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔" (۵۱ : ۲۹)

یعنی قرآنِ پاک ایسی نشانی ہے جو تمام نشانیوں سے بے نیاز کر دینے والی ہے۔ وہ زندہ و جاوید معجزہ ہے جو ہر مکان و زمان میں اُن پر پڑھا جاتا ہے اور پڑھا جاتا رہے گا۔ اس میں ایمان والوں کے لئے بڑی رحمت اور نصیحت ہے نہ کہ اُن کے لئے جو بغض و عناد رکھتے ہیں۔

اِس تقریر سے واضح ہو گیا کہ آیاتِ بالا سے معجزات کی نفی نہیں کی گئی بلکہ ان میں باوجود کثرتِ معجزات ان خاص نشانیوں کے نہ ملنے کی وجہ بیان ہوئی ہے جو کفار نے محض عناد سے طلب کیں۔ لہٰذا عیسائیوں کا یہ کہنا کہ قرآن میں کوئی ایسی آیت نظر نہیں آئی جس سے ثابت ہو کہ آنحضرت ﷺ نے معجزے دکھائے' صرف عناد اور مذاق و تمسخر پر مبنی ہے۔ بہ قولِ قرآن وہ اپنے منہ سے بڑا بول بولتے ہیں :

كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا O (الکہف : ۵)

"یہ کتنا بڑا بول ہے جو اُن کے منہ سے نکل رہا ہے۔ وہ (سراسر) جھوٹ کے سوا کچھ کہتے ہی نہیں۔" (۱۸:۵)

نوٹ : معجزاتِ نبوی کے لئے ملاحظہ ہوں سابقہ صفحات ۴۱۶۴ تا ۴۱۷۔

نبی اکرم ﷺ کے اپنی اُمّت پر حقوق: حسبِ ذیل ہیں :۔

(۱) آپ پر ایمان کے ساتھ ساتھ آپ کی کامل اتباع : نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت و نبوّت پر ایمان لانا بہر صورت لازم اور ناگزیر امر ہے۔ جو کچھ آپ اپنے خالق و مالک اللہ سے لائے ہیں اُس کی تصدیق و توثیق کرنا جزوِ ایمان ہے۔ کوئی شخص اُس وقت تک مسلمان ہو ہی نہیں سکتا جب تک ختم المرسلین ﷺ پر اُس کا کامل ایمان نہ ہو یہاں تک کہ صرف اللہ پر ایمان لانا اور رسول پر ایمان نہ لانا اُسے مسلمان نہیں بنا سکتا۔ قرآن مجید فرماتا ہے :

وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا O (الفتح : ۱۳)

''اور جو اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) پر ایمان نہ لائے تو (ایسے) کافروں کے لئے ہم نے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔'' (۱۳ : ۴۸)

آپ کی کامل اتباع کے بارے میں باری تعالیٰ کا حکم ہے :

(۱) قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (آلِ عمران: ۳۱)

''فرما دیجئے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو' تب اللہ تمہیں (اپنا) محبوب بنا لے گا

اور تمہارے لئے تمہارے گناہ بخش دے گا۔'' (۳ : ۳۱)

(۲) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًاO (النساء : ۶۵)

''پس (اے حبیب!) آپ کے رب کی قسم! یہ لوگ مسلمان نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ وہ اپنے درمیان واقع ہونے والے ہر اختلاف میں آپ کو حکم بنالیں پھر اُس فیصلہ سے جو آپ صادر فرمادیں اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور (آپ کے حکم کو) بخوشی پوری فرمانبرداری کے ساتھ قبول کرلیں۔'' ☆

(۳) اَلنَّبِيُّ أَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ (الاحزاب : ۶)

''یہ نبی مکرّم مومنوں کے ساتھ اُن کی جانوں سے زیادہ قریب اور حقدار ہیں۔'' (۳۳ : ۶)

(۴) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللهَ كَثِيرًاO (الاحزاب : ۲۱)

''فی الحقیقت تمہارے لئے رسول اللہ (ﷺ کی ذات میں) نہایت ہی حسین نمونہ (حیات) ہے ہر اُس شخص کے لئے جو اللہ (سے ملنے) کی اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہو اور اللہ کا ذکر بکثرت کرتا ہو۔'' (۳۳:۲۱)

(۵) مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (الْحَشْر : ۷)

''رسول تمہیں جو کچھ دے دیں، وہ لے لیا کرو اور جس سے وہ تمہیں روک دیں، رُک جایا کرو۔'' (۵۹ : ۷)

☆ بارگاہِ رسالت کی عدالت کی کوئی مثیل ونظیر نہیں ہے جن کے فیصلے کو رب تعالیٰ نے جزوِ ایمان قرار دیا اور اُس پر تنگی محسوس کرنے کو خارج از ایمان ہونے کا فیصلہ سنایا گیا۔ ذرا غور تو کیجئے کہ اس دنیا کی عدالت سے کسی مجرم کے خلاف صادر شدہ فیصلہ پر مجرم خوشی کا اظہار تو نہیں کرتا بلکہ فیصلہ کرنے والے کے خلاف وہ سراپا کینہ اور بغض ہوتا ہے۔ اس بغض رکھنے پر دنیا کا کوئی ضابطہِ اخلاق یا عدالت اُسے سزا دینے کے مجاز نہیں۔ لیکن سورۃ النساء کی محولہ بالا آیت ۶۵ کو پڑھیے اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اُس اعلیٰ وارفع مقام کا اندازہ لگایئے جو اُن کے خالق و مالک نے اُنہیں عطا فرمایا ہے۔ دربارِ نبوی سے صادر شدہ فیصلہ کو مجرم کا بہ صدقِ دل بخوشی تسلیم کر لینا ہی صحیح ایمان کا تقاضا ہے۔ ورنہ وہ ''توہینِ عدالت'' کا مرتکب ہونے کے ساتھ ساتھ ایمان کی دولت سے بھی محروم رہے گا اور غضبِ الٰہی کا بھی مورد بنے گا۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عدالتِ عالیہ کی بلا شرکتِ غیرے ''توہینِ عدالت'' کی اس خصوصیت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے یہ بات کہنا ضروری ہے کہ موجودہ رائج الوقت ''قانونِ توہینِ عدالت'' برطانوی قانون ہے اور اسلامی عدلیہ میں اس کا کوئی مقام نہیں۔ اس غیر اسلامی قانون نے تین برائیوں کو جنم دیا : (۱) عدل وانصاف مہنگا ہو گیا۔ (۲) ظلم وتشدد سستا ہو گیا اور (۳) قاضی اور مجسٹریٹ مغرور اور بد دماغ (Stiff-collard) ہو گئے۔ تکبر اور غرور کی مدہوشی میں رحمدلی اور خدمتِ خلق کے لئے اُن کے دروازے بند ہو گئے اور وہ اپنے آپ کو مافوق الفطرت ہستی سمجھنے لگے۔ طاقت و اختیار کے بل بوتے پر نفیس وجمیل ''آوازِ حق'' کا گلا دبا دیا گیا۔ ہوسکتا ہے کہ برطانوی راج نے اس قانون کو نبی علیہ السلام کی بلا شرکتِ غیرے خصوصیت اور استحقاق کو کم کرنے کے لئے درجِ بالا آیت ۶۵ سے اخذ کیا ہو۔

(۱۱) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے پُر جوش اور سرگرم محبت : نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے والہانہ اور پُر جوش محبت مؤمن کے ایمان کا جزوِ لاینفک ہے۔ وگرنہ اس سلسلہ میں قرآن کی تنبیہ یہ ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ آبَآءُكُمْ وَ اَبْنَآءُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (التوبة : ۲۴)

''فرما دیجئے: اگر تمہارے باپ (دادا) اور تمہارے بیٹے (بیٹیاں) اور تمہارے بھائی (بہنیں) اور تمہاری بیویاں اور تمہارے (دیگر) رشتہ دار اور تمہارے اموال جو تم نے کمائے اور تجارت و کاروبار جس کے نقصان سے تم ڈرتے رہتے ہو اور وہ مکانات جنہیں تم پسند کرتے ہو' تمہارے نزدیک اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) اور اُس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو پھر انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم (عذاب) لے آئے اور اللہ نافرمانوں کو ہدایت نہیں فرمایا کرتا۔'' (۹ : ۲۴)

آیت کا آخری حصّہ صاف بتا رہا ہے کہ جس شخص کو اللہ اور اُس کے رسول سے محبت نہیں ہے تو وہ حق وصداقت کا ساتھ نہیں دے رہا اور اس لئے اُس کا شمار فاسقین میں ہے۔

اور اس سلسلہ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بھی فرمان ہے :

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ

''تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک (کامل) ایمان والا نہیں ہوسکتا جب تک میں اُس کے نزدیک اُس کے والدین' اُس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔''

اس محبت کی عملی مثالیں اسلام کی کتبِ تاریخ میں محفوظ ہیں۔ ملاحظہ ہوں :

(۱) جنگِ اُحد میں ایک صحابیہ کا والد' بھائی اور خاوند شہید ہو گئے۔ جب اُسے اس کا علم ہوا تو اُسے اپنے اِن رشتہ داروں کی جدائی کا بالکل صدمہ نہیں ہوا بلکہ وہ بڑی بے صبری اور بے قراری سے پوچھتی پھرتی تھی کہ اللہ کے رسول ﷺ کیسے ہیں؟ اُسے رسول اللہ ﷺ کی خیریت کی اطلاع دی گئی۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بہ خیر و عافیت دیکھتے ہی وہ فوراً بول پڑی: كُلُّ مُصِيْبَةٍ بَعْدَكَ جَلَلٌ (پیارے رسول! جب آپ صحیح سلامت اور بخیر و عافیت ہیں تو ہر مصیبت بے قدر و قیمت ہے)۔

(۲) حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ کے وقتِ آخر میں اُن کی بیوی یہ کہتے ہوئے عزاداری کر رہی

تھیں وَاحَسرَتَا (ہائے افسوس!)۔ اس پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا : وَا طَرَبَاهٗ غَدًا نَلْقِی الْاَحِبَّةَ مُحَمَّدًا وَّحِزْبَه' (واہ! کتنی عظیم خوشی ہے! کل ہم اپنی محبوب ہستیوں محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ سے ملیں گے)۔

سچی محبت کی علامات : اگر کوئی شخص نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کا دعویدار تو ہے لیکن وہ حسب ذیل علامات سے خالی ہے تو وہ اپنے دعوائے محبت میں سچا نہیں ہے :

(۱) کامل خلوص اور لگن کے ساتھ سنتِ رسول کی اتباع کرنا' آپ کے احکامات پر عمل پیرا ہونا اور آپ کی منع کردہ چیزوں سے رک جانا۔

(۲) آپ پر اکثر و بیشتر درود و سلام پڑھنے کی صورت میں آپ کا ذکرِ خیر کرنا اور آپ کی احادیثِ مبارکہ وغیرہ کا مطالعہ کرنا۔

(۳) حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ کی طرح رسول اللہ ﷺ سے ملاقات اور آپ کی زیارت کا اشتیاق رکھنا۔

(۴) آپ ﷺ کی حد درجہ تعظیم اور اکرام کرنا جس کی چند مثالیں آئندہ صفحات میں دی گئی ہیں۔

(۵) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جن سے محبت فرمائی' انہیں اپنا محبوب رکھنا اور جن لوگوں نے آپ کے مرتبہ و مقام کو گھٹانے اور آپ کے کردار کو داغدار کرنے کی ناپاک کوشش کی' انہیں اپنا دشمن سمجھنا اور اُن کے خلاف بغض و کینہ رکھنا۔

کدّو شریف آپ ﷺ کی پسندیدہ سبزی تھی۔ ایک شخص نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی موجودگی میں کہا کہ مجھے کدّو پسند نہیں۔ امام موصوف نے اپنی تلوار نیام سے باہر نکالتے ہوئے اُس سے فرمایا: اپنے ایمان کی تجدید کرو ورنہ میں تجھے ضرور بالضرور قتل کر ڈالوں گا۔

(۶) جن لوگوں کے دلوں میں نبی علیہ الصلوٰۃ کے خلاف بغض و کینہ ہے' انہیں اپنا دشمن سمجھنا' نبی علیہ السلام کی سنتِ مبارکہ سے دُور رہنے والوں سے دُور رہنا اور اللہ اور اُس کے رسول کے باغیوں سے نفرت کرنا۔ اس سلسلہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ملاحظہ ہو :

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (الحشر : ۲۲)

''جو لوگ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں' آپ انہیں نہ پائیں گے کہ وہ ایسوں سے دوستی رکھیں جو اللہ اور اُس کے رسول کے مخالف ہیں خواہ وہ لوگ اُن کے باپ یا اُن کے بیٹے یا اُن کے کنبے والے ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ (اللہ نے) اُن کے دلوں میں ایمان ثبت کر دیا ہے اور انہیں اپنے فیض

سے قوت دی ہے۔'' (۲۲ : ۵۸)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اپنی جان' تن' من' دھن' اولاد اور عزت تک قربان دینے کا بے مثل نمونہ تھے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں :

(۱) حضرت عُبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے اپنے مشرک باپ کو جنگِ بدر میں قتل کر دیا۔
(۲) سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے ماموں عاص بن ہشام بن مغیرہ مخزومی کو جنگِ بدر میں قتل کیا۔
(۳) رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کے لڑکے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے آقائے نامدار ﷺ سے اپنے منافق باپ کو قتل کرنے کی اجازت چاہی لیکن آپ نے اس کی اجازت نہ دی۔
(۴) حضرت مُصعب بن عُمیر رضی اللہ عنہ نے اپنے کافر بھائی کو جنگِ اُحد میں قتل کیا۔
(۵) جنگِ بدر میں حضرت علی' حضرت حمزہ اور حضرت عُبَیدہ بن حارث رضی اللہ عنہم نے اپنے کافر رشتہ داروں عُتبہ بن ربیعہ' شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عُتبہ کو قتل کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔
(۶) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے صاحبِ قرآن ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ! جب میں آپ سے جدا ہو کر اپنے گھر میں جاتا ہوں تو آپ کی زیارت کے لئے وہاں بیتاب رہتا ہوں اور یہ فکر مجھے کھائے جاتی ہے کہ روزِ قیامت آپ تو جناتِ عدن کے اعلیٰ ترین مقامات میں ہوں گے جبکہ میں جنت کے کسی ادنیٰ طبقے میں اکیلا' تن تنہا ہوں گا تو میں کیسے آپ کی زیارت سے بہرہ ور ہو سکوں گا؟ اس پر اللہ عزّ وجلّ نے اپنے پیغمبر پر یہ خوشخبری دیتے ہوئے وحی نازل فرمائی کہ اپنے غلام ثوبان سے فرما دیجئے کہ ہم اُسے پیغمبر سے جدائی کا صدمہ نہیں دیں گے بلکہ اُسے پیغمبر کی ہمراہی سے سرفراز فرمائیں گے۔ آیت ملاحظہ ہو :

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًاO (اَلنِّسَآء : ۶۹)

''اور جو کوئی اللہ اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرے تو یہی لوگ (روزِ قیامت) اُن کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے (خاص) انعام فرمایا ہے جو کہ انبیاء' صدّیقین' شہداء اور نیکوکار ہیں' اور یہ بہت اچھے ساتھی ہیں۔'' (۴ : ۶۹)

(۷) قرآن مجید کے لئے مثالی محبت کا ہونا جس کا سچا آئینہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس میں نظر آتا ہے۔ قرآن مجید سے محبت کی علامات اس کی اکثر و بیشتر اور مسلسل تلاوت کرنا' اُس کے معانی و مفاہیم پر غور و خوض کرنا اور اس میں دئے گئے احکام کی تعمیل کرنا ہیں۔ حضرت سہل بن عبداللہ تستری فرماتے ہیں:

''اللہ تبارک و تعالیٰ سے محبت کی علامت قرآن سے محبت کرنا ہے' قرآن سے محبت کی علامت صاحبِ قرآن ﷺ سے محبت ہے' صاحبِ قرآن ﷺ سے محبت کی علامت آپ کی سنتِ مبارکہ سے محبت ہے'

آپ کی سنتِ مبارکہ سے محبت کی علامت اُخروی زندگی سے محبت ہے' اُخروی زندگی سے محبت کی علامت اس عارضی دنیا سے کراہت ہے اور اس دنیا سے محبت نہ کرنے کی علامت اس قدر (معمولی) مال و متاع ہے جو زندگی بسر کرنے کے لئے ناگزیر حد تک ضروری ہوتا ہے اور اتنا جتنا کہ ایک مسافر منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے اپنے ساتھ رکھتا ہے۔''

(۸) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت کے افراد پر مہربان اور رحمدل ہونا' اُن کی فلاح و بہبود اور بہتری کے لئے کام کرنا اور اُن کے لئے نرم و نازک احساسات رکھنا جیسا کہ نبی علیہ السلام کی عادتِ کریمانہ تھی۔

(۹) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حد درجہ تعظیم و توقیر کرنا جیسا کہ درج ذیل احادیث سے ثابت ہے:

(i) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: لَقَدْ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَالْحَلَّاقُ يَحْلِقُهُ' وَاَطَافَ بِهٖ اَصْحَابُهٗ' فَمَا يُرِيْدُوْنَ اَنْ تَقَعَ شَعْرَةٌ'' اِلَّا فِيْ يَدِ رَجُلٍ (صحیح مسلم: کتاب الفضائل ؛ مُسند احمد بن حنبل)

''حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک حجام کو رسول اللہ ﷺ کے بال کاٹتے دیکھا جبکہ آپ کے صحابہ کرام آپ کے اردگرد تھے۔ وہ اس بات کی کوشش میں تھے کہ کہیں رسول ﷺ کا کوئی بال نیچے نہ گرنے پائے بلکہ وہ اُن میں سے کسی کے ہاتھ لگ جائے۔''

(ii) عَنْ زَارِعٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ (وَكَانَ فِيْ وَفْدِ عَبْدِ الْقَيْسِ) قَالَ: لَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِيْنَةَ فَجَعَلْنَا نَتَبَادَرُ مِنْ رَوَاحِلِنَا فَنُقَبِّلُ يَدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَرِجْلَهٗ (سنن ابی داؤد: کتاب الادب؛ البخاری فی الادب المفرد؛ المعجم الکبیر للطبرانی ؛ شعب الایمان للبیہقی؛ مجمع الزوائد للهیثمی ؛ الحسینی فی البیان والتعریف ؛ المقری فی تقبیل الید)

''حضرت زارع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (جو عبدالقیس کے وفد میں آئے تھے)' وہ فرماتے ہیں: جب ہم مدینہ پہنچے تو ہم اپنی سواریوں سے جلدی جلدی اترے اور جا کر نبی علیہ السلام کے ہاتھ اور پاؤں چومنے لگے۔''

(iii) عَنْ مُوْسٰى بْنِ عُقْبَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فِيْ رِوَايَةٍ طَوِيْلَةٍ اَرْسَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اِلٰى قُرَيْشٍ --- فَدَعَوْا عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ لِيَطُوْفَ بِالْبَيْتِ فَاَبٰى اَنْ يَطُوْفَ وَقَالَ: كُنْتُ لَا اَطُوْفُ بِهٖ حَتّٰى يَطُوْفَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَرَجَعَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ (السنن الکبریٰ للبیہقی ؛ مختصر المختصر لابی المحاسن)

''حضرت موسیٰ بن عقبہ رضی اللہ عنہ سے ایک طول طویل روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو (بہ موقع صلح حدیبیہ) قریش کی طرف بھیجا۔ تو قریش نے جنابِ عثمان کو بیت اللہ شریف کے طواف کرنے کی دعوت دی لیکن آپ نے طواف کرنے سے انکار کر

دیا اور فرمایا: جب تک نبی اکرم ﷺ اس کا طواف نہ کریں گے، میں طواف نہیں کروں گا۔ تو آپ نبی اکرم ﷺ کی طرف لوٹ آئے۔''

(iv) عَنْ قَيْسِ بْنِ مَخْرَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: وُلِدْتُ أَنَا وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَامَ الْفِيْلِ وَسَأَلَ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قُبَاثَ ابْنَ أَشْيَمَ أَخَا بَنِيْ يَعْمُرَبْنِ لَيْثٍ: ءَ أَنْتَ أَكْبَرُ أَمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ؟ فَقَالَ: رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَكْبَرُ مِنِّيْ وَأَنَا أَقْدَمُ مِنْهُ فِي الْمِيْلَادِ (سنن ترمذی: کتاب المناقب عن رسول اللہ ﷺ؛ المستدرک للحاکم؛ المعجم الکبیر للطبرانی؛ الاحاد والمثانی للشیبانی)

''قیس بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں اور رسول اللہ ﷺ عام الفیل میں پیدا ہوئے۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے قُباث بن اَشیم جو بنو یعمر بن لیث کے بھائی تھے، سے پوچھا کہ تم میں اور رسول اللہ ﷺ میں (بہ لحاظ عمر) بڑا کون ہے؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ مجھ سے بڑے ہیں، میں تو (ویسے ہی) اُن سے پہلے پیدا ہو گیا تھا۔''

(v) عَنْ مُغِيْرَةَ بْنِ أَبِيْ رَزِيْنٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قِيْلَ لِلْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: أَيُّمَا أَكْبَرُ أَنْتَ أَمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ؟ فَقَالَ: هُوَ أَكْبَرُ مِنِّيْ وَأَنَا وُلِدْتُ قَبْلَهُ (المستدرک للحاکم؛ مصنف ابن ابی شیبہ؛ الاحاد والمثانی للشیبانی؛ مجمع الزوائد للهیثمی)

''مغیرہ بن ابی رزین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عباس بن عبدالمطلب سے کہا گیا کہ آپ اور رسول اللہ ﷺ میں (بہ لحاظ عمر) بڑا کون ہے؟ تو اُنہوں نے جواب دیا: رسول تو مجھ سے بڑے ہیں اگرچہ میں اُن سے پہلے پیدا ہوا تھا۔''

(vi) عَنِ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ وَمَرْوَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَا: إِنَّ عُرْوَةَ جَعَلَ يَرْمُقُ أَصْحَابَ النَّبِيِّ ﷺ بِعَيْنَيْهِ قَالَ: فَوَاللّٰهِ مَا تَنَخَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نُخَامَةً إِلَّا وَقَعَتْ فِيْ كَفِّ رَجُلٍ مِنْهُمْ فَدَلَكَ بِهَا وَجْهَهُ وَجِلْدَهُ وَإِذَا أَمَرَهُمْ اِبْتَدَرُوْا أَمْرَهُ وَإِذَا تَوَضَّأَ كَادُوْا يَقْتَتِلُوْنَ عَلٰى وَضُوْئِهِ وَإِذَا تَكَلَّمَ خَفَضُوْا أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَهُ وَمَا يُحِدُّوْنَ إِلَيْهِ النَّظَرَ تَعْظِيْمًا لَهُ فَرَجَعَ عُرْوَةُ إِلٰى أَصْحَابِهِ فَقَالَ: أَيْ قَوْمِ! وَاللّٰهِ لَقَدْ وَفَدْتُ عَلَى الْمُلُوْكِ وَفَدْتُ عَلٰى قَيْصَرَ وَكِسْرٰى وَالنَّجَاشِيِّ وَاللّٰهِ إِنْ رَأَيْتُ مَلِكًا قَطُّ يُعَظِّمُهُ أَصْحَابُهُ مَا يُعَظِّمُ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ ﷺ مُحَمَّدًا وَاللّٰهِ إِنْ تَنَخَّمَ نُخَامَةً إِلَّا وَقَعَتْ فِيْ كَفِّ رَجُلٍ فَدَلَكَ بِهَا وَجْهَهُ وَجِلْدَهُ وَإِذَا أَمَرَهُمْ اِبْتَدَرُوْا أَمْرَهُ وَإِذَا تَوَضَّأَ كَادُوْا يَقْتَتِلُوْنَ عَلٰى وَضُوْئِهِ وَإِذَا تَكَلَّمَ خَفَضُوْا أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَهُ وَمَا يُحِدُّوْنَ إِلَيْهِ النَّظَرَ تَعْظِيْمًا لَهُ (صحیح البخاری: کتاب الشروط؛ مسند احمد بن حنبل؛ صحیح ابن حبان؛ المعجم الکبیر للطبرانی؛ السنن الکبریٰ للبیھقی)

''مسور بن مخرمہ اور مروان رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں: عروہ (جب وہ کفارِ مکہ کی جانب سے حدیبیہ کے موقع پر نبی ﷺ کے پاس نمائندہ بن کر آیا تھا) صحابہ کرام میں اپنے رسول کی تعظیم و اِکرام کو بہ غور دیکھتا رہا کہ جب آپ ﷺ اپنا لعابِ دہن باہر پھینکتے ہیں تو کوئی صحابی اُسے اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے چہرے اور جسم سے مَل لیتا۔ جب پیغمبر ﷺ اُنہیں کسی چیز کا حکم دیتے تو اُس کی تعمیل فی الفور کرتے۔ جب آپ وضو کرتے تو لوگ آپ کے مستعمل پانی کو لینے کے لئے ٹوٹ پڑتے۔ جب آپ کلام فرماتے تو آپ کے صحابہ اپنی آوازوں کو دھیما کر لیتے اور آپ کے اعلیٰ وارفع مقام کے باعث آپ سے آنکھ ملا کر بات نہ کرتے۔ پھر عروہ اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹا اور کہا: لوگو! میں قیصرو کسریٰ اور نجاشی جیسے شہنشاہوں کے درباروں میں بطور وفد گیا ہوں لیکن بخدا! میں نے کسی ایسے بادشاہ کو نہیں دیکھا جس کے درباری اُس کی یوں تعظیم کرتے ہوں جس طرح محمد (ﷺ) کے اصحاب اُن کی تعظیم کرتے ہیں۔ بخدا! جب وہ لعابِ دہن باہر پھینکتے ہیں تو آپ کا کوئی صحابی اُسے اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے چہرے اور جسم پر مَل لیتا ہے۔ جب محمد (ﷺ) اُنہیں کسی چیز کا حکم دیتے ہیں تو اُس کی تعمیل فی الفور کرتے ہیں۔ جب آپ وضو کرتے ہیں تو لوگ آپ کے مستعمل پانی کو لینے کے لئے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ جب آپ کلام فرماتے ہیں تو آپ کے صحابہ اپنی آوازوں کو دھیما کر لیتے ہیں اور آپ کے اعلیٰ درجے کی تعظیم کی خاطر آپ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کرتے۔''

(vii) عَنِ ابْنِ شِمَاسَةَ الْمَهْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: حَضَرْنَا عَمْرَوبْنَ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَهُوَ فِيْ سِيَاقَةِ الْمَوْتِ فَبَكَى طَوِيْلاً وَقَالَ: وَمَا كَانَ اَحَدٌ اَحَبَّ اِلَيَّ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَلاَ اَجَلَّ فِيْ عَيْنَيَّ مِنْهُ اِجْلاَلاً لَهُ وَلَوْ سُئِلْتُ اَنْ اَصِفَهُ مَا اَطَقْتُ لِاَنِّيْ لَمْ اَكُنْ عَيْنَيَّ مِنْهُ (صحیح مسلم: کتاب الایمان؛ مسند ابوعوانہ؛ الطبقات الکبریٰ لابن سعد؛ فیض القدیر للمناوی؛ البیان والتعریف للحسینی)

''حضرت ابن شماسہ المہری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم عمرو بن العاص کے پاس اُن کی بیمار پرسی کے لئے گئے جبکہ وہ مرض الموت میں تھے۔ عمرو کافی دیر تک روتے رہے' پھر فرمایا: نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے زیادہ محبوب مجھے کوئی نہ تھا اور میرے نزدیک اُن سے بڑھ کر کوئی زیادہ قابلِ تعظیم نہ تھا اور آپ کی عظمت و جلال کے پیشِ نظر میں اُنہیں نظر بھر کر نہیں دیکھ سکا۔ اگر مجھے نبی علیہ السلام کی شکل و صورت بیان کرنے کو کہا جائے تو میں ایسا نہیں کرسکوں گا کیونکہ میں نے کبھی اُنہیں نظر بھر کر نہیں دیکھا۔''

(viii) امام مالک رضی اللہ عنہ نے اپنی تمام زندگی مدینہ منورہ میں گزاری۔ اس دوران ازراہِ تعظیم اُنہوں نے کبھی بھی مدینہ منورہ کی حدود میں ٹٹی پیشاب نہیں کیا اور اس ڈر سے کہ کہیں اُن کا جسم نبی علیہ السلام کے جسمِ اطہر سے اوپر نہ ہو جائے' وہاں کبھی کوئی سواری نہیں کی۔

(ix) حضرت احمد بن فضلویہ عظیم غازی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر تیرانداز بھی تھے۔ جب اُنہیں معلوم ہوا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اپنے دستِ مبارک میں کمان لی تھی تو اُس وقت سے احمد نے کبھی وضو بغیر اپنے ہاتھ میں کمان نہیں لی۔

(x) مدینہ منورہ کو ہجرت فرمانے پر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر کے نچلے حصے میں قیام پذیر رہے جبکہ ابوایوب اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ مکان کے بالائی حصے میں قیام پذیر تھے۔ ایک رات ابوایوب نیند سے جاگ کر کہنے لگے کہ ہم نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسمِ اطہر کے اوپر چلتے پھرتے ہیں تو وہ رات اُنہوں نے گھر کے کونے میں گزار دی۔ اگلی صبح اُنہوں نے نبی اکرم ﷺ کو صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اُنہوں نے فرمایا کہ میری سہولت اِسی نچلے حصے میں ہے۔ ابوایوب نے عرض کی کہ مجھ میں یہ تاب نہیں کہ میں اُس چھت پر رہوں جس کے نیچے اللہ کا رسول قیام پذیر ہو۔ اس لئے نبی علیہ السلام اوپر چلے گئے اور ابوایوب نیچے منتقل ہو گئے۔ ابوایوب پیغمبر علیہ السلام کو کھانا وہیں سے اوپر بھجواتے تھے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بچایا ہوا جو بھی کھانا ابوایوب کی طرف لوٹایا جاتا تو وہ خادم سے پوچھتے کہ کھانے کے کس حصے پر نبی علیہ السلام کی انگلیاں مَس ہوئی ہیں؟ اور پھر وہ اُسی حصہ سے کھانا کھانے لگتے جہاں نبی علیہ السلام کی انگلیاں لگی ہوتی تھیں۔ ایک دن کھانا تیار ہوا تو اس میں پیاز ڈالا گیا تھا۔ جب نبی علیہ السلام کا بقایا بچا ہوا کھانا واپس کیا گیا تو ابوایوب نے خادم سے پوچھا کہ کھانے کے کس حصے پر نبی علیہ السلام کی انگلیوں نے مَس کیا ہے؟ خادم نے جواب دیا کہ آج اللہ کے رسول ﷺ نے کھانا تناول نہیں فرمایا۔ اس پر ابوایوب پریشان اور خوفزدہ ہوگئے۔ آپ اوپر گئے اور نبی علیہ السلام سے دریافت کیا کہ کیا پیاز کا استعمال از روئے شریعت حرام ہے؟ نبی علیہ السلام نے جواب دیا: نہیں وہ حرام نہیں لیکن وہ مجھے پسند نہیں ہے۔ اس پر ابوایوب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے پیارے رسول! میں بھی اُس چیز کو پسند نہیں کرتا جو آپ کو پسند نہیں۔''

(xi) جس وقت سے جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور اپنا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دیا' اُس وقت سے اُنہوں نے اپنا دایاں ہاتھ ٹٹی پیشاب کی جگہ پر نہیں لگایا۔

(xii) حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے درِ دولت کو اپنے ناخنوں سے کھٹکھٹایا کرتے تھے۔

(xiii) حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تک نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کھانا تناول کرنا شروع نہ کرتے اور اپنا ہاتھ کھانے میں نہ ڈالتے' اُس وقت تک ہم بھی کھانا شروع نہ کرتے۔'' (''سیرتِ رسولِ عربی ﷺ'' از علامہ نور بخش توکلی)

(xiv) رسول اللہ ﷺ کی تعظیم و توقیر میں یہ امر بھی ہے کہ آپ کی آلِ اطہار و اولادِ پاک اور ازواجِ مطہرات کی تعظیم و توقیر اور اُن کے حقوق کی رعایت کی جائے۔ اسی طرح آپ کے صحابہ کرام کی تعظیم و توقیر کرنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعظیم و تکریم ہے۔ صحابہ کرام کے درمیان جو اختلاف و مشاجرات وقوع میں آئے' اُن کی تاویل نیک کرنی چاہئے۔ وہ مجتہد تھے اور جو کچھ اُنہوں نے کیا' ازروئے اجتہاد و خلوص کیا۔ وہ کسی طرح موردِ طعن نہیں ہیں۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

احادیثِ نبویہ کی حد درجہ تعظیم و توقیر: کوئی حدیثِ نبوی پڑھنے یا اُس کے سننے سے پہلے غسل کر لینا مستحب ہے اور اُس وقت اپنی آواز کو دھیما کر لینا بھی آدابِ نبوی میں شامل ہے۔ حدیثِ پاک کو کسی اونچی جگہ پر بیٹھ کر پڑھنا اور سنانا بہتر ہے۔ کسی حدیثِ پاک کی تعلیم دیتے وقت یا اُسے بیان کرتے وقت کسی کی تعظیم میں اٹھ کھڑے ہونا مکروہ (ناپسندیدہ) عمل ہے۔ اسلامی تاریخ سے مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) کسی حدیث کو بیان کرنے سے پہلے امام مالک رضی اللہ عنہ غسل فرماتے' خوشبو لگاتے اور اپنا لباس تبدیل فرماتے تھے۔ بیانِ حدیث کی خاطر آپ کے لئے تخت بچھایا جاتا۔ بیان کے دوران خوشبو کی خاطر عُود سلگائی جاتی اور یہ سب کچھ حدیثِ نبوی کی تعظیم و توقیر کی خاطر کیا جاتا تھا۔

(۲) عبداللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ جب میں امام مالک رضی اللہ عنہ کے ساتھ عقیق کو جا رہا تھا تو میں نے آپ سے ایک حدیث کے بارے میں پوچھا تو آپ نے مجھے ڈانٹا اور فرمایا: مجھے تم سے یہ امید نہ تھی کہ تم راہ چلتے ہوئے حدیثِ نبوی کی بات کرو گے۔

(۳) حضرت عبداللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں امام مالک کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپ ہم سے حدیثیں بیان کر رہے تھے۔ اثنائے قراءت میں آپ کو ایک بچھو نے سولہ مرتبہ ڈنک مارا جس سے آپ کا رنگ زرد ہو رہا تھا مگر آپ نے رسول اللہ ﷺ کی حدیث کو قطع نہیں کیا۔ جب آپ روایتِ حدیث سے فارغ ہوئے اور سامعین چلے گئے تو میں نے عرض کیا کہ میں نے آج آپ سے ایک عجیب بات دیکھی ہے۔ فرمایا: ہاں میں نے رسولِ اللہ ﷺ کی عظمت و احترام کے لئے صبر کیا۔ (مواھب اللدنیہ؛ شِفاء شریف بحوالہ ''سیرتِ رسولِ عربی ﷺ'' از علامہ نور بخش توکلی' صفحہ ۵۱۴)

(۴) حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کی نسبت مروی ہے کہ جب وہ حدیث سنتے تو اُن کو گریہ واضطراب لاحق ہو جاتا۔ (''سیرتِ رسولِ عربی ﷺ'' از علامہ نور بخش توکلی' صفحہ ۵۱۴)

آں حضرت ﷺ کے آثار شریفہ کی تعظیم: (۱) حضرت ابن سیرین تابعی نے حضرت عُبیدہ سے کہا کہ ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کے کچھ بال مبارک ہیں جو ہمیں حضرت اَنس یا اہلِ اَنس سے ملے ہیں۔ یہ سن کر

حضرت عبیدہ نے کہا کہ میرے پاس ان بالوں میں سے ایک بال کا ہونا میرے نزدیک دنیا و مافیہا سے محبوب تر ہے۔
حضرت اَنس فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ اپنے سر مبارک کے بال منڈواتے تو حضرت ابوطلحہ سب سے پہلے آپ کے موئے مبارک لیتے۔ (صحیح بخاری: کتاب الوضو'باب: الماء الذی یغسل بہ شعرالانسان)

(۲) حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ مزدلفہ سے منیٰ میں آئے اور جمرہ عقبہ میں کنکریاں پھینک کر اپنے مکان پر تشریف لائے۔ پھر آپ نے حجام کو بلایا اور سر مبارک کے دائیں جانب کے بال منڈوائے اور ابوطلحہ انصاری کو بلا کر عطا فرمائے۔ پھر آپ نے بائیں طرف کے بال منڈوا کر ابوطلحہ انصاری کو بلا کر عنایت کئے اور اُن سے فرمایا کہ یہ تمام بال لوگوں میں تقسیم کر دو۔ (مشکوٰۃ بحوالہ صحیحین: کتاب المناسک: باب الحق بحوالہ ''سیرتِ رسولِ عربی ﷺ'' صفحہ ۵۱۵)

(۳) حضرت خالد بن ولید قرشی مخزومی رضی اللہ عنہ کی ٹوپی جنگِ یرموک میں گم ہوگئی۔ اُنہوں نے اس کے لئے مڑ کر سخت حملہ کیا جس میں بہت سے مسلمان کام آئے۔ صحابہ کرام نے اُن پر اعتراض کیا تو اُنہوں نے جواب دیا کہ میں نے یہ حملہ ٹوپی کے لئے نہیں کیا بلکہ موئے مبارک کے لئے کیا تھا جو اس ٹوپی میں تھے کہ کہیں اُن کی برکت میرے پاس سے نکل کر کافروں کے ہاتھ میں نہ چلی جائے۔ (شفاء شریف از قاضی عیاض؛ الاصابہ فی تمییز الصحابہ: ترجمہ: خالد بن ولید بحوالہ ''سیرتِ رسول عربی ﷺ'' صفحہ ۵۱۶)۔

(۴) اُمّ المؤمنین سیّدہ اُمِّ سلمہ کے پاس رسول اللہ ﷺ کے کچھ سرخ رنگ کے بال تھے جو ایک ڈبیہ (بہ شکل جلجل) میں رکھے ہوئے تھے۔ لوگ ان بالوں سے نظرِ بد اور دیگر بیماریوں کا علاج کیا کرتے تھے۔ کبھی تو اُنہیں پانی کے پیالہ میں رکھتے' پھر پانی کو پی لیتے اور کبھی جلجل کو پانی کے مٹکے میں رکھ دیتے' پھر اُس پانی میں بیٹھ جاتے۔ یہ ماحصل حدیثِ بخاری ہے (صحیح بخاری: کتاب اللباس' باب: مایذکر فی الشیب)

(۵) حضرت ثابت بنّانی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے خادم حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے بالوں میں سے ایک بال ہے۔ جب میں وفات پا جاؤں تو اُسے میری زبان کے نیچے رکھ دینا۔ چنانچہ میں نے حسبِ وصیت اُن کی زبان کے نیچے رکھ دیا اور وہ اسی حالت میں دفن کئے گئے۔ (الاصابہ فی تمییز الصحابہ ترجمہ: انس بن مالک)

(۶) آنحضور ﷺ اُمِّ سلیم (والدہ انسؓ) کے گھر اُن کے بستر پر قیلولہ فرماتے جب وہ گھر پر نہ ہوتیں۔ ایک دن حسبِ معمول آپ اُن کے بستر پر آرام فرما تھے۔ ام سلیم نے آ کر دیکھا کہ حضور کا پسینہ بستر پر پڑا ہوا ہے تو انہوں نے ایک شیشی میں پسینہ مبارک کو اس میں نچوڑنے لگیں۔ حضور کی آنکھ کھلی تو پوچھا: کیا کر رہی ہو؟ عرض کیا کہ ہم اپنے بچوں کے لئے آپ کے پسینے کی برکت کے امیدوار ہیں۔ فرمایا: تم نے سچ کہا (صحیح مسلم: باب طیب عرقہ ﷺ والتبرک بہ)

محمد ﷺ کی پیشین گوئیاں بدھ مت' پارسی' ہندو اور عیسائی صحیفوں میں

سورہ آلِ عمران کی آیت ۸۱ (اور غالباً سورۃ الفتح کی آیت ۲۹) کی رُو سے تمام انبیاء علیہم السلام نے اپنے اپنے زمانہ حیات میں آخرالانبیاء ﷺ کی آمد کی خوشخبری لوگوں کو سنا دی تھی جو اپنے سابقہ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کی تصدیق و توثیق فرمائیں گے کیونکہ اُن تمام کا منبع خدائے واحد ہے اور اُن تمام کا پیغام ایک ہی ہے یعنی توحید۔

محمد ﷺ بدھ مت کے صحیفوں میں

انندا نے مبارک ہستی (گوتم بدھ) سے کہا: آپ کے جانے کے بعد ہمیں کون تعلیم دے گا؟
اور مبارک ہستی (گوتم بدھ) نے جواب دیا:

''میں زمین پر آنے والا پہلا بدھ نہیں ہوں اور نہ ہی میں آخری ہوں۔ اسی اثناء میں ایک اور بدھ دنیا میں نمودار ہوگا جو مقدس و سعادتمند ہوگا' رشد و ہدایت سے سرشار ہوگا' دانشمندی اُس کے اطوار سے ظاہر ہوگی' کائناتی علم اُس کے پاس ہوگا' لوگوں کا بے مثال و بے نظیر قائد ہوگا' فرشتوں اور فانی چیزوں کا قائد ہوگا۔ وہ تمہارے لئے اُن ابدی صداقتوں کی نقاب کشائی کرے گا جن کی میں نے تمہیں تعلیم دی ہے۔ وہ اپنے دین کی تبلیغ کرے گا جو اپنی ابتداء میں' اپنے نقطہ کمال میں اور اپنے مقصد میں عالی مرتبت ہے۔ وہ مذہبی زندگی کی دعوت دے گا جو تمام تر مکمل اور پاکیزہ ہے جیسا کہ میں تمہیں دعوت دیتا ہوں۔ اُس کے تلامذہ (صحابہ) کئی ہزاروں کی تعداد میں ہوں گے جبکہ میرے تلامذہ کئی سو ہیں۔''

انندا نے کہا: ہم اُسے کیسے معلوم کر پائیں گے؟
گوتم بدھ نے کہا: وہ ''میتریا (رحمت)'' کے نام سے جانا جائے گا۔'' ("The Gospel of Buddha"... Carus, pp. 217, 218)

''میتریا'' کے مترادف (ہم معنی) الفاظ: اُس ہستی کے نام جس کی آمد کے متعلق گوتم بدھ نے پیش گوئی کی تھی' مختلف زبانوں میں مختلف ہیں۔ پالی زبان میں آپ کا نام ''میتیا'' ہے' سنسکرت زبان میں ''میتریا'' برمی زبان میں ''ارمیدیا'' چینی زبان میں ''میتالیا'' یا ''ملی پوسا'' یا ''مل فو'' یا ''زوشین'' تبتی زبان میں ''دیامزپا'' یا ''مہیترجا'' اور جاپانی زبان میں ''مراکو'' ہے۔

انگریزی زبان میں ''میتریا'' کے مساوی الفاظ حسبِ ذیل ہیں:
(ا) محبت کا معلّم ("Chips from a German Workshop".. Max Muller, Vol.1, p.452)

(۲) آقائے محبت ("The Life & Teachings of Buddha".. A. Dharampal, p. 83)

(۳) وہ ہستی جس کا نام رحمدل ہے ("The Gospel of Buddha" .. Carus, p. 218)

(۴) کائناتی محبت یا سراپا رحمت ("Essence of Buddhism".. L. Narasu, pp. 101, 105)

(۵) محبت کرنے والا اور رحمدل ("Buddhism"... Monier Williams, p. 181)

(۶) رحمدل ("The Way of Buddha"... Herbert Baynes, p. 15)

(۷) سراپا رحمت ("Chinese Buddhism"... Joseph Edkins, p.240)

(۸) دوست کی خصوصیت کا حامل' دوست دار' رحمدل' مہربان' محبت بھرا' دوستانہ روابط رکھنے والا' ہمدرد اور دوسروں میں عملی دلچسپی لینے والا (Pali Dictionary... William Steade)

(۹) مشفق یا خاندانِ رحمت سے متعلق ("Gods of Northern Buddhism"... Getty, pp. 20, 68)

''میتر یا'' کے مساوی معنی عربی میں رحمت' شفقت' مہربانی' دوستداری' رحمدلی کے ہیں۔

بجر (Badger) کی انگلش عربی لغت میں اس کے معنی اچھائی اور حفاظتی نگہداشت کے ہیں۔

<u>محمد ﷺ سراپا ''میتر یا'' (رحمت) ہیں</u> : حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور شنکر اچاریہ دونوں کے پیروکاروں نے اپنے معلمین کو بدھ میتر یا کہا ہے۔ لیکن معلمین خود اپنی حیات میں اس نقطے پر خاموش رہے اور کچھ نہیں بولے جبکہ ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اس بات کا علی الاعلان دعویٰ کیا کہ اُنہیں ''میتر یا'' یعنی رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے (بحوالہ سورۃ الانبیاء : آیت ۱۰۷ ؛ سورۃ التوبۃ : آیت ۶۱)

''میدانِ اُحد میں محمد (ﷺ) کی زندگی ختم ہونے کو تھی کہ پتھروں کی بوچھاڑ نے آپ کو گھائل کر دیا تھا اور تیروں کے زخم کھا کھا کر آپ بے حال ہو گئے تھے (سیل کا ترجمہ قرآن : ذیلی نوٹ صفحہ ۶۰)۔ اس قابلِ رحم اور سخت زخمی ہونے کی حالت میں آپ کے کچھ ساتھیوں نے آپ سے کافر دشمنوں کے حق میں بد دعا کرنے کو کہا تو آپ نے اُن کے مطالبے کو مسترد کرتے ہوئے کافر دشمنوں کے لئے دعا کی اور فرمایا: میں بد دعا کرنے کے لئے نہیں بلکہ خدائے واحد کی طرف دعوت دینے والا اور میتر یا (رحمت) بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اے اللہ! میری قوم کو ہدایت عطا فرما (اور اُنہیں معاف فرما دے) کہ وہ میری حقیقت کو نہیں جانتے۔'' ("Muhammad in Parsi, Hindoo and Buddhist Scriptures".. A. H. Vidyarathi and U. Ali, p. 137).

''محمد (ﷺ) ہر وقت شفیق مزاج کے تھے اور آپ کی زندگی محبت کے برملا اظہار سے مرکّب تھی۔''

''زبان دل کی حالت کی صحیح ترین ترجمان ہوتی ہے۔۔۔انسان کے اندر کا چشمہ منہ سے نکالے ہوئے الفاظ میں چھلک جاتا ہے۔'' (Commentary on the New Testament .. W.W. How)

''یہ بات تعجب انگیز ہے کہ ایک تشدد پسند اور جنگجویانہ قوم میں پیدا ہونے کے باوجود محمد (ﷺ) کے نزدیک رحمدلی کی کتنی اہمیت تھی۔ آپ اللہ کا شکر ادا کرتے تھے جس نے لوگوں کے دلوں میں رحمدلی ڈالی ہے۔ تمام صفاتِ حسنہ میں سے آپ شفقت و رحمت کو بالخصوص عطیہ الٰہی سمجھتے تھے اور قرآن کی ہر سورۃ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتی ہے۔'' ("The Story of Mohammad"..Edith Holland)

محمد ﷺ پارسی صحیفوں میں

زرتشتی مذہب جسے عام طور پر پارسی مذہب کہا جاتا ہے' فارس (ایران) کا قبل از اسلام کا مذہب تھا۔ اس مذہب کو آتش پرستوں کا مذہب اور Magianism بھی کہا جاتا ہے۔ پارسیوں کے مذہبی صحیفے دو زبانوں میں پائے جاتے ہیں: زندی اور پہلوی۔ قدیم ایرانی صحیفوں میں دو قسمیں اہمیت کی حامل ہیں: اُن میں سے ایک ''دساتیر'' کے نام سے اور دوسری ''ویستا'' یا ''زنداویستا'' کے نام سے ہے۔

درج ذیل پیشین گوئی بہت پُر اثر اور توجہ طلب ہے اور ہر سنجیدہ ذہن قاری کے لئے فکر انگیز ہے۔ پیغمبر زرتشت نے کہا:

''شاید تم اس مکان میں جل جاؤ! شاید تم اس مکان میں ہمیشہ جلتے رہو! شاید تم اس مکان میں جھلتے رہو! شاید تم اِس مکان میں پھلتے پھولتے رہو! ایک طول طویل عرصے تک یہاں تک کہ دنیا کی طاقتور بحالی ہو جائے۔'' (Atash Nyaish : 9)

یہ پیشین گوئی بالکل واضح ہے اور اس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ جب دنیا کی بحالی وقوع پذیر ہوگی تو (آتش پرستوں کی عبادت گاہوں میں) آگ جلنا بند ہو جائے گی۔ زرتشت پیغمبر نے اپنے پیروکاروں سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ اللہ کے گھر میں آگ کو الٰہی روشنی کے اظہار کی علامت کے طور پر اُس رسولِ موعود کی آمد تک جلائے رکھیں گے جنہوں نے دنیا کی مکمل بحالی کرنی ہے اور دنیا نے دیکھ لیا ہے کہ جب نبی موعود دنیا میں تشریف لائے تو عبادت گاہوں میں آگ بجھ گئی۔

''وہ آگ جو زرتشتیوں نے جلائی تھی' دراصل عبادتِ الٰہی کی ایک علامت تھی۔ آگ جلانے میں مقصد یہ عہد تھا کہ وہ ہمیشہ الٰہی روشنی کی پیروی کریں گے اور اپنے مذہبی قوانین کے پابند رہیں گے۔''

"جس طرح زرتشت نے فارس میں روحانی آگ جلائی، بالکل اُسی طرح رسولِ خدا محمد (ﷺ) نے اُس آگ کے بجھنے پر آگ کو ملکِ عرب میں روشن کیا۔ قرآن مجید کی آیت کی رُو سے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: میری مثال اُس شخص (زرتشت) کی سی ہے جس نے آگ جلائی (صحیح بخاری)۔ دراصل اِن الفاظ میں زرتشت کی پیشین گوئی کا حوالہ ہے۔"
("Muhammad in Parsi, Hindoo and Buddhist Scriptures".. A. H. Vidyarathi and U. Ali, p. 17)

اس پیشین گوئی کا خلاصہ یہ ہے کہ جب زرتشتی لوگ اپنے مذہب کو چھوڑ دیں گے اور آوارہ منش ہو جائیں گے تو ملکِ عرب میں ایک آدمی اٹھے گا جس کے پیروکار فارس کو فتح کر کے سرکش اور مغرور ایرانیوں کو غلام بنالیں گے۔ اپنی عبادت گاہوں میں آگ کی پرستش کرنے کی بجائے وہ نماز میں اپنے رخ ابراہیم علیہ السلام کے بنائے ہوئے کعبہ کی طرف کریں گے جسے تمام بتوں سے پاک وصاف کر دیا جائے گا۔ پیغمبر کے یہ ساتھی دنیا کے لئے رحمت ثابت ہوں گے۔ وہ فارس، مدائن، طوس، بلخ، زرتشتیوں کے مقدس مقامات اور قرب وجوار کے علاقوں کے مالک بن جائیں گے۔ اُن کا پیغمبر فصیح اللسان اور بلیغ البیان ہوگا جو معجزانہ باتیں بتائے گا۔" (ایضاً، صفحات ۲۲، ۲۳)

نبی اکرم ﷺ ہندو صحیفوں میں

ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں بھی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تشریف آوری سے متعلق پیشین گوئیاں ملتی ہیں۔ یہ کتابیں تین طرح کی ہیں: وید، اُپنشد اور پُران۔ اُن کی مقدس کتاب "برہمن گرنتھ" ویدوں پر تبصرہ ہے، اس کے باوجود اُسے منزّل کتب میں شمار کیا جاتا ہے۔ رِگ وید، یجر وید اور سام وید کو قدیم ترین کتب مانا جاتا ہے۔ اُن میں رگ وید اپنے قدیم ہونے میں پہلے نمبر پر ہے جسے تین لمبے اور مختلف زمانوں میں مدوّن کیا گیا۔ ("Rigvedic India"... Abinash Chandra Datta)۔ اُن کے مقامِ نزول اور وقتِ نزول سے قطع نظر وید ہندوؤں کی انتہائی مستند کتب ہیں اور ہندو دھرم کی حقیقی بنیاد ہیں۔

ویدوں کے بعد اپنی فوقیت اور مستند ہونے کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر اُپنشد ہیں۔ تاہم کچھ پنڈت اُپنشدوں کو ویدوں پر فوقیت دیتے ہیں (Lectures of Raja Mohan Roy)۔ ہندوؤں کو ان فلسفیانہ نسخوں پر بڑا فخر ہے۔

اُپنشدوں کے بعد دیگر مستند کتابیں جن کا وسیع طور پر مطالعہ کیا جاتا ہے، پُران ہیں جو بہ آسانی قابلِ فہم ہیں اور ہر جگہ دستیاب ہیں جبکہ ویدوں کا سمجھنا مشکل ہے اور وہ شاذ و نادر ہی پائے جاتے ہیں۔ جمہور ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ وید پُرانوں کی صداقت کی توثیق کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پُران زیادہ مستند اور زیادہ قدیم ہیں۔ ایک لحاظ سے پُرانوں کے تقدّس اور تعظیم کو ہندوؤں کی تمام مستند کتب میں تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن اِن تمام حقائق کے باوجود آج کچھ پنڈتوں نے اِن مجموعوں کو محض اس وجہ سے مسترد کر دیا ہے کہ وہ اُن میں محمد (ﷺ) کی صداقت کی واضح نشانیاں اور آپ سے متعلق متعدد پیشین گوئیاں پاتے ہیں۔ ("Mohammad

in Parsi, Hindoo and Buddhist Scriptures".. A. H. Vidyarathi & U. Ali, p. 33)

بعض اوقات اس بات کی وکالت کی جاتی ہے کہ موجودہ پُران اصل مجموعہ نہیں ہیں جو دراصل گم ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ اِصرار درست نہیں۔ یہ بات ناممکن اور حق وصداقت سے بہت دُور ہے کہ تمام پُران کو جن کا مطالعہ اس قدر وسیع طور پر اور بڑے انہماک سے کیا جاتا ہے' طاقِ نسیاں کی نذر کر دیا گیا ہو اور عالمی سطح پر اُن کا نام ونشان مٹا دیا گیا ہو اور وید جنہیں چند لوگ ہی پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں' تا ہنوز سالم اور بے خلل رہے ہوں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اِن پیش گوئیوں کا پُرانوں میں بعد میں اضافہ کیا گیا لیکن یہ بات بھی بے بنیاد ہے۔ ایسی معروف ومشہور کتاب میں جس کی اتنی وسیع گردش ہو اور جسے عبادات میں مقررہ اوقات میں پڑھا جاتا ہو' ممکنہ حد تک دخل اندازی نہیں ہو سکتی۔ اپنی کتابوں میں عرب کے پیغمبر کی واضح پیشین گوئیوں کو دیکھتے ہوئے پنڈتوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ پُرانوں میں تحریف اور اِلحاق ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ خیال احمقانہ ہے کہ تمام پنڈت اور ہندوؤں کے علماء وفضلاء کسی جگہ پر اکٹھے ہوئے اور اِن پیشین گوئیوں کا پُرانوں میں اضافہ کر دیا۔ برہمنوں کے کثیر تعداد میں فرقے ہیں اور ہر فرقہ دوسرے فرقہ کے مخالف ہے' لہٰذا اُن کے لئے ایسی تبدیلی پر متفق ہونا ناممکن سی بات تھی۔ پُران کی ایک نقل تقریباً ہر برہمن کے گھر میں موجود ہوتی ہے اور یہ بات واقعی عجیب ہے کہ دنیا نے اب تک اِن پیشگوئیوں کے بغیر کوئی ایسا مجموعہ نہ دیکھا ہو۔ سب سے زیادہ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ دخل اندازی پیغمبر اور ہندوؤں کے اپنے مذہب کے خلاف کی گئی ہے۔ ان پیشین گوئیوں کے مقابل کسی چیز کا اضافہ کرنا یا اُن کے متن کو تبدیل کرنا تو ممکن تھا لیکن یہ خیال بالکل لغو اور بیہودہ ہے کہ ہندو پنڈتوں نے اپنے ہی مذہب اور عقیدے کے خلاف کسی چیز کا اضافہ کیا ہو۔ لہٰذا تمام تعصب اور ہٹ دھرمی سے قطع نظر ہندو سماج سے درخواست ہے کہ وہ اپنے آسمانی صحیفوں میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان وشوکت کا بہ غور مطالعہ کریں اور اس طرح آپ ﷺ پر اپنے ایمان لانے کا اعلان کریں۔'' (ایضاً' صفحات ۳۴' ۳۵)

محمد ﷺ کے ایک قصیدہ میں مہارِشی یا ساجی نے درجِ ذیل نِکات شمار کیے ہیں :

(۱) پیغمبر (ﷺ) کا واضح طور پر نام محمد ہی ہے۔ (۲) روایت کی رُو سے وہ ملکِ عرب میں پیدا ہوں گے۔ پیشینگوئی میں استعمال شدہ لفظ ''مارو ستھال'' کا سنسکرت زبان میں معنی ریتلی زمین یا صحرا کا ہے۔ (۳) پیغمبر (علیہ السلام) کے ساتھیوں کا ذکر خصوصی طور پر ہوا ہے۔ کسی بھی سابقہ پیغمبر کے اُن پر جان چھڑکنے والے اتنی کثیر تعداد میں ساتھی نہیں ہوئے۔ (۴) فرشتہ سیرت ہونے کے باعث وہ (پیغمبر) بے خطا اور معصوم ہوگا۔ (۵) ہندوستان کا راجہ اُس کے لئے اپنی پُر خلوص تعظیم وتکریم کا اظہار کرے گا۔ (۶) اُس پیغمبر (ﷺ) کو دشمنوں کے خلاف تحفظ حاصل ہوگا۔ (۷) وہ بدی کو ختم کرے گا' بت پرستی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا اور ہر قسم کے گناہ کا قلع قمع کر دے گا۔ (۸) وہ قادرِ مطلق اللہ کا مظہرِ اتم ہوگا۔ (۹) مہارِشی (قصیدہ گو) اُن کے چرنوں (قدموں) میں

رہنے کا دعویدار ہے۔(۱۰) اُس پیغمبر کو فخرِ نوعِ انسانی سمجھا جاتا ہے۔'' (Parbatis Nath)

'' یہ پیشینگوئی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے اور اس کا محمد (ﷺ) پر اطلاق ہونے میں ذرّہ بھر شک کی گنجائش نہیں۔ تاہم کچھ لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ اس پیشینگوئی میں جس راجہ کا ذکر ہوا ہے' اُس کا نام بھوج ہے جس کا زمانہ گیارھویں صدی عیسوی کا ہے۔ اس طرح راجہ بھوج محمد (ﷺ) کی آمد سے پانچ صدیاں بعد دنیا میں آیا۔ لیکن بھوج کے نام سے کوئی ایک راجہ نہیں ہوا جس طرح فراعنۂ مصر فرعون کے لقب سے مشہور تھے اور رومی بادشاہوں کو قیصر کہا جاتا تھا' اُسی طرح ہندوستان کے راجاؤں کو بھوج کا لقب دیا جاتا تھا۔ مذکور راجہ بھوج سے پہلے کئی راجاؤں کا یہی شاہی لقب بھوج تھا۔ سنسکرت کے ایک مشہور و ماہر پنّی نامی نے بھی جس کا زمانہ اسلام سے بہت پہلے کا ہے' اُس پیغمبر کے نام '' محمد '' کا واضح طور پر حوالہ دیا ہے۔(Adhya, 1 : 1075) المختصر یہ کہ مذکورہ پیشین گوئی میں انتہائی واضح اور صاف طور اُس پیغمبر کا نام '' محمد '' آیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نام کا اطلاق صرف پیغمبرِ اسلام پر ہی ہوتا ہے۔''

'' درجِ بالا حقائق کی روشنی میں کیا ہمیں ہندو برادری سے جو اپنے صحیفوں کو آسمانی سمجھتے ہیں اور اپنے مذہبی قائدین کو دیوتاؤں کا درجہ دیتے ہیں' یہ اپیل نہیں کرنی چاہئے کہ مہارشی یا ساجی نے جو کچھ پیغمبر (ﷺ) کے بارے میں کہا ہے' اُس پر غور کریں اور اُس پیغمبر پر یقین رکھتے ہوئے برہما کے احکامات کی تابعداری کریں اور اس طرح مہارشی یا ساجی کی انتہائی دلی آرزو کی تکمیل کریں۔'' ("Muhammad in Parsi, Hindoo and Buddhist Scriptures".. A. H. Vidyarathi and U. Ali, pp. 35-41)

نبی اکرم ﷺ کا ذکر تورات و انجیل میں

نبی آخرالزماں ﷺ کی رسالت کی صداقت میں قرآن مجید یہ دلیل پیش کرتا ہے:

(۱) اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰۃِ وَ الْاِنْجِیْلِ (الاعراف : ۱۵۷)

'' (یہ وہ لوگ ہیں) جو اس رسول (ﷺ) کی پیروی کرتے ہیں جو اُمّی (لقب) نبی ہیں جن (کے اوصاف و کمالات) کو وہ لوگ اپنے پاس تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔'' (۷ : ۱۵۷)

(۲) وَاِنَّہٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ O (الشعراء : ۱۹۶)

'' اور بے شک یہ پہلی امتوں کے صحیفوں میں (بھی مذکور) ہے۔'' (۲۶ : ۱۹۶)

یہ آیات کتبِ سماویہ کی اُن پیش گوئیوں اور خوش خبریوں کی طرف اشارہ کر رہی ہیں جن میں نبی آخرالزماں ﷺ کی آمد کا ذکر ہے' اور آج کی تحریف شدہ تورات میں بھی آپ ﷺ کا ذکرِ خیر موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

''خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اُس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت اُن کے لئے تھی۔'' (استثناء ۳۳:۲)

سینا (حضرت موسیٰ علیہ السلام) اور شعیر (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی نبوتوں کے بعد فاران سے جو نورِ نبوت جلوہ گر ہوا وہ بھی ہمارے ہی نبی اکرم کا تھا۔ فاران مکہ معظمہ ہی کی ایک پہاڑی کا نام ہے اور فتح مکہ کے وقت دس ہزار قدسی صحابہ آپ کے جلو میں تھے۔ آتشی شریعت بھی ہمارے رسولِ معظم کی تھی جس کا اشارہ سورۃ الفتح کی آیت ۲۹ کے الفاظ اشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّار (وہ کفار پر سخت ہیں) میں ہے۔

تورات و انجیل سے اخذ شدہ درج ذیل اقتباسات کی تاویلات مسلم علماء نے نبی آخر الزماں ﷺ کی آمد مبارک سے کی ہیں:

''میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار (یا وکیل یا شفیع) بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے گا۔'' (یوحنا ۱۴:۱۶)

''خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی طرف کان دھریو۔'' (استثناء : ۱۸ : ۱۵)

''اور خداوند نے مجھے کہا کہ انہوں نے جو کچھ کیا سو اچھا کیا۔ میں اُن کے لئے اُن کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا۔'' (استثناء ۱۸ :۱۸)

ان دونوں آیتوں میں بنی اسرائیل کے ''بھائیوں'' سے مراد ظاہر ہے کہ بنی اسمٰعیل ہی ہو سکتے ہیں۔

''میرا بندہ' بڑا برگزیدہ جس سے میرا جی راضی ہے۔ میں نے اپنی روح اُس پر رکھی۔ وہ قوموں کے درمیان عدالت کرے گا۔۔۔ اُس کا زوال نہ ہوگا اور نہ مسلا جائے گا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کر دے گا اور بحری ممالک اُس کی شریعت کی راہ تکیں۔'' (یسعیاہ ۴۲ :۱۔۴)

یہ ''میرا بندہ'' (عَبْدُہٗ و رَسُولُہٗ) اور ''میرا برگزیدہ'' (مصطفیٰ) جس کا ''زوال نہ ہوگا'' (خاتم النبیّین) صاف ہمارے ہی رسولِ اکرم ﷺ ہیں جن کی شریعت بحری ممالک تک پھیلی ہوئی ہے۔

قرآن مجید کا بیان ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد کی خبر احمد کے نام سے دی تھی:
وَاِذْقَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَابَیْنَ یَدَیَّ مِنَ

التَّوْرٰةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ اَحْمَدُ (اَلصَّفّ : ٦)
''اور (وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے) جب عیسیٰ بن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل! میں تمہارے پاس اللہ کا پیغمبر آیا ہوں، تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں جو مجھ سے پیشتر سے ہے اور ایک رسول (معظم) کی بشارت دینے والا ہوں جو میرے بعد آنے والا ہے جن کا نام احمد ہوگا۔'' (٦١ : ٦)

اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ اس مختصر سے فقرے کے اندر ہی بہت سی گمراہیوں کی تردید آ گئی۔ اور اس کا اثبات ہوا کہ (۱) عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت بنی اسرائیل کی جانب تھی، کُل دنیا کی جانب نہ تھی۔ (موجودہ مسیحیت کی تردید)۔
(۲) اس کا اثبات کہ آپ حق تعالیٰ کی طرف سے رسولِ برحق تھے۔ نعوذ باللہ کوئی مفتری نہ تھے (یہود کی تردید)۔
(۳) آپ حق تعالیٰ کے ایک مقرب ترین بندہ تھے۔ خود الوہیت کے مدعی کسی معنی میں بھی نہ تھے (مسیحیت کی تردید)۔

''انجیل برنابا کے نام سے آج جو انجیل حواری برنابا کی جانب منسوب، دنیا میں موجود ہے، اس میں تو یہ پیش گوئیاں بہت صاف اور کھلے لفظوں میں ہیں لیکن خود مسیحیوں کو بھی جو چار انجیلیں مسلم ہیں، ان میں سے بھی ایک میں یہ عبارتیں آج تک مل رہی ہیں۔۔۔۔ مسیحی جس یونانی لفظ کے ترجمہ سے خود مطمئن نہیں ہیں اور اس کا ترجمہ کبھی ''تسلی دہندہ'' سے کرتے ہیں، کبھی ''مددگار'' سے اور کبھی ''وکیل''، کبھی ''شفیع'' نے، وہ اصل میں PERICLUTOS ہے جو صحیح ترجمہ لفظ ''احمد'' ہی (بمعنی محمود و ستودہ) کا ہے۔'' (تفسیر ماجدی اردو، ص ۱۱۰۴، نوٹ: ۸)

بات کی مزید طوالت سے بچتے ہوئے مؤلف امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ (م ۶۹۴ ھ) کے قصیدہ بردہ شریف کے چند اشعار کا حوالہ دینے میں اپنا اعزاز سمجھتا ہے۔ جس میں امام موصوف نے نبی علیہ السلام کی تعریف و توصیف کی حد بندی نہ کرتے ہوئے (سوائے اس کے کہ نبی علیہ السلام کو اللہ کا شریک نہ بنایا جائے) آپ ﷺ کو یوں گلہائے عقیدت پیش کیے ہیں:

دَعْ مَا ادَّعَتْهُ النَّصَارٰی فِیْ نَبِیِّهِمِ ۔۔۔ وَاحْكُمْ بِمَا شِئْتَ مَدْحًا فِیْهِ وَاحْتَكِمِ
فَانْسُبْ اِلٰی ذَاتِهٖ مَا شِئْتَ مِنْ شَرَفٍ ۔۔۔ وَانْسُبْ اِلٰی قَدْرِهٖ مَا شِئْتَ مِنْ عِظَمِ
فَاِنَّ فَضْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ لَیْسَ لَهٗ ۔۔۔ حَدٌّ فَیُعْرِبَ عَنْهُ نَاطِقٌ بِفَمِ

''تم نبی علیہ السلام کے متعلق وہ دعویٰ (الوہیت) نہ کرو جو عیسائی اپنے پیغمبر (عیسیٰ علیہ السلام) کے بارے میں کرتے ہیں۔ آپ کی شانِ اقدس کی تعریف میں جو تمہارا جی چاہے کہہ دو بلکہ پورے یقین کے ساتھ دعویٰ کرو اور اس عقیدے پر خوب مستحکم اور استوار رہو۔''
''آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس سے جس شرف کو اور آپ کے مرتبے کو جس بزرگی تم چاہو نسبت دے سکتے ہو (کیونکہ الوہیت کو چھوڑ کر تمام شرف اور بزرگیاں آپ ﷺ کے مقام بلند سے فروتر ہیں)۔''
''حقیقت تو یہ ہے کہ حضور ختمی مرتبت ﷺ کے فضائل کی کوئی حد ہی نہیں ہے کہ کوئی بولنے والا اپنی زبانِ فصاحت سے بیان کر سکے۔''

(۱۷۲) محکمات و متشابہات (Mohkamaat & Mota'shabihaat)

مُلا جیون متشابہ اور محکم کی تعریف میں لکھتے ہیں :
''متشابہ اُس چیز کو کہتے ہیں جس کی معرفت کی امید نہ ہو اور اُس کے ظاہر ہونے کی اصلاً امید نہ ہو۔ وہ غایتِ خفا میں ہوتا ہے اور محکم کی ضد ہے جو غایتِ ظہور میں ہوتا ہے۔ متشابہ کا حکم یہ ہے کہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اس لفظ سے جو مراد ہے وہ حق ہے اگر چہ ہمیں قیامت سے پہلے یہ پتہ نہیں چلے گا کہ متشابہ کے لفظ سے کیا مراد ہے۔ قیامت کے بعد اس کی مراد انشاء اللہ ہر شخص پر منکشف ہو جائے گی الخ۔ یہ حکم امت کے حق میں ہے اور نبی ﷺ کے حق میں یہ اعتقاد ہے کہ آپ کو لفظ متشابہ کی مراد قطعاً معلوم ہے ورنہ آپ سے اس کے ساتھ خطاب کا فائدہ باطل ہو جائے گا اور یہ ایسے ہوگا جیسے لفظ مہمل کے ساتھ خطاب کیا جائے یا کسی عربی کے ساتھ حبشی میں گفتگو کی جائے۔'' (التفسیرات الاحمدیہ۔ مُلا جیون' ص۹۳' مطبوعہ سعید اینڈ کمپنی' کراچی)

محمد بن جعفر بن زبیر نے کہا: محکم وہ آیات ہیں جن کا صرف ایک معنیٰ اور ایک محمل ہے اور اس میں کسی اور تاویل کی گنجائش نہیں ہے اور متشابہ وہ آیات ہیں جن میں کئی تاویلات کی گنجائش ہے۔

مُحکمات اور متشابہات کی بابت سورہ آلِ عمران کی آیت ہفتم میں یہ بتایا گیا ہے :
هُوَالَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ ''مُّحْكَمٰتٌ'' هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ''فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ ''فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَاْوِیْلِهٖ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ'' مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝
''وہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی جس میں سے کچھ آیتیں محکم ہیں' وہی (احکام) کتاب کی بنیاد ہیں اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں' سو جن کے دلوں میں کجی ہے' اُس میں سے صرف متشابہات کی پیروی کرتے ہیں فتنہ پروری کی خواہش کے زیر اثر اور اصل مراد کی بجائے من پسند معنیٰ مراد لینے کی غرض سے اور اُس کی اصل مراد کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور علم میں کامل پختگی رکھنے والے کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے' ساری (کتاب) ہمارے رب کی طرف سے اتری ہے اور نصیحت صرف اہلِ دانش ہی کو نصیب ہوتی ہے۔'' (۳ : ۷)

<u>آیاتِ متشابہات کو نازل کرنے کا فائدہ</u> : علمائے متقدمین کا یہی مذہب تھا کہ آیاتِ متشابہات کے معنیٰ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو معلوم نہیں۔ اُن پر یہ اعتراض ہوا کہ پھر آیاتِ متشابہات کے نازل کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ انہوں نے اس کا یہ جواب دیا کہ اس میں علماء کا امتحان ہے جس طرح جاہل کے لئے تحصیلِ علم مشکل ہے اسی طرح علماء کے لئے کسی لفظ کے معنیٰ میں تدبر اور تفکر نہ کرنا مشکل ہے۔ سو آیاتِ متشابہات کو نازل کر کے

اللہ تعالیٰ نے علماء کو اس کا مکلّف کیا ہے کہ وہ ان آیات میں تدبر اور تفکر کرنے سے باز رہیں۔ (تبیان القرآن)

اُمُّ الْکِتٰب کی ترکیب میں اس حقیقت کو بیان کر دیا کہ قرآن مجید میں جو آیتیں بالکل واضح اور صاف ہیں جن سے صرف ایک ہی معنیٰ نکلتے ہیں' وہی اصل مدار و معیار ہیں۔ دوسری آیتوں کو جن کے کئی کئی معنیٰ ہو سکتے ہیں' اُنہی (محکم آیات) پر پیش کرنا چاہئے۔

جن کے دلوں میں کجی ہے اور جن کے دل حق سے منحرف ہوتے ہیں' وہ دوسرے سادہ لوح مسلمانوں کے سامنے آیاتِ متشابہات کی ایسی تاویلیں کرتے ہیں جو محکم آیات کے منافی ہوتی ہیں اور اس طرح اُن کے دلوں میں قرآن و اسلام کے متعلق طرح طرح کے شکوک اور وسوسے پیدا کر کے اُنہیں اپنے دین سے بدظن کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ چاہئے تو یہ تھا کہ متشابہات کی تاویل کرتے وقت محکم آیات کی پیروی کی جاتی اور اُن کی روشنی میں اُن کا مفہوم بتایا جاتا لیکن کیونکہ نیّت فاسد ہوتی ہے اس لئے وہ راہِ راست کو چھوڑ کر پیچ در پیچ راہ اختیار کرتے ہیں۔

وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗ' اِلَّا اللّٰہُ' پر وقف کی تحقیق : بعض علماء نے اِلَّا اللّٰہ پر وقف کیا ہے اور وَالرّٰسِخُوْنَ الخ کو مستقل جملہ قرار دیا ہے۔ اس صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ متشابہات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور علمائے راسخین نہ جاننے کے باوجود ان آیات کی حقانیت اور منزّل من اللہ ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ اور کچھ علماء نے اِلَّا اللّٰہ کی بجائے وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْم پر وقف کیا ہے۔ اس صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ آیاتِ متشابہات کی حقیقی غرض اللہ تعالیٰ اور پختہ علم والوں کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔

اب شبہ یہ وارد ہوتا ہے کہ کیا قرآن کریم میں ایسی آیات بھی ہیں جن کا مفہوم کسی کو معلوم نہیں۔ اگر ایسا ہے کہ جب اُنہیں کوئی سمجھ نہیں سکتا اور اُن سے ہدایت حاصل نہیں کی جا سکتی تو پھر اُن کے نازل کرنے کا کیا فائدہ؟ مفسّرین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ جو علماء اِلَّا اللّٰہ پر وقف کرتے ہیں وہ متشابہات کا عام معنیٰ مراد نہیں لیتے بلکہ اُن کے نزدیک متشابہات سے مراد وہ امور ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے خاص کیا ہوا ہے جیسے قیامت کا وقت' سورتوں سے پہلے حروفِ مقطعات وغیرہ۔ اب یہاں یہ چیز کھٹکتی ہے کہ کیا ان امور کا علم اللہ تعالیٰ نے کسی کو بھی نہیں بتایا؟ تو اس کا نہایت واضح جواب علامہ سیّد محمود آلوسی بغدادی نے دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"جن علماء کے نزدیک متشابہات سے مراد وہ امور ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے مختص فرمایا ہے' وہ علماء بھی اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے ان امور کا علم بذریعہ وحی اپنے رسول ﷺ کو دیا' یا اولیائے کاملین کے قلوب میں القاء فرمایا ہے۔ کیونکہ جو شخص حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقامِ رفیع اور آپ ﷺ کی امت کے اولیائے کاملین کے مرتبہ کو پہچانتا ہے وہ اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ نفی

علم محیط کی اور اُس علم کی ہے جو انسان اپنی عقل و فکر سے حاصل کرتا ہے، نہ کہ اُس علم کی جو اللہ اپنے نبی کو بذریعہ وحی یا کسی ولی کو بذریعہ الہام عطا فرماتا ہے۔'' (روح المعانی)

''اس طرح قرآن مجید میں بطور استعارہ ایسی بلیغانہ تراکیب کا استعمال اہلِ فلسفہ کے لئے ہے جو ذریعہ ابلاغ کے لئے ضروری ہے۔ اُن کی فصاحت و بلاغت اور حسن و جمال اعجازِ قرآن اور آیاتِ قرآنی کے تقدس کے لئے یقینی ثبوت ہے جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ تاہم ان متشابہات کی موجودگی ایمان کے ارتقاء اور عوام الناس کے عقیدے میں گرمجوشی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔''

(Encyclopaedia of the Qur'an, Vol. III, p. 387)

قرآن مجید میں محکم آیات کی مثالیں : قرآن مجید میں تقریباً 98% آیات محکم آیات ہیں یعنی جن کا مطلب واضح طور پر صرف ایک ہے۔ ان محکم آیات کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) یٰاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَo (البقرۃ: ۲۱)

(۲) وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُo (البقرۃ: ۱۱۷)

(۳) لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ ---- (البقرۃ: ۲۵۶)

(۴) كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران: ۱۸۵؛ الانبیاء: ۳۵؛ العنکبوت: ۵۷)

(۵) اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا (یونس: ۴)

(۶) اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍo (الحجر: ۴۵)

(۷) نَبِّئْ عِبَادِیْۤ اَنِّیْۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُo وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُo (الحجر: ۴۹، ۵۰)

(۸) وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا --- (بنی اسرائیل: ۲۳)

(۹) وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا یَعْقِلُهَاۤ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَo (العنکبوت: ۴۳)

(۱۰) یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِo (العنکبوت: ۵۶)

(۱۱) فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَo (الروم: ۱۷)

(۱۲) لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌo (لقمن: ۱۳)

(۱۳) لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُo (لقمن: ۲۶)

(۱۴) كُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍo (الرحمٰن: ۲۶)

(۱۵) وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (المزمل: ۲۰)

(۱۶) قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَo لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَo وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُo (الکفرون: ۱-۳)

(۱۷) قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌo اَللّٰهُ الصَّمَدُo لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْo وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌo (الاخلاص: ۱-۴)

ترجمہ: (۱) ''اے لوگو! اپنے اُس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ۔'' (۲ : ۲۱)

(۲) ''جب وہ کسی کام کا ارادہ کر لیتا ہے تو اُسے کہتا ہے: ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔'' (۲:۱۱۷)

(۳) ''دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت گمراہی سے واضح طور پر ممتاز ہو چکی ہے۔'' (۲:۲۵۵)

(۴) ''ہر جاندار نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔'' (۳:۱۸۵ ؛ ۲۱:۳۵ ؛ ۲۹ : ۵۷)

(۵) ''اُسی (اللہ) کی طرف تم سب نے لوٹنا ہے، اللہ کا وعدہ سچا ہے۔'' (۱۰ : ۴)

(۶) ''بیشک تقویٰ شعار لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔'' (۱۵ : ۴۵)

(۷) ''میرے بندوں کو بتا دیجئے کہ میں ہی بیشک بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہوں اور (اس بات سے بھی آگاہ کر دیجئے کہ) میرا ہی عذاب بڑا دردناک عذاب ہے۔'' (۱۵ : ۴۹، ۵۰)

(۸) ''اور آپ کے رب نے حکم فرما دیا ہے کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کیا کرو۔'' (۱۷ : ۲۳)

(۹) ''اور یہ مثالیں ہم انہی لوگوں (کے سمجھانے) کے لئے بیان کرتے ہیں اور اُنہیں اہلِ علم کے سوا کوئی نہیں سمجھتا۔'' (۲۹ : ۴۳)

(۱۰) ''اے میرے بندو! جو ایمان لے آئے ہو، بیشک میری زمین کشادہ ہے سو تم میری ہی عبادت کرو۔'' (۲۹ : ۵۶)

(۱۱) ''پس تم اللہ کی تسبیح کیا کرو جب تم شام کرو (یعنی مغرب اور عشاء کے وقت) اور جب تم صبح کرو۔'' (۳۰ : ۱۷)

(۱۲) ''اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا، بیشک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔'' (۳۱ : ۱۳)

(۱۳) ''جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے (سب) اللہ ہی کا ہے، بیشک اللہ ہی بے نیاز ہے اور لائقِ حمد و ثنا ہے۔'' (۳۱ : ۲۶)

(۱۴) ''جو کچھ بھی زمین پر ہے، فنا ہو جانے والا ہے۔'' (۵۵ : ۲۶)

(۱۵) ''نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو قرضِ حسن دیا کرو۔'' (۷۳ : ۲۰)

(۱۶) ''فرما دیجئے: اے کافرو! میں اُن (بتوں) کی عبادت نہیں کرتا جنہیں تم پوجتے ہو اور نہ تم اُس رب کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور نہ (ہی) میں آئندہ (کبھی) اُن کی عبادت کرنے والا ہوں جن (بتوں) کی تم پرستش کرتے ہو، اور نہ (ہی) تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس (رب) کی میں عبادت کرتا ہوں، (سو) تمہارا دین تمہارے لئے اور میرا دین میرے لئے ہے۔'' (۱۰۹ : ۱-۶)

(۱۷) ''فرما دیجئے: وہ اللہ ہے جو یکتا ہے۔ اللہ سب سے بے نیاز، سب کی پناہ اور سب پر فائق ہے۔ نہ اُس سے کوئی پیدا ہوا ہے اور نہ ہی وہ پیدا کیا گیا ہے اور نہ ہی اُس کا کوئی ہمسر ہے۔'' (۱۱۲:۱-۴)

آیاتِ متشابہات کی مثالیں : محکم آیات کی نسبت قرآن مجید میں آیاتِ متشابہات کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ آیاتِ متشابہات کی چند مثالیں حسبِ ذیل ہیں :

(۱) فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (البقرة : ۱۱۵)
''تم جدھر بھی رخ کرو' اُدھر ہی اللہ کا چہرہ ہے۔'' (۲ : ۱۱۵)

چہرہ جسم میں ہوتا ہے اور رب تعالیٰ جسمانیت سے پاک ہے۔ لہٰذا آیت از قبیلِ متشابہات ہے اور اس کا اصل معنیٰ اللہ کی موجودگی اور اُس کی توجہ کا ہے کیونکہ رب تعالیٰ کو کسی خاص سمت میں محدود نہیں مانا جا سکتا۔ وہ ہر جگہ اور ہر سمت میں برابر موجود ہے۔ وَجْهُ اللّٰه کہہ کر اُس کی ہر جگہ محیط موجودگی اور اپنی مخلوق کے ساتھ اُس کے گہرے تعلق کو بیان کرنا مقصود ہے۔

(۲) كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ'' اِلَّا وَجْهَه' (اَلْقَصَص : ۸۸)
''اُس کے چہرے کے سوا (یعنی اُس کی ذات کے سوا) ہر چیز فانی ہے۔'' (۲۸ : ۸۸)

(۳) قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ'' مِّثْلُكُمْ (اَلْكَهْف: ۱۱۰ ؛ فُصِّلَتْ : ۶)
''(اے حبیبِ محتشم!) فرما دیجئے کہ میں تمہارے جیسا بشر ہوں۔'' (۱۸:۱۱۰ ؛ ۴۱ : ۶)

نوٹ : تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آیتِ بالا میں خطاب کفار سے ہے کہ میں تمہارے جیسا ہوں تو کیا فخرِ موجودات' لَوْلَاكَ کا دل آویز اور من موہنا سہرا پہنا ہوا نبی (معاذ اللہ) کافروں جیسا ہو گیا!! اللہ ہی ہدایت دے۔ مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہوں اِسی جلد کے صفحات ۴۴۲۴ تا ۴۴۲۶۔

(۴) وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۞ (الرَّحْمٰن : ۲۷)
''اور آپ کے رب ہی کا چہرہ باقی رہے گا (یعنی اُس کی ذات باقی رہے گی) جو صاحبِ عظمت و جلال اور صاحبِ انعام و اکرام ہے۔'' (۵۵ : ۲۷)

(۵) يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ (القلم : ۴۲)
''جس دن ساق (بہ معنیٰ پنڈلی یعنی احوالِ قیامت کی ہولناک شدت) سے پردہ اٹھایا جائے گا اور وہ (نافرمان) لوگ سجدہ کے لئے بلائے جائیں گے۔'' (۶۸ : ۴۲)

ساق (پنڈلی) انتہائی مخفی راز کی علامت ہے کیونکہ بالعموم وہ دوہری ڈھانپی ہوتی ہے: ایک تو جلد سے اور دوم کپڑوں اور لباس سے وہ چھپی ہوتی ہے۔

(۱۷۳) رہبانیت (Monasticism)

''راہب مذہبی طبقے کے افراد ہوتے ہیں جو باقی تمام سماج سے الگ تھلگ رہتے ہیں اور جنہوں نے حلفاً خاص طور پر یہ عہد کیا ہوتا ہے کہ نہ تو وہ شادی کریں گے اور نہ ہی کوئی جائداد یا ملکیہ چیز رکھیں گے۔''
(آکسفورڈ ایڈوانسڈ لرنرز ڈکشنری' صفحہ ۷۵۲)۔رہبانیت (Monasticism) کا لفظ انسانوں سے ہر قسم کی لاتعلقی بالخصوص تجرد (شادی نہ کرنے) کی زندگی کو شامل ہے۔''

عیسائیت اور دیگر کافرانہ فلسفوں کی طرح اسلام اپنے دینی واخلاقی نظام کی بنیاد جسمِ انسانی کی خباثت اور گنہگاری کے نظریہ پر نہیں رکھتا۔اسلامی قانون جنسی تحرکات کے دبانے کا حامی نہیں۔اس کا صرف یہی مطالبہ ہے کہ اُن تحرکات کو اسلامی ضابطہ کے مطابق قابو میں رکھا جائے۔وسیع پیانے پر تجرد کی زندگی کا مقصد فطرت کے اسی مقصد کو ناکام بنانا ہے۔

ایک طرف تو اسلام کا موقف جنسی مادر پدر آزادی کے خلاف ہے جس کے نتیجے میں وہ شادی سے پہلے یا شادی کے بعد زنا سے روکتا ہے اور زنا کی طرف جانے کی تمام راہوں کو بند کرتا ہے جبکہ دوسری طرف وہ جنسی انگیخت کو دبانے کے خلاف ہے اور اسی لئے وہ بنی نوعِ انسان کو نکاح اور شادی کرنے کی دعوت دیتا ہے اور ترکِ دنیا اور خصی ہونے سے روکتا ہے۔

جب تک مسلمان کو شادی کرنے کے وسائل اور ذرائع حاصل ہیں' اُسے اس بنیاد پر شادی سے گریز کرنے کی اجازت نہیں کہ اُس نے اپنے آپ کو عبادتِ الٰہی یا خدمتِ خلق کے لئے وقف کر دیا ہے جس کی وجہ سے اُس نے ترکِ دنیا اور رہبانیت کی زندگی کو اختیار کر لیا ہے۔

پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے کچھ صحابہ میں رہبانیت کی طرف رجحان کو معلوم کیا تو آپ نے اسے اسلام کے صراطِ مستقیم اور اپنی سنت سے فرار قرار دیا اور اسلام کے نظریاتی ضابطہ کو عیسائی تصوّر سے پاک کیا۔ابو قلابہ فرماتے ہیں کہ کچھ صحابہ کرام نے ترکِ دنیا' اپنی بیویوں کو چھوڑنے اور راہبوں کی طرح ہو جانے کا فیصلہ کیا تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سخت لہجے میں اُنہیں فرمایا:

''تم سے پہلے لوگ ترکِ دنیا کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔اُنہوں نے اپنی جانوں پر انتہائی بوجھ ڈالا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں مصائب و آلام میں مبتلا کر دیا۔اس لئے عبادت صرف اللہ کی کرو اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔حج اور عمرہ ادا کرو' نیک بن جاؤ تو تمہارے تمام معاملات درست ہو جائیں گے۔''
(مصنف عبدالرزاق' ابن جریر' ابن المنذر)

ابو قلابہ فرماتے ہیں کہ درج ذیل آیت اُنہی صحابہ کے حق میں نازل ہوئی :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا (المائدة:۸۷)

''مومنو! اُن پاکیزہ چیزوں کو حرام مت ٹھہراؤ جو اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں اور حدود سے تجاوز مت کیا کرو۔'' (۵ : ۸۷)

کسی مسلمان کا ایسی جسارت کرنا گویا اس کا اقرار کرنا ہے کہ (معاذ اللہ) شریعت سے فلاں فلاں پرہیز کے مقرر نہ کرنے میں کمی ہوئی ہے اور اب میں اپنی عقل و تجربہ سے اس فروگزاشت کی تلافی کر رہا ہوں۔ کسی جائز چیز سے کسی طبی یا انتظامی مصلحت کی بنا پر دست بردار ہو جانا اور چیز ہے جیسے یعقوب علیہ السلام نے عرق النسا کے مرض کی وجہ سے اونٹ کے دودھ اور گوشت کو اپنے اوپر ممنوع کر لیا تھا (تفسیر بیضاوی: سورہ آلِ عمران' آیت:۹۳) اور ظاہر ہے کہ اس طبی پرہیز کا حُرمت شرعی سے کوئی تعلق نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ ترکِ لذات کی اور بیویوں سے دُور رہنے کی خود عائد کردہ قسموں کا کوئی اعتبار اور کوئی فائدہ نہیں جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی کے مطابق نہ ہوں۔ اس لئے انسان کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جذباتِ تشکر و امتنان کے ساتھ استعمال میں لانا چاہئے لیکن اُن کے استعمال میں بھی حدود سے آگے نکل جانے کو وہ پسند نہیں کرتا اور حدود سے آگے نکل جانا اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو اپنے اوپر حرام اور ممنوع کر دینا ہے۔

بھوک ہڑتال کی اسلام اجازت نہیں دیتا کہ اس میں خود کو اذیّت دینا ہے۔ نفس کُش ریاضتوں کی بھی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں جس سے انسان کچھ کھانوں کو اپنے اوپر ممنوع کر لیتا ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ سورۃ التّغابن کی آیت ۱۵ إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ'' (دراصل تمہارے مال اور تمہاری اولاد آزمائش ہیں) کے نازل ہونے پر کچھ صحابہ نے اپنے خالق کی مخالفت کے ڈر سے قسم کھائی کہ وہ نہ تو لذیذ اور خوش ذائقہ کھانا کھائیں گے اور نہ ہی اپنی بیویوں کے پاس جائیں گے۔ دو یا تین راتوں کے بعد اِن صحابہ کی بیویاں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس یہ دریافت کرتے ہوئے حاضر ہوئیں کہ کیا کسی الٰہی حکم نے تو اُن کے خاوندوں کو اُن کی بیویوں سے علیحدہ رہنے پر مجبور نہیں کیا۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن کے خاوندوں کو بلایا اور اُنہیں ڈانٹتے ہوئے کہا: لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ (اسلام میں ترکِ دنیا کی کوئی گنجائش نہیں)۔ اسی موقع پر سورۃ المائدۃ کی آیتِ بالا (۸۷) نازل ہوئی۔

حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ کچھ صحابہ بشمول حضرت عثمان بن مظعون اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیویوں سے علیحدہ رہنے' خصی ہونے اور موٹے جھوٹے کپڑے پہننے کا عزم کیا۔ تب آیتِ بالا اور اس سے متصل آیت کا نزول ہوا۔ (تفسیر ابن جریر طبری)

۴۴۶۸ (رہبانیت ۔۔ Monasticism)

امام بخاری اور کچھ دیگر محدّثین نے بیان کیا کہ تین آدمیوں نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عبادت کے طویل دورانیے کو معلوم کر کے اُن میں سے ایک نے کہا کہ میں تو تمام رات عبادت میں گزاردوں گا۔ دوسرے نے کہا: میں عورتوں سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا اور کبھی شادی نہیں کروں گا۔ جب نبی علیہ السلام نے یہ سنا تو اُنہیں اُن کی غلطی جتلائی کہ وہ صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے ہیں اور فرمایا:

''میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں۔ میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور روزہ افطار بھی کرتا ہوں۔ میں عبادت بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں۔ (یادرکھو) جو کوئی میری سنت سے منہ موڑے گا' اُس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔''

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی تجرد کی زندگی پر اعتراض کیا۔ اگر آپ ﷺ نے اُنہیں ایسا کرنے کی اجازت دی ہوتی تو ہم اپنے آپ کو خصی کرا لیتے۔''

تمام زمانوں کے نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے نبی محترم ﷺ نے فرمایا:

''نوجوانو! تم میں سے جو کوئی بیوی رکھ سکتا ہے' وہ شادی کر لے کیونکہ نکاح غیر عورتوں کے تکنے سے روکتا ہے اور تمہاری پاکبازی کی حفاظت کرتا ہے۔'' (صحیح بخاری)

درحقیقت مسلمان کی یہ شان نہیں کہ وہ غربت کے ڈر سے یا اپنے فرائض کی عدم تکمیل کے خوف سے شادی سے گریز کرے۔ اُسے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے ہوئے روزگار کے لئے بھرپور کوشش کرنی چاہیے کیونکہ رب تعالیٰ نے اُن لوگوں کی مدد کرنے کا وعدہ فرمایا ہے جو اپنے کردار اور پاکبازی کی حفاظت میں شادی کرتے ہیں۔ رب تعالیٰ کا سورۃ النور میں ارشادِ پاک ہے:۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (النور: ۳۲)

''اور تم اپنے مردوں اور عورتوں میں سے اُن کا نکاح کر دیا کرو جو (عمرِ نکاح کے باوجود) ازدواجی زندگی کے بغیر رہ رہے ہوں اور اپنے اُن غلاموں اور باندیوں کا بھی (نکاح کر دیا کرو) جو نکاح کے قابل ہوں۔ اگر وہ محتاج ہوں گے (تو) اللہ اپنے فضل سے اُنہیں غنی کر دے گا۔'' (۲۴ : ۳۲)

عیسائیوں اور کچھ یہودی فرقوں کے عقیدے کے برعکس اسلام میں نکاح کا عمل بذاتِ خود نیک کام ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا:

''تین آدمی ایسے ہیں جن کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے: ایک تو وہ جو پاکباز زندگی گزارنے کی نیت سے شادی کرے' دوسرا وہ غلام جس کے آقا نے اُس کو آزاد کرنا منظور کرلیا ہے جب وہ اُسے رقم ادا کردے اور تیسرا وہ جو اللہ کی راہ میں لڑے۔'' (ترمذی' احمد' نسائی' ابن ماجہ' الحاکم)

طلوعِ اسلام سے بہت پہلے رہبانیت عیسائیت کا امتیازی نشان تھا۔ پانچویں صدی عیسوی تک ملک عرب کی سرحدوں پر راہبوں اور راہب خانوں کی کثیر تعداد تھی۔ کلاسیکی قصیدوں میں شعراء تاریک رات میں راہبوں کی قیام گاہوں میں جلتی ہوئی روشنی کا بعض اوقات ذکر کرتے ہیں۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لڑکپن کے زمانہ میں بحیرہ نامی اُس راہب سے آپ کی ملاقات کا ذکر بھی تاریخ میں محفوظ ہے جس نے آپ کی ذات میں علاماتِ نبوّت دیکھ لی تھیں۔ نبی علیہ السلام کے ابتدائی صحابی سیّدنا سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قبولِ اسلام اُن کا راہبوں سے باقاعدہ اور مستقل رابطے کا نتیجہ تھا جن میں سے ایک راہب نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوّت کی سلمان فارسیؓ سے پیشین گوئی کی تھی۔ عربی لٹریچر میں رہبانیت اور راہبوں کے یہ اور دوسرے اشارے نبی علیہ السلام کے زمانہ میں عیسائیوں کی عام موجودگی کی توثیق کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں راہبوں (رُهبان کے لفظ میں) کا ذکر تین مرتبہ آیا ہے: سورۃ المائدۃ کی آیت ۸۲ میں اور سورۃ التوبۃ کی آیات ۳۱ اور ۳۴ میں۔ اور رہبانیت کا ذکر ایک مرتبہ سورۃ الحدید کی آیت ۲۷ میں ہوا ہے۔ سورۃ الحدید میں رہبانیت کی ان الفاظ میں حوصلہ شکنی کی گئی ہے:

وَرَهْبَانِيَّةَ ن ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُوْنَ ٥ (الحدید: ۲۷)

''اور ترکِ دنیا کو اُنہوں نے خود ایجاد کرلیا' ہم نے اُن پر واجب نہیں کیا تھا بلکہ اُنہوں نے اُسے اللہ کی رضامندی کی خاطر اختیار کرلیا تھا' سو اُنہوں نے اُس کی پوری پوری رعایت نہ کی' تو اُن میں سے جو ایمان لائے' ہم نے اُن کا اجر اُنہیں دے دیا اور اُن میں سے زیادہ تو نافرمان ہی ہیں۔'' (۵۷: ۲۷)

آیتِ مذکورہ میں اِبْتَدَعُوهَا کا لفظ بتا رہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں ترکِ دنیا (رہبانیت) جائز نہیں تھی۔ بعد کے لوگوں نے اسے اپنے طور پر بہ طورِ بدعت گھڑ لیا تھا اور عبادات میں پوری طرح منہمک ہونے کے لئے اسے اپنے اوپر عائد کرلیا تھا۔ اس کے پسِ پردہ مقصد دنیا میں عام پھیلی ہوئی گندگیوں سے راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے رضائے الٰہی کا حصول تھا۔ بدعتِ حسنہ ہونے کے لحاظ سے چونکہ ترکِ دنیا کا یہ عمل حُسنِ نیت کے تحت کیا گیا تھا' اس لئے ربِ تعالیٰ نے اپنے اُن بندوں سے اسے قبول فرمالیا جنہوں نے اس کے تقاضوں کی پابندی کی اور اُنہیں اس کا پورا پورا اجر عطا فرما دیا۔ لیکن ہوا یہ کہ اپنی لگائی ہوئی قیود و شرائط وہ خود ہی نہ نباہ سکے اور پھسل گئے۔ بہر حال یہ معلوم ہوا کہ اللہ کی خوشنودی کی خاطر جو بھی عمل کیا جائے وہ حرام اور راندۂ درگاہ نہیں ہوا کرتا اگرچہ وہ خود عائد کردہ ہو۔

۴۴۷۰ (رہبانیت ۔۔ Monasticism)

رہبانیت کی آڑ میں اخلاقی بے راہروی: خود مسیحیوں کے قلم سے لکھی ہوئی رہبانیت کی ساری تاریخ بڑی حد تک فسق وفجور ہی کی تاریخ ہے اور فطرتِ انسانی سے انحراف کا نتیجہ بدخود اُنہی کے گھر کے اُفراد سے سنئے:۔

''دو صدیاں گزرنے کے بعد سینٹ پال نے جنس سے متعلق ترکِ دنیا کا اپنا فارمولہ وضع کیا۔ اُس نے خصی' بے جنس مرد اور جنس سے بے حس عورت کی تحسین وتعظیم کی۔ اُس نے عیسائیت کے لئے استعاراتی جھنڈا لہرایا جس کا نسبی نشان اور تقدّس کا پہلو تمام جنسی خواہشات کو دبانا تھا۔ ترکِ دنیا کے اسی نظریے نے اُس وقت سے لے کر اَب تک کی جنس سے متعلق مغربی تہذیب کے نقطۂ نظر پر قبضہ کر رکھا ہے۔ سینٹ پال اور اُس کے ہمنواؤں کی وضع کردہ حدود وقیود' اخلاقیات اور تعصبات نے صدیوں سے عیسائی دنیا میں راہ پائی ہے اور کامیابی کے ساتھ ہمکنار ہوئے ہیں۔'' ("Sex Life of Man & Woman" .... Scott, p. 62)

''کنیساؤں میں رہنے والی راہبات ''نیک اور مقدس'' لوگوں کو اُچٹتی نظر ہی میں اُن کی جنسی تسکین کا سامان فراہم کیا کرتی تھیں۔'' ("History of Prostitution" .... Scott, p. 112")

''اِن کنیساؤں کے نمایاں پہلو یہ تھے کہ اُنہوں نے اُن زمینوں کو ہتھیا لیا تھا جو اگر نجی مالکان کے قبضہ میں ہوتیں تو زیادہ مفید ہوتیں' اِن کنیساؤں نے لوگوں کو سرگرمیِ عمل سے روکا ہوا تھا اور بیشتر طور پر اُنہیں کاہل اور نکما کر کردیا تھا۔''("Universal History of the World" ...Hammerton, Vol. 14, p.2627")

بہرحال ترکِ دنیا اور رہبانیت کی زندگی اسلامی تعلیمات سے زبردست طور پر متصادم ہے۔ سورۃُ النُّور کی ذیل کی آیت دین اور دنیا کے خوش آئند اور حسین امتزاج کو آشکار کرتی ہے:۔

رِجَالٌ'' لَّاتُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ'' وَّلَابَيْعٌ'' عَنْ ذِكْرِاللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ
الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُO (اَلنّور:۳۷)

''وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں نہ تو تجارت اللہ کی یاد سے' نماز پڑھنے سے اور زکوۃ دینے سے غفلت میں ڈالتی ہے اور نہ ہی خرید وفروخت' وہ ایسے دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی۔''

آیت مذکور کو اُس کے آخری حصہ سے ملا کر پڑھنے سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ مؤمن کی توجہ جہاں حصولِ دنیا اور کسبِ معاش کی طرف ہوتی ہے' وہاں باوجود پابندیِ احکام کے اُسے زیادہ فکر روزِ جزا اور اپنے محاسبے کی ہوتی ہے۔

حرفِ آخر: اسلام دین ودنیا کے حسین امتزاج کا نام ہے' اسی لئے اُس نے اپنے پیروکاروں کو یہ دعا سکھائی:

رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ O (اَلبقرۃ : ۲۰۱)
''اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھنا۔'' (۲۰۱ : ۲)

اقوام عالم کے دوش بہ دوش چلنے کے لئے مسلمان کے لئے یہ بات ناگزیر ہے کہ وہ عزت و وقار کی زندگی گزارنے کے لئے میدانِ حیات میں اپنے خالق کی یاد کے ساتھ قدم رکھے۔ اس لئے تجرد' خصی ہونے' مستقل طور پر روزے رکھنے' روزہ رکھنے کے بعد کھانا کھانے سے پرہیز' خود عائد کردہ سکوت و خاموشی جو اپنی ذات کے لئے قلق و اضطراب کا موجب ہے اور اہلِ خانہ کو اُن کے جائز حقوق سے محروم کر دیتی ہے' اِن سب کی اسلام میں سخت ممانعت آئی ہے۔

(۱۷۴) مالی معاملات(Monetary Affairs)

ایک مضبوط اخلاقی کردار کے ارتقاء کے لئے اور زندگی میں حسن و جمال اور ہم آہنگی لانے کے لئے قرآن مجید اپنے ماننے والوں کو راست رَو رہنے اور روز مرّہ معاملات میں اپنے ابنائے جنس کے ساتھ آبرو مندانہ رویّہ رکھنے اور اپنی روزگار جائز اور صحیح ذرائع سے کمانے پر زور دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآنی تعلیمات ایسی وسیع طور پر اثر انداز ہیں کہ جوئے بازی' لاٹری' دھوکہ دہی' غبن' سودی کاروبار وغیرہ جیسے ناجائز ذرائع سے دولت کمانا اور بنانا مسلمانوں کے لئے ممنوع اور حرام ہیں۔ درج ذیل احکام ملاحظہ ہوں :

(۱) وَلَا تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ O (البقرۃ : ۱۸۸)
''اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر مت کھاؤ اُڑاؤ اور نہ اُسے حکام تک پہنچاؤ کہ جس سے لوگوں کے مال کا ایک حصّہ تم گناہ سے کھا جاؤ درانحالیکہ تم جان رہے ہو۔'' (۱۸۸ : ۲)

اسلامی حکومت قائم ہونا اور اسلام کے سارے قانونِ دیوانی اور فوجداری کا نافذ ہونا تو خیر بڑی چیز ہے' قرآن مجید کی اسی ایک آیت پر اگر آج عملدرآمد ہو جائے تو جھوٹے دعووں' جعلی کاغذات' جھوٹی گواہیوں' جھوٹے حلف ناموں' اہلکاروں اور عہدہ داروں کی رشوتوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ حکّام کی خدمت میں نذر' نذرانوں' قیمتی ڈالیوں اور شاندار و پُر تکلف دعوتوں کا وجود کہاں باقی رہے گا؟ بالْاِثم گناہ کا لفظ عام ہے۔ ہر قسم کی معصیتیں جو عدالتی کارروائیوں اور انتظامی معاملات کے سلسلہ میں کام میں لائی جاتی ہیں' اس کے تحت میں آ جاتی ہیں۔

(۲) وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّأَحْسَنُ تَأْوِيْلًا O

''اور ناپ پورا رکھا کرو جب (بھی) تم (کوئی چیز) ناپو اور (جب تولنے لگو تو) سیدھے ترازو سے تولا کرو، یہ (دیانتداری) بہتر ہے اور انجام کے اعتبار سے (بھی) خوب تر ہے۔'' (۱۷:۳۵)

صحیح ناپ تول نہ صرف بذاتِ خود ایک اچھی بات ہے بلکہ انجام کار اُس شخص کی روحانی اور مادّی منفعت کے لئے بھی ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

(۳) اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ○ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ○ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ○ (اَلشُّعراء : ۱۸۱۔۱۸۳)

''پورا ناپا کرو اور نقصان پہنچانے والے نہ بنو اور صحیح ترازو سے تولا کرو اور لوگوں کا نقصان اُن کی چیزوں میں نہ کیا کرو اور ملک میں فساد مت مچایا کرو۔'' (۱۸۱۔۱۸۳ : ۲۶)

قرآن مجید واضح طور پر بتاتا ہے کہ ناپ تول میں کمی عوام الناس کے فطری اور جائز حقوق کا غصب کرنا ہے۔ وہ جب استحصال کرنے والوں کے خود غرضانہ مال بٹورنے کے ہتھکنڈوں سے تنگ آ جاتے ہیں تو اُن کے ظلم و جبر کے خلاف بغاوت کر کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اُن کی نہ رُکنے والی پیشقدمی تمام سماج کے اقتصادی نظام کو تہ و بالا کر کے رکھ دیتی ہے جس سے وہ مکمل طور پر تباہ ہو کے رہ جاتی ہے۔ قرآن مجید کے نزدیک اُن کی اِس فریب کاری کے عمل کا دوسرا نام زمین میں فساد پھیلانا ہے جیسا کہ سورہ ھود کی آیت ۸۵ اور سورۃ الشُّعَراء کی آیت ۱۸۳ میں بیان ہوا۔

(۴) اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ ○ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ○ (اَلرَّحمٰن:۸، ۹)

''کہ تم تولنے میں گڑ بڑ نہ کرو اور وزن کو انصاف کے ساتھ ٹھیک رکھو اور تول کو مت گھٹاؤ۔'' (۸، ۹:۵۵)

اَلْمِيْزَان کے معنی عدل کے بھی کئے گئے ہیں۔ تجارت اور تجارتی معاملات میں تقویٰ اور دیانت کی اہمیت اسی ایک حکم سے ظاہر ہے اور عالم کی فلاح و بہبود کا مدار بڑی حد تک اِسی ایک حکم سے ظاہر ہے۔

اِن واضح ترغیبات پر مستزاد یہ کہ اُن تاجروں کو آخرت کی سزا کی شدید تنبیہ کی گئی ہے جو وزن کرنے میں دھوکہ بازی اور فریب کاری کرتے ہیں۔ وہ دیتے کم اور لیتے بہت زیادہ ہیں۔ آدمی کس منہ سے رب تعالیٰ کی رحمت اور اُس کی محبت کی امید کرتا ہے جبکہ وہ خود اُسے اپنے ابنائے جنس کو دینے کے لئے تیار نہیں؟ ایسے لوگوں کے لئے قرآن کی تنبیہ یہ ہے:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ○ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ○ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ○ (المُطففین : ۱۔۳)

"(ناپ تول میں) کمی کرنے والوں کے لئے بڑی ہلاکت ہے کہ جب لوگوں سے ناپ کرلیں تو پورا پورا لے لیں اور جب اُنہیں ناپ کریا تول کردیں تو گھٹادیں۔"(۱۔۳ : ۸۳)

بعض محققین نے تَطفِیف کو عام اور وسیع معنوں میں لیا ہے یعنی کمی اور کوتاہی کو صرف وزن و پیائش کی چیزوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ طاعت وعبادت کی ہر چیز کو اس میں داخل کیا ہے جیسا کہ چوری صرف مال ہی میں نہیں' ہر شے میں ممکن ہے۔ ایک حدیثِ مبارکہ میں رکوع اور سجدے کو صحیح طور پر ادا نہ کرنے والے کو رکوع اور سجدے کا چور کہا گیا ہے۔

اس طرح اسلامی معاشرے میں تمام معاملات پاکیزہ اور مبنی بر انصاف ہوتے ہیں اور اُن میں کسی قسم کی تعدّی' فریب کاری' دھوکہ دہی یا نقص ہرگز نہیں ہوتے۔ فریب کاری اور دھوکہ دہی کی متعدد صورتیں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً:

(۱) ناپ تول میں کمی جسے قرآنی اصطلاح میں تَطفِیف کہا گیا ہے۔
(۲) نیلامی میں کسی چیز کی بولی بڑھ چڑھ کر دینا کہ اس سے اُس شخص کو نقصان ہو جو اُس چیز کی خرید میں دلچسپی رکھتا ہے۔ احادیثِ مبارکہ میں اس عمل کو نَجَش کہا گیا ہے۔
(۳) جانور کا بہت دیر تک دودھ نہ دوہنا تاکہ خریدار کو غلط طور پر اُس کا بہت زیادہ دودھ دکھایا جائے۔ احادیثِ مبارکہ میں اس غیر پسندیدہ فعل کو تَسرِیة کہا گیا ہے۔
(۴) دیہاتیوں کے بازار پہنچنے سے پہلے شہر کے مضافات ہی میں اُن سے کم قیمت پر سامان خرید کر لینا جسے احادیث میں تَلَقّیِ الرُّکبان کہا گیا ہے اور اس عمل سے روکا گیا ہے۔
(۵) اشیائے فروخت میں نقص کو چھپانا اور جھوٹی قسمیں کھانا بھی بددیانتی اور بدعنوانی کے تحت آتے ہیں۔
(۶) ایک تجارت میں دو تجارتیں یعنی دوہرا سودا کرنا بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔
(۷) ایک چیز ادھار پر بیچ کر پھر مشتری سے نقدی میں کم قیمت پر خرید کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے جسے بیع العینہ کہا گیا ہے۔

حضرت ابوہُریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنجناب ﷺ بازار میں گندم کے ایک ڈھیر کے پاس سے گزرے۔ آپ نے اپنی انگلیاں اُس ڈھیر میں داخل کیں تو وہ بھیگ گئیں۔ آپ نے اناج کے بیچنے والے سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ آدمی نے جواب دیا کہ بارش میں گندم بھیگ گئی تھی۔ پیغمبر علیہ السلام نے یہ کہتے ہوئے اُسے ڈانٹا کہ "تم نے بھیگے ہوئے حصے کو ڈھیر کے بالائی حصے پر کیوں نہیں رکھا تاکہ وہ خریدار کے علم میں ہو؟ یاد رکھو کہ فریب کاری کرنے والے کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" (صحیح مسلم : کتاب الایمان' جلد اوّل' حدیث نمبر ۱۰۲)

مسلمان تاجر کو دیانتداری کی اعلیٰ اخلاقی قدر کو قائم کرنے کی ترغیب وترہیب دلاتے ہوئے آپ نے فرمایا:

اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ وَالصَّالِحِیْنَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ (سنن ابن ماجہ حدیث: ۲۱۳۹) یعنی راستباز، دیانتدار تاجر روزِ قیامت انبیاء، مخلصین، شہداء اور نیکوکاروں کی ہمراہی میں ہوگا۔

اِن الٰہی احکامات کو معلوم کرنے کے بعد جس کا ایمان پختہ ہے اور اُسے اللہ کے حضور اپنی جوابدہی کا پورا احساس ہے، ہرگز کسی کو دھوکہ اور فریب نہیں دے گا اور اپنے اعمال کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرے گا۔

ہر کہ و مہ جانتا ہے کہ ہماری مخالف اور دشمن قوّتوں نے اپنی روزمرّہ زندگی کے کاروباری معاملات میں ہماری آخری الٰہی کتاب (قرآنِ حکیم) ہی سے دیانتداری، اخلاقی بلندی اور ایمانداری کے سنہرے اصولِ وضوابط اخذ کئے جس کی وجہ سے اقوامِ عالم میں وہ آج کامیاب تاجر ہیں اور اُنہیں کاروباری ساکھ حاصل ہے۔

حرام کمائی کی راہوں کے کھولنے کا اثر نہ صرف اُس حرام خور پر پڑتا ہے بلکہ آنے والی نسلوں پر بھی پڑتا ہے جس کا نتیجہ غضب اور عذابِ الٰہی کے سوا کچھ نہیں۔ دولت کے ایسے پجاریوں کا انجام دوزخ کی جھلسا دینے والی آگ ہی ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مبارک دَورِ حیات میں ایسے دھوکے باز اور فریب کار اکثر و بیشتر یہودیوں میں پائے جاتے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے بقول کسے: (معذرت کے ساتھ)

دَھپ دَھپ دَھپ — مے خانے کا پچھلا دَر
کھولا، دیکھا، پہچانا — توبہ توبہ مولانا!

اور یہ حقیقت ہے کہ ایسے خدا فراموش یہودی ہوں یا عیسائی یا مسلمان، قرآن مجید یہ اعلان کرتے ہوئے اُن کی دولت کے لئے نہ بجھنے والی پیاس اور ہوا و حرص کی مذمت کر رہا ہے:

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ o یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَ جُنُوْبُھُمْ وَ ظُھُوْرُھُمْ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ o (اَلتَّوبۃ: ۳۴، ۳۵)

''اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کر کے رکھتے ہیں اور اُسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، آپ اُنہیں دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔ یہ اُس دن (واقع ہوگا) جبکہ اُس (سونے چاندی) کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اُس سے اُن کی پیشانیوں کو، اُن کے پہلوؤں کو اور اُن کی پشتوں کو داغا جائے گا، یہی وہ ہے جسے تم اپنے واسطے جمع کرتے رہے تھے، سو اب اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو۔''

''قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام میں مال وزر کے جائز طریقوں سے کمانے کی ممانعت نہیں ہے

تو ذخیرہ اندوزی اور مال اکٹھا کرنے کی کیوں مذمت اور ممانعت ہے اور اسے گناہِ کبیرہ کیوں کہا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ ذخیرہ اندوزی سے معاشی محرومی' استحصال اور سماجی عدم مساوات جنم لیتے ہیں' اس لئے ذخیرہ اندوزی کی ممانعت ہے۔ کچھ لوگ ذخیرہ شدہ مال غیر محدود ہونے کی وجہ سے قدرتی طور پر عیش وعشرت کی طرف مائل ہوں گے جبکہ اُن کے بھائی بندوں کو کھانے کے لئے نانِ جویں بھی نہیں ملے گی۔ اس قسم کی صورتِ حال سماجی ہم آہنگی کو جو اسلام کا بنیادی ہدف ہے' درہم برہم کردے گی اور اس طرح اخلاقی بے راہروی اور دوسرے سنگین جرائم کو راہ ملے گی۔''

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قرآن مجید جہاں ایک طرف کمائی کے حرام ذرائع کی حوصلہ شکنی کرتا ہے اور اُس کے مہیب نتائج سے خبردار کرتا ہے' تو دوسری طرف وہ ہمیں ہر حلال' اچھی اور عمدہ چیزوں سے حظ اندوز ہونے اور حلال ذرائع سے روزی کمانے کی ترغیب بھی دیتا ہے جس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس طرح وہ حلال نعمت کے حصول پر اللہ کا شکر ادا کریں کہ اُس نے حرام راہ سے بچا کر اپنی رضا کی راہ پر چلایا اور غیر ضروری تکلیف میں نہیں ڈالا۔ چنانچہ فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ٥

''مومنو! پاک چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں دے رکھی ہیں' کھاؤ (پیو) اور اللہ کا شکر ادا کرتے رہو اگر تم خالص اُسی کی بندگی کرنے والے ہو۔'' (۲ : ۱۷۲)

دوسرے عوامل جو بے آہنگی اور اقتصادی عدمِ استحکام کا باعث بنتے ہیں' جوا اور شراب ہیں جن کی مذمت سورۃ المائدۃ کی آیات ۹۰' ۹۱ میں آئی ہے۔

<u>قمار بازی (جوئے) کے مضر اثرات</u> : ملاحظہ ہوں جلد پنجم کے صفحات ۲۰۸۸' ۲۰۹۸' ۲۰۹۹۔

<u>منشیات اور الکوحل کے مضر اثرات</u> : ملاحظہ ہوں جلد پنجم کے صفحات ۲۰۸۸ تا ۲۰۹۲۔

ایک اور خطرناک بیماری جو ہمارے سماج کے گوشت پوست کو اُس کے گودے سمیت کھائے جارہی ہے' سودی مشاغل ہیں۔ جہاں جائز و حلال تجارت وصنعت افراد اور اقوام کی خوشحالی میں ترقی کا موجب ہے' وہاں سود پر انحصار ست الوجود' خون چوسنے والے ظالموں اور فضول لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اس لئے وہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۷۵ کے الفاظ میں فاتر العقل (دیوانے) لوگ ہیں۔ سود کے گناہِ کبیرہ ہونے کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ کی آخری کتاب قرآن مجید کثیر التعداد دیگر ممانعتی احکام کو شامل ہے لیکن دوسرے کسی ممانعتی حکم میں اس قدر تند و تیز لہجہ اختیار نہیں کیا گیا جتنا سود کی ممانعت میں ہے۔ چنانچہ فرمایا:

''اگر تم سود سے باز نہ آئے تو اللہ اور اُس کے رسول سے جنگ کرنے کے لئے تیار رہو۔'' (۲ : ۲۷۹)

(۱۷۵) توحیدِ باری تعالیٰ (Monotheism)

توحید☆ کا مصدر ا۔ ح۔ د (اَحد) بمعنیٰ ''ایک'' ہے۔ اصطلاح میں اس کا معنیٰ اللہ تعالیٰ کا ایک اور یکتا ہونا ہے کہ نظامِ کائنات کو ہم آہنگی اور توافق کے ساتھ چلانے اور اُس کے امور کو صحیح سمت پر لانے میں اُس کا کوئی شریک اور ہمسر نہیں۔ صرف وہی خالق ورزّاق ہے' اُسی کے قبضۂ قدرت میں موت وحیات ہے۔ کائنات میں تمام موجودات اُسی کی پیدا کردہ ہیں اور اُسی کے حکم کے تابع ہیں۔ توحید کا متضاد شرک ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں کسی کو شریک ٹھہرانا۔ شرک گناہِ کبیرہ اور ظلمِ عظیم ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذاب کا موجب ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ہمارے نبی مکرّم ﷺ تک کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دنیا میں تشریف لائے اور اُن سب کا مقصدِ وحید جبینِ انسانیت کو ایک خدائے واحد کے حضور جھکا دینا تھا۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (اَلنَّحل : ۳۶)

''اور بیشک ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ (لوگو!) تم اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت (یعنی شیطان اور بتوں کی پرستش) سے بچتے رہو۔'' (۱۶ : ۳۶)

پیغمبرِ خدا جیسی معصوم اور قدسی صفت ہستی سے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ لوگوں کو اللہ کی عبادت سے ہٹا کر اپنی یا کسی اور کی عبادت کرانے لگے کہ اوّل تو یہ اُس کے ارفع واعلیٰ منصبِ رسالت کے خلاف ہے اور دوم کہ چونکہ وہ اللہ کا منتخب شدہ بندہ ہوتا ہے اس لئے ربِ تعالیٰ اُسے ہر صغیرہ وکبیرہ گناہ سے محفوظ رکھتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰہُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتٰبَ وَبِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ○ وَلَا یَاْمُرَکُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِکَةَ وَالنَّبِیّٖنَ اَرْبَابًا اَیَاْمُرُکُمْ بِالْکُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○

(آلِ عمران : ۷۹' ۸۰)

''کسی بشر کو یہ حق نہیں کہ اللہ تو اُسے کتاب' حکمت اور نبوّت عطا کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہنے لگے کہ تم اللہ کے علاوہ میرے بندے بن جاؤ بلکہ (وہ تو یہی کہے گا) کہ اللہ والے بن جاؤ' (یہ) اس لئے (اور بھی) کہ تم کتابِ (آسمانی) پڑھاتے ہو اور خود بھی (اُسے) پڑھتے ہو۔ اور نہ وہ تمہیں اس کا حکم دے گا کہ تم فرشتوں اور پیغمبروں کو پروردگار قرار دو' کیا وہ تمہیں تمہارے اسلام لانے کے بعد کفر کا حکم دے گا!''

☆ توحید دو طرح کی ہے: ایک توحید شیطانی ہے یعنی شیطان سب سے بڑا موحد ہے کہ کائنات کا چپہ چپہ پھرا کر اُسے دکھا دیا گیا کہ پوری کائنات میں ربِّ جلیل کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں۔ موحد ہونے کے باوجود وہ راندۂ درگاہ اس لئے ہوا کہ ایمان بالرسول اور عظمتِ رسالت سے وہ نفور اور بیگانہ تھا۔ اور ایک توحیدِ رحمانی ہے جس میں اللہ کو وحدہٗ لاشریک ماننے کے ساتھ ساتھ ایمان بالرسول اور عظمت وتوقیرِ رسالت بھی بھرپور ہوتی ہے۔ ربِ تعالیٰ کو یہی توحیدِ رحمانی پسند ومقبول ہے۔

جیسا کہ بیان ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا مقصدِ وحید لوگوں کو ایک خدا کا ٹھوس اور مضبوط عقیدہ دینا تھا۔ قرآن حکیم سے اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں :

(۱) لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ '(الاعراف: ۵۹)
'' بیشک ہم نے نوح (علیہ السلام) کو اُن کی قوم کی طرف بھیجا' سو اُنہوں نے کہا: اے میری قوم (کے لوگو!) اللہ کی عبادت کیا کرو' اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔'' (۵۹ : ۷)

(۲) وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ '(الاعراف: ۶۵)
''اور ہم نے (قوم) عاد کی طرف اُن کے (قومی) بھائی ہود (علیہ السلام) کو بھیجا' سو اُنہوں نے کہا اے میری قوم (کے لوگو!) اللہ کی عبادت کیا کرو' اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔'' (۶۵ : ۷)

(۳) وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ '(الاعراف: ۷۳)
''اور ہم نے (قوم) ثمود کی طرف اُن کے (قومی) بھائی صالح (علیہ السلام) کو بھیجا' سو اُنہوں نے کہا: اے میری قوم (کے لوگو!) اللہ کی عبادت کیا کرو' اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔'' (۷۳: ۷)

(۴) وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ '(الاعراف: ۸۵)
''اور ہم نے مدین کی طرف اُن کے (قومی) بھائی شعیب (علیہ السلام) کو بھیجا' سو اُنہوں نے کہا: اے میری قوم (کے لوگو!) اللہ کی عبادت کیا کرو' اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔'' (۸۵: ۷)

جد الانبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اپنے باپ (یعنی چچا آزر سے جس نے آپ کے والد تارخ کے انتقال کے بعد آپ کو پالا تھا) سے کہا:

یٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ وَلَا یُغْنِیْ عَنْکَ شَیْئًاO یٰٓاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِکَ فَاتَّبِعْنِیْٓ اَھْدِکَ صِرَاطًا سَوِیًّاO یٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّیْطٰنَ اِنَّ الشَّیْطٰنَ کَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِیًّاO یٰٓاَبَتِ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یَّمَسَّکَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَکُوْنَ لِلشَّیْطٰنِ وَلِیًّاO
(مریم : ۴۲ تا ۴۵)

'' اے میرے باپ! آپ ایسی چیز کی پوجا کیوں کرتے ہیں جو نہ سنے نہ دیکھے اور نہ آپ کے کچھ کام آئے؟ اے ابّا! میرے پاس وہ علم آچکا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا' سو آپ میری پیروی کیجئے میں آپ کو سیدھا راستہ بتا دوں گا۔ اے ابّا! آپ شیطان کی پرستش نہ کیجئے' شیطان بے شک خدائے رحمٰن کا نافرمان ہے۔ اے ابّا! میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تمہیں (خدائے) رحمٰن کا عذاب پہنچے اور تم شیطان کے ساتھی بن جاؤ۔'' (۴۲۔۴۵ : ۱۹)

یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں رب کی توحید کا اعلان ان الفاظ میں کیا تھا:

لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ (الانبیاء : ۸۷)

''تیرے سوا کوئی معبود نہیں' تیری ذات (ہر عیب سے) پاک ہے۔'' (۲۱ : ۸۷)

عیسیٰ علیہ السلام روزِ قیامت ربِّ قدیر کے حضور عرض کناں ہوں گے :

مَا قُلۡتُ لَهُمۡ اِلَّا مَاۤ اَمَرۡتَنِىۡ بِهٖۤ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىۡ وَرَبَّكُمۡ (المائدۃ : ۱۱۷)

''میں نے انہیں سوائے اس کے کچھ نہیں کہا تھا جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ تم (صرف) اللہ کی عبادت کیا کرو جو میرا (بھی) رب ہے اور تمہارا (بھی) رب ہے۔'' (۵ : ۱۱۷)

اور توحید کے بارے میں ہمارے نبی محتشم ﷺ کو یوں خطاب ہوا :

فَاعۡلَمۡ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (محمد : ۱۹)

''پس جان لیجئے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ۔'' (۴۷ : ۱۹)

__اللہ تعالیٰ کے واحد لاشریک ہونے کے دلائل__ : بعض کفارِ عرب فرشتوں کی عبادت کرتے تھے۔ رب تعالیٰ نے سورہ الصّٰفّٰت کی ابتدائی آیات میں فرشتوں کی قسم کھا کر فرمایا کہ بیشک تمہاری عبادت کا مستحق ضرور ایک اللہ ہے یعنی جن کو تم اپنا معبود قرار دیتے ہو وہ تو خود اس کے شاہد ہیں کہ تمہاری عبادت کا مستحق صرف ایک ہی ہے اور وہ اللہ عزّ وجلّ ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ وہی آسمانوں اور زمینوں کا اور اُن کے درمیان کی تمام چیزوں کا رب ہے کیونکہ آسمانوں اور زمینوں کے نظام کا ایک نہج اور ایک طریقہ پر جاری اور باقی رہنا اس بات کی قوی دلیل ہے کہ اس نظام کا وضع کرنے والا بھی واحد ہے۔ اسی لئے فرمایا:

لَوۡ كَانَ فِيۡهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (الانبیاء : ۲۲)

''اگر ان دونوں (آسمان و زمین) میں اللہ کے سوا اور (بھی) معبود ہوتے تو یہ دونوں تباہ ہو چکے ہوتے۔'' (۲۱ : ۲۲)

سیدھی سی بات ہے کہ اگر ایک ملک کے دو فرمانروا ہوں جن کے اختیارات مساوی ہوں تو اُس ملک میں فتنہ وفساد کے شعلے بھڑکیں گے اور اُس کی رونقیں خاکِ سیاہ بن کر رہ جائیں گی۔ اگر ایک ہی لشکر کے دو جرنیل ہوں تو وہ فوج کسی میدان میں جم کر نہیں لڑ سکے گی۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی ملک میں کسی قوم نے اپنے دو ایسے حکمران مقرر کئے ہوں جو قوّت و طاقت اور اختیار میں مساوی حیثیت کے مالک ہوں۔ اور اگر ایسا ہو بھی تو اُن میں باہمی اختلاف کا پیدا ہونا لازمی ہے اور جب ایک خدا دوسرے خدا سے ٹکرائے گا تو کائنات کی دھجیاں اڑ جائیں گی اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ سب نے آپس میں مصالحت کر لی ہے اور باہمی اتفاق سے سارا نظام چل رہا ہے تو کیا حوادثِ عالم کے رُو پذیر ہونے میں سب کی قوّت صَرف ہو رہی ہے یا ایک کی؟ اگر ایک کی صَرف ہو رہی ہے تو دوسرے بیکار ہوں گے اور یہ بھی اچھے خدا ہوئے کہ طاقت تو ہے لیکن بخیل کی دولت کی طرح بیکار و بے مصرف ہیں۔ اور اگر سب کی قوّت و ارادہ سے ہر کام انجام پا رہا ہے تو پھر دریافت طلب امر یہ ہوگا کہ

سب علیحدہ علیحدہ اس کام کو کر سکتے ہیں یا نہیں ؟ اگر نہیں کر سکتے تو عاجز ونا تواں ہوئے جو شانِ خداوندی کے خلاف ہے اور اگر ہر ایک کر سکتا ہے اور پھر سب مل کر کرتے ہیں تو یہ بھی قوت وارادہ کی بے جا نمائش اور ضیاع ہے جو حماقت کی دلیل ہے۔ علامہ اسمٰعیل حقی نے کیا خوب لکھا ہے کہ اگر ایک بدن میں دو روح اور ایک نظامِ شمسی میں دوسرا آفتاب نہیں سما سکتا تو اس جہانِ بالا و پست میں بھی اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کے علاوہ اور کوئی دوسرا خدا نہیں سما سکتا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ چونکہ آسمان و زمین تباہ نہیں ہوئے بلکہ ان دونوں کا نظام ہزار ہا برس سے بڑے توافق اور ہم آہنگی سے چل رہا ہے اس لئے معلوم ہوا کہ کئی معبود نہیں ہیں بلکہ ایک ہی معبود ہے۔

جب فرعونِ مصر نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ تم دونوں کا رب کون ہے؟ تو موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں ایک فقرہ کہا اور کوزے میں دریا بند کر کے رکھ دیا۔ فرمایا:

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی O (طٰهٰ : ۵۰)

یعنی میرا پروردگار وہ ہے جس نے کائنات کی ہر چیز کو اس طرح پیدا کیا کہ وہ اپنا وظیفہِ حیات اور مقصدِ تخلیق بہ حسن وخوبی ادا کر سکے، پھر اُسے اتنی سمجھ بوجھ بھی عطا فرما دی کہ وہ صحیح طور پر ان قوتوں سے کام لے سکے۔ پرندوں کو پر بخشے اور پھر انہیں اُڑنے کا سلیقہ بھی خود ہی سکھا دیا۔ مچھلی کو ایسا جسم دیا کہ وہ گہرے دریاؤں اور طوفانی سمندروں میں تیر سکے اور ساتھ ہی اُسے تیرنے کا ڈھنگ بھی بتا دیا۔ گوشت خور درندوں کے پنجے اور دانت ایسے بنائے کہ وہ اپنا شکار پکڑ سکیں۔ حضرتِ انسان کے کچھ دانت نوکیلے اور کچھ چپٹے بنائے تا کہ وہ اُن سے چبانے اور پیسنے کا کام لے سکے۔ اونٹ کی قامت کو بلند کیا تو اُس کی گردن بھی لمبی بنا دی تا کہ اونچے درختوں کے پتے بھی کھا سکے اور نیچے زمین سے گردن جھکا کر پانی پی سکے اور چارہ اٹھا سکے۔ صحراؤں میں جہاں پانی کی سطح بہت نیچی ہوتی ہے وہاں جو درخت اگائے اُن کی جڑیں اتنی لمبی بنا دیں کہ وہ زمین کی تہ سے اپنی خوراک حاصل کر سکیں۔ ہر خطہِ زمین میں پیدا ہونے والے حیوانات کو وہاں کے مخصوص موسمی تقاضوں کے مطابق لباس بھی دیا اور رزق بھی۔ شہد کی مکھی اپنا مسدس گھر بناتی ہے جو نہایت باریک خانوں پر حکمت اور تدبیر کے ساتھ بنا ہوا ہوتا ہے جیسے کسی ماہر انجنیئر نے اُسے بنایا ہے۔ چیونٹی گرمیوں میں سردیوں کے لئے خوراک کا ذخیرہ کر لیتی ہے۔ اِن ننھے منے جانوروں کو ایسی حکمت اور دانائی کی باتیں کس نے سکھائی ہیں۔ تمام دنیا کے ہر قسم کے جانوروں کو دیکھئے۔ زمین پر رینگنے والے کیڑوں کو، درندوں اور چرندوں کو، فضا میں اُڑنے والے پرندوں کو اور پانی کے جانوروں کو ان سب کو اپنی اپنی زندگی گزارنے کے طریقوں کی فطری ہدایت کس نے دی؟ کیا اللہ کے سوا کوئی اور ہے جس نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ اُس نے تمام جانداروں کے اندر اپنی زندگی گزارنے اور اپنی ضروریات کو پورا کرنے کی ہدایت رکھی ہے؟ ہم اُس سے اُس کے دلائل پوچھنے کی بات تو بعد میں کریں گے پہلے یہ تو معلوم ہو کہ وہ کون ہے جس کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ تمام جانداروں کو فطری ہدایت دیتا ہے اور جب کسی کا یہ دعویٰ نہیں ہے تو مان لیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہی واحد لاشریک ہے جو سب کو پیدا کرنے والا ہے اور انہیں اُن کی معیشت کی ہدایت دینے والا ہے۔ پھر اس گلشنِ ہستی کے گلِ سرسبد اور بزمِ حیات کے صدر نشین حضرت انسان کی ظاہری ساخت ☆ اور باطنی صلاحیتوں پر نگاہ ڈالئے تو آپ کو جناب موسیٰ علیہ السلام کے ارشاد کی عظمت کا یقین ہو جائے گا۔ (☆ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں جلد اوّل کے صفحات ۳۲۴، ۳۴۰ تا ۳۵۲)

۴۴۸۰ (توحید۔۔۔Monotheism)

علامہ زمخشری اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ' کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ہر چیز کو ایسی شکل و صورت بخشی جو اُن فوائد اور منافع کے لئے موزوں و مناسب ہے جن کے لئے اُس کی تخلیق ہوئی۔ اور ثُمَّ ھَدٰی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اُنہیں یہ بھی سکھا دیا کہ وہ ان اعضاء اور قوتوں سے کس طرح کام لے اور ان منفعتوں تک کیسے رسائی حاصل کرے۔ (الکشاف)

اپنی وحدہ' لاشریک لہٗ ذات کو منوانے کے لئے ایک مقام پر ارشاد ہوا:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّھَا مِمَّا تُنۡبِتُ الۡاَرۡضُ (یٰسٓ : ۳۶)

''(ہر عیب سے) پاک ہے وہ ذات جس نے تمام مقابل قسموں کو پیدا کیا زمین کے قبیل سے۔''

اس آیت کی وضاحت میں ترکی کے شہرہ آفاق سکالر ہارون یحیٰ لکھتے ہیں:

''اگر اناج کے پھولوں کا زیرہ سیب کے درخت میں لگایا جائے تو درخت سیب پیدا نہیں کرے گا۔ اس موقع پر رک جانا اور اُس کی غیر معمولی فطرت پر غور کرنا مفید ہوگا۔ پودے کی ایک ہی نوع کا پھول اُس زیرے کو پہچانتا ہے جو اُسی نوع کے پھول سے لیا گیا ہو۔ اگر تو زیرہ اُس کی اپنی نوع سے ہے تو تولیدی عمل شروع ہو جائے گا وگرنہ تولیدی عمل رک جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ مادہ پھول کے سٹگما کو اپنے اور غیر زیرہ میں فرق کیسے معلوم ہوا اور اُسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ خارجی زیرہ کی صورت میں اُسے اپنی میکانیت بروئے کار نہیں لانی۔ کوئی شک نہیں کہ اُس عقلِ کُل نے جو پودے کے ہر جزء کو کنٹرول کر رہی ہے' پھول میں اس میکانیت کو ایسے نازک اور نفیس ترین طریق پر وضع کیا ہے کہ نسل در نسل انواع کا تسلسل برقرار رہے۔'' ("The Miracle of Creation in Plants"... Harun Yahya, p. 60)

کسی نے حضرت علی کرّم اللہ وجہہ' سے کہا کہ موجدِ شطرنج کا کمال تو دیکھئے کہ اُس نے ایک مربع فٹ کے تختے میں 64 خانے بنا دئے اور اگر اِن خانوں میں لاکھ مرتبہ بھی شطرنج کھیلی جائے تو ہر مرتبہ چال مختلف ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خالق کا کمال تو دیکھو کہ اُس نے بالشت بھر چہرہ میں پانچ سوراخ کئے: دو آنکھوں کے' دو ناک کے اور ایک منہ کا مگر اُس پر کروڑوں نقشے کھینچ دئے۔ اُن میں کوئی دوسرے سے نہیں ملتا۔ اور چہرہ تو بہت دُور کی بات ہے' انسان کے ہاتھ میں دو ڈھائی انچ کا انگوٹھا ہوتا ہے اور کسی انگوٹھے کی لکیریں دوسرے سے نہیں ملتیں بلکہ ایک ہی انسان کے دائیں انگوٹھے کی لکیریں بائیں انگوٹھے کی لکیروں سے نہیں ملتیں۔

حضرت علی کرّم اللہ وجہہ' نے فرمایا کہ پاک ہے وہ ذات جس نے چربی کی ایک بوٹی سے دِکھایا' نرم ہڈی سے سُنوایا اور گوشت کے ایک ٹکڑے کو گویا (بولنے والا) کر دیا۔ جو لوگ انسان کو محض ایک اتفاقی حادثہ سمجھتے

ہیں' وہ اس بات کی کیا توجیہ کریں گے کہ انسان کے جسم میں ہر جگہ گوشت ہے' پھر بولنے کا خاصہ صرف زبان میں کیوں ہے اور کیوں ضروری ہے کہ دیکھنے کے لئے صرف آنکھیں مخصوص ہیں۔ جسم کے کسی اور حصے کی چربی بینائی کا آلہ کیوں نہیں بن جاتی؟ اس لئے اگر کوئی شخص محض ہٹ دھرمی پر نہیں اتر آیا تو اُسے اقرار کرنا پڑے گا کہ انسان کی تخلیق نہ کوئی اتفاقی حادثہ ہے اور نہ کسی فطری ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے بلکہ وہ مکمل طور پر اُس خلاقِ واحد کی قدرت وحکمت کا حسین و بے مثال شاہکار ہے۔

جب ایک عورت ماں بن جاتی ہے اور اُس کی گود میں بچہ کھیلنے لگتا ہے تو اُس کے سینے سے دودھ اتر آتا ہے۔ جو غذا وہ پہلے کھاتی تھی اب بھی وہی غذا کھاتی ہے۔ نہ غذا میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے اور نہ کھانے والی میں کوئی تبدیلی ہوئی۔ پھر یہ دودھ کہاں سے آ گیا؟ اگر تو یہ غذا کا اثر تھا تو کسی اور شخص کے کھانے سے اُس کے سینے میں دودھ کیوں نہیں اترتا اور اگر اُس عورت کی خاصیت ہے تو بچے کی پیدائش سے پہلے اُس کے سینے سے دودھ کیوں نہیں نکلا؟ معلوم ہوا کہ اثر نہ غذا کا ہے اور نہ غذا کھانے والی کا۔ یہ اُس قادرِ مطلق کی کارفرمائی ہے جو رنگ برنگ ترکاریوں کو خون کی رنگت دیتا ہے اور جب چاہتا ہے اُس خون کو دودھ کی سفید دھاریوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ پھر ہمارے پاس کوئی ایسا خارجی عمل نہیں جس کے ذریعے ہم ماں کے سینے سے جاری ہونے والے دودھ کو روک سکیں۔ مبدأ فیاض کے نزدیک جب تک بچے کو دودھ کی ضرورت ہوتی ہے' وہ ماں کے سینہ میں دودھ اتارتا رہتا ہے اور جب ضرورت ختم ہوتی ہے تو دودھ کے جاری ہونے کا یہ سلسلہ اپنے آپ ختم ہو جاتا ہے۔ پھر ایک اور توجہ طلب اور اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ بچے کے پیدا ہونے پر ماں کا دودھ انتہائی پتلا اور زود ہضم ہوتا ہے کیونکہ اُس وقت بچے کا معدہ اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ گاڑھے دودھ کو ہضم کر سکے۔ اب جوں جوں بچہ عمر میں بڑھتا ہے' اُسی تناسب سے رفتہ رفتہ دودھ بھی گاڑھا ہونا شروع ہو جاتا ہے کیونکہ معدہ اب اُس گاڑھے اور کثیف دودھ کو ہضم کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ کیا انسان کے جسمانی نظام میں اللہ کی ذات اور اُس کی حکمت وقدرت کی یہ بہترین نشانیاں نہیں ہیں؟

پانی ہر جاندار کی بنیادی ضرورت ہے جس کے بغیر زندہ رہنا ناممکن ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ کیا پہاڑوں کی چوٹیوں سے برفانی گھاٹیوں تک برف گرنے کا انتظام اور بادلوں کے ذریعے پانی کی بہم رسانی کا نظام یونہی خود بخود وجود میں آ گیا ہے؟ جب کارپوریشن کا ایک نل بھی مستری اور چند مزدوروں کے بغیر نہیں لگ سکتا تو پانی کی اس قدر عظیم الشان ترسیل کا انتظام کسی منتظم کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ پھر یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہے کہ کارپوریشن جو ایک محلّہ کو ٹیکس لے کر پانی فراہم کرے' اُس کی نظامت کو تو ہم تسلیم کر لیں اور جو ساری دنیا کو بغیر کسی ٹیکس کے پانی مہیا کر رہا ہے' اُس کے نظام اور اُس کی قدرت کا ہم انکار کر دیں۔ جبھی تو وہ فرماتا ہے:

أَفَرَأَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِىْ تَشْرَبُوْنَ ۞ ءَ أَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۞ لَوْنَشَآءُ جَعَلْنٰهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۞ (الواقعة : ۶۸ تا ۷۰)

۴۴۸۲ (توحید۔۔۔Monotheism)

"اچھا پھر یہ بتاؤ کہ جس پانی کو تم پیتے ہو' اُسے بادل سے تم برساتے ہو یا اُس کے برسانے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اُسے کڑوا کر ڈالیں تو تم شکر کیوں نہیں کرتے؟ (۶۸ تا ۷۰ : ۵۶)

توحید کے مراتب : توحید کے کئی مراتب ہیں : توحید الافعال' توحید الصفات اور توحید الذات۔

(۱) توحید الافعال کی طرف اشارہ اس آیت میں ہے :
وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ O (ابراھیم : ۱۲)
''اور توکل کرنے والوں کو اللہ پر ہی توکل کرنا چاہیے۔'' (۱۲ : ۱۴)

توکل توحید الافعال کا نتیجہ ہے کیونکہ توکل کا معنیٰ ہے : اپنے تمام معاملات کو اپنے مالک کے سپرد کر دینا اور پھر اُسی پر اعتماد کرنا۔

(۲) توحید الصفات کی طرف اشارہ اِس آیت میں ہے :
يَا اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ O ارْجِعِىْ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً O (اَلفجر: ۲۷' ۲۸)
''اے نفسِ مطمئنہ! اپنے رب کی طرف اس حال میں لوٹ جا کہ تو اُس سے راضی ہو' وہ تجھ سے راضی ہو۔'' (۲۷' ۲۸ : ۸۹)

کیونکہ انسان جب اللہ تعالیٰ کی صفتِ ارادہ اور صفتِ قضا و قدر پر راضی ہوتا ہے تو اُس پر جو مصائب و آلام آتی ہیں وہ اُن کی شکایت نہیں کرتا اور وہ صرف یہ سوچ کر خوش اور راضی رہتا ہے کہ اُس کے مالک اور مولیٰ کی طرف سے اُس پر جو حال بھی طاری کیا جائے وہ اُس کا کرم و لطف ہے اور تقدیر کے نافذ ہونے سے وہ مطمئن ہوتا ہے اور یہ مرتبہ توحید الصفات کا ثمرہ ہے۔

(۳) توحید الذات کی طرف اشارہ اِن آیات میں ہے :
(i) كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ '' اِلَّا وَجْهَهٗ ' (اَلقَصَص : ۸۸)
''اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔'' (۸۸ : ۲۸)
(ii) كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ O وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ (اَلرَّحمٰن: ۲۶' ۲۷)
''زمین پر جو بھی ہیں سب فنا ہونے والے ہیں' صرف آپ کے رب کی ذات باقی رہے گی جو جلال و اکرام والی ہے۔'' (۲۶' ۲۷: ۵۵)

رب تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں توحید کے اِن تینوں مراتب پر ایمان عطا فرمائے! (تبیان' ج ۱۰: ۶-۸)

BIBLIOGRAPHY (Volume – 9)

1. Abinash, Chandra Datta — Rigvedic India.
2. Afzal-ur-Rahman — Quranic Sciences.
3. Andrae, Tor — Muhammad the man and his Faith.
4. Arberry, A. J. — Revelation and Reason in Islam.
5. Armstrong, Karen — Muhammad -- A Biography of the Prophet.
6. Asad, Muhammad — Islam on the Crossroads.
7. Asad, Muhammad — The Message of the Quran.
8. Badr Azimabadi — The Prophetic Way of Treatment.
9. Bashir Mahmood, Sultan — Doomsday and Life after Death.
10. Baynes, Herbert — The Way of Buddha.
11. Bell, Richard — Introduction to the Qur'an.
12. Bhattacharya — Foundations of Living Faith.
13. Bosworth Smith — Muhammad and Muhammadanism.
14. Carus — The Gospel of Buddha.
15. Cobbold, Lady — Pilgrimage to Mecca.
16. Coulson — A History of Islamic Law.
17. Davenport, John — The Message of the Qur;an.
18. Dharampal, A. — The Life and Teachings of Buddha.
19. Draper — Conflict between Religion and Science.
20. Draper — Intellectual Development of Europe.
21. Edith — The Story of Mohammad (ﷺ)
22. Edkins, Joseph — Chinese Buddhism.
23. Galwish, A — The Religion of Islam.
24. Getty — Gods of Northern Buddhism.
25. Gibbon, Edward — The Decline and Fall of the Roman Empire.
26. Gilman — The Saracens.
27. Goldziher — Muhammadanische Studien
28. Grant, G. M. — Religions of the World.
29. Hammerton — Universal History of the World.
30. Harun Yahya — Miracles in our Bodies.
31. Harun Yahya — The Basic Concepts in the Qur'an.
32. Harun Yahya — The Miracle of Creation in Plants.
33. Hitti, P. K. — History of the Arabs.
34. Hogarth — Arabia.
35. Hutton Webster — Medieval and Modern History.
36. Irving, Washington — Mohammad and his Successors.
37. Jurji, Edward J. — The Great Religions of the World.
38. Khalifa, Mohammad — The Sublime Qura'n and Orientalism.
39. Lammens, H. — Islam-- Beliefs and Institutions.
40. Lane and Lane-Poole — Selections from the Qur'an.
41. Liaquat Ali Khan Niyazee — Islamic Law of Tort.
42. Lings, Martin — Mohammad -- His Life based on Earliest Sources.

43. Menezes, F. J. L. — The Life and Religion of Mohammad .... the Prophet of Arabian Sands.
44. Monier, Williams — Buddhism.
45. Muir, William, Sir — The Life of Mahomet.
46. Muller, Max — Chips from a Germnan Workshop.
47. Musleh-ud-Din, Dr. — Economics and Islam.
48. Najmee, Abul Hasan, Syed — Islamic Legal Theory and the Orientalists.
49. Narasu, L. — Essence of Buddhism.
50. Noldeke, Theodre — Geschichte des Qurans.
51. Nurbaki, Haluk, Dr. — The Holy Quran and the Facts of Science.
52. Palmer — The Qur'an --- Introduction.
53. Pickthall — Islamic Culture.
54. Rawlinson — Moses : His Life and Times.
55. Rodwell — Preface to the Qur'an.
56. Sale, George — Preliminary Discourse to the Translation of the Qur'an.
57. Scott — History of Prostitution.
58. Scott — Sex-life of Man and Woman.
59. Stanley Lane-Poole — The Speeches and Table-talk of the Prophet Mohammad (ﷺ).
60. Stobart, J. W. — Islam and Its Founder.
61. Tahir-ul-Qadri, Prof., Dr. — Greetings & Salutations on the Holy Prophet
62. Tahir-ul-Qadri, Prof., Dr. — Islamic Concept of Intermediation.
63. Tanzil-ur-Rahman — The Relationship between Qur'an and Sunnah.
64. Taqi Usmani, Mohammad — An Approach to the Qur'anic Sciences.
65. Thomson, J. A. — Science of Life.
66. Vidyarathi, A. H. — Muhammad in Parsi, Hindoo & Buddhist Scriptures.
67. Wahid-ud-Din — Religion and Science.
68. Wensinck — An Introduction to the Study of Anglo-Mohammadan Law.
69. Wensinck — Muslim Creed.
70. Yusuf Abbas Hashimi, Dr. — Muhammad ﷺ --- the Ummi Nabi.
71. Zhongjia Yuan — Meteorology.

ENCYCLOPAEDIAS

1. Encyclopedia Americana.
2. Encyclopaedia Britannica.
3. Encyclopedia of the Qura'n (Leiden)
4. Houtsma and Wensinck's Encyclopaedia of Islam.
5. Cheyne and Black's Encyclopedia Biblica.
6. Shorter Encyclopaedia of Islam.
7. New Caxton Encyclopaedia.
8. MacGraw Hill Encyclopaedia of Science and Technology.

کتب لغت

(۱) المفردات القرآن : علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی (م ۵۰۲ھ)؛ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ
(۲) لسان العرب: علامہ جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور افریقی (م ۷۱۱ھ)' مطبوعہ نشر الادب' ایران۔
(۳) القاموس المحیط : علامہ مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی (م ۸۱۷ھ)' مطبوعہ بیروت۔
(۴) الصحاح : علامہ ابونصر اسمٰعیل بن حماد الجوھری (م ۱۰۰۵ھ)' دار العلم للملایین' بیروت ۱۳۷۶ھ۔
(۵) تاج العروس: علامہ سیّد محمد مرتضیٰ زبیدی حنفی (م ۱۲۰۵ھ)' مطبوعہ المطبعۃ الخیریۃ' مصر۔
(۶) المنجد : لوئیس معلوف الیسوعی (م ۱۸۶۷ء)' مطبوعہ المطبعۃ الکاثولیکہ' بیروت ۱۹۲۷ء۔
(۷) التعریفات : جرجانی
(8) E.W. Lane's Arabic-English Lexicon.
(9)Dictionary of English Terms and Literary Theory... J.A. Cuddon.
(10)Pali Dictionary ... William Steade.
(11)English-Arabic Dictionary (Badger)

ARTICLES/LECTURES

(1) "Miracles" in the Encyclopaedia Britannica.
(2) "Muhammad's Historical Role" by Charles Issawi, in the "Muslim Woird" : April, 1950.
(3) Lectures of Raja Mohan Roy.

کتب تفسیر

(۱) جامع البیان : امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری (م ۳۱۱ھ)' دار المعرفۃ بیروت ۱۴۰۹ھ۔
(۲) النکت والعیون: علامہ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب ماوردی (م ۴۵۰ھ)' مطبوعہ بیروت۔
(۳) الکشاف : علامہ جاراللہ محمود بن عمر زمخشری (م ۴۶۷ھ)' مطبوعہ نشر البلاغۃ' قم ایران۔
(۴) معالم التنزیل : امام ابومحمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی (م ۵۱۶ھ)' مطبوعہ بیروت ۱۴۱۴ھ۔
(۵) مجمع البیان : شیخ ابوعلی فضل بن حسن طبرسی (م ۵۴۸ھ)' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۴۰۶ھ
(۶) زادالمسیر فی علم التفسیر: علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی بن محمد جوزی (م ۵۹۷ھ)' بیروت
(۷) تفسیر کبیر: امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی (م ۶۰۶ھ)' مطبوعہ دار الفکر' بیروت ۱۳۹۸ھ

(۸) تفسیر القرآن الکریم: علامہ محی الدین ابن عربی (م ۶۳۸ ھ)' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران۔
(۹) الجامع لاحکام القرآن: علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی (م ۶۶۸ ھ) انتشارات ناصر خسرو' ایران۔
(۱۰) انوار التنزیل: قاضی ابوالخیر عبداللہ بن عمر بیضاوی شیرازی شافعی (م ۶۸۵ ھ)' مطبوعہ مصر۔
(۱۱) مدارک التنزیل: علامہ ابوالبرکات عبداللہ بن محمد نسفی (م ۷۱۰ ھ)' مطبوعہ دار الکتب پشاور۔
(۱۲) تفسیر نیشاپوری: علامہ نظام الدین حسین بن محمد قمی (م ۷۲۸ ھ)' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۶ ھ۔
(۱۳) البحر المحیط: علامہ ابوالحیان محمد بن یوسف اندلسی (م ۷۵۴ ھ)' مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۲ ھ۔
(۱۴) تفسیر القرآن: حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر شافعی (م ۷۷۴ ھ)' مطبوعہ ادارہ اندلس بیروت ۱۳۸۵
(۱۵) الدرّ المنثور: حافظ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ ھ)' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ' ایران۔
(۱۶) جلالین: حافظ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ ھ)' مطبوعہ قدیمی کتب خانہ' کراچی۔
(۱۷) حاشیہ شیخ زادہ علی البیضاوی: علامہ محی الدین محمد بن مصطفیٰ قوجوی (م ۹۵۱ ھ)' بیروت ۱۴۱۸ ھ۔
(۱۸) عنایۃ القاضی: علامہ احمد شہاب الدین خفاجی مصری حنفی (م ۱۰۶۹ ھ)' مطبوعہ دار صادر' بیروت۔
(۱۹) التفسیرات الاحمدیہ: علامہ احمد جیون جونپوری (م ۱۱۳۰ ھ)' مطبع کریمی' بمبئی (انڈیا)
(۲۰) روح البیان: علامہ اسماعیل حقی حنفی (۱۱۳۷ ھ)' مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ' کوئٹہ۔
(۲۱) حاشیۃ القونوی علی البیضاوی: علامہ عصام الدین اسماعیل بن محمد حنفی (م ۱۱۹۵ ھ)' مطبوعہ بیروت۔
(۲۲) تفسیر مظہری: قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۲۲۵ ھ)' مطبوعہ بلوچستان بک ڈپو' کوئٹہ۔
(۲۳) فتح القدیر: شیخ محمد بن علی شوکانی (م ۱۲۵۰ ھ)' مطبوعہ دار الوفا بیروت' ۱۴۱۸ ھ)
(۲۴) روح المعانی: علامہ ابوالفضل سیّد محمود آلوسی (م ۱۲۷۰ ھ)' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت۔
(۲۵) تفسیر المنار: علامہ محمد رشید رضا (م ۱۳۵۴ ھ)' مطبوعہ دار المعرفہ بیروت۔
(۲۶) الجواہر فی تفسیر القرآن: علامہ حکیم شیخ طنطاوی جوہری مصری (م ۱۳۵۹ ھ) المکتبۃ الاسلامیہ ریاض
(۲۷) خزائن العرفان: سیّد محمد نعیم الدین مرادآبادی (م ۱۳۶۷ ھ)' مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور۔
(۲۸) نور العرفان: مفتی احمد یار خاں نعیمی (م ۱۳۹۱ ھ)' مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ' گجرات (پنجاب پاکستان)
ایضاً : صاحبزادہ مفتی اقتدار احمد خان نعیمی (گجرات)
(۲۹) معارف القرآن: مفتی محمد شفیع (م ۱۳۹۶ ھ)' مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی ۱۳۹۷ ھ۔
(۳۰) تفہیم القرآن: سیّد ابوالاعلیٰ مودودی (م ۱۳۹۹ ھ)' مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن' لاہور۔
(۳۱) التبیان: علامہ سیّد احمد سعید کاظمی (م ۱۴۰۶ ھ)' مطبوعہ کاظمی پبلیکیشنز' ملتان۔
(۳۲) ضیاء القرآن: جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری' مطبوعہ ضیاء القرآن پبلیکیشنز' لاہور۔
(۳۳) تبیان القرآن: علامہ غلام رسول سعیدی' مطبوعہ فرید بک سٹال' اردو بازار لاہور۔
(۳۴) عرفان القرآن: پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری۔
(۳۵) تفسیر ماجدی (اردو) عبدالماجد دریاآبادی

(36) Commentary on the Quran... Abdullah Yusuf Ali

کتب علوم قرآن

(۱) الاتقان فی علوم القرآن : علامہ جلال الدین سیوطی (م۹۱۱ھ)' مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور۔
(۲) علوم القرآن : محمد تقی عثمانی۔

کتب حدیث

(۱) مؤطا امام مالک : امام مالک بن انس اصبحی (م۱۷۹ھ)' مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۰۹ھ
(۲) مسند طیالسی : امام سلیمان بن داؤد بن جارود طیالسی (م۲۰۳ھ)' ادارۃ القرآن کراچی' ۱۳۹۱ھ۔
(۳) المصنف عبدالرزاق : امام عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی (م۲۱۱ھ)' مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت۔
(۴) مسند ابن ابی شیبہ : امام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ (م۲۳۵ھ)' مطبوعہ دار الوطن' بیروت' ۱۴۱۸
(۵) مسند امام احمد بن حنبل : امام احمد بن حنبل (م۲۴۱ھ)' مطبوعہ دار الفکر' بیروت ۱۴۱۵ھ۔
(۶) سنن دارمی : امام ابوعبداللہ بن عبدالرحمان دارمی (م۲۵۵ھ)' مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت۔
(۷) صحیح بخاری : امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری (م۲۵۶ھ)' مطبوعہ بیروت۔
(۸) صحیح مسلم : امام ابوالحسین مسلم بن حجاج قشیری (م۲۶۱ھ)' دار الکتب العلمیہ' بیروت۔
(۹) سنن ابن ماجہ : امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ (م۲۷۳ھ)' دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ
(۱۰) سنن ابوداؤد : امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی (م۲۷۵ھ)' مطبوعہ بیروت ۱۴۱۵ھ
(۱۱) سنن ترمذی : امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی (م ۲۷۹ھ)' مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۴ھ۔
(۱۲) سنن دارقطنی : امام علی بن محمد دارقطنی (م۲۸۵ھ)' مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان' ۱۴۱۷ھ۔
(۱۳) سنن نسائی : امام ابوعبدالرحمان احمد بن شعیب نسائی (م ۳۰۳ھ)' مطبوعہ مؤسسۃ القرآن' بیروت۔
(۱۴) سنن کبریٰ : امام ابوعبدالرحمان احمد بن شعیب نسائی (م ۳۰۳ھ)' دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۱ھ۔
(۱۵) مسند ابویعلیٰ : امام احمد بن علی المثنیٰ التیمی (۳۰۷ھ)' مطبوعہ دار المامون التراث بیروت' ۱۴۰۴ھ۔
(۱۶) صحیح ابن حبان : امام ابوحاتم محمد بن حبان البستی (م ۳۵۴ھ)' مطبوعہ مؤسسۃ الرسالۃ بیروت ۱۴۰۷ھ۔
(۱۷) صحیح ابن خزیمہ : امام محمد بن اسحاق بن خزیمہ (م۳۱۱ھ)' مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت' ۱۳۹۵ھ۔
(۱۸) مسند ابوعوانہ : امام ابوعوانہ یعقوب بن اسحاق (م۳۱۶ھ)' مطبوعہ دار الباز' مکہ مکرمہ۔
(۱۹) شرح معانی الآثار : امام ابوجعفر احمد بن محمد الطحاوی (م۳۲۱ھ)' مطبوعہ مطبع مجتبائی' لاہور پاکستان' ۱۴۰۴

(۲۰) مشکل الآثار: امام ابو جعفر احمد بن محمد الطحاوی (م ۳۲۱ھ)، مطبوعہ بیروت۔
(۲۱) المعجم الاوسط: امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی (م ۳۶۰ھ)، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت ۱۴۰۹ھ۔
(۲۲) المستدرک: امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری (م ۴۰۵ھ)، مطبوعہ دارالباز، مکہ مکرمہ۔
(۲۳) حلیۃ الاولیاء: امام ابونعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی (م ۴۳۰ھ)، مطبوعہ دارالکتب العلمیۃ بیروت۔
(۲۴) شعب الایمان: امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی (م ۴۵۸ھ)، مطبوعہ نشر السنۃ، ملتان۔
(۲۵) دلائل النبوۃ: امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی (م ۴۵۸ھ)، مطبوعہ دارالکتب العلمیۃ بیروت، ۱۴۲۳ھ
(۲۶) شرح السنۃ: امام حسین بن مسعود بغوی (م ۵۱۶ھ)، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۲ھ۔
(۲۷) الاحادیث المختارۃ: امام ضیاء الدین محمد بن عبدالواحد مقدسی حنبلی (م ۶۴۳ھ)، مطبوعہ مکہ مکرمہ ۱۴۱۰
(۲۸) الترغیب والترہیب: امام زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی المنذری (م ۶۵۶ھ)، قاہرہ ۱۴۰۷ھ۔
(۲۹) مشکوٰۃ: امام ولی الدین تبریزی (م ۷۴۲ھ)، مطبوعہ اصح المطابع، دہلی (انڈیا)۔
(۳۰) الخصائص الکبریٰ: حافظ جلال الدین السیوطی (م ۹۱۱ھ)، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۵۔
(۳۱) کنز العمال: علامہ علی متقی بن حسام الدین ہندی برہان پوری (م ۹۷۵ھ)، مطبوعہ بیروت ۱۴۰۵ھ۔

کتب شروح حدیث

(۱) اِکمال المعلم بہ فوائد مسلم: قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی (م ۵۴۴ھ)، مطبوعہ دارالوفاء، بیروت ۱۴۱۹ھ۔
(۲) اربعین: علامہ ابوزکریا یحییٰ بن شرف نووی (م ۶۷۶ھ)، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی، ۱۳۷۵ھ۔
(۳) ریاض الصالحین: علامہ ابوزکریا یحییٰ بن شرف نووی (م ۶۷۶ھ)، مطبوعہ دارالسلام، ریاض۔
(۴) فتح الباری: حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ)، دارالکتب الاسلامیہ لاہور، ۱۴۰۱ھ۔
(۵) عمدۃ القاری فی شرح البخاری: حافظ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی (م ۸۵۵ھ)، دارالطباعۃ المنیریۃ مصر
(۶) شرح الطیبی: علامہ شرف الدین حسین بن محمد الطیبی (م ۷۴۳ھ)، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی، ۱۴۱۳ھ۔
(۷) مجمع الزوائد: حافظ نورالدین علی بن ابی بکر الہیثمی (م ۸۰۷)، دارالکتاب العربی بیروت، ۱۴۰۲ھ۔
(۸) المطالب العالیۃ: حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ)، مطبوعہ مکتبہ دارالباز مکہ مکرمہ
(۹) کشف اللبس عن حدیث الشمس: حافظ جلال الدین السیوطی (م ۹۱۱ھ)، مطبوعہ دارالوفاء، بیروت۔
(۱۰) فیض القدیر: علامہ عبدالرؤف مناوی شافعی (۱۰۰۳ھ)، مطبوعہ دارالمعرفہ بیروت ۱۳۹۱ھ۔
(۱۱) مرقاۃ: علامہ علی بن سلطان محمد القاری (م ۱۰۱۴ھ)، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ، ملتان، ۱۳۹۰۔ مکتبہ حقانیہ پشاور۔
(۱۲) فیض الباری: شیخ انور شاہ کشمیری (م ۱۳۵۲ھ) مطبوعہ مطبع حجازی مصر ۱۳۷۵ھ۔

کتب فقہ

(۱) ہدایۃ اوّلین و آخرین: علامہ ابوالحسن علی بن ابی بکر مرغینانی (م ۵۹۳ھ)، مطبوعہ شرکتِ علمیہ ملتان

(۲) الدرّ المختار: علامہ علاء الدین محمد بن علی بن محمد حصکفی (م ۱۰۸۸ھ)' دار احیاء التراث العربی بیروت۔
(۳) فتاویٰ عالمگیری: ملّا نظام الدین (م ۱۱۶۱ھ) مطبوعہ مطبعہ کبریٰ امیریہ بولاق مصر ۱۳۱۰ھ۔
(۴) إحیاء علوم الدین: امام محمد بن محمد غزالی (م ۵۰۵ھ) مطبوعہ دار الخیر بیروت' ۱۴۱۳ھ۔

کتب عقائد وکلام

(۱) المنقذ من الضلال: امام محمد بن محمد غزالی (۵۰۵ھ)' مطبوعہ لاہور' ۱۴۰۵ھ۔
(۲) شرح عقائد نسفی: علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی (م ۷۹۱ھ)' نور محمد اصح المطابع' کراچی۔

کتب سیرت وفضائل وتاریخ

(۱) السیرۃ النبویہ: امام عبدالملک بن ہشام (م ۲۱۳ھ)' مطبوعہ مکتبہ فاروقیہ' ملتان۔
(۲) الطبقات الکبریٰ: امام محمد بن سعد (م ۲۳۰ھ)' مطبوعہ دار صادر بیروت ۱۳۸۸ھ۔
(۳) الشفاء: قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی (م ۵۴۴ھ)' مطبوعہ عبدالتواب اکیڈمی ملتان' ۱۴۱۵ھ۔
(۴) اسد الغابہ: علامہ ابوالحسن علی بن ابی الکرم الشیبانی (م ۶۳۰ھ)' مطبوعہ دار الفکر' بیروت۔
(۵) شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام: علامہ علی بن عبدالکافی تقی الدین سبکی (م ۷۴۶ھ) مطبوعہ کراچی
(۶) البدایہ والنہایہ: حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر شافعی (م ۷۷۴ھ) مطبوعہ دار الفکر بیروت۔
(۷) الاصابۃ: حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ)' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت۔
(۸) وفاء الوفاء: علامہ نور الدین علی بن احمد سمہودی (م ۹۱۱ھ)' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت
(۹) المواہب اللدُنیہ: علامہ احمد قسطلانی (م ۹۱۱ھ)' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۶ھ۔
(۱۰) شرح الشفاء: علامہ علی بن سلطان محمد القاری (م ۱۰۱۴ھ)' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۲۱ھ۔
(۱۱) نسیم الریاض: علامہ احمد شہاب الدین خفاجی (م ۱۰۶۹ھ)' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۲۱ھ۔
(۱۲) السیرۃ النبویۃ: علامہ سیّد احمد بن زینی دحلان مکی (م ۱۳۰۴ھ)' مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۲۱ھ۔
(۱۳) ضیاء النبی ﷺ: جسٹس پیر کرم شاہ الازہری' مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز' لاہور۔
(۱۴) سیرت النبی ﷺ: علامہ سیّد سلیمان ندوی۔
(۱۵) حیات النبی ﷺ: پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری۔
(۱۶) سیرتِ رسولِ عربی ﷺ: علامہ نور بخش توکلی۔

کتب اسماء الرجال

(۱) تاریخ بغداد: امام ابوبکر احمد بن علی خطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ)' دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۷ھ۔

(۲) میزان الاعتدال: علامہ شمس الدین محمد بن احمد ذہبی (۷۴۸ھ)، دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۶ھ۔

کتب متفرقہ

(۱) دیوان حسّان بن ثابت انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
(۲) قصیدہ بُردہ شریف: امام بُوصیری رحمۃ اللہ علیہ۔
(۳) التذکرۃ فی احوال الموتیٰ وامور الآخرۃ: شمس الدین قرطبی۔ (ترجمہ اردو: غلام نصیر الدین گولڑوی)
(۴) کتاب الاغانی: ابوالفرج اصفہانی۔
(۵) منہاج المسلم: ابوبکر جابر الجزائری۔
(۶) حجۃ اللہ علی العالمین: علامہ یوسف نبہانی۔
(۷) فی تقبیل الید: المقری۔
(۸) البیان والتعریف: الحسینی۔
(۹) معتصر المختصر: ابوالمحاسن
(۱۰) مصباح الظلام: حافظ ابوعبداللہ محمد بن موسیٰ بن نعمان۔
(۱۱) قصۃ الفلسفۃ الحدیثۃ: احمد امین۔
(۱۲) الحلال والحرام فی الاسلام: ڈاکٹر یوسف القرضاوی (انگریزی ترجمہ)۔
(۱۳) شواھد الحق: حافظ ابوسعید سمعانی۔
(۱۴) قضایائے وسیلہ: ذکی ابراہیم۔
(۱۵) مطالع المسرت: محمد مہدی
(۱۶) حدائق الانوار: شیبانی۔
(۱۷) قرآن رہنمائے سائنس: ہارون یحییٰ (اردو ترجمہ)
(۱۸) الغزالی: شبلی نعمانی۔
(۱۹) خطباتِ مدراس: سیّد سلیمان ندوی۔
(۲۰) سفرِ آخرت کی منازل: مولانا غلام نصیر الدین گولڑوی۔
(۲۱) قصص القرآن: حفظ الرحمن سیوہاروی۔
(۲۲) مقالاتِ سعیدی: علامہ غلام رسول سعیدی۔
(۲۳) آبِ حیات: مولانا قاسم نانوتوی۔

ماہنامے/روزنامے

(1) The Muslim World, April, 1950.

(۲) ماہنامہ ''مؤمن'' لاہور' جون 2003ء۔
(۳) روزنامہ ''نوائے وقت'' ملتان 27 نومبر 2005ء۔
(۴) ماہنامہ ''منہاج القرآن'' لاہور' فروری 2007ء۔
(۵) ماہنامہ ''منہاج القرآن'' لاہور' جون 2007ء۔
(۶) ماہنامہ ''منہاج القرآن'' لاہور' جولائی 2008ء۔
(۷) سالنامہ ''نخلستان'' (79-1978) گورنمنٹ ایمرسن کالج' ملتان۔

غیر اسلامی لٹریچر

Ragg's "The Gospel of Barnabas".
ہندوؤں کے وید' اُپنشد اور پُران۔
تورات وانجیل کے مختلف اقتباسات۔

اشاریہ قرآنی (جلد نہم)

[قوسین کے اندر (۔۔۔) کے اعداد صفحہ نمبر کو ظاہر کرتے ہیں۔]

المائدة (۵)

۵ : ۱۵،۱۶ (۴۳۰۰)
۵ : ۱۹ (۴۳۰۱)
۵ : ۲۴ (۴۲۳۳)
۵ : ۴۱ (۴۲۵۷)
۵ : ۵۹ (۴۲۹۳)
۵ : ۶۷ (۴۲۳۸)
۵ : ۸۷ (۴۴۶۷)
۵ : ۱۱۰ (۴۰۴۷)
۵ : ۱۱۲ (۴۴۴۰)
۵ : ۱۱۸ (۴۳۲۷)

الانعام (۶)

۶ : ۴۳ (۴۲۳۰)
۶ : ۴۵،۴۶ (۴۱۱۵)
۶ : ۷۶ (۴۱۴۵)
۶ : ۹۰ (۴۳۵۷)
۶ : ۹۲ (۴۲۳۱)
۶ : ۹۹ (۴۰۲۸)
۶ : ۱۰۳ (۴۱۳۷)
۶ : ۱۲۴ (۴۴۳۶)

الاعراف (۷)

۷ : ۱۰ (۴۰۳۲)
۷ : ۴۶ـ۴۸ (۴۱۰۷)
۷ : ۵۷ (۴۱۵۲)
۷ : ۵۹ (۴۴۷۷)
۷ : ۶۱،۶۰ (۴۴۲۹)
۷ : ۶۵ (۴۴۷۷)
۷ : ۶۷،۶۶ (۴۴۲۹)
۷ : ۷۳ (۴۴۷۷)
۷ : ۸۵ (۴۴۷۷)
۷ : ۹۴ـ۹۶ (۴۱۱۳)
۷ : ۱۵۷ (۴۲۱۲،۴۲۳۴)
۷ : ۱۵۸ (۴۲۳۰)
۷ : ۱۸۵ (۴۰۴۰)
۷ : ۱۸۷ (۴۱۰۱)

الانفال (۸)

۸ : ۱۷ (۴۲۴۹)
۸ : ۲۲ (۴۰۷۵)
۸ : ۲۴ (۴۲۱۲)
۸ : ۳۱ (۴۴۳۳)
۸ : ۳۳ (۴۲۴۷)
۸ : ۶۴ (۴۲۴۴)

التوبة (۹)

۹ : ۲۴ (۴۴۴۴)
۹ : ۳۴،۳۵ (۴۴۷۴)
۹ : ۴۰ (۴۳۱۸)
۹ : ۴۳ (۴۲۶۴)
۹ : ۵۹ (۴۲۵۸)
۹ : ۶۱ (۴۲۵۸)
۹ : ۶۲ (۴۲۱۷،۴۲۵۹)
۹ : ۶۳ (۴۲۵۹)
۹ : ۷۲ (۴۱۳۵)
۹ : ۸۰ (۴۲۶۷)
۹ : ۸۴ (۴۲۷۱)
۹ : ۱۰۳ (۴۲۶۲)
۹ : ۱۲۸ (۴۲۳۰)

یونس (۱۰)

۱۰ : ۴ (۴۰۹۲)
۱۰ : ۵ (۴۱۶۲)
۱۰ : ۱۵ (۴۴۳۶)
۱۰ : ۱۶ (۴۲۵۲)
۱۰ : ۲۲ (۴۱۶۱)
۱۰ : ۲۶ (۴۱۳۶)
۱۰ : ۶۱ (۴۰۹۹)
۱۰ : ۹۹ (۴۴۲۸)

هود (۱۱)

۱۱ : ۳۸،۳۹ (۴۴۳۲)
۱۱ : ۴۹ (۴۳۹۷)
۱۱ : ۵۴،۵۳ (۴۴۳۰)
۱۱ : ۵۴ـ۵۶ (۴۴۳۱)
۱۱ : ۶۳،۶۲ (۴۴۳۱)
۱۱ : ۷۳ (۴۳۸۴)
۱۱ : ۹۳،۹۲ (۴۴۳۰)

یوسف (۱۲)

۱۲ : ۱۰۲ (۴۳۹۷)

الرعد (۱۳)

۱۳ : ۴ (۴۰۷۴)
۱۳ : ۱۲،۱۳ (۴۱۵۹)
۱۳ : ۲۸ (۴۰۸۹)
۱۳ : ۳۸ (۴۴۳۶)
۱۳ : ۴۳ (۴۴۳۴)

ابراهیم (۱۴)

۱۴ : ۴ (۴۴۰۹)
۱۴ : ۱۲ (۴۴۸۲)
۱۴ : ۱۸ (۴۱۵۴)
۱۴ : ۳۲،۳۳ (۴۱۶۲)
۱۴ : ۳۴ (۴۰۲۱)
۱۴ : ۳۵ (۴۴۳۸)
۱۴ : ۵۰ (۴۱۲۲)

الحجر (۱۵)

۱۵ : ۶،۷ (۴۴۳۲)
۱۵ : ۸ (۴۴۳۳)
۱۵ : ۲۲ (۴۱۵۲)
۱۵ : ۴۵ـ۴۸ (۴۱۳۰)
۱۵ : ۷۲ (۴۲۴۴)
۱۵ : ۸۹ (۴۳۲۲)
۱۵ : ۹۴ـ۹۲ (۴۳۲۳)
۱۵ : ۹۵،۹۶ (۴۳۲۳)
۱۵ : ۹۷ـ۹۹ (۴۳۲۴)

النحل (۱۶)

۱۵ : ۱۲،۱۳ (۴۲۶۷)

۱۶ :۳۶(۴۴۷۶)
۱۶:۴۴(۴۲۶۲)
۱۶:۴۵_۴۷(۴۱۱۴)

بنی اسراءیل (۱۷)

۱۷ : ۱ (۴۳۳۳)
۱۷ : ۱۴(۴۱۰۴)
۱۷ : ۲۰(۴۲۲۲)
۱۷ : ۲۹(۴۴۲۸)
۱۷ : ۳۵ (۴۴۷۲)
۱۷:۴۹_۵۱(۴۰۹۳)
۱۷ : ۵۲(۴۱۰۲)
۱۷ : ۵۹(۴۱۸۱)
۱۷:۶۰(۴۳۴۱،۴۳۵۳)
۱۷:۶۷،۶۸(۴۱۵۵)
۱۷:۷۲(۴۰۸۷)
۱۷:۷۵،۷۴(۴۲۱۹)
۱۷ : ۷۹(۴۲۷۸)
۱۷ : ۸۵(۴۰۸۳)
۱۷ : ۸۸(۴۴۳۴)
۱۷:۹۴،۹۵(۴۴۳۵)
۱۷:۱۰۱،۱۰۲(۴۴۳۰)
۱۷ : ۱۱۰(۴۰۴۸)

الکہف (۱۸)

۱۸: ۵(۴۱۸۱،۴۴۴۲)
۱۸ : ۷(۴۰۵۴)
۱۸:۹_۱۱(۴۰۵۳)
۱۸:۱۴،۱۳(۴۰۶۸)
۱۸: ۱۶(۴۰۷۰)
۱۸ : ۱۷(۴۰۴۹)
۱۸ : ۱۸،۱۷(۴۰۵۶)
۱۸ : ۱۹(۴۰۷۲)
۱۸:۲۰ (۴۰۶۵)
۱۸ :۲۲،۲۱(۴۰۵۷)
۱۸ : ۲۴،۲۳(۴۰۶۵)
۱۸:۲۵(۴۰۶۳،۴۰۷۲)
۱۸: ۲۹(۴۱۲۲)
۱۸: ۳۱(۴۱۲۹)
۱۸ : ۱۰۵(۴۱۸۶)
۱۸:۱۱۰(۴۴۲۴)

مریم (۱۹)

۱۹:۴۲_۴۵(۴۴۷۷)
۱۹ : ۶۲(۴۱۳۰)
۱۹ : ۶۷(۴۰۹۳)
۱۹ :۷۲،۷۱(۴۱۱۹)
۱۹ : ۹۷ (۴۲۵۸)

طٰہٰ (۲۰)

۲۰ : ۲،۱(۲۴۴۴)
۲۰ : ۵۰(۴۴۷۹)
۲۰:۷۳،۷۲(۴۰۶۹)
۲۰ : ۹۹(۴۰۴۹)

الانبیاء (۲۱)

۲۱ : ۲۰(۴۱۴۱)
۲۱ : ۴۷(۴۱۸۲)
۲۱:۶۸_۷۰(۴۱۷۹)
۲۱ : ۸۷(۴۴۷۷)
۲۱: ۹۸(۴۱۱۹)
۲۱ : ۱۰۳ (۴۱۰۶)
۲۱ : ۱۰۷(۴۲۵۳)

الحجّ (۲۲)

۲۲ : ۱۰(۴۱۱۰)
۲۲ : ۱۵ (۴۲۶۴)
۲۲ : ۱۹ (۴۱۲۲)
۲۲ : ۲۳ (۴۱۲۹)
۲۲ : ۳۶(۴۰۴۹)
۲۲ : ۴۶ (۴۰۸۸)
۲۲: ۷۵ (۴۱۴۲)

المؤمنون (۲۳)

۲۳:۱۸(۴۱۵۳)
۲۳:۶۹_۷۰(۴۳۰۴)
۲۳:۷۳_۷۱(۴۳۰۵)
۲۳:۱۰۱(۴۱۰۲)
۲۳:۱۰۳(۴۱۸۶)

النّور (۲۴)

۲۴ : ۲۴(۴۱۰۶)
۲۴: ۲۶(۴۴۳۷)
۲۴: ۳۲(۴۴۶۸)
۲۴ : ۳۷(۴۴۷۰)
۲۴:۴۳(۴۱۵۶،۴۱۵۹)
۲۴ : ۵۶(۴۲۱۳)
۲۴: ۶۳(۴۳۱۱)

الفُرقان (۲۵)

۲۵ : ۱(۴۲۳۰)
۲۵:۴_۶(۴۴۳۴)
۲۵:۷(۴۴۳۵)
۲۵:۹،۸(۴۴۳۳)
۲۵ :۲۰(۴۴۳۵)
۲۵ : ۲۷(۴۲۱۳)
۲۵:۳۲(۴۴۳۵)
۲۵:۳۳،۳۲(۴۴۲۳)
۲۵:۷۳(۴۰۸۷)

الشّعراء (۲۶)

۲۶:۳(۴۲،۴۳،۴۴۲۸)
۲۶: ۱۴(۴۳۳۰)
۲۶ :۸۵،۸۴(۴۴۳۸)
۲۶: ۸۷(۴۴۳۸)
۲۶:۱۶۷ (۴۴۳۱)
۲۶:۱۶۹،۱۶۸(۴۴۳۲)
۲۶:۱۸۱_۱۸۳(۴۴۷۲)
۲۶:۱۹۴،۱۹۳(۴۲۸۵)

(۴۴۱۵) ۱۰، ۱۱ : ۷۳
(۴۴۱۵) ۲۰ : ۷۳

المدّثر (۷۴)
(۴۴۱۷) ۱تا۷ : ۷۴
(۴۴۱۸) ۱۱تا۳۰ : ۷۴
(۴۳۲۵) ۴۶،۴۷ : ۷۴

القیامة (۷۵)
(۴۱۸۲) ۱۴،۱۵ : ۷۵
(۴۰۴۷) ۱۶،۱۷ : ۷۵
(۴۲۶۰) ۱۶تا۱۹ : ۷۵
(۴۱۳۶) ۲۲،۲۳ : ۷۵
(۴۱۰۳) ۲۹ : ۷۵

الدّهر (۷۶)
(۴۱۳۰) ۱۳ : ۷۶
(۴۱۲۹) ۲۱ : ۷۶
(۴۰۵۰) ۲۵،۲۶ : ۷۶

النّبا (۷۸)
(۴۱۰۳) ۱۸ : ۷۸
(۴۱۲۲) ۲۲تا۲۶ : ۷۸

النّازعٰت (۷۹)
(۴۱۴۲) ۱تا۵ : ۷۹
(۴۰۸۷) ۳۴تا۴۱ : ۷۹

عبس (۸۰)
(۴۲۷۲) ۱تا۱۰ : ۸۰

التکویر (۸۱)
(۴۰۹۴) ۱تا۱۴ : ۸۱
(۴۲۵۲) ۲۲ : ۸۱
(۴۰۵۰) ۲۹ : ۸۱

المطفّفین (۸۳)
(۴۴۷۲) ۱تا۳ : ۸۳
(۴۰۸۸) ۱۴، ۱۵ : ۸۳
(۴۱۳۶) ۱۵ : ۸۳
(۴۱۳۳) ۲۶ : ۸۳

الانشقاق (۸۴)
(۴۱۲۴) ۱۳،۱۴ : ۸۴

الاعلیٰ (۸۷)
(۴۲۶۱) ۶ : ۸۷

الغاشیة (۸۸)
(۴۱۲۲) ۱۵تا۱۷ : ۸۸
(۴۰۴۱) ۱۷تا۲۰ : ۸۸
(۴۴۱۳) ۲۱،۲۲ : ۸۸

الفجر (۸۹)
(۴۴۸۲) ۲۷،۲۸ : ۸۹

البلد (۹۰)
(۴۲۸۵) ۱، ۲ : ۹۰

الضّحیٰ (۹۳)
(۴۳۲۵) ۳، ۴ : ۹۳
(۴۳۲۶) ۵ : ۹۳
(۴۴۰۹) ۶تا۸ : ۹۳

الانشراح (۹۴)
(۴۳۸۶) ۱ : ۹۴
(۴۳۸۸) ۴ : ۹۴

القارعة (۱۰۱)
(۴۱۸۲) ۶تا۹ : ۱۰۱

الکوثر (۱۰۸)
(۴۲۷۶) ۱ : ۱۰۸
(۴۲۷۸) ۳ : ۱۰۸

اللهب (۱۱۱)
(۴۳۵۴) ۱تا۵ : ۱۱۱

اشاریہ احادیثِ مبارکہ

(۱) اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَنْ نَّتَدَاوٰی مِنْ ذَاتِ الْجَنْبِ بِالْقُسْطِ الْبَحْرِیِّ وَالزَّیْتِ (۴۰۳۶)

(۲) کُلُوا الزَّیْتَ وَادَّهِنُوْا بِهٖ فَاِنَّ فِیْهِ شِفَاءً" مِّنْ سَبْعِیْنَ دَاءٍ مِّنْهَا الْجُذَام (۴۰۳۶)

(۳) لَعَنَ اللّٰهُ زَائِرَاتِ الْقُبُوْرِ وَالْمُتَّخِذِیْنَ عَلَیْهَا الْمَسَاجِدَ وَ السُّرُج (۴۰۵۸)

(۴) اَلَا وَاِنَّ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ کَانُوْا یَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِیَاءِ هِمْ مَّسٰجِدَ فَاِنِّیْ اَنْهٰکُمْ عَنْ ذٰلِکَ (۴۰۵۸)

(۵) اِنَّ اُولٰئِکَ اِذَا کَانَ فِیْهِمِ الرَّجُلُ الصّٰلِحُ مَاتَ بَنَوْا عَلٰی قَبْرِهٖ مَسْجِدًا وَّصَوَّرُوْا فِیْهِ تِلْکَ الصُّوَرَ اُولٰئِکَ شِرَارُ الْخَلْقِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ (۴۰۵۸)

(۶) لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرْعَةِ اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِکُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ (۴۰۸۷)

(۷) اَعْدَدْتُّ لِعِبَادِیَ الصّٰلِحِیْنَ مَالَا عَیْنٌ "رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ "سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ (۴۱۳۴)

(۸) سَاَلُوْا (اَهْلُ مَکَّةَ) رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَنْ یُّرِیَهُمْ اٰیَةً فَاَرَاهُمُ انْشِقَاقَ الْقَمَرِ مَرَّتَیْنِ (۴۱۶۵)

(۹) اُتِیَ النَّبِیُّ بِاِنَاءٍ وَهُوَ بِالزَّوْرَاءِ فَوَضَعَ یَدَهٗ فِی الْاِنَاءِ فَجَعَلَ الْمَاءُ یَنْبُعُ مِنْ بَیْنِ اَصَابِعِهٖ فَتَوَضَّاَ الْقَوْمُ قَالَ قَتَادَةُ: قُلْتُ لِاَنَسٍ: کَمْ کُنْتُمْ؟ قَالَ: ثَلَاثَ مِائَةٍ اَوْزُهَاءَ ثَلَاثِ مِائَةٍ وَفِیْ رِوَایَةٍ: لَوْ کُنَّا مِائَةَ اَلْفٍ لَکَفَانَا وَکُنَّا خَمْسَ عَشْرَةَ مِائَةٍ (۴۱۶۶)

(۱۰) جَلَسَ النَّبِیُّ ﷺ عَلٰی شَفِیْرِ الْبِئْرِ فَدَعَا بِمَاءٍ فَمَضْمَضَ وَ مَجَّ فِی الْبِئْرِ فَمَکَثْنَا غَیْرَ بَعِیْدٍ ثُمَّ اسْتَقَیْنَا حَتّٰی رَوِیْنَا وَرَوَتْ اَوْصَدَرَتْ رَکَائِبُنَا (۴۱۶۷)

(۱۱) قَالَ اَبُوْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنِّیْ اَسْمَعُ مِنْکَ حَدِیْثًا کَثِیْرًا اَنْسَاهُ قَالَ: اُبْسُطْ رِدَاءَکَ فَبَسَطْتُّهٗ قَالَ: فَغَرَفَ بِیَدَیْهِ ثُمَّ قَالَ: ضُمَّهٗ فَضَمَمْتُهٗ فَمَا نَسِیْتُ شَیْئًا بَعْدَهٗ (۴۱۶۷)

(۱۲) کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یُوْحٰی اِلَیْهِ وَرَاْسُهٗ فِیْ حِجْرِ عَلِیٍّ فَلَمْ یُصَلِّ الْعَصْرَ حَتّٰی غَرَبَت (۴۱۶۷)

(۱۳) اِنْ دَعَوْتُ هٰذَا الْعِذْقَ مِنْ هٰذِهِ النَّخْلَةِ اَتَشْهَدُ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ؟ فَدَعَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ (۴۱۶۸)

(۱۴) لَمَّا نَظَرَ الْجَمَلُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ خَرَّ (۴۱۶۹) (۱۵) اَسَمَمْتِ هٰذِهِ الشَّاةَ؟ قَالَتْ: مَنْ [illegible]

(۱۶) قَعَدَ النَّبِیُّ عَلَی الْمِنْبَرِ الَّذِیْ صُنِعَ لَهٗ فَصَاحَتِ النَّخْلَةُ الَّتِیْ کَانَ یَخْطُبُ عِنْدَهَا حَتّٰی (۴۱۷۰)

(۱۷) اَللّٰهُمَّ جَمِّلْهُ وَاَدِمْ جَمَالَهٗ قَالَ: فَلَقَدْ بَلَغَ بِضْعًا وَّمِئَةَ سَنَةٍ وَمَا فِیْ رَاْسِهٖ وَلِحْیَتِهٖ بَیَاضٌ "اِلَّا" (۴۱۷۱)

(۱۸) اَللّٰهُمَّ حَوْلَیْنَا وَلَا عَلَیْنَا مَرَّتَیْنِ اَوْثَلَاثًا فَجَعَلَ السَّحَابُ یَتَصَدَّعُ عَنِ الْمَدِیْنَةِ یَمِیْنًا وَّ -- (۴۱۷۱)

(۱۹) لَمَّا حَضَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ الْخَنْدَقَ مَرُّوْا بِکُدْیَةٍ فَتَنَاوَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْمِعْوَلَ مِنْ یَدِ اَمِیْرِ -- (۴۱۷۳)

(۲۰) اِذَا سَمِعْتُمُوا الْمُؤَذِّنَ فَقُوْلُوْا مِثْلَ مَا (۴۱۹۴) (۲۱) جَاءَنِیْ جِبْرِیْلُ فَقَالَ: اَمَا یُرْضِیْکَ (۴۱۹۵)

(۲۲) مَنْ ذُکِرْتُ عِنْدَهٗ فَلْیُصَلِّ عَلَیَّ وَمَنْ صَلّٰی عَلَیَّ صَلَاةً وَّاحِدَةً صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ عَشْرًا (۴۱۹۶)

(۲۳)مَنْ سَلَّمَ عَلَيَّ عَشْرًا فَكَأَنَّمَا أَعْتَقَ رَقَبَةً (۴۱۹۶)

(۲۴)إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَكْثَرُهُمْ عَلَيَّ صَلٰوةً (۴۱۹۶)

(۲۵)أَكْثِرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ عَلَيَّ يَوْمَ (۴۱۹۶) (۲۶) الصَّلٰوةُ عَلَيَّ نُوْر" عَلَى الصِّرَاطِ وَمَنْ (۴۱۹۶)

(۲۷)إِنَّ أَبْخَلَ النَّاسِ مَنْ ذُكِرْتُ (۴۱۹۷) (۲۸) رَغِمَ أَنْفُ رَجُلٍ ذُكِرْتُ عِنْدَهُ فَلَمْ (۴۱۹۷)

(۲۹) مَاجَلَسَ قَوْم" مَجْلِسًا لَمْ يَذْكُرُوا اللّٰهَ وَلَمْ يُصَلُّوْا عَلٰى نَبِيِّهِمْ إِلَّا كَانَ عَلَيْهِمْ تِرَةً يَوْم (۴۱۹۷)

(۳۰) قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: أُحْضُرُوا الْمِنْبَرَ فَحَضَرْنَا فَلَمَّا ارْتَقٰى دَرَجَةً قَالَ: آمِين ثُمَّ ارْتَقٰى (۴۱۹۸)

(۳۱) إِنَّ لِلّٰهِ مَلَائِكَةً" سَيَّاحِيْنَ فِي الْأَرْضِ يُبَلِّغُوْنَنِي مِنْ أُمَّتِيْ السَّلَامَ (۴۱۹۸)

(۳۲)صَلُّوْا عَلَيَّ فَإِنَّ صَلَاتَكُمْ تَبْلُغُنِيْ حَيْثُ كُنْتُمْ (۴۱۹۹) (۳۳)مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ عِنْدَ قَبْرِيْ (۴۱۹۹)

(۳۴)قَالَ أُبَيُّ ابْنُ كَعْبٍ اَجْعَلُ لَكَ صَلَاتِيْ كُلَّهَا؟قَالَ:إِذًا تُكْفٰى هَمُّكَ وَيُغْفَرُ لَكَ ذَنْبُكَ (۴۲۰۰)

(۳۵) يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اقَدْظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَقَدْجِئْتُكَ تَسْتَغْفِرْلِيْ فَنُوْدِيَ مِنَ الْقَبْرِقَدْغُفِرَلَكَ (۴۲۰۸)

(۳۶) عُرِضَتْ عَلَيَّ أُمَّتِيْ وَاُعْلِمْتُ مَنْ يُؤْمِنُ بِيْ وَمَنْ يَّكْفُرُ فَقَالَ الْمُنٰفِقُوْنَ:إِنَّهُ يَزْعَمُ أَنَّهُ (۴۲۱۶)

(۳۷)فَوَضَعَ اللّٰهُ كَفَّهُ بَيْنَ كَتِفَيَّ فَوَجَدْتُّ بَرْدَهُ بَيْنَ ثَدَيَّ فَعَلِمْتُ مَابَيْنَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (۴۲۲۱)

(۳۸)اُكْتُبْ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ مَاخَرَجَ مِنِّيْ إِلَّا الْحَقُّ (۴۲۵۰)

(۳۹) كُنْتُ بَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهِ وَسَمْعَهُ الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهِ وَيَدَهُ الَّتِيْ يَبْطِشُ بِهَاوَرِجْلَهُ الَّتِيْ (۴۲۵۱)

(۴۰)إِنِّيْ فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ مَنْ مَرَّ عَلَيَّ وَمَنْ شَرِبَ لَمْ يَظْمَأْ أَبَدًا لَيَرِدَنَّ أَقْوَام" أَعْرِفُهُمْ (۴۲۷۸)

(۴۱) إِذَا كَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَاجَ النَّاسُ بَعْضُهُمْ فِيْ بَعْضٍ فَيَأْتُوْنَ آدَمَ فَيَقُوْلُوْنَ :اِشْفَعْ لَنَا إِلٰى (۴۲۸۳)

(۴۲) يَا مُحَمَّدُ! اِرْفَعْ رَاْسَكَ فَاشْفَعْ تُشَفَّعْ سَلْ تُعْطَ (۴۲۸۴)

(۴۳)لَا تَسْئَلْنِيْ بِهِمَا فَوَاللّٰهِ مَاأَبْغَضْتُ شَيْئًا قَطُّ بُغْضَهُمَا (۴۲۸۸)

(۴۴) أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَلَافَخْرَ بِيَدِيْ لِوَاءُ الْحَمْدِ وَلَافَخْرَوَآدَمُ وَمَا سِوَاهُ تَحْتَ لِوَائِيْ وَلَافَخْر (۴۲۹۰)

(۴۵) مَا بَالُ اَقْوَامٍ طَعَنُوْا فِيْ عِلْمِيْ لَاتَسْئَلُوْنِيْ عَنْ شَيْءٍ فِيْمَا بَيْنِيْ وَبَيْنَ السَّاعَةِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمْ (۴۳۱۲)

(۴۶)فَوَاللّٰهِ مَا يَخْفٰى عَلَيَّ خُشُوْعُكُمْ وَلَا رُكُوْعُكُمْ إِنِّيْ لَأَرَاكُمْ مِنْ وَّرَآءِ ظَهْرِيْ (۴۳۲۲)

(۴۷)أُرِيَ النَّبِيُّ ﷺ مَايَفْتَحُ اللّٰهُ عَلٰى أُمَّتِهِ بَعْدَهُ فَسُرَّ بِذٰلِكَ وَنَزَلَ جِبْرَئِيْلُ بِقَوْلِهِ تعالىٰ . وَ (۴۳۲۶)

(۴۸) فَخَيَّرَنِيْ رَبِّيْ بَيْنَ اَنْ يَّدْخُلَ نِصْفُ أُمَّتِيْ اَلْجَنَّةَ وَبَيْنَ الشَّفَاعَةِ فَاخْتَرْتُ الشَّفَاعَةَ (۴۳۲۷)

(۴۹) شَفَاعَتِيْ لِاَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ أُمَّتِيْ (۴۳۲۷) (۵۰) إِنَّاسَنُرْضِيْكَ فِيْ أُمَّتِكَ وَلَانَسُوْءُ (۴۳۳۸)

(۵۱)مَنْ ذُكِرْتُ عِنْدَهُ فَخَطِئَ الصَّلَاةَ عَلَيَّ خَطِئَ طَرِيْقَ الْجَنَّةِ (۴۳۷۲)

(۵۲) مَنْ كَلَّمَهُ رُوْحُ الْقُدُسِ لَنْ يُؤْذَنَ لِلْاَرْضِ اَنْ تَأْكُلَ مِنْ لَحْمِهِ (۴۳۷۷)

(۵۳) أَسْمَعُ صَلَاةَ أَهْلِ مَحَبَّتِيْ وَأَعْرِفُهُمْ (۴۳۷۷)

(۵۴) وَلَئِنْ قَامَ (عیسیٰ) عَلٰى قَبْرِيْ فَقَالَ: يَامُحَمَّدُ! لَاُجِيْبَنَّهُ (۴۳۷۷)

(۵۵) مَامِنْ اَحَدٍ يُسَلِّمُ عَلَيَّ اِلاَّ رَدَّاللّٰهُ عَلَيَّ رُوْحِيْ حَتّٰى اَرُدَّ عَلَيْهِ السَّلاَمُ (۴۳۷۷)

(۵۶) مَامِنْ مُّسْلِمٍ سَلَّمَ عَلَيَّ فِيْ شَرْقٍ وَّلاَ غَرْبٍ اِلاَّ اَنَا وَمَلاَئِكَةُ رَبِّيْ نَرُدُّالسَّلاَمَ (۴۳۷۸)

(۵۷) حَيَاتِيْ خَيْرٌ" لَّكُمْ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ وَّوَفَاتِيْ خَيْرٌ" لَّكُمْ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ فَسَكَتَ الْقَوْمُ فَقَالَ عُمَرُ (۴۳۷۸)

(۵۸) خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ (۴۳۸۰)

(۵۹) هٰؤُلاَءِ اَهْلُ بَيْتِيْ (۴۳۸۳) (۶۰) هٰذَانِ اِبْنَايَ وَابْنَا بِنْتِيْ (۴۳۸۵)

(۶۱) اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اُحِبُّهُمَا فَاَحِبَّهُمَا وَاَحِبَّ مَنْ يُّحِبُّهُمَا (۴۳۸۵)

(۶۲) اَتَانِيْ جِبْرِيْلُ وَقَالَ : اِنَّ رَبَّكَ يَقُوْلُ : اَتَدْرِيْ كَيْفَ رَفَعْتُ ذِكْرَكَ؟ قُلْتُ : اَللّٰهُ اَعْلَمُ (۴۳۸۸)

(۶۳) اَدَّبَنِيْ رَبِّيْ فَاَحْسَنَ تَادِيْبِيْ/هَذَّبَنِيْ رَبِّيْ فَاَحْسَنَ تَهْذِيْبِيْ (۴۴۰۱)

(۶۴) اِنَّ مَثَلِيْ وَمَثَلُ الْاَنْبِيَاءِ مِنْ قَبْلِيْ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰى بَيْتًا فَاَحْسَنَهٗ وَ اَجْمَلَهٗ اِلاَّ مَوْضِعَ (۴۴۰۲)

(۶۵) فُضِّلْتُ عَلَى الْاَنْبِيَاءِ بِسِتٍّ : اُعْطِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ وَ نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ وَ اُحِلَّتْ لِيْ (۴۴۰۲)

(۶۶) اَنَا اٰخِرُ الْاَنْبِيَاءِ وَاَنْتُمْ اٰخِرُ الْاُمَمِ (۴۴۰۵)

(۶۷) لَوْكَانَ بَعْدِيْ نَبِيٌّ" لَكَانَ عُمَرَابْنُ الْخَطَّاب (۴۴۰۵)

(۶۸) اِنَّ الرِّسَالَةَ وَالنُّبُوَّةَ قَدِانْقَطَعَتْ وَلاَرَسُوْلَ بَعْدِيْ وَلاَ نَبِيًّا (۴۴۰۵)

(۶۹) اِنَّهٗ سَيَكُوْنُ فِيْ اُمَّتِيْ كَذَّابُوْنَ ثَلاَثُوْنَ كُلُّهُمْ يَزْعَمُ اَنَّهٗ نَبِيٌّ" وَاَنَاخَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لاَنَبِيَّ بَعْدِيْ (۴۴۰۵)

(۷۰) قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِعَلِيٍّ : اَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هٰرُوْنَ بِمُوْسٰى اِلاَّ اَنَّهٗ لاَنَبِيَّ بَعْدِيْ (۴۴۰۵)

(۷۱) اِنَّمَا مَثَلِيْ وَمَثَلُ اُمَّتِيْ كَمِثْلِ رَجُلٍ اِسْتَوْقَدَ نَارًا فَجَعَلَتِ الدَّوَآبُّ وَالْفَرَاشُ يَقَعْنَ فِيْهِ وَاَنَا (۴۴۰۷)

(۷۲) مَا مِنْ مُّؤْمِنٍ اِلاَّ وَ اَنَا اَوْلٰى بِهٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اِقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ : اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى (۴۴۰۷)

(۷۳) اَيُّكُمْ مِّثْلِيْ؟ اَبِيْتُ وَهُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِيْ (۴۴۲۶)

(۷۴) لاَ يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ O (۴۴۴۴)

(۷۵) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ : لَقَدْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَالْحَلاَّقُ يَحْلِقُهٗ وَاَطَافَ بِهٖ اَصْحَابُهٗ (۴۴۴۷)

(۷۶) عَنْ زَارِعٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ (وَكَانَ فِيْ وَفْدِ عَبْدِ الْقَيْسِ) قَالَ : لَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِيْنَةَ فَجَعَلْنَا نَتَبَادَرُ مِنْ رَوَاحِلِنَا فَنُقَبِّلُ يَدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَرِجْلَيْهِ (۴۴۴۷)

(۷۷) اَرْسَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ اِلٰى قُرَيْشٍ۔ فَدَعَوْا عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ لِيَطُوْفَ (۴۴۴۷)

(۷۸) رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَكْبَرُ مِنِّيْ وَاَنَا اَقْدَمُ مِنْهُ فِي الْمِيْلاَدِ (۴۴۴۸)

(۷۹) قِيْلَ لِلْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ : اَيُّمَا اَكْبَرُ اَنْتَ اَمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ؟ فَقَالَ : هُوَ اَكْبَرُ مِنِّيْ وَ اَنَا وُلِدْتُ قَبْلَهٗ (۴۴۴۸)

(۸۰) اِنَّ عُرْوَةَ جَعَلَ يَرْمُقُ اَصْحَابَ النَّبِيِّ ﷺ بِعَيْنَيْهِ قَالَ : فَوَاللّٰهِ مَا تَنَخَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نُخَامَةً اِلاَّ وَقَعَتْ فِيْ كَفِّ رَجُلٍ مِّنْهُمْ فَدَلَكَ بِهَا وَجْهَهٗ وَجِلْدَهٗ وَاِذَا اَمَرَهُمْ اِبْتَدَرُوْا اَمْرَهٗ وَاِذَاتَوَضَّاَ (۴۴۴۸)

(۸۱) اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (۴۴۷۴)

اشاریہ عمومی

قرآنک انسائیکلوپیڈیا

اردو ترجمہ

جلد نہم

مؤلف

پروفیسر اشفاق احمد خان